وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور اچھے اچھے کام کرے اور کہے کہ میں بھی یقیناً (خدا کے) فرمانبردار بندوں میں سے ہوں

کتاب مستطاب

احسن الفوائد

فی

شرح العقائد

اصل رسالہ اعتقادیہ

ازقلم حقیقت رقم

حضرت صدوق العلماء العاملین رئیس الفقہا والمحدثین جناب

شیخ ابوجعفر محمد بن علی ابن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی اعلی اللہ مقامہ

مترجم رسالہ

فاضل محقق مولانا سید منظور حسین بخاری مرحوم

شارح رسالہ

صدر المحققین، سلطان المتکلمین سرکار علامہ آیت اللہ الشیخ محمد حسین النجفی مجتہد العصر والزمان مدظلہ

منیجر مکتبۃ السبطین ۲۹۶ ۹۔بی سیٹلائٹ ٹاؤن بلاک بی سرگودھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو دوسروں کو خدا کی طرف بلائے اور اچھے کام کرے اور کہے کہ میں بھی یقیناً خدا کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں

کتاب مستطاب

احسن الفوائد
فی
شرح العقائد

جس میں

تمام شیعہ عقائد و مسلمات کو قرآن کریم، احادیث معصومین اور عقل سلیم کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے اور دیگر فرق ہائے اسلام کے مقابلہ میں دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے شیعہ اصول و عقائد کی برتری واضح کی گئی ہے اور ہر ہر موضوع پر ملاحدہ و منکرین کے جملہ شکوک و شبہات کو عقلی و نقلی ادلہ سے علوم قدیمہ اور جدیدہ کی روشنی میں رد کیا گیا ہے

سرکار صدوق العلماء العالمین رئیس الفقہاء والمحدثین حضرت شیخ ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی علیہ الرحمۃ

سرکار صدر المحققین سلطان المتکلمین حجۃ الاسلام والمسلمین حضرت علامہ محمد حسین صاحب قبلہ مدظلہ العالی علی رؤس المومنین

۲۹۶۔ بی سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا

ثنائی پریس بلاک نمبر 1 سرگودھا

فون 7/868

تقاریظ

۱۔ مرجع اکبر تقلید شیعیان جہان سرکار آیت اللہ السید محسن الطباطبائی الحکیم مدظلہ العالی علی روس المومنین سرکار موصوف ایک احسان نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

جناب مستطاب عماد الاعلام ثقۃ الاسلام والمسلمین آقائی آقا شیخ محمد حسین وامت برکاتہ پس از ابلاغ سلام انشاء اللہ تعالی موید مسدد بودہ خواہید بود تالیف منیف احسن الفوائد بوسیلہ جناب مستطاب ثقۃ الاسلام والمسلمین آقائی آقا صادق علی نقوی وامت برکاتہ وصل گردید البتہ خدمات حضرتعالی درراہ دین وایمان وتشیید عقاید نزد حضرت ولی عصر ارواحنا فداہ ذخیرہ خواہد بود خداوند بر تائیدات حضرتعالی بیفزاید رکتاب اور کتابخانہ عمومی ایں جانب جای وادیم تا مورد استفادہ عموم گردد التماس دعا واریم کما لا نفسکم والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (محسن الاطباطبائی الحکیم ۶ شوال ۸۶ء)

۲۔ سرکار استاذ العلماء حضرت مولانا سید محمد باقر صاحب اعلی اللہ مقامہ شفقت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں تسلیم بعد تعظیم کتاب مستطاب پہنچ گئی بے حد شکر گزار ہوں۔ خداوند کریم تربیت ایتام آل محمد علیہم السلام وافادہ واعانت سادات و مومنین کے لیے تادیر زندہ وسلامت رکھے۔ بحرمت حبیبہ محمد وآلہ الطاہرین علیہم افضل صلوۃ المصلین میں نے آپ کی کتاب مستطاب کو حرف بحرف سنا تھا لیکن اس وقت اجمالی طور پر اس قدر یاد ہے کہ کتاب نہایت مفید ہے اور اس سے میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ (دعا گو محمد باقر زبدھر جیانہ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء)

۳۔ سرکار خطیب اعظم جناب مولانا سید محمد صاحب قبلہ دہلوی صدر مطالبات کمیٹی آل پاکستان تحریر فرماتے ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم ٥ والحمد للہ والصلوۃ علی اھلھا اما بعد حقیر نے حامیان ملت جعفریہ کے شاہکار احسن الفوائد کا جگہ جگہ سے مطالعہ کیا اور ناشر ومحترم مترجم اور حضرت حجۃ الاسلام مولوی محمد حسین صاحب قبلہ کی جانگاہی کو عبارات میں دیکھا اس زمانہ میں جب کہ مذہبی امور پر لوگوں کو عبور نہیں رہا۔ ضروری مسائل ملت جعفریہ کو جس انداز میں حل کیا گیا ہے وہ لائق ہزار ستائش ہے۔ نیز مکتبہ ہمدانی کی ہمت پر آفرین ہے کہ اس نے چھوٹے ناتمام رسالوں کی جگہ ایک ضخیم تحقیقی کتاب قوم کے سامنے پیش کردی۔ حضرت حجۃ الاسلام نے اس مختصر عہد میں جو قلمی جہاد فرمایا ہے اور بلا خوف جس انداز سے مخالفین کے اعتراضات کو دفع فرمایا ہے وہ انہی جناب کا حصہ ہے۔ عامیانہ اعتراضات کو سنجیدہ اور مہذب طریقہ سے دفع کرنا ان جناب کا امتیازی کارنامہ ہے جن مومنین کے دل محبت مذہب حقیقی میں سرشار ہیں جو معلومات مذہبی کو ذریعہ نجات تصور کرتے ہیں جو معصومین علیہم الصلوۃ والسلام کے بتلائے ہوئے مذہب کو عقل وعلم وقرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں ان پر اس کتاب کا مطالعہ واجب ہے کہ جن میں ہر عقیدہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور عقائد کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا کہ جس کو شمع تحقیق کی روشنی میں اجاگر نہ کیا ہو۔ الشکر اللہ سعیھم۔

(السید محمد دہلوی فردوس کالونی کراچی نمبر ۱۸)

۴۔ عمدۃ المحققین علامہ مفتی جعفر حسین صاحب گوجرانوالہ ممبر اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان تحریر فرماتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ٥ الحمد للہ الفرد الصمد الواحد الذی اقام علی فردانیتہ الشواھد و تعالی فی عدو ناتہ من ان تحویہ المشاھد والصلوہ الزکیہ البھیتہ علی رسولہ المبعوث بجوامع

الکلم و توضیح المقاصد الذی رفع لا دین قواعد وانشا للعلم معاهد و نصب الاعلام لفسدید مافسد من العقائد وجدا لینا ولا قتفاء اثارهم نفائس الفرائد واحسن الفوائد وعلی اله السغر الا لیاب الا ماجدار لی الفواصل والفضائل ولمحامد ماطلع النجوم ولمع الضراقد

شیعی اصول کی بنیاد عقل پر ہے عقل ہی ایک خالق وصانع کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ عقل ہی تصدیق انبیاء کی دعوت دیتی ہے اور عقل ہی حافظان دین کی ضرورت بتاتی ہے جب عقل اللہ کی الوہیت ووحدت پیغمبر اسلام کی نبوت و صداقت اور آئمہ معصومین کی امامت وولایت کی طرف رہبری کرتی اور توحید ونبوت وامامت کے اقرار پر مجبور کرتی ہے تو ان کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی صحت حدیث رسول کی محبت اور آئمہ معصومین کے اقوال کی صداقت پر یقین کیا جائے شیعہ اتباع رسول اور قرآن و آئمہ اظہار سے تمسک ووابستگی ہو تو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور انہی کو احکام شرعیہ کا سرچشم مانتے ہیں اور ان کے اصول ومسلمات جہاں عقل کی تائید حاصل ہے وہاں قرآن وحدیث اور آثار معصومین بھی ان سے متفق ہیں۔ مگر کچھ تعصب وتنگ نظر افراد نے شیعی معتقدات کی غلط تعبیر کر کے اصل عقائد کو بھیانک صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور متعہ کو زنا سے تقیہ کو جھوٹ سے اور بداء کو عقیدہ جہل سے تعبیر کر کے اور تحریف قرآن وسب صحابہ وغیرہ کی ان کی طرف نسبت دے کر نہ صرف ان سے نفرت کدورت کی داغ بیل ڈالی ہے بلکہ بعض حضرات نے انہیں خارج از اسلام قرار دینے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی یہ کچھ تو ناروا عصبیت کی بناء پر ہے اور کچھ شیعی کتب وشیعی معتقدات سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے ضرورت تھی کہ شیعوں کے عقائد ومسلمات کو اولہ وبراہمین کے ساتھ پیش کیا جائے تا کہ شیعیۃ کا صحیح تعارف ہو سکے اور طالبان حق کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوسکیں۔ اگرچہ عربی زبان میں کافی روائی سرمایہ موجود ہے مگر ضرورت تھی کہ عامہ مسلمین کے لیے اردو زبان میں ایسا مواد مہیا کیا جائے جو شیعی خدوخال کو واضح کر سکے۔

الحمدللہ کہ العلامۃ الحجۃ جناب مولانا محمد حسین صاحب دامت برکاتہ مصدر مدرس مدرسہ محمدیہ سرگودھا نے اس ضرورت کو محسوس فرمایا اور العلم العلیم الشیخ الاکرم ابوجعفر الصدوق رحمہ اللہ کی مشہور ومعروف کتاب اعتقادیہ شیخ صدوق کی اردو میں بسیط شرح لکھ کر عصر حاضر کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ حقیر نے اس کتاب مستطاب کو من الباب الی المحر ان دیکھا اور اس کے مطالب عالیہ سے مستفید وشرف یاب ہوا ہر بحث جامع ومانع اور ہر لحاظ سے مکمل ہے شارح ممدح نے ابتداء میں علم کلام کی تدوین وتاریخ پر ایک سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے اور شیعہ علماء متکلمین کا ایک مختصر ومجمل تعارف بھی تحریر کیا ہے اگرچہ دیباچہ میں تفصیلی حالات کی گنجائش پیدا نہیں کی جاسکتی تاہم بعض افراد کی علمی رفعت وجلالت کا تقاضا یہ ہے کہ آئندہ اشاعت میں جتنا اضافہ ان کے متعلق ہو سکے کر دیا جائے۔ خصوصاً حضرت استاذ الکل العالم المتکلم مولانا سید ظہور حسین الباہروی طاب ثراہ کے علمی وکلامی خدمات کا مزید تعارف کرایا جائے اور اس سلسلہ میں ان کے بسیط مولفات کا تذکرہ کیا جائے تا کہ ان کی عظیم خدمات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ بہرحال یہ دیباچہ مفید اور معلومات افزاء ہے اور چالیس صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب کا آغاز توحید باری سے ہوتا ہے توحید کے معنی ایکو احد ہستی کے اعتراف کے ہیں۔ اس لیے مصنف نے اثبات صانع عالم کے دلائل درج کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ ہستی باری کے اعتراف کا لازما عقیدہ توحید ہے اور عقیدہ کا لازمہ اعتراف ہستی باری ہے اور جن دلائل سے اثبات توحید ہوتا ہے انہی دلائل سے ہستی باری کا اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مگر شارح دام فضلہ نے صانع عالم کی ہستی کا ثبوت بدیہی ہے کہ عنوان

سے علماء متکلمین عرفاء و سالکین کے دلائل بھی سادہ واضح عبارت میں تحریر فرما دیے ہیں اور مادین دوہرین کے شکوک و شبہات کا ازالہ بھی فرما دیا ہے۔ علم کلام میں صفات باری کا مسئلہ بھی جولانگاہ افکار اور محل نزاح رہا ہے اس طرح کہ کوئی ذات وصفات میں تغایر کا قائل ہے اور کوئی ان دونوں میں مغایرت کا قائل نہیں ہے اور دنگی لاعین ولا غیر کا نقابل فہم عقیدہ رکھتا ہے۔ مولانائے مصوف نے اس مسئلہ کو بھی پوری وضاحت سے تحریر کیا ہے اور عینیت صفات پر عقل ونقل سے روشنی ڈالی ہے اسی طرح تمام اصول دین اور ان سے متعلقہ امور پر تفصیلی بحث فرمائی ہے اور ہر مسئلہ کو متعدد دلائل و براہین سے واضح کیا ہے خصوصاً غلو و تفویض کی رد احسن طریقہ سے کی گئی ہے اور خطبۃ البیان اور غالیوں کے دوسرے متمسکات کی پوری تردید فرمائی ہے غرض یہ کتاب شیعی عقائد کا آئینہ دار ہے اور مذہب حقہ کی صداقت کا شاہکار ہے ہر پڑھے لکھے شیعہ کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ وہ اپنے معتقدات کو بدلائل جان سکے اور دوسرے طالبان حق کے لیے بھی اس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ تلاش منزل میں یہ صحیفہ ان کے لیے شمع راہ ثابت ہو۔

خداوند عالم مصنف ممدوح کے توفیقیات میں ازدیاد فرمائے تاکہ وہ تدریسی منبری مشاغل کے ساتھ ساتھ تحریری مشاغل بھی جاری رکھ کر مذہب حق کی خدمت کرتے رہیں اور حامیان ملت بیضاء اور ناصران آل طٰہٰ میں محسوب ہوں۔

جزاہ اللّٰہ عنا خیر الجزاء فقد اجاء فیما افادواتی بما ھو فوق المراد (علامہ مفتی جعفر حسین گوجرانوالہ)

۵۔ مجاہد ملت ضیغم پاکستان مولانا مرزا احمد علی صاحب قبلہ مدظلہ تحریر فرماتے ہیں۔

حضرات اہل بیت علیہم السلام کے دامن مقدس سے متمسکین علماء و فقہاء میں سے جن بزرگواروں کے اسماء گرامی سرفہرست نظر آتے ہیں۔ ان میں حضرت صدوق علیہ الرحمہ کا اسم مبارک ہے جنہوں نے تقریر و تدریس و تحریر سے مذہب حق کی اشاعت میں حتی الامکان کوئی کسر اٹھا نہ رکھی آپ کی تصنیفات جلیلہ میں سے رسالہ اعتقادیہ مشہور ہے جس میں آپ نے قرن چہارم میں حقانی عقائد کو احسن اسلوب سے بیان کیا۔ مجھے تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ خاندان نبوت کے مبارک افراد کے ذریعہ ابتداء ہی میں ادھر افریقہ میں اسلام کی آواز پہنچ گئی اور ادھر ایران عراق و علاقہ پاکستان میں بھی حق کی آواز پہنچ گئی۔ اس کے بعد قرون وسطی میں پہلے تو حضرت قاضی نور اللہ شوستری اعلی اللہ مقامہ کو شہنشاہ اکبر نے لاہور میں مملکت مغل کا قاضی القضاۃ چیف جسٹس مقرر کیا۔ خلد آشیاں قضا کے علاوہ راتوں میں اعلی درجہ کی مذہبی کتابیں لکھتے رہے جن میں سے حقاق الحق اول درجہ کی کتاب ہے اور مجالس المومنین متمسکین کے کوائف میں ہے اشاعت حق ہی کی وجہ سے خلد آشیاں درجہ شہادت پر فائز ہوئے پھر ایک دور آیا جس میں بٹالہ کے ہمدانی سادات کا خاندان تمام لوگوں کے لیے مرکز تعلیم بنا پھر انقلابی دور میں ارسطو جاہ حضرت علامہ سید رجب علی شاہ صاحب بھاکری نے دین حق کی بڑی خدمت کی اور پاکستان کے سادات و مومنین کی بیداری آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ بھی آپ نے اپنے فرزند ارجمند حضرت شریف العلماء مولانا سید شریف حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ کو اپنا جانشین چھوڑا جنہوں نے جگروں ضلع لدھیانہ میں مختلف علوم کے درس جاری کیے اور وہاں سے سینکڑوں مستفید ہوئے ان میں سے استاذ العلماء حضرت مولانا سید محمد باقر صاحب قبلہ ابھی تک زندہ ہیں اور باوجود نابینائی کے خدمت دین کر رہے ہیں۔ انہیں کے تلامذہ نے پنجاب میں دینی علوم کی آبیاری کی اور کر رہے ہیں جن میں ایسی قابل قدر ہستیاں موجود ہیں جن جیسا علوم عربیہ کا مدارس بھارت و پاکستان میں نہیں ملتا موالیان اہل بیت کے دینی مدارس میں سے سرتاج دار العلوم محمدیہ سرگودھا ہے جس کی سرپرستی شروع ہی سے حضرات سادات عظام جہانیاں شاہ فرما رہے ہیں انہی کی سرزمین سے یہ دریا بہا نکلا۔ جس نے یہاں اور مرکز علوم نجف اشرف سے فیوض علوم پا کر دار العلوم

محمدیہ کو چار چاند لگا دیئے حضرت شیخ الجامعہ محمدیہ سرگودھا ان قابل قدر و لائق فخر وجودوں میں سے ہیں جن کے وجود ذیجود پر موالیان اہل بیت جتنا فخر کریں کم ہے آپ کے زیر سایہ کئی افاضل کرام جامعہ میں کام کر رہے ہیں اور آپ ان کے پرنسپل ہیں طلباء کی تعداد بہت کافی ہے حضرت شیخ الجامعہ نگرانی کے علاوہ خود بھی اہم علوم کے درس دیتے ہیں اور لطف یہ لطف یہ ہے کہ آپ صرف زبان مبارک ہی سے علوم عربیہ و دینیہ کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ ترویج و تبلیغ دین حق میں آپ کا دست مبارک بھی چلتا رہتا ہے اور دار العلوم محمدیہ کے ماہوار رسالہ المبلغ میں آپ کے علمی و تبلیغی شاہکار ہوتے رہتے ہیں اس پر مزید یہ ہے کہ اتنی مصروفیتوں کے باوجود آپ نے حال ہی میں مذکور الصدر ضخیم کتاب شائع کی ہے جس کا حجم ۵۲۰ صفحہ ہے۔ ابتداء میں ۸ صفحوں پر فہرست مضامین ہے ہر صفحہ میں قریباً ۵۸۴ الفاظ کل کتاب میں قریباً تین لاکھ ساڑھے چار ہزار الفاظ ہیں ترجمہ اعتقادیہ فاضل کامل جناب مولانا سید منظور حسین صاحب بخاری نے کیا ہے اور مکمل شرح کہف المومنین صدر المحققین سلطان المتکلمین زین المحدثین حجۃ الاسلام والمسلمین حضرت علامہ محمد حسین صاحب قبلہ مجتہد مدظلہ علی روس المومنین نے فرمائی ہے کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتاب کے مواد کو جمع کرنے اور کتاب کو تالیف کرنے میں اپنے آرام و راحت کو قربان کر کے اپنا کتنا قیمتی وقت صرف کیا ہوگا۔ اس چھوٹے سے رسالہ کی شرح میں آپ نے کتنا زور لگایا ہے کتنی دماغی قوت صرف کی ہے حقیقت ہے کہ اعتقادیہ کی شرح میں اتنی ضخیم شرح ایک ہزار سال میں بھی نہیں لکھی گئی۔

آپ نے اس شرح میں تمام مذہبی اصول پر سیر کن بحث کی ہے اور اصول اسلام و ایمان کو پرانے علوم ہی سے نہیں بلکہ موجودہ زمانہ کی نئی تحقیقات سے بھی موید فرمایا ہے اور اسلام کے اصول کو براہین عقلیہ و نقلیہ سے ایسا مضبوط و موکد کیا ہے کہ مصنف مزاج کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ زبان اردو کو بھی شاندار طریق سے استعمال کیا ہے اور یبوست مضامین کو دور کرنے کے لیے جا بجا موزوں اشعار کا انتخاب بھی موجود ہے اپنی قوم کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا اور دوسروں کو اپنی باتیں سمجھانے کے لیے جادلہم بالتی ھی احسن پر عمل کرتے ہوئے احسن طریق پر عمل کیا ہے کاغذ۔ کتابت طباعت دیدہ زیب ہیں۔ غرض کتاب اس شعر کی مصداق ہے۔

زسر تا پیا ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دال می کشد کی جا انجاست

مکتبہ ہمدانی دار العلوم محمدیہ بلاک ۱۹ سرگودھا نے اسے چھپوایا ہے ہدایہ قسم اول دس روپے قسم دوئم سات روپے ہے۔ ہم جلیل القدر مصنف علام کی خدمت میں اس بے نظیر تالیف و تصنیف کے لیے ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے علوم و فضل و عمل میں برکت دے اور ان کی زبان اور ان کے قلم سے اہل اسلام کو ہمیشہ متمتع کرے اور ان کو باقیات الصالحات عطا فرمائے۔ (آمین)

(اقل خدام دین مرزا احمد علی ۲۰ جولائی ۱۹۶۵ء)

۲۔ استاذ العلماء حضرت مولانا سید محمد یار شاہ صاحب قبلہ مدظلہ تحریر فرماتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○ عونک اللھم وتیسرک وصلی علی افضل الخلق مطلقا وعلی الاصفیاء من عترتہ اما بعد فانا طالعنا اکثر مقامات احسن الفوائد فوجدناہ کمتنہ کتابا قیما یوتضیہ العالم الاواہ المنیب ویمیل عند الغمر الجاھل المریب والذی فلق الجنتہ وبوء عالنسمتہ یعرض علی القاری خلاصتہ الاسلام کما ھو عن جانیہ بلا افراط و تضریط لا یحبہ الا مومن ولا یبغضہ الا

منافق جذی اللہ الشارح و دفقه لکل خیر وهو الفاضل الا المعی الوعی العالم الکیس الفقیه الشید محمد حسین الجهانیاں شاهی رئیس الاساتذه فی الکلیته المحمدیه سر گودها

خطبہ مسنونہ کے بعد ہم نے کتاب احسن الفوائد...... کے اکثر مقامات کا مطالعہ کیا ہے اور اسے تین عقائد شیخ صدوق کی طرح ایک گرانقدر کتاب پایا ہے جسے ہر عالم عامل پسند کرتا ہے اور جاہل مطلق ناپسند اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ کیا اور روح کو پیدا کیا ہے کہ یہ کتاب پڑھنے والے پر لاکم وکاست بانی اسلام کے حقیقی اسلام کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جسے پسند نہیں کرتا۔ مگر مومن اور ناپسند نہیں کرتا۔ مگر منافق خدا اس کے شارح فاضل المعی عالم عقیل فقیہ الشیخ محمد حسین جہانیاں شاہی کو جو کہ دار العلوم محمدیہ سرگودھا میں رئیس المدرسین ہیں۔ جزاء خیر دے اور ہر عمل خیر کے لیے انہیں موفق فرمائے۔

(السید محمد یار)

۷۔ امداد الملۃ حضرت مولانا سید امداد حسین صاحب قبلہ کاظمی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں۔

رئیس الفقہاء المحدثین صدوق الملۃ والدین سرکار علامہ الشیخ ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی اعلی اللہ مقامہ المتوفی ۳۸۱ ہجری کا جو مقام اور مرتبہ مذہب شیعہ اثناعشریہ کثرہم اللہ فی البریہ کے نزدیک ہے۔ وہ محتاج تعارف وبیان تھیں ان کی ذات بابرکات ہر قسم کی تعریف وتوصیف سے مستغنیٰ ہے۔ آپ متکلم لاثانی مناظر ربانی عالم اجل محقق بے بدل محدث بے عدیل فقیہ بے نظیر فاضل مقبول اور جامع معقول ومنقول گزرے ہیں یوں تو آپ قریباً تین سو کتابوں کے مصنف ہیں اور علم کلام میں بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں لیکن علم کلام میں آپ کی ایک تیف اعتقادیہ ہے جو اعتقادیہ شیخ صدوق کے نام سے مشہور ہے اسے آپ نے ۳۶۸ ہجری یعنی اپنی وفات حسرت آیات سے قریباً تیرہ سال قبل لکھا تھا جسے علماء ذوی الاحترام نے آج تک حرز جان بنائے رکھا کیوں کہ اس میں مذہب حقہ کے عقاید کا مکمل احصاء کیا گیا ہے۔ ہر دور میں اس کے مندرجات سے استفادہ کیا جاتا رہا۔ لیکن چونکہ یہ کتاب مستطاب عربی زبان میں ہے اور مجمل ہے اس لیے عام مومنین اس کے استفادہ سے کلیۃ محروم تھے اردو زبان میں اس کا صرف ایک ہی ترجمہ نظر حقیر سے گزرا ہے جو مولانا الحاج شیخ محمد اعجاز حسین بدایوانی اعلی اللہ مقامہ نے کہیں کہیں نہایت مختصر حواشی کے ساتھ کیا تھا جسے آپ کی وفات کے بعد مع عربی متن اب مکتبہ امامیہ اردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے اور اس سے قبل مطبع یوسفی دہلی میں چھپا تھا۔ اب اس کتاب کا ایک اور ترجمہ جناب مستطاب مستغنی عن الصفات مولانا مولوی السید منظور حسین صاحب بخاری مدظلہ العالی و دامت برکاتہم نے نہایت شستہ سلیس اور بامحاورہ اردو زبان میں کیا ہے یوں تو اس نادر روزگار کتاب کی بہت شرحیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اردو زبان میں کوئی شرح نہیں لکھی گئی اب جناب معلی الالقاب رئیس المتکلمین عمدۃ المحققین حضرت سرکار شریعتمد علامہ محمد حسین مدظلہ العالی علی روس اللوالی پرنسپل مدرسہ محمدیہ سرگودھا نے مولانا السید منظور حسین صاحب کے ترجمہ کے ساتھ اردو زبان میں اس کی ایک فصیح وبلیغ شرح الموسوم بہ در احسن الفوائد فی شرح العقاید تحریر فرما کر قوم شیعہ پر احسان عظیم کیا ہے۔ یہ شرح کیا ہے؟ علوم معقول ومنقول کا ایک بحر ذخار ہے اصل کتاب تو صرف ۴۵ الیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں مذہب اہل بیت کے ہر عقیدہ کا مختصر بیان ہے لیکن شارح علام نے اسے پانچ سو بیس صفحات اور تین سو کانوے عنوانوں پر ختم فرمایا ہے میں نے اس مجلۂ شریفہ اور عجاز حنفیہ کو بعض مقامات سے بنظر معاون دیکھا اور میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ مولانا ممدوح نے محنت شاقہ اور کاوش دماغی سے اسے چار چاند لگا دیے ہیں جس سے اصل کتاب کی

افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اس جامع کتاب میں جملہ شیعی معتقدات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ایسے ایسے چھوتے سندلال اور مباحثات درج کئے گئے ہیں جو فی زمانہ بڑے بڑے علماء کرام کے اذہان میں بھی مستحضر نہ ہوں گے الا ماشاء اللہ آخر میں ثقاہت وصداقت احادیث آئمہ علیہم السلام پر مدلل تبصرہ فرمایا ہے جو ان نئی روشنی کے دلدادوں کی آنکھیں کھولنے کو کافی ہوگا جو ایک عرصہ سے اخبارات میں شور مچا رہے ہیں کہ کتب مذہب شیعہ کی بے شمار احادیث بھی وضعی اور پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔

مولانا ممدوح نے حضرت علی علیہ السلام کی طرف منسوب خطبۃ البیان پر بھی محاکمہ فرمایا ہے اور اسی قسم کے دیگر شبہات بھی رد فرمائے ہیں۔ جو حضرت علی علیہ السلام کی ذات اور آپ کے مافوق العادت واقعات سے منسوب کیے گئے ہیں نیز غلو اور تفویض کی بھی تردید فرمائی ہے۔

کتاب مذکور کی صرف فہرست مضامین پورے چھ صفحات پر مشتمل ہے اور شروع کتاب میں علم کلام کی تدوین اور علمائے شیعہ کے عنوان سے ایک مفید مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ جس میں علم کلام کی تعریف اس کی فضیلت متکلمین کی فضیلت احادیث آئمہ علیہم السلام کی روشنی میں علم کلام کی تدوین اس پر شبہات اور ان کا ازالہ چند متکلمین مذہب شیعہ کے مختصر حالات اور ان کی بعض بعض تصانیف کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔

بہرحال یہ شرح ایک ایسی جامع کتاب ہے کہ ہر مومن مسلمان کو خواہ وہ عالم ہو یا معمولی اردو خواندہ اسے خرید کر حرز جان بنا چاہیے ورنہ بعد میں کف افسوس ملنا پڑے گا باوجود اس قدر خوبیوں اور عجوبہ روزگار ہونے کے قیمت نہایت قلیل رکھی گئی ہے تاکہ ہر شخص اس سے مستفید ہو سکے۔ یعنی قیمت درجہ اول دس روپے اور درجہ دوئم سات روپے۔ (السید انداز حسین الکاظمی المشہدی صدر ادارہ معاف اسلام لاہور الحال گجرات ۲۶ جنوری ۶۶ء)

۸۔ شمس الواعظین ادیب العظم حضرت مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ مدظلہ امروہوی اپنے مجلہ علیہ نور میں تحریر فرماتے ہیں احسن الفوائد فی اشرح القائد شارع جناب سرکار حجۃ الاسلام مولانا ومقتدنا علامہ محمد حسین صاحب قبلہ مجتہد العصر دامت فیوضہ پرنسپل دارالعلوم محمدیہ سرگودھا۔

صدوق علیہ الرحمہ نے شیعوں کے اصول عقائد میں یہ ایک مختصر مگر نہایت جامع رسالہ عربی زبان میں تحریر فرمایا تھا اس کے جملہ مسائل شرح طلب تھے خدا اجزائے خیر دے سرکار شریعتمدار علامہ محمد حسین صاحب قبلہ کو کہ انہوں نے غیر معمولی تحقیق وکاوش کے بعد رسالہ مذکور کی ایسی مبسوط اور مکمل شرح تحریر فرمائی کہ کوئی مسئلہ تشنہ تکمیل نہ رہا ارباب علم وفہم جانتے ہیں کہ علم کلام کے مسائل کس قدر دقیق وعمیق وپیچیدہ ہیں بالخصوص الہیات کے مسائل کو عقل وفہم کی ذرا سی لغزش انسان کو قعر ضلالت میں دھکیل دیتی ہے۔ سرکار علامہ نے کمال کیا ہے کہ ہر مسئلہ کو عقلی ونقلی روشنی میں ۴۵ ابواب کے اندر بے شمار تحتی سرخیوں کے ساتھ قریب الفہم مثالوں سے مستحکم دلائل وبراہین سے دل نشین توضیحات سے ایسے دل کش پیرایہ میں سمجھایا ہے کہ کسی صاحب عقل سلیم کو جائے دم زدن باقی نہیں رہتی ہر مسئلہ کے متعلق زندیقوں، ملحدوں، حکماء اور فلاسفہ کی طرف سے جو شبہات وارد کیے جاتے رہتے ہیں سرکار علامہ نے ہر شبہ کے جوابات نہایت تسلی بخش تحریر فرمائے ہیں۔ کتاب مذکور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شارح علام نے اس شرح کے لکھنے میں بہت سی متعلقہ کتابوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ترتیب مضامین میں ایک خاص سلیقہ سے کام لیا ہے افسوس ہے کہ نور کے صفحات میں زیادہ گنجائش نہیں ورنہ ہم ان تمام مسائل کو درج کرتے ہیں جن کا بیان اس کتاب میں ہے یہ کتاب ہر شیعہ کے گھر میں ہونی چاہیے کیونکہ ایسی ہی

چیزیں ہمارے لیے سرمایہ ایمان ہیں ایسے ضلالت آگین دور میں جب کہ مادہ پرستی اور دہریت نوازی نے روح اسلامی کو مضمحل بنا دیا ہے اور ہر چہار طرف سے اسلامی عقاید پر ڈاکہ پڑ رہا ہے۔ یگانے بیگانے بن رہے ہیں۔ مسلمان مغربی تہذیب کے پرستار بن کر اپنا ایمانی سرمایہ لادینیت کے کھوٹے سکوں سے فروخت کر رہے ہیں۔ ایسی کتابوں کے شائع ہونے کی بڑی ضرورت ہے۔ یہی وقت کی صحیح آواز ہے سرکار علامہ محمد حسین صاحب قبلہ مجتہد دامت فیوضہ ہمارے علماء کرام میں ایک بڑی ممتاز شخصیت کے مالک ہیں وہ اپنے پرزور قلم سے جس طرح نصرت دین مبین اور حمایت مذہب حقہ فرما رہے ہیں وہ قابل صد تحسین و آفرین ہے۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔

۹۔ بابائے صحافت ابوالبشیر حضرت مولانا سید عنایت علی شاہ صاحب مدظلہ اپنے جریدہ در نجف میں تحریر فرماتے ہیں احسن الفوائد فی شرح العقائد یہ ایک ساڑھے پانچ سو صفحات کی ضخیم کتاب زمانہ حال میں منصہ شہود پر لائی گئی ہے جسے دیکھ کر کارپردازان دارالعلوم مدرسہ محمدیہ سرگودھا کے عزم صمیم کا ثبوت ملتا ہے ہم نے اس کتاب مستطاب کا اول سے آخر تک کئی دنوں میں مطالعہ کیا ہے اور دیانتداری سے کہا جاتا ہے کہ ایسی جامع علمی کتاب دور حاضر میں شائع نہیں ہوئی۔

ہم اس پر مفصل تقریظ اس لیے نہیں لکھ سکے کہ کما حقہ تقریظ کے لیے بھی ایک کتاب کی ضرورت ہے اس جامع کتاب میں اسلامی معتقدات پر وہ استدلال عام فہم عبارات میں پیش کیے گئے ہیں کہ بڑے بڑے فلاسفروں ملحدوں اور دہریوں کو بھی لاجواب کر دیا ہے۔ کتاب ہذا کے عنادین کی فہرست بھی پورے چھ صفحات پر مشتمل ہے اس نادر روزگار کارنامہ پر آفرین و تحسین کے لیے بھی قلم میں پوری طاقت درکار ہے۔

آخر میں مسئلہ تحریف پر بھی نہایت معقول و مدلل بحث کی گئی ہے بہر حال کتاب احسن الفوائد کی حقیقت بیان کرنے کی بجائے صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ہر ایک مومن جو اپنے اعتقاد کے حصار کو مستحکم کرنا ہے یا اپنے مذہب و ایمان کے حقائق سے واقفیت کا خواہاں ہے ہماری سفارش سے ایک ایک جلد حاصل کرے اگر خدانخواستہ اسے معلومات عملیہ کا بیش بہا خزانہ محسوس نہ ہو تو ہم سے قیمت واپس لے سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ناقدری دنیا کا یہ عالم کہ جب کوئی کتاب ختم ہو جاتی ہے اور دس گنا قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہوتی تو دست تاسف مل مل کر حرمان نصیبی کا اظہار کیا جاتا ہے ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ احسن الفوائد کی موجودگی میں کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں پڑے گی ویسے بھی آپ کے کتب خانہ کی زینت ہو گی۔ آخر میں ہم حضرت گرامی منزلت سرکار عالی وقار مولانا الشیخ محمد حسین قبلہ پرنسپل مدرسہ محمدیہ سرگودھا کے قلم حقیقت رقم کی داد دیتے ہوئے ان کے اس علمی کارنمایاں پر مبارکباد عرض کرتے ہیں۔

۱۰۔ جریدہ فریدہ رضا کار لاہور کے تبصرہ نگار رقمطراز ہیں۔

احسن الفوائد شرح العقائد مصنف رسالہ سرکار صدوق العلماء حضرت شیخ ابوجعفر بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ مترجم عمدۃ المحققین مولانا سید منظور حسین شاہ بخاری شارح علامہ محمد حسین صاحب پرنسپل دارالعلوم محمدیہ سرگودھا ضخامت ۵۲۰ صفحات کاغذ سفید کتابت و طباعت پسندیدہ قیمت قسم اول دس روپے قسم دوئم سات روپے ملنے کا پتہ مکتبہ الہمدانی دارالعلوم محمدیہ سرگودھا۔

یہ کتاب حضرت شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ کے عربی رسالہ اعتقادیہ کی اردو شرح ہے۔ مترجم نے عربی متن بھی ساتھ دے دیا ہے۔ شروع میں پیش لفظ کے طور پر سرکار صدر المحققین علامہ محمد حسین صاحب پرنسپل دارالعلوم محمدیہ کا پرمغز مقالہ علم کلام کی تدوین اور علماء شیعہ کے خدمات کے عنوان سے شامل ہے علم کلام کی تعریف علم کلام کی فضیلت علم کلام کی بلاغت

فہرست مضامین احسن الفوائد

قطعہ تاریخ کتاب ہذا

نتیجۂ فکر:۔ شاعر اہل بیتؑ سید وزیر حسین صاحب وزیرؔ شیرازی ۔ سرگودھا

اب تک چھپی نہ ہوگی ایسی کتاب شاید
تفصیل سے ہوں جس میں شیعوں کے سب عقاید
جس سے وزیرؔ ہر اک کرتا ہو استفادہ
وہ مخزنِ ہدایت ہے احسن الفواید

۹۴ ھ ۱۳

باسمہ سبحانہ

سپاسِ بے قیاس

نہایت ناشکر گزاری ہوگی کہ اگر کتاب کی موجودہ طباعت کے سلسلہ میں جناب اخلاص مآب الحاج محمد مشتاق صاحب آف گوجرانوالہ حال وارد نیوپورٹ برطانیہ کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنہوں نے کتاب کی اس اشاعت میں کافی مالی تعاون کیا ہے۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء فی الدارین و شکر اللہ سعیھم فی الکونین بجاہ النبی و آلہ الطاہرین۔

احقر محمد حسین النجفی
مجتہد العصر والزمان مدظلہ
۲۰ مئی ۱۹۹۹ء

باسمہ سبحانہ

اظہار تشکر و امتنان

فرمان رسولؐ کے مطابق یہ ناشکر گزاری ہوگی کہ کتاب مستطاب احسن الفوائد فی شرح العقائد کی اس پانچویں طباعت کے سلسلہ میں پاشا قوم آف چکوال کے سربراہ جناب الحاج منظور حسین پاشا چکوال حال وارد کرالے (انگلینڈ) کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کے مخلصانہ تعاون سے یہ کتاب اس وقت زیب شکل و صورت میں ابناء ملت کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی اس سعی جمیل کو شرف قبول سے نوازے اور ان کو ان کی اولاد امجاد کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور توفیقات خیر میں اضافہ عطا فرمائے۔ بجاہ النبی و آلہ

مخلص دعاگو

دانا الاحقر محمد حسین النجفی

مجتہد العصر والزمان مدظلہ

باسمہ سبحانہٗ

آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

عموماً مصنّفین و مؤلفین کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی تصنیفات و تالیفات کو بعض بزرگ شخصیات کی طرف منسوب کرتے ہوئے ان کی خدمت میں ہدیہ کرکے اسے اپنے لئے سرمایۂ عزّ و افتخار سمجھتے ہیں۔ چونکہ میں اس سلسلہ میں سرکار ولیٔ عصر ناموس دہر آیۃ اللہ العظمیٰ حجۃ اللہ الکبریٰ صاحب العصر والزمان حضرت حجۃ بن الحسن عجل اللہ تعالیٰ فرجہ وسہل مخرجہ سے زیادہ موزوں و مناسب کسی اور شخصیت کو نہیں سمجھتا۔ اس لئے اپنی اس ناچیز کتاب کو انہی کی بارگاہ قدس میں پیش کرکے اسے شرفِ قبولیت بخشنے کی تمنا و آرزو رکھتا ہوں۔ ع

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

فاقول یا مولائی جئتك ببضاعة مزجاة فتفضّل علیّ بالقبول والاحسان

بحق ابائك الكرام علیك وعلیهم الصلوٰة والسلام۔ ع

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

انا الراجی رحمۃ رب الکونین

الاحقر محمد حسین عفی عنہ

۱۴ ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۹۶۵ء

بروز شنبہ

پیش لفظ

علم کلام کی تدوین اور علماء شیعہ کے خدمات

مندرجہ ذیل مضمون جس کا عنوان اُوپر مذکور ہے۔ آج سے چند سال قبل رسالہ علیہ المبلغ کے خصوصی نمبر محمدیہ جنتری میں شائع ہو کر قوم سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اب جب کہ ہماری کتاب "احسن الفوائد فی شرح العقائد" طبع ہو رہی ہے۔ ہم نے موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے اس مضمون کو بطور مقدمہ اس میں شامل کرنا انسب خیال کیا چنانچہ مفید اضافہ کے بعد قندِ مکرر سمجھ کر اسے درج کیا جا رہا ہے اور اس مضمون کے آخر میں حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ کے مختصر حالات اور ان کے رسالۂ اعتقادیہ کی اہمیت پر کچھ تبصرہ بھی کر دیا گیا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ حتی الامکان ہماری یہ علمی پیش کش ہر حیثیت سے مکمل و مختتم ہو۔ وما توفیقی الا باللہ۔

علم کلام کی تعریف

علم کلام وہ علم ہے کہ جس میں اعتقاداتِ حقہ ایمانیہ اور معارفِ اسلامیہ ربانیہ کا ادراک و براہینِ تفصیلیہ یقینیہ سے اثبات اور ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں۔ ان اعتقادات و معارف کا اصل الاصول مسئلۂ توحید ہے۔

علم کلام کی فضیلت عقلِ سلیم کی روشنی میں

ارباب دانش و بینش پر مخفی و مستور نہیں ہے کہ کسی علم کی رفعت و بلندی یا خست و پستی کا معیار و میزان اس علم کے موضوع کی شرافت یا خساست ہوتی ہے جس علم کا موضوع جس قدر عظیم و خطیر ہوگا اسی قدر وہ علم جلیل القدر و عظیم الشان ہوگا اور جس علم کا موضوع جس قدر خسیس و حقیر ہوگا اسی قدر وہ علم بے قدر و قیمت و خسیس ہوگا۔ بنا بریں چونکہ علم کلام کا موضوع ذاتِ باری و ما یتعلق بہ ہے ظاہر ہے کہ ذاتِ باری ہر شے سے اشرف و اعلیٰ اور افضل و ارفع ہے بلکہ باقی اشیاء کو اس ذاتِ ذوالجلال کے فضل و کمال کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ این التراب و ربّ الارباب تو جس علم کا موضوع یہ ذاتِ بابرکات ہو گی وہ علم یقیناً دیگر سب علوم و فنون سے اشرف و اعلیٰ ہوگا۔ کما لایخفیٰ۔

علم کلام و متکلمین کی فضیلت احادیث معصومین کی روشنی میں

اس علم کی عظمت و جلالت اور

اس کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر لوگوں کو اس کی طرف متوجّہ کرنے کے لئے حافظان دین وحامیان شرع متین حضرات آئمہ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے مختلف طرق واسالیب سے اس علم کی عظمت وجلالت لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی مسلسل کوشش فرمائی ہے۔ کبھی تو براہ راست اس علم کی شرافت و بزرگی بیان فرمائی اور کبھی اس علم کے علماء کی عظمتِ شان و رفعتِ مکان کا تذکرہ فرمایا۔ چنانچہ پہلے سلسلہ میں سرکار ختمی مرتبت صلعم فرماتے ہیں اوّل الدّین معرفۃ الجبار۔ دین کی اصل بنیاد معرفتِ باری ہے (کتاب توحید الشیخ الصدوق علیہ الرحمہ) اسی طرح حضرت امیر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں اوّل الدّین معرفتہ دینِ حق کی پہلی کڑی معرفتِ خالق ہے (نہج البلاغہ) ان حقائق سے ظاہر ہے کہ اس علم کو باقی سب علوم پر ترجیح و تقدیم حاصل ہے اور دوسرے سلسلہ میں حضرت معصومین علیہم السّلام نے اس علم کے علماء کی رفعت وعظمت بیان کرتے ہُوئے انہیں عباد و زہاد بلکہ دیگر سب علوم کے علماء و فضلاء پر افضلیّت و اشرفیت کی سند عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ معاویہ ابن عمار بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے دریافت کیا کہ آپ کے شیعوں میں سے ایک شخص ایسا ہے جو آپ کی فرمائشات و تعلیمات کو کثرت کے ساتھ نقل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ مخالفین کے دلوں میں مذہب حق کو جاگزین کرتا ہے اور کمزور شیعوں کے اعتقاد کو محکم و مضبوط۔ آیا وہ افضل ہے یا وہ عبادت گذار و زاہد شب زندہ دار جو اس سابقہ فضیلت سے محروم ہے۔ آں جناب نے فرمایا کہ وہ عالم جو مخالفین کا دفاع کرے اور ہمارے ضعیف الاعتقاد شیعوں کے اعتقاد کو محکم کرے وہ ایسے ہزار عابدوں سے بہتر و برتر ہے (اصُول کافی) اسی طرح انہی حضرات سے منقول ہے کہ:۔

علماء شیعتنا مرابطون فی الثغر الذی یلی ابلیس و عفاریتہ یمنعو نھم عن الخروج علیٰ ضعفاء شیعتنا وعن ان یتسلط علیھم ابلیس وشیعتہ النواصب الا فمن انتصب لذالک من شیعتنا کان افضل ممن جاھد الرّوم والترک و الخزد الف الف مرّۃ لانہ یدفع عن ادیان محبینا وذالک یدفع عن ابدانھم۔

فرمایا ہمارے شیعوں کے علماء اعلام اس سرحد پر ڈیرہ زن ہیں جو شیطان اور اس کے سرکش، اعوان و انصار سے ملتی ہے وہ شیاطین کو اور ان کے پیروکار خوارج و نواصب کو ہمارے کمزور شیعوں پر خروج کرنے اور ان پر مسلط ہونے سے روکتے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ ہمارے علماء شیعہ میں سے جو شخص اس مُہم کو سر کرنے کے لئے سینہ سپر ہو جائے وہ ترک و خزر کے کفار سے جہاد کرنے والوں سے ہزار ہزار مرتبہ افضل و اعلیٰ ہے کیونکہ یہ عالم دین ہمارے محبّوں کے دین کی حفاظت و حراست کرتا ہے اور وہ مجاہد ان کے بدنوں کی حفاظت کرتا ہے۔ پس جو فرق دین اور ابدان میں ہے وہی تفاوت ان کی محافظت کرنے والوں کے اجر و ثواب میں بھی ہے۔ اور جناب امام علی نقی علیہ السّلام سے مروی ہے۔ لولا من یبقی بعد غیبۃ قائمکم من العلماء الداعین الیہ و الدالین علیہ الذابین

عن دینہ بحجج اللہ والمنقذین لضعفاء عباد اللہ من شباک ابلیس ومردتہ ومن فخاخ
النواصب الذین یمسکون ازمۃ قلوب ضعفاء الشیعۃ کما یمسک السفینۃ سکانہا
لما یبقی احد الا ارتد عن دین اللہ اولئک ہم الافضلون عند اللہ عزّ وجل۔ فرمایا اگر قائم
آلِ محمدؐ کی غیبتِ کبریٰ کے بعد ایسے علمائے اعلام موجود نہ ہوتے جو آنجنابؑ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، اور
ان جناب کے وجودِ ذی جود کی دعوت دیتے اور راہبری کرتے ہیں اور ان کے دینِ حق سے دلائل ربانیہ کے ساتھ
مدافعت کرتے ہیں اور کمزور بندگانِ خدا کو شیاطین کے شکنجوں سے اور ان ناصبیوں اور خارجیوں جو کمزور شیعوں کے
دلوں کی باگ ڈور کو اس طرح پکڑتے ہیں جس طرح کشتی اپنے مدبرِ سفینہ کو دامِ تزویر سے نجات و چھٹکارا دلاتے ہیں تو ایک
آدمی بھی ایسا باقی نہ رہتا جو دینِ الٰہی سے مرتد اور برگشتہ نہ ہوجاتا۔ الپس اس دورِ پُرفتن و پُرآشوب میں جو کچھ دین و دنیا
موجود اور اسلام و ایمان کے کچھ آثار مشہود ہیں یہ سب ایسے علمائے اعلام و متکلمین اسلام کے وجودِ ذی جود کے برکات
ہیں اس لئے یہ حضرات خداوندِ عالم کے نزدیک سب لوگوں سے افضل ہیں (غنیۃ المرید، احتجاج طبرسی)
امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آں جنابؑ نے فرمایا کہ جس شخص کا مطمعِ نظر یہ ہو کہ اہلِ ایمان سے نصاب
خوارج کا دفاع کرے اور ان کے اور ان کے ناقص العیار مذہب کے نقائص و عیوب نکال کر انہیں ذلیل و خوار کرے
اور سرکارِ محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کے مذہبِ حق کی صداقت و حقانیت کو ثابت کرے تو خداوندِ عالم ملائکہ جنت کا
مطمعِ نظر اس کے لئے مکانات و قصور تعمیر کرنا قرار دے دیتا ہے اور اس کی ہر ہر دلیل و حجت کے عوض جو وہ مخالفین
پر قائم کرتا ہے۔ خداوندِ عالم جنت میں اس قدر ملائکہ کو اس کے مکانات و عمارات کی تعمیر میں لگا دیتا ہے جن کی تعداد
روئے زمین والے لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے اور طاقتور اتنے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک فرشتہ سب زمینوں اور
آسمانوں کو اٹھا سکتا ہے۔ پس ایسے عالمِ مجاہد کے لئے جنت میں اس قدر نعمات و محلات ہیں کہ لا یعرف قدرھا
الا ربّ العٰلمین کہ ان کی جلالت و منزلت کا صحیح اندازہ ربّ العالمین ہی لگا سکتا ہے (عماد الاسلام وغیرہ)
آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس قسم کی احادیثِ فضیلت بیان کرکے اپنے شیعوں اور نام لیواؤں کو علمِ کلام کی تحصیل
کی جو ترغیب و تحریص دلائی ہے اس سے خود ان سرچشمہ ہائے علم و معرفت کی اس علم کے ساتھ لگاؤ و وابستگی اور
اس کی ترویج و ترقی میں دلچسپی لینے کا قدرے اندازہ بھی ہوجاتا ہے۔

آئمہ اہلِ سنت کی مخالفت علمِ کلام

جس زمانہ میں حضرات معصومینؑ علم کلام کی ترویج و ترقی کے
لئے یہ مساعی جمیلہ فرما رہے تھے یہ ایسا دور تھا کہ اس میں آج
کل کے علم برداران علم کلام کے آئمہ و بزرگان کے اس سلسلہ میں سردمہری و جمود کا یہ عالم تھا کہ وہ اس علم کی تعلیم و تعلّم کی
حرمت کے فتوے صادر کر رہے تھے اور اس کے پڑھنے والوں کی ہر طرح توہین و تذلیل کرکے ان کی ہمتوں کو پست

کرنے میں مشغول تھے۔ اگر یقین نہ آئے تو جناب شبلی نعمانی کی کتاب علم الکلام حصہ اول ص۳۳ ملاحظہ کریں۔ وہ لکھتے ہیں "علم الکلام کے پیدا ہونے کے ساتھ محدثین اور ارباب ظاہر نے نہایت زور شور سے مخالفت کی۔ امام شافعی احمد بن حنبل۔ سفیان ثوری اور اکثر محدثین نے اس علم کو حرام بتایا۔ امام غزالی احیاء العلوم میں عقائد کے ذکر میں لکھتے ہیں والی التحریم ذھب الشافعی ومالک واحمد بن حنبل وسفیان وجمیع اھل الحدیث من السلف۔ امام شافعی کا قول تھا کہ اہل کلام کو درّے لگانے چاہئیں۔ امام احمد بن حنبل کہتے تھے کہ اہل کلام زندیق ہیں"۔ لیکن بایں ہمہ آئمہ اہل بیت علیہم السّلام جو کہ دین اسلام کے صحیح محافظ و نگہبان اور اس کی حفاظت و حراست کے طور و طریق سے کماحقہ واقف و آگاہ تھے وہ جہاں خود بھی تعلیم الٰہی اس علم کے سب سے بڑے عالم تھے وہاں وہ اس کی سرپرستی فرماتے ہوئے اپنے شیعوں کو بھی اس علم کا عالم بنانا چاہتے تھے اس لئے مختلف طریقوں سے اس کی طرف ترغیب و تحریص دلاتے رہتے جیسا کہ ابھی اوپر اس کا ایک شمہ بیان ہو چکا ہے اور اس کی کچھ تفصیل عنقریب آرہی ہے۔ فانتظر۔

ایک عظیم شبہ اور اس کا ازالہ

جہاں بیسیوں احادیث معتبرہ میں اس علم کی عظمت و جلالت اور اس کے علماء کی رفعت اور بلندی مرتبہ کا ذکر موجود ہے۔ وہاں ان کے بالمقابل چند ایک احادیث ایسی بھی مل جاتی ہیں جن سے بعض اصحاب قشر وارباب ظاہر علم کلام کی مذمت سمجھتے ہیں۔ ان احادیث میں سے ایک حدیث وہ ہے جو امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے۔ ویل لاصحاب الکلام یقولون ھذا ینقاد وھذا لاینقاد وھذا ینساق وھذا لاینساق وھذا نعقله وھذا لانعقله۔ فرمایا اصحاب کلام کے لئے افسوس ہے کہ (جو دینی مسائل میں موشگافیاں کرتے ہوئے) کہتے ہیں یہ مسئلہ صحیح ہے اور یہ غیر صحیح اور یہ (ہمارے قواعد کلامیہ پر) پورا اترتا ہے اور یہ نہیں اترتا۔ اور یہ ہم سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے (اصول کافی) نیز انہی معادن قدس و طہارت سے مروی ہے کہ فرمایا ھلک المتکلمون ونجی المسلمون اہل کلام ہالک اور تسلیم کرنے والے ناجی ہیں (ملخصاً) الی غیر ذالک من الاخبار۔ اس شبہ کا جواب باصواب کئی طرح دیا جا سکتا ہے۔

جواب اوّل۔ بموجب الاحادیث یفسر بعضھا بعضا کہ بعض احادیث دوسری بعض کی تفسیر و تشریح کرتی ہیں۔ خود انہی بزرگواروں کے کلام حق ترجمان میں ان مجمل احادیث کی توضیح و تشریح موجود ہے۔ وہ اس طرح کہ متکلمین دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ جو اپنے مدعا کے اثبات اور مد مقابل کے اسکات میں اس امر کی پروا نہیں کرتے کہ آیا ان کے ادلّہ و براہین معادن علم و یقین سے ماخوذ بھی ہیں یا نہیں؟ بلکہ جو کچھ غلط یا صحیح ان کے اذہان ناقصہ و آرائے کاسدہ میں ہے وہ ہی کہہ گزرتے ہیں۔ اور دوسرے ایسے متشرع اور متدین متکلم ہوتے ہیں

جو اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام اور ان کی اولاد اطہار علیہم السلام کے تعلیمات وارشادات سے سرِ مو تجاوز و تخلّف نہیں کرتے۔ حضرات معصومین نے ان دو گروہوں کے اختلافِ طبائع کے پیش نظر اوّل الذکر گروہ کی مذمّت اور ثانی الذکر حضرات کی مدح فرمائی ہے۔ اس تاویل کی شاہد وہ روایت ہے جو اصولِ کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی جو آپ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب کہ ایک شامی ان جناب کے اصحاب سے مناظرہ کرنے کے لئے آیا تو آپ نے جناب یونس بن عبدالرحمٰن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا یا یونس لو کنت تحسن الکلام۔ اے یونس کاش تم علمِ کلام میں مہارت رکھتے ہوتے اور آج اس شامی سے بحث کرتے۔ اس پر یونس نے عذر خواہی کرتے ہوئے عرض کیا کہ آقا میں نے اس لئے اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میں نے آپ کو اہلِ کلام کی مذمّت کرتے ہوئے سنا ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا انما قلت لھم ویل لھم ان ترکوا ما اقول وصاروا الی ما یریدون (اے یونس تجھے مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے) میں نے ان کی مذمّت اس صورت میں کی ہے کہ اگر وہ اسے ترک کردیں جو کچھ میں کہتا ہوں۔ اور وہ اپنی . . . . خود ساختہ دلیلوں سے کام لیں۔ (اصول کافی ص۹۹ طبع نولکشور)

پس معلوم ہوا کہ اگر اس علم کا سرچشمہ آئمہ ہدیٰ کو قرار دے کر انہیں سے فیض حاصل کیا جائے تو اس صورت میں نہ صرف یہ کہ یہ علم جائز۔ بلکہ مستحب بلکہ بعض حالات میں واجب ثابت ہوتا ہے۔ ہاں ان کی تعلیماتِ مقدسہ کو پسِ پشت ڈال کر اپنے قیاسی و اختراعی دلائل سے کام لینا جائز نہیں ہے۔ ورنہ ان تمام لوگوں کو ناجی تسلیم کرنا پڑے گا جو صراطِ مستقیم سے منحرف ہیں مگر وہ اپنی گمراہی کو اپنے قیاسات سے عین رشد و ہدایت تصور کرتے ہیں۔ ولا یقول بہ احد۔

جواب دوئم۔ متکلم دو طرح کے ہوتے ہیں کچھ فطرتاً ایسے کمزور واقع ہوتے ہیں کہ اگرچہ وہ حق کی تائید کرنا چاہیں لیکن وہ اس عہدہ برآ نہیں ہوسکتے بلکہ مخالف سے مغلوب و مقہور ہو کر بجائے حق کی نصرت و تائید کے الٹا اس کی توہین و تذلیل کا باعث بن جاتے ہیں۔ دوسرے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اس مہم سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں اور مخالفین کا ناطقہ باحسن وجہ بند کرسکتے ہیں۔ حضرات معصومین نے اول الذکر کو اس کی ممانعت فرمائی ہے اور ثانی الذکر کو اس کی ترغیب و تحریص دلائی ہے۔ اس کا ثبوت بھی کلامِ معصومؑ سے ملاحظہ ہو امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے بعض اصحاب کو کلام سے روکا اور بعض کو اس کا حکم دیا تو حاضرین میں سے بعض نے یہ استفسار کیا کہ مولا اس میں کیا راز ہے کہ آپ نے ایک کو کلام کی ممانعت فرمائی ہے اور دوسرے کو اس کا حکم دیا ہے۔ امامؑ عالیمقام نے فرمایا ھذا ابصر بالحجج وارفق منہ۔ کہ میں نے اس لئے اسے اجازت دی ہے کہ یہ ادلّہ قائم کرنے میں اس پہلے شخص سے زیادہ بابصیرت اور کلام کرنے میں زیادہ رفق و مدارات برتنے والا ہے۔ پس ان حقائق سے واضح ہوگیا کہ ان حضرات کی ممانعت فقط بعض مخصوص لوگوں کے لئے بعض مخصوص وجوہ کی بنا پر ہے نہ علی الاطلاق۔ کما لا

یخفی علی من لہ اذن فی العام بالکلام اس کے اہل کو تو یہاں تک اس طرف متوجہ فرمایا ہے کہ ارشاد فرمایا خاصموھم وبینوا لھم الھدی الذی انتم علیہ وبینوا لھم ضلالتھم وباھلوھم فی علی علیہ السلام۔ تم مخالفین سے مباحثہ کرو اور ان کے سامنے اپنی ہدایت وحقانیت کا بیان کرو جس پر تم ہو۔ اور ان کی ضلالت وگمراہی کو ان پر واضح کرو، اور علی علیہ السلام کے سلسلہ میں مباہلہ بھی کرنا پڑے تو کر گذرو۔ (کتاب العیون والمحاسن شیخ المفیدؒ)

جواب سوم ۔ آئمہ اطہار کے بعض اخبار وآثار سے واضح وآشکار ہوتا ہے کہ جس کلام وجدال کی ممانعت وقدح وارد ہوئی ہے اس سے مراد وہ کلام ہے جو بطریق غیر احسن ہو۔ اور جس کی مدح وثنا وارد ہوئی ہے اس سے مراد وہ جدال ہے جو بطریق احسن ہو چنانچہ امام حسن عسکری علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں یہ روایت پیش کی گئی کہ جناب رسولؐ خدا نے دین کے بارے میں جدال وکلام کرنے کی ممانعت فرمائی ہے یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا لم ینھہ مطلقا ولکن نھی عن الجدال التی ھی غیر احسن اما تسمعون قول اللہ ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن وقولہ تعالیٰ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔ الخ یعنی آں حضرتؐ نے علی الاطلاق جدال وکلام کی ممانعت نہیں فرمائی بلکہ اس جدال سے روکا ہے جو غیر احسن طریقہ پر ہو۔ کیا تم خداوند عالم کا یہ ارشاد نہیں سنتے ہو کہ اہل کتاب کے ساتھ جدال نہ کرو مگر احسن طریقہ سے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔ اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت دو۔ اور احسن طریقہ سے ساتھ کلام وجدال کرو۔ (احتجاج طبرسیؒ) اس سے معلوم ہوا کہ صرف جدال غیر احسن ممنوع ہے نہ جدال احسن بلکہ وہ تو شرعاً مرغوب ومطلوب ہے۔ وہو المقصود۔

علم کلام کی تدوین

اگرچہ علم کلام کے مخترع وموجد کے بارے میں لوگوں نے بہت اختلاف کیا ہے اور ہر شخص نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اس فضیلت کا تاج کسی شخص کے سر پر رکھا ہے بعض نے واصل ابن عطا کو اس شرف سے نوازا ہے (اوائل سیوطی) اور بعض نے ابو الہذیل علاف کو اس فضیلت کا تاج پہنایا ہے (الکلام شبلی) لیکن ہماری ناقص رائے ان سب حضرات سے مختلف ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ دیگر اسلامی علوم مثل فقہ وتفسیر واخلاق وغیرہ کی طرح اس جلیل القدر علم کا سر چشمہ بھی خود صاحب شریعت غرا ومبلغ قانون اسلام مدینۃ العلوم حضرت سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں۔ اگر کسی صاحب کو اس امر کی صداقت میں کچھ شک وشبہ ہو تو وہ آں حضرتؐ کے ان احتجاجات واستدلالات کو ملاحظہ کرے جو آں جناب نے مختلف مذاہب وادیان کے لوگوں کے سامنے پیش فرما کر ان کے مذاہب باطلہ کا ابطال اور مذہب اسلام کا اثبات بطریق احسن فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں

احتجاج طبرسیؒ اور رابع بحار الانوار کا مطالعہ ہی کافی ہے اور آں جناب کے بعد اس علم کی اہمیت و عظمت کے پیش نظر ان کے حقیقی جانشین حضرات آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین یکے بعد دیگرے اپنے اپنے دور میں بحسب تقاضائے ظروف زمان و مکان اس علم کی نشر و اشاعت فرماتے رہے اور اپنے مدرسہ الٰہیہ سے متعدد باکمال تلامذہ پیدا کر کے لوگوں کی رشد و ہدایت اور نجاح و فلاح کے لئے بہت کچھ سامان مہیا فرما دیا۔

اس سلسلہ میں حضرت امیر المؤمنین علیہ الصلوٰۃ والسلام مثل دیگر فضائل و فواضل کے دیگر سب معصومینؑ سے پیش پیش نظر آتے ہیں بلکہ صاحب اعیان الشیعہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے **ھو اول من سن ما یسمیٰ علم الکلام** آپ پہلے وہ بزرگ ہیں جنہوں نے علم کلام کی طرح ڈالی۔ صاحب اعیان الشیعہ اعلی اللہ مقامہ کی یہ رائے گرامی ہماری ناقص رائے سے کچھ تضاد و تباین نہیں رکھتی کیونکہ حضرت امیر علیہ السلام کو ہی اس علم جلیل کا موجد و مخترع تسلیم کر لیا جائے تو بھی مطلب وہ ہی ہے جو ہم نے عرض کیا کیونکہ آں جناب کا علم بھی تو مشکوٰۃ نبوت کے نور سے ہی مقتبس و مکتسب ہے۔ دروازے سے وہی کچھ ملتا ہے جو مکان کے اندر ہو۔ (انا مدینۃ العلم و علی بابھا) اس سلسلہ میں آں جناب کے وہ خطبات و احتجاجات جو آپ نے مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سامنے مختلف موضوعات پر بالعموم اور اپنی خلافت و وصایت کے اثبات اور اپنے مد مقابلین کے ادعائے خلافت کے ابطال میں ارشاد فرمائے ہیں۔ بالخصوص اس امر کا قطعی ثبوت ہیں۔ جناب ابو الائمۃ الطاہرین کی طرح ان کے بعد دیگر سب آئمہ دین بھی اس علم کی ترویج و ترقی میں برابر حصہ لیتے رہے ہیں خاص کر حضرات امامین ہمامین حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور پھر ان میں سے بھی حضرت صادقؑ نے اس سلسلہ میں وہ زریں خدمات انجام دی ہیں جو رہتی دنیا تک سنہری حروف سے لکھی جائیں گی اور ہمیشہ اہل علم و انصاف سے خراج تحسین و آفریں حاصل کرتی رہیں گی۔

حضرت صادق علیہ السلام کے علم کلام کو زیادہ ترقی دینے کے علل و اسباب

اس کی متعدد وجوہ ہیں۔

وجہ اول۔ چونکہ اس وقت حکومت بنی اُمیّہ کو زوال آ رہا تھا۔ اور حکومت بنی عباسیہ کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ اول الذکر اپنی حکومت کو بچانے اور ثانی الذکر اپنی حکومت کو بنانے کی تدابیر میں مشغول و منہمک تھے۔ اس طرح حضرات صادقین علیہما السلام کو اسلامی حقائق کے نشر و اشاعت اور بالخصوص علم کلام کی ترویج و ترقی کا اچھا موقع مل گیا۔

وجہ دوم۔ اب تک کلام کا کام صرف اسلامی عقائد و نظریات کا اثبات تھا لیکن جب حضرت صادق علیہ السلام کے عصر میں منصور دوانقی نے دنیا کی تمام زبانوں کی علمی و مذہبی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ کرانا شروع کیا تو ان کو پڑھ کر سینکڑوں مسلمانوں کے عقیدے متزلزل ہو گئے۔ اس لئے اس وقت علم کلام کے دوسرے شعبے کی طرح ڈالی گئی اور یہ دوسرا شعبہ علم کلام وہ تھا جو فلسفہ یونان کے مقابلہ کے لئے ایجاد ہوا۔ اس طرح علم کلام اگرچہ ابتدا میں ایک مختصر اور

سادہ سا علم تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں جن چیزوں کا اضافہ ہو گیا ان کے اعتبار سے اب علم کلام دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

۱۔ اسلامی عقائد کا اثبات۔

۲۔ فلسفہ ملاحدہ و دیگر مذاہب باطلہ کا رد۔ اندریں حالات چونکہ مسلمانوں کے عقائد میں تزلزل پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے ازالہ کے لئے حضرت صادق علیہ السلام نے اس طرف خاص توجہ مبذول فرمائی اور علم کلام کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔

وجہ سوم:۔ چونکہ اوائل اسلام فقط عربوں تک ہی محدود تھا جن کی طبیعتوں میں ایک قسم کا جمود و خمود پایا جاتا ہے لیکن جوں جوں اسلام کو زیادہ وسعت ہوئی اور ایرانی و یونانی اور تبتی وغیرہ اقوام اسلام کے حلقہ میں آنی شروع ہوئیں تو عقائد کے متعلق نقطہ آفرینیاں اور باریک بینیاں زیادہ شروع ہو گئیں۔ اس طرح اس علم کی اہمیت و عظمت اور بڑھ گئی اور عام و خاص اس کی اہمیت و افادیت کو ماننے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت صادق نے تعلیمات اسلامیہ کی نشر و اشاعت کے لئے جو مدرسہ عالیہ قائم کیا تھا جس میں اطراف و اکناف عالم سے آئے ہوئے تقریباً چار ہزار متعطشان علوم ربانیہ یعنی طلبہ علوم دینیہ کسب فیض کر کے اپنی تشنگی علم و معرفت کو بجھاتے تھے (از معتبر محقق حلی علیہ الرحمۃ ص طبع ایران) اس مدرسہ عالیہ سے جہاں اور اسلامی علوم و فنون مثل فقہ و حدیث و تفسیر اور اخلاق کے ہزاروں فضلاء فارغ التحصیل ہو کر نکلے وہاں اس نے بیسیوں باکمال متکلم بھی پیدا کئے۔ ان میں سے چند نمایاں شخصیات کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

ایضاح: مخفی نہ رہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں صرف انہی اصحاب و علماء کا اجمالی تذکرہ کیا ہے جنہوں نے صرف تقریر سے نہیں بلکہ بذریعہ تحریر بھی اس علم جلیل کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا۔ اسی طرح یہاں ان کی صرف انہی کتب کا تذکرہ کیا جائے گا جو انہوں نے اسی موضوع پر لکھی ہیں۔

بعض علمائے اعلام کا تعارف

۱۔ عیسیٰ بن روضہ:۔ جناب نجاشی نے اپنی کتاب رجال نجاشی ص۲ پر لکھا ہے **کان متکلماً جید الکلام وله کتاب فی الامامة**۔ کہ یہ بڑے بلند پایہ متکلم تھے۔ انہوں نے مسئلہ امامت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اگرچہ ابن ندیم نے اور بعض دیگر ارباب رجال نے یہ لکھا ہے کہ جناب علی ابن اسماعیل میثمی **اول من تکلم علی مذھب الامامیه و صنف کتاباً فی الامامة سماه بالکامل**۔ کہ یہ پہلے بزرگوار ہیں جنہوں نے مذہب امامیہ میں مسئلہ امامت پر کتاب لکھی جس کا نام انہوں نے کامل رکھا (فہرست ابن ندیم) لیکن صاحب اعیان الشیعہ نے اس میں اختلاف کرتے ہوئے جناب عیسیٰ بن روضہ کو پہلا مصنف قرار دیا ہے اور بظاہر انہی کی رائے گرامی صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ جناب میثمی پر متقدم ہیں کیونکہ یہ بزرگ منصور دوانقی کے عہد میں تھے۔ اور جناب میثمی ہارون و مامون کے دور میں۔ (متوفی اواسط قرن دوم)

۲۔ عبدالرحمٰن بن احمد العسکری:۔ جناب نجاشی نے اپنے رجال ص۱۴۲ طبع بمبئی پر ان کے متعلق لکھا ہے

متکلم من اصحابنا احسن ۔ یہ ہمارے حضراتِ شیعہ میں سے بڑے متکلم اور عمدہ مصنف ہیں انہوں نے امامت کے موضوع پر ایک کتاب بنام کامل تصنیف فرمائی۔ (قرن دوم)

۳۔ ابو جعفر محمد ابن علی المعروف بمومن طاق ۔ علم کلام کے بڑے ماہر تھے۔ ابن ندیم نے فہرست ص۲۵۰ پر ان کے متعلق لکھا ہے کہ کان متکلما حاذقاً کہ وہ بڑے ماہر اور حاذق متکلم تھے۔ انہوں نے اپنے مناظرات کی وجہ سے مخالفین پر قافیۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اسی لئے وہ ان کو مومن طاق کی بجائے شیطانِ طاق کہتے تھے سوادِ اعظم کے امامِ اعظم کے ساتھ مختلف موضوعات و مسائل پر ان کے بڑے دلچسپ مناظرات کتب سیر و تواریخ میں موجود ہیں بوجہ خوف طوالت ان سب کا بیان تو یہاں نہیں ہو سکتا۔ البتہ برادران ایمانی کے جلائے ایمان کی خاطر ان کا ایک مختصر سا مناظرہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مومن طاق کا ایک دلچسپ مناظرہ ایک مرتبہ امامِ اعظم نے ان سے طنزاً کہا کہ تم چونکہ رجعت کے قائل ہو۔ اس لئے مجھے پانچ سو دینار قرضہ دے دو۔ زمانۂ رجعت میں جب ہم واپس آئیں گے۔ اس وقت واپس لے لینا۔ مومن طاق نے برجستہ کہا کہ مجھے قرضہ دینے میں تو کوئی تامل نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ رجعت کے احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں دشمنانِ اہل بیت مسخ ہو کر اٹھیں گے۔ لہٰذا تم مجھے اس امر کا کوئی ضامن دے دو کہ جب تم اس وقت اٹھو گے تو انسان ہی ہو گے (مجالس المومنین) ابن ندیم نے ان کی آٹھ تصانیف کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کتاب الامامۃ۔ کتاب الرد علی المعتزلہ۔ کتاب الرد۔ علی المفوضہ کتاب الاستطاعۃ (متوفی اواسط قرون دوم)

۴۔ زرارہ ابن اعین ۔ جناب نجاشی نے ان کے متعلق لکھا ہے۔ شیخ اصحابنا فی زمانہ ومتقدمھم وکان قاریاً فقیھا متکلما شاعراً ادیباً ۔ یہ جناب اپنے زمانے میں ہمارے اصحاب شیعہ کے بزرگ اور فضل و کمال میں ان پر متقدم تھے اور وہ بیک وقت قاری، فقیہ، متکلم شاعر اور ادیب تھے جناب شیخ صدوق کا بیان ہے کہ انہوں نے ان کی ایک کتاب استطاعت و جبر کے مسئلہ پر دیکھی ہے (اواسط قرون دوم)

۵۔ حمران ابن اعین ۔ صاحب اعیان الشیعہ نے لکھا ہے کان معروفاً بعلم الکلام ۔ یہ بزرگوار علم کلام میں بہت مشہور و معروف تھے۔ انہوں نے امامت کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی (اواسط قرون دوم)

۶۔ ہشام ابن الحکم ۔ یہ وہی بزرگوار ہیں جن کے متعلق حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ لا تزال مویداً بروح القدس ما نصرتنا بلسانک کہ اے ہشام جب تک تم اپنی زبان سے ہماری نصرت کرتے رہو گے۔ روح القدس سے تمہاری تائید ہوتی رہے گی (اصول کافی) ابن ندیم نے ان کے متعلق لکھا ہے۔ کان حاذقاً بصناعۃ الکلام حاضر الجواب۔ کہ جناب ہشام علم کلام میں بہت حاذق و ماہر اور بڑے حاضر جواب

تھے۔ (فہرست ابن ندیم ص۲۵۰ طبع مصر)

انہوں نے مخالفین کے ساتھ سینکڑوں مناظرات کئے اور حضرت صادق علیہ السلام کی دعائے مبارک کا اثر تھا کہ ہمیشہ مخالفین کو پسپا کیا اور فتح و نصرت نے ان کے قدم چومے۔ ان کے سب مناظرات اور بالخصوص عمرو ابن عبیدہ بصری والا مناظرہ بہت مشہور اور کتاب اصول کافی وغیرہ میں مذکور ہے۔ قارئین کرام کی تواضع طبع کے لئے ہم ان کی حاضر جوابی کا یہاں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔

ہشام کی حاضر جوابی کا ایک عجیب واقعہ

دربار خلافت میں چونکہ جناب ہشام کے جرم تشیع کا عموماً تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ دربار ہارون عباسی میں تشریف رکھتے تھے کہ یحییٰ ابن خالد برمکی نے ان سے پوچھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت علیؑ و عباسؓ نے آں حضرتؐ کی وراثت میں جھگڑا کیا تھا اور ابوبکر کے پاس گئے تھے۔ ان دونوں میں سے حق پر کون تھا جناب ہشام کہتے ہیں کہ یہ سوال سن کر میں قدرے گھبرایا کہ اگر یہ کہتا ہوں کہ عباس حق پر تھے تو ایمان رخصت ہوتا ہے اور اگر یہ کہتا ہوں کہ علیؑ حق پر تھے تو جان جاتی ہے لیکن صادق علیہ السلام کی دعا کا اثر تھا کہ اس کا بہترین جواب فوراً میرے ذہن میں آگیا۔ میں نے یحییٰ سے کہا کہ جب جناب داؤد علیٰ نبینا و آلہٖ علیہ السلام کے پاس دو فرشتے جھگڑا لے کر آئے تھے جس کا تذکرہ قرآن مجید سورہ صٓ میں بالتفصیل مذکور ہے، تو بتایئے ان دونوں میں سے حق پر کون تھا اور باطل پر کون؟ یحییٰ نے کہا وہ تو فرشتے تھے دونوں حق پر تھے۔ ان کا آپس میں درحقیقت کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ وہ جناب داؤد کو ایک حکم پر تنبیہ کرنے آئے تھے۔ جناب ہشام کہتے ہیں کہ میں نے کہا بس بعینہٖ اسی طرح حضرت علیؑ و عباسؓ کا بھی درحقیقت آپس میں ہرگز کوئی جھگڑا نہ تھا وہ تو خلیفۂ اوّل کو وراثتِ پیغمبرؐ کا مسئلہ سمجھانے کے لئے آئے تھے۔ ہارون نے جناب ہشام کے اس جواب کو بہت پسند کیا اور یحییٰ برمکی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا (از مجالس المومنین وغیرہ)

ان جناب نے علم کلام میں متعدد کتب تصنیف فرمائیں جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتاب الامامت۔ کتاب الدلالات علی حدوث الاشیاء، کتاب الرد علی الزنادقہ۔ کتاب الرد علی اصحاب الاثنین۔ کتاب التوحید، کتاب الرد علی اہل الطبائع، کتاب الرد فی الجبر والقدر، کتاب المعتزلہ۔ کتاب الرد علی من قال بامامۃ المفضول۔ (اواخر قرن دوم)

۷۔ **ابوالحسن علی بن اسماعیل بن شعیب بن میثم التمار معروف بہ میثمی**۔ یہ بزرگوار جناب میثم التمار جو کہ حضرت امیر علیہ السلام کے اصحاب اخیار میں سے تھے کے پوتے ہیں ان کے متعلق ابن ندیم اور دیگر بعض علماء رجال مثل ابی علی حائری صاحب منتہی المقال نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اوّل من تکلم علی مذہب الامامیۃ و صنف کتاباً فی الامامۃ۔ کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے مذہب امامیہ کے مطابق علم کلام میں حصہ لیا اور امامت

کے موضوع پر کتاب لکھی۔

(منتہی المقال صفحہ ۲ و فہرست ابن ندیم صفحہ ۲۴۹ طبع مصر)

لیکن ان کی اوّلیت پر صاحب اعیان الشیعہ اعلی اللہ مقامہٗ نے جو ایراد کیا ہے۔ ہم اس کا تذکرہ جناب عیسیٰ بن روضہ کے حالات میں کر چکے ہیں۔ یہ جناب بڑے متکلم و مناظر تھے۔ ابو الہذیل علاف اور نظام وغیرہم کے ساتھ ان کے بڑے معرکۃ الآرا مناظرات کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہیں۔ ان کا فقط ایک مناظرہ جو انہوں نے ابو الہذیل علاف کے ساتھ کیا تھا قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

جناب میثمی کا ابو الہذیل کے ساتھ ایک عجیب مناظرہ۔ جناب میثمی نے ابو الہذیل سے پوچھا کیا یہ ٹھیک ہے کہ شیطان سب اچھے کاموں سے روکتا ہے اور سب بُرے کاموں کا حکم دیتا ہے؟ ابو الہذیل نے کہا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب اچھے کاموں سے روکے اور سب بُرے کاموں کا حکم دے۔ لیکن ان سب اچھے یا بُرے افعال کی معرفت نہ رکھتا ہو؟ (میثمی نے کہا)

نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا (ابو الہذیل نے جواب دیا)

تو اس سے ثابت ہوا کہ شیطان تمام اچھے اور بُرے افعال کا عالم ہے (میثمی نے کہا)

ہاں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے (ابو الہذیل نے جواب دیا)

کیا جسے تم اپنا امام سمجھتے ہو وہ تمام اُمورِ خیر و اُمورِ بد سے واقف ہے؟ (میثمی نے استفسار کیا)

نہیں وہ ان سب امور کے عالم نہیں (ابو الہذیل نے جواب دیا۔)

تو معلوم ہوا کہ شیطان ان سے زیادہ عالم ہے (میثمی نے کہا)

یہ سُن کر ابو الہذیل بہت شرمندہ ہوا اور خاموش ہو کر رہ گیا (از مجالس المومنین وغیرہ)

جناب میثمی کا دوسرا مناظرہ

دل چاہتا ہے کہ یہاں جناب میثمی کا ایک اور دلچسپ اور مفید مناظرہ بھی قارئین کرام کی جلاءِ ایمانی کی خاطر درج کر دیا جائے یہ جناب جیسا کہ اُوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ہارون و مامون عباسی کے عہد میں تھے اور ابو الہذیل کے معاصر۔ ملاحدہ اور مخالفین کے ساتھ آپ کے معرکۃ الآرا مناظرے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب حسن بن سہل (وزیر مامون) کے دربار میں گئے تھے حسن کے پاس ایک دہریہ بیٹھا ہوا تھا جناب میثمی نے سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔ حضرات! آج میں نے ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔ سب حاضرین نے دریافت کیا کیا دیکھا ہے؟ فرمایا ایک کشتی ہے جو کسی ملاح کے بغیر لوگوں کو دریائے دجلہ کے آر پار لے جا رہی ہے اور لا رہی ہے۔ دہریہ نے حسن بن سہل کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔ حضور! آپ اس شخص کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔ کیونکہ دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ عقل و شعور نہ رکھنے والی کشتی ملاح

سکے بغیر لوگوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لے جائے؟ جناب میثمی نے ملحد سے فرمایا جو بات میں نے بیان کی ہے یہ زیادہ تعجب خیز ہے یا وہ جس کے تم قائل ہو کہ آسمان سے بارش خود بخود برستی ہے الشمس وقمر خود بخود جاری وساری ہیں۔ اور یہ تمام نظام عالم بغیر کسی چلانے والے کے خود بخود چل رہا ہے۔ جناب میثمی کا کلام سن کر دہریہ مبہوت اور لاجواب ہوگیا۔

ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، کتاب الامامۃ اور کتاب الاستحقاق (قرن دوم)

خاندانِ نوبخت کا ایک ممتاز فرد

مذکورہ بالا حضرات کے بعد علم کلام کی خدمت کے سلسلہ میں خاندانِ نوبخت کا ذکر آتا ہے یہ خانوادہ ولایت اہل بیتؑ میں مشہور ومعروف ہے اور علم کلام میں انہوں نے جو زریں خدمات انجام دی ہیں ان کا اپنوں اور بیگانوں سب کو اقرار ہے۔ چنانچہ اپنوں میں سے صاحب ریاض نے اس خاندان کے متعلق لکھا ہے **بنو نوبخت طائفۃ معروفۃ من متکلمی الامامیۃ** " اور بیگانوں میں سے شبلی نعمانی صاحب نے اپنی کتاب علم الکلام صلک پر لکھا ہے: " علم کلام کی ترقی کے ذکر میں خاندانِ نوبخت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ فضل بن نوبخت ہارون الرشید کے خزانۃ الحکمۃ کا افسر تھا۔ اور فارسی زبان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ اسماعیل جو نوبخت کا پوتا تھا بہت بڑا عالم اور علم کلام کا ماہر تھا۔ اس کے ہاں ایک خاص مجلس مقرر ہوا کرتی تھی جہاں متکلمین جمع ہوا کرتے تھے اور مسائل کلام پر مباحثے کرتے تھے۔ علم کلام میں اس کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں سے ذیل کا تذکرہ ابن الندیم نے کیا ہے کتاب ابطال القیاس، نقض کتاب عبث الحکمت علی الراوندی۔ نقض التاج علی الراوندی۔ کتاب تثبیت الرسالۃ اسماعیل کا بھانجا حسن بن موسےٰ اس خاندان میں سب سے زیادہ نامور ہوا۔ ابن الندیم نے اس کی نسبت لکھا ہے کہ وہ متکلم بھی تھا اور فلاسفر بھی، فلسفۂ یونان کی بہت سی کتابیں اسی کے حکم اور اہتمام سے ترجمہ کی گئیں۔ ابوعثمان دمشقی اسحاق ثابت بن قرۃ جو مشہور مترجم گذرے ہیں۔ اس کے دربار میں ہمیشہ حاضر رہتے تھے۔ اس کی ایک تصنیف کا تذکرہ آگے آئے گا۔"

اس جلیل القدر خاندان میں بہت سے نامور متکلم گذرے ہیں جن کی تعداد صاحب اعیان الشیعہ نے تو ستائیس تک پہنچائی ہے۔ لیکن ان میں سے جو آسمانِ عظمت پر آفتاب بن کر چمکے وہ یہ ہیں۔

۸۔ **فضل بن نوبخت**۔ جن کا تذکرہ شبلی کے کلام میں ابھی اوپر ہو چکا ہے۔ (اواخر المائۃ الثانیہ)

۹۔ **فضل ابن شاذان**۔ جناب شیخ ابوعلی حائری نے اپنی کتاب منتہی المقال ص۲۴۲ پر ان کے متعلق لکھا ہے **وکان ثقۃ اجل اصحابنا الفقہاء والمتکلمین ولہ جلالۃ فی ھذہ الطائفۃ وھو فی قدرہ اشھر من ان نصفہ**"۔ جناب فضل بہت قابل وثوق اور ہمارے فقہا ومتکلمین میں بہت جلیل القدر تھے۔ اور وہ طائفہ امامیہ میں خاص عظمت وجلالت کے مالک ہیں۔ اور وہ اپنی قدر وعظمت کے لحاظ سے اس سے اشہر واعرف ہیں۔ کہ ہم ان کی کچھ تعریف وتوصیف کریں۔ شیخ نجاشی نے لکھا ہے کہ انہوں نے مذہب حق کی تائید ونصرت میں

ایک سو اسّی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے بہت سی کتابیں علمِ کلام میں ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب الرد علی اہل التعطیل، کتاب الرد علی الثنویہ کتاب الرجعۃ کتاب الرد علی الغالیہ۔ کتاب التوحید، کتاب الرد علی الفلاسفۃ، کتاب الفضائل فی الامامۃ (قرن سوم ۲۶۵ھ)

۱۰۔ جناب حسن بن موسیٰ نوبختی۔ ان کا تذکرہ بھی شبلی کے کلام میں آگیا ہے۔ ابنِ ندیم نے ان کی بہت سی کتب شمار کی ہیں جن میں سے یہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب الآراء والدیانات۔ کتاب الرد علی اصحاب التناسخ، کتاب الامامۃ وغیرہا (۳۱۰ ہجری)

۱۱۔ ابوسہل اسماعیل بن علی ابن اسحاق۔ شیخ طوسی نے فہرست اور نجاشی نے اپنے رجال میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ کان شیخ المتکلمین من اصحابنا ببغداد ووجههم۔ کہ وہ بغداد میں ہمارے علمائے متکلمین کے شیخ اور ان کے سردار تھے۔ اور ابن الندیم نے لکھا ہے۔ کان من کبار الشیعۃ وکان فاضلاً عالماً متکلماً (ص۲۵) وہ اکابر شیعہ میں سے تھے۔ ان کی ایک خاص مجلس ہوتی تھی جس میں علماء حاضر ہوتے تھے ابنِ ندیم نے ان کی متعدد تصانیف کا تذکرہ کیا ہے جن میں یہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب التنبیہ امامت میں کتاب الرد علی الغلاۃ۔ کتاب نقض رسالۃ الشافعی، کتاب حدوث العالم کتاب ابطال القیاس۔ باقی وہی ہیں جن کا تذکرہ شبلی نے بھی کیا ہے۔ جب شلمغانی نے دعوائے مہدویت کیا تو اس نے جناب اسماعیل کو بھی اپنی بیعت کا دعوت نامہ بھیجا اور اس میں اپنے معجزات دکھانے کا بھی تذکرہ کیا۔ جناب اسماعیل کے سر کے اگلے حصہ پر بال نہیں تھے۔ جب قاصد دعوت نامہ لایا تو جناب اسماعیل نے فرمایا ہمیں ان کے دیگر معجزات کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارا مہدی میرے سر کے بال ہی اگا دے تو میں اس پر ایمان لے آؤں گا۔ قاصد نے واپس جاکر شلمغانی کو یہ پیام دیا۔ شلمغانی نے ایسی چپ سادھی کہ پھر زندگی بھر ان سے خط و کتابت نہ کی۔ رجال نجاشی ص۲۱ (۳۱۱ ہجری)

۱۲۔ ابراہیم بن اسحاق بن ابی سہل نوبختی۔ یہ بزرگوار بھی علمِ کلام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے اس علم میں ایک جلیل القدر کتاب بنام "یاقوت" تصنیف فرمائی۔ جس کی شرح حضرت علامہ حلی علیہ الرحمہ نے لکھی ہے اور مقدمہ میں اس کے مصنف کی بہت تعریف و توصیف فرمائی ہے (قرن چہارم)

۱۳۔ محمد ابن عبدالرحمٰن بن قبہ رازی۔ یہ وہی بزرگوار ہیں جن کا کتب اصول فقہ کے مبحث اصل برائت میں بکثرت ذکر خیر آتا ہے۔ بڑے جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ ابنِ ندیم نے فہرست ص۲۵ پر ان کے متعلق لکھا ہے من متکلمی الشیعۃ وحذاقهم۔ یہ شیعوں کے بڑے حاذق اور ماہر علمائے متکلمین میں سے تھے۔ جناب نجاشی نے لکھا ہے یہ بزرگوار پہلے معتزلی تھے۔ بعد ازاں مذہب امامیہ قبول فرمایا۔ مزید برآں نجاشی نے ان کے متعلق لکھا ہے۔ متکلم

عظیم القدر۔ حسن العقیدہ (ص۲۶۵)

نجاشی اور ابن ندیم نے علم کلام میں ان کی چند کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جیسے کتاب الانصاف۔ کتاب الامامۃ۔ کتاب الرد علی الزیدیہ۔ کتاب المستثبت وغیرہا (متوفی اوائل قرن چہارم)

۱۴۔ ابوالحسین محمد ابن بشر سوسنجری۔ معروف بہ حمدانی منسوب بہ آل حمدان۔ پہلے معتزلی العقیدہ تھے۔ پھر مذہب شیعہ خیر البریہ اختیار کیا۔ اور اپنے سابق استاد ابوالقاسم بلخی کے نظریات فاسدہ کی تردید میں ایک کتاب بھی لکھی۔ جناب نجاشی نے ان کے متعلق لکھا ہے۔ متکلم جید الکلام کروہ علم کلام کے بڑے جید عالم تھے۔ ابن ندیم نے مسئلہ امامت میں انکی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ المقنع اور المنقذ۔ ان کے زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ ابن بطہ نے اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے کہ انہ حج علی قدمیہ خمسین حجۃ۔ کہ انہوں نے پیدل چل کر پچاس حج کئے۔ (اوائل قرن چہارم)

۱۵۔ حسن ابن ابی عقیل عمانی۔ مشہور عالم فقیہ و متکلم تھے اور حضرت ثقۃ الاسلام کلینی قدس سرہ کے معاصر تھے۔ اگرچہ ان پر فقہ غالب تھا اور انفعال آب قلیل وغیرہ۔ بعض مسائل فقہ میں مخصوص آراء رکھتے تھے لیکن علم کلام میں بھی صاحب تصنیف ہیں۔ چنانچہ اس علم میں ان کی ایک کتاب بنام الفر والکر کا تذکرہ ملتا ہے۔ (اوائل قرن چہارم)

۱۶۔ علی ابن حسین مسعودی۔ یہ بزرگوار علاوہ مورخ شہیر ہونے کے بڑے جلیل القدر متکلم بھی تھے۔ ان کی کتاب اثبات الوصیۃ موضوع امامت پر حال ہی میں نجف اشرف میں چھپی ہے۔ ان کے مذہب اور اس کتاب کے ان کی طرف انتساب کے بارہ میں اگرچہ قدرے اختلاف ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ کتاب ان ہی کی تالیف ہے۔ اور یہ بزرگوار شیعہ علمائے کبار میں سے ہیں۔ ولاقامۃ الدلائل محل آخر۔ علاوہ بریں علم کلام میں ان کی دو اور کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ (۱) کتاب الصفوۃ در مبحث امامت (۲) کتاب الاستبصار (۳۴۶ھ قرن چہارم)

۱۷۔ ابوجعفر محمد ابن جریر ابن رستم الطبری الآملی۔ علمائے امامیہ میں سے جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ اکثر کم علم لوگوں کو اشتباہ ہو جاتا ہے اور وہ محمد ابن جریر طبری صاحب تاریخ طبری و تفسیر ابن جریر کو یہی ابوجعفر ابن رستم آملی سمجھ بیٹھتے ہیں اور پھر صاحب تاریخ طبری کے تشیع کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور ان کی مشہور عالم تاریخ کو ناقابل اعتبار قرار دینے کی مذموم سعی کرتے ہیں اور اس اشتباہ کی وجہ بظاہر ان ہر دو حضرات کی کنیتوں اور ان کے اور ان کے والدین کے اسموں کا اشتراک ہے۔ کیونکہ دونوں کی کنیت ابوجعفر اسم محمد اور والد کا نام جریر ہے۔ ان کا باہمی امتیاز ان کے دادا کے نام سے ہوتا ہے۔ ہمارے ابن جریر کے دادا کا اسم گرامی رستم ہے اور ابن جریر سنی کے دادا کا نام یزید ہے۔ ان دونوں کو ایک سمجھنا جہالت یا تجاہل کی دلیل ہے۔ جناب ابوجعفر کی مسئلہ امامت پر مشہور تصنیف المسترشد فی الامامۃ ہے جو حال ہی میں نجف اشرف میں طبع ہوئی ہے (اواسط قرن چہارم)

۱۸۔ ابوالقاسم علی ابن احمد الکوفی۔ علمائے متکلمین میں سے بڑے جلیل القدر عالم تھے اور کثیر التصنیف والتالیف ان کی کتب میں سے زیادہ مشہور کتاب الاستغاثۃ فی بدع الثلاثۃ ہے جو ماضی قریب میں نجف اشرف میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مسئلہ امامت پر ایک کتاب بنام الاوصیاء بھی لکھی ہے یہ کہا جاتا ہے آخر میں ان کے مذہب میں کچھ اختلاط ہوگیا تھا۔ واللہ العالم (قرن چہارم ۳۵۲ھ)

۱۹۔ محمد ابن احمد ابن جنید اسکافی۔ بڑے جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ نجاشی نے ان کے متعلق لکھا ہے ثقۃ جلیل القدر، صنف فاکثر (متوفی ۳۸۱ھ) کہ ابن جنید بڑے ثقہ اور جلیل القدر عالم اور کثیر التصنیف مصنف تھے اگرچہ ان کی زیادہ شہرت فقہی اعتبار سے ہے اور وہ فقہ میں بعض مخصوص آراء بھی رکھتے ہیں لیکن علم کلام میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ ابن ابی الحدید معتزلی شرح نہج البلاغہ میں بہت مقامات پر ان کے مقالات کلامیہ کو نقل کرتا ہے ان کی کتب کلامیہ میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کا تذکرہ نجاشی نے کیا ہے۔ الشہب المحرقۃ، تبصرۃ العارف، نور الیقین اور ازالۃ الران۔ (قرن چہارم ۳۸۱ھ)

۲۰۔ ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی۔ یہ عالم ربانی و نور شعشعانی رئیس المحدثین اپنی علمی و عملی جلالت و شہرت کی بنا پر ہر قسم کی تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ اگرچہ ان کی زیادہ شہرت ایک عظیم الشان فقیہ اور جلیل القدر محدث ہونے کی حیثیت سے ہے۔ مگر بنظر غائر ان کے حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگوار تمام علوم متداولہ میں مہارت رکھتے تھے اور جدل و کلام میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت شہید ثالث اعلی اللہ مقامہ نے مجالس المومنین میں جناب رکن الدولہ دیلمی وغیرہ سے ان جناب کے بعض مکالمات علمیہ کلامیہ کو نقل فرمایا ہے۔ ہم یہاں بغرض افادۂ عام ان کے بعض مکالمات علمیہ درج کرتے ہیں۔

• جب حضرت شیخ صدوق کے فضل و کمال کی شہرت تمام اطراف و اکناف میں پھیل گئی تو بادشاہ رکن الدولہ آپ کی ملاقات کا مشتاق ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بڑے احترام و اہتمام سے حضرت شیخ قدس سرہ کو اپنے ہاں دعوت دی۔ جب آپ تشریف لائے تو ان کی بہت تعظیم و تکریم کی اور اپنے پہلو میں ان کو جگہ دی۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد اسی طرح سلسلۂ کلام کا آغاز ہوا۔

رکن الدولہ:۔ جناب شیخ اس بزم میں کچھ ایسے فضلا بھی موجود ہیں جو ان مخصوص اشخاص کے بارہ میں جن پر حضرات شیعہ طعن و تشنیع کیا کرتے ہیں، باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ طعن ضروری ہے اور بعض اسے غیر ضروری بلکہ ناجائز بتلاتے ہیں۔ آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے۔؟

شیخ صدوق:۔ اے بادشاہ خداوند عالم کا یہ قانون ہے کہ اس کے بالمقابل جو جھوٹے خدا ہیں، جب تک ان کی نفی نہ کی جائے وہ اپنی توحید کا اقرار قبول نہیں کرتا جیسا کہ کلمہ توحید لا الٰہ الا اللہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح اپنے نبی اعظم کی نبوت کا اقرار بھی اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک اس کے بالمقابل تمام جھوٹے مدعیان مثل مسیلمہ کذاب و اسود عنسی و سجاح وغیرہ کی نبوت باطلہ کا انکار نہ کیا جائے۔ اسی طرح وہ حضرت امیر المومنین کی امامت کا اقرار بھی ہرگز قبول نہیں کرتا جب تک غلط مدعیان و منصدیان خلافت سے بیزاری اختیار نہ کی جائے۔

رکن الدولہ۔ نے جناب شیخ کے جواب متین کو بہت پسند کیا اور مدح و ثنا کے بعد جناب شیخ سے التماس کیا کہ ہم ان لوگوں کا انجام معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ظلم و ستم سے مسند آرائے خلافت ہو گئے تھے۔

شیخ صدوق۔ سورۂ براۃ کے واقعہ نے اس امر کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ ان لوگوں کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے کوئی تعلق و واسطہ نہیں ہے اور یہ کہ حضرت علیؑ کی امامت آسمان سے نازل ہوئی ہے۔

رکن الدولہ۔ اس قصہ کی تفصیلات سے آگاہ فرمائیں۔

شیخ صدوق۔ تمام مخالف و موالف مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ جب سورۂ برائت نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے ابوبکر کو بلا کر فرمایا کہ اس سورہ کو مکہ میں جا کر کفار و مشرکین کے سامنے میری طرف سے علی الاعلان پڑھ کر سناؤ چنانچہ ابوبکر لے کر روانہ ہوئے۔ ابھی تھوڑا ہی راستہ طے کیا تھا کہ جبرئیل امین نازل ہوئے اور تحفہ درود و سلام کے بعد عرض کیا خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے لا یودی عنك الا انت او رجل منك۔ اس سورہ کی تبلیغ آپ خود کریں یا وہ شخص کرے جو آپ سے ہو۔ چنانچہ آں حضرتؐ نے حضرت امیر المومنین کو حکم دیا کہ جا کر ابوبکر سے سورۂ برائت لے لو اور خود موسم حج میں لوگوں کو پڑھ کر سناؤ۔ چنانچہ آں جناب نے تعمیل ارشاد کی اور اس وظیفۂ دینی کو انجام دیا (مزید تسکین کے لئے یہ کتب ملاحظہ ہوں۔ (در منثور ج ۳ صفحہ ۲۰۹۔ تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج ۲ صفحہ ۵۸۴ مسند امام احمد بن حنبل۔ ترمذی۔ دلائل بیہقی۔ مسند ابن ابی شیبہ۔ بخاری و مسلم وغیرہ از فلک النجاۃ ج ا صفحہ ۲۶۹)

پس اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ فلاں آں حضرتؐ سے نہ تھا اور جب آں حضرتؐ سے نہ ہوا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آں حضرتؐ کا پیروکار بھی نہ تھا کیونکہ ارشاد قدرت ہے من تبعنی فانه منی جو میری اتباع کرے گا وہ مجھ سے ہوگا اور جب آپ کا پیروکار نہ ہوا تو پیغمبر کی زبانی خدا و رسول کا دوست بھی نہ ہوگا کیونکہ ارشاد رب العزت ہے قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله ویغفر لکم ذنوبکم۔ ظاہر ہے کہ جب دوست خدا و رسول نہ ہو تو ان کا دشمن ہوگا۔ نتیجہ واضح ہے کہ محبت خدا و رسول ایمان اور ان کا بغض کفر ہے۔

اور اسی روایت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضرت علی پیغمبر اسلام میں سے ہیں اور اس روایت کے علاوہ اور بھی بکثرت روایات سے یہ امر ظاہر ہے جیسا کہ آیت مبارکہ افمن کان علی بینة من ربه ویتلوه شاهد

منہ کی تفسیر میں وارد ہے کہ شاہد منہ سے مُراد حضرت امیر المومنینؑ ہیں۔

اسی طرح جنگِ احد میں جب اکثر اصحاب راہِ فرار اختیار کر گئے اور حضرت علیؑ بڑی دلیری و دلجمعی سے داد شجاعت و حق نصرت ادا کر رہے تھے اور ہاتفِ غیبی لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذو الفقار کی ندا کر رہا تھا تو جناب جبریل نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ مواسات و ہمدردی اس کا نام جو علیؑ ادا کر رہے ہیں۔ آں حضرتؐ نے فرمایا بھلا علی کیونکر ایسا نہ کریں انہ منی وانا منہ اس وقت جبریل نے کہا وانا منکما اور میں آپ دونوں میں سے ہوں۔ (مدارج النبوت ج ۲ ص)

اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ جس شخص کو خداوندِ عالم قرآن مجید کی چند آیتیں لوگوں تک پہنچانے کا حق دار نہیں سمجھتا اسے امامت کبریٰ اور تمام قرآن کی تبلیغ کا اہل کیونکر سمجھ سکتا ہے۔؟

رکن الدولہ۔ جو کچھ آپ نے افادہ فرمایا ہے وہ بالکل واضح اور صحیح ہے۔ رکن الدولہ کے مقربین میں سے ایک شخص ابو القاسم نامی دربار میں موجود تھا۔ اس نے بادشاہ سے اجازت طلب کی کہ وہ حضرت شیخ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اجازت مل اور وہ اس طرح گویا ہوا۔

ابو القاسم۔ جناب شیخ! یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ اُمت ضلالت و گمراہی پر اجتماع کرے حالانکہ پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے **لا تجتمع امتی علی الضلالۃ** میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔

شیخ صدوق: اُمت لغتِ عرب میں بمعنی جماعت ہے اور جماعت کا کم از کم تین افراد کے مجموعہ پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ایک مرد و زن کے مجموعہ کو بھی جماعت کہا جاتا ہے اور خداوند عالم نے تو فقط ایک شخص کو بھی اُمت کہا ہے۔ چنانچہ اپنے خلیل ابراہیمؑ کے بارہ میں فرمایا ہے وکان ابراھیم امۃ قانتا للہ حنیفا لہٰذا بنا بر تسلیم صحتِ حدیث یہ ممکن ہے کہ اس سے حضرت علیؑ اور ان کے حقیقی پیروکار مراد ہوں۔

ابو القاسم: جو کچھ بھی ہو حدیث سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ اسے سوادِ اعظم کے معنی پر محمول کرنا چاہیے جو تعداد میں زیادہ ہیں۔

شیخ صدوق۔ ہم نے جہاں تک غور و فکر کیا ہے قرآن میں متعدد مقامات پر کثرت کی مذمت اور قلت کی مدح دیکھی ہے۔ ارشادِ قدرت ہے ولکن اکثرھم یجھلون ولکن اکثرھم فاسقون اکثر الناس لا یشکرون۔

الذین امنوا وعملوا الصالحات وقلیل ما ھم وقلیل من عبادی الشکور۔ وما امن معہ الا قلیل۔ نیز اس امر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خداوندِ عالم نے لفظِ اُمت حضرت موسےٰ کی قوم میں سے چند ہدایت یافتہ لوگوں پر اطلاق کیا ہے چنانچہ فرماتا ہے ومن قوم موسیٰ امۃ یھدون

بالحق وبہ یعدلون۔ اسی طرح ہمارے پیغمبر اسلام کی امت کے بعض افراد کے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ و ممن خلقنا امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون۔ حضرت شیخ کا مدلل ومکمل جواب باصواب سن کر ابوالقاسم خاموش ہو گیا (علاوہ بریں اگر لفظ "امت" کو عمومی معنیٰ پر بھی محمول کیا جائے تو بنا بر صحت حدیث مطلب یہ ہو گا کہ تمام امت کبھی ضلالت وگمراہی پر مجتمع نہ ہو گی لہٰذا اگر ایک یا دو فرد بھی مخالف ہو جائیں تو دیگر تمام افراد کی غلطی کا امکان باقی رہے گا اور متعلقہ مسئلہ میں تو بنا بر اتفاق فریقین حضرت علیؑ اور ان کے مخصوص اتباع بلکہ تمام بنی ہاشم مخالف تھے۔ جیسا کہ بخاری شریف ج ۳ ص ۔۔ طبع مجتبائی دہلی میں بھی تصریح موجود ہے۔ پھر رکن الدولہ نے سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہا!!

رکن الدولہ۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ آں حضرتؐ کی وفات کے بعد باوجود قرب عہد آپ کی امت میں سے بہت سے لوگ ارتداد کا شکار ہو جائیں۔

شیخ صدوق۔ اس میں کونسی بات محل تعجب ہے جب کہ خود خداوند عالم خبر دیتا ہے۔ وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔ محمدؐ نہیں ہیں مگر اللہ کے رسول ان سے پہلے بھی اللہ سبحانہ کے رسول گذر چکے ہیں، اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم اپنے پچھلے پاؤں (کفر کی طرف) پلٹ جاؤ گے؟

آں حضرتؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد کچھ لوگوں کا ارتداد قوم موسیٰ کے ارتداد سے زیادہ تعجب خیز نہیں ہے، جس کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ زندہ تھے۔ فقط تیس دن کا وعدہ کر کے کوہ طور پر گئے اور اس دوران حضرت ہارون کو اپنا جانشین بھی مقرر کر گئے تھے مگر بحکم ایزدی تیس کے بجائے چالیس دن کر دیئے گئے اور قوم صبر نہ کر سکی۔ حضرت ہارون روکتے رہ گئے مگر سامری نے ایک گوسالہ بنا کر لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ یہ تمہارا خدا ہے۔ اور لوگوں نے اس کی پرستش شروع کر دی اور حضرت ہارون کو اس قدر مجبور کر دیا کہ قریب تھا کہ ان کو شہید کر دیں۔ جیسا کہ خداوند عالم نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے یا بن ام ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی۔ پس جب ایک اولوالعزم نبی کی زندگی میں فقط چند روز کی غیبت کی وجہ سے لوگ گمراہ ہو سکتے۔ اس کے بعد اس کے نامزد خلیفہ کی مخالفت کر سکتے ہیں تو یہ اس امت کے لئے کیونکر ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی وفات کے بعد ان کے حقیقی خلیفہ کو چھوڑ کر گمراہی کے چاہ ضلالت میں جا گرے؟ رکن الدولہ نے حضرت شیخ کے جواب باصواب کو بہت پسند فرمایا۔ یہ مکالمہ بہت طویل ہے۔ حضرت شیخ نے اور بھی چند اہم اختلافی مسائل کو بڑی عمدگی کے ساتھ حل فرمایا ہے۔ بنظر اختصار ہم باقی ماندہ حصہ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ کی تصنیفات وتالیفات میں علم کلام کی بھی چند کتب کے نام ملتے ہیں جن میں سے بعض مطبوع وموجود ہیں۔ ۱۔ التوحید ۲۔ النبوۃ ۳۔ اثبات الوصیۃ لعلیؑ

(۴) اثبات النص علی الائمہ (۵) التقیہ (۶) الشوریٰ (۷) ابطال الغلو والتقصیر (۸) ابطال الاختیار واثبات النص (۹) اکمال الدین (۱۰) رسالہ اعتقادیہ۔ قرن چہارم ۳۸۵ھ

۲۱۔ اسماعیل ابن عباد۔ المعروف بالصاحب۔ مشہور و معروف فاضل جلیل اور جامع بین السعادتین الوزارۃ الدینویہ والجلالۃ العلمیہ تھے۔

علاوہ اپنی ادبی مہارتوں کے وہ علم کلام میں بھی خاص مقام رکھتے ہیں۔ علم کلام میں ان کی دو کتابوں کا نام ملتا ہے کتاب اسماء اللہ وصفاتہ اور کتاب الانوار و کتاب الدیانہ ہر دو امامت کے موضوع پر ہیں۔

۲۲۔ محمد ابن محمد الحارثی المعروف بالشیخ المفیدؒ۔ یہ بزرگوار اپنی عظمت، جلالت اور معروفیت و شہرت کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں اور بھلا اس شخص کی وصف ہو ہی کیونکر سکتی ہے جس کو امام زمانہ "الاخ الرشید" کے جلیل القدر خطاب سے مخاطب فرمائیں (احتجاج طبرسی) اور ان کی وفات حسرت آیات پر خود مرثیہ لکھیں (فوائد رضویہ ج ۲ ص) ابن ندیم نے ان کے متعلق لکھا ہے انتھت ریاسۃ متکلمی الشیعۃ الیہ شیخ کے دور میں شیعہ متکلمین کی ریاست آپ کے پاس تھی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی ریاست کو فقط علم کلام میں منحصر قرار دینا ان کی کسرِ شان کا موجب ہے۔ حق یہ ہے کہ وہ جناب اپنے عہد میں علی الاطلاق تمام علوم اسلامیہ میں رئیس کل تھے خواہ فقہ ہو اور خواہ حدیث، تفسیر ہو یا کلام علمائے مخالفین کے ساتھ انہوں نے بڑے بڑے مناظرات کر کے کلمۂ حق کو بلند کیا۔ مذہب حق کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں ان کا یہ دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں سن لیتے تھے کہ فلاں جگہ فلاں مذہب کا بہت بڑا عالم رہتا ہے تو باوجود اپنی عظمت و جلالت کے خود اس کے پاس تشریف لے جاتے اور اس سے مباحثہ کر کے وہاں شیعیت کے نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ آتے اگر خوفِ طوالت دامن گیر نہ ہوتا تو ہم کچھ واقعات ہدیۂ قارئین کرتے۔ ہاں محض اس خیال کے پیش نظر کہ ان کے افادات عالیہ سے ہمارے قارئین کرام کیسر محروم نہ رہ جائیں۔ ان کا ایک مختصر مگر معرکۃ الارا مناظرہ بیان درج کیا جاتا ہے۔

جناب شیخ مفید کا قاضی عبد الجبار کے ساتھ ایک عظیم الشان مناظرہ

جب جناب شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے قاضی عبد الجبار معتزلی کے متعلق سنا کہ وہ آسمان عظمت و شہرت پر مہر نیمروز کی طرح چمک رہا ہے۔ جناب شیخ نے حسب عادت اس کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لئے رختِ سفر باندھا اور بروز جمعہ قاضی صاحب کے پاس پہنچ گئے دیکھا کہ قاضی صاحب جامع مسجد میں ممبر پر جلوہ فگن ہیں اور مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے اور مختلف لوگ ان سے مختلف مسائل پوچھ رہے ہیں اور وہ ان کا جواب دے رہے ہیں۔ جناب شیخ بھی اسی جمعیت میں جا کر بیٹھ گئے اور جب فرصت میسر ہوئی تو اٹھ کر قاضی صاحب سے یوں

مخاطب ہوئے۔

حضرت شیخ۔ میں ایک مسافر آدمی ہوں۔ مجھے اجازت ہے کہ میں بھی ایک مسئلہ پوچھ لوں۔

قاضی۔ ہاں ضرور پوچھئے۔

شیخ مرحوم۔ آپ حدیث غدیر (من کنت مولاہ فہٰذا علی مولاہ) کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ آیا یہ حدیث صحیح ہے۔

قاضی۔ ہاں یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ۔ آپ لفظ "مولا" سے کیا معنے مراد لیتے ہیں۔

قاضی۔ اولیٰ بالتصرف!

شیخ۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے اور مولیٰ کے معنی بھی اولیٰ بالتصرف ہیں تو پھر آپ کے خلفاء کی خلافت کیا ہوئی؟

قاضی۔ حدیث غدیر اگرچہ صحیح ہے لیکن پھر بھی روایت ہے اور ہمارے خلفاء کی خلافت درایت ہے اور روایت درایت کا مقابلہ نہیں کرسکتی بلکہ درایت بہرحال روایت پر مقدم ہوتی ہے۔

شیخ۔ جناب شیخ نے بحث کا رخ بدلتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص امام برحق کے خلاف خروج کرے آپ اس کے متعلق کیا فتوے دیتے ہیں۔؟

قاضی۔ وہ کافر ہے اور پھر استدراک کرتے ہوئے کہا نہیں بلکہ فاسق ہے!

شیخ۔ آپ چوتھے مرتبے پر علیؑ کی خلافت و امامت کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

قاضی۔ یقیناً وہ امام المسلمین و خلیفہ رسولؐ رب العالمین تھے۔

شیخ۔ تو پھر آپ طلحہ و زبیر اور معاویہ و اُمّ المؤمنین عائشہ کے متعلق کیا فتوے صادر کرتے ہیں جنہوں نے علیؑ کے برخلاف خروج کیا اور بغاوت پھیلائی۔

قاضی۔ جنگ جمل اور صفین والوں نے بعد میں توبہ کر لی تھی۔

شیخ۔ قاضی صاحب! ان کا جنگ کرنا یہ درایت ہے اور توبہ کرنا روایت۔ اور آپ خود ابھی ابھی کہہ چکے ہیں کہ روایت جس قدر بھی معتبر ہو وہ درایت کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور درایت بہرحال روایت پر مقدم ہوتی ہے۔

قاضی۔ لاجواب ہو کر بولا۔ آپ کا نام کیا ہے؟۔

شیخ۔ میں آپ کا مخلص محمد ابن محمد حارثی ہوں۔

قاضی۔ انت المفید حقاً۔ آپ صحیح معنوں میں مفید ہیں یہ کہا اور اٹھ کر شیخ کے بغل گیر ہو گیا اور انہیں اپنی

جگہ پر پہنچایا (از مجالس المومنین وغیرہ)

حضرت شیخ مفید نے علم کلام میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جیسے الافصاح (در مسئلہ امامت) العیون والمحاسن۔ اوائل المقالات۔ شرح عقائد شیخ صدوق علیہ الرحمۃ وغیرہ۔ یہ سب کتابیں عراق وایران میں کئی بار چھپ کر دنیائے علم وفضل سے خراج آفرین وتحسین حاصل کرچکی ہیں۔ مخالفین جناب شیخ کے مناظرات اور ان کی خداداد قوتِ استدلال اور ان کے فضل وکمال سے کس قدر ہراساں ونالاں تھے؟ اس کا اندازہ مورخ ابن خلکان کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے جو اس نے حضرت شیخ کی وفات حسرت آیات کے متعلق لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔ لما مات شیعہ ثمانون الف رافضی واراح اللہ منہ النّاس۔ جب شیخ مفید کا انتقال ہوا تو اسی ہزار رافضیوں نے ان کے جنازہ کی تشییع کی۔ اور خدا نے لوگوں (اہل جماعت) کو ان سے راحت پہنچائی (از وفیات الاعیان) (قرن پنجم ۴۱۳ھ)

۲۳۔ علی بن الحسین الموسوی المعروف بالسید المرتضیٰ علم الہدیٰ۔ یہ عالم جلیل حضرت علامہ السید رضی جامع نہج البلاغہ کے بڑے بھائی اور حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ کے ارشد واکمل تلامذہ میں سے تھے وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے فاضل جلیل اور متکلم نبیل تھے۔ سرکار علامہ حلی نے اپنے خلاصۃ الرجال ص۵۳ میں ان کے متعلق لکھا ہے متوحد فی علوم کثیرۃ مجمع علی فضلہ متقدم فی علم الکلام والفقہ کہ جناب سید علوم کثیرہ (بالخصوص اصول فقہ وفقہ اور ادب وکلام) میں یگانہ تھے۔ اور ان کی عظمت وجلالت اور فضل وکمال پر سب کا اجماع واتفاق ہے۔ علم کلام میں ان کی کتاب "الشافی" جو کہ قاضی ابوبکر باقلانی کی کتاب المغنی کا کافی وشافی جواب ہے اور خود آج تک بے جواب ہے۔ نیز اسی موضوع پر ان کی دوسری کتاب الفصول المختارہ ہے جو کہ ان کے استاد وحید حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ کی کتاب العیون والمحاسن اور مجالس کا گویا ایک جامع خلاصہ ہے نجف اشرف، عراق میں دو مرتبہ چھپ چکی ہے۔

جناب شیخ مفیدؒ کے بعد ریاست امامیہ انہی کی طرف منتقل ہوئی تھی۔ علم وفضل کا یہ آفتاب ۴۳۶ھ میں غروب ہوا۔ (قرن پنجم ۴۳۶ھ)

۲۴۔ ابوالفتح شیخ محمد بن عثمان کراجکی۔ بڑے جلیل القدر عالم ومتکلم تھے۔ شیخ عباسی قمی مرحوم نے فوائد رضویہ ج۲ ص۵۶۳ پر ان کے ترجمہ میں ان الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر کیا۔ شیخ اجل اقدم اعلم فاضل متکلم فقیہ محدث ثقۃ جلیل القدر شیخ مشائخ طائفہ وتلمیذ شیخ مفید است الخ اس شیخ جلیل نے علاوہ دیگر علوم وفنون کے علم کلام میں بھی متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں من جملہ ان کے کتاب التعجب اور کتاب التفضیل ہر دو مسئلہ امامت میں ہیں اور کتاب کنز الفوائد تو ان کے فضل وکمال کا بہترین شاہکار ہے

جس میں انہوں نے مختلف موضوعات پر نہایت محققانہ بحثیں فرمائی ہیں (قرن پنجم ۴۴۶ھ)

۲۵۔ ابو یعلیٰ محمد ابن حسن ابن حمزہ جعفری ۔ یہ بزرگوار حضرت شیخ مفید کے داماد اور ان کے جانشین تھے ، اور فقہ و کلام میں بڑے ماہر تھے ۔ شیخ نجاشی نے اپنے رجال ص۲۸۹ پر ان کے متعلق فرمایا ہے ۔ متکلم و فقیہ قیم بالامرین جمیعاً ۔ ابو یعلیٰ فقہ و کلام دونوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے ۔ یہ عالم جلیل بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جو اکثر سوالوں کے جوابات پر مشتمل ہیں ۔ علم کلام میں بھی انہوں نے چند کتابیں لکھی ہیں من جملہ ان کے مندرجہ ذیل کتب ہیں جن کا ذکر جناب نجاشی نے کیا ہے المسئلة فی الرد علی الغلات الموجز فی التوحید مسئلة فی ایمان آباء النبی علیہ السلام وغیرہا (متوفی قرن پنجم ۴۶۳ھ)

۲۶۔ ابو جعفر محمد ابن الحسن الطوسی المعروف بشیخ الطائفہ ۔ یہ فخر الشیعہ و فخر الشریعہ اس سے کہیں اجل و ارفع ہیں کہ ان کی تعریف و توصیف میں کچھ قلم فرسائی کی جائے ۔ حضرت شیخ مفید اور جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ۔ کتب اربعہ میں سے دو کتابیں تہذیب الاحکام اور استبصار اسی بزرگوار کے فضل و کمال کا شاہکار ہیں ۔ اس جامع الفنون والعلوم عالم جلیل نے علاوہ دیگر علوم و فنون کے علم کلام میں بھی متعدد کتب تصنیف فرمائیں ۔ من جملہ ان کے مندرجہ ذیل کتب کا شیخ نجاشی نے ذکر فرمایا ہے ۔
کتاب المفصح فی الامامة المدخل الی علم الکلام ، تلخیص الشافی (یہ کتاب شافی مصنفہ جناب سید مرتضےٰ علم الہدیٰ کا جامع خلاصہ ہے اور مطبوعہ موجود ہے (قرن پنجم ۴۶۵ھ)

۲۷۔ صدوق علیہ الرحمۃ کے
نا عشر لکھی جو کہ مطبوع

موجود ہے ۔ (قرن پنجم ۔۔۔ھ)

۲۸۔ شیخ سدید الدین محمود ابن علی الحمصی الرازی الحلی ۔ مشہور عالم و متکلم ہیں ۔ مرحوم شیخ عباس قمی نے فوائد رضویہ ج ۲ ص۶۲۵ پر ان کے متعلق لکھا ہے علامہ متبحر متکلم ۔ اور علم کلام میں ان کی چند کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ من جملہ ان کے کتاب المنقذ من التقلید والمرشد الی التوحید ۔ کتاب التبیین والتنقیح فی التحسین والتقبیح وھدایة الھدایة ۔ یہ وہی بزرگوار ہیں کہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں مختلف مسائل پر ان کے احتجاجات و استدلالات کو نقل کر کے ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس سلسلے میں بہت ہی کھسیانے پن کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ جیسا کہ جواب دہی میں اس کی عادت ہے ۔ قاموس اللغت ج ۲ ص۲۹۹ میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ محمود بن علی الحمصی متکلم اخذ عنہ الامام فخر الدین الرازی محمود بن علی الحمصی اتنے عالم جلیل ہیں کہ امام فخر الدین رازی نے ان سے استفادہ کیا ہے ۔ (قرن ششم)

۲۹ - السید مرتضیٰ بن السید حسین الرازی - آپ بہت جلیل القدر عالم و فاضل تھے۔ علماء متاخرین مثل علامہ مجلسیؒ و مقدس اردبیلی و امثالہم اپنی کتب میں ان کی کتب سے حوالے لیتے ہیں۔ مشہور ہے کہ آپ جب حج بیت اللہ الحرام پر تشریف لے جا رہے تھے تو راستہ میں امام غزالی کی رفاقت کا اتفاق ہوا۔ اور ان کے درمیان حدیث غدیر پر گفتگو شروع ہوئی چنانچہ سید نے دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے اس حدیث کی صحت اور دلالت بر امامت امیرالمومنین غزالی پر ثابت کر دی۔ غزالی بے ساختہ کہہ اٹھا۔ انت علم الهدی۔ چنانچہ پھر ان کا یہ لقب مشہور ہوا لیکن یہ یاد رہے کہ یہ بزرگوار اور ہیں اور حضرت سید مرتضیٰ علم الہدیٰ برادر حضرت رضی شاگرد شیخ مفیدؒ اور بزرگ ہیں۔ جس سے متاثر ہو کر غزالی نے اپنا رسالہ سر العالمین لکھا جس میں اس حدیث کی صحت کا اقرار کرتے ہوئے غاصبین خلافت علویہ پر کڑی تنقید کی ہے۔ سید کی تبصرۃ العوام بہت نافع اور سود مند کتاب ہے۔ (قرن ششم)

۳۰ - ابوالمکارم السید حمزہ بن علی بن زہرہ حسینی معروف بہ سید ابن زہرہ :- یہ سید بزرگوار بہت جلیل القدر عالم فاضل اور متکلم تھے۔ جناب ابن زہرہ کا تمام خانوادہ ہی ایک علمی خاندان ہے۔ چنانچہ ان کے والد ماجد جناب السید علی اور جد امجد جناب ابوالمحسن اور برادر معظم ابوالقاسم سید عبداللہ اور بھتیجہ جناب سید محمد بن عبداللہ۔ اسی طرح ان کے دیگر تمام اعمام اور بنی عم علماء و فضلاء تھے۔ انہوں نے دیگر اسلامی علوم کے علاوہ علم کلام میں بھی چند کتب لکھیں۔ جیسے قبس الانوار فی نصرۃ العترۃ الاخیار، رسالہ در اعتقاد امامیہ وغیرہ۔ (قرن ششم ۵۸۵ھ)

۳۱ - قطب الدین راوندی - آپ کا اسم گرامی سعد بن ہبۃ اللہ ہے۔ آپ بلند پایہ عالم و فاضل اور جامع الفنون تھے۔ آپ نے مختلف علوم و فنون میں متعدد کتب نافعہ رائقہ تصنیف و تالیف فرمائیں جن میں سے دو چار علم کلام میں بھی ہیں۔ ۱۔ جواہر الکلام ۲۔ ایقاظ المجتنی البرہان علی الرجعہ۔ ۳۔ زہر المباحثہ وغیرہ۔ قرن ششم ۵۷۳ھ۔

۳۲ - نصیر الدین محمد ابن محمد الطوسی معروف بہ محقق طوسی - یہ بزرگوار صرف فیلسوف اور متکلم ہی نہیں۔ بلکہ افضل الحکماء والمتکلمین، سلطان العلماء والمحققین، علامۃ البشر العقل الحادی عشر ہیں (فوائد رضویہ) یہ وہی بزرگوار ہیں کہ جب کتب فلسفہ و کلام میں ان کا نام آ جائے تو علمائے فریقین کی گردنیں جھک جاتی ہیں ان کی جلالت قدر اور عظمت شان میں سب مخالف و موالف رطب اللسان نظر آتے ہیں اس جامع المعقول والمنقول عالم جلیل نے علاوہ دیگر علوم و فنون کے علم کلام میں بھی متعدد کتب تصنیف فرمائیں جن میں سے تجرید سب سے زیادہ مشہور ہے اور یہ وہی کتاب ہے جس کی علمائے فریقین نے اب تک بیسیوں شروح لکھی ہیں۔ اور ہنوز سلسلہ جاری ہے دوسری کتاب "قواعد العقائد" ہے۔ تیسرا رسالہ "الجبر والاختیار" ہے۔ علاوہ بریں کتاب شرح اشارات و اخلاق ناصری و شرح محصل و اوصاف الاشراف بھی اسی بحر بے کنار کے جواہر آبدار ہیں۔ یہ بزرگوار اخلاق حسنہ میں اپنے آئمہ

کرام علیہم السلام کے اخلاق جمیلہ کا صحیح نمونہ تھے۔

جناب محقق طوسی علیہ الرحمۃ کے خلق جمیل کا ایک عجیب واقعہ

ایک دفعہ کسی گستاخ نے ان کو ایک خط لکھا جس میں اس نے ان کو گویا کلب ابن کلب (معاذ اللہ) کہہ کے خطاب کیا جس کے جواب میں جناب محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے اس کو لکھا اے عزیز تو نے جو مجھے کلب کہا ہے۔ اس میں تجھے اشتباہ ہوا ہے۔ کیونکہ کتے کے خواص و فصول میرے خواص و فصول سے جدا ہیں۔ وہ چار ٹانگوں پر چلتا ہے مگر میں دو پر چلتا ہوں۔ اس کے ناخن لمبے لمبے ہوتے ہیں اور میرے چوڑے ہیں اس کی جلد بالوں سے ڈھکی رہتی ہے اور میرے جسم پر اتنے بال نہیں۔ وہ بھونکنے والا حیوان ہے اور میں بولنے والا انسان ہوں۔ اسی طرح کلب اور اپنے امتیازی خواص بیان کر کے اسے خط بھیج دیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ وہ گستاخ عرقِ انفعال میں غرق ہو گیا اور معافی مانگنے پر مجبور ہوا۔ (فوائد رضویہ ج ۲ ص ۶۰۳) دعا ہے کہ خداوند عالم تمام اہل ایمان کو بالعموم اور ان میں سے اہل علم حضرات کو بالخصوص محقق طوسی کی طرح اپنے آئمہ کرام علیہم السلام کی تقلید و تاسی کی توفیق مرحمت فرمائے۔ فضل و کمال کا یہ مہر نیمروز قرن ہفتم ۶۷۲ھ میں غروب ہوا۔۔ اور کاظمین میں امامین کی جانب سر مدفون ہوا۔ (قرن ہفتم)

۳۳۔ شیخ علی ابن سلیمان البحرینی۔ بڑے جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ انہوں نے علم کلام میں ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام اشارات ہے (قرن ہفتم)

۳۴۔ السید رضی الدین ابو القاسم علی بن موسیٰ بن جعفر بن طاؤس معروف بسید بن طاؤس۔ اس سید اجل ازہد۔ اعبد اور قدوۃ العارفین و مصباح المتہجدین صاحب کرامات باہرہ و مناقب فاخرہ کی مدح و ثنا سے قلم اور زبان عاجز و حیران ہے۔ علی بن حمزہ شاعر نے ان جناب کے حق میں کیا خوب کہا ہے ؎

فہذا علیٌّ بن موسیٰ بن جعفرٍ — شبیہ علیٍّ بن موسیٰ بن جعفرٍ

سرکار علامہ حلی نے اپنی کتاب منہاج الصلاح میں ان جناب کے بارے میں لکھا ہے وکان اعبد من رأینا من اہل زمانہ۔ یہ بزرگوار اپنے دور میں ان تمام لوگوں سے بڑے عابد و زاہد تھے جن کو ہم نے دیکھا ہے۔ سادات بنی طاؤس سب کے سب فضلاء و اتقیاء تھے۔ چنانچہ حضرت سید کے برادر معظم جمال الدین السید احمد بن موسیٰ بن جعفر بھی بڑے عابد و زاہد اور عالم و فاضل اور قریباً اسی کتب کے مصنف و مولف تھے۔ اسی طرح ان کے بھتیجے غیاث الدین السید عبد الکریم بن السید احمد (مذکور) صاحب فرحۃ الغری بھی عالم و فاضل تھے۔ اسی طرح سید صاحب کے دو فرزند ارجمند جناب السید محمد اور جناب سید علی بھی فضلاء و اتقیاء میں سے تھے ؎

سدتم الناس بالتقی وسواکم — سودتہ البیضاء والصفراء

مختلف عنادین پر سیدؒ نے بیسیوں کتب جلیلہ نافعہ لکھیں۔ ان میں سے چند علم کلام کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں (۱) طرائف در مذہب طوائف (۲) کشف المحجۃ لثمرۃ المہجۃ (۳) سعد السعود (۴) کتاب الاختصاص (۵) طرف وغیرہا۔ زہد و تقویٰ اور علم و فضل کا یہ آفتاب عالمتاب ۵ ذی القعدہ ۶۶۴ھ میں غروب ہوا۔ (قرن ہفتم)

۳۵۔ میثم ابن علی البحرینی :- بہت بلند پایہ متکلم و فیلسوف تھے۔ انہوں نے علم کلام میں متعدد کتب تصنیف فرمائیں جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شرح اشارات (جو ان کے استاد محترم شیخ علی ابن سلیمان البحرینی کی کتاب اشارات کی شرح ہے) قواعد، النجاۃ فی القیامۃ فی امر الامامۃ۔ استقصاء النظر فی امامۃ الائمۃ الاثنا عشر شرح نہج البلاغہ معروف بشرح ابن میثم بحرانی بھی ان کے فضل و کمال کا بہترین شاہکار ہے۔ یہ عالم جلیل علاوہ متکلم و فیلسوف ہونے کے علوم ادبیہ میں بھی خاص مقام رکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار آبدار ان ہی کی جودت طبع کا نتیجہ ہیں۔

طلبت فنون العلم ابغی بہا العلیٰ   فقصر عما سموت بہ القل

میں نے مختلف علوم طلب کئے اور میری غرض یہ تھی کہ سر بلندی حاصل کروں لیکن میرے ارادہ میں میری قلت مال حائل ہو گئی۔

تبین لی ان المحاسن کلہا   فروع و ان المال ہو الاصل

تلخ تجربات کے بعد مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ جس قدر خوبیاں ہیں وہ سب فرع ہیں اور مال ان کی اصل ہے ان اشعار کے متعلق ان کے اور علمائے نجف کے درمیان ایک عجیب و غریب واقعہ بھی رونما ہوا جسے بوجہ خوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ شائقین کتاب مجالس المومنین اور لؤلؤۃ البحرین کی طرف رجوع فرمائیں۔

(قرن ہفتم)

۳۶۔ حسن ابن داؤد حلی :- صاحب رجال مشہور۔ انہوں نے علم کلام میں دو منظوم کتابیں تصنیف فرمائیں۔

الدر الثمین فی اصول الدین۔ الخریدۃ العذراء فی العقیدۃ الغراء

(اواخر قرن ہفتم یا اوائل قرن ہشتم)

۳۷۔ حسن ابن یوسف المعروف بعلامہ حلی - یہ وہی علامہ حلی ہیں کہ جن کے فضل و کمال اور عظمت و جلال کے تذکروں سے شرق و غرب اور بر و بحر چھلک رہے ہیں اگرچہ ان کی زیادہ تر شہرت اصول فقہ اور فقہ میں ہے لیکن چونکہ یہ بحر العلوم اور جامع المعقول والمنقول تھے۔ اس لئے انہوں نے دوسرے علوم و فنون کی طرح علم کلام میں بھی متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جیسے شرح تجرید الکلام جو ان کے استاد علامہ حضرت محقق طوسی علیہ الرحمہ کی کتاب تجرید کی مختصر مگر بہت مفید شرح ہے اور اکثر مدارس دینیہ میں داخل نصاب ہے (۲) منہاج الکرامۃ یہ وہی کتاب ہے جس کے رد میں ابن تیمیہ حرانی نے ایک کتاب بنام منہاج السنۃ لکھی اور پھر شیعیان حیدر کرار کی طرف سے جناب علامہ

سید مہدی قزوینی البصری نے کتاب منہاج الشریعہ لکھ کر ہمیشہ کے لیے مخالفین کا ناطقہ بند کر دیا (۳) نہج الحق یہ وہی کتاب ہے جس کا جواب فضل ابن روزبہان مشہور فاضل سنی نے بنام "ابطال الباطل" لکھا جس کے جواب میں العالم السری حضرت قاضی نور اللہ شوستری معروف بہ شہید ثالث علیہ الرحمہ نے قلم اٹھایا اور "احقاق الحق" نامی مشہور عالم کتاب لکھی اور کچھ اس انداز سے مدلل جواب لکھا گویا کہ مخالفین کی رگ حیات کو کاٹ دیا کہ پھر انہیں آج تک اس کے جواب میں قلم فرسائی کی جرأت نہ ہو سکی۔ نیز ماضی قریب میں جناب شیخ محمد حسن مظفر نجفی نے بھی اسی ابطال الباطل کے رد میں تین جلدوں میں ایک کتاب بنام "دلائل الصدق" لکھی جو "احقاق الحق" کی طرح بہت دلچسپ ہے۔ (۴) اسی طرح سرکار علامہ کی مسئلہ امامت میں کتاب "الفین" بھی بہت مشہور و مقبول ہے (۵) الیقین فی امرۃ امیر المؤمنین بہر حال اس بحر العلوم نے کم و بیش چالیس کتابیں علم کلام میں تصنیف فرمائیں۔ شاہ خدا بندہ کے دربار میں سرکار علامہ کا مذاہب اربعہ کے اکابر علماء کے ساتھ مذہب امامیہ کی صداقت و حقانیت پر مناظرہ کر کے ان سب کو لاجواب کرنا اور بادشاہ کا ان کے دلائل سے متاثر ہو کر مذہب شیعہ قبول کر لینا بہت مشہور اور دلچسپ ہے اور بنظر اختصار ہم اسے درج کرنے سے قاصر ہیں۔ شائقین کتاب روضات الجنات، مجالس المومنین، سفینۃ البحار وغیرہ کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔ ہاں محض اس خیال سے کہ ناظرین کرام اس مناظرۂ جلیلہ کے افادات سے بالکل محروم نہ رہ جائیں۔ اس کا ایک مختصر سا تتمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

علامہ حلّی کے ایک تاریخی مناظرہ کا تتمہ

جب سرکار علامہ نے مختلف فیہا مسئلہ میں مذاہب اربعہ کے علماء کو لاجواب کر کے مذہب حق کے برحق ہونے کو دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کر دیا ہے تو بادشاہ نے ان سے خواہش کی کہ وہ اسی مجلس میں مذہب شیعہ کی حقانیت پر ایک جامع تقریر کریں۔ سرکار علامہ نے اس کی استدعا کو قبول کر لیا اور خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ اثنائے خطبہ میں انہوں نے حسب فرمان نبوی آں حضرتؐ پر صلوات بھیجنے کے بعد ان کی آل اطہارؑ پر صلوات بھیجی۔ اس پر ایک نام نہاد موصلی سید آتش زیر پا ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ جناب! غیر انبیاء پر صلوات بھیجنا جائز نہیں۔ سرکار علامہ نے جواباً فرمایا کہ قرآن کی رو سے غیر انبیاء پر صلوات بھیجنا جائز ہے۔ چنانچہ ارشاد رب العزت ہے وبشر الصابرین الذین اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانا اليه راجعون اولئك عليهم صلوات من ربهم۔ اے رسولؐ ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو کہ جن پر جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ جزع فزع نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں ہم خدا کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے ایسے لوگوں پر خداوند عالم صلوات بھیجتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو بھی مصیبت پر صبر کرے اس پر صلوات بھیجنا جائز ہے۔ موصلی نے کہا تو آل محمدؐ پر کون سی مصیبت نازل ہوئی تھی جس پر وہ صبر کر کے صلوات کے مستحق قرار پاتے ہوں۔ جناب علامہ نے

فرمایا کہ اہلِ بیت نبویؐ پر اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت آئے گی کہ تجھ ایسا ناخلف بھی یہ کہتا ہے کہ میں سید اور آلِ رسولؐ ہوں یہ سننا تھا کہ فبھت الذی کفر۔ سرکارِ علامہ نے (قرن ہشتم ۷۲۶ھ) میں وفات پائی۔

۳۸۔ **محمد ابن الحسن معروف بہ فخر المحققین :۔** یہ عالم جلیل سرکار علامہ حلی کے خلف رشید اور ان کے علم و عمل کے صحیح وارث تھے۔ اور سرکار علامہ کی زندگی میں ہی انہوں نے علمی میدان میں وہ بلند مقام حاصل کر لیا تھا کہ علامہ مرحوم نے انہیں اپنی نامکمل تصانیف کے مکمل کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ یہ بزرگوار اپنے تحقیقی و علمی کارناموں کی وجہ سے علمی حلقوں میں فخر المحققین کے جلیل القدر لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے علم کتاب میں ایک کتاب بنام **الکافیہ الوافیہ** لکھی (متوفی قرن ہشتم)

۳۹۔ **مقداد ابن عبداللہ السیوری الحلی المعروف بفاضل مقداد :۔** بڑے جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ ان کی کتاب کنز العرفان فی شرح آیات الاحکام بہت مشہور و مقبول ہے۔ انہوں نے علم کلام میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جیسے شرح نہج المسترشدین اور شرح باب حادی عشر جو عراق و عجم وغیرہ کے اکثر مدارس دینیہ میں داخل نصاب ہے۔ شرح فصول اللوامع الالٰہیۃ فی المباحث الکلامیہ وغیرہ (اواخر قرن ہشتم)

۴۰۔ **حسن ابن محمد ابن راشد حلی :۔** صاحب ریاض العلماء (علی مانقل عنہ) نے ان کے متعلق لکھا ہے المتکلم **الفاضل الجلیل**۔ انہوں نے علم کلام میں ایک کتاب بنام مصباح المتہدین فی اصول الدین لکھی (قرن نہم)

۴۱۔ **محمد ابن ابی جمہور الاحسائی۔** شیخ عباس مرحوم نے فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ ۳۸۲ پر ان کا ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ کیا ہے "عالم، عارف حکیم متکلم محقق مدقق فاضل، محدث خبیر متبحر، ماہر" اور علم کلام میں ان کی چار کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ المجلی۔ شرح باب حادی عشر زاد المسافرین فی اصول الدین اور اس کی شرح مسمّٰی بکشف البراہین۔ انہوں نے مخالفین کے ساتھ بڑے بڑے مناظرات بھی کئے جن میں سے بعض کا تذکرہ مجالس المومنین اور روضات الجنات میں اور نامۂ دانشوراں میں مذکور ہیں (قرن دہم) المجلی ہمارے پاس موجود ہے اسکے دیکھنے سے انکا رجحان تصوف و عرفان کی طرف

۴۲۔ **احمد بن محمد الاردبیلی النجفی المعروف بمقدس اردبیلی۔** بہت بلند پایہ عالم ربانی اور فقیہ صمدانی تھے۔ ان کی وثاقت و جلالت اور فضل و نبالت زہد و دیانت اور ورع و امانت اس سے مشہور تر و افزوں تر ہے کہ قلم اس کا احاطہ کر سکے۔ اگرچہ وہ ایک عظیم المرتبت فقیہ کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت بلند پایہ متکلم بھی تھے۔ چنانچہ شیخ عباس قمی مرحوم نے اپنی کتاب الکنیٰ الالقاب ج ۳ صفحہ ۱۹۶ پر ان کے متعلق لکھا ہے۔ کان **متکلماً فقیہاً عظیم الشان جلیل القدر رفیع المنزلت اورع اہل زمانہ واعبدھم واتقاھم**۔ علم کلام میں ان کی مشہور کتاب حدیقۃ الشیعہ ہے (قرن دہم ۹۹۳ھ)

۴۳۔ **الشیخ علی بن عبد العالی معروف بہ محقق کرکی و محقق ثانی۔** یہ شیخ عالی مقدار اپنے وقت میں مرجع مذہب

ملت اور رئیس مشائخ اجلہ تھے۔ اور بہت بلند مرتبہ عالم و فاضل اور فقیہ و متکلم تھے۔ اگرچہ ان کی شہرت زیادہ تر ایک فقیہ نبیہ ہونے کی حیثیت سے ہے اور ان کی فقہی کتاب جامع المقاصد فقہاء کی نگاہ میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ لیکن علم کلام میں بھی ان کی کافی خدمات ہیں۔ ان کا رسالہ جعفریہ اور نفحات اللاہوت خاص طور پر قابل ذکر ہیں

جناب شاہ طہماسب صفوی کے عہد میں یہ شیخ الاسلامی کے منصب رفیع پر فائز تھے اور بادشاہ ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا اور یہاں تک کہتا تھا کہ درحقیقت بادشاہ آپ ہیں چونکہ آپ نائب امام ہیں میں آپ کا نائب ہو کر آپ کے حکم کے مطابق حکومت کرتا ہوں۔ اور اس نے اپنی تمام قلمرو سلطنت میں ایک شاہی فرمان بھیجا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ مجتہد جامع الشرائط کے حکم کی مخالفت بموجب فرمانِ امام عالی امام شرک کے برابر ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی حضرت محقق کرکی کے کسی حکم کی مخالفت کرے گا وہ ملعون اور ہماری بارگاہ سے مردود و مطرود ہوگا۔

محقق کرکی کی حاضر جوابی کا ایک عجیب واقعہ

ایک بار آپ شہنشاہ کی بارگاہ میں تشریف فرما تھے کہ بادشاہِ روم کا سفیر بھی شرف یاب ہوا۔ اثناء گفتگو میں اسے شرارت سوجھی اور کہنے لگا۔ اے شیخ آپ کے مذہب و طریقہ کے اختراع کا مادۂ تاریخ ہے۔ مذہب ناحق (۹۰۶ شاہانِ صفویہ کی بادشاہت کی تاریخ ہے) جس سے آپ کے مذہب کا بطلان ظاہر و عیاں ہوتا ہے شیخ نے برجستہ جواب دیا کہ ہم عربی الاصل ہیں۔ اور ہماری اصل زبان عربی ہے نہ عجمی۔ لہٰذا اگر آپ لفظ مذہب کو ضمیر جمع متکلم (نا) کی طرف مضاف کر دیں تو یوں جملہ بنے گا "مذہبنا حق" (ہمارا مذہب برحق ہے) فبھت الذی کفر و بقی کانما القم حجر۔

ان کے فرزند ارجمند شیخ عبد العالی بھی بہت عالم و فاضل اور متکلم تھے۔ (۱۸ ذی الحجہ ۹۴۰ھ قرن دہم)

۴۴۔ **غیاث الدین منصور بن صدر الدین الحسینی الاشتکی**۔ یہ بزرگوار بہت بلند پایہ عالم عامل اور فاضل کامل تھے۔ یہ علامہ سید علی خان شارح صحیفہ کاملہ کے جد امجد ہیں۔ اور شیراز کے مدرسہ منصوریہ کے بانی ہیں شاہ طہماسب صفوی مرحوم کے عہد معدلت انگیز میں "صدر صدور الممالک" کے جلیل القدر لقب سے ملقب اور صدر الصدور کے مرتبہ عالیہ پر فائز تھے۔ علم کلام میں ان کی چند کتابیں ہیں۔ ا۔ حجۃ الکلام۔ حواشی بر الٰہیات شفا و اشارات وغیرہ۔

(سنہ ۹۴۸ھ قرن دہم)

۴۵۔ **قاضی نور اللہ بن شریف الدین الحسینی الشوستری معروف بشہید ثالث**:۔ بہت بلند پایہ عالم عظیم الشان متکلم فصیح البیان تھے۔ باوجود ناملائم حالات سے دوچار ہونے کے علم کلام میں بہت سی کتب جلیلہ تصنیف فرمائیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتب بہت مشہور و مفید ہیں۔ احقاق الحق اس کا تذکرہ علامہ حلی کے حالات میں ہو چکا ہے۔ مصائب النواصب الصوارم المحرقہ عقائد امامیہ یہ بزرگوار ان مظلوم علمائے

شیعہ میں سے ہیں جنہیں تشیع کے جرم میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ انہیں جہانگیر نے مفسد ملاؤں کے فتوائے کے مطابق شہید کرایا۔ ان کی مزار آگرہ میں مشہور و معروف انام اور زیارت گاہ خاص و عام ہے (قرن یازدہم ۱۰۱۹ھ)

۴۶۔ **محمد ابن الحسین العاملی الحارثی المعروف بشیخ بہاؤ الدین العاملی:۔** یہ بزرگوار اسلام کی ان نادر شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنہیں صحیح معنوں میں جامع العلوم والفنون کہا جا سکتا ہے۔ یہ عالم جلیل القدر اپنے علمی و تحقیقی کارناموں کی بدولت آسمان شہرت و عظمت کے درخشندہ ستارہ سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ بالعموم ان کا شمار متکلمین میں نہیں کیا جاتا جس کی بظاہر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس فن میں ان کی کوئی مبسوط تصنیف نہیں ملتی۔ لیکن چونکہ یہ بزرگوار جامع الفنون ہونے کی وجہ سے ہر فن مولا تھے ان کی کتاب "کشکول" معروف بہ کشکول بہائی جو کہ مصر و ایران وغیرہ میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے جہاں اس میں اور سینکڑوں موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے وہاں مباحثِ کلامیہ کی بھی کوئی کمی نہیں ہے علاوہ بریں جناب شیخ کا ایک مختصر سا رسالہ بنام عقائد الشیعہ بھی ہے جو ایران میں ایک مجموعہ رسائل کے ہمراہ طبع ہو چکا ہے۔ مرحوم شیخ شاہ عباس صفوی کے عہدِ معدلت انگیز میں "شیخ المشائخ" کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے اور اسی بادشاہ کے نام پر انہوں نے جامع عباسی نامی کتاب بھی لکھنا شروع کی تھی جسے بعد میں ان کے تلمیذ رشید جناب نظام الدین ساوجی نے مکمل کیا۔ (قرن یازدہم ۱۰۳۱ھ)

۴۷۔ **محمد محسن ابن مرتضےٰ کاشانی المعروف بملا محسن فیض:۔** یہ بزرگوار بڑے جامع الفنون والعلوم اور کثیر التصنیف والتالیف عالم جلیل و فاضل نبیل تھے۔ بروایت علامہ جزائری مرحوم آنجناب نے مختلف علوم و فنون میں تقریباً دو سو کتب تحریر فرمائیں۔ علم کلام میں بھی انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ المعارف فی اصول الدین۔ علم الیقین۔ عین الیقین۔ منہاج النجاۃ۔ اگرچہ ان کتب میں ایک معمولی سا نقص یہ ہے کہ ان میں تصوف و عرفان کی ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے جس کا سبب اور پھر اس کا عذر سرکار فیض نے اپنے رسالہ "انصاف" مطبوعہ ایران میں کر دیا ہے جس کا قبول نہ کرنا دیانت بلکہ انسانیت کے منافی ہے جو حضرات مرحوم محسن فیض کے مسلک و عقیدہ کے متعلق مختلف شکوک و اوہام میں مبتلا ہیں۔ انہیں رسالۂ انصاف کا مطالعہ کر کے اپنے شکوک و شبہات کو دور کرنا چاہیں۔ (قرن یازدہم ۱۰۹۱ھ)

۴۸۔ **عبد الرزاق بن علی بن الحسین لاہجی:۔** یہ بزرگوار بہت جلیل القدر عالم فاضل اور حکیم و متکلم تھے۔ صدر المتقین ملا صدرا الشیرازی کے تلمیذ رشید اور ان کے داماد اور سرکار محدث محسن فیض کاشانی کے ہم زلف تھے انہوں نے اپنی گرانقدر تصانیف کے ذریعہ علم کلام کے لٹریچر میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی کتب کلامیہ درج ذیل ہیں۔

(۱) تجرید محقق طوسی کی دو شرحیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بنام شوارق مطبوع و موجود ہے (۲) گوہر مراد (۳) سرمایۂ ایمان وغیرہ۔ ان کا ایک فرزند ارجمند مسمّی بہ مرزا حسن بھی فاضل آدمی تھا۔ اس نے مسئلہ امامت میں ایک کتاب بنام

شمع یقین تصنیف کی جو کہ مطبوع ہے (قرن یازدہم ۱۰۵۱ھ)

۴۹۔ عبدالرزاق رانگوئی شیرازی۔ عالم و فاضل اور متکلم تھے۔ یہ فاضل لاہجی کے معاصر تھے انہوں نے علم کلام میں محقق طوسی کے رسالہ قواعد العقائد کی شرح لکھی (قرن یازدہم)

۵۰۔ محمد بن ابراہیم معروف بہ ملا صدرا الشیرازی:۔ یہ بہت عظیم الشان حکیم و فیلسوف اور جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ ان کی کتاب اسفار اربعہ تمام دنیا کے حکماء و فضلا کا مرکز توجہ بنی ہوئی ہے اور ان سے خراج تحسین لے چکی ہے۔ یہ بزرگوار عظیم فلسفی و متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے متقی و پرہیزگار بھی تھے، چنانچہ شیخ عباس قمی مرحوم نے لکھا ہے کہ وہ چھ مرتبہ پیادہ پا حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور ساتویں بار جا رہے تھے کہ راستہ میں بصرہ کے اندر وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ انہوں نے علم کلام میں چند کتب تصنیف فرمائیں۔ (قرن یازدہم)

۵۱۔ محمد باقر بن محمد الحسینی الاسترآبادی معروف بہ میر محمد باقر داماد:۔ یہ بزرگوار عالی مقدار بہت بڑے عالم محقق نحریر و فاضل خبیر اور متکلم و حکیم اور جامع المعقول والمنقول تھے ؎

عقلیش از قیاس عقل بروں نقلیش از قیاس فزوں

ان کی علمی جلالت قدر کا اندازہ لگانے کے لئے یہی کافی ہے کہ صدر المتألہین شیرازی اسی بزرگوار کا تلمیذ اور علمی میدان میں انہی کا کاسہ لیس ہے۔ علاوہ اس کے کہ علوم حکمیہ وغیرہ میں سرآمد روزگار تھے، عمل و عبادت میں بھی بے نظیر تھے۔ ان کی عبادت و زہادت، علمی جلالت و وجاہت اور عملی عظمت و ثقاہت کے سلسلہ میں ان کے متعلق کتب سیر میں بکثرت حکایات درج ہیں۔ یہاں ان تمام کے نقل کرنے کی تو گنجائش نہیں۔ دو چار مختصر حکایات تبرکاً نقل کی جاتی ہیں۔ (۱) شیخ عباس قمی نے بحوالہ حدائق المقربین میر محمد صالح نقل کیا ہے کہ میر باقر داماد مرحوم عبادت کے معاملہ میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور قرآن مجید کی بکثرت تلاوت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض ثقات نے نقل کیا ہے کہ وہ ہر رات پندرہ پارے پڑھتے تھے۔

(۲) نیز شیخ موصوف نے فوائد رضویہ میں لکھا ہے کہ ان کی علمی و عملی مصروفیات کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگوں نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے چالیس سال کی مدت مدید تک سونے کے لئے اپنے پاؤں دراز نہیں کئے۔ لکھائی و پڑھائی کا کام کرتے ہوئے بیٹھے بیٹھے چند منٹ آرام کر لیتے تھے۔ شیخ نے اس حکایت کو عجائبات روزگار میں سے شمار کیا ہے اور واقعی بنا بر صحت عجیب ہے۔ وای عجیب۔

(۳) اہل علم اور بالخصوص معاصرین کے درمیان جو کچھ باہمی کدو کدورت اور منافرت ہوتی ہے۔ وہ عیاں را چہ بیان کی مصداق ہے (الا من رحم اللہ و قلیل ما ھم) مگر محقق عماد سید محمد باقر داماد کا دامن عفت ان آلائشات کی لوث سے منزہ و مبرا تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ بہائی جو ان کے معاصر جلیل تھے۔ ان کے ساتھ ان کے مخلصانہ مراسم و

روابط ضرب المثل تھے۔ ان کے اس باہمی خلوص و محبت اور مواخات کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ شاہ عباس صفوی اپنے شاہانہ شان و شکوہ کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے نکلا اور یہ دونوں بزرگوار بھی اس کے ہمرکاب تھے۔ سید داماد مرحوم جسیم و لحیم اور عظیم الجثہ تھے۔ اس کے برعکس حضرت بہائی بالکل نحیف و نزار اور دبلے پتلے تھے بادشاہ نے چاہا کہ دونوں بزرگواروں کی باہمی محبت و خلوص کی آزمائش کرے۔ چنانچہ سید صاحب کی خدمت میں پہنچا جو کہ سب کے آخر میں آہستہ آہستہ گھوڑے پر تشریف لا رہے تھے۔ اور بوجہ ثقل جثہ چہرہ مبارک پر تکان کے آثار آشکار تھے اور جناب شیخ کا گھوڑا سب سے آگے آگے اس طرح جولان کرتا ہوا جا رہا تھا کہ گویا اس پر کوئی سوار ہی نہیں۔ شاہ نے سید کی خدمت میں عرض کیا یا سیدنا آپ ان شیخ صاحب کو بھی دیکھتے ہیں یہ کس طرح گھوڑے کے ساتھ کھیلتے کودتے ہوئے جا رہے ہیں۔ اور آپ کی طرح سکینہ و وقار کے ساتھ نہیں چلتے۔ سید نے شاہ کا یہ کلام سن کر فرمایا اے بادشاہ! اس میں شیخ کا کوئی قصور نہیں، گھوڑا اس فرحت و انبساط میں کہ آج حضرت شیخ اس کی زین پر سوار ہیں تیز تیز چل رہا ہے۔ بادشاہ سید کا یہ جواب باصواب سن کر خاموشی سے شیخ کی خدمت میں پہنچ گیا اور عرض کیا شیخنا۔ ذرا سید صاحب کی حالت دیکھئے کہ انہوں نے اپنی جسامت و موٹاپے کی وجہ سے گھوڑے کو بھی مصیبت و تکان میں ڈال رکھا ہے۔ عالم دین کو تو آپ کی طرح ہلکا دبلا اور خفیف المؤنہ ہونا چاہیے۔ شیخ نے بادشاہ کا یہ کلام سن کر فرمایا سید کے گھوڑے پر تکان کے جو آثار آشکار ہیں وہ سید کی ظاہری جسامت کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ یہ ان کے اس علم کے بوجھ کی وجہ سے ہیں جس کے اٹھانے کی پہاڑ بھی تاب و توانائی نہیں رکھتے بادشاہ شیخ کا یہ جواب باصواب سن کر اور دو علماء دین کی باہمی خالص اخوت و الفت دیکھ کر فوراً گھوڑے سے اتر آیا اس نعمت پر سجدۂ شکر ادا کیا کہ اس کے پاس دو ایسے عالم باعمل موجود ہیں (روضات الجنات وغیرہ)

دل چاہتا ہے کہ موجودہ دور کے مولوی صاحبان کی حالتِ زار بیان کرنے کے لئے وہ واقعہ درج کر دیا جائے جو رسالہ اصلاح کے کسی شمارہ میں دیکھا تھا۔ ہوا یوں کہ دو مولوی صاحبان کسی جگہ اکٹھے کسی صاحب کے ہاں جا کر مہمان ہوئے۔ اتفاق سے ان میں سے ایک صاحب کہیں قضائے حاجت وغیرہ کے لئے باہر تشریف لے گئے میزبان نے خلوت کو غنیمت سمجھا۔ دوسرے مولوی صاحب سے کہا کہ ماشاء اللہ آپ کی شکل و شمائل سے تو علم و فضل کے آثار ہویدا و آشکار ہیں۔ مگر یہ مولوی صاحب جو آپ کے ہمراہ ہیں۔ یہ بھی کچھ جانتے ہیں؟ مولوی صاحب نے فوراً کہا نہیں جناب یہ تو بالکل گدھے ہیں۔ اتنے میں دوسرے مولوی صاحب واپس پہنچ گئے اور اب یہ دوسرے مولوی صاحب باہر تشریف لے گئے۔ اب میزبان نے اپنے سابقہ رویہ کا اعادہ کرتے ہوئے وہی سوال ان سے بھی کیا۔ انہوں نے بھی بلا تامل یہی فتویٰ صادر فرمایا کہ ان کے ساتھی گدھے اور علم و فضل سے بھی بالکل کورے ہیں میزبان خاموش ہو گیا جب کھانے کا وقت ہوا تو اس نے ایک توبڑا نخود (چنے) کا بھر کر مولوی صاحبان کی خدمت

میں پیش کیا اور عرض کیا حضور نوش فرمائیں۔ مولوی صاحبان حیران و پریشان ہو کر کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی میزبان کی طرف غیظ و غضب کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔ میزبان ان کی یہ سراسیمگی دیکھ کر بولا جناب اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ آپ دونوں نے ایک دوسرے کے بارہ میں گدھا ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور گدھوں کی بہترین غذا تخود کے دانے ہیں۔ دونوں حضرات شرمندہ اور خجل ہوئے۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ جب تک علماء کی سیرتیں پاکیزہ اور کردار بلند تھا۔ بادشاہ ان کی خدمت ان کی تعظیم و تکریم کو واجب اور اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے اور جب ان کی سیرتیں داغدار اور کردار ناہنجار ہو گئے تو آج یہ عالم ہے کہ ع

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

سچ ہے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔ یعنی

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(۴) محقق داماد میر باقر داماد مشکل نویسی میں مشہور ہیں اور ان کی کتب اس سلسلہ میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہیں چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کی بعض کتب کی بعض عبارات پر کچھ ایرادات کر کے بغرض جواب آپ کی خدمت میں بھیجے جناب نے اس کے جواب میں ایک مفصل مکتوب ارسال فرمایا جس میں یہ بھی لکھا "این قدر شعور باید داشت کہ سخن من فہمیدن ہنر است نہ با من جدال کردن و بحث نام نہادن۔ اس قدر شعور رکھنا ضروری ہے کہ میرے کلام کا مطلب سمجھنا تمہارے لئے ہنر اور کمال ہے نہ یہ کہ میرے ساتھ مجادلہ کر کے اس کا نام علمی مباحثہ رکھنا (فوائد رضویہ ج ۲ ص ۴۲۱)۔ محقق داماد کی یہ فرمائش بہت گرانقدر و متین ہے۔ واقعاً علماء اعلام کے کلام حقیقت ترجمان کا حقیقی مطلب و مفہوم سمجھنا ہی عام لوگوں کے کمال کی دلیل ہے نہ کہ اپنی کم عقلی و کوتاہ اندیشی سے ان پر زبان اعتراض دراز کرنا۔ مگر افسوس اکثر لوگوں کا رویہ بموجب ارشاد خداوندی یہی ہے کہ کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ۔ جس چیز کا علمی احاطہ نہ کر سکیں اس کو جھٹلانا شروع کر دیتے ہیں اور یہ روش انتہائی مضر اور خطرناک ہے۔ خدا محفوظ رکھے۔ بہرحال اس عالم جلیل نے دیگر علوم و فنون کے علاوہ علم کلام میں حسب ذیل کتب لکھیں۔

(۱) نبراس الضیاء (۲) تقویم الایمان (۳) عیون المسائل (۴) تقدیسات وغیرہ (قرن یازدہم سنہ ۱۰۴۱ھ)

۵۲۔ محمد بن الحسن الشیروانی الاصفہانی معروف بہ ملا مرزا۔ بہت جلیل القدر عالم و فاضل اور علوم کثیرہ میں تبحر کامل تھے۔ علم کلام میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ دیگر تصنیفات کثیرہ کے علاوہ علم کلام میں بھی متعدد رسائل لکھے جیسے رسالہ در توحید۔ رسالہ در نبوت۔ رسالہ در امامت رسالہ در صداقت کلام اللہ۔ رسالہ در معنی بداء۔ رسالہ در جبر و اختیار۔ رسالہ در احباط و تکفیر وغیرہا۔

یہ بزرگوار پہلے نجف اشرف میں مقیم تھے۔ شاہ سلیمان صفوی ان کو اصفہان میں لے گئے اور بالآخر وہیں

بروز جمعہ ۲۹ ماہ رمضان ۱۰۹۸ھ میں وفات پائی۔

۵۳۔ السید محمد بن السید حیدر الحسینی الحسنی الطباطبائی معروف میرزا رفیع الدین۔ یہ سید بزرگوار بہت عظیم المرتبت عالم و حکیم و متکلم و متاله اور محقق و مدقق فاضل تھے۔ ان کی عظمت و جلالت کے اثبات کے لئے یہی امر کافی ہے کہ یہ سرکار علامہ مجلسیؒ کے استاد ہیں۔ انہوں نے دیگر علوم و فنون کے علاوہ علم کلام میں بھی بعض کتب جلیلہ تصنیف فرمائیں۔ جیسے شجرہ الہیہ اور اس کا جامع خلاصہ "ثمرۃ الہیہ" (۷ شوال ۱۰۹۹ھ قرن یازدہم)

۵۴۔ السید علی خان ابن السید خلف ابن السید الموسوی الحویزی۔ یہ سید نبیل بہت عالی مرتبہ عالم و فاضل اور جامع العلوم تھے۔ دینی و دنیوی دونوں سعادتوں پر فائز تھے۔ حویزہ اور اس کے اطراف کی عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں تھی۔ مختلف موضوعات پر ان کی متعدد کتب ہیں۔ علم کلام میں بھی کتاب النور المبین لکھی۔ مخفی نہ رہے کہ فاضل اجل سید علی خان صاحب شرح صحیفہ کاملہ وغیرہ کتب جلیلہ اور بزرگوار ہیں (متوفی اواخر قرن یازدہم)

۵۵۔ محمد باقر ابن محمد تقی مجلسی الاصفہانی معروف بعلامہ مجلسی :۔ یہ بزرگوار نقط عالم شہیر و محدث بصیر ہی نہیں بلکہ رئیس المحدثین و مروج المذہب والدین و ناشر آثار الائمۃ الطاہرین ہیں۔ اگرچہ وہ ایک محدث جلیل ہونے کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن وہ علم کلام میں بھی پوری پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ بحار الانوار کی بعض مجلدات (مثلاً ۱۔۲۔۳۔۴۔۱۴ وغیرہ) اس امر پر شاہد صادق موجود ہیں۔ سرکار علامہ کی علم کلام میں دو کتابیں موجود ہیں "حق الیقین فی اصول الدین" جس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے (۲) رسالہ لیلیہ جس میں عقائد حقہ کا مختصر تذکرہ ہے اسے لیلیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ سرکار علامہ نے اسے ایک ہی شب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس عالم علوم آئمہ اطہار و غواص بحار اخبار کے مذہب شیعہ پر اس قدر احسانات ہیں کہ قوم شیعہ کبھی ان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی مذہب اہل بیتؑ کے اسی بطل جلیل کے متعلق شاہ عبد العزیز دہلوی نے تحفہ میں لکھا ہے کہ "اگر مذہب شیعہ را دین مجلسیؒ گفتہ شود بے جا نیست"۔

آسمان عظمت و جلالت کا یہ بدر منیر ۱۱۱۰ھ میں غروب ہوا۔

۵۶۔ یوسف ابن احمد البحرانی :۔ یہ بزرگوار بہت بڑے عالم عامل محدث ورع کامل۔ فاضل متبحر و متتبع ماہر صاحب حدائق ناظرہ فی احکام العترۃ الطاہرہ۔ یہ وہ عظیم الشان کتاب ہے کہ جس کے متعلق علمائے اعلام کا یہ فیصلہ ہے کہ هو کتاب جلیل لم یعمل فی کتاب الامامیہ مثلہ "کہ اس کی مثل کتب امامیہ میں کوئی نہیں لکھی گئی۔ (منتہی المقال للشیخ ابی علی الحائریؒ) اگرچہ اس عالم ربانی اور فاضل صمدانی کی زیادہ شہرت فقہ و حدیث میں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بزرگوار علم کلام میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس علم میں انہوں نے تین

کتابیں تصنیف فرمائیں ،۱۔ سلاسل الحدید فی تقیید ابن ابی الحدید ۔ ۲۔ اعلام القاصدین الی مناہج اصول الدین ۔ ۳۔ النفحات الملکوتیہ فی الرد علی الصوفیہ علم وعمل کا یہ مہرتاباں قرن دوازدہم ۱۱۸۶ھ کربلا معلی میں غروب ہوا۔ اور سرکار سیدالشہداءؑ کے رواق مبارک میں پائنتی کی طرف جو دروازہ ہے وہاں مدفون ہوا۔

۵۷۔ سید نعمت اللہ بن عبداللہ المعروف بعلامہ جزائری :۔ آپ حضرت علامہ مجلسی اور آقا حسین خوانساری اور فاضل جلیل ملا محسن فیض کے شاگرد رشید اور بہت بلندپایہ کے عالم وفاضل، ماہر کامل، محدث جلیل محقق نبیل، متکلم کم عدیل تھے۔ تحصیل علوم وفنون میں انہوں نے جس قدر مصائب وآلام جھیلے ہیں شائد ہی کسی نے اس قدر رنج وآلام جھیلے ہوں گے۔ بالآخران کی محنت ومشقت ٹھکانے لگی اور بفضلہ تعالیٰ علم وعمل کے مدارج عالیہ و مراتب سامیہ پر فائز ہوئے اور مرجع فضلاء وعلماء قرار پائے اور سرآمد روزگار رہے۔ فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ انہوں نے جہاں دیگر علوم اسلامیہ میں گرانقدر کتب تصنیف وتالیف فرمائیں وہاں علم کلام میں بھی چند کتب جلیلہ لکھیں (۱) شرح توحید شیخ صدوق رح (۲) قاطع اللجاج شرح احتجاج طبرسی (۳) انوار نعمانیہ کا ایک معتدبہ حصہ مباحثِ کلامیہ پر مشتمل ہے (۴) شرح اعتقادیہ شیخ صدوق علیہ الرحمۃ۔ سید مرحوم کی تمام کتب فوائد بہیہ اور لطائفِ علمیہ سے لبریز ہیں اور قابلِ استفادہ واستفاضہ ہیں۔ (قرن دوازدہم ۱۱۱۲ھ)

۵۸۔ جمال الدین محمد بن محقق آقا حسین خوانساری :۔ صاحب ہدیۃ الاحباب قدس سرہ نے ان کا ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے۔ "عالم محقق مدقق حکیم متکلم فقیہ نبیہ جلیل القدر صاحب تصانیف رائقہ" یہ پہلے بزرگوار ہیں جنہوں نے فارسی زبان میں کلام اللہ کا ترجمہ کیا۔ انہوں نے دیگر موضوعات کے علاوہ علم کلام میں بھی بعض رسائل مفیدہ تصنیف فرمائے ہیں۔ من جملہ ان کے ایک رسالہ اصولِ دین میں ہے۔

(متوفی ۲۶ ماہ رمضان ۱۱۲۵ھ قرن دوازدہم)

۵۹۔ الشیخ محمد بن الحسن معروف بشیخ حر عاملی۔ حضرت شیخ عباس قمی علیہ الرحمہ نے فوائد رضویہ ص ۴۷۴ پر ان جناب کے تذکرہ کی ان الفاظ کے ساتھ ابتدا کی ہے "عالم فاضل محقق مدقق متبحر جامع کامل صالح ورع ثقہ فقیہ نبیہ محدث حافظ شاعر ادیب اریب جلیل القدر عظیم الشان۔ الخ۔ اگرچہ ان جناب کی شہرت زیادہ تر ایک جلیل القدر محدث خبیر ہونے کی حیثیت سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بزرگوار جامع العلوم تھے۔ ان کی کتاب مستطاب وسائل الشیعہ کے اخبار و آثار پر اجتہاد کا دارومدار ہے۔ انہوں نے وہ تمام مستند احادیث اس میں جمع فرمائی ہیں جن کا تعلق احکام شرعیہ فرعیہ کے ساتھ ہے۔ خواہ وہ احادیث اربعہ کی ہوں یا دیگر کتب معتبرہ کی اگر اس کے ساتھ ثقۃ الاسلام حضرت علامہ محدث نوری قدس سرہ کی مستدرک الوسائل بھی شامل کر لی جائے اور استنباط احکام کے وقت ان کتب جلیلہ کو پیش نظر رکھا جائے تو جس قدر تتبع وتفحص ایک فقیہ جامع الشرائط پر

لازم ہوتا ہے۔ اس کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ یہ عالم جلیل اپنے وقت میں "شیخ الاسلامی" کے درجۂ رفیعہ پر فائز تھے اور قیام مشہد مقدس میں تھا۔ بہرحال اس بزرگوار نے علاوہ دیگر علوم شرعیہ کے خاص کر علم کلام میں بھی چند کتب جلیلہ لکھ کر اس علم کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا ہے (۱) اثبات الهداة بالنصوص والمعجزات (۲) رسالہ در مسئلہ رجعت (۳) رسالہ در رد صوفیہ (۴) رسالہ در خلق کافر (۵) رسالہ در تواتر قرآن۔

اس آفتاب علم نے اکیس ماہ رمضان المبارک ۱۱۰۴ھ کو مشہد مقدس میں غروب فرمایا۔ (قرن دوازدہم)

۶۰۔ **سلیمان بن عبداللہ الماحوزی البحرانی:** محقق مدقق جامع جمیع علوم خطیب شاعر حافظ مورخ محدث متکلم صاحب تصانیف کثیرہ نافعہ در علوم مختلفہ۔ علم کلام میں بھی چند کتابیں لکھیں۔ جیسے ہدایۃ القاصدین الی اصول الدین فصل الخطاب، کتاب الاربعین در امامت، صواب النداء فی مسئلۃ البداء، شرح باب حادی عشر۔ یہ بزرگوار عالم ربانی الشیخ یوسف البحرانی صاحب حدائق ناضرہ کے والد علامہ الشیخ احمد کے استاد ہیں۔ یہ شیخ مرحوم حدائق ناضرہ میں ان کے اقوال پر کافی نقد و تبصرہ کرتے ہیں۔

(۱۷ رجب ۱۱۲۱ھ قرن دوازدہم)

۶۱۔ **سید دلدار علی ابن سید محمد معین النقشاپوری لکھنوی۔** معروف بجناب غفرانمآب بڑے جلیل القدر عالم اور عظیم الشان متکلم تھے۔ عراق میں شیخ اکبر شیخ جعفر کبیر صاحب کشف الغطاء اور سید جلیل السید مہدی بحر العلوم سے علوم نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کرنے اور ان سے اجازۂ اجتہاد لینے کے بعد ہندوستان میں تشریف لائے اور سرزمین لکھنؤ کو اپنا مرکز قرار دے کر ہندوستان کو اپنے انوار علمیہ سے منور کرنا شروع کیا۔ ہند و پاک میں آج کل جس قدر علمی شمعیں روشن ہیں ان میں بہت حد تک ان ہی جناب کے فیوض و برکات شامل ہیں۔ انہوں نے علم کلام میں پانچ جلدوں کے اندر ایک عظیم الشان کتاب بنام عماد الاسلام تحریر فرمائی جس کی تین جلدیں کتاب التوحید، کتاب العدل، کتاب النبوۃ چھپ کر دنیائے علم و فضل سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں لیکن افسوس کہ اس کی باقی دو جلدیں کتاب الامامت و کتاب المعاد آج تک منظر عام پر نہ آسکیں۔ وہ مسودے کی شکل میں اب تک قوم شیعہ کے جمود و خمود کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔ ہم مرحوم کے عقیدت مندوں اور قوم کے مخیر حضرات، درد مذہب و ملت رکھنے والے افراد سے بالعموم اور ان کے اخلاف و اقارب سے بالخصوص التماس کریں گے کہ وہ ان کی طباعت کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرما کر اس علمی خزانہ کو قوم کے ہاتھوں تک پہنچانے کا کوئی جلد انتظام و اہتمام فرمائیں۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ (قرن سیزدہم)

۶۲۔ **سید محمد بن السید دلدار علی المعروف بسلطان العلماء:** یہ جلیل القدر عالم جناب غفرانمآب مولانا سید دلدار علی صاحب کے خلف رشید تھے۔ انہوں نے بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح علم کلام کی بڑی خدمت کی اور اس میں

گرانقدر آثار چھوڑے ان میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

طعن الرماح (یہ کتاب تحفہ اثنا عشریہ کے بعض ابواب کا جواب باصواب ہے) ضربتِ حیدریہ بجواب شوکت عمریہ بارقۂ ضیغمیہ وغیرہا (اواخر قرن سیزدہم)

۶۳۔ سید حسین ابن سید دلدار علی معروف بہ سید العلماء:۔ یہ عالم جلیل و فاضل نبیل بھی جناب غفران مآب کے خلف صدق تھے۔ انہوں نے بھی اپنے والد معظم اور برادر مکرم کی طرح علم کلام کی بڑی خدمت کی اور قابلِ قدر کتب تصنیف فرمائیں جیسے حدیقۂ سلطانیہ، افادات حسینیہ وغیرہما۔

۶۴۔ سید محمد قلی ابن سید محمد حسین النیشاپوری اللکھنوی۔ یہ جناب غفران مآب کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ اور بہت بزرگ مرتبہ عالم اور متکلم متبحر تھے۔ انہوں نے اعلائے کلمۃ الحق کے لئے بڑے قلمی و لسانی جہاد کئے انہوں نے علمِ کلام میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جو اکثر و بیشتر تحفہ اثنا عشریہ کے مختلف ابواب کے جوابات پر مشتمل ہیں جیسے سیف ناصری، تقلیب المکائد، برہان سعادت وغیرہا (متوفی قرن سیزدہم ۱۲۶۰ھ)

۶۵ مرزا محمد الدہلوی المتخلص بالکامل معروف بشہید رابع:۔ یہ بزرگوار بہت بڑے عالم شہیر و طبیب قدیر اور مجاہد کبیر تھے۔ ان کے مصنفات جلیلہ میں سے کتاب "نزہۃ اثنا عشریہ" ہے یہ جلیل القدر کتاب بارہ جلدوں میں ہے۔ جس کی بعض جلدیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور بعض مجلدات تا حال منظر عام پر نہیں آسکیں۔ یہ کتاب تحفہ اثنا عشریہ کا مکمل و مدلل جواب باصواب ہے۔ بعض ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ مصنف ممدوح نے یہ کمال کیا کہ جن دنوں شاہ عبد العزیز تحفہ کی تالیف (بلکہ سرقہ) میں مشغول تھا تو انہیں اس کا پتہ چلا۔ انہوں نے کسی آدمی کے ذریعے سے یہ انتظام کیا کہ ہر روز جو مقدار شاہ عبد العزیز لکھتا وہ اسے نقل کرکے ان کی خدمت میں پہنچا دیتا اور یہ اس کا جواب باصواب لکھ دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جونہی کتاب تحفہ اثنا عشریہ جو کہ بارہ ابواب پر مشتمل ایک جلد ہے چھپ کر منظرِ عام پر آئی تو اس کا بارہ جلدوں میں مکمل جواب بنام "نزہۃ اثنا عشریہ" منصۂ شہود پر آگیا۔ کہتے ہیں کہ اس کا شاہ صاحب پر اتنا اثر ہوا کہ رنج والم میں گھل گھل کر مر گیا۔ کیونکہ جس کتاب کو وہ لاجواب سمجھ رہا تھا اس کے چھپتے ہی اس کا بارہ جلدوں میں مکمل اور مدلل جواب موجود پایا لیکن بموجب ؎

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

یہی کتاب اس مجاہد کبیر کی شہادت کا باعث بنی۔ ایک متعصب والیٔ ریاست جھجر نے انہیں علاج معالجہ کے بہانہ سے اپنے ہاں طلب کیا اور بذریعہ زہر شہید کرا دیا۔ یہ بزرگوار ہندوستان میں شہید رابع کے لقب سے مشہور ہیں۔ (قرن سیزدہم)

۶۶۔ سید عبد اللہ شبر بن سید محمد رضا الکاظمی:۔ یہ سید عالی گوہر جلیل القدر محدث، عظیم المرتبت فقیہ اور

وسیع النظر متبتع عالم ربانی اور اپنے وقت میں علامہ مجلسی ثانی کے لقب سے مشہور تھے اور کثیر التصنیف والتالیف تھے۔ انہوں نے علوم شرعیہ میں متعدد کتب جلیلہ تصنیف وتالیف کی ہیں ان کی کتب کی تعداد ساٹھ سے زائد ہے ان میں سے مندرجہ ذیل کتب علم کلام میں لکھی ہیں۔

(۱) حق الیقین دو جلد (۲) البلاغ المبین (۳) جامع المعارف کی جلد اول اور دوم توحید اور دیگر اصول عقائد میں ہیں۔ (قرن سیزدہم ۱۲۴۲ھ)

۱۱۷۔ مرزا ابوالحسن محمد بن سلیمان تنکابنی ۔ آپ علمائے شیعہ میں ممتاز درجہ رفیعہ رکھتے ہیں اور کثیر التصانیف والتالیف عالم ہیں۔ نیز آپ کو بڑے باکمال اساتذہ اور جہابذہ کی ایک جماعت کثیرہ سے علمی استفادہ کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ جن کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب قصص العلماء میں کیا ہے۔ متعدد علوم وفنون میں کتب تصنیف و تالیف کی ہیں۔ ان کی کتاب قصص العلماء بہت مشہور ہے۔ علم کلام میں بھی انہوں نے چند کتب لکھی ہیں جیسے (۱) شرح تجرید فارسی (۲) الفیہ منظومہ در توحید وعدل (۳) منظومہ در امامت (۴) منظومہ علم کلام (۵) رسالہ ہفتاد و دو ملت۔ (قرن سیزدہم ــــھ)

۱۱۸۔ مرزا احمد بن عبدالنبی بن عبدالصانع استرآبادی ۔ یہ عالم جلیل علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور مختلف علوم وفنون میں اسی کے قریب کتب نافعہ رائقہ تصنیف وتالیف کیں جن میں چند علم کلام میں بھی ہیں۔

(قرن سیزدہم)

۱۱۹۔ شیخ مہدی بن ابی ذر النراقی ۔ یہ شیخ عالم فاضل کامل بارع جلیل اور فقیہ و متکلم نحریر اور جامع علوم و فنون تھے۔ علامہ احمد نراقی صاحب معراج السعادۃ واستاد رئیس المجتہدین الشیخ مرتضیٰ انصاری قدس سرہ کے والد ماجد تھے۔ علاوہ دیگر علوم وفنون کے علم کلام میں ایک بہت نفیس رسالہ مسمیٰ انیس الموحدین مطبوع وموجود ہے۔ یہ شیخ جلیل طالب علمی کے وقت درس وتدریس میں اس قدر انہماک رکھتے تھے کہ جب ان کے گھر سے خطوط آتے تھے تو ان کو پڑھتے نہیں تھے تاکہ مبادا ان میں کوئی ایسی خبر درج ہو جس کے پڑھنے سے ان کے حواس پراگندہ ہوں اور تعلیم میں حرج ہو حتیٰ کہ ان کے والد ماجد قتل ہو گئے گھر والوں نے ان کو اس واقعہ ہائلہ کی خبر دی مگر انہوں نے حسب معمول اس خط کو بھی نہ پڑھا جب کافی دن گذر گئے اور یہ گھر نہ تشریف لے گئے تو اب گھر والوں نے ان کے استاد کو خط بھیجا کہ وہ ان کو اس واقعہ کی اطلاع دیں اور گھر بھی بھیجیں۔ چنانچہ جب درس پڑھنے کے لئے خدمت استاد میں حاضر ہوئے تو ان کو مغموم ومہموم پایا۔ سبب دریافت کرنے پر انہوں نے ان سے فرمایا کہ تمہارے والد صاحب بیمار یا مجروح ہیں تم گھر جاؤ۔ انہوں نے عرض کیا خدا ان کی حفاظت کرے گا آپ درس دیں۔ بالآخر مجبوراً استاد کو

قتل ہونے کی تصریح کرنا پڑی۔ خلاصہ یہ کہ گھر تشریف لے گئے۔ اور وہاں تین دن قیام کرکے تمام امور کا انتظام کیا اور پھر واپس آکر تحصیل علم میں مشغول ہوگئے۔ اسی طرح پورے تیس سال علم کی تکمیل میں صرف کئے یہانتک کہ یگانۂ روزگار اور فرید اعصار بن کر اوج فضل و کمال پر چمکے اور کاشان کو اپنے فیوض و برکات کی نشر و اشاعت کا مرکز قرار دیا۔ (فوائد رضویہ ج ۲ صفحہ ۶۶)

ان کی جامع السعادت اور مشکلات العلوم بہت ہی مشہور اور متمتع بہ کتب ہیں آج کل کے طلبہ وفیہ ذرا اپنے حالات و کوائف کا ان بزرگوں کے حالات و کوائف کے ساتھ موازنہ کریں جو گھر جانے اور درس میں ناغہ کرنے اور سلسلہ تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر قوم کے لئے بوجھ بننے کے لئے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ واللہ الموفق

(سنہ ۱۲۰۹ھ قرن سیزدہم)

۷۰۔ سلیمان بن احمد آل عبد الجبار القطیفی البحرانی۔ یہ بہت بڑے فاضل جلیل اور محقق نبیل تھے دیگر موضوعات کے علاوہ علم کلام میں بھی متعدد کتب لکھیں جیسے ارشاد البشر فی شرح الباب الحادی عشر۔ رسالہ در مسئلۂ رجعت۔ رسائل در اصول خمسہ۔ کتاب الرد علی النصاری وغیرہا۔ قرن سیزدہم سنہ ۱۲۹۶ھ)

۷۱۔ مرزا الحسین بن مرزا محمد تقی النوری الطبرسی معروف محدث نوری۔ ان بزرگوار کے تلمیذ رشید ثقۃ الاسلام حضرت الشیخ عباس القمیؒ نے ہدیۃ الاحباب میں ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے۔ شیخنا الاجل الاعظم وعمادنا الارفع الاقوم صفوۃ المتقدمین والمتاخرین خاتم الفقہاء والمحدثین ثقۃ الاسلام و ناشر آثار الائمۃ الطاہرین علیہم السلام۔ بہرحال ان کی جلالت قدر و عظمت شان حد بیان سے باہر ہے۔ اگرچہ ایک محدث خبیر و نقاد بصیر ہونے کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں مگر وہ علم کلام میں بھی پوری دسترس رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کتاب کشف الاستار عن وجہ الغائب عن الابصار اس امر پر شاہد عادل موجود ہے۔ حدیث میں ان کی مستدرک الوسائل اس قدر عظمت کی حامل ہے کہ فقہاء عظام کا فیصلہ ہے کہ استنباط احکام کے وقت جب تک وسائل کے ساتھ اس کی طرف بھی رجوع نہ کرلیا جائے تو اس وقت تک فقیہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ (متوفی سنہ ۱۳۲۰ھ قرن چہاردہم)

۷۲۔ السید اعجاز حسین ابن السید محمد قلی خان الکنتوری۔ یہ بزرگوار بھی اپنے برادر معظم حضرت علامہ السید حامد حسین صاحب قبلہ کی طرح بہت بڑے عالم عامل و فاضل کامل اور متکلم ماہر تھے۔ بعض اہل خبرہ کا بیان ہے کہ کتاب مستطاب استقصاء الافحام جو کہ ملا حیدر آبادی کی منتہی الکلام کا مکمل اور مدلل جواب ہے۔ اسی بزرگوار کے قلم اعجاز رقم کا نتیجہ ہے لیکن چونکہ سرکار مولانا حامد حسین صاحب قبلہ بھی اس کی تصنیف میں ان کے ساتھ شریک تھے انہوں نے اس کو انہی کے نام پر شائع فرما دیا۔ واللہ العالم

(قرن چہاردہم)

۴۳۔ الشیخ محمد بن الشیخ محمد مہدی الخالصی الکاظمینی:۔ آپ بہت بڑے عالم اجل وفاضل اکمل اور متکلم ماہر تھے۔ مرحوم حافظ قرآن مجید ہونے کے ساتھ ساتھ حق القول بھی تھے۔ اپنے نظریات کے اظہار میں کسی کی ملامت یا عوام کالانعام کی غوغا آرائی کی مطلقاً کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی بعض آراء سے علماء اعلام کو اختلاف تھا اور اہل علم کے ایسے باہمی اختلافات ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ان کے نپٹانے کا وہ طریقہ نہیں ہوتا جس طرح بعض جہال نے ان کی مخالفت کی اور سوقیانہ انداز میں اپنی زبان درازی سے کام لیا وہ کسی طرح بھی اہل علم کے شایان شان نہیں

بہر حال مرحوم شیخ نے مندرجہ ذیل کتب کے ذریعہ علم کلام کی زریں خدمات انجام دیں۔

(۱) احیاء الشریعہ جلد اول کا اکثر حصہ (۲) پخدرور طبعیت یہ کتاب ایک

(قرن چہاردہم ۱۳۸۴ھ)

۴۴۔ علی ابن عبداللہ البحرانی۔ ان کا شمار بحرین کے علمائے کبار میں ہوتا ہے۔ بہت بڑے عالم و متکلم تھے۔ علم کلام میں انہوں نے دو مفید کتابیں تصنیف فرمائیں۔ (۱) لسان الصدق جو کہ بعض نصرانیوں کی کتاب میزان الحق کا رد ہے (۲) منار الہدیٰ فی اثبات امامۃ الائمۃ الاثنا عشر (اوائل قرن چہاردہم)

۴۵۔ مفتی محمد عباس ابن سید علی شوستری الجزائری اللکھنوی۔ آپ سید العلماء مولانا سید حسین و سلطان العلماء مولانا سید محمد کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے بہت بلند پایہ فقیہ و متکلم و بے بدل ادیب، نغز گو شاعر اور کثیر التصنیف والتالیف مصنف تھے۔ علاوہ دیگر علوم و فنون کے علم کلام میں بھی متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جو اکثر و بیشتر تحفہ اثنا عشریہ کے ردود ہیں جیسے صوارم الہیات، جواہر عبقریہ وغیرہ۔

جو حضرات حضرت مفتی صاحب کے مکمل سوانح حیات اور ان کی علمی نگارشات کے نمونہ جات دیکھنے کے طلبگار ہیں، انہیں ان کی مفصل سوانح عمری "تجلیات" نوشتہ مرزا عزیز لکھنوی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

(قرن چہاردہم)

۴۶۔ السید حامد حسین ابن السید مفتی محمد قلی نیشاپوری اللکھنوی۔ جناب شیخ عباس قمی نے اپنی کتاب ہدایۃ الاحباب صفحہ ۱۲۲ پر ان جناب کا بایں الفاظ ذکر کیا ہے۔ "سید اجل علامہ و فاضل ورع فہامہ، حجۃ الاسلام والمسلمین ناشر مذہب آباء الطاہرین انہوں نے علم کلام کی جو زریں خدمات انجام دیں، وہ "بماء الذہب" سے لکھنے کے قابل ہے۔

عبقات الانوار اسی معدن علم و فضل کے ان جواہر آبدار میں سے ہے جس کی نظیر کتب کلامیہ میں نہیں ملتی اور عرب و عجم کے علماء اس کی تعریف و توصیف بلکہ اس کے عدیم النظیر ہونے میں رطب اللسان نظر آتے ہیں

چنانچہ صاحب ہدایۃ الاحباب صفحہ ۱۰۱ پر رقمطراز ہیں۔ ہر کس کہ عبقات را مطالعہ کند خواہد دانست کہ در فن کلام سیما در مبحث امامت از صدر الاسلام تاکنوں احدے بداں منوال سخن نرانده و بداں نمط تصنیف نپرداختہ جو شخص بھی عبقات کا مطالعہ کرے گا۔ وہ یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ فن کلام بالخصوص مبحث امامت میں ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک کسی متکلم نے ایسا کلام نہیں کیا۔ اور نہ کسی مصنف نے ایسی طرز کی کتاب لکھی ہے۔ حق یہ ہے کہ صاحب ہدیہ نے کتاب کی اس تعریف و توصیف میں کوئی مبالغہ نہیں فرمایا۔ واقعاً یہ کتاب ایسی ہی ہے۔ یہ کتاب تقریباً تیس مجلدات پر مشتمل ہے اور بایں ہمہ خصوصیات تحفہ اثنا عشریہ کے فقط باب ہفتم (جو کہ مسئلہ امامت میں ہے۔) کا جواب ہے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ اس کتاب کو شائع ہوئے ہو چکا ہے۔ مصنف کتاب نے دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کے تیز حربوں سے اہل باطل کی کمر کو کچھ اس طرح توڑا ہے کہ انہیں آج تک ہنگامہ آرائی اور اس کتاب جلیل کے جواب پر قلم فرسائی کی جرأت و ہمت نہیں ہو سکی۔ ہاں اب سننے میں آرہا ہے کہ پنجاب ضلع جھنگ کے ایک دینی مدرسہ کے بعض مدرس حضرات اس کتاب جلیل کے بعض مجلدات کا جواب لکھنے کی لاحاصل سو ناکر رہے ہیں۔ خیر جواب تو وہ کیا لکھیں گے کیونکہ جب تک اپنی تمام مذہبی کتب کو صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح ہست و نابود نہ کردیں اس وقت تک اس کتاب کا جواب لکھا جا سکتا ہی نہیں۔ ہاں وہ اپنا منہ چڑھانے کی ضرور کوشش کریں گے اور اپنے چیلے چانٹوں سے داد بھی ضرور لیں گے اگرچہ علمی حلقوں میں انہیں فضیحت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ لیکن ان کی بلا سے ان کا تو مقصد ہی صرف یہ ہے کہ اتنی بڑی علمی کتاب کے جواب میں قلم فرسائی کریں ؎

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا [1]

(اوائل قرن چہاردہم)

---

[1] ۔ اڑھائی تین سو صفحوں کا ایک رسالہ بنام "حدیث ثقلین" جو کہ مدرسہ محمدی یوسفیہ شریف ضلع جھنگ کے بعض مدرسین کی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے جس میں عبقات الانوار کی حدیث ثقلین کے متعلق دو جلدوں کے جواب دینے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اور جناب علامہ حامد حسین صاحب نے ناقابل رد دلائل سے جو یہ ثابت کیا تھا کہ حدیث ثقلین میں کتاب اللہ و عترتی اھلبیتی" کے الفاظ موجود ہیں۔ مجیب نے بزعم خود اس متواتر حدیث کی سند میں خدشہ واقع کرکے یہ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے کہ حدیث میں "کتاب اللہ و سنتی" وارد ہے۔ ہم نے اپنی عنقریب شائع ہونے والی کتاب ان شاء اللہ تحقیقات الفریقین فی حدیث الثقلین" میں اس رسالہ کا تار و پود بکھیر کے رکھ دیا ہے اور مسکت شکن جواب باصواب تحریر کر دیا ہے۔ امید ہے اب ان کو یارائے سخن آرائی نہ ہو گا۔ (منہ عفی عنہ)

۷۔ سید ناصر حسین ابن سید حامد حسین۔ صاحب عبقات الانوار کے یگانۂ روزگار عالم علامہ وفاضل فہام خلفِ رشید اور سب کمالات و آثار میں اس بحرِ ذخار کے صحیح وارث ہیں۔

کما قال الشاعر

نشئت تتابع کابر عن کابر   کالرمح انبوبا علی انبوب

یہ جناب مدۃ العمر دیگر علمی و تحقیقی مشاغل کے ساتھ ساتھ عبقات الانوار کی تتمیم و تکمیل میں بھی مشغول رہے اور وہ اس سلسلہ میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے اور اس کی چند جلدیں تحریر فرمائیں۔ افسوس کہ اس علمی ذخیرے کی فقط چند جلدیں اب تک قوم کے ہاتھوں تک پہنچی ہیں۔ دیگر مجلدات ایک محفوظ خزانہ کی طرح ابھی تک لکھنؤ کے مشہور عالم کتب خانہ ناصریہ کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ خدا کرے کہ کسی طرح اس کتاب جلیل کی باقی مجلدات بھی چھپ کر شائقین تک پہنچ جائیں۔ سنا ہے کہ ایران میں اس کی طباعت کا کام شروع ہو گیا ہے۔ خدا کرے یہ خبر صحیح ہو۔ پہلے بھی ایران میں اس کی بعض مجلدات چھپی تھیں۔ نہ معلوم کن حالات کی بنا پر یہ سلسلہ مسدود ہو گیا تھا۔ تقاعد ہمم کے اس دور میں اس کتاب کے ایک جامع خلاصہ کی اشد ضرورت ہے۔ دیکھئے یہ سعادت کس کے حصہ میں آتی ہے۔ بہتر ہوتا کہ اسی خاندان کا کوئی چشم و چراغ اس اہم کام کو انجام دے دیتا۔ (قرن چہاردہم)

بر سبیل تذکرہ

چونکہ یہاں کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کا ذکر آگیا ہے۔ تو یہاں بر سبیل تذکرہ کچھ اس کتاب اور کچھ اس کے جوابات کے بارے میں تبصرہ کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ سو مخفی نہ رہے کہ اگرچہ عوام بلکہ اکثر خواص میں بھی مشہور یہی ہے کہ کتاب تحفۂ اثنا عشریہ شاہ عبد العزیز دہلوی کی تصنیف ہے۔ چنانچہ نزہۃ اثنا عشریہ، صوارم تبار، سیف ناصری، بصوارم الہیات اور حسام الاسلام وغیرہ کتب جلیلہ کی تصنیف تک یہی خیال عام تھا کہ یہ کتاب شاہ صاحب موصوف کے قلم باطل رقم کا نتیجہ ہے لیکن جناب سلطان العلماء سید محمد طاب ثراہ کے آخری ایام میں یہ انکشاف ہوا کہ یہ کتاب دراصل صواقع ملا نصر اللہ کابلی کا سرقہ اور اس کا ترجمہ ہے۔ اصل صواقع کا قلمی نسخہ دستیاب ہو گیا تھا جس سے یہ انکشاف ہوا۔ چنانچہ اس وقت سے جو کتابیں تحفہ کے جواب میں لکھی گئیں ان کے حواشی پر صواقع کی اصل عبارات بھی درج کر دی جاتی تھیں جس کے بعد یہ بات روز روشن سے بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

بہر حال اصل کتاب تحفہ بارہ ابواب پر مشتمل ہے جس کے ہر باب کے جواب میں نزہۃ اثنا عشریہ کی ایک ایک جلد لکھی گئی۔ اس کے علاوہ تحفہ کے مختلف ابواب کے جواب میں علماء شیعہ کثرہم اللہ فی البریہ نے جو جوابات لکھے ان کی تفصیل مع تفصیل ابواب تحفہ درج ذیل ہے۔

تحفہ کے باب اول میں شاہ صاحب نے اس کا دعویٰ کیا تھا کہ مذہب شیعہ ایجاد کردہ عبداللہ بن سبا

یہودی ہے۔ اس کے جواب میں کتاب سیف ناصری جناب علامہ محمد قلی خان صاحب مرحوم ایک لاجواب کتاب ہے۔

باب دوم تحفہ ۔ بیان مکائد شیعہ میں ہے اس باب کا جواب نزہتہ میں نہیں ملتا مگر جناب علامہ مفتی محمد قلی خان صاحب مرحوم نے تقلیب المکائد میں ایسا مدلل جواب دیا ہے کہ قابل دید ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے جس کو بہت عرصہ ہوا ۱۲۹۲ھ ہجری میں بمقام دہلی چھپی تھی۔

باب سوم تحفہ ۔ میں ذکر اسلافِ شیعہ ہے۔ اس کا جواب نزہتہ اثنا عشریہ جلد سوم میں شائع ہو گیا ہے مگر افسوس وہ نسخہ بھی کمیاب ہے صرف کتب خانہ سرکار مولانا السید ناصر حسین صاحب قبلہ مرحوم میں موجود ہے۔

باب چہارم تحفہ ۔ اقسام اخبار شیعہ اور احوال رجال اسانید میں ہے اس کا جواب جلد چہارم نزہتہ اثنا عشریہ میں صرف شائع ہوا بلکہ چھپ بھی گیا ہے اگرچہ وہ بھی نادر الوجود ہے۔

اس کتاب سے علامہ مرحوم کی غزارت علمیہ کا اور بھی پتہ چلتا ہے کہ خدا نے کیسی لیاقت علمی عطا فرمائی تھی کیونکہ باب امامت و مطاعن میں صدہا کتابیں سلف سے آج تک لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں کچھ تحریر کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے بخلاف اس بحث کے ہم جہاں تک جانتے ہیں یہ پہلی کتاب ہے جو اس جامعیت اور معقولیت سے لکھی گئی۔

باب پنجم تحفہ ۔ ذکر الہیات شیعہ میں ہے اس کا جواب بھی مکمل نزہتہ اثنا عشریہ جلد پنجم میں شائع ہو چکا ہے اس سلسلہ سے اور بھی یقین ہوتا ہے کہ باب دوم تحفہ کا جواب بھی علامہ نے ضرور لکھا ہو گا اگرچہ ہم کو نہ ملے۔

اس باب پنجم کے جواب میں جناب غفران مآب مولانا السید دلدار علی صاحب اعلی اللہ مقامہ نے بھی صوارم الٰہیات تحریر فرمائی جو اسی زمانہ میں چھپ گئی تھی۔

باب ششم تحفہ ۔ نبوت کے متعلق ہے جس کا جواب جناب غفران مآب طاب ثراہ نے حسام الاسلام میں تحریر فرمایا۔ اس باب کا جواب نزہتہ میں نہیں ملتا۔

باب ہفتم تحفہ ۔ امامت کے متعلق ہے اس کا جواب جناب غفران مآب نے شروع کیا مگر ناتمام رہا پھر جناب مفتی محمد قلی خان صاحب مرحوم نے برہان السعادۃ لکھی اور جناب سلطان العلماء مرحوم نے بوارق موبقہ اور جناب مفتی محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ نے جواہر عبقریہ تحریر فرمایا اور کتاب مستطاب عبقات الانوار نے جو تیس جلدوں میں ہے اس کا ایسا خاتمہ کیا کہ قیامت تک اہل سنت سے اس کا جواب نہیں ہو سکتا مگر افسوس کہ ہنوز یہ کتاب ناتمام ہے اور باوصفیکہ مسودات موجود ہیں مگر ترتیب و تالیف اس کی انجام نہیں پائی۔ خداوند عالم جلد کچھ ایسے اسباب مہیا کر دے کہ یہ کتاب مکمل شائع ہو جائے۔ اللّٰھم آمین۔

باب ہشتم تحفہ ۔ امور معاد کے متعلق ہے جس کا جواب جناب غفران مآب طاب ثراہ نے احیاء السنۃ

میں تحریر فرمایا ہے۔

باب نہم تحفہ ۔ مسائل فقیہ میں شاہ صاحب نے لکھا تھا جس کا جواب نزہتہ جلد نہم میں دیا گیا یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔

باب دہم ۔ رد مطاعن خلفاء ثلثہ میں ہے جس کا جواب کتاب تشئید المطاعن میں اس شرح و بسط سے مرقوم ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ کیونکر ایسی کتاب لکھی گئی۔ اس باب میں طعن الرماح جناب سلطان العلماء خاص بحث فدک میں اور بارقہ ضیغمیہ خاص بحث متعہ میں قابل دید ہے جس کا جواب رشید الدین خان نے شوکت عمریہ میں لکھا۔ اور اس کا جواب ضربت حیدریہ میں دیا گیا جو دو جلدوں میں ہے۔

باب یازدہم ۔ خواص مذہب شیعہ میں ہے جس کا جواب مفتی محمد قلی خان صاحب اعلی اللہ مقامہ نے مصارع الافہام میں تحریر فرمایا۔

باب دوازدہم ۔ تولا و تبرا میں ہے جس کا جواب جناب غفران مآب طاب ثراہ نے ذوالفقار میں تحریر فرمایا۔ جزاھم اللہ احسن الجزا۔

۷۸ ۔ سید ظہور حسین لکھنوی ۔ یہ بزرگوار بہت عظیم القدر جلیل الشان عالم و فاضل تھے اور منقول و معقول میں برابر مہارت تامہ رکھتے تھے، بالخصوص کتب شئید معتبر معقولات میں تو اپنے وقت میں ان کا کوئی عدیل نہ تھا۔ تمام زندگی تعلیمی و تدریسی اور علمی مشاغل میں گذری مختلف علوم و فنون میں گرانقدر تصانیف بھی چھوڑیں مگر فلک ناہنجار کی کج رفتاری سے اکثر منظرِ عام پر نہ آسکیں۔ علم کلام میں ان کے بعض رسائل مطبوعہ موجود ہیں۔ جیسے (۱) کتاب التوحید (۲) کتاب العدل (۳) کتاب النبوۃ۔ اُصولِ کافی کی بڑے علمی رنگ میں شرح لکھنا شروع کی تھی مگر افسوس یہ سلسلہ بعض ابواب کی شرح سے آگے نہ بڑھ سکا۔ (قرن چہاردہم)

۷۹ ۔ سید ابوالقاسم ابن سید حسین الرضوی القمی اللاہوری ۔ بہت بزرگ مرتبہ عالم و متکلم تھے پنجاب میں ان کی علمی خدمات سنہری حروف کے ساتھ لکھے جانے کے قابل ہیں۔ مرحوم نے علاوہ تفسیر وغیرہ کے علم کلام میں بہت سے کتب و رسائل تصنیف فرمائے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

معارف الملۃ الناجیہ والناریہ، برہان المتعہ، عشرہ کاملہ، شرح تجرید۔

علاوہ بریں ان کی تفسیر بے نظیر (لوامع التنزیل تیرھویں پارے تک) بھی مباحث کلامیہ کا ایک عمدہ شاہکار ہے۔ (قرن چہاردہم ۱۳۲۴ھ)

۸۰ ۔ سید علی ابن سید ابوالقاسم معروف بہ علامہ حائری ۔ آپ مولانا ابوالقاسم رضوی کے خلف رشید ان کے علم و عمل کے صحیح وارث اور بہت بلند پایہ عالم جلیل و متکلم نبیل تھے۔ مرحوم سید بڑے حرفی القول تھے۔ دین

کے معاملے میں بہت سخت تھے اور کسی قسم کی لومۃ لائم کی پروا نہیں کرتے تھے۔ پنجاب میں اب جو کچھ علمی چہل پہل ہے۔ اس فضا کے بنانے میں مرحوم حائری کی مساعی جمیلہ کو بہت کچھ دخل ہے۔ انہوں نے علم کلام کی بڑی خدمت کی اور اس میں گرانقدر آثار باقیہ چھوڑے جیسے غایۃ المقصود فی احوال المہدی الموعود چار جلد موعظہ حسنہ۔ موعظہ غدیر، موعظہ مباہلہ، فتاویٰ حائری منہاج السلامۃ۔ بشارات احمدیہ وغیرہا۔

ان کے علاوہ ان کی تفسیر بے نظیر لوامع التنزیل (جو کہ ان کے والد ماجد کی تفسیر کی تتمیم وتکمیل ہے اور بجائے خود سورۂ قمر تک لکھی گئی ہے) ابھی جہاں کتب تفسیر میں ایک بہت بلند اور ممتاز مقام رکھتی ہے بلکہ جامعیت وافادیت میں تمام کتب تفاسیر پر گوئے سبقت لے گئی ہے۔ وہاں مباحث کلامیہ کا بھی اس میں ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن افسوس کہ قوم کی بے حسی اور ناقدردانی کی وجہ سے آج تک یہ پوری تفسیر بے نظیر منظر عام پر نہ آسکی اور یہ بے نظیر علمی ذخیرہ لاہور کے اندر مرحوم علامہ کے مکتبہ میں ضائع ہو رہا ہے۔ میں نے خود اس کا ملاحظہ کیا ہے بہت بوسیدہ۔ کرم خوردہ اور خستہ حالت میں ہے۔ اگر کچھ عرصہ اور اسی حالت میں گزر گیا اور اس کی طباعت کا کچھ انتظام نہ ہو سکا تو پھر وہ ناقابل طباعت ہو جائے گی۔ مرحوم کے صاحبزادے جناب ابوالفضل صاحب رضوی زید مجدہٗ حقوق طباعت مفت دینے پر تیار ہیں بشرطیکہ کوئی قابل وثوق آدمی اس کی طباعت کے فرائض اپنے ذمے لے لے شاید

ع مردے از غیب آید وکارے بکند

واللہ الموفق والمعین (قرن چہاردہم)

۸۱۔ سید اسماعیل الطبرسی النوری۔ یہ بزرگوار فقہ واصول اور کلام میں مشہور فاضل جلیل ہیں۔ انہوں نے دیگر فنون کے علاوہ علم کلام میں بھی تین جلدوں میں ایک بڑی عمدہ کتاب موسوم بہ کفایۃ الموحدین تصنیف فرمائی جو کہ ایران میں کئی بار چھپ کر عوام وخواص کے لئے مورد استفادہ بنی ہوئی ہے۔ (قرن چہاردہم)

۸۲۔ شیخ احمد بن عبداللہ التبریزی الکوزہ کنانی۔ آپ بڑے جلیل القدر فاضل ہیں۔ آپ کے آثار جلیلہ سے علاوہ دیگر کتب کے علم کلام میں تین جلدوں میں ایک عظیم الشان کتاب ہدایت الموحدین بھی ہے جو کہ مطبوع ومتداول ہے۔ (قرن چہاردہم)

۸۳۔ محمد جواد ابن شیخ حسن البلاغی۔ مرحوم بلاغی کا شمار حوزۂ علمیہ نجف اشرف کے علمائے کبار کی صف اول میں ہوتا ہے۔ بہت بڑے عالم ومتکلم ومجاہد تھے۔ ان کی ساری عمر مذہب اسلام سے دفاع کرنے میں گزری۔ انہوں نے اسلام کی نصرت وتائید اور نصرانیت وہابیت اور دہریت کی رد میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جو سب کی سب چھپ کر خواص وعوام میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں جیسے الہدیٰ الیٰ دین المصطفیٰ دو جلد الرحلۃ المدرسیہ تین جلد رسالۃ التوحید والتثلیث نصائح الہدیٰ وغیرہا۔ (قرن چہاردہم ۱۳۵۶ھ)

۸۴۔ الشیخ محمد حسین ابن الشیخ علی آل کاشف الغطاء۔ یہ نابغۂ عصر ان علمائے اعلام میں سے تھے کہ جن کی ذات والا صفات پر اسلام و مسلمان جس قدر فخر و مباہات کریں وہ کم ہے۔ مرحوم شیخ جامع العلوم والفنون شخصیت کے مالک تھے اور تقریر و تحریر ہر دو کے بادشاہ تھے۔ اور علاوہ دیگر علوم و فنون کے علم کلام میں بھی انہیں پوری پوری دسترس اور مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ انہوں نے متعدد کتب تصنیف فرما کر اس علم کی افادیت میں معتدبہ اضافہ فرمایا ان کی مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ الدین والاسلام چار جلد (لیکن آخری دو جلدیں تاحال طبع نہیں ہو سکیں۔ اصل الشیعہ و اصولہا (اس کا ترجمہ اُردو بھی چھپ چکا ہے ہم ہر پڑھے لکھے آدمی سے اس کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کرتے ہیں) الآیات البینات المراجعات الریحانیہ وغیرہا (قرن چہاردہم ختم)

۸۵۔ سید غلام حسنین کنتوری۔ آپ بہت جلیل القدر و عظیم المرتبت عالم جلیل و متکلم نبیل اور علوم قدیمہ و جدیدہ میں مہارت تامہ رکھنے والے بزرگ تھے اور طبیعین و دہریین کے نظریات فاسدہ کی تردید میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا سید احمد خان نیچری نے جو مذہب کش تحریک شروع کی تھی۔ آپ اپنی دُوربین نگاہوں سے اس کے مضر اثرات کو بھانپ گئے تھے۔ اور اس کے خلاف علمی محاذ قائم کر کے اس کے نظریاتِ فاسدہ کا تار و پود بکھیر کے رکھ دیا۔ آپ نے علم کلام کی بڑی بیش قیمت خدمات انجام دیں اور گرانقدر تصانیف سے اس کی افادیت میں اضافہ فرمایا۔ خاص طور پر ان کی "انتصار الاسلام" ہر سہ جلد بہت مشہور اور مفید ہے۔ علاوہ بریں مفارقاتِ حسینیہ و عثمانیہ تا تین جلد سوم بھی اس سلسلہ میں خاص مقام رکھتی ہیں (قرن چہاردہم)

۸۶۔ شیخ عبد العلی الہروی الطہرانی۔ آپ بہت بلند پایہ فیلسوف و متکلم اور فاضل تھے۔ پنجاب میں جو کچھ علمی فضا موجود ہے اس میں بہت حد تک اس عالم جلیل کی برکات کا دخل بھی ہے۔ اگر بالفرض آپ کا اور کوئی فیض نہ ہوتا سوائے سرکار مولانا محمد سبطین صاحب مرحوم کے تو ان کی عظمت و جلالت کے اثبات کے لئے کافی تھا آپ کی تقاریر عالیہ کا ایک نفیس مجموعہ بنام "مواعظ حسنہ" کئی بار چھپ کر مقبولیت عامہ حاصل کر چکا ہے جو مباحث کلامیہ سے لبریز ہے۔ اس کتاب اور مولانا سید محمد سبطین صاحب مرحوم کی کتب میں علاوہ اس کے کہ ان کے بیان کردہ معارف نبوت و امامت میں قدرے افراط موجود ہے۔ ایک نقص اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کتب میں بعض غامض اور مشکل مسائل قدرے مجمل انداز میں بیان کئے گئے ہیں جنہیں کم تعلیم یافتہ طبقہ کما حقہ سمجھ نہیں سکتا۔ اس لئے بعض ناسمجھ لوگ ان کو پڑھ کر بعض عقائد فاسدہ مثلاً غلو و تفویض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کتب کا مطالعہ بڑی وقت نظر اور بیدار مغزی کے ساتھ کیا جائے تاکہ معارفِ نبوت و امامت کے سلسلہ میں ہر قسم کی افراط و تفریط سے دامن محفوظ رہے۔ واللہ العالم۔ (قرن چہاردہم)

۸۷۔ سید نجم الحسن لکھنوی۔ آپ لکھنؤ کے اکابر علماء اعلام و فقہائے کرام اور متکلمین عظام میں سے تھے۔ سرکار

نجم الملت نے بھی سرکار ناصر الملت کے دوش بدوش بہت جلیل القدر علمی خدمات انجام دیں اور ان دو بزرگوں کا باہمی اتفاق و اتحاد بھی ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم تمام اہلِ علم کو ایسے اتحاد و اتفاق کی توفیق مرحمت فرمائے۔ علم کلام کے سلسلہ میں مرحوم کا ایک نہایت نفیس و عمدہ رسالہ شریفہ بنام "النبوۃ والخلافۃ" نظر قاصر سے گذرا ہے۔ علاوہ بریں دیگر مختلف موضوعات پر رسائل لکھے۔ جناب نجم الملت کو حضرت مفتی محمد عباس مرحوم کی شاگردی و دامادی کا شرف بھی حاصل تھا۔ (قرن چہاردہم)

۸۸۔ سیّد محمد مہدی ابن سیّد محمد صالح کاظمی القزوینی۔ آپ بہت بلند پایہ عالم و متکلم اور مجاہد تھے ان کی ساری زندگی مذہب و ملت کی خدمت میں گذری۔ علم کلام میں بہت سی کتب تصنیف فرمائیں جیسے منہاج الشریعۃ جو ابن تیمیہ کی منہاج السنۃ کا جواب ہے۔ بوار الغالین جو فرقہ غالیہ کے نظریاتِ باطلہ کے ابطال میں عمدہ کتاب ہے۔ ہدی المنصفین در ردّ شیخیہ ذکری المہبور، ظہور الحقیہ۔ وغیرہا۔ (قرن چہاردہم)

۸۹۔ سیّد علی اظہر کھجوی۔ آپ صوبہ بہار کھجوہ کے بہت بزرگ مرتبہ عالم و متکلم تھے۔ نصرتِ مذہب اہل بیتؑ میں متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ذوالفقار حیدری، ارسال الیدین، اور ان کا جاری کردہ رسالہ اصلاح جو بحمدہ تعالیٰ اب تک جاری و ساری ہے۔ خاص طور پر رسالہ قابلِ ذکر ہے جس نے جلیل القدر مذہبی خدمات انجام دی ہیں اور دے رہا ہے۔ کثّرہ اللہ اشاعتہ۔ (قرن چہاردہم)

۹۰۔ سیّد حشمت علی خیر اللہ پوری۔ آپ بہت بلند مرتبہ عالم دین و محافظ شرع مبین تھے۔ پنجاب میں ان کی خدماتِ دینیہ کی فہرست طویل ہے۔ علم کلام میں انہوں نے متعدد رسالے تصنیف فرمائے جن میں سے رسالہ معراجیہ غایۃ المرام فی ضرورۃ الامام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ (قرن چہاردہم)

۹۱۔ السیّد عبدالحسین آل شرف الدین الموسوی العاملی۔ بڑے بلند پایہ عالم و متکلم و مجاہد تھے۔ ساری عمر مذہب حق کی نصرت اور دین اسلام کی خدمت میں گذری۔ اور علم کلام میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جو فریقین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں جیسے "المراجعات" یہ ان کی ایک مصری عالم سے مسئلہ امامت پر باہمی خط و کتابت کی تفصیل روئیداد سے مشتمل ہے اور بڑی عمدہ و دلچسپ کتاب ہے۔ فارسی اور اردو میں بھی اس کے تراجم چھپ چکے ہیں۔ "الفصول المہمہ فی تالیف الامہ" اجوبہ مسائل جار اللہ، حول الرویہ وغیرہا۔

ان کے علاوہ مرحوم کی اور بھی بہت سی گرانقدر تالیفات تھیں جو بعض حوادث روزگار کا شکار ہو گئیں جس کا تذکرہ مرحوم نے اپنی بعض تصانیف میں بڑے دردناک الفاظ میں کیا ہے۔ (اواخر قرن چہاردہم ۱۳۷۹ھ)

۹۲۔ السیّد محسن ابن سیّد عبدالکریم المعروف بہ علامہ سیّد محسن امین عاملی۔ یہ وہ ہی باغیرت فرزند اسلام اور بطل حریت عالم شہیر و مجاہد کبیر ہے کہ جب اس نے ایک مصری عالم کے متعلق یہ سنا کہ وہ کہتا ہے کہ

مذہب شیعہ میں علمی یا مالی لحاظ سے کوئی بلند شخصیت نہ گذری ہے اور نہ اب ہے" تو اس غیور عالم جلیل نے اتنی سی بات سے متاثر ہو کر کتاب لاجواب "اعیان الشیعہ" لکھنا شروع کردی جو کئی سال کی مسلسل کدوکاوش کے بعد چونتیس مجلدات تک پہنچی تھی کہ مرحوم مصنف کا انتقال ہوگیا۔ ان کے لائق فرزند ارجمند جناب سید حسن الامین نے اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا۔ موصوف اب تک اس کی مزید بیس مجلدات لکھ چکے ہیں۔ مجموعی طور پر چون جلدیں ہوچکی ہیں اور ہنوز تکمیل کی منزل دُور ہے۔ وفقہ اللہ للاتمام۔

یہ بزرگوار بہت کثیر التصنیف والتالیف ہیں۔ علاوہ دیگر موضوعات کے علم کلام میں بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

نقض الوشیعہ، البرہان علی وجود صاحب الزمان۔ اقناع اللائم فی اقامۃ الماتم۔ علاوہ بریں مجلدات معادن الجواہر فی علوم الاوائل والاواخر بھی مباحث کلامیہ سے لبریز ہیں۔ علاوہ بریں اعیان الشیعہ مجلد اوّل کا معتدبہ حصہ مباحث کلامیہ پر مشتمل ہے (اواخر قرن چہاردہم۔ (۹۳) سرکار مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی (۹۴) مولانا سید محمد ہارون صاحب زنگی پوری (۹۵) مولانا محمد رضی صاحب زنگی پوری (۹۶) مولانا سید راحت حسین صاحب گوپالپوری (۹۷) مولانا سید علی حیدر صاحب کجھوی (قرن چہاردہم) یہ پانچوں بزرگوار بڑے جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ انہوں نے بہت عظیم الشان خدمات دینیہ انجام دیں۔ اور اپنی گرانقدر کتب امامیہ سے علم کلام کے لٹریچر میں بہت مفید اضافہ فرمایا۔ اوّل الذکر مرحوم کی خلافت النبیہ سہ جلد مصحف ناطق ہر سہ جلد۔ اسلامی نماز اور الصراط السوی۔ نیز ان کا علمی اور تحقیقی رسالہ "البرہان" اور ثانی الذکر مرحوم کی کتاب توحید القرآن، امامت القرآن علوم القرآن اور ثالث الذکر مرحوم کی ابطال مادیت۔ نور الشیعہ، کشف الظلام اور رابع الذکر مرحوم کی کتاب بسط الیدین ماخذ بدا صفات ثبوتیہ اور خامس الذکر مرحوم کی جواہر قرآن اور تصویر عزا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شکر اللہ مساعیہم الجمیلۃ۔

(۹۸) حافظ علی محمد۔ (۹۹) حکیم امیر الدین ۔ یہ ہر دو بزرگوار علوم عربیہ کے ماہر اور جید عالم دین تھے اور ثانی الذکر تو حکمت یونانی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ہر دو بزرگوار پہلے بڑے متعصب سنی تھے۔ مکمل بارہ سال مذہبی تحقیقات میں صرف کئے۔ اسلام کے تقریباً ہر فرقہ کی مذہبی کتب کا مطالعہ کیا۔ علماء سے مناظرے و مباحثے کئے۔ اس طویل مباحثہ و مجاہدہ کے بعد بموجب ارشاد قدرت والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ ان پر یہ حقیقت واضح و آشکار ہوئی کہ تمام ادیان عالم میں دین اسلام برحق ہے اور پھر مذاہب اسلام میں سے مذہب شیعہ خیر البریہ صحیح مذہب ہے۔ چنانچہ انہوں نے بلاخوف لومۃ لائم اپنے تشیع کا اعلان کردیا ان کی بڑی مخالفت ہوئی۔ ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی مگر ان کے عزم و ثبات میں کوئی

تزلزل واقع نہ ہوا پہلے تو فرداً فرداً سب کو اپنی تبدیلی مذہب کے حقیقی علل واسباب بتاتے رہے لیکن جب یہ سلسلہ طوالت پکڑ گیا تو دونوں بزرگواروں نے مل کر اپنی بارہ سالہ تحقیقات کا نچوڑ "تلک النجاۃ فی الامامۃ والصلاۃ" ایسی جلیل القدر و عظیم الشان کتاب کی شکل میں شائع کردیا جس نے ہمیشہ کے لئے قال وقیل کا دروازہ بند کردیا۔ آج ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اس عظیم کتاب کو شائع ہوئے ربع صدی سے زائد عرصہ گذر چکا ہے مگر تا حال کوئی مخالف اس کا جواب نہیں لکھ سکا۔ حضرت مولانا امیر الدین صاحب مرحوم کا ایک رسالہ بھی اس موضوع پر موجود ہے۔ بنام "ابطال الاستدلال لاہل الزیغ والضلال"۔

مرحوم بڑے عبادت گذار اور خلیق و ملنسار تھے۔ (اواخر قرن چہارم)

علمائے عصر دامت برکاتہم

علمائے معاصرین کی ایک جمع کثیر و جم غفیر اپنی بضاعت و استطاعت کے مطابق علم کلام میں خدمات جلیلہ انجام دینے میں مشغول و منہمک ہے۔ زاد اللہ توفیقاتہم۔

ان کے اسماء گرامی کی فہرست بہت طویل ہے اور مضمون خلاف توقع بہت لمبا ہوچکا ہے۔ نیز اور بعض وجوہ کی بنا پر ان کے اسی اجمالی بیان پر ہی اکتفا کی جاتی ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم ان سب حضرات کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے اور انہیں بیش از بیش خدمات دینیہ انجام دینے اور علم کلام کو بام عروج تک پہنچانے کے لئے مؤید و مسدد فرمائے۔

حکم این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

مختصر سوانح حیات حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ

اس عالم ربانی و فاضل صمدانی۔ نقاد اخبار و ناشر آثار آئمہ اطہار شیخ الفقہین رئیس المحدثین صدوق العلماء البارعین کا اسم گرامی محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی اور کنیت ابو جعفر اور مشہور لقب شیخ صدوق ہے۔ یہ بزرگوار وہی ابن بابویہ ہیں جن کی روایت کردہ احادیث عام کتب حدیث میں ملتی ہیں۔ اور ان کا نام صحف علماء میں کالشمس فی رابعۃ النہار مشہور و معروف ہے۔

آپ کی ولادت حضرت صاحب العصر والزمان کی دعا سے ہوئی۔ حضرت شیخ طوسی اور دیگر بعض اعلام نے نقل کیا ہے کہ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ کے والد ماجد جناب شیخ علی بن حسین کی شادی اپنے عم محترم محمد بن موسیٰ بن بابویہ کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی لیکن ان سے ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے جناب ابو القاسم حسین بن روح نوبختی (جو کہ حضرت قائم آل محمد کے تیسرے نائب خاص تھے) کی خدمت میں مکتوب ارسال کیا کہ وہ حضرت صاحب العصر والزمان کی خدمت میں عرض کریں کہ وہ

بارگاہ ایزدی میں سفارش کریں کہ خداوندِ عالم ان کو ایسی اولاد عطا فرمائے جو فقیہ ہو۔ چنانچہ آپ نے آں جناب کی خدمت میں شیخ کی استدعا پیش کی، ناحیۂ مقدسہ سے جواب ملا کہ ہم نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی ہے مگر اس بیوی سے ان کی اولاد نہ ہوگی۔ لیکن عنقریب ان کو ایک دیلمیہ کنیز دستیاب ہوگی جس سے ان کو دو فقیہ بیٹے عطا ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور وہ دو فرزند ایک یہی جناب شیخ محمد بن علی اور دوسرے ان کے بھائی حسین بن علی متولد ہوئے۔ جب پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئے تو ان کی ذہانت و فطانت اور قوتِ حافظہ اس قدر تیز تھی کہ جو کچھ دوسرے طلبہ یاد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اسے بآسانی حفظ کر لیتے تھے۔ لوگ انکی قوت حافظہ سے تعجب کرتے اور پھر کہتے یہ خصوصی امتیاز ان کو حضرت امام عصر علیہ السلام کی دعائے مبارک کی وجہ سے حاصل ہوا۔ (روضات الجنات صص)

حضرت شیخ صدوق کی جلالت قدر و عظمت شان علماء اسلام کی نگاہ میں۔ رئیس المحدثین کی جلالت قدر و عظمت شان محتاج بیان نہیں ہے بلکہ وہ آفتاب آمد دلیل آفتاب کی مصداق ہے۔ تاہم دو چار اعلام کی تصریحات پیش کی جاتی ہیں۔ حضرت شیخ الطائفہ شیخ طوسی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب فہرست صفحہ ۱۵۶ و صفحہ ۱۵۷ طبع نجف میں لکھا ہے محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی جلیل القدر یکنی ابا جعفر کان جلیلا حافظا للاحادیث بصیرًا بالرجال ناقدًا للاخبار لم یر مثلہ فی القمیین فی حفظہ و کثرۃ علمہ لہ نحو ثلاث مأۃ مصنف و فہرست کتبہ معروف یہ شیخ جن کی کنیت ابو جعفر ہے، بڑے جلیل القدر اور حافظ حدیث، علم رجال کے ماہر اخبار کے ناقد تھے۔ اہل قم میں (جو کہ ہمیشہ سے مرکز علم و علماء رہا ہے) ان کے مثل کوئی عالم کثرتِ حفظ اور کثرت علم کے لحاظ سے نہیں دیکھا گیا۔ ان کی تصانیف قریبًا تین سو ہیں اور ان کی فہرستِ کتب مشہور ہے۔ حضرت علامہ حلی علیہ الرحمۃ خلاصۃ الرجال میں صص پر ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی ابو جعفر نزیل الری شیخنا و فقیہنا و وجہ الطائفۃ بخراسان ورد بغداد سنۃ خمس و ثلاثمأۃ و سمع منہ شیوخ الطائفۃ و ہو حدیث السن کان جلیلاً حافظاً للاحادیث بصیرًا بالرجال ناقد الاخبار لم یر فی القمیین مثلہ فی حفظہ و کثرۃ علمہ لہ نحو من ثلاثمأۃ مصنف ذکرنا اکثرہا فی کتابنا الکبیر۔

حضرت شیخ حر عاملی اعلی اللہ مقامہ نے امل الآمل میں صفحہ ۶۵ پر ان کے متعلق شیخ طوسی، علامہ حلی اور نجاشی کی عبارات کے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی یکنی ابا جعفر کان جلیلاً حافظاً للاحادیث بصیرًا بالرجال ناقداً للاخبار و لم یر فی القمیین مثلہ فی حفظہ و کثرۃ علمہ لہ نحو من ثلاثمأۃ مصنف قالہ الشیخ و العلامۃ

والنجاشی ۔ ان تمام عبارات کا مطلب تقریباً وہی ہے جو حضرت شیخ طوسی علیہ الرحمۃ کی عبارت کا ہے۔
حضرت شیخ عباس قمی علیہ الرحمۃ نے فوائد رضویہ ج ۲ ص ۵۶۰ میں ان کے حالات کی ابتدا ان الفاظ کے ساتھ کی ہے۔ محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی ابا والدیلمی اماً ابوجعفر العالم الجلیل والمحدث النبیل نقاد الاخبار وناشر اثار الائمۃ الاطہار علیہم السلام عماد الملۃ والمذہب والدین شیخ القمیین و ملاذ المحدثین شیخ مشائخ الشیعہ ورکن من ارکان الشریعۃ وشیخ الحفظۃ ووجہ الطائفۃ المستحفظۃ رئیس المحدثین والصدوق فیما یرویہ عن الائمۃ الطاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین
بہر حال آپ بہت بڑے ثقہ متورع عالم دین اور حافظ و ناشر احادیث سید المرسلین و آل الطاہرین تھے۔ آج جو کچھ آئمہ طاہرین کے آثار و اخبار ہمارے پاس موجود ہیں ان کا کافی حصہ آپ کے قلم مبارک کے برکات کا نتیجہ ہے۔
جناب نے شیعیان رے کی خواہش پر اپنے افادات کا مرکز شہر رے کو قرار دے کر وہیں رحل اقامت ڈالا تھا اور وہیں تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور خراسان بلکہ کوفہ و بصرہ ۔ مصر و مدائن اور قزوین وغیرہ کے شیعہ آپ کے ہی فتاوی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور آں جناب سے ہی مسائل دینیہ دریافت کر کے ان پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ جناب نے ان کے جوابات میں بعض رسائل بھی لکھے ہیں جن کے نام آپ کی فہرست کتب میں مرقوم ہیں۔

آپ کے تصنیفات و تالیفات ۔ اوپر علمائے اعلام کا کلام حق ترجمان نقل ہو چکا ہے کہ حضرت شیخ صدوق کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد قریباً تین سو ہے۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر حوادث زمانہ کا شکار ہو گئیں۔ جو کتب فی الحال موجود اور مورد استفادہ ہیں ان کے نام یہ ہیں۔
(۱) من لا یحضرہ الفقیہ۔ یہ ہماری ان کتب اربعہ میں سے ایک کتاب ہے جن پر مدار تشیع ہے۔ (۲) عیون اخبار الرضا، (۳) معانی الاخبار (۴) کتاب الخصال (۵) کتاب الامالی (۶) اکمال الدین و اتمام النعمۃ (۷) علل الشرائع (۸) ثواب الاعمال (۹) عقاب الاعمال (۱۰) کتاب التوحید (۱۱) صفات الشیعہ (۱۲) حقوق الاخوان (۱۳) فضل الشیعہ (۱۴) رسالہ عقائد شیعہ۔

آپ کی وفات اور ایک کرامت کا ظہور ۔ آپ کی وفات ۳۸۱ھ میں ہوئی۔ حضرت شہزادہ عبدالعظیم حسنی کے مضافات میں شہر رے میں مدفون ہوئے۔ آج کل وہاں ایک عالی شان قبہ اور عمدہ باغیچہ موجود ہے اور وہاں بعض اور اعلام کی قبور بھی موجود ہیں۔
اس کرامت کی تفصیل جس طرح کہ روضات الجنات میں مرقوم یہ ہے کہ قریباً ۱۲۳۸ھ میں جب کہ ایران

میں فتح علی شاہ قاچار مرحوم کی بادشاہت تھی۔ بارش کی شدت کی وجہ سے آپ کے مرقد مقدس میں شگاف پڑ گیا۔ اس کی اصلاح کی غرض سے معمار مقبرہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ نیچے ایک سرداب میں حضرت شیخ مدفون ہیں، ان کی نعش مبارک بالکل صحیح سلامت موجود ہے، سوائے شرمگاہ کے دوسرا جسم ننگا ہے۔ بڑے جسیم و وسیم ہیں۔ انگلیوں پر مہندی کے نشانات تک موجود ہیں۔ جسم کے ارد گرد کفن کے کپڑے گلڑے فتیلوں کی شکل میں پڑے ہیں۔ یہ خبر طہران میں مشہور ہوگئی حتیٰ کہ مرحوم فتح علی شاہ قاچار تک بھی پہنچی، چنانچہ وہ امراء و اعیان سلطنت کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ عمائد و اعیان نے بادشاہ کا اندر داخل ہونا قرین مصلحت نہ دیکھا۔ مگر دوسرے امناء و اعیان داخل ہوئے اور حقیقت الامر کی تصدیق کی۔ پھر قبر کی اصلاح کر دی گئی اور ملک معظم کے حکم سے اس پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ اور یہ واقعہ علماء کرام اور ثقات عظام بلکہ تمام خواص و عوام میں اس قدر مشہور ہے کہ اس کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اعلی اللہ مقامہ فرادیس الجنان۔

رسالہ اعتقادیہ اور اس کی پیش نظر شرح پر مختصر تبصرہ ۔ حضرت شیخ صدوق کا رسالہ اعتقادیہ ہر قسم کی تعریف و توصیف سے اجل و ارفع ہے اور جس وقت سے یہ لکھا گیا ہے برابر ہر دور میں علماء اعلام و فضلائے عظام کے لئے مورد استفادہ و استفاضہ اور ان کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ بڑے بڑے علماء اعلام نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کئے ہیں۔ اس کے مندرجات کی صحت و جامعیت اور وثاقت کے لئے یہی امر کافی ہے کہ شیخ الطائفہ شیخ طوسی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب فہرست ص۱۸۸ طبع نجف اشرف میں اس کو "کتاب دین الامامیۃ" سے تعبیر فرمایا ہے۔

خریت فن رجال عالم ربانی آغا بزرگ طہرانی اعلی اللہ مقامہ نے اپنی کتاب الذریعہ الی تصانیف الشیعہ ج ۲ ص۲۲۶ طبع نجف میں اس رسالہ کے متعلق لکھا ہے۔ الاعتقادات للشیخ ابی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی المتوفی بالرائے ۳۸۱ھ طبع مکرراً اولہ الحمد للہ رب العلمین وحدہ لا شریک لہ، املاہ فی نیشاپور فی مجلس یوم الجمعۃ ثانی عشر شعبان ۳۶۸ھ لما سألہ المشائخ الحاضرون ان یملی علیہم وصف دین الامامیۃ علی وجہ الایجاز ولذا اسماہ الشیخ فی الفہرس بدین الامامیۃ ذکر فیہ جمیع اعتقادات الفرقۃ الناجیۃ الضروریۃ منہا وغیر الضروریۃ الوفاقیۃ منہا وغیر الوفاقیۃ ولہ شروح وترجمۃ نذکرھا فی محالہا۔

یعنی رسالہ اعتقادیہ مولفہ شیخ ابو جعفر ... کئی مرتبہ طبع ہو چکا ہے جس کی ابتدا اس طرح ہے۔ الحمد للہ رب العالمین وحدہ لا شریک لہ۔ حضرت شیخ نے بتاریخ بارہ شعبان ۳۶۸ھ

بروز جمعہ اسے لکھوایا تھا جب کہ علماء حاضرین نے آپ سے استدعا کی تھی کہ مختصر طور پر مذہب امامیہ کے عقائد و اصول ان کو لکھوا دیں۔ اسی بنا پر حضرت شیخ طوسی علیہ الرحمۃ نے فہرست میں اسے دین امامیہ سے موسوم کیا ہے۔ اس رسالہ میں حضرت شیخ نے فرقہ ناجیہ کے تمام اعتقادات کو بیان کیا ہے۔ خواہ وہ ضروری ہوں۔ یا غیر ضروری اتفاقی ہوں یا غیر اتفاقی۔ اس کی بہت سی شرحیں اور ترجمے ہیں جن کا ہم مناسب مقامات پر ذکر کریں گے۔"

جیسا کہ حضرت آغا بزرگ صاحب طہرانی نے فرمایا ہے یہ درست ہے کہ رسالہ اعتقادیہ میں بعض مختلف فیہ مسائل بھی موجود ہیں۔ ایسا نہیں کہ آیات محکمات کی طرح اس کا بیان کردہ ہر ایک عقیدہ بلا چون وچرا اور بلا تاویل وتامل واجب القبول ہو۔ ہاں وہ اختلافی عقائد النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ کما لا یخفیٰ علی الناظر الخبیر۔ اس رسالہ شریفہ کا موجودہ بامحاورہ ترجمہ ہمارے ایما پر قوم کے مشہور محقق نوجوان مولوی سید منظور حسین بخاری مولف سیاست معاویہ و یزید وغیرہ کے قلم کا نتیجہ ہے اور ہم نے اس پر نظر ثانی کر کے جا بجا مناسب اصلاح کر دی ہے۔

اس رسالہ کے متعدد شروح و حواشی میں سے ایک شرح یہی احسن الفوائد بھی ہے جس کا یہ مقدمہ لکھا جا رہا ہے۔ اس شرح کی جامعیت وافادیت اور اس کی تحقیقات کا صحیح اندازہ تو حضرات اہل علم مطالعہ کے وقت ہی لگائیں گے ہم اس کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ اس میں خود ستائی کی بو آتی ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ البتہ اظہار حقیقت اور شکرانہ نعمت کے طور پر اتنا عرض کرنا شاید بے جا نہ ہو کہ اس شرح کے ذریعہ شیعہ علم کلام میں ایک معتدبہ اضافہ ہوگا۔ اور بالخصوص اُردو زبان میں اس فن میں جو خلا موجود تھا وہ کافی حد تک پر ہو جائے گا۔ اس کتاب میں عصر حاضر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ان کو پورا کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ اس کا طرز استدلال اور طریقہ بیان اس پر شاہد ہے۔ ہر ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور عقلی و نقلی دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ قائم کئے گئے ہیں۔ اختلافی مسائل وعقائد میں علماء متقدمین ومتاخرین کے تحقیقات و نظریات کا لب لباب پیش کیا گیا ہے۔ ہر ہر موضوع پر ملاحدہ و منکرین کے جملہ شکوک و شبہات کو عقلی و نقلی، علوم قدیمہ وجدیدہ کی روشنی میں زائل کیا گیا ہے۔ اور تمام موضوعات پر شیعہ اصول و عقائد کی برتری ثابت کی گئی ہے

خلاصہ یہ کہ یہ کتاب بفضلہ تعالےٰ مسائل اصولیہ وکلامیہ میں قرآن کریم۔ احادیث معصومین اور علماء متقدمین ومتاخرین کی تحقیقات کا نچوڑ ہے۔ اس کتاب کے مدلل ومبرہن ہونے کا یہ عالم ہے کہ کوئی بات بھی معتبر حوالہ وسند کے بغیر معرض تحریر میں نہیں آئی۔ الغرض نہ اس نے کسی طالب حق وحقیقت کے لئے کوئی عذر چھوڑا ہے اور نہ کسی مخالف ومعاند کے لئے کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے۔ ان حقائق کی روشنی

میں بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی جامع و مکمل کتاب اس سے قبل اگر کسی بھی زبان میں نہیں تو کم از کم اُردو زبان میں تو نہیں لکھی گئی۔ وذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔ مگر اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب ہر قسم کے لفظی و معنوی عیوب و اسقام سے خالی ہوگی۔ بتقاضائے بشریت لفظی یا معنوی خطا کا سرزد ہونا ناممکن نہیں ہے امید ہے کہ قارئین کرام بقول اقبال ع

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا　　غواص کو موتی کی طلب ہے نہ صدف کی

الفاظ کی بجائے معانی و مطالب پر زیادہ توجہ مبذول فرمائیں گے اور اگر کہیں کوئی سقم نظر آئے تو بجائے زبانِ اعتراض دراز کرنے کے ایسے مقامات کی قلم عفو سے اصلاح کریں گے دعا ہے کہ خداوند عالم ہماری اس ناچیز سعی کو شرف قبولیت بخشے۔ اور اس کے فیض کو یوم القیام تک عام و تام فرمائے۔

بجاہ القائم من آل العباء و جدہ المصطفیٰ و آلہ البررۃ الاتقیاء مصابیح الدجیٰ و اعلام الھدیٰ و منار التقیٰ والعروۃ الوثقیٰ علیہ و علیھم صلوات الملک العلی الاعلیٰ

حررہ المتمسک بالثقلین
الاحقر محمد حسین عفی عنہ پرنسپل دار العلوم محمدیہ سرگودھا
۱۳ ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ بمطابق ۱۷ اپریل ۱۹۶۵ء

دیباچہ طبع ثانی

خدائے کریم کے احسان عمیم سے بطفیل سرکار معصومین صلوات اللّٰہ علیہم اجمعین وہ وقت بھی آگیا کہ ہم احسن الفوائد فی شرح العقائد مفید اضافہ جات اور مزید تحقیقات کے ساتھ دوسری بار ابناءِ ملک و ملت کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں ——— اس کی پہلی اشاعت کے بعد جہاں ہم ان علم دوست اصحاب و احباب کے سپاس گزار ہیں، جنہوں نے حد سے زیادہ اس کتاب کی قدر افزائی فرمائی۔ وہاں ان حضرات کے لیے بھی دعاگو ہیں جنہوں نے نہ صرف تقریر و تحریر کے ذریعہ بلکہ اور بھی مختلف تخریبی صورتوں سے اس کے اور اس کے مصنف کے خلاف ہنگامہ آرائی فرمائی۔ ربّ اھد قومی انھم لا یعلمون۔

اس اشاعت میں جہاں تک ممکن تھا اس کتاب کو بہر لحاظ پہلے سے زیادہ مکمل و مدلل اور عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے، نیز باطنی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری زیبائش و آرائش کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے، امید واثق ہے کہ علمی و قومی حلقوں میں ہماری اس تازہ پیشکش کو بنظر استحسان دیکھا جائیگا۔ انشاء اللّٰہ العزیز

دیباچہ طبع چہارم

باسمہ سبحانہ۔ خداوند کریم کے فضل و کرم سے وہ وقت آگیا ہے کہ کتاب مستطاب احسن الفوائد فی شرح العقائد ظاہری و باطنی زیبائش و آرائش سے مزین ہو کر چوتھی بار منتظر حضرات کے مشتاق ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔

الاحقر محمد حسین عفی عنہ پرنسپل دار العلوم محمدیہ سرگودھا
جون ۱۹۹۹ء (م)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ وَحَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ

باب اوّل | باب

فی صفۃ اعتقاد الامامیۃ فی التوحید | توحید باری تعالٰی کے بارہ میں شیعہ امامیہ کا اعتقاد

(اس باب میں معرفت توحید حق نیز خداوند عالم کی ذات وصفات سے متعلق بعض آیات متشابہات کی توضیح وتشریح مذہب امامیہ کے اصول کے مطابق بیان کی گئی ہے)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِہِمْ اَجْمَعِیْنَ۔

تمہید سدید

رسالہ شریفہ وعجالہ لطیفہ معروف بہ "اعتقادیہ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ" کی جامعیت و وثاقت اور افادیت مگر اس کے انتہائی اختصار کے پیش نظر مدت مدید وعرصہ بعید سے یہ تمنا تھی کہ اس کی ایک مبسوط ومفصل اور مکمل ومدلل شرح لکھی جائے لیکن ہمیشہ دیگر دینی وعلمی مشاغل کی کثرت اس نیک مقصد کو عملی جامہ پہنانے سے مانع رہی حتی کہ گذشتہ سال بعض اہل علم احباب الباب نے بھی اس کی شرح لکھنے پر اصرار فرمایا۔ اپنی دیرینہ تمنا اور ان احباب اخیار کے مخلصانہ اصرار نے اس امر پر آمادہ کیا کہ دیگر مشاغل سے کچھ وقت نکال کر اس اہم دینی کام کو انجام دیا جائے۔ چنانچہ بفضلہ وعونہ تعالٰی احسن الفوائد فی شرح العقائد لکھنا شروع کر دی ہے۔ سچ ہے۔ کل امر مرھون باوقاتہ۔ امید کامل ہے کہ ہماری اس علمی وتحقیقی پیشکش کو سوائے حاسدین کے باقی تمام طبقات کی طرف سے بنظر استحسان وپسندیدگی دیکھا جائے گا۔ انشاء اللہ۔ بہرحال المسعی

مناد الانعام من اللہ ۔ وھو حسبی و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر !!

صانع عالم کا وجود بدیہی ہے یا نظری؟

چونکہ سرکار مصنف علام قدس سرہ نے شاید مسئلہ اثبات صانع کو اس کی بداہت اور اس کے فطری ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اسی رسالہ کے آٹھویں باب میں اس مطلب کی تصریح فرمائی ہے (اس لئے ہم اس کی اہمیت کے پیش نظر اس پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں) مخفی نہ رہے کہ معرفت ایزدی کے بدیہی یا نظری ہونے کے بارے میں تین قول ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ معرفت بالکل بدیہی ہے اور کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں ہے۔ دوئم یہ کہ کچھ بدیہی ہے اور کچھ نظری۔ سوم یہ کہ بالکل نظری و کسبی ہے اور محتاج دلیل و برہان ہے و خیر الامور اوسطھا۔ درمیانہ قول ہی اقرب الی الرشد والصواب ہے۔ دوسرے دونوں قول افراط و تفریط کی وجہ سے ناقابل قبول ہیں۔ اس درمیانے قول کا مطلب یہ ہے کہ خدائے رحمٰن و رحیم کی اس قدر اجمالی معرفت تو بالکل بدیہی اور فطری ہے کہ اس عالم کا ضرور صانع علیم اور خالق قدیر و حکیم موجود ہے۔ ہاں البتہ اس کی پوری معرفت کہ آیا وہ واحد ہے یا شریک رکھتا ہے۔ وہ جسم رکھتا ہے یا نہیں۔ کسی مکان میں ہے یا لامکان ہے۔ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان حقائق کی معرفت البتہ نظری اور محتاج دلیل برہان ہے۔ اس بیان سے ان تمام مختلف آیات و روایات کے درمیان بطریق احسن جمع و توفیق ہو جاتی ہے جن میں سے بعض اس معرفت کی بداہت اور بعض اس کے نظری ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ کما لایخفیٰ۔

خالق کائنات کی ہستی کا اجمالی اقرار بدیہی ہے

جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے خلاق عالم کی ہستی کا اجمالی ثبوت بدیہی و فطری ہونے کی وجہ سے کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں ہے۔ خدا کی ذات کا اقرار و اعتراف انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ جس طرح کل کا جزو سے بڑا ہونا اور اجتماع و ارتفاع نقیضین کا محال ہونا اور ناقد کا معطی شئی نہ ہو سکنا یا جس طرح برف کی برودت اور آگ کی حرارت بدیہی و ضروری ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی بدیہی و فطری ہے کہ معلول کا بلا علت، اثر کا بلا مؤثر، فعل کا بلا فاعل، مصنوع کا بلا صانع، بنا کا بغیر بانی اور جنایت کا بغیر جانی صادر ہونا ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے مشرکین کو بھی وجود صانع سے یارائے انکار نہ تھا۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ ولئن سالتھم من خلق السموٰت والارض لیقولن اللہ۔ اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ پکار اٹھیں گے کہ اللہ نے۔" بھلا واجب الوجود اور خالق ہر موجود کے وجود مسعود ہی میں شک ہو تو پھر کسی شئے کا وجود کیونکر ثابت ہو سکتا ہے؟ افی اللہ شک فاطر السمٰوات والارض۔ آیا اس خدا کی ہستی میں کوئی شک ہو سکتا ہے جو آسمان و

زمین کا خالق ہے۔ ولقد احسن من قال ع

وکیف یصح فی الاذھان شیٔ اذا احتاج النھار الی الدلیل

یعنی اگر روز روشن بھی دلیل و برہان کا محتاج ہو تو پھر اور کوئی شئی کیونکر ذہن میں آسکتی ہے۔

ارباب معقول جانتے ہیں کہ معرّف اور دلیل کے لئے مدلول و معرّف سے اجلیٰ و اعرف، اور زیادہ واضح ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بنا بریں اگر ذاتِ باری تعالیٰ کا اثبات بھی دلیل و برہان کا محتاج ہو تو لازم آئے گا کہ وہ معرّف اور دلیل ذاتِ حیّ و قیوم سے زیادہ واضح و روشن ہو، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کیف یستدل علیك بما ھو فی وجودہ مفتقر الیك ایکون لغیرك من الظھور ما لیس لك حتی یکون ھو المظھر لك متی غبت حتی تحتاج الی دلیل یدل علیك ...... عمیت عین لا تراك علیھا رقیبا الدعاء ... بار الہا! تجھ پر ان چیزوں سے کس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے جو خود اپنے وجود میں تیری محتاج ہیں۔ کیا تیرے غیر کے لئے اس قدر ظہور و وضوح ہے۔ جو تیرے لئے نہیں ہے تاکہ وہ تیرے لئے ظاہر کنندہ قرار پائے۔ یا اللہ! تو کب غائب تھا کہ دلیل کا محتاج ہو؟ وہ آنکھ اندھی ہو جائے جو تجھے اپنے اوپر نگران نہیں دیکھتی۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناسازِ بے اندامِ ماست ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

یہی وجہ ہے کہ علم الانسان کے ماہروں نے اس مسئلہ پر بہت بحث و تمحیص کی ہے کہ انسان جب بالکل فطری حالت میں تھا یعنی جس وقت علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا نام و نشان نہ تھا۔ اس وقت اس نے پہلے اصنام کی پرستش کی تھی یا خدا کی؟ مادیین کے سوا دیگر تمام علماء محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسان نے پہلے خدا تعالیٰ کی پرستش کی تھی۔ چنانچہ محقق مکس مولر اپنی کتاب میں لکھتا ہے: ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکایا تھا جب کہ وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکے تھے: یہی سبب ہے کہ جس زمانہ سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے دنیا کے ہر حصہ میں خدا تعالیٰ کا اعتقاد موجود تھا۔ ثوری، مصری، کلدانی، یہود، اہل فنشیہ سب کے سب خدا کے قائل تھے۔ پلوٹارک کہتا ہے اگر تم دنیا پر نظر ڈالو گے تو بہت سے ایسے مقام ملیں گے جہاں نہ قلعے ہیں نہ سیاست نہ علم نہ صناعت نہ حرفت نہ دولت لیکن ایسا کوئی مقام نہیں مل سکتا جہاں خدا نہ ہو (از علم الکلام) ہاں چونکہ اکثر یہ فطری احساس خارجی اسباب سے دب جاتا ہے۔ اس لئے خداوند عالم نے جابجا اسی فطرت کو متنبہ کیا ہے۔ اور اس کے فرستادگان کا چونکہ سب سے بڑا نصب العین دعوت الی التوحید ہی تھا۔ اس لئے جب

بھی انہوں نے کہیں خالق عالم کے وجود میں شک و ریب کے آثار دیکھے ۔ فوراً اسی فطرت انسانیہ کو جھنجوڑا اور تعجب خیز انداز سے خطاب فرمایا ۔ کما قال عز شانہٗ قالت لھم رسلھم افی اللہ شک فاطر السموات والارض ۔ ان کے رسولوں نے فرمایا کیا تمہیں اس خدا تعالےٰ کے وجود میں شک و شبہ ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے ۔ منقول ہے کہ محقق دوانی اثبات واجب الوجود پر ایک رسالہ لکھنے بیٹھے ۔ ان کی خادمہ نے ان سے دریافت کیا کہ کس موضوع پر خامہ فرسائی کرنا چاہتے ہو ؟ انہوں نے جواب دیا ۔ اثبات صانع پر ؟ خادمہ نے فوراً یہی آیت پڑھی ۔ افی اللہ شک فاطر السموات والارض ۔ بھلا اُس خدا کے وجود میں بھی شک ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے ۔ دوانی نے قلم رکھ دیا اور اپنے ارادہ کو ترک کر دیا ۔

حضرت امام رضا علیہ السلام توحید کے متعلق ایک طویل حدیث شریف کی ابتداء میں فرماتے ہیں ۔ الحمد للہ الملھم عبادہ الحمد وفاطرھم علی معرفۃ توحیدہ ۔ سب تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے اپنے بندوں کو اپنی حمد و ثنا کرنے کا طریقہ تبلایا اور ان کو اپنی معرفت توحید پر پیدا کیا الکتاب حقیقت یہ ہے کہ خالق عالم کا وجود آفتاب و ماہتاب کے وجود سے بھی زیادہ بدیہی اور واضح ہے ۔ اور ہرگز کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں ہے مگر خارجی اسباب و اثرات سے بعض اوقات یہ فطری و بدیہی احساس اس قدر دب جاتا ہے کہ محض تنبیہ و اشارہ اسے بیدار کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا اس لئے خدا اور اُس کے نمائندگان نے اس پر اکتفا نہیں کیا ۔ بلکہ تجربی اور حسی مقدمات کے ذریعہ استدلال بھی کیا ہے جس کے کچھ نمونے ابھی ذیل میں پیش کئے جائیں گے انشاءاللہ ۔ بہر حال چونکہ ہستی باری تعالیٰ کا مسئلہ بالکل فطری اور بدیہی تھا اس لئے قرآن مجید میں اس پر زیادہ بحث نہیں کی گئی ۔ صرف بعض تنبیہات اور بعض استدلالی اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے کیونکہ کسی بدیہی مسئلہ کو موضوع بحث و استدلال بنانا اور اس پر طول طویل دلائل پیش کرنا جہاں خلاف حکمت ہے وہاں اس سے ایک سہل و آسان مسئلہ خواہ مخواہ مشکل اور نظری بن جاتا ہے ۔ الغرض اگر فطرت انسانیہ بالکل مسخ نہ ہو جائے تو خالق کائنات کی ہستی کا مسئلہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور اسی طرح فطری و بدیہی ہے جس طرح خود اپنے وجود اور اپنی ہستی کا مسئلہ بدیہی ہے ۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

یہاں یہ شبہ پیش کیا جا سکتا ہے ۔ بلکہ پیش کیا بھی جاتا ہے کہ اگر صانع عالم کی ہستی کا اقرار انسانی فطرت میں داخل ہونے کی وجہ سے فطری و بدیہی ہے تو پھر منکرین خدا کی یہ ہنگامہ آرائی اور غوغا نوائی کیسی ہے ؟ اس شبہ کا ازالہ تین وجہوں سے کیا جا سکتا ہے ۔

وجہ اوّل ۔ ابھی اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ فطری احساس بعض اوقات خارجی اسباب و اثرات مثل ماحول و سوسائٹی کی خرابی ۔ غلط تعلیم اور مادیات میں حد سے زیادہ مشغولیت وغیرہ امور کی وجہ سے دب جاتا ہے ۔ جیسا کہ حدیث میں

وارد ہے۔ کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام ثم ابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ
ہر بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔
وجہ دوئم۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شے کی شدتِ ظہور اور فرطِ وضوح بھی اس کے لئے باعث خفا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب اور چمگادڑ کی مثال سے یہ امر واضح ہے ع

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

بعض ادعیہ مبارکہ میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے یا خفیًا من فرط الظھور۔ اے وہ ذات جو کثرتِ ظہور کی وجہ سے مخفی ہے۔ بعض دعاؤں میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ یا من احتجب بفرط ظھورہ عن ذوا ظر خلقہ۔ اے وہ ذات جو اپنی شدت ظہور کے باعث اپنی مخلوق کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ علاوہ بریں چونکہ اشیاء کی معرفت اور صحیح قدر و قیمت ان کی اضداد سے ہوتی ہے۔ اگر تاریکی نہ ہوتی تو نور کی معرفت نہ ہو سکتی تھی اور نہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو تا۔ سچ ہے۔ تعرف الاشیاء باضدادھا۔ چنانچہ قصص اختراعیہ میں ہے کہ ایک مرتبہ دریا کی سب چھوٹی مچھلیاں مل کر سب سے بڑی مچھلی کے پاس گئیں اور جا کر اس سے یہ استدعا کی کہ ہم مدت سے پانی کا نام سنتی آئی ہیں، ذرا ہمیں اس کا مشاہدہ کرا دیجئے۔ بڑی مچھلی نے کہا تم پہلے مجھے وہ جگہ دکھا دو جہاں پانی موجود نہ ہو تاکہ میں تمہیں بتلاؤں کہ یہ پانی ہے (الدین والسلام) ولقد اجاد من افاد۔ ع

خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

بلا تشبیہ حضرت رحمٰن و انسان کا باہمی معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ حضرت انسان نے ابھی عالم رنگ و بو میں قدم بھی نہ رکھا تھا کہ الطاف و مراحم الٰہیہ کی اس پر بارش شروع ہو گئی عالم آب و گل میں آیا تو ذرہ ذرہ میں جمال معبود کا جلوہ موجود پایا اور انوار ربانیہ کے تشعشع نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اس لئے وہ بعض اوقات غفلت کا شکار ہو کر اس کے وجود ہی میں تردد کرنے لگا بلکہ انکار تک نوبت پہنچ گئی۔ مگر ان دو قسم کے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے معمولی سی تنبیہ کافی ہوتی ہے۔ ع

چند ایں ہزار ذرہ سراسیمہ می دوند در آفتاب و غافل ازاں کافتاب چیست

وجہ سوم۔ منکرین خدا کی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے کہ اگرچہ وہ آثارِ قدرتِ الٰہیہ کو مشاہدہ کرتے ہیں، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عجیب و غریب آثار بغیر کسی شرعلیم اور یہ صنائع محکم بغیر کسی صانع حکیم کے موجود نہیں ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ شہوات نفسانیہ اور لذات جسمانیہ میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ وہ کسی صورت میں ان سے دست بردار ہو

کہ تکالیفِ شرعیہ کے زیرِ بار نہیں ہونا چاہتے۔ اور چونکہ فطرتاً اُن کے نفوس میں خوفِ عذابِ اُخروی کے تصور سے اضطراب و انقباض پیدا ہوتا ہے وہ اُسے زائل کرنے کے لئے مختلف ظنون و اوہام اور خیال ہائے خام سے وجودِ واجب الوجود کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ خداوند عالم نے ان لوگوں کی یہ کیفیت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔ وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء۔ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون۔ جو لوگ اللہ سبحانہ کے علاوہ دیگر شرکاء کی اتباع و پیروی کرتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہے۔ بلکہ وہ محض ظن و گمان کی پیروی کرتے ہیں۔ اور وہ خیالی باتیں کرتے ہیں۔ اسی بنا پر مادیین کے بڑے بڑے لیڈر مثل سٹالین۔ لینن وغیرہ کے بیانات موجود ہیں کہ ہمارا سب سے اہم اور پہلا مقصد دین کا ختم کرنا ہے۔ کیونکہ دین ہی ہمیں اپنے مقاصد کے حصول کے سلسلہ میں بعض ذرائع مثل مکر و فریب اور کذب و افتراء کے استعمال سے روکتا ہے۔ اور خواہشاتِ نفسانیہ کے پورا کرنے پر قدغن کرتا ہے (الشیوعیۃ والاسلام) اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے۔ یہ گروہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے لئے ارشاد و ابلاغ اور انذار و تبشیر کچھ سودمند نہیں ہوتی۔ الا من رحم اللہ وقلیل ما ھم) نعوذ باللہ من شرور انفسنا وسیئات اعمالنا ومن شر الشیطان ومن الغوایۃ والخذلان۔

بہرکیف مذکورہ بالا حقائق کے پیشِ نظر حضرت مصنفِ علامؒ اور ان کی طرح بعض دیگر علمائے اعلام نے بھی اثباتِ صانع سے بحث نہیں کی۔ اور اثباتِ توحید سے ہی سلسلۂ کلام کی ابتدا کی ہے۔ ہم بھی ضرور ان حضرات کی تاسی کرتے مگر عصرِ حاضر کے تقاضے مجبور کرتے ہیں کہ اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ اگرچہ ابتدائے آفرینشِ عالم سے ہمیشہ ایسے کچھ کم عقل اور کج فطرت انسان موجود رہے ہیں جو صانعِ عالم کے وجود ایسے بدیہی و فطری مسئلہ میں شاک و متردد یا صریح طور پر منکر تھے۔ مگر موجودہ دورِ جہاں مادی ترقی۔ سائنسی ارتقاء اور جدید انکشافات کے اعتبار سے عصرِ طلائی۔ عصرِ نور اور عصرِ ارتقائی اور نہ معلوم کن کن عمدہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے وہاں دینی و روحانی طور پر تنزل و انحطاط کے لحاظ سے دورِ کفر و الحاد اور عصرِ زندقہ و فساد بھی کہلاتا ہے۔ اس عصر نے مذہبی اقدار پر کاری ضربیں لگائی ہیں۔ اور دین و مذہب کی طرف سے عام لوگوں کو بیگانہ و بدگمان کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اب ملاحدہ و زنادقہ یعنی منکرینِ دین و مدعیٔ خدا کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا ہے جو خود بھی مختلف قیاساتِ فاسدہ و خیالاتِ کاسدہ کی بناء پر خالقِ کائنات کی ذاتِ جامع جمیع صفات کا انکار کرتے ہیں اور مزید برآں مختلف طبیعی شکوک و شبہات سے سادہ لوح اور بے خبر لوگوں کے اعتقاد پر بھی ڈاکہ ڈالتے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہی علومِ جدیدہ ان لوگوں کے لئے جن کی چشمِ بصیرت

بالکل بند نہیں ہوگئی۔ اور فطرتِ صحیحہ میں ہنوز کچھ رمقِ حیات باقی ہے۔ کحل البصیرت ثابت ہو رہے ہیں۔ اور ان علومِ جدیدہ و انکشافاتِ مفیدہ نے ان کو صانع عالم کی ہستی کا اقرار اور مذہب بالخصوص مذہب اسلام کی حقانیت و صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور ان میں سے جو پہلے ہی قائل ہیں۔ ان کے نورِ ایمانی کو جلاءِ روحانی حاصل ہو رہی ہے۔ ؎

علم را بر جاں زنی یارے بود | علم را بر تن زنی مارے بود

قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ ۔ جیسا کہ کتاب "خدا موجود ہے" کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح و عیاں ہوتی ہے۔ جس میں مغرب کے چالیس سائنسدانوں کی شہادت موجود ہے کہ صانع عالم موجود ہے۔ ان سائنسدانوں میں سائنس کے مختلف شعبوں کے ماہر شامل ہیں جیسے شعبۂ طبعیات، ریاضی و کیمیا، حیوانات و حشرات۔ حیاتیات و عضویات ارضیات و باغیات اور طبیات و فلکیات وغیرہا۔ بہر حال دریں صورت ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ موجودہ دور کے انسان کے شکوک و شبہات کو علم قدیم و جدید کی روشنی میں دلیل و برہان کے ساتھ زائل کیا جائے اور اس طرح نئی پود کی اصلاح کا بھی سامان مہیا کیا جائے۔ لیھلک من ھلک عن بینۃ و یحییٰ من حیّ عن بینۃ۔

استدلال بر وجودِ خدا بطریق فلاسفہ و حکماء

مخفی و مستور نہ رہے کہ اثباتِ صانع عالم (جلّت قدرتہ) کے مختلف و متعدد طرق و مسالک ہیں۔ مثلاً (۱) طریقۂ حکماء ربانیین (۲) طریقۂ علماء متکلمین (۳) طریقۂ عرفاء شامخین۔ بعض اربابِ معرفت نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ الطرق الی معرفۃ رب الارباب بقدر انفاس العباد (وھذا حق لا یعتریہ شک ولا ارتیاب) اس مختصر شرح میں اس قدر تو گنجائش نہیں ہے۔ اور نہ ہی ضرورت ہے کہ ان تمام طرق کے تمام دلائل و براہین ذکر کئے جائیں۔ ہاں بموجب مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔ ہم یہاں بطور نمونہ مشتے از خروارے و اندکے از انبارے ان طرق سہ گانہ میں سے چیدہ چیدہ چند دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ ذکر کرتے ہیں۔ اور آخر میں ان بعض مبہم شکوک و شبہات کا ازالہ بھی کریں گے جو اس مقام پر پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ مبحث ہر لحاظ سے مکمل و مختتم ہو جائے۔ انشاء اللہ۔

دلیل اوّل: عقلاء روزگار کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جو چیز علم و تصور انسانی میں آسکتی ہے وہ تین حال سے خالی نہیں ہے یا واجب الوجود ہوگی (جس کے لئے لذاتہ وجود ضروری و لازمی ہو اور عدم ناممکن) یا ممتنع الوجود ہوگی (جس کے لئے لذاتہ عدم ضروری ہو) (۳) یا ممکن الوجود ہوگی (جس کے لئے لذاتہ نہ وجود ضروری ہو۔ اور نہ عدم بلکہ اس کے لئے وجود عدم دونوں برابر ہوں) ہم دیکھتے ہیں کہ اس عالم آب و گل میں کچھ چیزیں عرصۂ وجود میں آتی ہیں اور پھر پردۂ عدم میں روپوش ہو جاتی ہیں۔ اور آمد و رفت کا یہ سلسلہ نباتات و حیوانات وغیرہ میں برابر جاری و ساری ہے۔ اب یہ چیزیں یا تو واجب الوجود ہیں یا ممتنع الوجود۔ یا

[illegible handwritten marginal note]

ممکن الوجود۔ کیونکہ کوئی بھی چیز ان تین صورتوں میں سے باہر متصور نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اب یہ واجب الوجود تو ہو نہیں سکتیں۔ کیونکہ اگر واجب الوجود ہوتیں تو کبھی معدوم نہ ہوتیں۔ اور نہ ممتنع الوجود ہو سکتی ہیں کیونکہ اگر ممتنع الوجود ہوتیں تو کبھی عالمِ وجود میں قدم نہ رکھتیں۔ پس لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ممکن الوجود ہیں۔ پس جب ان کا ممکن الوجود ہونا قطعاً ثابت ہو گیا تو اس سے ذات واجب (جل مجدہٗ) کا وجود مسعود بھی قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ابھی اُوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ممکن کے لئے وجود و عدم برابر ہے۔ یعنی وہ کسی مُوجد اور وجُود عطا کرنے والے کے بغیر خود بخود وجود میں نہیں آ سکتا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ کسی معطی و موجد نے اسے خلعتِ وجود عطا کی ہے اب اس وجُود و ہندہ کے متعلق چار ہی احتمال متصور ہو سکتے ہیں۔ (۱) یا تو بعینہٖ اسی ممکن نے ہی اپنے آپ کو وجود دیا ہے۔ (۲) یا اس کی جزء نے اسے وجود عطا کیا ہے (۳) یا ممتنع الوجود نے اسے خلعتِ وجود بخشی ہے (۴) یا واجب الوجُود نے اسے نعمتِ وجُود مرحمت فرمائی ہے۔ پہلی شق بالبداہت باطل ہے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ شئے اپنے وجُود سے پہلے موجُود ہو۔ اور پھر اپنے آپ کو وجود دے اور یہ بالکل محال اور ناممکن ہے۔ اسی طرح دوسری شق بھی باطل ہے۔ کیونکہ جزء ہرگز موجد کل نہیں ہو سکتی۔ اس سے بھی وہی خرابی لازم آتی ہے جو پہلی شق میں لازم آتی ہے۔ تیسری شق بھی بداہتہً باطل ہے کیونکہ بلا امتیاز مذہب و ملت تمام عقلاء روزگار حتی کہ دہریہ کا بھی (بشرطیکہ ان میں عقل تسلیم کی جائے) اس امر پر اتفاق ہے کہ فاقد شئی معطی شئی نہیں ہو سکتا۔ یعنی جس کے پاس جو چیز موجود نہ ہو وہ چیز دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ لہٰذا جب ممتنع الوجود خود موجود نہیں ہے تو پھر وہ دوسری اشیا کو کیونکر وجود عطا کر سکتا ہے۔ ان ھذا الا اختلاق۔ پس جب یہ تینوں شقیں باطل ہو گئیں تو اب سوائے چوتھی شق کو صحیح تسلیم کرنے کے اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ جاتا۔ یعنی یہ کہ ان تمام اشیاء کو ایک ذات مستجمع جمیع کمالات نے خلعتِ وجود عطا فرمائی ہے۔ جو واجب الوجُود ہے۔ اس کا اپنا وجُود اصلی و ذاتی ہے۔ تمام کائنات اپنی ہستی و وجود میں اس کی محتاج ہے مگر وہ کسی کا محتاج نہیں۔ یاَیھا النّاس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید۔ اے لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو مگر خدا سب سے بے نیاز ہے!۔ وہ ازلی و ابدی ہے اور دائمی و سرمدی۔ وہ ایسی باقی رہنے والی ذات ہے کہ اسے فنا نہیں (ھو الاول و الاخر و الظاھر و الباطن) کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربّک ذو الجلال والاکرام) ذالک اللہ ربّ العٰلمین۔

یہ دلیل جلیل مختلف طریقوں سے بیان کی جاتی ہے مگر ہم نے اسے نہایت سہل و سادہ اور ذہن نشین ہونے والے انداز سے بیان کیا ہے۔ اس دلیل جمیل کی حرف بحرف تائید مزید امام ثامن ضامن حضرت امام رضا علیہ افضل التحیۃ والثناء سے منقول شدہ مختصر دلیل سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے اس سلسلہ میں ایک سائل کے ایک سوال کے جواب میں بیان فرمائی تھی۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ انک لم تکن ثم کنت و قد علمت انک لم تکون

نفسك و لا كونك من هو مثلك ۔ پہلے ایک وقت تھا جس میں تو موجود نہ تھا پھر وجود میں آیا اور تجھے معلوم ہے کہ تو نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا (کہ یہ عقلاً محال ہے) اور یہ بھی تجھے یقین ہے کہ جو شخص تیری طرح (ممکن الوجود) ہے اس نے بھی تجھے خلق نہیں کیا۔ (کیونکہ وہ خود اپنے وجود میں محتاج غیر ہے۔ لہٰذا خفتہ را خفتہ کے کند بیدار) اس لئے ماننا پڑے گا کہ تیرا خالق و صانع تیری جنس سے خارج ہے اور وہ واجب الوجود ہے۔ هو الذی خلق من الماء بشراً فجعله نسباً و صهراً۔

دلیل دوئم۔ عالم حادث ہے اور جو چیز حادث ہے۔ یعنی عدم کے بعد وجود میں آئی ہے اور ازلی نہیں ہے۔ وہ اپنے وجود میں کسی معطیٔ وجود (علت) کی محتاج ہے اور یہی معطیٔ وجود ہی خدا ہے۔ اس استدلال کا دوسرا مقدمہ یعنی یہ کہ جو حادث ہے وہ محتاج علت ہے۔ بدیہی ہے اور کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں۔ ہاں اس کا پہلا مقدمہ کہ عالم حادث ہے۔ یہ محتاج دلیل ہے۔ اور اس پر متعدد ادلہ و براہین قائم کئے گئے ہیں۔ ہم اختصار کے پیش نظر یہاں چند ادلہ ذکر کرتے ہیں۔

حدوثِ عالم کی پہلی دلیل

اس عالم میں تغیر و تبدل اور فنا و زوال کا سلسلہ جاری ہے۔ کون شخص یہ نہیں جانتا کہ ایک زمانہ تھا کہ ہم پردۂ عدم میں مستور تھے۔ اور پھر عنقریب ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ ہم اسی پردۂ عدم میں جا چھپیں گے۔ ہمارا وجود دو عدموں کے درمیان اس طرح محصور ہے۔ جس طرح نورِ زمین شب گذشتہ اور شب آئندہ کی دو تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس پر نور کی یہ آمد و رفت بآواز بلند پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ نور زمین کا ذاتی نہیں ہے۔ بلکہ مستعار و عطاءِ غیر ہے۔ اگر ذاتی ہوتا تو کبھی زائل نہ ہوتا۔ اسی طرح موت و حیات کی کشمکش اور وجود کی آمد و رفت اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کائنات کا وجود اسی طرح ہمارا وجود بھی کسی ایسی ذات کا فیض وجود ہے۔ جس کا وجود اصلی و ذاتی ہے۔ اور اس ذات کے لئے وجود اسی طرح ضروری و لازمی ہے جس طرح آفتاب کے لئے نور، آتش کے لئے حرارت۔ چار کے لئے زوجیت۔ تین کے لئے فردیت اسی موجود مسعود کو جس کا وجود اصلی و ذاتی ہے۔ اہل اسلام اللہ سبحانہ واجب الوجود اور خدائے معبود کہتے ہیں اس آیت مبارکہ میں اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔ کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتاً فاحیاکم ثم یمیتکم۔ تم کس طرح اللہ جل جلالہ کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم موجود نہ تھے۔ اس نے تمہیں وجود عطا کیا۔ پھر تم سے یہ وجود چھین لے گا۔

دوسری دلیل

عقل و مشاہدہ اس امر کے شاہد عادل ہیں کہ عالم کی ہر شے محدود و متناہی ہے۔ کوئی زمان اور مکان ایسا نہیں جس کی ابتداء و انتہاء نہ ہو۔ دن رات۔ مہینہ و ہفتہ۔ سال اور صدی ہر ایک کی ابتداء ہے اور انتہاء۔ اسی طرح ہر مکان کی مساحت و مسافت محدود و متعین ہے۔ غرض عالم کے تمام

بسائط و مرکبات محدود و متناہی ہیں۔ بسائط کا محدود ہونا تو ظاہر ہے۔ اور مرکب چونکہ انہی محدود بسائط سے مرکب ہے لہٰذا وہ بھی متناہی ہی ہوگا۔ لہٰذا جب عالم کے تمام بسائط و مرکبات متناہی و محدود ہیں۔ تو عالم بھی ضرور محدود و متناہی ہوگا۔ اور اس کی ضرور کوئی ابتداء ہوگی۔ کیونکہ عالم انہی بسائط و مرکبات کے مجموعہ کا دوسرا نام ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ اجزاء تو متناہی ہوں مگر مجموعہ غیر متناہی اور غیر محدود ہو؟۔

تیسری دلیل

یہ عقلاً مسلم ہے کہ کسی ثانی کا وجود اوّل کے بغیر اور ثالث کا وجود بدوں ثانی کے وعلیٰ ہذا القیاس رابع کا وجود بغیر ثالث کے و ھلم جراً، عقلاً محال و ناممکن ہے۔ اعداد کا سلسلہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ مگر اوّل کے بغیر کسی طرح نہیں چل سکتا۔ اگر اوّل ہی معدوم ہو تو تمام سلسلہ نیست و نابود ہوگا بالکل اسی طرح اگر اس عالم کے لئے کوئی ابتداء نہ ہو تو یہ تمام سلسلہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ قرآن کریم میں اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔ لقد احصاھم وعدّھم عدًّا ۔ واحاط بما لدیھم و احصیٰ کل شیءٍ عددًا خداوند عالم نے ان سب کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور ان کو کما حقہ شمار کیا ہوا ہے۔ اور وہ ان کی سب چیزوں پر محیط ہے اور ان تمام کا احصا کئے ہوئے ہے۔ (از علم الکلام)

چوتھی دلیل

یہ دلیل چند مقدمات پر موقوف ہے۔ (۱) عالم میں دو قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جوہر یعنی وہ چیزیں جو خود قائم ہیں۔ جیسے درخت، پتھر، پانی وغیرہ۔ عرض یعنی وہ چیزیں جو بذات خود قائم نہیں بلکہ کسی دوسری چیز میں پائی جاتی ہیں۔ جیسے رنگ و بو اور ذائقہ وغیرہ۔

(۲) کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا کیونکہ جس قدر جواہر ہیں وہ کسی نہ کسی صورت اور ہیئت میں ہوتے ہیں۔ اور صورت و ہیئت عرض ہیں۔ نیز تمام جواہر میں کسی نہ کسی قسم کی حرکت پائی جاتی ہے۔ اور حرکت عرض ہے۔ غرضیکہ کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا ہے۔

(۳) عرض حادث ہے۔ یعنی پیدا ہوتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔

(۴) جو چیز کبھی عرض سے خالی نہ ہو سکتی ہو وہ بھی ضرور حادث ہوگی۔ کیونکہ اگر وہ قدیم ہو تو پھر عرض کا بھی قدیم ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ جو دو چیزیں باہم لازم و ملزوم ہوں ان دونوں کا حکم ایک ہوتا ہے اگر ایک قدیم ہے تو دوسری بھی ضرور قدیم ہی ہوگی ورنہ لازم و ملزوم میں فصل زمانی لازم آئے گا اور یہ محال ہے حالانکہ عرض کا حادث ہونا واضح و آشکار ہے تو لامحالہ جوہر بھی حادث ہی ہوگا۔

اب ان مقدمات چہار گانہ سے استدلال اس طرح کیا جائے گا کہ عالم دو حال سے خالی نہیں۔ جوہر ہوگا یا عرض؟ اور چونکہ جوہر و عرض دونوں حادث ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ عالم بھی حادث ہو۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ عالم حادث ہے تو ضرور ہے کہ کوئی ذات ایسی ہو جو اسے وجود دے۔ اب اگر وہ ذات بھی حادث ہو تو اس کے لئے بھی کوئی وجود

دینے والی اور ذات تسلیم کرنا پڑے گی۔ اس طرح اگر یہ سلسلہ کسی ایسی ذات جامع جمیع کمالات پر جاکر ختم ہو کہ جو واجب الوجود ہے۔ اور اس کا وجود اصلی و ذاتی ہے۔ اور وہی خدائے عزّوجل ہے۔ تو فبہا ورنہ دور یا تسلسل لازم آئے گا۔ اور یہ دونوں محال و باطل ہیں۔ لہٰذا پہلی صورت ہی متعیّن ہوگی۔

پانچویں دلیل

"تمام اعداد و مقادیر محدود ہوتے ہیں۔ اجرام فلکیہ اور مادے کے ذرّات کی تعداد معیّن ہے ہر لمحہ کے اجزائے وقت کی تعداد بالکل معیّن ہوتی ہے۔ زمین سورج کے گرد معین بار پھرتی ہے۔ سلسلۂ علّت و معلول کی کڑیاں بھی عدد معین میں ہیں۔ اسی طرح تمام اعمالِ فطرت کا بھی کوئی آغاز ہوگا۔ کیونکہ لاانتہا ہی طور پر پیچھے ہٹنا ناقابلِ فہم ہے (تاریخ فلسفۂ جدید ج ۲ صفحہ ۶۳ بحوالہ رسالہ حدوث عالم) فلاسفر مغرب ڈیورنگ کہتا ہے۔ اس زمانے سے پہلے جس میں تغیرات واقع ہونے شروع ہوئے۔ ایک سرمدی ہستی ہوگی جس کے اندر تغیرات واختلافات کا وجود نہیں ہوگا۔ اس وقت وجود عین ذات ہوگا۔ (تاریخ فلسفہ جدید ج ۲ صفحہ ۱۳) ڈیکارٹ کہتا ہے۔ خدا کے سوا میں اور کسی شے کا تخیل ہی نہیں کر سکتا جس کا وجود اس کی حقیقت میں وجوباً داخل ہو (ترجمہ تفکرات ص ۱۵۲ بحوالہ رسالہ حدوث مادہ مولانا محمد رضی صاحب مرحوم) یہ حکمائے مغرب کے آراء ہیں۔ مگر تعجب ہے ان بعض حکماء اسلام پر جو باوجود عالم کو حادث تسلیم کرنے کے پھر بھی اسے قدیم بالنوع اور وجود میں خدا کے ساتھ قدیم جانتے ہیں حالانکہ انواع کا بوجہ کلی ہونے کے خارج میں سوائے افراد کے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اور جب افراد حادث ہیں۔ تو پھر نوع کو قدیم قرار دینا بالکل ایک غیر معقول نظریہ ہے۔ کما لایخفیٰ۔ معصومؑ نے اس نظریۂ فاسدہ کے بطلان پر اس طرح تنبیہ فرمائی ہے۔ کیف یکون خالقاً لمن لم یزل معہ۔ بھلا خدا ایسی چیز کا کیونکر خالق ہو سکتا ہے جو ازل سے اس کے ساتھ ہے۔ لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں عقل سلیم بلاچون وچرا یہ تسلیم کرتی ہے کہ آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین کا یہ ارشاد واجب الاعتقاد ہے۔ اور سراسر حق ہے کہ کان اللہ ولم یکن معہ شئی۔ خداوند عالم موجود تھا اور اس کے ساتھ کوئی شے موجود نہ تھی"۔

بہرکیف تمام عقلاء روزگار اور حکماء نامدار عالم کے حادث ہونے پر متفق الکلام ہیں۔ جیسا کہ فاضل شہرستانی نے نہایۃ الاقدام میں اور دیگر علماء اعلام نے یہ دعویٰ کیا ہے۔ اور بڑے بڑے حکماء قبل از اسلام مثل "تالیس وفیثاغورس سقراط اور افلاطون وغیرہم کا بھی یہی نظریہ ہے اور اسی پر تمام انبیاء و اولیاء کا اتفاق ہے۔ حضرت علامہ مجلسیؒ رسالہ اعتقادیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ ولابد ان تعتقد ان العالم حادث۔۔ فان علی طبق الذی ذکرنا اجماع جمیع الملیین والاخبار بہ متظافرۃ متواترۃ۔ یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ عالم حادث ہے اس مطلب پر تمام اہل ملل و ادیان کا اجماع و اتفاق ہے اور اس سلسلہ میں اخبار متظافرہ و متواترہ موجود ہیں طالبان حق و حقیقت کے لئے اس مطلب کے اثبات کے لئے یہی مختصر ادلہ و براہین کافی ہیں۔ وہ اہل علم حضرات جو تفصیل

دیکھئے۔ گرے شائق ہوں وہ کتاب "ارتباط انسان با جہان" مطبوعہ ایران کی طرف رجوع کریں۔ اور جب ان دلائل سے عالم کا

استدلال بر وجود خدائے کریم بطریقۂ متکلمین

اگرچہ علمائے متکلمین نے مختلف طرق سے اثباتِ باری تعالیٰ پر استدلال قائم کئے ہیں مگر ان کا بہترین طریقہ استدلال اثر کو دیکھ کر موثر مخلوق کو دیکھ کر خالق اور مصنوع کو دیکھ کر صانع پر استدلال کرنا ہے جسے حکماء دلیل "انی" کہتے ہیں۔ اور یہ وہ آسان و سہل قاطع برہان ہے کہ جسے علماء اعلام تو بجائے خود نسوان و صبیان اور عوام کالانعام بھی بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ طریقۂ استدلال بالکل فطری و جبلی ہے۔ چنانچہ جب ایک بدو سے یہ سوال کیا گیا کہ بماذا عرفت ربک؟ تو نے اپنے پروردگار کو کیونکر پہچانا ہے؟ تو اس نے فوراً یہ فطری جواب دیا۔ البعرۃ تدل علی البعیر و آثار الاقدام یدل علی المسیر اسماء ذات ابراج و ارض ذات فجاج لا یدلان علی اللطیف الخبیر۔ جب اونٹ کی مینگنی اونٹ پر اور نشانات قدم چلنے والے پر دلالت کرتے ہیں تو کیا یہ برجوں والا آسمان اور گھاٹیوں والی زمین مل کر ایک لطیف و خبیر صانع عالم کی ذات پر دلالت نہیں کرتے؟ یہی دلیل جمیل تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ سید الموحدین حضرت امیر المومنینؑ سے بھی منقول ہے۔ فرمایا البعرۃ تدل علی البعیر والروثۃ تدل علی الحمیر و آثار القدم تدل علی المسیر فھیکل علوی بھذہ اللطافۃ و مرکز سفلی بھذہ الکثافۃ کیف لا یدلان علی اللطیف الخبیر (چھوٹی سی مینگنی اونٹ پر۔ لید گدھے پر اور نشاناتِ قدم چلنے پر دلالت کرتے ہیں کیا آسمان نیلگوں باوجود اپنی لطافت کے اور فرش زمین پر باوجود اپنی کثافت کے ایک خدائے لطیف و خبیر پر دلالت نہیں کرتے؟ اس طریقۂ استدلال کی آسانی و عمدگی ہی کا نتیجہ ہے کہ جب ایک ایسی بوڑھی عورت سے سوال کیا گیا جو چرخہ کات رہی تھی کہ تو نے اپنے رب کو کس طرح پہچانا ہے؟ تو اس نے فوراً یہ جواب دیا بمغزلی ھذا (او قالت بجوزلی ھذا) میں نے اُسے اس چرخے سے پہچانا ہے۔ فان ان حرکتہ تحرک وان لم احرکہ سکن۔ جب میں اسے حرکت دیتی ہوں تو یہ حرکت کرنے لگتا ہے اور جب حرکت نہیں دیتی تو یہ رک جاتا ہے۔ پس جب یہ معمولی سا چرخہ بغیر کسی چلانے والے کے نہیں چل سکتا تو پھر اتنے بڑے عالم کا نظام کیونکر کسی ناظم و مدبر کے بغیر چل سکتا ہے؟ جب جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس بڑھیا کا یہ استدلال سنا تو بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا علیکم بدین العجائز۔ بوڑھی عورتوں والے دین کو لازم پکڑو۔ یعنی دلیل و برہان سے مذہب اختیار کرو۔ اگرچہ وہ دلیل اس طرح سادہ و سہل ہی کیوں نہ ہو جس طرح اس بڑھیا کی ہے۔ کیونکہ بنا بر مشہور اصولِ عقائد میں تقلید جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ سرکار علامہ حلی علیہ الرحمۃ نے اس امر پر دعویٰ اجماع فرمایا ہے۔ اجمع العلماء کافۃ علی وجوب معرفۃ اللہ تعالیٰ و صفاتہ الثبوتیۃ والسلبیۃ وما یصح علیہ وما یمتنع عنہ

والنبوۃ والامامۃ والمعاد بالدلیل لا بالتقلید (شرح باب حادی عشر ص۴) تمام علماء اس بات پر اجماع و اتفاق کیا ہے کہ خداوند عالم کی ہستی اور اس کی صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ اسی طرح نبوت و امامت اور قیامت کی معرفت واجب ہے اور وہ بھی دلیل و برہان کے ساتھ نہ تقلید کے ساتھ۔

قرآن کے طرزِ استدلال سے اس طریقہ کی تائید

چونکہ منطقی دلائل اور عقلی براہین نہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اور نہ وہ اس کے لئے مفید ہو سکتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ افہام و تفہیم اور کسی مطلب کے اثبات کا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو عام فہم ہو۔ تاکہ اسے ہر شخص سمجھ سکے۔ اس امر کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب کہ وہ مطلب ہر خاص و عام، مرد و عورت، خورد و کلاں عالم و جاہل، شہری و بدوی سب کو سمجھانا مقصود ہو۔ بنا بریں چونکہ مذکورہ بالا طریقۂ استدلال بالکل عام فہم و آسان ہے اور ایسے محسوسات پر مبنی ہے۔ جو ہر وقت انسان کے پیشِ نظر رہتے ہیں۔ اس لئے حکیم مطلق ہادی سبل یعنی خدائے عزوجل نے قرآن مجید میں جابجا اسی طریقۂ استدلال کو اختیار فرمایا ہے۔ چند آیات یہاں پیش کی جاتی ہیں (۱) ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (البقرۃ پ ۲) (ترجمہ) بالتحقیق آسمانوں کی اور زمینوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اولنے بدلنے میں اور اُن کشتیوں میں جو سمندر میں وہ کچھ لے کر چلتی ہیں جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے۔ اور اس پانی میں جسے خدا نے آسمان سے اُتارا۔ اور جس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیا اور ہر قسم کا چلنے والا اس میں بکثرت پھیلا دیا۔ اور ہواؤں کے چلنے میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان و زمین کے مابین معلق ہیں سمجھنے والے لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں موجود ہیں، چونکہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اثر کو دیکھ کر مؤثر (اثر کرنے والے) کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ جیسا کہ اُوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ اسی لئے خالق فطرت نے بھی اپنی ہستی کے اثبات کے سلسلہ میں یہی فطری آثار پیش کئے ہیں کہ جن کے رموز و اسرار میں معمولی غور و فکر کرنے سے واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ ان کا کوئی ضرور مؤثر و فاطر ہے۔ اس آیتِ مبارکہ میں خلاق عالم نے اپنی صنعت و قدرت کے دس عظیم الشان آثار کو واضح [illegible] شمار فرما کر فطرتِ انسانی کو جھنجھوڑا ہے کہ جب وہ معمولی سے اثر کو دیکھ کر ایک بڑے مؤثر کو معلوم کر لیتی ہے۔ وہ دھواں دیکھ کر آگ کا پتہ لگا لیتی ہے۔ اور تحریر دیکھ کر کاتب کا حال معلوم کر لیتی ہے۔ آواز سن کر بولنے والے کا سراغ لگا لیتی ہے تو یہ دس جلیل القدر آثار دیکھ کر کیوں ان کے خالق خدائے جبار کے موجود ہونے کا یقین نہیں کرتی؟ حضرتِ انسان مشاہدہ و وجدان کی بنا پر علم و یقین رکھتا ہے کہ ایک چھوٹا سا مکان بھی بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بن

سکتا۔ کپڑا بغیر بُننے والے کے تیار نہیں ہو سکتا۔ روٹی بغیر کسی پکانے والے کے پک نہیں سکتی۔ ایک معمولی سی چکی بغیر کسی پھرانے والے کے پھر نہیں سکتی۔ بل بغیر کسی چلانے والے کے چل نہیں سکتا۔ ایک ڈھیلا بغیر کسی ہلانے والے کے ہل نہیں سکتا۔

تو پھر کیا یہ اتنا بڑا آسمان جس میں سینکڑوں ایسے آفتاب موجود ہیں جن میں سے ہر ایک زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے، جس میں کروڑوں ثوابت و سیارے ستارے موجود ہیں (آج تک دوربین کے ذریعہ تقریباً بیس کروڑ ستارے نظر آچکے ہیں ...) جو بجائے خود ایک عظیم الشان مقدار حجم اور خاص روش و رفتار اور خواص و آثار رکھتے ہیں۔ بغیر کسی بنانے کے خود بخود بن گیا ہے؟ یہ اتنی بڑی زمین (جس کا قطر ۸۰۰۰ میل ہے اور محیط چار کروڑ میٹر ہے) جو ہزاروں قسم کے فوائد و عوائد اور لاکھوں قسم کے عجائب و غرائب کا مرکز ہے۔ بغیر کسی صانع حکیم کے معرضِ وجود میں آگئی ہو۔ یہ شب و روز کی باقاعدہ یکے بعد دیگرے آمد و رفت کا سلسلہ خود بخود قائم ہو گیا؟ یہ بارش جو ہزاروں کاموں میں کام آتی ہے یہ بغیر کسی برسانے والے کے خود بخود برسنا شروع ہو گئی؟ ہزاروں قسم کے از بارہ اثمار سے لدے ہوئے اشجار۔ ہزاروں قسم کے مختلف الالوان نباتات۔ لاکھوں قسم کے چرند و پرند اور حیوانات جن کے فوائد و خواص اور حالات و آثار اور ان کی خلقت کے رموز و اسرار دیکھ کر بڑے بڑے فلاسفر و سائنسدان حیران و سر بگریبان ہو جاتے ہیں (اس سلسلہ میں علم الحیوانات، علم النباتات کی مخصوص کتب دیکھی جائیں) کیا یہ سب اشیاء بغیر قادر علیم اور صانع حکیم کے پیدا کرنے کے خود بخود عالم وجود میں آگئیں لا واللہ کوئی عقل سلیم اور طبع مستقیم اسے ہرگز باور نہیں کر سکتی ہے۔ ولنعم ما قیل۔ ع

فوا عجباً کیف یعصی الالٰہ ام کیف یجحدہ جاحد و فی کل شیئ لہ اٰیۃ تدل علی انہ واحد

تعجب ہے کہ خداوند عالم کی کس طرح نافرمانی کی جاتی ہے یا کس طرح انکار کرنے والے اس کی ذات کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ہر ایک شی میں اس کی نشانیاں موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کی ہستی یگانہ ہے۔

(۲) ایک اور مقام پر ارشادِ قدرت ہے۔ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۔ (وہ خدا وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن قرار دیا ہے اور چاند کو نور اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب سمجھ لیا کرو۔ اللہ نے ان سب چیزوں کو برحق پیدا کیا ہے۔ سمجھنے والے لوگوں کے لئے وہ اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے) (سورہ یونس پ ۱۱ ع ۱)۔ اس آیت مبارکہ میں بھی خلاق عالم نے اپنی حکیمانہ صنعت و حرفت کے چند اعلیٰ نمونے پیش کر کے لوگوں کو اپنی ربوبیت و خدائی کے اقرار کرنے کی دعوت دی ہے۔

(۳) ایک اور جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ

لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ ○ اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے جن کو تم دیکھتے ہو بلند کیا پھر عرش پر (اُس کا حکم) غالب آیا اور سورج اور چاند کو مطیع کر لیا۔ ہر ایک مدت معینہ تک کے لئے رواں ہے۔ تمام معاملات کی تدبیر خود کرتا ہے (اور) نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین کر لو (سورہ رعد پ ۱۳ ع ۱) اس آیت مبارکہ میں بھی خدائے بزرگ و برتر نے اپنی قدرت کے آثار کو پیش فرما کر اپنی معرفت کرائی ہے۔

(۳) ایک اور محل پر یوں ارشاد فرماتا ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ط وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ اور وہ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اُس میں بھاری بھاری پہاڑ اور دریا مقرر رکھے اور ہر قسم کے پھلوں میں سے اُس میں دو دو طرح کے پیدا کر دیئے۔ دن کو وہ رات سے ڈھانپ دیتا ہے بے شک اسی میں فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں (سورۂ رعد پ ۱۳ ع ۱)

اس آیت مبارکہ میں بھی خالق حکیم نے اپنی ہستی کے اثبات کے لئے اپنے حکمت آمیز آثار قدرت کو پیش کر کے ارباب عقل و خرد کو دعوت فکر دی ہے۔

(۴) ایک اور جگہ اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ اور زمین کے مختلف قسم کے ٹکڑے ایک دوسرے کے پاس پاس ہیں۔ اور انگوروں کے باغ اور کھیتیاں اور کھجور کے درخت ایک ہی جڑ سے کئی اُگے ہوئے اور علیحدہ علیحدہ اُگے ہوئے کہ یہ سب ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں۔ اور اُن کے پھلوں کے بارے میں ہم ایک دوسرے پر برتری دے دیتے ہیں۔ بے شک اس میں عقل رکھنے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں (مقبول ترجمہ) (سورہ رعد پ ۱۳ رکوع ۱) اس آیت وافی ہدایہ میں قادر مطلق نے اپنی قدرت کاملہ کا ایک عجیب کرشمہ ذکر کر کے صاحبان عقل و فہم کو اپنی قدرت کاملہ کے اعتراف کی دعوت فکر دی ہے۔ زمین و بھی ایک۔ پانی بھی ایک جنس بھی ایک بلکہ اصل بھی ایک مگر باہم طعم و ذائقہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سب کا ذائقہ یکساں کیوں نہیں ہے؟ اگر نیچر و طبیعت ہی سب کچھ کرتی ہے تو طبیعت تو سب کی ایک ہے۔ پھر یہ اختلاف کہاں سے آ گیا ہے؟ ہے کوئی جواب ان منکرین خدا طبیعین کے پاس؟ اگر ہے تو لائیں؟ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

ایک مفید حکایت

اسی مطلب کے ساتھ ملتی جلتی ایک نہایت عمدہ حکایت بعض کتب میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ ایک عالم نے بارگاہ ایزدی میں یہ التجا کی کہ بار الٰہا دہریین و طبیعین کے مقابلہ میں مجھے کسی ایسی دلیل کا القا فرما کہ جس میں کوئی فلسفی تشکیک جاری نہ ہو سکے۔ وہ یہ دعا کر کے سو گیا خواب میں

دیکھا کہ ایک شخص یہ آیت پڑھ رہا ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یلتقیان بینہما برزخ لا یبغیان (سورۃ رحمٰن) یعنی خداوند عالم نے دو دریا جاری کئے ہیں، (ایک شیریں اور ایک شور) دونوں مل کر چلتے ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک حجاب و پردہ ہے۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے پر نہیں چڑھتے (ایک کا پانی دوسرے میں نہیں ملتا) طبیعت و نیچر کے پرستار بتلائیں پانی کی طبیعت کا تقاضا تو اتصال و امتزاج ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جو آب شیریں کو آب شور کے ساتھ مل جانے سے مانع ہے؟ آیا وہ قدرت ربانیہ اور مشیتِ الٰہیہ کے علاوہ کوئی چیز ہو سکتی ہے؟

خلاصہ یہ کہ۔ ع

برگِ درختان سبز در نظر ہوشیار ۔۔۔ ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السموٰت والارض طوعًا وکرہًا والیہ ترجعون

آئمہ طاہرین کے طرز استدلال سے اس طریقہ کی تائید مزید

اس طریقہ استدلال کی انہی خوبیوں کے پیش نظر جن کا تذکرہ ابھی اوپر کیا جا چکا ہے۔ حکمائے ربانیین و ہادیانِ دینِ مُبین یعنی حضرات آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس سلسلۂ جلیلہ میں عامۃ الناس کے لئے یہی طریقہ استدلال اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت امیر المومنین البعرۃ تدل علی البعیر۔ الخ والے ارشاد باسداد کے بعد فرماتے ہیں بصنع اللہ یستدل علیہ و بالعقول تعتقد معرفتہ و بالتفکر تثبت حجتہ معروف بالدلالات مشہور بالبیّنات۔ یعنی خداوند عالم کی مصنوعات و مخلوقات سے اس کی ذات پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اور عقول و افہام سے اس کی ذات کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور غور و فکر سے اس کی دلیل و حجت ثابت اور راسخ ہوتی ہے۔ وہ بہت اور آثار واضحہ سے معروف اور بینات لائحہ سے مشہور ہے۔ ع

واذا نظرت الی الکواکب نظرۃً ۔۔۔ فتری الکواکب للکوکب شاھدا

جب تم ستاروں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو گے تو ان ستاروں کو اس ہستی کے وجود پر شاہد پاؤ گے جس نے ان کو ستارہ بنایا ہے۔

ایک زندیق نے ایک مرتبہ بحق ناطق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ صانع عالم کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا۔ وجود الافاعیل دلت علی ان صانعًا صنعہا الا تری اذا نظرت الی بناءٍ مشیدٍ مبنی علمت ان لہ بانیًا وان کنت لم تر البانی ولم تشاھدہ۔ یعنی یہ آثار قدرت ایک صانع حکیم کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کہیں ایک محکم و مضبوط بنا ہوا مکان دیکھو تو تمہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ضرور کسی بنانے والے نے اسے تعمیر کیا ہے۔ اگرچہ تم نے ظاہری آنکھوں سے معمار کو نہ دیکھا ہو۔؟

ارباب عقل و دانش غور فرمائیں کہ یہ دلیلِ جمیل باوجود مختصر ہونے کے کس قدر جامع اور مقنع ہے۔ کون ہوشمند انسان ہے جو اس حقیقت کا انکار کرے کہ کوئی بھی مکان بغیر کسی معمار کے نہیں بن سکتا تو جب ایک چھوٹا سا مکان کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتا تو اتنا بڑا جہان جس کی عظمتِ شان کے سامنے بڑے بڑے فلاسفر و سائنسدان اپنے بےحد ان ہونے کا یقین و اذعان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، کیونکر کسی صانع حکیم اور قادر کریم کے بغیر عرصۂ وجود میں آ سکتا ہے۔ ؟

اصولِ کافی، علل الشرائع اور بحار ج ۲ میں روایت ہے۔ کہ ایک مرتبہ ابوشاکر عبداللہ دیصانی زندیق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا جعفر بن محمد دلنی علی معبودی ؟ اے جعفرؑ مجھے میرے معبود کی طرف راہبری فرمایئے ؟ آں جناب نے فرمایا تمہارا نام کیا ہے ؟ دیصانی اٹھ کر چلا گیا اور کوئی جواب نہ دیا جب اپنے اصحاب میں پہنچا تو انہوں نے اس سے دریافت کیا کہ تو نے اپنا نام کیوں نہ بتایا ؟ دیصانی نے کہا اگر میں اپنا نام (عبداللہ) بتا دیتا تو وہ (امام) مجھ سے پوچھتے کہ وہ اللہ کون ہے جس کا تو عبد ہے ؟ تو پھر میں کیا جواب دیتا۔ اصحاب نے کہا اب دوبارہ ان کے پاس جاؤ مگر ان سے کہنا کہ وہ تمہارا نام نہ پوچھیں۔ چنانچہ یہ دوبارہ خدمت امام میں شرفیاب ہوا۔ اور جا کر وہی سابقہ سوال کیا مگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ میرا نام نہ پوچھیں۔ امام نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا بچہ کھیلتا ہوا وہاں سے گذرا جس کے ہاتھ میں مرغی کا ایک انڈا تھا۔ امام نے فرمایا اے بچے ذرا یہ انڈا مجھے دیدو چنانچہ امام نے بچے سے وہ انڈا لے کر فرمایا۔ یا دیصانی ھذا حصن مکنون لہ جلد غلیظ وتحت الجلد الغلیظ جلد دقیق وتحت الجلد الرقیق ذھبۃ مائعۃ وفضۃ ذائبۃ فلا الذھبۃ المائعۃ تختلط بالذھبۃ الصائغۃ فھی علی حالھا لم یخرج منھا خارج مصلح فیخبر عن اصلاحھا ولم یدخل فیھا داخل مفسد فیخبر عن افسادھا لا یدری للذکر خلقت ام للانثی تنفلق عن مثل الوان الطواویس اتری لہ مدبرا ؟ فاطرق راسہ ملیا ثم قال اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ وانک امام وحجۃ من اللہ علی خلقہ وانا تائب مما کنت فیہ ۔ اے دیصانی ! یہ ایک پوشیدہ قلعہ ہے اس کے اوپر ایک موٹی جلد ہے۔ اور موٹی جلد کے نیچے ایک پتلی جلد ہے اور اس کے نیچے بہنے والا سونا اور پگھلی ہوئی چاندی ہے نہ بہنے والا سونا پگھلی ہوئی چاندی کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے اور نہ ہی پگھلی ہوئی چاندی بہنے ہوئے سونے کے ساتھ خلط ملط ہوتی ہے۔ یہ انڈا اسی حالت پر رہتا ہے۔ نہ تو کوئی اصلاح کرنے والا اندر سے نکلا ہے جو یہ بتائے کہ اس نے اندر اصلاح کی ہے اور نہ کوئی خراب کرنے والا اس کے اندر داخل ہوا ہے۔ جو اس کے خراب ہونے کی اطلاع دے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کے اندر نر ہے یا مادہ ؟ یکایک یہ پھٹتا ہے اور طاؤس کی مانند رنگ برنگا چوزہ باہر نکل آتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے آیا اس کا کوئی ناظم و مدبر ہے ؟ دیصانی نے تھوڑی دیر سر نیچے جھکانے اور غور و فکر کرنے کے بعد کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور نہ اس کا

کوئی شریک ہے۔ اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ جناب محمدؐ اس کے بندۂ خاص اور اس کے رسول ہیں اور آپ امام برحق اور مخلوق پر حجتِ خدا ہیں۔ اور میں اپنے سابقہ عقیدہ سے توبہ کرتا ہوں۔ وفی الارض لآیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون۔

ایک عجیب حکایت

اس سلسلہ میں بعض کتب معتبرہ کے اندر ایک عجیب حکایت موجود ہے جو اپنی افادیت کے پیشِ نظر یہاں نقل کی جاتی ہے۔ ایک بادشاہ اعتقادِ خداوندی کے بارے میں اقرار و انکار کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ مگر اس کا وزیر باتدبیر نہایت عقلمند اور دیندار آدمی تھا۔ جب اسے بادشاہ کی اعتقادی کمزوری کا علم ہوا تو وہ بادشاہ کو جادۂ مستقیم پر لانے اور شک و شبہ کی پرخار وادی سے نکالنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ بڑے غور و خوض کے بعد ایک نہایت عمدہ تدبیر اس کے ذہن میں آگئی۔ اس نے مخفی طور پر تاکہ بادشاہ کو علم نہ ہو، بہت سے معمار و مزدور اکٹھے کر لئے۔ اور شہر کی آبادی سے بہت دور ایک لق و دق صحرا میں اینٹ گارا، لکڑی وغیرہ، ضروری سامان مہیا کر کے ایک عالی شان مکان کی تعمیر شروع کرا دی۔ مکان مکمل ہوا۔ وہاں ایک بہت عمدہ باغیچہ بھی لگوا دیا۔ پانی کی نہریں بھی جاری کرا دیں۔ جب یہ سب کام مکمل ہو گیا تو وہاں سے سب معمار و مزدور بلا لئے اور مکان کو بالکل خالی کرا دیا۔ اور پھر بادشاہ کو سیر و تفریح کے بہانے اس طرف لے گیا۔ جب بادشاہ نے اس بے آب و گیاہ جنگل میں ایسا عالی شان مکان اور پھر عمدہ باغیچہ اور پانی کی بہتی ہوئی نہریں ملاحظہ کیں تو حیران و ششدر ہو گیا۔ اسی حیرانی کے عالم میں وزیر سے مخاطب ہوا کہ یہاں یہ عظیم الشان قصر کس نے تعمیر کرایا ہے؟ وزیر نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے عرض کیا، حضور یہ خود بخود بن گیا ہے۔ بادشاہ نے تعجب خیز لہجہ میں سوال کیا کہ یہ خود بخود بن گیا ہے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ وزیر نے بڑے سکینہ و وقار کے ساتھ جواب دیا کہ حضور ہوا چلی کہیں سے اینٹیں آگئیں، کہیں سے گارا آ گیا پھر اتفاق سے ایک اینٹ کے اوپر دوسری اینٹ جڑتی چلی گئی اور اسی طرح یہ شہتیر اور دروازے کی لکڑیاں بھی کہیں سے اڑ کر آ گئیں اور یہاں آ کر پیوست ہو گئیں۔ اور اس طرح یہ مکان مکمل ہو گیا اور باغیچہ کا بھی یہی حال ہے۔ اتفاقاً کہیں سے بیج آ گیا اور ناہموار زمین اتفاق سے ہموار ہو گئی۔ اور اسی طرح یہ نہر بھی اتفاق سے جاری ہو گئی اور اس پانی کی آبیاری سے یہ بیج اگا اور یہ باغیچہ تیار ہو گیا۔ وزیر کا یہ جواب سن کر بادشاہ غیظ و غضب میں ڈوب گیا۔ اور آتش زیر پا ہو کر قہر آلود نگاہوں سے وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے تند و تیز لہجہ میں کہا۔ کیا تم میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی ہے کہ بادشاہ سے تمسخر کرتے ہو؟ بھلا مکان بغیر بنانے والے کے کس طرح بن سکتا ہے اور باغیچہ بغیر لگانے والے کے کس طرح لگ سکتا ہے؟ وزیر باتدبیر نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ دست بستہ ہو کر عرض کی۔ حضور گستاخی معاف۔ اگر یہ ایک مختصر سا مکان اور یہ چھوٹا سا باغیچہ اور یہ معمولی سی نہر کسی بانی و باغبان و کسان کے بغیر نہیں بن سکتے تو یہ اتنی بڑی کائنات کیونکر کسی قادرِ مطلق، صانعِ حکیم کے بغیر عالمِ وجود میں آ سکتی ہے؟

اس وقت بادشاہ کی چشم بصیرت سے غفلت کی پٹی دُور ہوئی۔ اور شکوک و شبہات کے وہ تمام بادل جو اس کے آسمانِ اعتقاد پر چھائے ہوئے تھے، چھٹ گئے۔ صدقِ دل سے صانع عالم کی ذات جامع جمیع صفات کا قائل ہو گیا اور سمجھ گیا کہ وزیر نے یہ تمام تدبیر اسی کی اصلاح حال کے لئے کی ہے۔ اس لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اللّٰہ الّذی جعل لکم الارض قرارًا والسماء بناءً و صوّرکم فاحسن صورکم و رزقکم من الطیبٰت ذٰلکم اللّٰہ ربکم فتبارک اللّٰہ رب العالمین۔ (سورہ مومن پ ۲۴ ع ۱۲)

حضرت امیر المومنین علیہ السّلام اسی دلیلِ جلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں وھل یکون بناء من غیر بانٍ او جنایۃ من غیر جانٍ (نہج البلاغۃ) بھلا کوئی مکان بغیر بانی کے اور کوئی جنایت بغیر جانی کے ہو سکتی ہے؟ اللہ اللہ! اثبات صانع ایسے عظیم الشان مسئلہ کے متعلق یہ مختصر کلام معجز نظام کس قدر جامعیت کا حامل ہے۔ سچ ہے کلام الامام امام الکلام۔ اسی طرح اس سلسلہ میں حضرت امیر علیہ السّلام کا یہ کلام حق ترجمان بھی بڑی جامعیت و افادیت کا حامل ہے۔ عرفت ربی بفسخ العزائم و نقض الھمم عن مت فنسخ عزمی و نقض ھمی فعرفت ان المدبر غیری۔ میں نے اپنے رب کو عزوم و ارادہ کے توڑنے سے پہچانا ہے۔ میں ارادہ کرتا ہوں مگر وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس سے میں نے یہ یقین کر لیا ہے کہ مدبر میں نہیں بلکہ کوئی اور ذات ہے (بحار ج ۲)

اس طرح اس موضوع پر انہی جناب سے ایک مختصر مگر جامع جواب مروی ہے۔ آپ سے دریافت کیا گیا اثباتِ صانع پر کیا دلیل ہے؟ فرمایا ثلاثۃ اشیا تحویل الحال وضعف الارکان و نقض الھمۃ۔ تین چیزیں دلیل ہیں۔ اوّل ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیل کرنا۔ دوئم۔ اعضاء و جوارح میں ضعف و کمزوری کا پیدا ہونا سوم۔ ارادہ کا ٹوٹ جانا (بحار الانوار ج ۲)

خلاصہ کلام یہ کہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا اور اثر کو دیکھ کر مؤثر کا تصور اور اس کے وجود کی تصدیق ایک فطری اور بدیہی امر ہے۔ منکرینِ خدا بتلائیں کہ دنیا میں کوئی ایسا صحیح الدماغ شخص ہے جو مکان کو دیکھے مگر مکان بنانے والے کا تصور اور اس کے وجود کی تصدیق نہ کرے۔ کتاب دیکھے اور اس کے مصنف و مؤلف کا تصور نہ کرے ؎

بلوحے گر ہزاراں نقش پیداست نباید بے قلم آں یک الف راست

خدا کی ہستی کے موضوع پر ایک دلچسپ مکالمہ

صاحبِ رسالہ دین و شریعت نے ایک منکرِ خدا کے ساتھ اپنا ایک عجیب مکالمہ نقل کیا ہے جو اس تمام کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ افادۂ ناظرین کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک ایسے صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں شک رکھتے تھے اور اس پر بحث کرنا چاہتے تھے۔ راقم سطور نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس کاغذ پر جو

حروف لکھے ہوئے ہیں وہ کسی لکھنے والے نے نہیں لکھے ہیں بلکہ آپ سے آپ لکھے گئے ہیں تو کیا آپ میری اس بات کو مان لیں گے ؟ یا اس کا امکان بھی تسلیم کر لیں گے ؟ انہوں نے کہا نہیں یہ بالکل ناممکن ہے۔ پھر میں نے کہا اور اگر اسی طرح میں اپنی گھڑی کے متعلق آپ سے کہوں کہ یہ کسی بنانے والے نے بنائی نہیں ہے بلکہ آپ سے آپ یہ بن گئی ہے یا اپنے اس فونٹین پن کے بارہ میں دعویٰ کروں کہ یہ کسی بنانے والے نے بنایا نہیں ہے بلکہ یونہی آپ سے آپ بن کر آسمان سے گر پڑا ہے یا اگر کسی دوڑتی ہوئی موٹر کے متعلق میں آپ سے کہوں کہ اس کو کسی نے بنایا نہیں ہے بلکہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہے اور کوئی ڈرائیور اس کو چلا نہیں رہا ہے بلکہ یہ آپ سے آپ دوڑ رہی ہے اور ہر موڑ پر خود ہی قاعدہ کے مطابق مڑ جاتی ہے۔ تو کیا آپ میری ان باتوں کو باور کر سکیں گے ؟ تو ان صاحب نے جواب دیا کہ ان میں سے تو کسی بات کو بھی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ میں نے ان سے کہا اللہ کے بندے موٹر، فونٹین پن اور گھڑی جیسی چیزوں کے متعلق تو آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہیں اور اس کاغذ پر لکھے ہوئے ٹیڑھے ترچھے حروف کے متعلق بھی آپ کی عقل کسی طرح نہیں مان سکتی کہ آپ سے آپ لکھے گئے ہیں لیکن چاند، سورج یہ ایک حیرت انگیز حکیمانہ نظام کے ساتھ چل رہے ہیں، اور ان سے بھی عجیب تر انسان کی ہستی ہے۔ اس کا دل و دماغ اور اس کی آنکھیں اور اس کے کان اور اس کی زبان ان سب کے متعلق آپ کی عقل مان سکتی ہے کہ یہ بغیر کسی کے بنائے آپ سے آپ ہی بن سکتے ہیں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ بس آپ کے نزدیک یہ بات بالکل بدیہی اور ناقابلِ بحث ہے کہ کاغذ کے اس پرزہ پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اُسے کسی لکھنے والے نے لکھا ہے اور اس گھڑی، فونٹین پن کو کسی بنانے والے نے بنایا ہے اور موٹر بھی کسی کارخانہ میں بنی ہے اور اگر وہ چل رہی ہے تو یقیناً چلانے والے کے چلانے سے چل رہی ہے۔ اسی طرح یہ بات اس سے بھی زیادہ بدیہی اور قطعاً ناقابلِ بحث ہے کہ یہ چاند، سُورج اور انسان، حیوانات اور یہ ساری کائنات کسی حکیم و خبیر اور کسی کامل القدرۃ ہستی کی بنائی ہُوئی ہے۔ اور اس میں شک و بحث کرنا اپنی فطرت کے مسخ ہو جانے یا عقل سے اپنے بالکل کورے ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید

ع ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا جس پھول کو سونگھتا ہوں بُو تیری ہے

استدلال بر وجودِ خدا بطریقۂ عرفاء شامخین

کلامِ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین میں غور و خوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طرق اُوپر بیان کئے گئے ہیں۔ یہ مکتبِ معرفتِ الٰہی کے ابتدائی سبق کی حیثیت رکھتے ہیں، اور کتابِ قرآن کی ابجد ہیں۔ ان سے مخالف کی زبان بند ہو سکتی ہے، منکر کو قائل کیا جا سکتا ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس سے حقیقی لذتِ معرفتِ پروردگار سے لُطف اندوز ہو، اور نفسِ ایمان کو جِلا ہو تو یہ سراسر خیال ہی خیال ہے وہ خدا جس کی ہستی ہماری دلیل کی بنا پر ہے وہ تو اپنی ہستی میں

جاری دلیل اور اپنی مخلوق کا محتاج ہوگا۔ تعالی اللہ عن ذٰلك علوا کبیرا کس قدر کند ذہن ہوگا وہ طالب معرفت جو اپنی تمام زندگی معرفت کی اسی ابجد خوانی میں صرف کر دے۔ اور یا من دل علی ذاتہ بذاتہ اور اعرفوا اللہ باللہ کے مقام منیع تک رسائی حاصل کرنے کی سعی نہ کرے۔ اس لئے ہادیان دین و سالکان مسلک معرفت رب العالمین یعنی حضرات آئمہ طاہرین چاہتے تھے کہ بتدریج اپنے موالیان باتمکین کو عرفان کی ان آخری مقامات عالیہ کی سیر کرائیں۔ جن پر وہ خود قائم المرام تھے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خدائے قدوس کی معرفت خدا ہی کے ذریعہ کرتے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ وہ مخلوق کو خالق کا معرّف اور آلۂ معرفت بنائیں۔ اس کے برعکس وہ مخلوق کو خالق کے ذریعہ پہچانتے ہیں۔ اور اسی طریقۂ کار کی کاملین کو تعلیم بھی دیتے ہیں۔

چنانچہ سید الموحدین حضرت امیر المومنینؑ دعائے صباح میں خداوند عالم کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ یا من دل علی ذاتہ بذاتہ و تنزہ عن مجانسۃ مخلوقاتہ۔ اے وہ بزرگ و برتر خدا جو اپنی ذات پر خود ہی دلالت کرتا ہے۔ اور اپنی مخلوق کے ساتھ مشابہت سے منزہ و مبرا ہے۔ اس سلسلہ میں امام الثقلین حضرت امام حسینؑ کا وہ علیٰ عرفہ والا کلام حق ترجمان پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ جس میں آپ فرماتے ہیں۔ کیف یستدل علیك بما هو فی وجودہ مفتقر الیك۔ الخ... بار الہا ان چیزوں سے تیری ہستی پر کیونکر استدلال کیا جا سکتا ہے جو اپنی ہستی میں خود تیری محتاج ہیں۔ الخ...

حضرت امام زین العابدینؑ دعائے ابی حمزہ ثمالی میں فرماتے ہیں۔ الٰهی بك عرفتك و انت دللتنی علیك ولولا انت لم ادر ما انت۔ اے میرے معبود تو نے ہی اپنی معرفت کے متعلق میری راہبری فرمائی اگر تو نہ ہوتا تو میں یہ سمجھ ہی نہ سکتا۔ کہ تو کیا ہے؟ کتب سیر و تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ طاہرین کے بعض اصحاب کاملین معرفت کے اسی درجہ رفیعہ پر فائز تھے۔ چنانچہ اصول کافی میں جناب منصور بن حازم سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کی خدمت میں اپنے اس مناظرہ و مباحثہ کی روئداد بیان کی جو انہوں نے ایک جماعت مخالفین کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے ضمن میں انہوں نے امام کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے ان لوگوں سے کہا ان اللہ جل جلالہ اجل و اعز و اکرم من ان یعرف بخلقہ بل العباد یعرفون باللہ۔ یعنی خداوند عالم کی ذات بابرکات اس سے کہیں اجل و اعلیٰ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے ذریعہ سے پہچانی جائے بلکہ اس کی مخلوق اس کے ذریعہ سے پہچانی جاتی ہے۔ امام عالی مقام جناب منصور کا یہ کلام سن کر مسرور و شادکام ہوئے۔ اور فرمایا۔ یرحمك اللہ۔ خدا تم پر رحم و کرم فرمائے۔

یہ بزرگوار اپنے تمام نام لیواؤں کو معرفت کے اسی مرتبۂ عظمیٰ تک لے جانے کے متمنی نظر آتے ہیں چنانچہ حضرت امیر المومنینؑ کا یہ ارشاد اصول کافی میں موجود ہے۔ فرمایا۔ اعرفوا اللہ باللہ والرسول بالرسالۃ و اولی الامر

بالامر بالمعروف اللہ سبحانہ کو خود۔ اللہ سے اور رسول کو رسالت سے اور اولی الامر کو امر بالمعروف سے پہچانو۔

اب رہا یہ امر کہ معرفت کا یہ بلند مقام کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟ اس کا طریقۂ اکتساب کیا ہے؟ تو اس کے متعلق اگرچہ علماء اعلام نے بہت کچھ طویل کلام کیا ہے۔ اور واقعاً اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جس کے لئے اس شرح کے اوراق متحمل نہیں ہیں۔ مگر ہمارا نظریہ یہ ہے کہ بموجب فارسی ضرب المثل کے کہ حلوائے ناتنانی تا نخوری ندانی۔ یہ امر حال سے تعلق رکھتا ہے نہ مقال سے۔ اس کے لئے "علم الاخلاق" کی سیر کے تخلقوا باخلاق اللہ کے عملی مظاہرہ کی ضرورت ہے۔ ولقد اجاد من افاد۔ ؎

ہاں مجرد شو مجرد را ببیں   دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

ولنعم ما قیل۔ ؎

بسر قصۂ سیمرغ ز قصۂ ہدہد   کسے رسد کہ شناسائے منطق الطیر است

سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العزیز الحکیم۔ اللھم ارزقنا حلاوۃ معرفتک الکاملۃ بجاہ النبی وعترتہ الطاہرۃ۔

فرقہ دہریہ کے چند شکوک و شبہات کا ازالہ

انکار وجود باری تعالیٰ کے سلسلہ میں مادیین و دہریین کے بزعم خود دلائل کو ہم نے شکوک و شبہات سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ اگر ان کو میزانِ عقل و دانش پر جانچا جائے تو وہ دلائل کہلانے کے حقدار ثابت نہیں ہوتے۔ بلکہ بموجب ارشادِ قدرت مالھم بذلک من علم ان ھم الا یظنون۔ (جاثیہ) ان کے پاس علم و یقین نہیں بلکہ جو کچھ ہے وہ سراسر اوہام و ظنون ہیں۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ سطور بالا میں منکرین کے انکار کی وجوہات تفصیل سے ذکر ہو چکی ہیں۔ اگرچہ مذکورہ بالا بیاناتِ شافیہ کے بعد مزید کچھ خامہ فرسائی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ وہ بیانات طالبانِ حق و متلاشیانِ حقیقت کو راہِ راست پر لانے کے لئے کافی ہیں۔ تاہم ہم چاہتے ہیں کہ قدیم و جدید ملاحدہ و دہریہ جن شکوک و شبہات کی بنا پر وجود باری تعالےٰ کا انکار کرتے ہیں۔ ان میں سے چند اہم شبہات کا یہاں ذکر کر کے ان کے مکمل جوابات پیش کر دیں۔ تاکہ یہ بحث کسی لحاظ سے بھی تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔

شبہ اولیٰ اور اس کا جواب) اور یہی شبہ دہریہ کے قصرِ انکار کا سنگِ بنیاد ہے۔ وہ یہ کہ ہر وہ چیز جو حواس خمسہ ظاہریہ (لامسہ۔ ذائقہ۔ شامہ۔ سامعہ۔ باصرہ) سے محسوس و مشاہدہ نہ ہو۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اور چونکہ خدائے تعالےٰ ان حواس کے ساتھ محسوس نہیں ہوتا۔ لہٰذا (معاذ اللہ) وہ موجود نہیں ہے؟ اگر معمولی غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کا ازالہ کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل واضح البطلان ہے۔

کیونکہ مشہور و مسلّم اصول ہے کہ عدم الوجدان لا یدل علی عدم الوجود۔ کسی شے کا نہ پانا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں، خود انسان کے اندر اس امر کے کئی شواہد و دلائل موجود ہیں۔ مثلاً روح، عقل، حافظہ، لذت و رنج، صحت و سقم، محبت و عداوت اور بھوک و پیاس وغیرہ کئی ایسی اشیاء ہیں، جن کا وجود ناقابلِ انکار ہے۔ مگر یہ سب سوائے حواسِ باطنیہ اور اپنے خواص و آثار کے حواسِ ظاہریہ کے ساتھ محسوس نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ انہی حواسِ ظاہریہ میں جو قوتیں موجود ہیں (یعنی چھونے، چکھنے، سونگھنے، سننے اور دیکھنے کی قوت) وہ خود محسوس نہیں تو کیا کوئی عقل مند فقط اس وجہ سے کہ یہ چیزیں ظاہری حواس کے ساتھ محسوس نہیں ہوتیں، ان کے وجود کا انکار کر سکتا ہے؟ قدیم زمانہ کے دہریے اسی اصولِ غیر معقول کی بنا پر نفس و رُوح کے وجود کا انکار کرتے ہوئے اسی ظاہری ہیکل کو ہی انسان کہتے تھے۔ مگر آج موجودہ دَور کی سائنسی تحقیقات جدیدہ و انکشافاتِ مفیدہ بالخصوص علمِ تنویمِ مقناطیسی اور علمِ احضار الارواح" نے ان کے نظریات کو باطل کر کے ان کو رُوح کے وجود کا اقرار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور ان کے لئے معرفتِ خدا کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ اسی وجہ سے مخبرِ صادق نے فرمایا ہے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا۔ اُس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا۔ مگر افسوس یہ لوگ اللہ سبحانہ کو فراموش کر بیٹھے۔ اور اس ذاتِ قہار نے ان کو اپنے نفس بھی بھلا دیئے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے۔ نسوا اللہ فانساھم انفسھم (سورۃ حشر پ۲۸) یہ لوگ خدائے عزّوجل کو بھول گئے اور خدا نے ان کو ان کے نفوس بھلا دیئے۔ ع

از مکافاتِ عمل غافل مشو گندم از گندم بروید جوز جو

حقیقت الامر یہ ہے کہ انسانی علم جیسا کہ ارشادِ باری ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ بہت ہی ناقص اور محدود ہے۔ اس لئے ہمارا علم ان تمام حقائق کو جو خیال میں آ سکتے ہیں، معلوم کرنے سے قاصر ہے۔ بایں ہمہ روز بروز کئی ایسی چیزوں کے وجود کا انسان کو علم ہوتا رہتا ہے کہ جو پہلے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ اور پھر بھی حواسِ ظاہریہ سے محسوس نہیں ہو سکتیں۔ قوتِ برقیہ (بجلی) کو دیکھئے اس کے دریافت ہونے سے پہلے اس کا کون خیال کرتا تھا؟ اس کے خواص و آثار کا کسے علم تھا؟ اتفاقیہ طور پر یہ قوت دریافت ہو گئی۔ اور آج ہم اس سے ہزاروں فائدے حاصل کر رہے ہیں۔ اور باوجود کہ وہ عالمِ طبیعات میں سے ہے۔ آج تک اس کا مشاہدہ نہیں ہو سکا۔ مگر ہر شخص اس کے خواص و آثار دیکھ کر اس کے موجود ہونے کا یقین رکھتا ہے۔ اسی طرح قوتِ مقناطیسی کا وجود بھی اپنے آثار و لوازم کی بنا پر حتمی و یقینی ہے۔ مگر آج تک کسی شخص نے اسے آنکھ سے نہیں دیکھا۔ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان اس کے آثار دیکھنے کے باوجود اس کے موجود ہونے کا انکار کر سکتا ہے؟ طرفہ تماشا یہ کہ خود مادۂ اثیر (ایتھر) ہی کو لے لیجئے، جسے یہ فرقہ اصل کائنات قرار دیتا ہے۔ کیا انہوں نے اس کو اپنے حواسِ خمسہ میں سے کسی حاسہ کے ساتھ ادراک کیا ہے؟ حاشا و کلا۔ ہمارے اسی مادی عالم میں کئی ایسی چیزیں موجود ہیں کہ خوردبین استعمال کئے بغیر ہمارے حواس ان کا ادراک نہیں کر سکتے۔ تو

پھر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اسی عالم میں کچھ ایسی چیزیں بھی موجود ہوں کہ جن کو ہمارے حواس ظاہر یہ باوجود آلات کے استعمال کرنے کے بھی درک نہ کرسکیں جیسا کہ نامبردہ اشیاء کی یہی کیفیت ہے۔ پس ان حقائق سے ثابت ہو گیا کہ جب ہمارے حواس اس قدر عاجز و کمزور ہیں کہ اسی مادی عالم کی بعض اشیاء کا بھی ادراک نہیں کر سکتے لیکن وہ اشیاء یقیناً موجود ہیں۔ تو اگر دوسرے عالم کی بعض اشیاء کا ادراک نہ کرسکیں تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔ لہٰذا محض اس بناء پر خداوندِ عالم کی ہستی کا انکار کرنا کہ اسے ہمارے حواس خمسہ درک نہیں کر سکتے۔ باوجودیکہ اس کی ہستی کے بے شمار آثار موجود ہیں۔ بالکل خلافِ عقل و دانش بات ہے ع

وجمیع اوراق الغصون دفاتر مشحونۃ بادلۃ التوحید

یعنی ہمہ عالم کتاب حق تعالیٰ است۔

اور یہ آثار بے شمار بتلاتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں ان کے مؤثر کا انکار کرنا عین حماقت و جہالت ہے۔

ع۔ تجلت لوحدانیتہ الحق انوار فدلت علی ان المجود ھو العار

شبۂ ثانیہ۔ اگرچہ قدمائے زنادقہ و فلاسفہ کا اس مادی عالم کی اصل اور اشیاء ارضی و سماوی کی خلقت کے بارہ میں باہم بڑا اختلاف ہے اور ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ ایک نظریہ قائم کیا ہے لیکن زمانۂ حال میں جس امر پر ان کی رائے مستقر اور قائم ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس عالم ارضی و سماوی کی تمام اشیاء کی اصل دو امر ہیں۔ مادہ اور اس کی حرکت یہ دونوں قدیم ہیں۔ اور ازل سے ان کے درمیان تلازم ہے۔ پہلے کوئی شے نہ تھی۔ فضا ذراتِ مادیہ سے لبریز تھی۔ پھر یکایک ان ذرات و اجزاء میں تموّج اور حرکت پیدا ہوئی۔ اور اس سے کائنات ارضی یعنی جمادات و نباتات اور حیوانات بنے۔ اور اسی سے اجرام سماوی یعنی آفتاب و ماہتاب اور ستارے خود بخود معرضِ وجود میں آئے (اس پیدائش کی کیفیت اور تفصیل سے یہاں بحث کرنا خارج از مقصد ہے) خلاصہ یہ کہ یہ فرقہ کائنات کی اصل مادہ کو قرار دیتا ہے۔ اور اسے قدیم کہتا ہے۔ اس بنا پر وہ وجودِ خدا کا منکر ہے۔

یہ شبہ بچند وجہ باطل اور ناقابلِ قبول ہے۔

وجہ اوّل۔ تمام فلاسفہ دہریہ کا اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ مادہ میں نہ عقل ہے نہ شعور۔ نہ حس ہے نہ حرکت اور نہ اس میں حیات و زندگی ہے مگر مشاہدہ شاہد ہے کہ کائنات میں کروڑوں چیزیں ایسی موجود ہیں جو زیورِ حیات سے آراستہ اور زینتِ عقل و شعور سے مرصّع و مزیّن اور نعمتِ حس و حرکت سے مالا مال ہیں۔ اور یہ اصول بلا امتیاز مذہب و ملت تمام حکماء بلکہ تمام عقلاء کے نزدیک محقق و مسلّم ہے کہ فاقدِ شئی معطیٔ شئی نہیں ہو سکتا یعنی جس کے پاس جو چیز موجود نہ ہو۔ وہ دوسرے کو نہیں دے سکتا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مادہ ہی اصل کائنات ہے۔ اور وہی مبدأ عالم ہے اور خود اس میں عقل و شعور اور حرکت و حیات نہیں ہے تو کائنات میں عقل و حیات کہاں سے

آگئی؟ اہل سائنس نے یہ امر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس میں آج تک کامیاب نہ ہو سکے۔ اور انہوں نے اس سلسلہ میں متعدد نظریات قائم کئے لیکن بالآخران کو یہ اقرار کرنا پڑا ہے کہ وہ اس معمہ کو حل کرنے میں ہرگز کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے! بھلا کوئی عقل سلیم اس بات کو کیونکر تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک بے عقل و شعور شئی صاحب عقل و ادراک اور ذی حیات ہستی کو پیدا کر دے۔ مالکم کیف تحکمون؟

وجہ دوئم۔ یہ امر مسلّم و مبرہن ہے کہ حرکت بلا محرک پیدا نہیں ہو سکتی تو مادہ میں وہ حرکتِ اوّلین کیونکر پیدا ہوئی؟ وہ حرکت کس نے پیدا کی؟ اس حرکتِ اوّلین کا باعث وسبب کیا تھا؟ سائنس اور فلسفہ آج تک اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب پیش نہ کر سکا۔ اور نہ ہی آئندہ اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس گتھی کو سلجھا سکے گا۔ دہریت میں یہ بڑا نقص ہے کہ وہ ان یا ان جیسے دیگر سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتی۔ قرآن نے تو پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وما لھم بذلک من علم ان ھم الا یظنون (الجاثیہ) کہ وہ دولت علم و یقین سے تہی دامن ہے۔ ہر دعویٰ کے لئے ثبوت ضروری ہوتا ہے۔ کوئی دعویٰ بلا دلیل قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اگر ان میں ہمت وجرأت ہے تو وہ اپنے دعاوی کو دلائل و براہین سے ثابت کریں کہ مادہ ازل سے موجود ہے۔ بے جان مادہ میں زندگی پیدا کرنے کی طاقت موجود ہے۔ اس میں خود بخود حرکت پیدا ہوئی۔ ایک ہی مادے مختلف الانواع چیزیں پیدا ہو سکتی ہیں بے عقل وحس مادہ باعقل و باحس اشیاء کو پیدا کر سکتا ہے؟

کیا دہریوں کو ان امور کا علم ہے؟ قرآن بتلاتا ہے کہ ان کو علم نہیں ہے۔ سائنسدانوں کو اعتراف ہے کہ ان کو کوئی علم نہیں۔ بعد ازاں دہریت کے پاس رہ ہی کیا جاتا ہے؟ ہم دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے ملاحدہ و دہریہ قیامت تک ان سوالات کے تحقیقی جوابات نہیں دے سکتے! ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین ان حقائق کے پیش نظر ماننا پڑتا ہے کہ یہ کائنات ایک ایسے حیّ و قیوم، خالق حکیم اور بصیر علیم کی قدرت کاملہ کا نتیجہ ہے جو علیٰ کل شیئٍ قدیر کا مصداق ہے اور عقل و شعور اور حیات و وجود اس کا عین ذات ہے۔ اور تمام کائنات کی بادشاہت اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ تبارک الذی بیدہ ملکوت کل شیئٍ۔ اسی لئے اسلام بلا کسی تذبذب کے پورے وثوق و اطمینان کے ساتھ کہتا ہے۔ کہ موت وحیات کو خداوند عالم نے پیدا کیا ہے۔ اور موت وحیات کے آلات و اسباب کا بھی وہی خالق ہے۔ سب اسباب و واقعات اس کے زیر حکم ہیں۔ الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ (الملک ۲۹)

وجہ سوئم۔ اس تمام شبہ کا دارومدار اس بات پر ہے کہ مادہ قدیم و ازلی ہے۔ مگر ادلّہ قطعیہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ خود مادہ بھی دیگر مادیات کی طرح حادث ہے نہ قدیم یہاں اس کے حدوث کے چند دلائل ذکر کرتے ہیں۔

حدوث مادہ کی پہلی دلیل

پرستاران مادہ قائل ہیں کہ عالم کے تمام تغیرات و تبدلات حادث ہیں اور ماہرین طبقات الارض کا بھی اس امر پر اتفاق ہے کہ نباتات و حیوانات کی تمام انواع پہلے موجود نہ تھیں، مدت مدید کے بعد کتم عدم سے عرصۂ وجود میں جلوہ گر ہوئیں۔ پس اگر ان تمام تغیرات و تبدلات کی علت مادہ اور اس کی حرکت ہے۔ اور یہ تغیرات اس کے معلول تو جب یہ علت قدیم ہے تو معلول کیوں حادث ہے؟ علت و معلول میں یہ تفریق و جدائی عقلاً محال و ناممکن ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ علت تو قدیم ہو مگر اس کے معلولات حادث ہوں؟ جب علت موجود تھی تو اس کے معلولات کیوں لاکھوں برس بعد وجود میں آئے۔ یہاں اگر یہ عذر پیش کیا جائے کہ یہ اس قدر طویل زمانہ استعداد کی انتظار میں گذرا کہ معلومات میں استعداد پیدا ہو جائے تو پھر وجود میں آئیں۔ تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب اس کی استعداد کی علت بھی وہی مادہ قدیمہ ہے تو وہ استعداد اس سے قبل کیوں پیدا نہ ہو گئی؟ یہاں اگر یہ کہا جائے کہ مادہ قدیمہ نے اپنے ارادہ و اختیار سے ان چیزوں کی تخلیق کے لئے جو وقت چاہا مقرر کر دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مادہ میں تو علم و ارادہ اور عقل و شعور ہے ہی نہیں۔ تو وہ ان کی تخلیق کا وقت کیونکر معین کر سکتا ہے؟ خلاصۂ کلام یہ کہ اگر علت قدیم ہے تو پھر یا تو تغیرات و تنوعات کو بھی قدیم تسلیم کیا جائے۔ حالانکہ ان کا حادث ہونا اظہر من الشمس ہے۔ اور ہم اس موضوع پر پہلے کافی تبصرہ کر چکے ہیں اور یا پھر مادہ کو بھی ان تبدلات کی طرح حادث مانا جائے۔ اور یہی درست ہے کہ ایک وقت تھا کہ نہ مادہ تھا نہ مادیات نہ ان کے تغیرات اور تنوعات! قادر قدیم خدائے مختار نے ان کو پردۂ عدم سے نکال کر خلعتِ وجود سے سرفراز فرمایا ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکوراً (سورۃ الدھر پ۲۹)

دوسری دلیل

اس عالم میں جس قدر تغیر و تبدل اور تحول و تنوع مادہ میں پایا جاتا ہے۔ اتنا کسی اور شی میں نہیں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مادہ میں ارادہ و اختیار اور علم و ادراک نہیں ہے۔ لہٰذا یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اس کے ان تغیرات و تبدلات کی علت اس کے ارادہ کو قرار دیا جائے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے یہ مختلف شکلیں و صورتیں بدلتا رہتا ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ایک قدیم و قدیر اور علیم و بصیر الیسی ذات و الاصفات موجود ہے جو اپنے ارادہ و اختیار سے اس مادہ میں مناسب تغیر و تبدل کرتی رہتی ہے۔ یہ امر سابقاً مبرہن کیا جا چکا ہے کہ جس چیز میں تغیر و تبدل ہو وہ حادث ہوتی ہے۔

تیسری دلیل

یہ قاعدہ ہے کہ جس چیز کا وجود اصلی اور ذاتی ہو اس میں تغیر و تبدل ناممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی چیز میں تبدل اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب کسی اور شئی کو اس کے وجود میں دخل ہو۔ اور ظاہر ہے کہ قدیم اور واجب الوجود میں کسی کا دخل ممکن نہیں ہے۔ مگر یہ امر بالمشاہدہ ثابت ہے کہ مادہ میں بے شمار تغیرات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ مادہ قدیم نہیں ہے۔ یا ایھا الانسان ما غرک بربک

الکریم الذی خلقك فسوّاك فعدلك فی ای صورة ما شاء رکّبك (سورۃ الانفطار پ ۳۰)

اے انسان تجھے اپنے کریم پروردگار کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا جس نے تجھے پیدا کیا تو تجھے درست بنایا۔ اور مناسب اعضا دیے۔ اور جس صورت میں اُس نے چاہا تیرے جوڑ بند بنائے۔ (ترجمہ فرمان)

چوتھی دلیل

اس عالم رنگ و بو میں حضرت انسان علم و ادراک۔ فہم و فراست، صنعت و حرفت فضل و کمال ارادہ و اختیار اور طاقت و قدرت میں تمام کائنات پر فوقیت رکھتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ایک مچھر بھی نہیں پیدا کر سکتا تو عقل انسانی یہ کس طرح باور کر سکتی ہے کہ ایک بے عقل و شعور اور بے حس و حرکت اور بے جان مادہ نے حضرت انسان کو اور دیگر صنائع و بدائع کو پیدا کیا ہے؟ لہٰذا عقل مادہ کو حادث اور مخلوق ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ خود مخلوق ہے خالق نہیں ہے۔ ام خلقوا من غیر شیئ ام ھم الخالقون (سورۃ طور پ ۲۷ ع ۴) کیا یہ لوگ کسی کے (پیدا کئے) بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہی لوگ (مخلوقات کے) پیدا کرنے والے ہیں (ترجمہ فرمان)

پانچویں دلیل

یہ مسلم ہے کہ جس طرح ممکن اپنے وجود میں واجب الوجود سے کمتر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں واجب کی صفات سے کمتر ہو لیکن اگر مادہ کو قدیم اور اصل تسلیم کر لیا جائے تو معاملہ اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے کیونکہ بنا بریں مادہ و حرکت میں جس سے بقول دہریہ یہ کائنات پیدا ہوئی ہے۔ علم و ادراک اور ارادہ و اختیار کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے۔ مگر کائنات میں یہ سب صفتیں بدرجۂ اتم و اکمل موجود ہیں۔ تو کیا اثر اپنے موثر سے اور مصنوع اپنے صانع سے بڑھ سکتا ہے اور کیا فاقد شی معطی شی ہو سکتا ہے؟ کیا ایسے خلاف عقل نظریہ کو عقل سلیم و طبع مستقیم تسلیم کر سکتی ہے؟ مالکم کیف تحکمون۔

(علم الکلام کاندھلوی) ع

ذات نایافتہ از ہستی بخش   نتواند کہ شود ہستی بخش

ان دلائل ساطعہ و براہین قاطعہ سے واضح و آشکارا ہو گیا کہ مادہ کو قدیم اور مبدأ کائنات قرار دینا بالکل ایک ایسا لغو اور بے ہودہ نظریہ ہے کہ جسے عقل سلیم ہرگز صحیح تسلیم نہیں کر سکتی۔

استعجاب

تعجب ہے کہ دہریوں نے اس موقعہ پر اپنے ایک مشہور قاعدہ کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ بلا مشاہدہ کسی چیز کو نہیں مانتے۔ ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا انہوں نے مادہ اور اس کی حرکت قدیم کا مشاہدہ کیا ہے؟ اس مقام پر اگر وہ یہ جواب دیں کہ ہم نے اگرچہ مادہ اور اس کی حرکت قدیمہ کا مشاہدہ تو نہیں کیا۔ مگر اس کے آثار یعنی تغیرات و تبدلات سے یہ کشف کیا ہے۔ کہ ان کا کوئی موثر ضرور ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ ہمارا بھی بعینہ یہی استدلال ہے کہ جب ہم اس عالم میں ایسے عجیب و غریب آثار دیکھتے ہیں کہ جن کے فہم و ادراک سے عقول و افہام حیران اور سرگریبان ہیں تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان آثار کی موثر کوئی ایسی ہستی ہے جو علم و فضل۔ ارادہ و

اختیار، قدرت وحکمت اور حیات وغیرہ صفاتِ کمالیہ سے بدرجۂ اتم واکمل متصف ہے۔ ذلک اللہ رب العلمین

اور اگر یہ کہا جائے (جیسا کہ موجودہ زمانہ کے بعض زنادقہ ودہریہ کہتے ہیں) کہ یہ سب صفاتِ مادہ میں موجود ہیں تو ہماری اور اُن کی تمام بحث ونزاع ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ پھر حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں رہ جاتا۔ فقط نام کا فرق ہے جسے ہم خداوند عالم کہتے ہیں۔ اسے وہ مادہ کہہ رہے ہیں ؎

وکل الی ذاک الجمال یشیر ولقد اجاد من افاد ؏

ہندو نے بتوں میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ مغوں نے راگ گایا تیرا

دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھ کو انکار کسی سے نہ بن آیا تیرا حالیؔ

یا صنم یا صنم از خلق جہاں می شنوم ایں صنم کیست کہ عالم ہمہ دیوانۂ اوست

شبۂ ثالثہ اور اُس کا جواب۔ اس کائنات کا کوئی مبداء نہیں ہے۔ نہ خدا نہ مادہ۔ بلکہ یہ عالم اتفاقاً ظہور پذیر ہو گیا ہے۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ جب دہریوں کا مذکورہ بالا دلائل وغیرہ سے ناطقہ بند کیا جاتا ہے کہ ایک بے عقل و بے حس اور بے ارادہ واختیار اور بے طاقت وبے حیات مادہ کیونکر یہ عجائب وغرائب سے بھرا ہوا عالم پیدا کر سکتا ہے؟ تو ان لوگوں پر قافیۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے اور بموجب ضاقت علیھم الارض بما رحبت اور زمین اپنی وسعت کے باوجود اس طرح تنگ ہو جاتی ہے کہ ان کے لئے نہ جائے ماندن اور نہ پائے رفتن والا معاملہ درپیش آجاتا ہے تو اس وقت یہ لوگ بفحوئے الغریق یتشبث بکل حشیش۔ (ڈوبتے کو تنکے کا سہارا) اس ذہنی کشمکش وتذبذب کے عالم میں وہ وہ عجیب مذبوحی حرکات کرتے ہیں اور ایسے ایسے مہمل ومزخرف جوابات دیتے ہیں کہ جو ان کے مزعومہ مادہ کی طرح عقل وشعور سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ انہی جوابات میں سے ایک جواب یہی ہے جو اس شبہ ثالثہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ کائنات کی کوئی اصل نہیں ہے۔ محض صدفۃً واتفاقاً ظہور پذیر ہو گئی ہے۔ ان کے اس جواب باصواب پر یہ مشہور عربی مثل منطبق ہوتی ہے کہ فرّ من المطر وقام تحت المیزاب یعنی بارش سے بھاگا اور پرنالہ کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ ان بے چاروں نے جس امر سے گھبرا کر اس جواب کا سہارا لیا تھا آتنی خرابیاں اس نظریہ میں نہ تھیں جس قدر اس جواب میں ہیں۔

ہم ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ واضح وآشکار کرتے ہیں کہ یہ جواب بچند وجہ ناقابلِ سماعت اور یہ شبہ بچند وجہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

وجہ اوّل۔ یہ نظریہ بالکل بدیہی البطلان ہے۔ کیونکہ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ فعل بغیر فاعل کے اور اثر بغیر مؤثر کے واقع ہو جو کہ صاف ترجیح بلا مرجح ہے۔ اور یہ ایسے ہی محال ومناممکن ہے جیسے ایک کا دو کے برابر ہونا۔ یا جیسے دو اور دو کا مل کر تین ہونا۔ کوئی بھی شخص جسے مبداء فیض سے معمولی عقل وشعور بھی ملا ہے وہ کبھی ایسے خلافِ عقل وفطرت نظریہ

کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ان فی ذلک لایات لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔

وجہ دوم۔ اگر صدفہ اتفاق کے مشہور معنی سلئے جائیں یعنی کسی فعل واثر کا اس کے فاعل ومؤثر سے بلا قصد و ارادہ ظاہر ہونا اور یہ معنی ان لوگوں نے کئے ہیں جو بے عقل اور بے حس وحیات مادہ کو مبدأ کائنات تصور کرتے ہیں۔ اور پھر ان پر مذکورہ بالا اعتراضات کئے جاتے ہیں تو وہ ان سے بچنے کے لئے یہ راستہ اختیار کرتے ہیں کہ یہ کائنات مادہ سے بلا ارادہ واختیار محض اتفاقاً پیدا ہو گئی ہے۔

تو یہ شق بھی شق سابق باطل ہے کیونکہ بفرض محال اگر چند لمحات کے لئے ایسے صدفہ واتفاق کو ممکن بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تاہم یہاں یہ اتفاق باور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ جو کام اتفاق سے انجام پذیر ہو۔ وہ پراگندہ اور غیر منتظم ہوتا ہے۔ اس میں نظم ونسق ہوتا ہے اور نہ ترکیب وترتیب۔ مگر کائنات میں وہ نظم وضبط اور عمدہ ترتیب پائی جاتی ہے کہ عقلاء روزگار اور بڑے بڑے سائنسدان اسے دیکھ کر ...... انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ اور آج اس علمی دور میں بڑے بڑے سائنسدان اور فلیسوف عالم اسی کامل نظام کو مشاہدہ کر کے صانع حکیم کے وجود کا اقرار و اعتراف کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ مگر حکیم روحانی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آج سے تقریباً تیرہ سو برس پیشتر عالم کی اسی نظم وترتیب سے صانع عالم کے وجود مسعود پر استدلال فرمایا تھا۔ چنانچہ جناب مفضل سے فرماتے ہیں

یا مفضل اول العبر والادلۃ علی الباری جل قدسہ ھیئۃ ھذا العالم وتالیف اجزائہ ونظمھا علی ما ھی علیہ فانک اذا تاملت العالم بفکرک ومیزتہ بعقلک وجدتہ کالبیت المبنی المعد فیہ جمیع مایحتاج الیہ عبادہ فالسماء مرفوعۃ کالسقف والارض ممدودۃ کالبساط والنجوم مضیئۃ کالمصابیح والجواھر مخزونۃ کالذخائر والانسان مالک ذالک البیت وضروب النبات مھیاۃ لمآربہ وصنوف الحیوان مصروفۃ فی مصالحہ ومنافعہ ففی ھذا دلالۃ واضحۃ علی ان العالم مخلوق بتقدیر وحکمۃ ونظام وان الخالق لہ واحد وھو الذی نظمہ بعضاً الی بعض جل قدسہ ولا الہ غیرہ تعالیٰ عما یقول الجاحدون وجل وعظم عما ینتحلہ الملحدون! اے مفضل! وجود باری تعالیٰ پر تمام دلائل تامہ سے پہلی قطعی دلیل اس عالم کی شکل وصورت اور اس کی نظم وترتیب ہے۔ کیونکہ اگر تم اپنی عقل وفکر سے اس عالم میں غور وتأمل کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ عالم ایک ایسے گھر کی مانند ہے کہ جس میں بندگان خدا کی بود وباش اور رہائش وآسائش کے سب اسباب مہیا ہیں۔ چنانچہ یہ بلند آسمان بشکل چھت کے اور یہ پھیلا ہوا زمین بشکل فرش کے ہے۔ اور یہ چمکتے ہوئے ستارے بشکل قندیل کے اور جواہر بشکل ذخیروں کے ہیں۔ اور حضرت انسان اس گھر کا مالک ومتصرف ہے۔ اور یہ مختلف قسم کی نباتات اس کی حاجات پورا کرنے کے لئے اور یہ حیوانات اس کے ضروریات ومصالح کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ تخلیق میں اس امر پر واضح دلالت

موجود ہے۔ کہ اس عالم کی تخلیق تقدیر و تدبیر اور حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔ اور اس کا خالق حکیم مالک ہے اور اسی نے عالم کے بعض اجزا کو دوسرے بعض اجزا کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔ جو کچھ ملحد و منکر کہتے ہیں۔ اس سے اس کی ذات والاصفات اجل و ارفع ہے۔ (از رسالہ توحید مفضل[1])

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اس کی۔ کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

یہ امر انسانی جبلت و فطرت میں داخل ہے کہ جب وہ کسی چیز کو مرتب و منظم دیکھتا ہے۔ تو یقین کر لیتا ہے۔ کہ کسی عقلمند و دانشمند نے اسے ترتیب دیا ہے۔ اور اگر وہ کہیں چند چیزوں کو بے ترتیب اور بے سلیقہ رکھا ہوا دیکھے تو اسے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ چیزیں آپ سے آپ اکٹھی ہو گئی ہوں مگر حسن ترتیب کی صورت میں یہ خیال اُسے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کی واضح مثال یوں فرض کریں کہ آپ مرزا غالبؔ یا ڈاکٹر اقبالؔ کا کوئی شعر لیں اور اس کے الفاظ کو الٹ پلٹ کر کسی ناخواندہ آدمی کو دے کر کہیں کہ وہ ان الفاظ کو اس طرح ترتیب دے کہ اصل شعر بن جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہزار طرح الٹ پلٹ کرے گا۔ مگر اتفاقیہ طور پر کبھی یہ نہ ہوگا کہ مرزا غالبؔ یا ڈاکٹر اقبالؔ کا اصل شعر نکل آئے حالانکہ الفاظ و حروف اور جملے وہی ہیں۔ صرف معمولی سی ترتیب کا ہیر پھیر ہے۔ بنا بریں کوئی سلیم العقل انسان کیونکر یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ نظام عالم جو اس قدر باقاعدہ مرتب و منظم اور موزوں ہے۔ خود بخود پیدا ہو گیا ہے؟ قرآن مجید میں بھی اثباتِ صانع عالم کے سلسلہ میں اسی طریقہ سے استدلال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ صنع اللہ الذی اتقن کل شئی (یہ خداوند عالم کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو محکم طریقہ سے بنایا ہے) ما ترٰی فی خلق الرّحمٰن من تفاوت فارجع البصر هل ترٰی من فطور (سورۂ الملک پ۲۹) (صانع عالم کی اس کاریگری میں تمہیں کہیں بھی فرق نظر نہ آئے گا پھر دوبارہ نظر دوڑاؤ۔ کیا کوئی خلل دکھائی دیتا ہے؟) خلق کلّ شئیٍ فقدّرہ تقدیرًا (خداوند عالم نے ہر شے کو پیدا کیا۔ اور اس کے لئے ایک اندازہ مقرر کیا۔ عالم کی اسی موزونیت اور حسنِ ترتیب کو دیکھ کر بڑے بڑے فیلسوف اور سائنسدان معبود برحق کا اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

چنانچہ پلین آلورڈ کہتا ہے: "انسان اس وقت سخت حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر اور ناطق مشاہدات کے ہوتے ہوئے ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عجائبات صرف بخت و اتفاق

---

[1] یہ رسالہ شریفہ اور رسالہ اہلیلجہ معارف توحید کے سلسلہ میں انمول منفید ہیں علامہ مجلسیؒ نے ہر دو رسائل کو بحار الانوار میں درج کیا ہے نیز رسالہ توحید مفضل کا فارسی ترجمہ بھی فرمایا ہے اور علیحدہ علیحدہ بھی عراق و ایران میں شائع ہو چکے ہیں اور اردو زبان میں مولانا سید محمد ہارون صاحب مرحوم نے ان کا ترجمہ بنام توحید الائمہ شائع کیا ہے۔ عارف کامل عالم فاضل حضرت سید ابن طاؤس علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ کشف المحجہ میں سفر و حضر میں ان کو زیر مطالعہ رکھنے کی وصیت فرمائی ہے لہٰذا مومنین کو ان رسائل شریفہ سے استفادہ کرنا چاہیئے (شارح عفی عنہ)

کے نتائج ہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ مادہ کی عام خاصیت کے نتائج ہیں یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں۔ جن کو لوگوں نے علم المحسوسات کا لقب دے رکھا ہے۔ لیکن علم حقیقی نے ان کو بالکل باطل کر دیا ہے۔ فزیکل سائنس جاننے والا کبھی اس پر اعتقاد نہیں رکھ سکتا۔"

مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے "یہ اسرار جو روز بروز زیادہ دقیق ہوتے جاتے ہیں۔ جب ہم ان پر زیادہ بحث کرتے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت ہے جس سے تمام اشیاء وجود میں آئی ہیں۔"

پروفیسر لینی لکھتا ہے: "خدائے قادر و توانا اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ اور میں بالکل دیوانہ بن جاتا ہوں۔ ہر چیز میں گو وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ اس کی کس قدر عجیب قدرت۔ کس قدر عجیب حکمت۔ کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے۔" اسحٰق نیوٹن کہتا ہے: "کائنات کے اجزاء میں باوجود ہزاروں انقلابات زمان و مکان کے جو ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایک ایسی ذات کے پایا جا سکے جو سب سے اوّل ہے اور صاحب علم اور صاحب اختیار ہے۔"

کیمل فلماریاں حکیم فرانس کہتا ہے "تمام اساتذہ اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وجود کیونکر ہوا۔ اور یہ کیونکر برابر چلا جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر ان کو مجبوراً ایک ایسے خالق کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ جس کا موثر ہونا ہمیشہ اور ہر وقت قائم ہے۔" (بحوالہ الکلام شبلی)

کس قدر تعجب ہے کہ جب کہ تحقیقات جدیدہ و تدقیقات مفیدہ کی انتہا ہو گئی ہے اور کائنات کے ہزاروں سربستہ راز فاش ہو چکے ہیں۔ اور سائنس اپنے معراج کمال تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے باوجود بڑے بڑے فلاسفر اور سائنسدان بڑے غور و خوض کے بعد خداوند عالم کی ہستی کے ثبوت میں وہی استدلال پیش کر سکے ہیں۔ جو قرآن نے آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے نہایت سادہ اور قریب الفہم طریقہ سے پیش فرمایا تھا۔ ان فی ذالک لآیات لقوم یعقلون پروفیسر لینی کا یہ قول کہ "ہر چیز میں گو وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو کس قدر عجیب قدرت، کس قدر عجیب حکمت، کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے۔" ارباب عقل و فکر کو اس صد رنگ کائنات کی اشیاء میں قدرت کاملہ نے جو کرشمہ سازیاں اور حکمت آمیزیاں فرمائی ہیں۔ ان میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ جوں جوں انسان کائنات کی بزرگ یا خورد اشیاء میں غور و فکر کرتا ہے۔ خالق عالم کی عظمت و جلالت کا نقش صفحۂ ذہن میں زیادہ اُجاگر ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے اپنے کلام پاک میں بار بار نگار خانۂ کائنات کی مختلف اشیاء میں غور و فکر کرنے کی ترغیب دلائی ہے کبھی ارشاد فرماتا ہے۔ اولم یتفکروا فی انفسھم ما خلق اللہ السموٰت والارض وما بینھما الا بالحق

(روم پ ۲۱)

کبھی اس طرح حکم دیتا ہے۔ قل انظروا ماذا فی السموٰت والارض (سورہ یونس پ ۱۱)

کبھی فرماتا ہے۔ افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت (سورہ غاشیہ پ)

کہیں اس طرح فرماتا ہے۔ اولم یروا الی الارض کم انبتنا فیہا من کل زوج کریم (سورہ شعراء پ۱۹)

اور کہیں کائنات میں غور و فکر کرنے پر یوں تہدید فرماتا ہے۔ اولم ینظروا فی ملکوت السموٰت والارض وما خلق اللہ من شیئ (سورہ اعراف پ۹)

اور اسی بنا پر معصومین نے ہدایت فرمائی کہ اذا اردتم ان تنظروا الی عظمتہ فانظروا الی عظم خلقہ۔ یعنی جب چاہو کہ خالق کائنات کی عظمت و جلالت معلوم کرو تو اس کی مخلوق کی عظمت میں غور و فکر کرو۔ (اصول کافی)

انسانی جسم کے معجزات

ذیل میں ہم کائنات کی ایک عظیم اور ایک حقیر مخلوق کی خلقت پر کچھ تبصرہ کرتے ہیں۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ نگارخانۂ کائنات میں اشرف المخلوقات حضرتِ انسان ہے۔ انسانی بدن الٰہی صنعت و تخلیق کا ایک حیرت انگیز اعجاز ہے جسے دیکھ کر عقل سر بسجود ہو جاتی ہے ماہرین ارحام نے تکوینِ جنین کا ہر منزل اور ہر درجے پر تماشا دیکھنے کے بعد اس حقیقت سے نقاب اٹھایا ہے۔ کہ بدن انسانی کی ترکیب خلیوں سے ہوتی ہے۔ آغاز میں یہ خلیہ ایک ہوتا ہے۔ پھر دو۔ پھر چار اور پھر آٹھ میں متضاعف ہو کر بدن کی تشکیل کرتا ہے۔ بعض خلیے کان، بعض آنکھ، بعض ناک اور بعض دیگر اعضاء کی تشکیل پر لگ جاتے ہیں۔ یہ آج تک کبھی نہیں ہوا کہ چند خلیے سازش کر کے کان کی جگہ ناک اور ناک کی جگہ آنکھیں بنا ڈالیں یا پیچھے کوئی دم چپاں کر دیں۔ یہ اس لئے کہ ایک ہمہ بین آنکھ ان کی نگرانی کر رہی ہے۔ جس کی قہرمانیت کے سامنے تمام کائنات سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران ۸۳)

ارض و سما کی ہر چیز مشیت ایزدی کو بجا لانے پر مجبور و مجبول ہے۔

آج علم ترقی کرتے کرتے خیام قدس کے اسرار تک بے نقاب کرنے پر تل چکا ہے اور دوسری طرف تعلیم یافتوں میں ایک دو فی صدی آدمی بدستور ایسے موجود ہیں جو اللہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے جن کے نقطۂ خیال سے تکوین و تدوین کی یہ کارگاہِ جلیل کسی ناظم و آمر کے بغیر چل رہی ہے۔ اور تخلیق کے روح افروز خوارق خود بخود سرزد ہو رہے ہیں۔ ان کج فہمی کے مجسموں سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ اگر یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے اور کوئی نگران آنکھ پیچھے موجود نہیں تو پھر رحم مادر میں خلیوں نے تمہیں انسانی شکل کیوں دی۔ گدھا کیوں نہ بنا دیا؟ یا سر گدھے کا اور دم بندر کی کیوں نہ لگا دی؟

ایک اچھا خاصا پروں والا گدھا کیوں نہ بنا دیا؟ مینڈک اور کچھوے کی شکل کیوں نہ دے دی؟ انسانی پیٹ سے آج تک کوئی بکری پیدا نہ ہوئی؟ بکری کے پیٹ سے مرغی نے کیوں نہ جنم لیا۔ اور کبوتر کے انڈوں سے بٹیر کیوں نہ نکلا؟ ہے کوئی جواب ان منکرین خدا کے پاس؟ اگر ہے تو لاؤ، اور اگر نہیں تو آؤ ہمارے ہم نوا بن کر کہو۔

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ۔ (آل عمران)

وہ صرف اللہ ہی ہے جو اپنی مشیت قاہرہ کے مطابق ماؤں کے ارحام میں تمہاری صورتیں بناتا ہے۔

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ (اقبالؒ)

جسم انسانی کے مختلف مناظر

۱۔ چار طبائع ۔ حرارت ۔ برودت ، یبوست اور رطوبت۔

۲۔ چار ارکان جسم ۔ آگ ، ہوا ، مٹی ، پانی۔

۳۔ چار اخلاط :۔ صفرا ، خون ، بلغم ، سودا

(۴) نو طبقات :۔ سر ، منہ ، گردن ، سینہ ، پیٹھ ، کمر ، ران ، ساق ، پاؤں

۵۔ ستون :۔ ۲۴۸ ہڈیاں

(۶) رسیاں :۔ ۷۵۰ پٹھے

۷۔ خزانے۔ دماغ ، نخاع ، پھیپھڑے ، دل ، جگر ، تلی ، معدہ ، انتڑیاں ، گردے۔

۸۔ مسالک و شوارع :۔ ۳۶۰ عروق

۹۔ نہریں :۔ ۳۹۰ وریدیں

۱۰۔ دروازے :۔ آنکھیں ، کان ، ناک ، پستان ، منہ اور شرمگاہیں۔

انوکھا شہر

جسم انسانی کو ایک شہر سمجھئے جس میں مختلف اعمال ہو رہے ہیں۔ مثلاً

۱۔ باورچی :۔ معدہ ایک باورچی کی طرح غذا پکا رہا ہے۔

۲۔ عطّار :۔ کوئی عطّار غذا کا جوہر نکال کر جزو بدن بنا رہا ہے۔

۳۔ حکیم :۔ جگر ایک طبیب کی طرح غذا میں تیزاب ملا رہا ہے۔

۴۔ جاروب کش :۔ انتڑیاں ، جلد ، گردے اور پھیپھڑے غلاظت کو جسم سے باہر پھینک رہے ہیں۔

۵۔ شعبدہ باز :۔ کوئی صنّاع ، خون کو گوشت میں تبدیل کر رہا ہے۔

۶۔ بھٹہ :۔ ہڈیاں اینٹوں کی طرح پک کر مضبوط بن رہی ہیں۔

۷۔ جلاہا :۔ کوئی بافندہ اعصاب اور جھلیاں بُن رہا ہے۔

۸۔ درزی :۔ کوئی درزی زخموں کو سی رہا ہے۔

۹۔ کاشت کار :۔ کسی کاشت کار کی قلبہ رانی کی وجہ سے جسم کے کھیت میں گھاس کی طرح بال اُگ رہے ہیں۔

۱۰۔ رنگ ساز :۔ کوئی صبّاغ دانتوں کو سفید ، بالوں کو سیاہ اور خون کو سرخ بنا رہا ہے۔

۱۱۔ بت تراش :۔ کوئی بت تراش ماں کے پیٹ میں ایک خوب صورت بچہ تراش رہا ہے۔

ایک چھوٹی سی کائنات

۱۔ زمین ــــ جسم انسانی ــــ ۲۔ پہاڑ ــــ ہڈیاں ــــ ۳۔ معادن ــــ مخ
۴۔ ستارے ــــ عقل، قوتِ متفکرہ و متخیلہ وغیرہ۔

۵۔ سمندر	پیٹ	۱۰۔ ہوا	تنفّس	۱۵۔ حیات	بیداری یا علم
۶۔ نہریں	رگیں	۱۱۔ صبح کی روشنی	مسکراہٹ	۱۶۔ بہار	بچپن
۷۔ بدررَوئیں	انتڑیاں	۱۲۔ بارشں	رونا	۱۷۔ گرما	جوانی
۸۔ نباتات	بال	۱۳۔ ظلمت	غم	۱۸۔ برفباری	سفید بال
۹۔ میدان	ماتھا اور پیٹھ	۱۴۔ موت	نیند یا جہالت	۱۹۔ رعد و برق	غصّہ

انسان میں حیوانیّت

۱۔ شیر کی طرح	بہادر	۷۔ ہرن کی طرح	تیز خرام	۱۵۔ مرغی کی حالت	مفید
۲۔ خرگوش ″	بزدل	۸۔ کچھوے ″	سست رو	۱۶۔ چوہے ″	مضر
۳۔ کتے ″	ہوشیار	۹۔ اونٹ ″	مطیع	۱۷۔ گھوڑے ″	وفادار
۴۔ الّو کی ″	خود فراموش	۱۰۔ چیتے ″	سرکش	۱۸۔ سانپ ″	بے وفا
۵۔ لومڑی ″	پُرکار	۱۱۔ قطاۃ ″	رہبر	۱۹۔ مور ″	حسین
۶۔ بھیڑ ″	سادہ لوح	۱۲۔ شتر مرغ ″	گم راہ	۲۰۔ گدھ ″	بدوضع
		۱۳۔ بلبل ″	گویا	۲۱۔ ہُدہُد ″	مسعود
		۱۴۔ گدھے ″	بدآواز	۲۲۔ الّو ″	منحوس

چھوٹی سی کائنات

کسی بڑے کارخانے میں تشریف لے جائیے۔ انجن کسی ایک طرف کمرے میں ہوگا اور ہر طرف مختلف پرزے مختلف اعمال سرانجام دے رہے ہوں گے۔ کہیں تلواریں بن رہی ہوں گی۔ کہیں تیل نکالا جا رہا ہوگا۔ ایک طرف ٹین کے ڈبے تیار ہو رہے ہوں گے۔ اور دوسری طرف لوہا پگھل رہا ہوگا بس یہی حالت کائنات کی ہے۔ اس کارگاہِ عظیم کے مختلف اعمال پر ذرا نگاہ ڈالو۔ دریا بہہ رہے ہیں۔ ہوائیں چل رہی ہیں آفتاب روشنی کے طوفان اٹھا رہا ہے۔ درخت اُگ رہے ہیں، اور بادل برس رہے ہیں۔ گو اس کارگہِ حیات کا ہر منظر مختلف فرائض کی بجاآوری میں مصروف ہے۔ لیکن انجن صرف ایک ہی ہے یعنی اللہ جلّ جلالہ و عمّ نوالہ۔

ادھر جسم انسانی کو دیکھو بال اُگ رہے ہیں۔ آنسو بہ رہے ہیں۔ دل دھڑک رہا ہے۔ سانس چل رہی ہے۔ کان سُن رہے ہیں۔ آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور دماغ سوچ رہا ہے۔ اور اس کارخانے کے انجن کا نام روح ہے۔ روح جسم کے کس حصّے میں رہتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ہر بال اور ہر قطرۂ خون میں۔ لیکن اگر آپ چاقو سے کسی حصۂ جسم کو

کرید کر روح کو دیکھنا چاہیں تو آپ کو کامیابی نہیں ہوگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کائنات کے ہر ذرے میں جلوہ گر ہے لیکن روح کی طرح دکھائی نہیں دیتا۔ انسانی جسم حقیقۃً ایک چھوٹی سی کائنات ہے جس میں روح اسی طرح کام کر رہی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کائناتِ ارض و سما میں ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا (اقبال)

میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں (از دو قرآن)

انسان کی اسی عجیب و غریب خلقت کی بابت حضرت صادق علیہ السلام حدیث اہلیلج میں فرماتے ہیں والعجب من مخلوق یزعم ان اللہ یخفی علی عبادہ و ھو یری اثر الصنع فی نفسہ بتر کیب یبھت عقلہ و تالیف یبطل حجتہ یعنی ان لوگوں سے تعجب ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ خداوند عالم اپنے بندوں پر پوشیدہ ہے حالانکہ وہ اپنے اندر خداوند عالم کی مبہوت کرنے والی ترکیب اور ان کی حجت کو باطل کرنے والی ترتیب کی صورت میں اس کی قدرت کاملہ کے آثار دیکھ رہے ہیں۔ انسانی اعضاء و جوارح میں قدرتِ کاملہ نے کیا کیا صناع و بدائع عمل میں لائے ہیں؟ اور کیا کیا اسرار و رموز ان میں ودیعت فرمائے ہیں؟ ان کے سمجھنے کے لئے پورا علم تشریح الاعضا بھی کافی نہیں ہے۔ حضرت امام جعفر صادق نے رسالہ توحید مفضلؒ میں۔ مخاطب کے فہم و ادراک کے مطابق ان حقائق کے چہرہ سے کچھ نقاب اٹھایا ہے۔ رسالہ دو قرآن میں بھی اس پہ کافی بحث کی گئی ہے۔ اسی لئے ارشادِ قدرت ہے وفی انفسکم افلا تبصرون۔ خود تمہارے نفوس میں خالق کے وجود کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے؟ اسی لئے ترسید الموحدین جناب امیر المومنینؑ غافل انسان کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ ع

اتزعم انک جرم صغیر و فیک انطوی العالم الاکبر

کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر تو عالم کبیر سمویا ہوا ہے

و انت الکتاب المبین الذی باحرفہ یظھر المضمر

اور تو وہ واضح کتاب ہے کہ جس کے حروف سے مضمرات اور پوشیدہ راز ظاہر ہوتے ہیں۔

دائک منک و لا تشعر دوائک فیک و لا تبصر

تیرا مرض تجھ ہی سے ہے مگر تجھے شعور نہیں۔ اور تیرا دوا علاج بھی خود تجھ میں موجود ہے۔ مگر تو دیکھتا نہیں ہے۔ (دیوان منسوب حضرت علیؑ)

یہ تو تھا اشرف المخلوقات کا تذکرہ اب ذرا اخس المخلوقات کا ذکر بھی سن لیں۔ اس عالم میں سب سے زیادہ صغیر و حقیر مخلوق مچھر اور چیونٹی کو کہا جاتا ہے مگر صانع حکیم نے انہی کے خلقت میں اپنی عجیب قدرتِ کاملہ کا وہ ایمان افزا مظاہرہ فرمایا ہے۔ کہ عقل انسانی حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔ مچھر ہی کو لے لیجئے اس میں وہ سب اعضاء و جوارح

موجود ہیں جو ہاتھی میں موجود ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اس میں دو عضو ایسے پائے جاتے ہیں جو ہاتھی میں نہیں پائے جاتے (۱) دو پر (۲) اور دو زائد ٹانگیں۔ اسی طرح چیونٹی میں خالق حکیم نے جس کاریگری کا نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ بہت ہی تعجب خیز ہے۔ حضرت امیر المومنینؑ اپنے ایک خطبہ میں اسی چیونٹی کی خلقت اور اس میں جو آثار قدرت نمایاں ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ولو فكروا فى عظيم القدرة وجسيم النعمة لرجعوا الى الطريق وخافوا عذاب الحريق ولكن القلوب عليلة والابصار مدخولة الا ينظرون الى صغير ما خلق كيف احكم خلقه واتقن تركيبه وخلق له السمع والبصر وسوى له العظم والبشر انظروا الى النملة فى صغر جثتها ولطافة هيئتها لا تكاد تنال بلحظ البصر ولا بمستدرك الفكر كيف دبت على ارضها وصبت على رزقها تنقل الحبة الى جحرها وتعدها فى مستقرها تجمع فى حرها لبردها وفى وردها لصدرها مكفولة برزقها مرزوقة بوفقها لا يغفلها المنان ولا يحرمها الديان ولو فى الصفا اليابس والحجر الجامس ولو فكرت فى مجارى اكلها فى علوها وسفلها وما فى الجوف من شراسيف بطنها وما فى الراس من عينها واذنها لقضيت من خلقها عجبا ولقيت من وصفها تعبا فتعالى الذى اقامها على قوائمها وبناها على دعائمها لم يشركه فى فطرتها فاطر ولم يعنه فى خلقها قادر ... (الى ان قال) فالويل لمن جحد المقدر وانكر المدبر زعموا انهم كالنبات ما لهم زارع ولا لاختلاف صورهم صانع[۳]

"اگر یہ (منکرین ربوبیت) خدائے قادر و قیوم کی عظیم الشان قدرتوں اور جلیل القدر نعمتوں میں غور و فکر کرتے تو یقیناً راہ راست پر آجاتے اور آتش جہنم کے عذاب سے ڈرتے مگر افسوس کہ ان کے دل بیمار اور آنکھیں عیب دار ہیں کیا یہ لوگ خداوند عالم کی صغیر و حقیر مخلوق کو نہیں دیکھتے کہ اس صانع حکیم نے اس کی خلقت کو کس طرح محکم و متقن بنایا ہے اور اس کے لئے کس طرح کان، آنکھ، ہڈی اور چمڑا تیار کیا۔ یہ چیونٹی کو دیکھو کہ جو اس قدر صغیر الجثہ ہے کہ قریب ہے کہ آنکھوں سے دکھائی نہ دے اور حاشیہ فکر سے ورک نہ ہو۔ مگر باایں ہمہ کس طرح زمین پر چل رہی ہے اور اپنا رزق تلاش کر رہی ہے۔ دانے کو اپنی بل میں لے جا کر گرمیوں میں سردیوں کے لئے اور داخل ہوتے وقت نکلنے کے وقت تک کے لئے بطور خوراک جمع کر لیتی ہے۔ خداوند عالم نے اس کے رزق کی کفالت اپنے ذمہ لے لی ہے۔ لہٰذا خدائے منان اس کے مناسب حال اسے روزی پہنچاتا رہتا ہے اگرچہ وہ خشک پتھر ہی میں کیوں نہ ہو۔ اگر تم اس (چیونٹی) کے کھانے کے اوپر اور نیچے والے مقامات اور اس کے پیٹ کی پسلیوں اور اس کے سر میں جو آنکھ اور کان ہیں۔ ان میں غور و فکر کرو۔ تو تمہیں اس کی عجیب خلقت سے بڑا تعجب ہوگا۔ اور اس کی تعریف و توصیف میں تھکان محسوس کرو گے۔ کس قدر بڑی عظمت والا ہے وہ خدا جس نے تنہا اسے پیدا کیا ہے۔ کسی دوسرے نے اس کی تقدیر و خلقت میں اس کے ساتھ

شرکت یا اس کی اعانت نہیں کی ہے . . . افسوس ہے اس شخص پر جو ان آثار قدرت کی موجودگی میں اس مقتدر و مدبر کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ یہ بدبخت لوگ گمان کرتے ہیں۔ کہ یہ خودرو پودے کی طرح خود بخود پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اور ان کی مختلف صورتوں کا کوئی صانع نہیں ہے۔ ان کے پاس اپنے اس نظریہ فاسدہ پر کوئی دلیل و برہان نہیں ہے۔ بھلا کوئی مکان بغیر بانی کے اور کوئی جنایت بغیر جانی کے ہو سکتی ہے؟ (نہج البلاغہ) سبحان اللہ! کس قدر جامع اور مکمل استدلال ہے۔ سچ ہے "کلام الامام امام الکلام" امام عالی مقام کے اس کلام معجز نظام میں جن خواص و آثار کی طرف اشارات کئے گئے ہیں، اگر ہم ان کی تشریح و توضیح کرنا چاہیں تو اس کے لئے کئی صفحات درکار ہیں جس کے لئے اوراق کتاب متحمل نہیں اسی لئے اسی اجمالی بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس تحریر سے مقصد صرف آیات انفسیہ اور آیات آفاقیہ کی طرف ناظرین کرام کی توجہ مبذول کرانا تھا۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ ولقد نسویھم ایاتنا فی الافاق و فی انفسھم حتی یتبیّن لھم انہ الحق اولم یکف بربّک انہ علیٰ کلّ شیئ شھید (سورہ سجدہ پ۲۵) ہم ان لوگوں کو اپنی ذات کی آیات و علامات دکھلائیں گے۔ آفاق میں اور خود ان کے نفوس میں۔ تاکہ ان پر واضح ہو جائے۔ کہ خدا برحق ہے۔ کیا تمہارے پروردگار کے اثبات کے لئے یہ امر کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے؟ ان حقائق کی روشنی میں کوئی بھی صحیح الدماغ انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ کائنات بغیر کسی خالق حکیم کے محض بخت و اتفاق سے یا ایک بے عقل اور بے حس و حیات مادہ سے اتفاقاً صادر ہو گئی ہے؟ مالکم کیف تحکمون؟

وجہ سوم۔ اوپر وجہ دوئم میں بالتفصیل یہ امر محقق و مبرہن کر دیا گیا ہے کہ یہ کائنات جو عجیب و غریب صنائع و بدائع سے لبریز ہے۔ بے عقل و ادراک اور بے حس و حیات مادہ سے محض بطور بخت و اتفاق کے ہرگز ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہونا عقلاً ناممکن اور محال ہے۔ اس وجہ سوم میں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر بغرض محال چند لمحوں کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ ایسا ہونا ممکن ہے تب بھی اس عالم کا اتفاقاً پیدا ہونا بدستور ناممکن و محال رہتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنے مقام پر مسلم ہے کہ جو امر محض اتفاق کا نتیجہ ہو (بنا بر تسلیم اتفاق) اس میں استمرار و دوام نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی نے کنواں کھودنا شروع کیا تو اتفاقاً اسے ایک گراں بہا خزانہ مل گیا۔ یا ایک شخص نے کسی پرندہ کو تیر مارا۔ مگر پرندہ تو بچ گیا۔ اور وہ تیر اس شخص کے دشمن کو لگا اور وہ ہلاک ہو گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص جب بھی کنواں کھودنے کے لئے گڑھا کھودے تو اسے گنج ہی مل جائے یا جب ہی وہ شکار پر تیر چلائے تو شکار کے بجائے اس کا ایک دشمن ہی ہلاک ہو جائے۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ خلقت زمین و آسمان وغیرہ کو ہزاروں بلکہ لاکھوں سال گذر گئے مگر اس میں تاحال ہرگز کسی قسم کا کوئی خلل و اضطراب واقع نہیں ہوا۔ لیل و نہار اور شمس و قمر وغیرہ اشیاء بڑی حسن و خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر و لا اللیل سابق النھار و کل فی فلک یسبحون

(سورہ یٰس ۳۸) ثوابت اپنے مقام پر ثابت اور سیارے اپنے اپنے مرکز و محور کے ارد گرد گھوم رہے ہیں۔ والشمس تجری لمستقر لها ذلك تقدير العزيز العليم (یونس) تمام اجناس و انواع بدستور جاری و ساری ہیں۔ فلن تجد لسنة الله تبديلا ولن تجد لسنة الله تحويلا ما ترى فى خلق الرحمن من تفاوت فارجع البصر هل ترى من فطور ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاسئا وهو حسير (الملک ۳ ـ ۴)

لہٰذا عالم کا یہ انتظام و دوام اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ عالم ایک خالق علیم و صانع حکیم کی صنعت و کارگری کا نتیجہ ہے۔ اور وہی مدبر و منتظم اس کے دوام کا انتظام کر رہا ہے۔ (از ہدایہ اللہ)

ایک چشم بصیرت رکھنے والا انسان تخلیق و تکوین کے یہ معجزات دیکھ کر یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ضرور کوئی نگران ان کی نگرانی کر رہا ہے اور کوئی زبردست دماغ اس عالم میں مصروف عمل ہے۔ چنانچہ پروفیسر ولیم ہیکر لانڈ کہتا ہے: کیا کوئی شخص سنجیدگی سے خیال کر سکتا ہے کہ کائنات میں یہ نظم و ہدایت عناصر کی اتفاقیہ آمیزش سے پیدا ہو گئی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی نہر اپنے سے مرتفع سطح پر بہہ سکے۔ وما كنا عن الخلق غافلين وكاين من اية فى السموات والارض يمرون عليها وهم عنها معرضون۔ (سورۃ الزخرف) ہم اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہیں۔

شبہ را الجعہ

ان لوگوں نے جب دیکھا کہ مذکورہ بالا نظریات اختیار کرنے سے خدا پرستوں کے اعتراضات سے گلو خلاصی نہیں ہوتی۔ نہ بے حس و حرکت اور بے عقل و شعور مادہ سے یہ عقل و ادراک اور ذی حیات مخلوق پیدا ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی اتفاقیہ طور پر ایسا ہونا ممکن ہے۔ تو ان میں سے بعض جدت پسند اشخاص (مثل ڈارون وغیرہ) نے ان مفاسد و محاذیر سے بچنے کے لئے ایک اور راہ تلاش کی جو خلاف عقل و دانش اور بالکل مہمل و مزخرف ہونے میں سابقہ نظریات سے کمتر نہیں ہے۔ اور وہ نظریہ "نشو و ارتقاء" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں اس وقت جو مختلف انواع و اقسام کے حیوانات موجود ہیں۔ ابتداء میں اس طرح علیحدہ علیحدہ خلق نہیں ہوئے بلکہ اصل میں ایک ہی نہایت سادہ لوح اور معمولی احساس و شعور والی نوع تھی۔ پھر تنازع بقا اور انتخاب طبعی کے قانون سے اس نے رفتہ رفتہ تدریجی ترقی کی۔ اور منازل ترقی طے کرتے کرتے موجودہ حالت تک پہنچی۔ حضرت انسان ہی کو لیجیے۔ یہ اصل میں بندر تھا۔ اس سے ترقی کرتے کرتے موجودہ انسانی شکل تک پہنچا۔ لہٰذا انسان بندر کی ہی ایک ترقی یافتہ فرد ہے۔ اور بندر بھی پہلے کسی اور پست درجہ کی نوع سے تعلق رکھتا تھا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

خلاصہ یہ کہ ابتدائے خلقت میں انسان موجودہ شکل و صورت پر پیدا نہیں ہوا۔ تاکہ یہ اعتراض وارد ہو کہ ایک بے عقل و ادراک اندھا اور بہرا مادہ ایسے باعقل و ہوش اور صاحب علم و عرفان حضرت انسان کو کیونکر پیدا کر سکتا ہے۔

جواب۔ یہ شبہ بھی شبہاتِ سابقہ کی طرح بچند وجہ مردود ہے اور اصولِ عقل و فطرت کے خلاف ہونے کی وجہ سے سراسر ظنون و اوہام کی اختراع ہے۔ وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔

وجہ اوّل۔ یہ نظریہ ان (دہریہ) حضرات کے اپنے مسلّم اصول کے مخالف ہے کیونکہ ان کا اصول ہے کہ جب تک کوئی چیز آنکھوں سے دکھائی نہ دے اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا اور وہ اپنے اسی اصول غیر معقول کی بنا پر صانع عالم کی ہستی کا انکار کرتے ہیں۔ اب یہاں ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ آیا تمہارا یہ نظریہ کسی چشم دید مشاہدہ پر مبنی ہے؟ کیا تم نے کبھی بچشم خود کسی بندر کو انسان بنتے دیکھا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ثبوت پیش کرو۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین ۝ اور اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہوگا تو پھر جس امر کو تم نے دیکھا نہیں اس کے قائل کیونکر ہوئے ہو؟ اگر ایمان بالغیب ہی لانا ہے تو مسلمانوں کے نظریہ صحیحہ کو تسلیم کر لو۔ کہ خالق قادر نے ابتداء ہی میں تمام انواع کو اسی موجودہ شکل و صورت پر علیحدہ علیحدہ خلق فرمایا ہے۔

وجہ دوئم۔ شریعت اسلامیہ کے ناقابلِ تاویل نصوص قطعیہ موجود ہیں کہ خداوند عالم نے زمین کے موالید ثلاثہ (جمادات نباتات اور حیوانات) کو موجودہ شکل میں علیحدہ علیحدہ خلق فرمایا ہے مگر ان لوگوں کے پاس اپنے اس نظریہ ارتقاء کی صحت پر ہرگز کوئی قطعی دلیل نہیں ہے انہوں نے اس سلسلہ میں جس قدر دلائل یا بالفاظ دیگر شبہات پیش کئے ہیں۔ وہ ظنون و اوہام اور تخمینِ خام سے متجاوز نہیں ہیں۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔

نظریۂ ارتقاء کی پہلی دلیل

مثلاً ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ کچھ اعضاء کے نشانات بعض حیوانات میں مشاہدہ کئے جاتے ہیں اور وہ ایسے اعضاء کے آثار تھے جو حیوانات میں پائے جاتے ہیں۔ جیسے پیروں کے غیر مکمل نشانات جن کے پیشِ نظر یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہر نوع کی بطور استقلال تخلیق نہیں ہوئی (کیونکہ اس نظریہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نوع کے لئے جتنے اعضاء درکار ہیں۔ اس میں اتنے ہی اعضاء موجود ہوں۔ کچھ کمی و بیشی نہ ہو مگر بعض حیوانات میں زائد اعضاء کے آثار بتلاتے ہیں کہ یہ سابقہ نوع کے تھے اور اس کے لئے ضروری تھے مگر جب نوع تبدیل ہوئی تو نیست و نابود ہونے لگے۔ فقط ان کے آثار و نشانات باقی رہ گئے۔ یا یہ سابقہ نوع ان اعضاء سے خالی تھی۔ اور پھر اس میں دوسری نوع کے آثار شروع ہو گئے تاکہ اسے اس قابل بنا دیں کہ وہ یہ دوسری نوع بن سکے اس کی تائید میں یہ لوگ قدیم ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے بھی پیش کرتے ہیں جس کے پیشِ نظر یہ کہتے ہیں کہ انسان اصل میں انسان نہیں تھا بلکہ پہلے بندر تھا (معاذ اللہ)

مگر ان کی یہ نام نہاد دلیل جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے ظن و تخمین سے زائد کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور اس سے سوائے ظن کے اور ہرگز کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اعتقادیات میں ظن حجت نہیں ہے۔

اس سے یقین اُس وقت حاصل ہوتا جب کہ سوائے اس نتیجہ کے جو انہوں نے اخذ کیا ہے۔ اور کوئی احتمال

قائم نہ ہوتا۔ مگر جب اور بھی احتمالات موجود ہیں تو پھر یہ دلیل مفید یقین نہیں ہو سکتی کیونکہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

اس دلیل کا پہلا جواب

کوئی کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے۔ ان زائد اعضاء میں کچھ ایسے فوائد و مصالح مضمر ہوں جو تم پر مخفی و مستور ہیں جیسا کہ نباتات و حیوانات میں کثرت چیزوں کے فوائد و حکم تم پر مخفی و مستور ہیں۔ جیسا کہ علم فزیالوجی کی کتب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ پس جب تمہارا علم ناقص ہے اور کائنات کی ہر شے کے فوائد و خواص پر حاوی نہیں تو پھر تم کس طرح یہ بات بطور یقین کے کہہ سکتے ہو کہ ان زائد اعضاء میں سوائے تبدیلی نوع کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے کیا عدم علم دلیل عدم بن سکتا ہے؟

دوسرا جواب۔ یہ استقراء ناقص اور غیر تام ہے۔ بعض انواع میں یہ تغیر دیکھ کر تمام انواع کے متعلق یہ حکم لگانا غیر یقینی ہے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ ظن و گمان ہی پیدا ہوتا ہے جو کہ مفید مطلب نہیں ہے۔

تیسرا جواب۔ اگر اس تدریجی ارتقاء کی کوئی اصلیت اور حقیقت ہوتی تو لازم تھا کہ اس ارتقاء کے کچھ آثار ہر ہر زمانہ میں واضح اور آشکار ہوتے۔ اور ایک معتد بہ زمانہ گذرنے کے بعد انواع میں اس ترقی کا کچھ ایسا نتیجہ ظاہر ہوتا جو مشاہد و محسوس ہوتا۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ تقریباً ایک لاکھ سال کے بعد نوع میں مکمل تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے۔ تو جس زمانہ کے اجمالی حالات تاریخ سے معلوم ہوتے ہیں اس کی مدت کم و بیش چھ سات ہزار سال ضرور ہے تو اس طویل عرصہ میں ضروری تھا کہ اس تدریجی ترقی کے کچھ نہ کچھ آثار واضح و آشکار ہوتے۔ کوئی سافل نوع عالی نوع میں داخل ہوتی۔ خود نوع انسانی ہی کے کسی اور نوع (مثلاً فرشتہ) میں داخل ہونے کے کچھ علامات ظاہر ہوتے۔ موجودہ بندروں ہی میں انسان بننے کے کچھ علائم رونما ہوتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نتیجہ صفر ہے۔ آج بھی ہر نوع اُسی طرح موجود ہے۔ جس طرح آج سے ہزارہا برس پہلے موجود تھی وہی اعضاء و جوارح۔ وہی عادات و خصائل وہی شکل و شمائل کسی نوع کا ترقی کر کے دوسری نوع میں داخل ہونا ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا ڈارون صاحب کا یہ نظریہ محض وہم پرستی ہے۔ حقیقت سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنا ہ ہباءً منثورا۔

اس نظریہ کی دوسری دلیل اور اس کا جواب

اس نظریہ کے قائلین یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں۔ کہ چونکہ بندر و انسان میں بعض چیزوں میں باہمی مشابہت پائی جاتی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی اصل بندر ہے۔ ان کی یہ دلیل بھی بچند وجہ علیل ہے اور درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

اولاً۔ اس لئے کہ یہ محض ایک ظنی مفروضہ ہے۔ اگر اس باہمی مشابہت ہی کی بناء پر بندر کو اصل اور انسان کو اس کی فرع بنانا جائز ہے۔ تو پھر اگر کوئی یوں کہہ دے کہ انسان اصل اور بندر اس کی فرع ہے تو اس کا ڈارون کے

پاس کیا جواب ہے ؟

ثانیاً۔ اس لئے کہ خالق حکیم نے تخلیق و تکوین کا نظام کچھ اس طرح قائم کیا ہے کہ ہر جنس کے ماتحت جو انواع موجود ہیں۔ ان میں کچھ نہ کچھ باہمی مشابہت ضرور پائی جاتی ہے تو اگر باوجود لوازم و آثار کے اختلاف اور فوائد و خواص کے افتراق کے محض اس معمولی سی باہمی مشابہت کی وجہ سے بعض انواع کو اصل اور بعض کو فرع قرار دینا صحیح ہو تو اس اصول کے تحت یہ بھی جائز ہوگا کہ کوئی شخص یہ کہہ دے کہ سرو کا درخت کھجور کے درخت سے بنا ہے۔ یا کھجور کا درخت سرو کے درخت سے بنا ہے۔ یا زیتون انگور سے یا انگور زیتون سے پیدا ہوا ہے۔ گائے بھینس سے یا بھینس گائے سے وعلیٰ ہذا القیاس۔ آیا کوئی عقلمند اس دعا ندلی کو روا رکھ سکتا ہے؟ کیا عقل سلیم و فطرت صحیحہ اس بے راہروی کو اختیار کرنے کی اجازت دیتی ہے؟۔

ثالثاً۔ اس لئے کہ اگر یہ بات درست ہوتی۔ کہ انسان بندر سے ترقی کرکے انسانیت کے درجہ پر پہنچا ہے اور یہ بندر کی ہی فرد کامل ہے تو لازم تھا کہ انسان کسی مرحلہ پر بھی کسی صفت میں بندر سے پیچھے نہ رہتا۔ بلکہ ہر ہر مرحلہ پر اس سے آگے بڑھا ہوا ہوتا حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جب ایک عام انسان ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے وہ عقل و جسم کے اعتبار سے اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ نہ وہ چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے یا معمولی حرکت کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اُسے اچھی اور بُری اور مفید و مضر چیز میں تمیز ہوتی ہے نہ نافع کا اکتساب اور مضر سے اجتناب کرنے کی لیاقت رکھتا ہے حتیٰ کہ اسے یہ بھی شعور نہیں ہوتا کہ ماں کی چھاتی کس طرح منہ میں لینی ہے۔ کافی جدوجہد کے بعد اسے دودھ پینے کا طریقہ آتا ہے۔ مگر اس ساری کمزوری اور نادانی کے باوجود جب وہ ترقی کرنے پر آتا ہے۔ تو ایک محقق و مدقق عالم و فیلسوف بن جاتا ہے اور تمام اشیاء عالم کو اپنی خداداد عقل و تدبیر سے مسخر کر لیتا ہے اور نظام شمسی و قمری پر اپنی ہمت کی کمندیں ڈالنے لگتا ہے۔ مگر بندر کی یہ کیفیت ہے کہ وہ پیدا ہوتے ہی اکثر حیوانات کی طرح کافی حرکت کرنے پر قادر ہوتا ہے اور اپنی پرورش میں ماں کے ساتھ معاون و مددگار رہتا ہے۔ مناسب غذا کھا لیتا ہے۔ مفید و مضر کی پہچان رکھتا ہے غرضکہ اس میں اسی وقت وہ سوجھ بوجھ ہوتی ہے جس کا عشر عشیر بھی — انسانی نومولود بچے میں نہیں ہوتا اس اختلاف و افتراق سے یہ امر پایۂ یقین کو پہنچ جاتا ہے کہ انسان ہرگز بندر سے ترقی کرکے پیدا نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو ابتداء پیدائش میں کسی طرح بھی وہ بندر سے کمتر نہ ہوتا۔ حالانکہ وہ بالمشاہدہ مذکورہ بالا امور میں اس سے پست تر اور کمتر ہے مگر اس کے باوجود جب بڑا ہو کر انسان عقل و جسم میں بندر پر بدرجہا فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے بندر و انسان کے ایک ہی اصل سے ہونے والا نظریہ بالکل تار عنکبوت کی طرح کمزور بلکہ باطل ہو جاتا ہے۔ وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت پس اس باہمی تفاوت و اختلاف کی موجودگی میں یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ بندر اور انسان کی اصل ایک ہے اور یہ کہ بندر ہی ترقی کرکے انسانی منزل تک پہنچا ہے۔ وما لھم بذالک من علم ان ھم الا یظنون (سورہ جاثیہ پ۲۵)

یہی حقائق تھے کہ جنہوں نے بڑے بڑے علمائے یورپ کو ڈارون کی اس تھیوری کی مخالفت و رد کرنے پر مجبور کیا۔ تندل کہتا ہے " یہ نظریہ بالکل غلط ہے " اور فرخو ربلین کہتا ہے " نظریہ ارتقاء کسی ٹھوس علمی قاعدہ پر مبنی نہیں ہے " ڈاکٹر دوستوں کہتا ہے " ہم اوزۂ صحیحہ کی بنا پر کہتے ہیں کہ انسان کبھی بندر نہ تھا بلکہ ابتدائے آفرینش ہی میں انسان تھا۔ کامل فلاریون نے بھی ایسا ہی افادہ فرمایا ہے۔ (بحوالہ سائنس اور اسلام)

شبہ خامسہ۔ یہ لوگ خالق کائنات کی ذات والاصفات کا انکار کرکے عجیب ذہنی کش مکش اور عقلی تذبذب و اضطراب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ گرگٹ کی طرح تلون مزاجی اور تبدل طبعی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی شبہ پیش کرتے ہیں اور کبھی کوئی۔ کبھی کوئی عذر تراش کرتے ہیں۔ اور کبھی کوئی۔ گویا ان کا ہر شخص زبان حال سے پکار رہا ہے ؎

کبھی جھکتا ہوں مینا پر کبھی گرتا ہوں ساغر پر ۔۔۔ مری بے ہوشیوں سے ہوش ساقی کے بکھرتے ہیں

بہر حال اپنے انکار پر جب سابقہ عذر ہائے لنگ سے کام نہیں بنتا تو ایک اور عذر بارد پیش کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی جسم میں بعض اجزاء جیسے مرد کے پستان یا حشفہ کا چمڑا وغیرہ بے فائدہ ہیں۔ اسی طرح بعض ایسے موجودات بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ ان کی خلقت میں کوئی مصلحت نہیں بلکہ ان کا وجود سراسر شر و فساد ہے۔ جیسے عقرب و سانپ وغیرہ زہریلی اشیاء۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق کائنات کوئی علیم و حکیم اور قادر و قیوم ذات نہیں ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ یہ سب مادہ کے تخلیقی آثار ہیں۔

یہ شبہ بھی بچند وجہ درجۂ اعتبار سے ساقط و باطل اور ناقابلِ استناد ہے۔

وجہ اول۔ اس مقام پر صاحب رسالہ حمیدیہ نے صانع عالم کی ہستی کا اقرار و انکار کرنے والوں کی مثال ان دو شخصوں کے ساتھ دی ہے۔ (یہ مثال دراصل امام جعفر صادقؑ کے املا کردہ رسالہ توحید مفضل سے ماخوذ ہے) جو کسی نہایت عالی شان رفیع البنیان کوٹھی میں داخل ہوں جس میں متعدد محکم و مضبوط کمرے اور نشستگاہیں موجود ہوں۔ در دروازوں جنگلوں سے آراستہ ہو برآمدے بہت عمدہ ہوں۔ ان کمروں میں اعلیٰ درجہ کے فرش فروش بچھے ہوں۔ بڑے بڑے پلنگ، عمدہ کرسیاں، میز اور بیش قیمت ظروف نہایت سلیقہ و قرینہ سے اپنی اپنی جگہ موجود ہوں۔ اس کے چاروں طرف نہایت خوب صورت سیرگاہیں نظر آرہی ہوں۔ اس کے ارد گرد ایسی چمن بندی کی گئی ہو کہ بیل بوٹے قطار اندر قطار ایستادہ ہوں قسم قسم کے پھولوں کی کیاریاں مناسب جگہ پر بنی ہوئی ہوں۔ پانی کے چھوٹے چھوٹے چشمے بہہ رہے ہوں اور فوارے جاری و ساری ہوں، نیز پانی کے حوض لبالب پر ہوں۔ غرض کہ آرائش و زیبائش اور عیش و آرام کے تمام سامان مہیا ہوں جو شخص بھی اسے دیکھے اس کے معمار و صناع کی کاریگری پر عش عش کر اٹھے۔ اور اس کی حکمت و تدبیر کی تعریف و توصیف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ بہر کیف یہ دونوں شخص اس کوٹھی میں داخل ہوں۔ اور اس کی ہر ہر چیز کو بنظر غائر دیکھتے اور معمار کی عجیب صنعت و حرفت کی داد دیتے ہوئے ایک ایسی جگہ پر پہنچ جائیں کہ ایک ایسا روشندان دیکھیں۔ یا

اس میں کوئی لکڑی پڑی ہوئی دیکھیں یا کوئی خلا دیکھیں جس کی مصلحت ان کی سمجھ میں نہ آسکے۔ اس وقت ان میں سے ایک شخص تو یہ کہے کہ اس کوٹھی کا بنانے والا اگرچہ ہماری نظروں سے غائب ہے لیکن اس بات میں تو ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہے کہ وہ ہے ضرور اور اس کوٹھی کی تعمیر میں اس نے جس کاریگری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں علم و قدرت اور تدبیر و حکمت بدرجۂ اتم و اکمل موجود ہے ہاں البتہ اس کوٹھی میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی حکمت و مصلحت ہماری سمجھ میں نہیں آرہی۔ مگر چونکہ اکثر چیزوں کی حکمت واضح و آشکار ہے جو اس کے معمار کے حکیم و مدبر ہونے کی بیّن دلیل ہے۔ اس لئے ان بعض چیزوں میں بھی ضرور کوئی مصلحت اور حکمت ہوگی جو اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آرہی مگر دوسرا شخص یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد یہ کہے کہ اس کوٹھی کو کسی علیم و حکیم اور مہندس معمار نے نہیں بنایا۔ ایک تو اس لئے کہ میں نے اسے بچشم خود دیکھا نہیں اور دوسرے اس لئے کہ اگر وہ حکیم ہوتا تو یہاں بعض چیزیں بلا فائدہ نہ ہوتیں اور پھر کچھ سوچ کر وہاں موجودہ پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ مدت ہائے دراز میں ہوائیں چلتی رہیں۔ اور اس پہاڑ کی طرف سے مٹی اور پتھر حرکت کرکے آتے رہے۔ اور چشمہ و بارش کے پانی کی آمیزش سے گارا بن گیا۔ اور ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد تدریجی طور پر یہ محل خود بخود اس مواد سے تیار ہوگیا۔ اسی طرح عرصۂ دراز تک ہوائیں چلتی رہیں کہ یہ سامان ادھر ادھر سے اڑ کر یہاں جمع ہو کر کمروں میں خود بخود آراستہ ہو گیا۔

اب فیصلہ اربابِ عقل و دانش پر ہے کہ وہ اس شخص کے بارہ میں کیا حکم دیتے ہیں کہ جو اس تعمیر کو ایک مدبّر و حکیم اور ذی عقل و حیات ذات کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس شخص کی نسبت کیا فیصلہ صادر کرتے ہیں جو اس تعمیر کو ایک ترابی مادہ اور اس کی حرکت کی طرف نسبت دیتا ہے؟ اور ان میں سے کس کا نظریہ قرینِ عقل و دانش ہے؟

تلك الامثال نضربها للناس وما يعقلها الا العالمون (سورۃ عنکبوت پ ۲۰)

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ دہریہ تو اس عجائب و غرائب سے لبریز عالم کو ایک بے عقل و شعور مادہ کی طرف منسوب کریں اور اپنی حکمت و دانائی کے مدعی ہوں اور جو اس عالم کے عجیب و غریب نظام اور اس کے انصرام و استحکام کو خدائے حکیم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ ان کو جاہل و نادان قرار دیتے ہیں۔ خلافِ عقل و فطرت بات کا بلا دلیل و برہان ماننا اور منوانا اور مطابق عقل و فطرت امر کا انکار کرنا اور اس کے قائلین کا مذاق اڑانا سراسر اندھیر اور سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر ع

جو چاہے ان کا حسن کرشمہ ساز کرے

اگرچہ اس شبہ کے ازالہ میں یہی بے نظیر مثال والی تقریر دلپذیر کافی و وافی ہے مگر ہم مزید اطمینان قلب کے لئے ذیل میں بعض اور وجوہ بھی بیان کرتے ہیں۔

وجہ دوئم۔ یہ ایک مسلّمہ قانون ہے کہ کسی چیز کے معلوم نہ ہوسکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واقع

ہیں موجود ہی نہیں ہے ۔ بنا بریں ہم اس عالم کی اکثر و بیشتر اشیا کے حکم و مصالح سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں ، اور ان میں جو محیر العقول فوائد و مصالح موجود ہیں ۔ ان کے چہرہ سے نقاب کشائی کر چکے ہیں تو عقل سلیم یہی کہتی ہے کہ جس صانع حکیم کے اکثر آثار صنعت میں بے شمار اسرار و رموز موجود ہیں ۔ ضرور ان بعض اشیاء میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہو گی جس تک تا حال ہماری رسائی نہیں ہوئی ۔ لہٰذا اس کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے کی جد و جہد کرنا چاہیے ۔ اگرچہ انسانی علم بہت ہی ناقص ہے ۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ۔ اس لئے یہ تو ممکن نہیں ہے ۔

کہ وہ تمام اسرار قدرت کو بے نقاب کر سکے مگر وہ مسلسل تگ و تاز سے اپنے معلومات کے ذریعہ بہت سے مجہولات کو حاصل کر سکتا ہے ۔ آج کل کے انکشافات جدیدہ اور آلات مفیدہ انسان کے اسی جذبہ تحقیق و جستجو کے ناقابل انکار آثار و شاہکار ہیں ۔ بایں ہمہ کسی چیز کی حکمت و مصلحت کو نہ سمجھ سکنے کو اپنی کم علمی پر محمول کرنا چاہیے نہ اس امر پر کہ اس چیز میں کوئی مصلحت ہی نہیں ۔ ایسا کرنا دانشمندی نہیں بلکہ سراسر حماقت ہے ۔ یہ بات اس وقت درست ہوتی جب کہ ہم کائنات کی تمام چیزوں کی کنہ حقیقت معلوم کر چکے ہوتے ۔ اور اس کے باوجود بعض اشیاء کی کوئی مصلحت نظر نہ آتی مگر جب یہ حقیقت مسلّم ہے کہ علوم و فنون کی موجودہ ترقی کے دور میں بھی ہمارے مجہولات کی تعداد معلومات سے کہیں زیادہ ہے تو پھر یہ نظریہ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ جس چیز کی مصلحت ہم معلوم نہیں کر سکے ۔ اس میں کوئی مصلحت ہی نہیں ہے ۔ خداوند عالم نے ایک گروہ کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے ۔ وکذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ۔ کہ وہ جس چیز کا احاطہ علمی نہ رکھتے ہوں اسے جھٹلا دیتے ہیں ۔ دو چار مجہول چیزوں کو دیکھ کر بکثرت معلوم چیزوں سے بھی دست بردار ہو جانا خردمندوں کا کام نہیں ہے ۔

وجہ سوئم ۔ ہم انسانی علمی و عملی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ایسا نہیں ہے کہ ہمیں اعتراض میں نامبردہ اشیاء کی مصلحت کا بالکل کچھ علم نہیں ہے ۔ بلکہ بفضلہٖ تعالیٰ ان کے بعض فوائد و عوائد معلوم ہو چکے ہیں ۔ اور روز بروز جوں جوں سائنس اور دیگر علوم جدیدہ ترقی کرتے جاتے ہیں تو اس سے جہاں دیگر ارباب مذاہب اپنے مذاہب کی بقاء و سالمیت کو خطرہ میں محسوس کر کے خائف و ہراساں نظر آتے ہیں ۔ وہاں مسلمان اسلام کی صداقت و حقانیت کو اور اجاگر و روشن ہوتے ہوئے دیکھ کر خوش و خرم ہو رہے ہیں ۔ آج یہی علوم ہماری دینی ترقی کا زینہ بن رہے ہیں اور اصول و احکام اسلام کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم وہبیہ اور صحیح تحقیقات جدیدہ کے درمیان ہرگز کسی قسم کا کوئی اختلاف اور تصادم نہیں ہے ۔ مثلاً ہم یہاں ایسے چند احکام کا تذکرہ کرتے ہیں جن کی فلاسفی علوم جدیدہ کی بدولت معلوم ہوتی ہے ۔

(۱) شارع مقدس نے فرمایا تھا ۔ فر من المجذوم فرارک من الاسد ۔ کوڑھ والے مریض سے اس طرح دور بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو ۔ آج کی ڈاکٹری تحقیق میں ثابت ہو چکا ہے کہ جذام کے جراثیم شکل و

صورت میں ہو بہو شیر کی مانند ہوتے ہیں۔ آج دنیا والوں کو اس تشبیہ بلیغ کی حقیقت معلوم ہوئی ہے۔

(۲) شارع اسلام نے فرمایا ہے کہ روٹی کھانے کے بعد اگر انگلیوں پر کچھ غذا لگی ہوئی ہو تو انگلیاں چاٹ لو۔ جب تک موجودہ تحقیقات بروئے کار نہیں آئی تھی متجددین کا طبقہ اس حکم یا اس جیسے دوسرے احکام کا مذاق اڑاتا تھا مگر آج کی طبی و سائنسی تحقیقات سے یہ امر پایہ تحقیق تک پہنچ چکا ہے کہ انسانی انگلیوں پر کچھ ایسا قدرتی مواد موجود ہے جو غذا کے ہضم و تحلیل میں بہت ممد و معاون ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ آج حضرت شارع علیہ السلام کے اس حکم کی مصلحت کو معلوم کرکے حیران ہوتے ہیں۔

(۳) ابھی کل تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ آفتاب اپنے مرکز پر ساکن ہے اور سیارے اس کے ارد گرد چکر لگاتے ہیں مگر قرآن نے آج سے قریباً چودہ سو سال پیشتر یہ اعلان کیا تھا کہ والشمس تجری لمستقر لها ذلك تقدير العزيز العليم۔ آفتاب اپنے محور و مستقر پر جاری ہے یہ خدائے غالب و دانا کی تقدیر ہے۔ موجودہ تحقیقات سے قبل بے دین لوگ شریعت مقدسہ کے اس اعلان کا تمسخر اڑاتے تھے اور دیندار حضرات اس کی مناسب تاویل کرنے پر مجبور تھے۔ مگر موجودہ تحقیقات جدیدہ نے ثابت کر دیا ہے کہ آفتاب متحرک ہے نہ ساکن۔

(۴) حشفہ والا چمڑا بظاہر بے فائدہ سمجھا جاتا ہے مگر اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں اس کی موجودگی اور بعد میں اس کا قطع کر دینا بھی فوائد سے خالی نہیں ہے چونکہ یہ مقام بڑا نرم و نازک ہوتا ہے اور بچہ ابتداء میں اس کی کماحقہ نگہداشت سے غافل ہوتا ہے لہٰذا خطرہ تھا کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس لئے صانع حکیم نے اس پر غلاف چڑھا دیا۔ تاکہ سر حشفہ کی حفاظت ہوتی رہے مگر بلوغ سے قبل ختنہ کو لازم قرار دے دیا۔ اور اس میں جو فوائد ہیں ان کا آج منصف مزاج غیر مسلمان ڈاکٹر بھی اقرار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر کوبراج ہرنام داس اپنے رسالہ ہدایت نامہ خاوند صفحہ ۲۱ پر رقمطراز ہے: "تمام مسلمان اصحاب بچپن کی حالت میں ہی اپنے لڑکوں کے اس پردہ کو کٹوا دیتے ہیں، اس فعل کو ختنہ کہتے ہیں۔ طبی نکتہ نگاہ سے مجھے مسلمانوں کی یہ رسم بہت ہی پسند ہے۔"

اسی طرح عقرب و سانپ وغیرہ زہریلے جانور جو پہلے عبث و بے فائدہ سمجھے جاتے تھے۔ آج کل کی تحقیقات مظہر ہیں کہ اس فضا کے اندر کچھ ایسے زہریلے مواد موجود ہیں کہ اگر یہ زہریلے حشرات و حیوانات انہیں جذب نہ کریں تو انسانوں کی ہلاکت واقع ہو جائے۔ علاوہ بریں یہی اشیاء بعض امراض مزمنہ کے علاج میں بطور دوا بھی استعمال ہوتی ہیں۔ اور بھی ان کے وجود سے بہت سے فوائد ہیں جو عند التامل معلوم ہو سکتے ہیں۔ ابھی تک ہمارے علوم ناقص اور تحقیقات تشنۂ تکمیل ہیں۔ روز بروز نئی تحقیقات و تجربات سے کئی اسرار کائنات فاش ہو رہے ہیں جو آج سے قبل پردۂ خفا میں تھے۔ ڈاکٹر کوبراج ہرنام داس اپنے رسالہ ہدایت نامہ صحت صفحہ ۵۹ پر لکھتا ہے: "اپنڈسائٹس کا فائدہ آج تک کوئی معلوم نہ ہو سکا تاہم خدا کا کوئی کام حکمت کے سوا نہیں ہے۔ امید ہے تجربوں

سے جلدی پتہ لگ جائے گا۔"

وجہ چہارم۔ شبلی نے ابن رشد سے اس شبہ کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ دنیا میں جو برائی پائی جاتی ہے وہ بالذات نہیں بلکہ کسی نہ کسی بھلائی کے تابع ہے۔ مثلاً غصہ بری چیز ہے۔ لیکن اس حاسہ کا نتیجہ ہے جس کی بدولت انسان حفاظت خود اختیاری کرتا ہے۔ اگر یہ حاسہ نہ ہو تو انسان ایک قاتل کے مقابلہ میں اپنی جان بچانے کی بھی کوشش نہ کرے فسق و فجور بری چیز ہیں مگر یہ اسی قوت سے متعلق ہیں جس پر نسل انسانی کی بقا منحصر ہے۔ آگ گھروں کو جلا دیتی ہے۔ شہر کے شہر اس سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر آگ نہ ہو۔ انسان کا زندگی بسر کرنا محال ہو جائے۔ ان اچھی چیزوں سے اس تاریک پہلو کی جدائی بظاہر ناممکن ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسی آگ پیدا کی جائے جس سے کھانا تو پکایا جا سکے مگر مسجد میں جلانا چاہیں تو نہ جل سکے۔

خلاصہ کلام یہ کہ موجوداتِ عالم میں جو کچھ موجود ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہے یا وہ خیر محض ہیں یا ان میں خیر کا پہلو غالب ہے۔ ایسی کوئی چیز موجود نہیں جو سراسر شر ہو یا اس میں خیر و شر کا پلہ برابر ہو یا شر کا پلہ بھاری ہو۔ آزمائے جس کا جی چاہے۔ ولا ینبئك مثل خبیر۔ والوجود خیر من العدم۔ بہرحال نظام عالم میں بزعم خویش جو برائیاں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ان کے متعلق کون شخص یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعی نقائص ہیں جب کہ نظام عالم کا پورا سلسلہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اتنی سی بات پر خداوند عالم کے کمال اور عزت و جلال کا کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ ہمارے علم کی آخری سند ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ مگر افسوس۔ ما قدروا اللہ حق قدرہ۔ لوگوں نے خداوند عالم کی قدر ہی نہیں کی ورنہ یہ جرأت نہ کرتے۔ مگر ع

کرم ہائے تو مارا گستاخ کرد

سابقہ ابحاث کا خلاصہ

مذکورہ بالا بیانات شافیہ اور ابحاثِ کافیہ سے یہ امر کالشمس فی نصف النہار واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ خالقِ کائنات کے وجود کا اقرار بالکل بدیہی و فطری ہے، اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بلند و بالا ہے۔ اسی بنا پر حکیم فرفوریوس نے کہا ہے کہ جو امور بداہتِ عقل سے ثابت ہیں۔ من جملہ ان کے ایک مسئلہ ثبوت صانع عالم بھی ہے۔" اور حکیم ابن مسکویہ کہتے ہیں حکما میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں ہے کہ اس نے وجود صانع کا انکار کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ حکما تو بجائے خود آج تک عقلا میں سے کسی عقلمند آدمی نے بھی ہستئ صانع کا انکار نہیں کیا۔ اگر کسی شخص نے صانع کا انکار یا اس کی ہستی میں تردد و تذبذب کا اظہار کیا ہے تو عقلائے روزگار نے اسے زمرۂ عقلائے کامگار سے شمار نہیں کیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسا شخص صاحبِ عقل کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ عقل کی تعریف (بالاثر) جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے یہ ہے۔ العقل ما عبد بہ الرحمٰن واکتسب بہ الجنان (اصول کافی) عقل وہ ہے جس

سے خداوند عالم کی عبادت کی جائے اور جنت حاصل کی جائے۔ ۴

ومن کان ذا عقل اجل بعقلہٖ ۔ وافضل عقل عقل من یتدیّن

لہٰذا بنا بریں جو شخص خدائے رحمٰن کی عبادت اور جنت کا حاصل کرنا تو درکنار خود معرفتِ پروردگار سے بھی تہی دامن ہے وہ کسی طرح بھی عقل مند کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔ ایسے شخص میں جو چیز موجود ہے جسے عام لوگ عقل کہتے ہیں وہ درحقیقت "نکرا" اور شیطنت ہے۔ جو عقل کے ساتھ شباہت تو رکھتی ہے مگر حقیقتاً عقل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ فی الواقع عقل ہوتی تو اس کا حامل معرفتِ خالق عالم اور اس کی عبادت سے اس طرح غافل و ذاہل نہ ہوتا۔

اثباتِ صانع پر ایک اقناعی دلیل

عقل کے نزدیک ضررِ محتمل کا دفع کرنا اور اس سے بچاؤ کی تدبیر اختیار کرنا لازم ہے یعنی جہاں کسی قسم کے ضرر پہنچنے کا محض احتمال و اندیشہ بھی ہو، وہاں عقلِ سلیم بطورِ وجوب اس کے دفع کرنے اور اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر اختیار کرنے کا حکم کرتی ہے چہ جائیکہ جب وہ ضرر یقینی و حتمی ہو۔ چنانچہ مشاہدہ شاہد ہے کہ اگر کوئی غیر ثقہ آدمی یا کوئی بچہ کسی شخص کو یہ خبر دے کہ فلاں جگہ ایک شیر یا اژدھا بیٹھا ہے جو شخص بھی اس طرف سے گذرتا ہے وہ اُسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے تو اگرچہ اس شخص کو اس مخبر کی اس خبر پر یقین نہ ہو مگر محض اس خیال سے کہ شاید یہ سچ کہہ رہا ہو اور مبادا اسے کوئی ضرر پہنچ جائے اس لئے وہ یا تو اس مقام پر جاتا ہی نہیں اور اگر جائے بھی تو بچاؤ کی کوئی نہ کوئی تدبیر کرکے جاتا ہے۔ اور یہی طریقِ کار عقل و فطرت کے عین مطابق ہے مگر متعلقہ مسئلہ میں پہنچ کر منکرینِ خدا کے نزدیک یہ اصول بدل جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بنا بر مشہور ایک لاکھ چوبیس ہزار صادق القول معصوم عن الخطا انبیاء و مرسلین اور ان سے بھی زائد ان کے اوصیاء طاہرین اور کروڑوں علمائے دین بلکہ تمام متدینین و ملیین یہ کہتے رہے اور کہہ رہے ہیں کہ خداوند عالم موجود ہے اور اس صانع حکیم نے اس مادی عالم کے علاوہ ایک اور عالمِ آخرت بھی پیدا کیا ہے جس میں جنت و دوزخ ہے جس میں مرنے کے بعد بطورِ جزا یا سزا لوگوں کو رہنا ہے۔ کیا یہ حالات اگر کسی عقلمند آدمی کے سامنے ہوں تو اس کی عقل اسے حقیقتِ حال کا سنجیدگی سے جائزہ لینے اور متانت سے غور و فکر کرنے پر مجبور نہیں کرتی؟ کیا عقل اسے یہ سوچنے پر آمادہ نہیں کرتی کہ قطع نظر ان ادلّہ و براہین کے جو صانع عالم کی ہستی پر قائم ہیں حقیقت امر دو حال سے خالی نہیں۔ یا خدا ہے (اور یقیناً ہے) یا نہیں ہے؟ (اور یقیناً یہ شق باطل ہے) اگر نہیں ہے تو اُسے ماننے اور نہ ماننے والے مرنے کے بعد سب برابر ہوں گے۔ نہ کوئی حساب و کتاب ہوگا، اور نہ جنت و دوزخ۔ لیکن اگر وہ موجود ہوا۔ تو ماننے والے تو رستگاری حاصل کر جائیں گے مگر نہ ماننے والے ہلاک و برباد ہو جائیں گے اس سے ثابت ہوا۔ کہ ماننے میں فائدہ اور نہ ماننے میں ضرر و نقصان کا اندیشہ ہے۔ کیا صحیح عقل اس ضرر سے بچنے کا حکم نہیں کرتی؟ لیکن باوجودیکہ بقول بعض محققین حقیقی اجماع و اتفاق جس طرح محسوسات میں موجب یقین و اطمینان ہوتا ہے۔ اسی طرح معقولات

میں بھی باعثِ علم واذعان ہے۔ لیکن بعض کج فطرت لوگ اس جمِ غفیر اور جمع کثیر کے اجماع و اتفاق سے بھی ہرگز متاثر نہیں ہوتے بلکہ بایں ہمہ اپنے انکار پر اصرار کر رہے ہیں۔ لہٰذا دریں حالات کون دشمن عقل ایسے لوگوں کو صاحبِ عقل تسلیم کر سکتا ہے۔ یہی مختصر اور سادہ مگر مقنع دلیل حکماء روحانیین یعنی حضرات آئمہ طاہرین صلوات علیہم اجمعین سے بھی منقول ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اشعار آبدار حضرت امیر المومنینؑ کی طرف منسوب ہیں۔

قال المنجم والطبیب کلاھما　　لن یبعث الاموات قلت الیکما

منجم اور طبیب دونوں نے کہا کہ مردے کبھی زندہ نہ ہوں گے میں نے ان کے جواب میں کہا بس الگ رہو۔

ان صح قولکما فلست بخاسر　　او صح قولی فالخسار علیکما

اگر بالفرض تمہاری بات صحیح ہوئی تو اس میں میرا کوئی نقصان نہیں لیکن اگر میرا قول صحیح نکل آیا تو پھر تم دونوں کو ضرور نقصان اٹھانا پڑے گا۔　　(دیوان منسوب بہ حضرت علیؑ)

ایسا ہی ایک استدلال حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ ایک دہریہ آنجناب کی خدمت میں یہ مشورہ دینے آیا کہ آپ نماز روزہ وغیرہ خود ساختہ احکام کی بے فائدہ پابندی کر کے کیوں لطفِ حیات ضائع کرتے ہیں، حیات مستعار سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور لطف اندوز ہونا چاہیے۔ امام عالی مقام نے فرمایا کہ اگر یہ پابندیاں فی الواقع خود ساختہ ہی ہیں، اور کوئی حاکم مطلق موجود نہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ موت کے بعد اس پابندی پر کوئی بازپرس نہ ہوگی۔ لہٰذا تمہارے قول کے مطابق مجھے کوئی خمیازہ نہ بھگتنا پڑے گا۔ لیکن اگر ہمارا نظریہ درست ہوا تو بتاؤ تمہاری یہ آزادیاں تمہیں آیندہ کہاں لے جائیں گی؟ (بحار الانوار ج ۲) امام کے اس کلامِ ہدایت التیام کا یہ اثر ہوا کہ وہ دہریہ مشرف باسلام ہو گیا۔ امام علیہ السلام کے اس کلام معجز نظام کا جس طرح اس دہریہ پر اثر ہوا تھا وہ تو آپ نے سن لیا یہاں ایک اور گم گشتہ وادیٔ ضلالت کا تاثر بھی سماعت فرما لیجئے جو غلط تعلیم اور غلط سوسائٹی سے متاثر ہو کر اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار کر دہریت کی تاریک وادیٔ ضلالت میں قدم رکھ چکا تھا اور بڑی بڑی دلیلوں سے اس کی تسلی نہ ہوتی تھی، مگر جب توفیق ایزدی شامل حال ہوئی تو امام علیہ السلام کا یہی کلام حق ترجمان پڑھ کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہو گیا۔ اور اس کے تمام عقدے حل ہو گئے۔ اس کے اپنے الفاظ میں اس کی داستان سنیئے۔ کہتے ہیں۔ ایک دن میں ایک مذہبی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے میری نظر ایک دلیل پر پڑی جسے صادق آلِ محمدؐ نے خدا کی ہستی کے ثبوت میں ایک دہریہ کے سامنے پیش فرمایا تھا (پھر یہی سابقہ روایت نقل کی ہے) یہ روایت پڑھ کر میرے ہاتھ سے رسالہ گر پڑا، اور میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضور مجھ ہی کو مخاطب فرما کر کہتے ہیں کہ لیکن اگر ہم صادق القول ہوں تو یہ آزادیاں تمہیں آیندہ کہاں لے جائیں گی؟ آنکھیں دیکھتی تھیں مگر ان لفظوں کے سوا کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا۔ کان سنتے تھے مگر یہی ایک فقرہ۔ میری نیند اچاٹ

ہوگئی۔ اور کھانا پینا چھوٹ گیا۔ عجب حالت تھی۔ دل میں خوف، جسم کو لرزہ، زبان خاموش، اور دماغ میں اسی ایک فقرہ کی صدائے بازگشت۔ لیکن اگر میں صادق القول ہوں تو تمہاری آزادیاں تمہیں آیندہ کہاں لے جائیں گی؟۔۔۔۔ آٹھ دس روز تک میری یہی حالت رہی۔ اور میں یہ لکھتے ہوئے آج بھی بے اندازہ خوشی اور سرور محسوس کرتا ہوں کہ بطفیل چہاردہ معصومین آخر میں دل و دماغ نے وہ سوال حل کر لیا۔ جو سالہا سال تک میرے لئے ایک معمہ رہا تھا۔ (رسالہ میں شیعہ کیوں ہوا از حلمی) نکلا ہے۔ مایخرج من القلب یقع فی القلب یعنی "بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" خدا کرے ہماری یہ کتاب بھی اسی طرح گم گشتگان وادیٔ ضلالت و سرگردانان ورطۂ غوایت کے لئے باعث رشد و ایمان اور شمع ہدایت و ایقان ثابت ہو۔ بجاہ النبی وآلہ الاطہار علیہم السلام۔

وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق ایک سوال اور اُس کا جواب

بعض بے بصیرت لوگوں کے اذہان ناقصہ میں عموماً یہ سوال چکر لگاتا رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح وجود میں آیا؟ جب کہ ہر موجود کے لئے عقلاً کسی موجد کا ہونا ضروری ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح عقل کا یہ فیصلہ ہے کہ کسی موجود کے لئے ایک موجد کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح یہی عقل یہ بھی کہتی ہے۔ کہ اس تمام کائنات کا کوئی ایسا موجد ہونا چاہیے جو کسی موجد کے بغیر آپ سے آپ موجد ہو ورنہ ہر موجود کے لئے آپ موجد درکار ہوگا اور یہ سلسلہ کہیں بھی جا کر نہ رکے گا۔ خدا تو کہتے ہی اس کو ہیں جو سب کا خالق ہو اور خود کسی کا مخلوق نہ ہو۔ اگر وہ بھی کسی کا مخلوق ہو تو پھر وہ خدا نہیں رہے گا بلکہ خدا وہ ہوگا جس نے اس کو پیدا کیا۔

ایمان باللہ کے اخلاقی فوائد

مذکورہ بالا تمام حقائق سے ایک ناظر خبیر کو یقین ہو جاتا ہے کہ صانع عالم موجود ہے اور اس کی ہستی کا اقرار واجب و لازم ہے اگر اسے مسئلہ ہستی صانع کو دیکھا جائے تو اسکے کئی اخلاقی فوائد ہیں ہم یہاں بعض فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

پہلا فائدہ

یہ ہے کہ یہ تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے جب یہ یقین مبدل بہ شک ہو جائے تو انسان جوشش عمل سے عاری ہو جاتا ہے پھر حسن عمل کی بزرگی کے باوجود انصاف کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکتا اور وہ شیطان کا آلۂ کار بن کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ جب کسی محاسب اعلیٰ کا یقین ہی نہ ہو تو سعی و عمل کا جائزہ لینے کی کیا ضرورت۔ جب کوتوال ہی موجود نہیں تو چور کو چوری سے کیا امر مانع ہو سکتا ہے؟ منکرین کے گروہ میں جو کچھ حسن عمل پایا جاتا ہے وہ ان کے باطنی تذبذب کا نتیجہ ہے۔ یعنی منکر لوگ اگرچہ بظاہر منکر خدا ہیں اور آخرت کے خطروں سے بے پرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر دل کے گوشہ میں یہ اندیشہ ضرور رکھتے ہیں کہ مبادا اس وسیع و عریض کائنات کا کوئی خالق و مالک ہو۔ جو مرنے کے بعد ہمیں زندہ کرکے ہم سے بازپرس کرے۔ دوسری طرف بعض مدعیان ایمان شب و روز گناہ کی آلودگیوں میں ملوث نظر آتے ہیں اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ان کا یہ اقرار لفظی اور رسمی ہے وہ عین حالت رکوع و سجود میں بھی شک کرتے

رہتے ہیں کہ شاید خدا موجود نہ ہو۔ اور ہمارے یہ رکوع و سجود تضیع اوقات ہوں۔ اسی لئے قرآن کریم مناظر قدرت کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے۔ وہ قدرت کی صنعت بھری رنگ آمیزیوں اور گلکاریوں کو انسان کے سامنے پیش کر کے پوچھتا ہے کہ سب کچھ موجود ہے کیا یونہی پیدا ہو گیا؟ مظاہر عالم اور مناظر قدرت میں تحقیقی نظر ڈالنے سے بالآخر ضرور انسان شک کی دیوار سے پار ہو کر خالق بر و بحر کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یا ایھا الناس قد جاءکم الرسول بالحق من ربکم فامنوا خیرا لکم

ایمان باللہ کا دوسرا اخلاقی فائدہ

یہ ہے کہ اس سے انسانی نگاہ میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے جتنی خدا کی سلطنت وسیع و عریض ہے۔ انسان اس نعمت ایمان سے محروم ہو تو پھر اس کی نگاہ اسی تنگ دائرہ تک محدود رہتی ہے جہاں تک اس کی اپنی قدرت، علم اور اس کے مطلوبات محدود ہوتے ہیں، وہ اسی دائرہ میں اپنے حاجت روا تلاش کرتا ہے۔ طاقتوروں سے ڈرتا ہے۔ اور کمزوروں کو دباتا ہے۔ لیکن خدا پر ایمان لانے کے بعد اس کی نگاہ تمام کائنات تک پھیل جاتی ہے۔ ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدا ماست۔ اب ہر چیز سے اس کا ایک ہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اب اس کی دوستی، دشمنی، محبت یا نفرت، اپنے نفس کے لئے نہیں ہوتی بلکہ خدا کے لئے ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں جس خدا کا بندہ ہوں اس کی خدائی، میرے خاندان یا میرے ملک یا صرف امراء یا غرباء تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ رب العالمین اور خالق السموات والارض ہے۔ ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعا و کرھا۔ لہذا اللہ پر ایمان رکھنے والا کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ وسیع النظر اور عالی دماغ ہوتا ہے۔

ایمان باللہ کا تیسرا فائدہ

ایمان باللہ سے عزت نفس اور خودداری کی لازوال دولت ہاتھ آتی ہے اور انسان ذلت و پستی کے گڑھے سے دائمی نجات حاصل کر لیتا ہے۔ جب تک خدا پر ایمان نہیں ہوتا انسان ہر طاقتور ہر بظاہر نافع یا ضار اور ہر شاندار چیز کے سامنے جھکتا ہے۔ اس سے خائف رہتا ہے۔ اس سے اُمیدیں رکھتا ہے۔ مگر جب وہ خدا پر ایمان لاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ جن کے سامنے یہ ہاتھ پھیلا رہا تھا جن کو نافع یا مضر سمجھ رہا تھا۔ وہ تو خود خدائے قادر و قیوم کے محتاج ہیں۔ لا یملکون لانفسھم ضرا و لا نفعا و لا موتا و لا حیوۃ و لا نشورا۔ اسی کی طرف سے نصرت عطا ہوتی ہے۔ وما النصر الا من عند اللہ العزیز الحکیم (آل عمران) رزق بھی وہی دیتا ہے۔ ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین (الذاریات) وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ واللہ یحی و یمیت۔ (آل عمران) ضرر و نفع کا وہی مالک ہے۔ و ان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو و ان یردک بخیر فلا راد لفضلہ (یونس)، غرضیکہ تمام قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ وہی ہے۔ ان القوۃ للہ جمیعا (البقرۃ) لہذا اس ایمان کے بعد انسان دنیا کی تمام قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے اور خدا کے سوا اب اس کی گردن کسی اور کے سامنے نہیں جھکتی سہ ماسوی اللہ را مسلمان بندہ نیست ؛ پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

ایمان باللہ کا چوتھا فائدہ

اس ایمان کی وجہ سے انسان غرور و تکبر ایسی صفاتِ رذیلہ سے منزہ و مبرا ہو جاتا ہے اور خودداری اور عزتِ نفس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر تواضع و انکساری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو کہ اخلاقِ جمیلہ میں سے ایک بہت بڑا خلق ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدائے قادر کے سامنے بالکل بے بس ہے وھو القاہر فوق عبادہ (الانعام) بلکہ وہ جانتا ہے کہ صرف وہی نہیں بلکہ تمام عالم خدا کا محتاج اور خدا سب سے بے نیاز ہے۔ واللہ الغنی وانتم الفقراء (سورۂ محمد) وہ تمام نعمتوں کا سرچشمہ خدا ہی کو سمجھتا ہے۔ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ (النحل) لہٰذا اس عقیدہ کے باعث وہ سراپا انکسار بن جاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما۔ خدائے رحمٰن کے خالص بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور جب جاہل لوگ ان سے جہالت آمیز باتیں کرتے ہیں تو وہ سلام کر کے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

ایمان باللہ کا پانچواں فائدہ

ایمان اللہ سے انسان کے اندر اُمید و رجا کی ایک اطمینان بخش کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مایوسی اور شکستہ دلی اس کے نزدیک نہیں بھٹکتی۔ اس کے پاس ایمان کا لازوال خزانہ موجود ہے۔ اگرچہ تمام ظاہری اسباب و وسائل اس کا ساتھ چھوڑ جائیں لیکن خدا پر بھروسہ و اعتماد کا دامن کبھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا خدا بڑا رحیم و کریم ہے ورحمتی وسعت کل شیٔ (اعراف) وہ سمجھتا ہے کہ خدا کی رحمت سے نااُمید ہونا کفر ہے۔ ولا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون (یوسف) وہ یقین رکھتا ہے کہ خدا ظلم و ستم نہیں کرتا۔ وما ربک بظلام للعبید (آل عمران) اس کا ایمان ہے کہ خدا اپنے بندوں کی داد و فریاد سنتا ہے۔ واذا سئلک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (البقرۃ) لہٰذا وہ سکون و اطمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ اس رجا و اطمینان قلب سے انسان کے اندر صبر و استقامت اور توکل علی اللہ ایسے صفاتِ جلیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے سخت سے سخت مشکلات و مصائب بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کر سکتے۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ نصرت کرے تو دنیا کی کوئی طاقت اس پر غالب نہیں آسکتی۔ ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم (آل عمران) یہی وجہ ہے مشکلات و مصائب کے ہجوم کے وقت حزن و ملال اس کے نزدیک بھی نہیں بھٹکتا۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا (حم السجدہ) وہ یقین رکھتا ہے جو بلا و مصیبت آتی وہ تقدیر الٰہی کے تحت آتی اور وہی اُسے دور کرتا ہے۔ قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا وعلی اللہ فلیتوکل المومنون (التوبہ)

ایمان باللہ کا چھٹا فائدہ

ایمان باللہ سے بزدلی اور کمزوری دُور ہوتی ہے۔ اور شجاعت و شہامت ایسی صفاتِ جلیلہ

پیدا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بزدلی دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے ایک اپنی جان اور اپنے اہل وعیال اور مال کے ساتھ محبت۔ دوسرے یہ خوف کہ یہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کرنے کی طاقت انہی اشیاء میں ہے جو بطور آلہ استعمال ہوتی ہیں۔ ایمان باللہ ان دونوں خوفوں کی جڑ کاٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ مومن باللہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ مال واولاد محض چند روزہ دنیا کی زینت ہیں، یہ خود فانی اور اس کی محبت بھی فانی ہے۔ المال والبنون زینة الحیوة الدنیا والبٰقیٰت الصالحات خیر عند ربك ثوابا وخیر املاً (الکهف) اس لئے وہ اپنی محبت کا مرکز لازوال شیٔ کو قرار دیتا ہے۔ والذین اٰمنوا اشد حبا للہ (البقرۃ) نیز وہ یقین رکھتا ہے۔ دنیا کی یہ حیات بہرحال مستعار ہے جسے دوام اور پائیداری حاصل نہیں۔ قل ان الموت الذی تفرون منه فانه ملاقیکم (الجمعه) موت سے مفر نہیں یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدة (النساء) اس لئے وہ فطری طور پر خواہش کرتا ہے کہ کیوں نہ جان قربان کرکے وہ دائمی وابدی زندگی حاصل کی جائے جسے فنا وزوال نہیں ہے۔ لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربهم یرزقون فرحین بما اٰتٰهم اللہ من فضله (آل عمران) رہا دوسرا خوف تو مومن یقین کامل رکھتا ہے۔ ان چیزوں میں ہلاک کرنے یا نقصان پہنچانے کی حقیقی طاقت نہیں ہے۔ اگر خدا کا اذن نہ ہو تو یہ تمام طاقتیں کسی کا بال بیکا نہیں کرسکتیں۔ وما هم بضارین به من احد الا باذن اللہ (البقرۃ) وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا موجلاً (آل عمران) اس لئے وہ ان چیزوں سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اگر ڈرتا ہے تو محض خدا سے۔ فلا تخافوهم وخافون ان کنتم مؤمنین (آل عمران) وہ جانتا ہے کہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔ اس یقین واذعان کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنی جان اور اپنا مال سب خدا کے سپرد کردیتا ہے۔ ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسهم واموالهم بان لهم الجنة یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون (التوبه) اس کی موت وحیات بس خدا کے لئے ہوجاتی ہے۔ ان حیاتی ومماتی للہ رب العالمین۔

ایمان باللہ کا ساتواں فائدہ

اس ایمان سے حرص وہوس اور حسد ایسے صفات رذیلہ دور ہوجاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ قناعت واستغناء ایسے صفات جمیلہ پیدا ہوجاتے ہیں۔ ؎

کرائی ہیں نے استغناء میں معراج مسلمانی

جب اسے یہ یقین ہوجاتا ہے کہ رزق قدرتِ کاملہ کے ہاتھ میں ہے۔ جسے جس قدر چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر (رعد) تو وہ اس کے حصول کے لئے ذلیل اور ناجائز ذرائع استعمال نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ باعزت طریقہ سے اپنا رزق تلاش کرتا ہے۔ اور جو کچھ کم یا زیادہ مل جاتا ہے اس پر قناعت کرلیتا ہے۔ قل ان الفضل بید اللہ یؤتیه من یشاء۔ (آل عمران) عزت ودولت خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وتعز من

تشاء و تذل من تشاء بیدك الخیر انك علی کل شیء قدیر (آل عمران) وہ جانتا ہے کہ عزت و ذلت اور رزق کی وسعت یا تنگی وغیرہ امور میں جو باہمی اختلاف و تفاوت پایا جاتا ہے وہ خدا نے کئی مصالح و حکم کے پیش نظر اس نظام میں خود جاری فرمایا ہے۔ اسے انسان نہ بدل سکتا ہے اور نہ ہی اسے بدلنے کی کوشش کرنا چاہیے واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق (النحل) ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض (النساء)

ایمان باللہ کا آٹھواں اخلاقی فائدہ

ایمان باللہ سے تمدن کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اس عقیدہ سے افراد میں پاکیزگی و پرہیزگاری اور احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے۔ اور قانون کی پابندی اور باہمی نظم و ضبط کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور تمام افراد ایک سلک میں منسلک نظر آتے ہیں جب انسان یقین رکھتا ہے کہ وہ جہاں بھی جائے خدا کی وسیع و عریض مملکت سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ ان اللہ واسع علیم (البقرہ) اور یہ بھی ایمان رکھتا ہے کہ خدا پر اس کی کوئی حرکت یا سکون مخفی و مستور نہیں ہے۔ ان اللہ لا یخفی علیہ شیء فی الارض ولا فی السماء (آل عمران) وہ خدا کو علیم بذات الصدور سمجھتا ہے اور یہ اذعان بھی رکھتا ہے کہ ایک دن ضرور اس نے بارگاہ ایزدی میں حاضر ہونا ہے۔ واعلموا انکم ملاقوہ (البقرہ) واعلموا انکم الیہ تحشرون (البقرہ) اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جہاں خدا بڑا غفور رحیم ہے۔ وہاں اس کی گرفت بھی بڑی سخت ہے۔ ان بطش ربك لشدید (البروج) تو اس سے اس کے اعمال و افعال کی پاکیزگی اور سیرت کی بلندی، پندار و کردار میں ہم آہنگی پر جو کچھ اثر مرتب ہو سکتا ہے وہ "عیاں را چہ بیان" کا مصداق ہے۔"

(مقتبس از رسالہ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول)

خداوند عالم کی کنہ حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ صانع عالم کی اس قدر اجمالی معرفت بدیہی و فطری ہے کہ اس عالم کا ایک قادر و علیم صانع اور خالق حکیم موجود ہے۔ جس سے بعونہ تعالیٰ لطریق احسن و اکمل ہم عہدہ برآ ہو چکے ہیں (والحمد للہ علی احسانہ) لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس ذات ذوالجلال کی کنہ حقیقت تک رسائی حاصل کرے تو "ایں خیال است و محال است و جنوں"۔

محقق شیخ بہائی علیہ الرحمہ اپنے رسالہ اعتقادات الامامیہ میں تحریر فرماتے ہیں وان کنہ ذاتہ مما لا تصل الیہ ایدی العقول والافکار۔ خداوند عالم کی کنہ ذات تک عقول و افکار کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح علامہ مجلسی نے بھی اپنے رسالہ اعتقادیہ لیلیہ میں افادہ فرمایا ہے۔ وانہ لا یمکن الوصول الی کنہ ذاتہ او صفاتہ۔ خدائے عزوجل کی ذات یا صفات کی اصل حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

یہ وہ مشکل مرحلہ ہے کہ یہاں انبیاء عظام و اصفیاء کرام بھی بارگاہ قدس میں اپنے عجز کا اقرار کرتے ہوئے نظر آتے

ہیں۔ سبحانك ما عرفناك حق معرفتك۔ حق بھی یہی ہے کہ حریمِ خالق کی ذات تک مخلوق کے عقول و اوہام کی رسائی ناممکن و محال ہے۔ اور خداوندِ عالم کی کنہِ حقیقت کی معرفت ممتنع۔ این التراب و ربّ الارباب ؟ یعنی چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ اس سلسلہ میں خود ارشادِ قدرت ہے۔ ولا یحیطون بہ علمًا۔ کہ لوگ خداوندِ عالم کی ذات کا احاطہ علمی نہیں کر سکتے۔ ادعیہ مبارکہ میں وارد ہے سبحان من لا یعلم ما ھو الا ھو۔ پاک ہے وہ ذات جس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے ؟ (دعائے مشلول)

سید الانبیاء و المرسلینؐ فرماتے ہیں۔ انّ اللّٰہ احتجب عن العقول کما احتجب عن الابصار و ان الملأ الاعلیٰ یطلبونہٗ کما تطلبونہ انتم۔ خداوندِ عالم کی حقیقت عقول و افہام کی دسترس سے اسی طرح بلند و بالا اور پوشیدہ ہے جس طرح آنکھوں سے مخفی و محتجب ہے اور عالمِ بالا کی مخلوق اسے اسی طرح تلاش کرتی ہے جس طرح تم آپ سے تلاش کرتے ہو (از بدایت الوحدین) ولنعم ما قیل ؎

توان در بلاغت بہ سحباں رسید نہ در کنہِ بیچون سبحان رسید!

سید الموحدین حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔ الحمد للّٰہ الذی لا یبلغ مدحتہ القائلون ولا یحصی نعمائہ العادون ولا یودی حقہ المجتہدون الذی لا یدرکہ بعد الھمم ولا ینالہ غوص الفطن الذی لیس لصفتہٖ حد محدود ولا نعت موجود ولا وقت معدود ولا اجل ممدود۔ الخ (نہج البلاغہ) سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس کی مدح و ثنا تک بولنے والے نہیں پہنچ سکتے اور نہ شمار کرنے والے اس کی نعمتوں کو گن سکتے ہیں اور نہ کوشش کرنے والے اس کے حقوق ادا کر سکتے ہیں۔ اسے بلند ہمتیں درک نہیں کر سکتیں، اور نہ ہی عقل و زیرکی کی گہرائیاں اس کی کنہِ حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کی کوئی حد مقرر نہیں نہ اس کی تعریف کے لئے سرحد موجود ہے اور نہ ہی اس کی ابتدا کے لئے کوئی وقت اور انتہا کے لئے کوئی مدت ہے....

اسی طرح حضرت امام زین العابدینؑ صحیفہ سجادیہ کی پہلی دعائے تحمید میں فرماتے ہیں۔ الحمد للّٰہ الاول بلا اول کان قبلہ والاخر بلا اخر یکون بعدہ الذی قصرت عن رؤیتہ ابصار الناظرین و عجزت عن نعتہ اوھام الواصفین۔ الخ۔ سب حمد و ثنا اس خدائے جل و علا کے لئے ہے جو ایسا اوّل ہے کہ اس سے پہلے کوئی اوّل نہیں۔ اور ایسا آخر ہے کہ اس کے بعد اور کوئی آخر نہیں۔ وہ اتنا اجل و ارفع ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر اور وصف کرنے والوں کے عقول و اوہام اس کی تعریف و توصیف سے عاجز ہیں۔ نیز آں جناب دعائے دوشنبہ میں فرماتے ہیں۔ کلّت الالسن عن غایۃ صفتہ والعقول عن کنہ معرفتہ زبانیں اس کی انتہائی توصیف کرنے سے عاجز اور عقلیں اس کی حقیقی معرفت تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں ان کل ما تصورہ احد فی عقلہ او وھمہ او خیالہ

فاللہ سبحانہ غیرہ ودونہ لانہ مخلوق والمخلوق لا یکون من صفات الخالق (شرح اصول کافی)

جو شخص اپنے عقل یا وہم یا خیال میں خدا کی ذات کا کوئی خیالی تصور قائم کرے۔ اسے سمجھ لینا چاہیے کہ خدا اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ کیونکہ جو کچھ اس کے ذہن میں آجائے وہ اس کے ذہن کی مخلوق ہے۔ مگر خدا خالق ہے مخلوق نہیں ہے۔ حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کیف اصفہ بالکیف و ھو الذی کیف الکیف حتی صار کیفاً فعرفت الکیف بما کیف لنا الکیف۔ خلاصہ یہ کہ بھلا میں خداوند عالم کو کیفیت وچگونگی کے ساتھ کس طرح متصف کر سکتا ہوں۔ حالانکہ خدا نے ہی کیفیت کو پیدا کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کیفیت بن گئی۔ اور اسی کے بتانے سے ہم نے کیفیت کو پہچانا لہٰذا خالق اپنی مخلوق کے ساتھ کیونکر متصف ہو سکتا ہے؟ اسی بنا پر حضرت امیرالمومنینؑ فرمایا کرتے تھے۔ لا تقدر عظمۃ اللہ علی قدر عقلک فتکون من الھالکین۔ خدائے قدوس کی عظمت وجلالت کا اندازہ اپنی ناقص عقل سے نہ لگاؤ ورنہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ چونکہ حقیقتِ خداوندی تک رسائی حاصل کرنا لوگوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ بلکہ اس کی ذات میں غور وخوض کرنے سے ضلالت وگمراہی کا شدید خطرہ تھا۔ اسی لئے پیشوایانِ دین نے اس سلسلہ میں مزید غور وخوض کرنے کی ممانعت فرما دی ہے۔ چنانچہ اس مضمون کی متعدد روایات اصول کافی وغیرہ کتبِ معتبرہ میں موجود ہیں۔ تکلموا فی خلق اللہ ولا تکلموا فی اللہ فان الکلام فی اللہ ولکن لایزداد صاحبہ الا تحیراً (فروع) امام محمد باقر علیہ السلام نیز انہی بزرگوار سے مروی ہے۔ فرمایا ایاکم والتفکر فی اللہ ولکن اذا اردتم ان تنظروا الی عظمۃ اللہ فانظروا الی عظیم خلقہ۔ اللہ سبحانہ کی کنہِ ذات میں غور وفکر کرنا۔ ہاں جب تم اس کی عظمت وجلالت دیکھنا چاہو تو اس کی مخلوق کی عظمت میں غور وتامل کر لینا۔

مخلوق خدا میں جس قدر چاہو گفتگو کرو مگر خود خداوند عالم کی ذات کے متعلق کلام نہ کرو۔ کیونکہ اس کی ذات میں گفتگو کرنے والے کو حیرانی وپریشانی میں اضافہ کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اسی طرح حضرت صادق علیہ سے منقول ہے فرمایا۔ تکلموا فی کل شئی ولا تتکلموا فی ذات اللہ ہر شے میں گفتگو کرو۔ مگر خداوند عالم کی ذات کے بارے میں کلام نہ کرو۔ نیز انہی حضرت سے یہ بھی مروی ہے کہ من نظر فی اللہ کیف ھو ھلک۔ جو شخص اللہ سبحانہ کی کیفیت میں غور وفکر کرے گا کہ وہ کس طرح ہے وہ ہلاک ہو جائے گا۔ آیت مبارکہ ان الی ربک المنتھیٰ کی تفسیر میں حضرت صادق آلِ محمدؐ سے مروی ہے۔ اذا انتھی الکلام الی اللہ فامسکوا۔ جب سلسلۂ کلام خدائے رحمٰن تک پہنچ جائے۔ تب فوراً خاموش ہو جاؤ۔

خلاصہ یہ کہ خالق کائنات کے متعلق یہی اجمالی عقیدہ کافی ہے کہ وہ واجب الوجود اس کائنات کا خالق اور ہر کمال سے متصف اور ہر نقص سے منزہ و مبرا اور ذات و صفات میں بے مثل و بے مثال ہے۔ لیس کمثلہ شئی خلاصہ یہ کہ سورۂ توحید کے مطالب پر ایمان رکھنا کافی ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ قل ھو اللہ احد ہ اللہ الصمد ہ لم یلد و لم یولد ہ و لم یکن لہ کفواً احد۔ اے میرے حبیب کہدو اللہ ایک ہے وہ تمام عالم سے بے نیاز ہے۔ اس سے کوئی پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر و نظیر ہے چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ من قرأ قل ھو اللہ احد و آمن بھا فقد عرف التوحید جو شخص سورۂ قل ھو اللہ کو سمجھ کر پڑھے۔ اور اس پر ایمان لائے اس نے توحید کی معرفت حاصل کر لی۔ (از عیون اخبار الرضا) اور حضرت امام زین العابدینؑ سے منقول ہے۔ فرمایا۔ ان اللہ عزوجل علم انہ یکون فی اخر الزمان اقوام متعمقون فانزل اللہ تبارک و تعالیٰ قل ھو اللہ احد و الایات من سورۃ الحدید الی قولہ علیم بذات الصدور فمن رام وراء ذلک فقد ھلک۔ خداوند عالم کو علم تھا کہ آخری زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو (مباحثِ توحید میں) بہت غور و تعمق سے کام لیں گے۔ اس لئے اس نے سورۂ توحید اور سورۂ حدید کی پہلی چند آیتیں علیم بذات الصدور تک نازل کر دیں۔ لہٰذا اب جو شخص اس سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا (بحار الانوار ج ۲)

جناب ہشام روایت کرتے ہیں کہ ایک زندیق نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا۔ ان اللہ تعالیٰ ما ھو؟ کہ خداوند عالم کیا ہے؟ فقال ھو شئی بخلاف الاشیاء ارجع بقولی شئی الی انہ شئی بحقیقۃ الشیئیۃ غیر انہ لا جسم و لا صورۃ و لا یحس و لا یجس و لا یدرک بالحواس الخمس لا تدرکہ الاوھام و لا تنقصہ الدھور و لا تغیرہ الازمان۔ الخ۔ فرمایا وہ ایک شے ہے مگر دوسری اشیاء سے مختلف ہے۔ اس کو شے کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ وہ حقیقت شے کے اعتبار سے فی الحقیقت شے ہے اور موجود ہے (کیونکہ وہ واجب الوجود ہے اور باقی اشیاء کا وجود بوجہ امکان عارضی ہے) نہ وہ جسم ہے اور نہ صورت نہ وہ ظاہری حواس سے محسوس ہو سکتا ہے اور نہ باطنی حواس سے محسوس ہو سکتا ہے اور نہ حواس خمسہ سے ادراک کیا جا سکتا ہے۔ نہ وہم اس کا احاطہ کر سکتے ہیں اور نہ زمانوں کا گذرنا اس میں کسی قسم کا نقص یا تغیر پیدا کر سکتا ہے۔ (بحار ج ۲ بحوالہ احتجاج) فتح بن یزید جرجانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے سوال کیا۔ عن ادنی المعرفۃ۔ کہ کم از کم معرفتِ خداوندی کس قدر ضروری ہے۔ فقال الاقرار بانہ لا الہ غیرہ و لا شبہ لہ و لا نظیر لہ و انہ قدیم مثبت موجود غیر فقید و انہ لیس کمثلہ شئی (توحید شیخ صدوق) فرمایا یہ اقرار کرنا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود برحق نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر و نظیر ہے۔ وہ ہمیشہ سے موجود ہے اور

ہمیشہ باقی رہے گا۔ کوئی شئی اس کی مانند نہیں ہے۔ خداوند عالم کی کنہ حقیقت تک انسانی عقل وفہم کی رسائی ظاہر سکنے کی ابن ابی الحدید معتزلی نے بہت صحیح تصویر کشی کی ہے۔ ع۔

فیك یا اعجوبة الکون غدا الفکر کلیلا　　انت حیرت ذوی اللب وبلبلت العقولا

کلما اقدم فکری فیك شبراً فرّ میلا　　ناکصاً یخبط فی عمیا لا یهتدی سبیلا

اے عجوبہ کائنات تیرے متعلق عقل وفکر درماندہ ہو گئے ہیں۔ تو نے صاحبان عقل کو متحیر اور عقول وافہام کو پریشان کر دیا۔ میں جب بھی اپنے جواد فکر کو مہمیز کر کے اسے تیرے بارے میں ایک بالشت آگے بڑھاتا ہوں تو وہ الٹے پاؤں اندھا دھند ایک میل پیچھے ہٹ جاتا ہے اور کوئی راستہ نہیں پاتا۔

اس حدیث شریف کا مطلب بھی یہی ہے جو جناب امیر علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا۔ من سئل عن التوحید فھو جاھل۔ جو شخص ذات خداوندی کی حقیقت کے بارے میں سوال کرے وہ جاہل ہے۔ ومن اجاب عنه فھو مشرك۔ اور جو ایسے سوال کا جواب دے وہ مشرک ہے۔ ومن عرفه فھو ملحد۔ جو شخص حقیقت ایزدی کی معرفت کا دعویٰ کرے وہ ملحد ہے۔ ومن لم یعرفه فھو کافر۔ اور جو شخص (بقدر استطاعت) اپنے خالق کو نہ پہچانے وہ کافر ہے۔ (از تحفہ امامیہ در حقیقت مذہب شیعہ)

شیخ سعدی نے بھی اس مطلب کو اپنے مخصوص انداز میں یوں ادا کیا ہے ع

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم　　وز ہرچہ گفتہ اند شنیدم و خواندہ ایم

دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر　　ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

عقلاً بھی یہ بات مسلّم ہے۔ کہ کسی چیز کی حقیقی معرفت اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب اس کی جنس وفصل معلوم ہو اور جس ذات والاصفات کی کوئی جنس وفصل ہی نہ ہو تو پھر بھلا اس کی حقیقی معرفت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے بہرحال ہم شکار معرفت کردگار کے متلاشیوں کو یہ مشورہ دے کر اس بحث کو بیان ختم کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اپنا وقت عزیز ضائع نہ کریں۔ ع

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں　　کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

محقق شیخ بہائی علیہ الرحمۃ اپنی کتاب اربعین میں بذیل شرح حدیث دوم فرماتے ہیں۔ المراد بمعرفة الله تعالیٰ الاطلاع علی نعوته وصفاته الجلالیة بقدر الطاقة البشریة واما الاطلاع علی حقیقة الذات المقدسة فمما لا مطمع للملائکة المقربین والانبیاء المرسلین فضلاً عن غیرھم وکفیٰ فی ذلك قول سید البشر ما عرفناك حق معرفتك۔ معرفت خداوندی حاصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ طاقت بشری کے مطابق اس کے صفات وکمالات پر اطلاع حاصل کی جائے لیکن جہاں تک اس کی اصل ذات کی حقیقت

معلوم کرنے کا تعلق ہے۔ غیر تو بجائے خود ملائکہ مقربین، انبیاء مرسلین بھی اس کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔

اس سلسلہ میں بجناب سید البشرؐ کا ارشاد ہی کافی ہے کہ بارالہا ہم نے تجھ کو اس طرح نہیں پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق ہے۔ قد جاءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسه ومن عمی فعلیها وما انا علیکم بحفیظ

صفاتِ ثبوتیہ اور ان کے عین ذات ہونے کا بیان

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی شے کی معرفت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس شے کے صفات کی معرفت حاصل کی جائے اس طرح موصوف کی خود بخود فی الجملہ معرفت حاصل ہو جاتی ہے یہاں اگر ہم اس طریقہ کار سے معرفتِ پروردگار حاصل کرنا چاہیں تو اس میں مشکل یہ ہے کہ عند التحقیق خداوند عالم کی صفاتِ حقیقیہ یعنی صفات ذات (نہ صفات فعل) اس کی عین ذات ہیں، نہ کہ زائد بر ذات جیسا کہ حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ اوّل الدین معرفته وکمال معرفته التصدیق به وکمال التصدیق به توحیده وکمال توحیده الاخلاص له وکمال الاخلاص له نفی الصفات عنه لشهادة کل صفة انها غیر الموصوف وشهادة کل موصوف انه غیر الصفة فمن وصف الله سبحانه فقد قرنه ومن قرنه فقد ثنّاه ومن ثنّاه فقد جزّاه ومن جزّاه فقد جهله ومن جهله فقد اشار الیه ومن اشار الیه فقد حدّه ومن حدّه فقد عدّه ومن قال فیم فقد ضمنه ومن قال علام فقد اخلیٰ منه۔ سلسلۂ دین کی پہلی کڑی خدا تعالےٰ کی معرفت ہے اور کمال معرفت اس کی تصدیق اور کمال تصدیق اس کی توحید ہے اور کمال توحید اس کے لئے اخلاص ہے۔ اور کمال اخلاص صفاتِ (زائدہ) کی نفی کرنا ہے۔ کیونکہ ہر صفت شہادت دیتی ہے کہ وہ موصوف کی غیر ہے۔ اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ اپنی صفت کا غیر ہے۔ پس جس شخص نے صفاتِ (زائدہ) سے خدا کی توصیف کی۔ اس نے خدا کا ساتھی قرار دیا۔ اور جس نے ساتھی قرار دیا۔ اس نے دوئی پیدا کی۔ اور جس نے دوئی پیدا کی وہ اس کے لیے جز کا قائل ہو گیا۔ اور جو جزء کا قائل ہوا۔ وہ درحقیقت اس ذات کا جاہل اور اس سے بے خبر ہے جو اس سے بے خبر ہے۔ اس نے اسے قابل اشارہ سمجھ لیا۔ اور جس نے اسے قابلِ اشارہ قرار دیا۔ اُس نے اسے محدود کر دیا۔ اور جس نے اس کی حد بندی کر دی۔ اس نے اسے شمار کر دیا اور جس نے اس کے متعلق یہ کہا کہ وہ کس چیز میں ہے۔ اس نے اسے کسی چیز کے اندر تصوّر کیا اور جس نے یہ کہا وہ کس چیز پر ہے اس نے دیگر مقامات کو اس سے خالی فرض کر لیا (نہج البلاغہ)

آں جناب کے ان کلماتِ شریفہ میں توحید کے بہت سے معارف وحقائق بیان کر دئے گئے ہیں۔ مگر یہاں ان ارشاداتِ طریفہ کے نقل کرنے سے ہمارا مقصد صرف صفاتِ زائدہ بر ذات کی نفی پر استشہاد کرنا ہے صفاتِ

ذات اور صفات فعل کی تعریف اور ان کا باہمی فرق ہم دوسرے باب میں بیان کریں گے جہاں حضرت مصنف علام اس مسئلہ کا ذکر کریں گے۔ اس اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ذات و صفات میں اثنینیت و دوئیت نہیں ہے کہ ذات اور ہو اور صفت اور بلکہ جو آثار و نتائج بالعموم صفات سے ظاہر ہوتے ہیں، وہ یہاں خود ذات واجب الوجود سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ذات بھی ہے اور صفت بھی۔ اسی ذات واحد و یکتا کو مظہر آثار علم ہونے کی بنا پر عالم اور مظہر آثار قدرت ہونے کی وجہ سے قادر اور مظہر آثار حیات ہونے کے اعتبار سے حی اور مظہر آثار سماعت ہونے کے باعث سمیع کہا جاتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ بنابریں کوئی لمحہ بھی ایسا متصور نہیں ہو سکتا کہ خداوند عالم کی ذات ان صفات کمالیہ سے خالی و عاری ہو۔ بل هو علم كله قدرة كله. سمع كله. بصر كله. حياة كله وهكذا۔ بخلاف ممکنات کی صفات کے کہ وہ زائد بر ذات ہوتی ہیں۔ یعنی ان پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اس وقت ان میں نہ علم ہوتا ہے نہ قدرت نہ حیات نہ سماعت نہ بصارت (الی غیر ذلك من الصفات) بعد میں جب علم آیا تو عالم کہلائے اعضا میں توانائی آگئی تو قادر بنے۔ نیستی سے نکل کر عرصہ ہستی میں قدم رکھا تو حی قرار پائے وقس علی هذا سائر الصفات مگر ذات احدیت میں ایسا نہیں ہے۔ حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔ لم یزل ربنا عزّ وجل والعلم ذاته ولا معلوم والسمع ذاته ولا مسموع والقدرة ذاته ولا مقدور فلما احدث الاشياء وكان المعلوم وقع العلم منه على المعلوم والسمع على المسموع والبصر على المبصر والقدرة على المقدور۔ (توحید شیخ صدوقؒ) ہمارا پروردگار ہمیشہ سے عین علم تھا۔ حالانکہ ابھی معلوم موجود نہ تھا۔ وہ عین سمع و بصر تھا۔ حالانکہ ابھی سننے اور دکھائی دینے کے قابل کوئی چیز موجود نہ تھی۔ وہ ہمیشہ سے عین قدرت تھا۔ حالانکہ ابھی کوئی مقدور (آثار قدرت کو قبول کرنے والا) نہ تھا۔ بعد میں جب اس نے اشیاء کو پیدا کیا اور معلوم موجود ہوا۔ تو علم اس پر پوری طرح منطبق ہوا۔ اور سمع مسموعات پر اور بصر مبصرات پر اور قدرت مقدورات پر واقع ہوئی۔ برادران اسلامی نے یہاں اس صحیح مسلک کے علاوہ ایک اور راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ ذات و صفات میں علیحدگی کے قائل ہیں۔ چنانچہ فاضل شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل طبع ایران ص۳۹ پر لکھا ہے۔ قال ابو الحسن الہادی تعالی عالم بعلم قادر بقدرة حي بحياة مريد بارادة متكلم بكلام سميع بسمع بصير ببصر۔ یعنی ابو الحسن اشعری کہتے ہیں کہ خداوند عالم علم و قدرت، حیات و ارادہ اور سمع و بصر کے ذریعہ عالم و قادر، حی و مرید اور سمیع و بصیر ہے خلاصہ یہ کہ ذات علیحدہ ہے اور صفات علیحدہ ہیں حضرات آئمہ معصومین علیہم السلام نے اس نظریہ فاسدہ کی بڑی شد و مد کے ساتھ رد فرمائی ہے۔ حسن بن خالد بیان کرتے ہیں۔ سمعت علی بن موسی الرضا علیهما السلام يقول لم يزل الله تبارك وتعالى قادرا حيا قديما سميعا بصيرا فقلت له يا بن رسول الله ان قوما يقولون انه عزّ وجل لم يزل عالما بعلم وقادرا بقدرة وحيا بحياة وقديما

بقدم وسمیعًا بسمع وبصیرًا ببصر فقال علیہ السلام من قال بذلک ودان بہ فقد اتخذ مع اللہ الھۃ اخریٰ ولیس من ولایتنا علی شیٔ ثم قال علیہ السلام لم یزل اللہ عزّوجلّ عالمًا قادرًا حیًا قدیمًا۔ سمیعًا۔ بصیرًا بذاتہ تعالیٰ عما یقول المشرکون والمشبھون علوًّا کبیرًا (بحار الانوار ج ۲) میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہمارا پروردگار ہمیشہ سے عالم و قادر وحی و قیوم اور سمیع و بصیر رہا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ فرزند رسولؐ! کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خداوند عالم علم و قدرت حیات و قدم اور سمع و بصر کے ذریعہ عالم و قادر، حی و قدیم اور سمیع و بصیر ہے۔ آنجناب نے فرمایا جو شخص اس کا قائل ہے۔ اور اسے اپنا دین قرار دیتا ہے۔ اس نے گویا خدا کے ساتھ اور بہت سے معبود بنا لئے ہیں اور اسے ہماری ولایت کے ساتھ کوئی تعلق و واسطہ نہیں ہے۔ پھر فرمایا۔ خداوند عالم ہمیشہ سے بذاتہ عالم و قادر۔ حی قدیم اور سمیع و بصیر رہا ہے مشرک اور تشبیہ دینے والے لوگ جو کچھ کہتے ہیں۔ خدا کی ذات اس سے کہیں بلند و بالا ہے۔ تو اس نظریہ کی اجمالی تو تو کلام معصوم میں آگئی ہے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اگر صفاتِ باری کو زائد بر ذات تسلیم کیا جائے تو یہ دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ صفات ہمیشہ سے اس میں ہوں گی یا بعد میں اس میں پیدا ہوئی ہوں گی۔ پہلی صورت میں تعدد قدما لازم آئے گا یعنی جتنی صفتیں مانی جائیں گی اتنے ہی اور قدیم ماننے پڑیں گے جو قدیم ہونے میں خدا کے شریک ہوں گے حالانکہ قدیم ایک ہی ہے اور دوسری صورت میں دو خرابیاں لازم آئیں گی اول یہ کہ اس کی ذات محلِ حوادث قرار پائے گی۔ اور یہ واضح ہے کہ جو ذات محلِ حوادث ہو۔ وہ واجب الوجود اور قدیم نہیں ہو سکتی۔ دوم یہ کہ اس سے لازم آئے گا کہ وہ ان صفات کے پیدا ہونے سے پہلے ان اوصافِ حمیدہ سے عاری ہو۔ یعنی نہ عالم ہو اور نہ قادر نہ حی ہو اور نہ سمیع و بصیر جو ذات ایسی ہو وہ ناقص ہوگی۔ اور اپنی تکمیل میں محتاجِ غیر۔ لہٰذا ایسی ذات معبود و مسجود اور واجب الوجود نہیں ہو سکتی۔ بنا بریں ماننا پڑے گا کہ صفاتِ کمالیہ حقیقیہ عین ذات ہیں۔ نہ زائد بر ذات و ہو المقصود اس تمام طویل سمع خراشی کا خلاصہ یہ نکلا کہ صفات کے ذریعہ سے بھی ذاتِ باری کی کنہ حقیقت معلوم نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ جب یہ صفات عین ذات ہیں تو یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ جس طرح ذات کی کنہ تک ہمارے عقول و افہام کی رسائی ناممکن ہے۔ اسی طرح ان صفات کی تہ تک بھی رسائی محال ہے۔

زہے ذاتے صفاتش عین ذات است ۔۔۔ عقول از درک آں ہیہات ہیہات

ہاں مختلف مظاہر صفات جلال و جمال کو دیکھ کر ان کے موصوف با کمال کا اجمالی تصور ضرور ہو جاتا ہے اور یہی مقدارِ معرفت ہمارے لئے کافی بھی ہے۔ ۶۔

عباراتنا شتی وحسنک واحد ۔۔۔ فکل الی ذاک الجمال یشیر

خداوند عالم کی صفاتِ کمالیہ غیر محدود ہیں

مذکورہ بالا حقائق سے ایک اور امر بھی واضح و آشکار ہو

جاتا ہے۔ وہ یہ کہ خداوند عالم کی صفاتِ کمالیہ غیر محدود اور بے شمار ہیں۔ کیونکہ جب یہ محقق و مبرہن ہو گیا کہ اس کی صفات حقیقیہ عین ذات ہیں۔ اور یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ خالق عالم کی ذات غیر محدود ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی صفات بھی یقیناً غیر محدود اور غیر منحصر ہوں گی۔ علاوہ بریں اور ۲ طریقہ سے بھی اس مطلب کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اولاً۔ اس طرح کہ ان صفات کا ثبوت موجبِ کمال اور ان کی نفی باعثِ نقص ہے۔ اور چونکہ خداوند عالم ہر کمال سے متصف اور ہر نقص سے منزہ و مبرا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کمالِ باری غیر محدود ہے۔ لہٰذا صفات کمال غیر محدود ہوں گی۔

ثانیاً۔ اس طرح کہ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صفاتِ ثبوتیہ کی بازگشت صفاتِ سلبیہ ہی کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ علماء محققین کی تحقیق ہے اور حضرت مصنف علام کا بھی یہی نظریہ ہے جیسا کہ دوسرے باب میں بیان ہوگا۔

عرفوا اضافاتاً وسلباً

والحقیقة لیس توجد

ابھی اُوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ ذاتِ احدیت کی طرح صفاتِ ذاتیہ کی کنہِ حقیقت تک بھی ہماری رسائی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے عقول و افہام علم و قدرتِ باری اور اس کی حیات اور سمع و بصر وغیرہ صفاتِ جلیلہ کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ان صفات کے اثبات سے درحقیقت مقصود ان صفات کے اضداد کی نفی کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا عالم ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جاہل نہیں ہے۔ اور جب یہ کہتے ہیں کہ وہ قادر ہے تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عاجز نہیں ہے۔ وعلی ہذا القیاس۔ ع وبضدھا تتبین الاشیاء۔ اور چونکہ اعدام و سلوب غیر محدود اور غیر متناہی ہیں۔ اس لئے صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ بھی غیر محدود ہوں گی۔ وھو الحق الحقیق بالاتباع۔ بایں ہمہ جو کچھ کتب کلامیہ میں مشہور ہے وہ یہ ہے کہ صفاتِ ثبوتیہ آٹھ ہیں۔ اور اسی طرح صفات سلبیہ بھی آٹھ ہیں۔ غالباً سب سے پہلے جناب محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے تجرید میں یہ نظریہ قائم کیا اور بعد حضرت علامہ حلی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتب کلامیہ میں اس کی تائید و تشئید فرمائی۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ اسے شہرتِ عام حاصل ہو گئی۔

باوجود صفاتِ کمالیہ کے غیر محدود ہونے کے صرف آٹھ صفات میں انحصار کی وجہ؟

باوجود صفاتِ کمالیہ کے غیر محدود ہونے کے اس انحصار کی بظاہر دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔

اول۔ یہ کہ ان حضرات کا مقصد صرف صفاتِ ذاتیہ حقیقیہ کا بیان کرنا مقصود ہے۔ دیگر صفات مثل خالق و رازق وغیرہ جو صفات اضافیہ محضہ اور صفاتِ فعلیہ ہیں ان کا بیان کرنا مقصود نہ تھا۔

دوم۔ یہ کہ عند التامل دیگر تمام صفات کی بازگشت انہی آٹھ صفات کی طرف ہوتی۔ یہی صفات اصل الاصول

اور مرکزی صفات ہیں۔ بلکہ اگر مزید غور و تامل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام صفات کی بازگشت فقط دو صفات (علم و قدرت) کی طرف ہوتی ہے۔ کما لا یخفیٰ علی اولی الابصار۔ بلکہ اگر اس سے بھی زیادہ دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو تمام صفات کی بازگشت واجب الوجود کی طرف ہے جیسا کہ حضرت شہید ثانی علیہ الرحمۃ کی تحقیق انیق ہے فیکفی فی معرفتہ تعالیٰ اعتقاد وجوب وجودہ وعلمہ وقدرتہ بل اعتقاد وجوب وجودہ فتامل خدائے تعالیٰ کی معرفت کی بابت اتنا اعتقاد رکھنا کافی ہے کہ وہ واجب الوجود اور عالم و قادر ہے بلکہ صرف اس قدر عقیدہ رکھنا ہی کافی ہے کہ وہ واجب الوجود ہے۔

علمائے محققین نے اس مقام پر پوری پوری دادِ تحقیق دی ہے۔ اور بڑے شد و مد کے ساتھ صفات باری کا غیر محدود ہونا ثابت کیا ہے۔ بالخصوص فقیہ نبیہ حکیم الاسلام جناب شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء مرحوم نے الدین والسلام۔ میں اس موضوع پر بہت عمدہ اور سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ بہرکیف تاسیًا بالعلماء وجریًا علی منو الھم۔ ہم بھی ذیل میں چند صفاتِ ثبوتیہ اور سلبیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ساتھ ان کے ثبوت پر چند اجمالی دلائل و براہین بھی پیش کریں گے۔

چند صفاتِ ثبوتیہ کا بیان

پہلی صفت خدا قادر ہے عاجز نہیں۔

اس صفت جلیلہ کے اثبات پر چند ادلّۂ عقلیہ و نقلیہ قائم ہیں۔

دلیل اوّل۔ خود ذاتِ احدیت کا ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ (خدا ہر چیز پر قادر ہے)

دلیل دوم۔ عاجز ہونا نقص اور قادر ہونا کمال ہے۔ اور چونکہ خداوند عالم ہر نقص سے مبرّا اور ہر کمال سے متصف ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔

دلیل سوم۔ بغیر قدرتِ کاملہ کے صانع و خالقِ عالم ہونا محال ہے لیکن چونکہ اس کا صانع عالم ہونا مسلم ہے لہٰذا اسے قادر علی الاطلاق بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

دلیل چہارم۔ عجیب و غریب آثار قدرت کا وجود خالق کی قدرت کاملہ کی بیّن اور واضح دلیل ہے۔

دلیل پنجم۔ اس کا دوسروں کو قدرت عطا کرنا خود اس کے قادر ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ کیونکہ فاقد شئے معطی شئ نہیں ہو سکتا۔

دلیل ششم۔ انبیاء و اوصیاء اور آسمانی کتب ما اس کے قادرِ مطلق ہونے پر اتفاق ہے۔ اور ان کا یہ اتفاق بوجہ ان کی عصمت کے حجت ہے۔ مخفی نہ رہے کہ انہی بیاناتِ شافیہ سے خداوند عالم کی قدرت کا عام ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو بعض نظریاتِ فاسدہ ہیں۔ ان کا بطلان بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً حکماء کہتے ہیں الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد۔ ایک ہستی سے ایک ہی چیز صادر ہو سکتی ہے۔ ثنویہ یہ کہتے ہیں کہ خدا شر پر قادر

نہیں۔ اور نظام یہ کہتا ہے کہ خدا امر قبیح پر قدرت نہیں رکھتا۔ اسی طرح بلخی اور جبائی اور راگ الاپتے ہیں۔ پہلا نظریہ فاعل موجب و مضطر کے بارے میں ہے جیسے آگ سے صرف حرارت اور برف سے برودت صادر ہوتی ہے لیکن خداوند عالم چونکہ فاعل مختار ہے۔ لہٰذا اس پر یہ قاعدہ منطبق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دوسرے نظریاتِ فاسدہ کا فساد و بطلان بھی واضح و عیاں ہے۔ کیونکہ مسلّم قاعدہ ہے کہ جب مقتضی موجود ہو اور مانع مفقود تو مقتضی اپنا اثر کرتا ہے یہاں مؤثر و مقتضی خدائے قادر و مختار کی ذات والا صفات ہے۔ اس میں کوئی نقص و عجز ہے نہیں۔ اور تمام مقدورات میں بوجہ امکان ذاتی اثر قبول کرنے کی استعداد موجود ہے۔ پھر خالق کے ہر شئے پر قادر ہونے سے کیا چیز مانع ہے؟ ہاں یہ اور بات ہے کہ قدرت رکھتے ہوئے بھی خدا بعض اُمور مثل شرور و قبائح کو بجا نہیں لاتا لیکن قدرت رکھتا اور ہے۔

(۲) خداوند عالم عالم ہے جاہل نہیں۔ اس کا علم ہر شئی کو محیط ہے۔ وہ ہر کلی اور جزئی امر کا عالم ہے۔ خلقتِ اشیاء سے پہلے اسے اسی طرح ان کا علم ہوتا ہے۔ جس طرح خلقت کے بعد ہوتا ہے۔ اس امر کے چند اجمالی دلائل یہ ہیں۔

دلیل اوّل۔ آیاتِ قرآنیہ میں جیسے وھو بکل شئی علیم۔ خدا ہر شئے کا علم رکھتا ہے۔ لا یخفی علی اللہ خافیۃ۔ خدا پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ ولا یعزب عن ربک من مثقال ذرۃ فی الارض ولا فی السّماء۔ تمہارے پروردگار سے کائنات کا کوئی ذرہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

دلیل دوم۔ علم صفت کمال اور جہل صفتِ نقص ہے۔ اور چونکہ خالق عالم ہر صفتِ کمال سے متصف اور ہر نقص و عیب سے خالی ہے۔ لہٰذا اسے عالم تسلیم کرنا ضروری ہے۔

دلیل سوم۔ اس کی مخلوق میں گوناگوں قسم کی حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے یہ اس کے کمال کی بیّن دلیل ہیں۔ غیر عالم ایسی محکم و متقن اشیاء ہرگز پیدا نہیں کر سکتا۔

دلیل چہارم۔ دوسروں کو علم و فضل عطا کرنا خود اس کے علیم و خبیر ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

دلیل پنجم۔ چونکہ خداوند عالم ہر چیز کا خالق ہے۔ قل اللہ خالق کل شئی۔ تو یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کا علم نہ ہو۔ انہی دلائل سے بعض فلاسفہ کے اس قول کا بطلان ظاہر ہو جاتا ہے کہ خدا کو جزئیات کا علم نہیں ہے۔ (معاذ اللہ)

تیسری صفت (خداوند عالم مختار ہے مجبور و مضطر نہیں ہے) وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے جو نہیں چاہتا نہیں کرتا۔ وہ اپنے افعال و اعمال میں اس طرح مجبور نہیں ہے۔ جیسے آگ جلانے میں۔ آفتاب چمکنے میں اور پانی بہنے میں۔ ذیل میں اس مطلب پر چند اجمالی عقلی و نقلی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔

دلیل اوّل۔ ارشاد قدرت ہے۔ وربک یخلق ما یشاء ویختار۔ ویفعل اللہ ما یشاء۔ تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منصب نبوت و امامت کیلئے اختیار فرماتا ہے اور خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے

دلیل دوم ۔ مجبور و مضطر ہونا نقص ہے لہذا ذاتِ ایزدی میں کسی نقص کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے برخلاف فاعلِ مختار ہونا کمال ہے۔ لہذا خداوند عالم کو یقیناً مختار ہونا چاہیے جو کہ ہر کمال کا مرکز ہے۔

دلیل سوم ۔ اگر خدا تعالیٰ کو فاعل مختار نہ مانا جائے بلکہ اُسے فاعل موجب و مضطر تسلیم کیا جائے تو تین خرابیوں میں سے ایک خرابی ضرور لازم آئے گی یا تو عالم کا قدیم ہونا لازم آئے گا کیونکہ فاعل مضطر کا اثر اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ جیسے آتش سے حرارت علیحدہ نہیں ہو سکتی یا خدا کا حادث ہونا کیونکہ وہ عالم میں مؤثر ہے۔ اور جب اثر حادث ہے تو اس کا موثر بھی حادث ہوگا یا علتِ تامہ سے معلول کی علیحدگی و جدائی لازم آئے گی اور جب یہ تینوں شقیں بالبداہت باطل ہیں۔ لہذا خالق عالم کو فاعل مختار ماننا پڑے گا۔

دلیلِ چہارم ۔ جو ادلّہ و براہین خدا کے قادر ہونے کے سلسلہ میں قائم کئے گئے ہیں وہی دلائل اس کے مختار ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ فاعل مجبور کو قادر نہیں کہا جا سکتا۔ کما لایخفیٰ۔

چوتھی صفت (خداوند عالم زندہ ہے) وہ ازل سے زندہ ہے۔ اور ابد تک زندہ رہے گا۔ اسے کبھی فنا و زوال نہیں ہے۔ اس امر کے اثبات کے لئے چند ادلّہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

دلیل اوّل ۔ خود اس کا ارشاد ہے۔ **هو الحی القیوم۔ کل من علیها فان ویبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام۔ کل شی هالک الا وجهه۔**

دلیل دوم ۔ جب اس کا عالم و قادر ہونا ثابت ہو چکا تو اس سے بالبداہت اس کی حیات بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ علم و قدرت حیات کی فرع ہے۔ بغیر حیات کے ان کا وجود ناممکن ہے۔

دلیل سوم ۔ عالم میں ہر وقت ہونے والے نئے نئے تغیرات و تبدلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حیّ و قیوم کے قبضۂ قدرت میں نظامِ کائنات کی زمام ہے۔ **تبارک الذی بیدہ الملک وکل یوم هو فی شان**

دلیل چہارم ۔ موت، جسم و روح کے باہمی ربط و تعلق کے خاتمہ کا نام ہے یا بالکل مادی نقطۂ نگاہ سے اجزاء جسم کے پریشان ہونے کو موت سمجھا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب	موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

بہرکیف چونکہ ذاتِ احدیت جسم و جسمانیات سے منزّہ و مبرّا ہے جیسا کہ صفاتِ سلبیہ میں اس امر کو مبرہن کیا جائے گا تو پھر اسے موت کیسے آ سکتی ہے؟۔

پانچویں صفت (خداوند عالم مدرک ہے) ادراک سے ان چیزوں کا علم مراد ہے جو بذریعہ حواس معلوم ہوتی ہیں۔ بالفاظ دیگر اس سے جزئیات کا علم مراد ہے۔ بہرحال علم عام ہے اور ادراک خاص۔ اسی بنا پر خدا کے مدرک ہونے کو علیحدہ صفت شمار کیا گیا ہے۔ اس مطلب کے اثبات پر یہاں ایک عقلی اور دوسری سمعی دلیل کی طرف اشارہ

کیا جاتا ہے۔

دلیل اوّل۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔ خدا کو آنکھیں نہیں درک کرسکتیں ہاں وہ آنکھوں کو درک کرسکتا ہے کیونکہ وہ لطیف و خبیر ہے۔

دلیل دوم۔ جب اسے ہر چیز کا علم ہے جیسا کہ اوپر ثابت کیا جاچکا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے بغیر حواس ان چیزوں کا بھی ضرور علم ہوگا۔ جو بذریعہ حواس معلوم ہوتی ہیں۔ نیز جب وہ ہر چیز کا کامل علم رکھتا ہے تو اس میں جس طرح کلیات شامل ہیں۔ اسی طرح ہر شے میں جزئیات بھی داخل ہیں لہٰذا اسے عالم جزئیات تسلیم کرنا پڑے گا۔

چھٹی صفت (خداوند عالم صادق ہے کاذب نہیں ہے) اس کا ہر قول و فعل صدق و راستی پر مبنی ہے۔ اس میں کذب و افتراء کا شائبہ تک نہیں ہے اس پر مندرجہ ذیل دلائل دلالت کرتے ہیں۔

دلیل اوّل۔ خود اس کا ارشاد ہے ان اللہ لا یخلف المیعاد۔ خداوند عالم وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ قل صدق اللہ اے میرے حبیب! کہہ دو کہ خدا سچ کہتا ہے۔

دلیل دوم۔ جھوٹ بولنا فعل قبیح ہے۔ اور خدا کا دامن ربوبیت تمام قبائح و شنائع کی آلودگیوں سے منزہ و مبرا ہے۔

دلیل سوم۔ اس نے اپنے کلام حمید میں جھوٹوں پر لعنت کی ہے۔ و لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ تو اب اگر آپ ہی جھوٹ کا ارتکاب کرے تو خود بھی اس لعنت کی زد میں آجائے گا (معاذ اللہ)

دلیل چہارم:۔ صدق و راستی کمال ہے اور خداوند عالم ہر لحاظ سے کامل اور ہر کمال سے متصف ہے۔ لہٰذا اسے صادق ماننا لازمی ہے۔

دلیل پنجم۔ جھوٹ کا ارتکاب جہالت یا عجز کی وجہ سے کیا جاتا ہے یعنی یا تو جھوٹ بولنے والے کو اس بات کے جھوٹ ہونے کا علم نہیں ہوتا۔ یا کسی ذاتی غرض کے لئے جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور خداوند عالم نہ جاہل ہے اور نہ عاجز۔ لہٰذا اس کے متعلق ارتکاب کذب کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا ہے اس لئے لامحالہ اسے صادق تسلیم کرنا پڑے گا۔ وھو المطلوب۔

ساتویں صفت۔ (خداوند عالم قدیم ہے حادث نہیں ہے) وہ ازلی و ابدی اور سرمدی ہے۔ ہر شے سے اوّل اور ہر شے کے آخر ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔ حضرت باقر العلوم علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ وہ کب سے ہے؟ فرمایا۔ متی لم یکن حتی اخبرک متی کان۔ وہ کب نہ تھا۔ تاکہ میں تجھے بتاؤں کہ وہ فلاں وقت سے ہے۔ اس پر چند اجمالی دلائل ملاحظہ ہوں۔

دلیل اوّل۔ ارشاد قدرت ہے۔ ھو الاوّل والاخر والظاھر والباطن۔ وہ اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے نیز فرمایا ہے۔ وما نحن بمسبوقین۔ یعنی ہم سے پہلے کوئی شے نہ تھی۔

دلیل دوم ۔ اگر اس کی بھی کوئی ابتدا ہو، اور اس پر کسی وقت عدم طاری ہو سکتا ہو تو یہ خدا بھی کسی موثر و خالق کا محتاج ہوگا ۔ جو اسے عدم سے نکال کر عرصۂ وجود میں لائے ۔ لہٰذا وہ واجب الوجود نہیں رہے گا ۔ حالانکہ وہ واجب الوجود ہے ۔

دلیل سوم ۔ اگر ازلی نہ ہو تو محتاج صانع ہوگا جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے اور جو محتاج غیر ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا کیونکہ احتیاج ممکن ہونے کی علامت ہے ۔

دلیل چہارم ۔ یہ امر مسلّم ہے کہ جو ازلی ہو وہ ابدی ضرور ہوتا ہے ۔ یعنی جس کی ابتداء نہ ہو ۔ اُس کی انتہا بھی نہیں ہوتی کیونکہ کسی چیز کو فنا و زوال اس لئے لاحق ہوتا ہے کہ اس کی علتِ فاعلی ختم ہو جاتی ہے یا علت فاعلی اپنا فیض قطع کر لیتی ہے ۔ اور جس ذات کی کوئی علت ہی نہ ہو ۔ اس کے لئے فانی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

دلیل پنجم ۔ واجب الوجود کہتے ہی اس کو ہیں جس کا وجود ذاتی اور اصلی ہو ۔ اور جس کا وجود ذاتی اور اصلی ہو ۔ اس کے لئے عدم یقیناً محال ہوتا ہے ۔ اور جس کے لئے عدم محال ہو وہ یقیناً ازلی اور ابدی ہوگا ۔ وھو المطلوب ۔

آٹھویں صفت (خداوند عالم مرید ہے مکرہ و مجبور نہیں) خداوند عالم جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے وہ اپنے افعال و اقوال میں مجبور نہیں ہے ۔ وہ فعال لما یرید کا مصداق ہے ۔ نیز وہ اپنے بندوں سے اعمال صالحہ بجا لانے کو پسند اور برے اعمال کو ناپسند کرتا ہے ۔ جو دلائل خداوند عالم کے فاعل مختار ہونے کے سلسلہ میں پیش کئے گئے ہیں وہی دلائل اس کے مرید و کارہ ہونے پر پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ فلا نطیل الکلام بالتکرار

تنبیہ ۔ مخفی نہ رہے کہ ہم نے بنا بر مشہور ارادہ کو صفاتِ ذاتیہ میں شمار کیا گیا ہے ورنہ ہماری ذاتی تحقیق دیگر بعض علماء محققین کی طرح یہ ہے کہ ارادہ صفاتِ فعلیہ میں سے ہے ۔ جیسا کہ ہم اس امر پر باب ششم میں تبصرہ کریں گے انشاء اللہ

نویں صفت (خداوندِ عالم متکلم ہے) خداوند عالم کے متکلم ہونے پر چند دلائل قاطعہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔

دلیل اوّل ۔ خود اس کا ارشاد ہے ۔ و کلم اللہ موسیٰ تکلیما ۔ خدا نے جناب موسیٰ سے کلام کیا ۔ و منھم من کلم اللہ ۔ انبیاء میں سے بعض وہ ہیں جن کے ساتھ خدا نے کلام کیا ۔

دلیل دوم ۔ جب تک من جانب اللہ خطاب و کلام نہ ہو ۔ اس وقت تک غرض خلقت کا اظہار و ابراز ممکن نہیں ہے ۔

دلیل سوم ۔ قرآن مجید اور دیگر کتب سماویہ اور احادیث قدسیہ سب کلام اللہ ہونے پر شاہد عادل موجود ہیں ۔

دلیل چہارم ۔ چونکہ اظہارِ مقصد کے لئے کلام کرنا ایک کمال ہے ۔ اور خداوند عالم چونکہ ہر کمال سے مزیّن و متصف ہے ۔ لہٰذا اسے متکلم ماننا ضروری ہے لیکن یہ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ کے متکلم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بھی

ہماری طرح کلام کرتا ہے کیونکہ کلام حروف و اصوات سے مرکب ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ عرض ہے۔ اور قائم بالغیر سب ہیں حادث ہے۔ اور جس کے ساتھ حادث قائم ہوگا وہ محلِ حوادث ہوگا۔ اور جو محلِ حوادث ہو وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ممکن الوجود اور حادث ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابھی صفاتِ سلبیہ کے ذیل میں اس کی وضاحت کی جائے گی۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ خدا کے متکلم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ جس چیز میں چاہے کلام پیدا کر دیتا ہے۔ جس طرح کوہ طور پر درخت میں کلام پیدا کر کے حضرت موسٰے کو شرف ہمکلامی بخشا تھا۔ نیز واضح رہے کہ کلام حادث ہے اور صفات فعل میں سے ہے

دسویں صفت (خداوند عالم سمیع و بصیر ہے) بلا بغیر کان اور آنکھ کے ہر آواز کو سنتا اور ہر قابلِ دید شے کو دیکھتا ہے۔ اس پر بالاختصار دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔

دلیل اوّل۔ جیسا کہ خود اس کا ارشاد ہے۔ لیس کمثلہ شیٔ و ھو السمیع البصیر۔ کوئی چیز خدا کے مانند نہیں ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے۔ ان اللہ کان سمیعًا بصیرا۔

دلیل دوم۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ مخلوق میں سمع و بصر (سننے اور دیکھنے) کی صفت پائی جاتی ہے۔ تو اگر خالق میں یہ صفت موجود نہ ہو تو لازم آئے گا کہ خالق ناقص اور مخلوق کامل ہے۔ علاوہ بریں قرآن شاہد ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے چچا آذر کو بتوں کی پوجا پاٹ سے یہ کہہ کر روکا تھا کہ یا ابت لم تعبد ما لا یسمع و لا یبصر و لا یغنی عنک شیئا۔ تم ایسی چیز کی پرستش کیوں کرتے ہو جو نہ سن سکتی ہے اور نہ بول سکتی ہے۔ اور نہ ہی تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معبود ایسا ہونا چاہیے جو سن بھی سکتا ہو اور دیکھ بھی سکتا ہو۔ اور نفع و نقصان بھی پہنچا سکتا ہو۔ اگر معبود برحق سمیع و بصیر نہ ہوتا تو آذر پلٹ کر کہہ سکتا تھا کہ اے ابراہیم تمہارا معبود بھی تو سمیع و بصیر نہیں ہے اس طرح جناب ابراہیم کی دلیل ختم ہو جاتی مگر آذر کا یہ ایراد نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ ابراہیم جس معبود کی پرستش کی دعوت دے رہے ہیں اس میں یہ نقص نہیں ہے ہاں یہ یاد رہے کہ اس کے سمیع و بصیر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کان سے سنتا اور آنکھ سے دیکھتا ہے۔ ورنہ وہ صاحب اجزاء ہونے کی وجہ سے مرکب ہو جائے گا۔ اور جو مرکب ہو وہ حادث و ممکن ہوتا ہے لہٰذا واجب الوجود نہیں رہے گا۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ بغیر سمع و بصر کے سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے۔

گیارہویں صفت (خداوند عالم حکیم ہے) اس کے تمام افعال مبنی بر حکمت ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی فعل یا قول عبث و بے فائدہ نہیں ہوتا۔ اس مطلب پر یہ چند اجمالی دلائل دلالت کرتے ہیں۔

دلیل اوّل۔ خود اس کا ارشاد ہے۔ کان اللہ عزیزًا حکیما۔ ۔ ۔ ۔ واللہ علیم حکیم ۔ ۔ ۔ افحسبتم انما خلقناکم عبثا و انکم الینا لا ترجعون۔ کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں عبث و بے فائدہ پیدا کیا ہے اور کیا تم ہماری بارگاہ میں پلٹ کر نہیں آؤ گے؟

دلیل دوم۔ عبث و بے فائدہ کام کرنا نقص و عیب ہے۔ اور خالق کا دامن تقدس ہر نقص و عیب سے پاک و صاف ہے۔

دلیل سوم۔ حکیم و علیم ہونا کمال ہے اور واجب الوجود کے لئے ہر کمال کا جامع ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اسے حکیم ماننا پڑے گا۔

دلیل چہارم۔ کائناتِ عالم میں بے شمار رموز و اسرار اور مصالح و حکم کا پایا جانا ان کے خالق و صانع کے حکیم مطلق ہونے کی ناقابلِ رد دلیل ہے۔

بارھویں صفت۔ (خداوند عادل ہے) وہ نہ کبھی کسی اچھے کام کو ترک کرتا ہے، نہ کبھی کسی برے کام کا ارتکاب کرتا ہے، نہ کبھی کسی قسم کا ظلم و ستم کرتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی بے انصافی کرتا ہے۔ اس کی تفصیل اگرچہ افعال العباد میں متن کے اندر آرہی ہے مگر یہاں بھی اس کے عادل ہونے پر چند قطعی دلائل و براہین کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

دلیل اول۔ رب العباد کا ارشاد ہے۔ شهد الله انه لا اله الّا هو والملٰئكة واولوا العلم قائمًا بالقسط۔ انّ الله ليس بظلّام للعبيد۔ وما يظلم ربك احدا۔ وما الله يريد ظلما للعباد۔ خداوندِ عالم ظلم کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔

دلیل دوم۔ خدا نے دوسروں کو عدل و انصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ انّ الله يامر بالعدل والاحسان۔ اعدلوا هو اقرب للتقوىٰ۔ اگر خود اس پر عمل پیرا نہ ہو۔ تو معاذ اللہ خود میاں فضیحت و دیگراں را نصیحت کا مصداق بن کر اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسكم کی زد میں آجائے گا۔ تعالى الله عن ذلك علوًّا كبيرا

دلیل سوم۔ اس نے ظالموں پر لعنت کی ہے۔ ولعنة الله على الظالمين۔ عدل نہ کرنے کی صورت میں یہ لعنت معاذ اللہ خود اس کی ساحت قدس تک پہنچ جائے گی۔

دلیل چہارم۔ ظلم و ستم اور بے انصافی فعل قبیح ہے اور خداوند عالم کی رداء کبریائی تمام شرور و قبائح کی آلائشات سے پاک و صاف ہے۔ کیونکہ اگر وہ فعلِ قبیح کا ارتکاب کرے تو حقیقت حال چار حال سے خالی نہیں ہے (۱) یا تو وہ اس کے قبح سے ناواقف ہوگا (۲) یا عالم۔ مگر اس کے ترک کرنے سے عاجز (۳) یا اس کے بجالانے کی طرف محتاج (۴) یا ترک پر قادر بھی ہوگا اور بجاآوری پر مجبور بھی نہ ہوگا۔ مگر ویسے بلا فائدہ اس کا ارتکاب کرے گا اور یہ تمام صورتیں باطل ہیں کیونکہ پہلی صورت میں اس کا جاہل ہونا لازم آتا ہے۔ حالانکہ وهو بكل شئ عليم کا مصداق ہے اور دوسری صورت میں اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا۔ حالانکہ وہ على كل شئ قدير ہے۔ اور تیسری صورت میں اس کا محتاج غیر ہونا لازم آئے گا۔ حالانکہ وہ غنی مطلق ہے۔ وانّ الله لغنى عن العالمين۔ اور چوتھی صورت میں اس کا عبث کار ہونا لازم آئے گا۔ حالانکہ ابھی اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ حکیم علی الاطلاق ہے۔ لہٰذا لامحالہ اسے عادل ماننا پڑے۔

دلیل پنجم ۔ عدل و انصاف صفتِ کمال ہے ۔ لہٰذا واجب الوجود کا اس سے متصف ہونا ضروری ہے ۔
بنظرِ اختصار انہی چند صفاتِ ثبوتیہ کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے ورنہ ع سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے ۔

چند صفاتِ سلبیہ کا بیان

ان صفات کو صفاتِ جلال بھی کہا جاتا ہے ۔ جس طرح صفاتِ ثبوتیہ کو صفاتِ جمال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ صفاتِ سلبیہ سے مراد وہ صفات ہیں جو شانِ خداوندی کے لائق نہیں ہیں ۔ کیونکہ ان کا پایا جانا باعثِ نقص و عیب ہے ۔ اور وہ اپنی ربوبیت ہر عیب و نقص سے منزہ و مبرا ہے ۔ اور یہ صفات بھی مثل صفاتِ جمال (ثبوتیہ) کے غیر محدود ہیں ۔ مگر ہم بنظرِ اختصار ذیل میں ان میں سے چند صفات کا ان کے ثبوت کے چند اجمالی دلائل و براہین سمیت تذکرہ کرتے ہیں ۔

پہلی صفت (خداوند عالم مرکب نہیں ہے) اس کے نہ اجزاءِ خارجیہ ہیں ۔ جیسے انسانی بدن مثلاً ہاتھ ، پاؤں سر اور آنکھ ، کان وغیرہ اجزاء سے مرکب ہے ۔ اور نہ ہی اس کے اجزائے ذہنیہ ہیں جیسا کہ مثلاً انسان جنس و فصل (حیوان و ناطق) سے مرکب ہے ۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل قائم کئے جا سکتے ہیں ۔

دلیل اوّل ۔ اگر اسے مرکب مانا جائے تو وہ اپنے اجزاء کا محتاج ہوگا اور جو محتاجِ غیر ہو وہ ممکن ہوتا ہے ۔ نہ واجب الوجود ۔ واجب کی شان تو غنائے مطلق ہے ۔

دلیل دوم ۔ اگر اسے مرکب فرض کیا جائے تو اس کے اجزاء دو حال سے خالی نہ ہوں گے یا واجب ہوں گے یا ممکن اور یہ دونوں صورتیں باطل ہیں ۔ کیونکہ اگر ان کو واجب فرض کیا جائے تو ترکیبِ حقیقی حاصل نہ ہوگا ۔ کیونکہ مرکب حقیقی میں اجزاء کا ایک دوسرے کی طرف محتاج ہونا ضروری ہوتا ہے ۔ اور یہ احتیاج شانِ واجب کے خلاف ہے اور اگر محتاج ہوں تو پھر وہ اجزاء واجب نہ رہیں گے ۔ اور اگر ممکن ہوں تو اجزاءِ ممکنہ کا مجموعہ بھی ممکن ہوگا وہ واجب کس طرح ہو سکتا ہے ؟

دلیل سوم ۔ ہر مرکب کسی نہ کسی مرکب (ترکیب دہندہ) کا محتاج ہوتا ہے جو اس کے اجزاء کو مناسب مقدار اور مناسب محل میں ترکیب دے ۔ لہٰذا اگر خدا مرکب ہو تو اس کے لئے کوئی موجد و مرکب تسلیم کرنا پڑے گا اس طرح وہ خدا جسے خدا مانا تھا خدا نہیں رہے گا ۔

دلیل چہارم ۔ اگر اسے مرکب فرض کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس کا وجود اجزاء کے وجود کے بعد ہے ۔ کیونکہ ہر مرکب اجزاء کے بعد وجود میں آتا ہے ۔ حالانکہ اوپر صفاتِ ثبوتیہ میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ خداوند عالم قدیم ہے وہ ہر شے سے پہلے ہے ۔ اس پر کوئی چیز سابق نہیں ہے ۔ بنا بریں بنا بریں حقائق تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ مرکب نہیں ہے ۔ بلکہ بسیط محض ہے ۔ نیز انہی بیانات سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جب خدا کے اجزاءِ ذہنیہ (جنس و فصل) بھی نہیں ہیں تو اس کی حقیقی تعریف نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ حدِ تام جنس و فصل قریب سے مرکب ہوتی ہے ۔ کما برھن علیہ فی الکتب المنطقیۃ

دوسری صفت (خداوند عالم جسم نہیں رکھتا)

اس امر کے بعض دلائل یہ ہیں۔

دلیل اوّل۔ جو دلائل و براہین خداوند عالم کے مرکب نہ ہونے پر دیئے گئے ہیں۔ وہی دلائل اس کے جسم و جسمانی نہ ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں کیونکہ عند التحقیق ہر جسم مرکب ہوتا ہے۔ لہذا جو دلائل خدائے عزّوجل کے مرکب ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ وہی دلائل اس کی جسمیت کی نفی پر بھی دال ہیں۔

دلیل دوم۔ ہر جسم کسی نہ کسی مخصوص مادہ و صورت کی طرف محتاج ہوتا ہے۔ اور جو محتاج ہو وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتا۔

دلیل سوم۔ ہر جسم اپنے تحقق اور وجود میں زمان و مکان کا محتاج ہوتا ہے۔ اور یہ احتیاج نقص اور علامت امکان ہے۔ اور شانِ واجب الوجود کے منافی ہے۔

دلیل چہارم۔ متعدد روایاتِ معتبرہ میں خدا کے جسم کی نفی وارد ہوئی ہے۔ اُصول کافی میں حمزہ بن محمد سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں عریضہ لکھا جس میں خدا تعالےٰ کے جسم و صورت کے بارے میں سوال کیا تھا آپ نے جواباً تحریر فرمایا۔ سبحان من لیس کمثلہ شیء وھو لا جسم ولا صورۃ پاک ہے وہ ذات جس کی کوئی مثل و نظیر نہیں۔ وہ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ صورت۔

تیسری صفت (خداوند عالم جوہر و عرض نہیں ہے)

جوہر سے مراد وہ ممکن ہے جو اپنے وجود میں موضوع کا محتاج نہ ہو۔ بالفاظ سہل و سادہ جو خود بخود قائم ہو۔ اور عرض سے مراد وہ ممکن ہے جو اپنے وجود میں کسی موضوع کا محتاج ہو۔ بالفاظ دیگر قائم بالغیر ہو۔ جیسے رنگ و بو وغیرہ۔ مندرجہ ذیل دلائل خدا کے جوہر و عرض ہونے کی نفی کرتے ہیں۔

دلیل اوّل۔ جوہر و عرض ممکن کے صفات میں سے ہیں۔ اور خدا واجب الوجود ہے۔ لہذا اگر وہ جوہریت و عرضیت کے ساتھ موصوف ہو تو اس کا ممکن ہونا لازم آئے گا۔

دلیل دوم۔ جوہر اپنے کمال میں عرض کا اور عرض اپنے وجود میں جوہر کا محتاج ہوتا ہے اور یہ احتیاج ممکن کے خواصّ آثار میں سے ہے۔ جو محتاج ہو وہ کبھی واجب الوجود نہیں ہو سکتا کیونکہ واجب تو اِنّ اللہ لغنیّ عن العالمین کا مصداق ہوتا ہے۔

دلیل سوم۔ جوہر جسم ہوتا ہے اور ابھی خدا کا جسم ہونا باطل کیا جا چکا ہے اور عرض لازم جسم ہے لہذا خدا تعالےٰ نہ جوہر ہو سکتا ہے اور نہ عرض۔ لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر۔

دلیل چہارم۔ جناب شاہزادہ عبد العظیم حسنی والی روایت میں وارد ہے انہ لیس بجسم ولا صورۃ ولا عرض ولا جوھر بل ھو مجسم الاجسام و مصور الصور و خالق الاعراض والجواھر (ترجمہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ) خداوند عالم نہ جسم رکھتا ہے اور نہ صورت۔ اور وہ نہ جوہر ہے اور نہ عرض بلکہ وہ جسموں کو جسم اور صورتوں کو صورت بنانے والا اور اعراض و جواہر کا خالق ہے۔

چوتھی صفت (خداوند عالم محل حوادث نہیں ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم پر وہ حالات طاری نہیں ہوتے جو مخلوق پر طاری ہوتے رہتے ہیں جیسے خواب و بیداری۔ جوانی و پیری۔ حرکت و سکون اور صحت و مرض وامثالہا اور اس پر مندرجہ ذیل دلائل دلالت کرتے ہیں۔

دلیل اوّل۔ یہ تمام امور جسم و جسمانیات کے لوازم و آثار میں سے ہیں۔ اور چونکہ خداوند عالم جسم و جسمانیات سے منزّہ و مبرّا ہے۔ لہٰذا وہ محلِ حوادث نہیں ہو سکتا۔

دلیل دوم۔ ان حالات و عوارض سے متصف ہونا دلیل نقص و کمزوری ہے۔ اور خداوند عالم ہر نقص وعیب سے پاک ہے۔

دلیل سوم۔ یہ سب اُمور خدائے بزرگ و برتر کے مخلوق ہیں۔ لہٰذا خالق اپنی مخلوق سے ہرگز متصف نہیں ہو سکتا۔

دلیل چہارم۔ چونکہ یہ اُمور حادث ہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ ایک وقت میں یقیناً نہ تھے۔ اس لئے خدا تعالےٰ اس وقت ان سے یقیناً متصف بھی نہ ہوگا۔ اب ان کے وجود کے بعد اگر اسے ان سے متصف فرض کیا جائے تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ان سے متصف ہونا باعث کمال ہوگا یا موجب نقص۔ اور یہ دونوں صورتیں یہاں ناممکن ہیں۔ پہلی صورت میں دو خرابیاں لازم آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک وقت خدا کو اس کمال سے خالی و عاری تسلیم کرنا پڑے گا حالانکہ اس کے تمام کمالات بالفعل ہوتے ہیں وہ کسی وقت بھی کسی کمال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس طرح اس کا تحصیل کمال میں محتاج غیر ہونا لازم آئے گا۔ اور دوسری صورت کا بطلان بھی واضح ہے کہ جن اُمور سے اتصاف موجب نقص ہو۔ وہ ذاتِ باری کے لئے کیونکر روا ہو سکتے ہیں۔ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ۔

پانچویں صفت (خداوند عالم کسی چیز میں حلول نہیں کرتا) خداوند عالم کسی شے میں اس طرح حلول نہیں کرتا جس طرح کوزے میں پانی یا جسم میں روح۔ جیسا کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ کے متعلق اور صوفیہ عرفاء و اولیا کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور اس پر چند قطعی دلائل قائم ہیں۔

دلیل اوّل۔ حلول کرنے والا اپنے محل کا محتاج ہوتا ہے۔ اور یہ احتیاج ممکن کے خواص سے ہے۔ واجب الوجود کسی چیز کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

دلیل دوم۔ جو چیز کسی چیز میں حلول کر جائے دوسری جگہ اس کے وجود سے خالی ہو جاتی ہے حالانکہ خداوند عالم لامکان ہے۔ اور علمی احاطہ کے اعتبار سے ہر جگہ موجود ہے۔

دلیل سوم۔ جس چیز کے حالات میں تبدیلی واقع ہو جائے وہ زوال پذیر ہوتی ہے لہٰذا اگر خدا کے لئے حلول ممکن ہو اور آج کسی چیز میں اور کل کسی چیز میں حلول کرے تو وہ فانی ہو جائے گا حالانکہ وہ ازلی اور ابدی ہے۔ اس کے لئے فنا و زوال ناممکن ہے۔

دلیل چہارم۔ حلول میں حال کے لئے جوہر یا عرض ہونا ضروری ہے۔ جوہر کی مثال تو اُوپر مذکور ہے۔ اور عرض کی مثال یہ ہے۔ جیسے پھول میں خوشبو یا آگ میں حرارت۔ حالانکہ اُوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ خدا کی ذات جوہر و عرض ہونے سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ لہٰذا اس کے لئے حلول کرنا بھی ناممکن ہوگا۔

چھٹی صفت (خداوند عالم کسی شے کے ساتھ متحد نہیں ہوتا) جیسا کہ بعض فرقہائے باطلہ اپنے رہبروں اور بزرگوں کے متعلق یہ نظریہ فاسدہ رکھتے ہیں کہ خدا اُن کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے اور اس حالت میں وہ یہ راگ الاپتے ہیں ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ت   اکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اور یہ بچند وجہ باطل ہے۔

دلیل اوّل۔ اتحاد کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ دو چیزوں کا اس طرح باہم مل کر ایک ہو جانا کہ ان کے اتحاد سے حجم میں نہ کوئی کمی واقع ہو نہ زیادتی۔ اس طرح کا اتحاد عقلاً محال و ناممکن ہے۔ لہٰذا خدا کے لئے کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

دلیل دوم۔ اگر بالفرض خداوند عالم کسی شے سے متحد ہو تو وہ دوسری شے دو حال سے خالی نہیں۔ واجب ہوگی یا ممکن؟ اگر واجب ہو تو واجب الوجود ایک سے زائد ہو جائیں گے جو کہ باطل ہے (اس کی تفصیل مبحثِ توحید میں گزر رہی ہے) اور اگر ممکن ہو تو اتحاد کے بعد جو حاصل ہوگا وہ اگر واجب ہوا تو انقلاب ممکن بواجب لازم آئے گا اور اگر ممکن ہوا تو انقلاب واجب بممکن لازم آئے گا۔ اور یہ انقلاب بالکل محال و ناممکن ہے۔ پس اتحاد کو باطل تسلیم کرنا پڑے گا۔

دلیل سوم۔ اس قسم کا اتحاد بالکل غیر معقول ہے۔ کیونکہ اگر اتحاد میں ہر دو کا وجود محفوظ ہے تو پھر دو میں اتحاد حاصل نہیں ہوا۔ اور اگر ہر دو معدوم ہو گئے۔ اور کسی تیسری چیز نے جنم لے لیا تو بھی اتحاد نہ ہوا۔ اور اگر ایک موجود ہے اور دوسرا معدوم تو اس صورت میں بھی اتحاد ثابت نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ اتحاد ناقابلِ قبول اور ناقابلِ فہم ہے۔ اس لئے محال اور ناممکن ہے۔

دلیل چہارم۔ اور اگر اتحاد کے مجازی معنی مراد لئے جائیں کہ کون و فساد کے ذریعہ ایک چیز کا دوسری چیز بن جانا جیسے پانی کا بخار بن جانا تو اسی معنیٰ کے اعتبار سے بھی خداوند عالم کے لئے اتحاد ناممکن ہے اس لئے اس کے لئے کون و فساد (بننا اور بگڑنا) محال ہے کیونکہ یہ امر صفاتِ ممکن میں سے ہے۔

ساتویں صفت (خداوند عالم محتاج نہیں ہے) خداوندِ عالم اپنی ذات و صفات میں کسی زمان یا مکان یا آلات و اسباب یا کسی وزیر و مشیر کا محتاج نہیں ہے بلکہ تمام کائنات اس کی محتاج ہے۔ اور وہ سب سے مستغنی و بے نیاز ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل دلالت کرتے ہیں۔

دلیل اوّل۔ خود اس کا ارشاد ہے۔ انتم الفقراء الی اللہ واللہ الغنی الحمید۔ تم سب خدا کے محتاج ہو مگر وہ سب سے بے نیاز ہے۔ ان اللہ لغنی عن العالمین۔ خداوند عالم تمام کائنات سے بے نیاز

ہے۔ اللہ الصمد۔ اللہ بے نیاز مطلق ہے۔

دلیل دوم۔ احتیاج ممکن کے خواص و آثار میں سے ہے۔ واجب الوجود ہوتا ہی وہ ہے جو سب سے بے نیاز ہو۔ اگر وہ محتاج غیر ہو تو واجب نہیں رہے گا۔ بلکہ ممکن بن جائے گا اور یہ ناممکن ہے۔

دلیل سوم۔ اگر وہ کسی غیر کا محتاج ہو تو وہ غیر خدا بننے کا زیادہ حقدار ہوگا بہ نسبت اس محتاج کے خدا ہونے کے لہٰذا اس طرح جسے خدا تسلیم کیا ہے۔ اس کی خدائی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

دلیل چہارم۔ احتیاج غیر نقص و عیب ہے۔ اور خداوند عالم تمام نقائص و عیوب سے منزہ و مبرا ہے اور بے نیاز ہونا صفتِ کمال ہے۔ اور خداوندِ عالم صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ محتاج غیر نہیں ہے۔

آٹھویں صفت (خداوندِ عالم متحیز نہیں ہے) اور اس کا کوئی مخصوص مکان نہیں ہے۔ وہ مکان و زمان کی قید سے آزاد ہے۔ اس کے چند بعض دلائل یہ ہیں۔

دلیل اوّل۔ مکان کی احتیاج اُسے ہوتی ہے جو جسم یا جسمانی ہو۔ لیکن چونکہ وہ جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ لہٰذا اس کے لئے مکان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دلیل دوم۔ احتیاج مکان علامتِ امکان ہے۔ اور واجب الوجود کا دامن قدس اس کی آلائش سے صاف ہے۔

دلیل سوم۔ جو چیز مکان میں ہو اس کے لئے حرکت و سکون لازم ہوتا ہے۔ اور اوپر ثابت کیا جا چکا ہے۔ کہ خداوند عالم محل حوادث نہیں ہے۔

دلیل چہارم۔ اخبار اہل بیت میں اس سے مکان کی نفی کی گئی ہے چنانچہ ابی بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں آں جناب نے فرمایا۔ **انّ اللہ تبارک و تعالیٰ لایوصف بزمان ولا مکان ولا حرکۃ ولا انتقال ولا سکون بل ھو خالق الزمان والمکان والحرکۃ والسکون والانتقال تعالیٰ عما یقول الظالمون علواً کبیرا۔** (بحار ج ۲ بحوالہ امالی شیخ صدوقؒ) خداوند عالم زمان و مکان اور حرکت و سکون اور نقل و انتقال کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ زمان و مکان۔ حرکت و سکون اور نقل و انتقال کا خالق ہے وہ اس سے بلند و بالا ہے۔ جو کچھ ظالم لوگ اس کے بارے میں کہتے ہیں۔

نویں صفت (خداوند عالم صفات زائد بر ذات نہیں رکھتا) اس امر کی تفصیل اُوپر بیان ہو چکی ہے اس کا اعادہ و تکرار کر کے ہم تطویل بلاطائل کا ارتکاب نہیں کرتے۔ سطور بالا کا مطالعہ کیا جائے۔ نیز اس مطلب کی مزید وضاحت دوسرے باب کے ذیل میں کی جائے گی۔

دسویں صفت (خداوند عالم کے لئے جسمانی لذت و رنج نہیں ہے) یہ امر محتاج بیان نہیں ہے اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب وہ جسم و جسمانیات سے ہی منزہ و مبرا ہے تو پھر ہماری طرح اس کے لذائذ جسمانیہ اور خواہشات نفسانیہ

سے لذت اندوز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا:

گیارہویں صفت (خداوند عالم مرئی نہیں ہے) یعنی وہ ان ظاہری آنکھوں سے دنیا و آخرت میں دیکھا نہیں جاسکتا۔ اس مطلب پر نقلی و عقلی چند اجمالی دلائل و براہین ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں۔

دلیل اول ۔ خود اس کا ارشاد ہے۔ لاتدرکہ الابصار و ھو یدرک الابصار و ھو اللطیف الخبیر۔ آنکھیں اسے درک نہیں کرسکتیں لیکن وہ آنکھوں کو درک کرتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔ نیز جب حضرت موسیٰ نے قوم کے بے جا اصرار اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً (ہمیں کھلم کھلا خدا دکھایئے) سے مجبور ہو کر سوال رویت کیا تھا تو ان کو یہ جواب ملا تھا۔ لن ترانی اے موسیٰ تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکتے! اہل علم جانتے ہیں کہ عربی زبان میں حرف "لن" ابدی نفی کے لئے مقرر ہے۔ لہٰذا اس آیت میں ہمیشہ کے لئے رویت باری کی نفی کر دی گئی ہے۔ لہٰذا وہ نہ دنیا میں دیکھا جاسکتا ہے اور نہ آخرت میں۔

دلیل دوم ۔ کسی چیز کے دیکھنے کے لئے چھ چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) وہ چیز دیکھنے والے کی جہت مقابل میں ہو (۲) کوئی شکل و صورت رکھتی ہو (۳) کوئی رنگ بھی رکھتی ہو (۴) کسی مکان میں ہو (۵) دیکھنے والے اور اس میں زیادہ فاصلہ نہ ہو۔ اسی طرح درمیان میں کوئی چیز حائل بھی نہ ہو (۶) روشنی ہو تاریکی نہ ہو۔ بدیہی ہے کہ یہ تمام صفات جسم و جسمانیات کے ہیں۔ اور اوپر محقق و مبرہن کیا جاچکا ہے کہ خالق عالم جسم اور اس کے جملہ آثار و خواص سے منزہ و مبرا ہے۔ لہٰذا اس کے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

دلیل سوم ۔ جو چیز دیکھی جاسکے وہ محاط اور محدود ہو جاتی ہے اور خداوند عالم تو ہر چیز کو محیط ہے۔ کما قال عزوجل من قائل انہ بکل شیء محیط۔ خداوند عالم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ لہٰذا جو محیط کل ہو چیز کس طرح اس کا احاطہ کرسکتی ہے؟

دلیل چہارم ۔ ایک آدمی نے حضرت امیرالمومنین سے سوال کیا۔ یا امیرالمومنین ھل رائت ربک حین عبدتہ؟ کیا آپ نے عبادت کرتے وقت کبھی اپنے رب کا مشاہدہ کیا ہے؟ قال ویلک ما کنت اعبد ربًا لم اَرہ۔ فرمایا میں تو ایسے خدا کی عبادت کرتا ہی نہیں جسے دیکھ نہ لیا ہو۔ قال وکیف رأیتہ؟ سائل نے سوال کیا آپ نے اُسے کس طرح اور کس حال میں دیکھا ہے؟ قال ویلک لاتدرکہ الابصار بمشاھدۃ العیون ولکن رأتہ القلوب بحقائق الایمان۔ فرمایا افسوس ہے تیرے لئے اسے ظاہری آنکھیں مشاہدہ نہیں کرسکتیں بلکہ دل اسے حقائق ایمانیہ کے ساتھ دیکھتے ہیں ؎

کیف یحکی الرب ام کیف یری ۔۔۔ فلعمری لیس ذا الا فضول

بارہویں صفت (خداوند عالم ہرگز کسی فعل قبیح کا ارتکاب نہیں کرتا) اور اس کے دلائل اوپر خداوند عالم کے عادل ہونے کے ضمن میں بیان کئے جاچکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے وہاں رجوع کیا جائے۔

تیرہویں صفت (خداوند عالم بے مثل و بے مثال ہے) یعنی پوری کائنات میں کوئی چیز اس کے مشابہ و مانند نہیں ہے اور نہ کوئی شئی اس کی ہمسر و نظیر ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل دلالت کرتے ہیں۔

دلیل اوّل ۔ خود اس کا ارشاد ہے۔ لیس کمثلہ شئی۔ کوئی چیز اس کی مثل و مانند نہیں ہے۔ ولم یکن لہ کفواً احدا۔ کوئی اس کا ہمسر و نظیر نہیں ہے۔

دلیل دوم ۔ یہ امر بدیہی ہے کہ ہر صانع اپنی مصنوع اور ہر خالق اپنی مخلوق کے ہر لحاظ سے مغایر ہوتا ہے۔ اور چونکہ کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے لہٰذا خدائے عزوجل ان میں سے کسی بھی شے کے ساتھ مشابہ نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی ہے فرمایا۔ ان کل ما تصورہ احد فی عقلہ او وھمہ او خیالہ فاللہ سبحانہ غیرہ وورائہ لانہ مخلوق والمخلوق لا یکون من صفات الخالق (ہدایۃ الموحدین بحوالہ شرح اصول کافی) ہر وہ چیز جو کسی کے عقل یا وہم یا خیال میں سما سکے۔ اللہ سبحانہ اس کے علاوہ اور اس کے ماوراء ہے۔ کیونکہ عقل و وہم میں آنے والی چیز مخلوق ہے۔ اور کوئی مخلوق اپنے خالق کے مشابہ نہیں ہو سکتا ہے۔ کئی روایات میں وارد ہے کہ ھو شئی لا کالاشیاء خداوند ایک شے ضرور ہے۔ مگر وہ دوسری اشیاء کی مانند نہیں ہے (اصول کافی)

فھو لا کیف ولا این لہ ۔۔۔ وھو رب الکیف والکیف یحول

اس کی نہ کوئی کیفیت ہے اور نہ اس کے لئے کوئی مکان ہو سکتا ہے۔ وہ تو کیفیت و مکان کا رب ہے۔ لہٰذا وہ ان سے متصف کیونکر ہو سکتا ہے۔

جل ذاتاً وصفاتاً وعلا ۔۔۔ وتعالیٰ ربنا عما نقول

جو کچھ ہم بیان کرتے ہیں اس سے اس کی ذات اور اس کی صفات اجل وارفع ہیں۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ۔۔۔ وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

ازالۂ شبہ ۔ انہی حقائق سے ایک شبہ کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے جو اس مقام پر بعض کم فہم حضرات کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ ایسے خدا کے وجود کا کیونکر اقرار کیا جا سکتا ہے کہ جو جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ اور آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ عقل و وہم میں اس کی کیفیت نہیں آ سکتی۔ اس کی کنہ حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ مگر بایں ہمہ علم و قدرت وغیرہ صفات جلیلہ کے ساتھ متصف ہے؟ اگرچہ سابقہ مباحث میں اس قسم کے شبہات کے مفصل جوابات دئے جا چکے ہیں تاہم چونکہ اس شبہ میں قدرے جدت و تنوع ہے۔ اس لئے یہاں بالاختصار اس کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے جب یہ مسلّم و محقق ہو چکا ہے کہ اس عالم میں امکان و حدوث کے جملہ آثار و خواص پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی بدیہی امر ہے کہ کوئی حادث و ممکن بغیر کسی محدث و موجد کے عرصۂ ہستی میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا عقل سلیم مجبور کرتی ہے کہ اس عالم کے لئے کوئی ایسا موثر و موجد ہونا ضروری ہے۔ جس میں ممکن یا حادث کے آثار و علامات موجود نہ ہوں اسی موجد و موثر

کائنات کا نام خدا ہے۔ اگرچہ اس کی حقیقت تک ہماری عقلوں کی رسائی نہ ہو سکے۔ جس طرح انسان ایک عمدہ قسم کی گھڑی دیکھ کر یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کا ایک بنانے والا ضرور ہے۔ جو صنعتِ ساعت سازی میں کامل دستگاہ رکھتا ہے۔ لیکن اگر اس کے ایسے بعض اوصاف جو گھڑی سازی میں دخل نہیں رکھتے۔ اس کو معلوم نہ ہو سکیں مثلاً یہ کہ اس کا رنگ سفید تھا یا سیاہ۔ اس کا قد دراز تھا یا کوتاہ۔ وہ جوان تھا یا بوڑھا۔ تو اس بنا پر اس کے موجود اور کامل صناع ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ بعینہ اسی طرح عجائب و غرائب سے مملو و مشحون اس عالم کو دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا ایک ایسا صانع و خالق ضرور موجود ہے جو ہر کمال سے متصف اور ہر نقص وعیب سے منزہ و مبرا ہے۔ اب اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس کی اصل حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ تو اس سے اس کے موجود ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وھذا اوضح من ان یخفی۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من   خاک بر فرقِ من و تمثیل من!

اس عالم میں ہزار ہا چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں ہے۔ جو چیزیں سب سے زیادہ انسان کے قریب ہیں جیسے... عقل، فہم، نفس اور روح۔ اسے ان کی حقیقت کا بھی علم نہیں ہے۔ اسی لئے حدیث میں وارد ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

این منک الروح فی جوھرھا   ھل تراھا او تری کیف تجول

اے معرفت خدا کے دعویدار ذرا یہ تو بتا کہ روح اپنی حقیقت کے اعتبار سے تیرے کس عضو میں ہے۔ کیا تو نے کبھی اسے دیکھا ہے یا اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ وہ کس طرح جولان کرتی ہے۔

چودھویں صفت (توحید کا بیان) خداوند عالم واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے

نہ ذات میں نہ صفات میں نہ افعال میں اور نہ عبادت میں۔ چونکہ وہ ہر اعتبار سے واحد و یکتا ہے اور یہی خالص توحید اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ کیونکہ خداوند عالم کی ہستی کا اجمالی اقرار و اعتقاد تو تمام مذاہب میں پہلے بھی موجود تھا اور اب بھی ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں موجود ہے۔ ولئن سألتھم من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن اللہ۔ اگر تم کفار سے دریافت کرو کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے ان میں اگر کوئی نقص ہے۔ تو وہ توحید کا ہے۔ ان میں یا تو توحید سرے سے ہے ہی نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو وہ ناقص ہے۔ کوئی ثنویت کے مخمصہ میں مبتلا ہے اور کوئی تثلیث کے غیر معقول معمہ میں الجھا ہوا ہے اور کوئی اس سے بھی زیادہ معبودوں کی عبادت کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جو کچھ کد و کاوش اور وحشت ہے وہ صرف عقیدۂ توحیدِ خالص سے ہے چنانچہ ارشادِ قدرت ہے اذا دعی اللہ وحدہ کفرتم وان یشرک بہ تؤمنوا واذا ذکر اللہ وحدہ اشمازت قلوب الذین لا یؤمنون بالآخرۃ (پ ۲۴ سورہ مؤمن ع ۲) جب خدائے واحد کو پکارا جاتا ہے تو تم انکار کر دیتے ہو اور اگر اس کے ساتھ کوئی شریک قرار دے دیا جائے تو تم اقرار کر لیتے ہو۔ اور جب

قال الشیخ الربانی ابو جعفر محمد | اس رسالہ شریفہ کے مصنف شیخ جلیل عالم ربانی و فقیہ صمدانی ابو جعفر محمد

خدائے وحدہٗ لاشریک کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تو ان لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر کفار مکہ کی نگاہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اگر کوئی بڑا جرم تھا تو یہی کہ وہ ان کے متعدد خداؤں کو نظر انداز کر کے صرف ایک خدا کا کلمہ پڑھانا چاہتے تھے۔ خلاق عالم نے ان کی اس ناراضی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ اجعل الالہۃ الہا واحدا ان ھذا الشئ عجاب (پ۲۳ سورہ ص ع ۱۰) کیا اس رسول نے متعدد خداؤں کو فقط ایک خدا بنا دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ بہر حال جیسی صاف اور نکھری ہوئی توحید اسلام نے پیش کی ہے ایسی خالص توحید کسی مذہب نے پیش نہیں کی۔ دیگر مذاہب میں یا تو توحید فی الذات ہی کا فقدان ہے۔ اور اگر توحید ذاتی ہے تو توحید فی الصفات ندارد۔ اور اگر توحید فی الصفات ہے تو توحید فی الافعال عنقا ہے۔ اور اگر بالفرض وہ موجود ہے تو توحید فی العبادت کا قحط ہے۔ بہر صورت ان کی توحید ناقص ہے۔ قالت الیھود عزیر ابن اللہ و قالت النصاری المسیح ابن اللہ ذلک قولھم بافواھم یضاھئون قول الذین کفروا من قبل۔ یہودی کہتے ہیں عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصرانی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ لوگ سابقہ کفار کے قول کی برابری کرتے ہیں۔

مجوسی یزدان و اہرمن دو خداؤں کے قائل ہیں۔ آریہ سماج اگرچہ دوسرے ہندوؤں سے کم ہی تاہم وہ خدا، مادہ اور روح تینوں کو قدیم تسلیم کر کے نئی قسم کی تثلیث کے قائل ہوئے ہیں۔ اسلام نے خالص توحید پر اس قدر زور دیا ہے کہ شرک کو ناقابل معافی جرم قرار دے دیا جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذلک لمن یشاء۔ خداوند عالم شرک کو (بلا توبہ) ہرگز معاف نہیں کرتا۔ اور اس کے علاوہ جو گناہ ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ جناب جابر بن عبداللہ انصاری آں حضرت سے نقل کرتے ہیں۔ فرمایا من مات یشرک باللہ دخل النار۔ جو شخص اس حال میں مرے کہ وہ شرک کرتا تھا وہ داخل جہنم ہوگا۔ (بحار الانوار ج ۲ عقاب الاعمال صدوق) شرک سے اجتناب کرنا اس قدر محبوب خدا فعل ہے کہ اس سے جنت حاصل ہو جاتی ہے۔

چنانچہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ من مات ولم یشرک باللہ شیئا دخل الجنۃ۔ جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس نے کسی چیز کو خداوند عالم کا شریک قرار نہ دیا ہو۔ وہ بلاشبہ داخل جنت ہوگا۔ (توحید شیخ صدوق) اور حقیقی موحدین کا مقام حضرت امام جعفر صادق یہ بیان فرماتے ہیں کہ ان اللہ حرم اجساد الموحدین علی النار۔ خداوند عالم نے موحدین کے اجسام کو آتش جہنم پر حرام کر دیا ہے۔

(توحید صدوق۔ بحار ج ۲ مجلسی)

حضرت امام رضا علیہ السلام اپنے آباء و اجداد طاہرین کے سلسلۂ سند سے آں حضرتؐ سے روایت کرتے ہیں۔

التوحید ثمن الجنۃ ۔جنت کی قیمت توحید ہے (روضہ بحار الانوار)

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کے جنتی ہونے پر قسم یاد فرمائی ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسیؒ عقائد و امالی کے حوالہ سے بحار الانوار ج ۲ میں ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت نے فرمایا۔ **والذی بعثنی بالحق بشیرا لا یعذب اللہ بالنار موحدًا ابدًا وان اھل التوحید لیشفعون فیشفعون** مجھے اس ذات کی قسم جس نے مجھے برحق بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ خداوند عالم اہل توحید کو ہرگز آتش جہنم میں عذاب نہیں کرے گا اور یہ لوگ شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت مقبول ہوگی۔

توضیح

یہاں دو باتوں کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ جن اہل توحید کا ان احادیث میں بے حساب اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی توحید حضرات آئمہ طاہرین علیہم السلام سے ماخوذ ہے۔ نہ وہ لوگ جن کی توحید ابلیس لعین سے حاصل کی ہوئی ہے چنانچہ احمد غزالی نے کہا ہے۔ "**من لم یتعلم التوحید من ابلیس فھو زندیق**۔ جو شخص شیطان سے توحید حاصل نہ کرے۔ وہ ملحد و زندیق ہے۔

دوم یہ کہ کوئی کج فہم ان احادیث سے یہ نہ سمجھ لے کہ عقیدہ توحید کی درستی جنتی اور ناجی ہونے کے لئے کافی ہے اور عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے حضرت امام رضاؑ والی وہ حدیث پیش نظر رکھنی چاہیے جس میں آپ نے کلمۂ توحید کا ثواب بیان کرنے کے بعد فرمایا تھا۔ بشرطہا و شروطہا۔ **وانا من شروطھا**۔ یہ ثواب چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ اور من جملہ ان شرائط کے ایک شرط میری امامت کا اقرار اور میری اطاعت بھی ہے (عیون اخبار الرضاؑ)

"بہر حال اطاعتِ شیطان کے ساتھ توحید خالص کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اب ہم ذیل میں توحید ذاتی پر چند ادلّہ و براہین ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد توحید کے بعض دیگر اقسام کا مختصر تذکرہ ان کے اجمالی دلائل کے ساتھ کریں گے۔

توحید ذاتی کے دلائل و براہین، پہلی دلیل

جس طرح اس کائنات کا وجود اپنے خالق کی ہستی اور وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح اس کا نظم و ضبط اور باہمی ربط و ارتباط اور اس کا دوام و استقرار اس امر پر بھی قطعی دلالت کرتا ہے کہ اس کا خالق و مدبر ایک ہی ہے۔ جیسے اعضاء بدن۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ سر و منہ وغیرہ متعدد ہیں۔ مگر ان کا مجموعہ ایک ہی انسان ہے۔ اسی طرح ثریٰ سے ثریا تک اور آسمان سے زمین تک ہر چیز کا مناسب مقدار اور اعلیٰ و اکمل نظام پر گامزن ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس کا ناظم اعلیٰ

الفقيه المصنّف لهذا الكتاب اعلم ان اعتقادنا في التوحيد ان الله	ہیں، جاننا چاہیے کہ معرفتِ توحید کے بارے میں ہم شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ واحد و یگانہ ہے۔ کوئی چیز

ایک ہی خدائے پاک ہے۔ والشمس تجری لمستقر لها ذلك تقدير العزيز العليم۔ اگر ایک سے زائد ناظم و مدبر ہوتے تو عالم میں یہ اتحاد و یک جہتی اور یہ نظم و ضبط ہرگز نہ ہوتا بلکہ اختلاف و افتراق اور بے ترتیبی و بدنظمی کے آثار نمایاں و آشکار ہوتے۔!!

جناب ہشام بن الحکم کے سوال پر حضرت صادق آل محمد علیہ السلام نے توحید باری تعالیٰ پر اسی دلیل جمیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ہشام نے عرض کیا۔ ما الدليل على ان الله واحد۔ فرزند رسولؐ! اس بات پر کیا دلیل ہے کہ خداوند عالم ایک ہے۔؟ قال اتصال التدبير و تمام الصنع كما قال عز وجل لو كان فيهما آلهة الا الله لفسدتا فرمایا تدبیر کا اتصال و ارتباط اور صنعت کا کامل و تمام ہونا خدا کے ایک ہونے کی دلیل ہے۔ اگر ایک سے زائد خدا ہوتے تو زمین و آسمان تباہ ہو جاتے ؎

وفي كل شئ له اٰية تدل على انه واحد

توحید کی دوسری دلیل

جناب آدمؑ سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جس قدر انبیاء و مرسلین تشریف لائے سب یہی کہتے رہے کہ معبود برحق ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی وحدہ لاشریک کی توحید کا پرچار کرتے رہے، اور اسی کو منوانے کے لئے مصائب و آلام جھیلتے رہے قرآن جو خدا کا آخری پیام ہے اس میں کئی بار اعلان ہوا ہے۔ اللہ لا الٰہ الا ہو۔ اللہ کے سوا اور کوئی معبود برحق نہیں ہے اگرچہ کئی انبیاء کے ارشادات و تعلیمات قرآن مجید میں مذکور ہے۔ مگر اختصار تفصیل میں جانے سے مانع ہے، اجمالاً اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن خبر دیتا ہے۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحي اليه انه لا اله الا انا فاعبدون۔ (پ۱۷ سورہ انبیاء) اے حبیب! آپ سے پہلے جس قدر ہم نے رسول بھیجے ہر ایک کی طرف ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔ یہ قرآن سے استدلال نہیں تاکہ منکر قرآن پر حجت نہ ہو سکے بلکہ یہ ایک تاریخی مسئلہ کے ساتھ متمسک ہے کہ ہر آنے والے پیمبرؑ نے آکر یہی پیغام دیا ہے کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس سے بالبداہت یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا ایک ہی ہے۔ کیونکہ اگر اس کے علاوہ کوئی اور معبود بھی ہوتا تو اس کے بھی تو کچھ انبیاء اور نمایندے آتے اور اس کے وجود کے بھی تو بالآخر کچھ آثار نمایاں ہوتے۔ لہٰذا اس کے آثار کا فقدان اس کے نہ ہونے کا واضح برہان ہے۔ سید الموحدین حضرت علی علیہ السلام نے اسی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ واعلم يا بني لو كان لربك شريك لاتتك رسله ولرأيت آثار ملكه وسلطانه

واحد احد لیس کمثلہ شئ قدیم   اس کی مثل و مانند نہیں ہے وہ ہمیشہ سے اسی طرح رہا ہے۔ اور

ولعرفت افعالہ و صفاتہ و لکنہ واحد کما وصف نفسہ لا یضادہ فی ملکہ احد۔ اے بیٹا حسنؑ! نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تمہارے رب کا کوئی شریک ہوتا۔ تو اس کے بھی کچھ رسول تمہارے پاس آتے اور تم ضرور اس کی مملکت و سلطنت کے کچھ آثار دیکھتے اور تم اس کے افعال و صفات سے آگاہ ہوتے لیکن (چونکہ ایسا کچھ بھی نہیں لہذا) وہ ایک ہے۔ جیسا کہ اس نے اپنی توصیف کی ہے۔ اس کی حکومت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ (نہج البلاغۃ)

وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون۔

توحید کی تیسری دلیل

اگر دو خدا فرض کئے جائیں اور ہر ایک کامل القدرۃ والاختیار ہو (جیسا کہ شانِ ربوبیت ہے) اور ان میں سے ایک کا ارادہ کسی شئ کو پیدا کرنے کے متعلق ہو تو سوال یہ ہے کہ دوسرا خدا اس پہلے خدا کی مخالفت و مزاحمت پر قادر ہے یا نہیں؟ پس اگر دوسرا خدا پہلے خدا کی مخالفت پر قادر ہے۔ اور اس کے ارادہ کو ملتوی کرا سکتا ہے تو پہلا خدا بوجہ عجز و قصور خدا نہیں رہے گا۔ اور یہ قاہر و غالب خدا قرار پائے گا اور اگر دوسرا خدا پہلے خدا کی مخالفت پر قادر نہیں بلکہ اس کی موافقت و ہمنوائی کرنے پر مجبور ہے تو پھر یہ دوسرا عاجز و مجبور ہونے کی وجہ سے خدا نہیں رہ سکے گا۔ خدا پہلا ہی ہوگا۔ کیونکہ خدا کے لئے قادر و مختار اور غالب و قہار ہونا ضروری ہے۔ قل ھو ربی لا الہ الا ھو علیہ توکلت والیہ متاب۔

توحید کی چوتھی دلیل

ایک زندیق نے ایک مرتبہ حضرت صادق آلِ محمدؐ کی خدمت میں عرض کیا یہ کیوں جائز نہیں کہ ایک سے زائد خدا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ تمہارا یہ قول کہ دو خدا ہوں، تین حال سے خالی نہیں ہے یا تو دونوں قدیم اور قوی ہوں گے یا ہر دو ضعیف و ناتوان ہوں گے یا ایک قوی و توانا اور دوسرا کمزور و ناتواں ہوگا؟ اور یہ تینوں صورتیں باطل ہیں کیونکہ ہر دو مضبوط اور طاقتور ہیں تو کیوں ایک خدا دوسرے کو اپنے راستے سے ہٹا کر ربوبیت کے ساتھ منفرد نہیں ہو جاتا (کیونکہ مستقل اور بلا شریک ہونا کمال ہے) اور اگر دونوں ضعیف ہیں تو پھر خدائی کے لائق نہیں اور اگر ایک قوی اور دوسرا ضعیف ہے تو پھر خدا وہی ایک ہوگا جو قوی ہے۔ دوسرا کمزور و ناتواں خدا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں اگر دو ہوں تو وہ ارادہ و تدبیر میں یا تو ہر اعتبار سے متفق ہوں گے یا مختلف مگر جب ہم نظامِ عالم کو دیکھتے ہیں کہ وہ بڑی عمدگی سے جاری و ساری ہے۔ شب و روز کی آمد و رفت باضابطہ ہے۔ شمس و قمر کا طلوع و غروب مقررہ اوقات پر ہوتا ہے تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ مدبر و منتظم ایک ہی ہے۔ (احتجاج طبرسیؒ)

ازالہ شبہ:۔ امام عالی مقام کی یہ دلیل بہت ہی محکم و متقن ہے۔ مگر فقط یہ شبہ عاید کیا جا سکتا ہے کہ

لم یزل ولا یزال سمیعاً بصیراً علیماً حکیماً حیاً قیوماً عزیزاً قدوساً

ہمیشہ ایسا ہی رہے گا کہ بغیر کانوں کے سنتا اور بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے وہ سب کچھ جانتا ہے وہ ایسا حکیم ہے کہ اس کا کوئی کام عبث نہیں زندہ قائم و دائم ہے غالب اور پاکیزہ ہے

ممکن ہے دونوں خدا قوی و توانا ہوں۔ مگر وہ اتفاق سے ہر کام انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا ان میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اس لئے آثار میں اختلاف نہیں ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا دونوں میں سے ہر ایک کا ارادہ اور اس کی قدرتِ کائنات کی تخلیق اور اُس کے نظام کو چلانے کے لئے کافی ہے یا کافی نہیں ہے۔؟ یا ایک کا ارادہ کافی ہے۔ اور دوسرے کا ناکافی۔ اگر پہلی شق کو اختیار کیا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ معلول واحد پر دو مستقل علتیں جمع ہوں۔ اور ایک اثر کے دو مستقل موثر ہوں جو کہ محال ہے۔ علاوہ بریں جب ایک خدا تخلیقِ کائنات اور اس کے نظام کی بقا کے لئے کافی ہے۔ تو دوسرے کا وجود و عدم برابر ہوگا۔ اور جس کا وجود و عدم برابر ہو اور اس کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟ واجب الوجود تو وہ ہوتا ہے کہ سب اس کے محتاج ہوں۔ اور وہ سب سے بے نیاز ہو۔ اس کے علاوہ اس صورت میں ہر دو خدا جب ایک دوسرے کے مشورے کے محتاج اور مرضی کے پابند ہوں گے تو بوجہ احتیاج ممکن الوجود ہو جائیں گے اور دونوں واجب الوجود نہیں رہیں گے۔

اور دوسری صورت میں دونوں خدائی کے نااہل قرار پائیں گے اور تیسری شق میں خدا ایک ہی ہوگا۔ ضعیف و عاجز خدا نہیں ہو سکتا۔ قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔

توحید کی پانچویں دلیل

اگر دو خدا فرض کئے جائیں تو پھر یہ فرض کرنا بھی ممکن ہوگا کہ ایک خدا چاہتا ہے کہ ایک وقت مخصوص میں ایک چیز مثلاً زید کو پیدا کرے اور دوسرا چاہتا ہے اسے پیدا نہ کرے یا ایک چاہتا ہے کہ مثلاً زید کو مالدار بنائے۔ دوسرا اسے نادار رکھنا چاہتا ہے یا ایک زید کو مارنا چاہتا ہے اور دوسرا اسے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اب صورتِ حال تین حال سے خالی نہیں یا دونوں کا مقصد پورا ہوگا۔ اور یہ محال ہے کیونکہ اس طرح اجتماع نقیضین لازم آتا ہے۔ یا ایک اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا اور دوسرا ناکام رہے گا۔ تو ظاہر ہے کہ پھر خدا وہی ہوگا جو قادر و قوی ہوگا۔ جو مغلوب و مقہور ہو جائے وہ خدا نہیں ہو سکتا یا وہ باہم لڑتے اور جھگڑتے رہیں گے اور کسی کا بھی مقصد حاصل نہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں نظامِ عالم درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ پس جب یہ تینوں شقیں باطل ہوگئیں۔ تو اس سے ایک سے زائد خداؤں کا ہونا بھی باطل ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی دلیل جمیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا۔ اگر زمین و

عالمًا قادرًا غنيًّا	عالم و قادر ہے اور ایسا غنی ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں مگر وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اس کی ذات ایسی بے مثال ہے
لا یوصف بجوهر ولا جسم ولا صورة ولا عرض ولا خط ولا سطح ولا ثقل ولا خفة ولا سکون ولا حرکة۔	کہ اسے جوہر عرض اور جسم (جس میں طول و عرض اور عمق ہو) شکل و صورت (صورت وہ عرض ہے جو مادہ میں سمایا ہوا ہے) وخط (سطح کا وہ کنارہ جس میں فقط طول ہو) وسطح (جسم کا وہ کنارہ جس میں طول و عرض ہو مگر عمق نہ ہو) وغیرہ صفات سے متصف نہیں کیا جا سکتا (کیونکہ وہ جسم و جسمانیات سے منزہ ہے) نہ تو اس میں ثقل ہے اور نہ خفت نہ حرکت ہے نہ سکون۔

آسمان میں زیادہ خدا ہوتے تو زمین و آسمان کا سلسلہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ اب ارباب عقل و ادراک غور فرمائیں کہ أأرباب متفرقون خیر ام الله الواحد القهار۔ الگ الگ خدا بہتر ہیں یا وہ خدا جو واحد و قہار ہے۔

توحید کی چھٹی دلیل یہ حقیقت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ تخلیق کائنات اور نظام عالم کے چلانے میں منفرد و یگانہ ہونا عین کمال اور شرکت نقص ہے اور چونکہ خدا کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر کمال سے متصف اور ہر نقص سے منزہ و مبرا ہو۔ لہذا اسے واحد و یگانہ تسلیم کرنا ضروری ہے ومن یشرك بالله فقد افتری اثمًا عظیمًا۔ جو شخص شرک کرتا ہے وہ گناہ عظیم کا مرتکب ہوتا ہے۔

توحید کی ساتویں دلیل جیسا کہ دلیل دوئم میں بیان کیا جا چکا ہے جس قدر انبیاء و مرسلین آئے، سب نے خدا کا یہی پیغام لوگوں تک پہنچایا کہ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ لہذا حقیقت حال دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو ان کا بھیجنے والا (خدا تعالیٰ) اس بات میں صادق ہوگا۔ اور اس کے نمائندے بھی صادق ہوں گے۔ اس طرح مقصد توحید حاصل ہے۔ یا وہ اس سلسلہ میں معاذ اللہ کاذب ہوگا اس طرح جسے خدا تسلیم کیا تھا اس کی خدائی سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا۔ یا اس طرح ہوگا کہ اس نے تو انبیاء و مرسلین کو یہ کہا تھا کہ خدا دو ہیں۔ مگر انبیاء نے معاذ اللہ کر غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ خدا ایک ہے۔ اس صورت میں دو خرابیاں ہیں ایک یہ کہ یہ امر عصمت انبیاء کے منافی ہے حالانکہ ان کی عصمت مسلّم ہے۔ دوئم اس طرح خداوند عالم پر یہ الزام عائد ہوگا کہ اس نے معاذ اللہ جھوٹوں کی معجزات کے ساتھ تصدیق و تائید کی جو کہ شان خداوندی کے خلاف ہے۔ پس جب یہ سب صورتیں باطل ہیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا ایک ہی ہے۔ وهو المطلوب۔

توحید کی آٹھویں دلیل اگر دو خدا مانے جائیں تو یہ امر دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ان میں سے ایک ...

ولا مکان ولا زمان وانہ تعالیٰ متعال من جمیع صفات خلقہ خارج عن الحدین حد الابطال وحد التشبیہ

اور نہ زمان و مکان کی حدود اس کا احاطہ کر سکتی ہیں غرضیکہ وہ بے مثال ذات اپنی مخلوق کی تمام صفاتِ ناقصہ سے منزّہ و مبرّا ہے اور بلند و بالا ہے۔ خداوند عالم ابطال و تشبیہ کی دونوں حدوں سے خارج ہے (یعنی نہ تو وہ ایسا ہے کہ اس سے فضل و کمال کی بالکل نفی کی جائے اور نہ ہی اس کے کمال کو اس کی مخلوق کے کسی کمال سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے)

محتاج ہوگا۔ یا ہر ایک دوسرے سے بے نیاز ہوگا۔ یا ایک محتاج ہوگا اور دوسرا مستغنی و بے نیاز۔ اور یہ تینوں صورتیں باطل ہیں۔ پہلی صورت میں کوئی خدا بھی نہ رہے گا۔ کیونکہ احتیاج غیر علامت امکان اور شانِ خداوندی کے منافی ہے۔ اور دوسری صورت میں بھی کوئی معبود نہ رہے گا۔ کیونکہ خدا تو وہ ہوتا ہے جس کی طرف ہر کوئی محتاج اور ہر ایک اس کا نیاز مند ہو۔ اگر اس سے استغنا و بے نیازی ممکن ہو تو وہ خدا نہیں رہے گا۔ اور تیسری صورت میں خدا وہی ہوگا جو سب سے بے نیاز ہو اور جو محتاج و نیاز مند ہوگا وہ خدا نہ بن سکے گا۔

ان دلائل قاطعہ و براہینِ ساطعہ سے واضح و آشکار ہو گیا کہ جو لوگ ایک خدا کے علاوہ زائد معبودوں کے قائل ہیں۔ ان کے پاس سوائے محض دعویٰ کے کوئی دلیل و برہان نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربّ العباد ہے۔ ومن یدع مع اللہ الٰھاً اٰخر لا برھان لہ بہ فانما حسابہ عند ربہ انہ لا یفلح الکٰفرون (پ مومنون پ ۶)

([illegible] فرمان [illegible] کیا ہے)

توحید صفاتی کا بیان

اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کی صفاتِ حقیقیہ ذاتیہ عین ذات ہیں۔ ذات و صفات میں کسی وقت بھی تفریق و جدائی متصور نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ اس کی کما حقّہ وضاحت مباحث سابقہ میں کی جا چکی ہے۔ خداوندِ عالم کے علاوہ جس قدر مخلوق ہے ملائکہ مقربین ہوں اور خواہ انبیاء و مرسلین یا آئمہ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین سب کی صفاتِ کمالیہ زائد بر ذات ہیں۔ اس سے کسی بزرگوار حتیٰ کہ سرکارِ ختمی مرتبت کا استثنا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ آیت مبارکہ وعلمك ما لم تكن تعلم۔ وغیرہ سے ثابت ہے جس طرح ان کا وجود مسعود تخلیقِ ایزدی کا ثمرہ ہے۔ اسی طرح ان کی صفات جلیلہ بھی عطیہ موہبت الہیہ کا نتیجہ ہیں اس مرتبہ توحید میں کوئی بھی خداوندِ عالم کا شریک و سہیم نہیں ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

کچھ عرصہ ہوا ہمارا ایک مضمون بعنوان "اقسامِ توحید" بعض قومی جرائد میں شائع ہوا تھا۔ پھر پمفلٹ کی صورت میں طبع ہوا جس میں توحید کے

وانّہ تعالیٰ شئی لا کالاشیاء احد صمد لم یلد فیورث ولم یولد فیشارک ولم یکن لہ کفواً احد ولا ولا ضد ولا شبہ۔

وہ اپنی حیثیت سے ایک چیز تو ہے مگر دوسری چیزوں کی طرح نہیں - وہ یکہ و تنہا اور بے نیاز ہے اس سے کوئی پیدا نہیں ہوا کہ وہ اس کا وارث بن سکے اور نہ وہ خود کسی سے پیدا ہوا ہے تاکہ اس کی ذات و صفات میں شریک ہو سکے نہ اس کا کوئی ہمسر و نظیر ہے نہ اس کی کوئی ضد ہے اور نہ شبہ۔

توحید افعالی کا بیان

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ افعال تکوینیہ جن پر کوئی بشر من حیث البشر ذاتی طور پر طاقت و قدرت نہیں رکھتا۔ جیسے خلق کرنا رزق دینا۔ مارنا اور جلانا یا مریض کو شفا دینا یا اس قسم کے دیگر افعال تکوینیہ ان میں خداوند عالم کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں آیات و روایات حد احصا و شمار سے متجاوز ہیں۔ اس مسئلہ

اقسام و انواع پر قدرے تفصیل کے ساتھ مدلل طریقہ پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ جس کا خلاصہ سطور بالا میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس رسالہ میں ہم نے صفحہ تا صفحہ میں توحید صفاتی کا تذکرہ کرتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ خدائے تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں۔ مگر ہماری صفات زائد بر ذات ہیں بایں معنی کہ ذات و صفات میں تفکیک و تفریق موجود ہے۔ ایک وقت تھا کہ علم و قدرت و حیات وغیرہ صفات ہمیں حاصل نہ تھیں جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئاً ثم جعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون۔ قدرت نے آلات کسب و اکتساب مرحمت فرمائے جن سے یہ صفات حاصل ہوئیں۔ ۔ ۔ بعد ازاں صفات باری کی قدرے وضاحت کرکے بالآخر صفحہ پر لکھا۔ پس اس مرتبہ توحید میں کوئی خداوند عالم کا سہیم و شریک نہیں ہے۔ باقی سب مخلوقات کی صفات زائد بر ذات ہیں حتیٰ کہ اس سلسلہ میں سرور کائنات صلعم کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ آیات مبارکہ وعلمک مالم تکن تعلم ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ولکن جعلنا نوراً نھدی بہ من نشاء و علمنا من لدنا علماً اس پر دال ہیں" صفحہ۔ اس پر بعض مدعیان علم معقول نے ایک غیر معقول ایراد وارد کرتے ہوئے پہلے تو ہم پر یہ اتہام لگایا ہے کہ ہم نے جناب رسالت مآب صلعم کو بھی آیت مبارکہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون اخ والے تمیں بحالت لاعلمی پیدا کیا اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا" اور یہ کہ "اپنے دعویٰ کے ثبوت میں آیت مبارکہ ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان۔ تم نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ کو پیش کیا ہے" اس کے بعد بزعم خود ہماری غلطی ثابت کرتے ہوئے ازالہ یوں فرمایا ہے کہ صفت عین ذات اور صفت ذاتی میں فرق ہے اور پھر علم رسول کو صفت ذاتی قرار دیا ہے" جیسے جسم کے لئے طول، عرض، عمق یا شمس کے لئے صفت اشراق اور نار کی صفت احراق جو زائد بر ذات تو ہے مگر وجود میں اشراق شمس سے جدا نہیں اور احراق نار سے جدا

ولا صاحبة ولا مثل
ولا نظير ولا شريك لهٗ
لا تدركه الابصار وهو
يدرك الابصار ولا الاوهام
وهو يدركها لا تاخذه
سنة ولا نوم وهو اللطيف الخبير

نہ تو اس کی کوئی زوجہ ہے اور نہ کوئی اس کا شریک ہے اور نہ نظیر و مثیل
غرضیکہ وہ ہر حیثیت سے بے مثل اور بے مثال ہے وہ ایسا لطیف و خبیر ہے
کہ آنکھیں اسے دنیا و آخرت میں نہیں دیکھ سکتیں ہاں وہ اپنی مخلوق کی
آنکھوں کی ہر حالت سے باخبر رہتا ہے اس کی ذات ایسی بلند و بالا ہے کہ
انسانی وہم و خیال کی بلند پروازیں بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں البتہ وہ اپنے بندوں
کے دل و دماغ کے تصورات سے ہر وقت پوری طرح باخبر رہتا ہے اسکو نیند نہیں بلکہ اونگھ بھی

کی اگرچہ پوری وضاحت تو وہاں کی جائے گی جہاں تمہ رسالہ میں غلو و تفویض کے موضوع پر مصنف علام بحث کریں گے
مگر یہاں بھی بعض آیات و روایات کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ارشاد قدرت ہے ھو اللہ الخالق البارئ المصور له الاسماء الحسنیٰ (پ ۲۸ سورۂ حشر ۲۴)

نہیں۔۔۔۔ پس علم ذوات مقدسہ انبیاء و آئمہ علیہم السلام کی صفت زائد بر ذات ہے جو وجود میں ان ذوات مقدسہ
سے جدا نہیں ہے۔ —— پھر آیت مبارکہ ماکنت تدری ما الکتاب الخ کی بزعم خویش یہ تفسیر بیان کی
ہے کہ یہاں۔ قضیہ سالبہ ہے جس میں موضوع کا موجود ہونا ضروری نہیں ہوتا بلکہ موضوع کے عدم کی صورت میں بھی قضیہ سالبہ
صادق ہوتا ہے مثلاً زید لیس بقائم۔ زید کھڑا نہیں ہے اس وقت بھی صادق ہے کہ جب زید موجود ہو کھڑا نہ ہو
اور اس وقت بھی صادق ہے کہ جب زید موجود نہ ہو آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے رسول (صلعم) جس طریقہ سے وجود
ہمارا عطیہ ہے اسی طریقہ سے ایمان و علم کتاب بھی ہمارا عطیہ ہے۔ لہٰذا تم جب تم موجود نہ تھے تو نہ ایمان کو جانتے تھے اور نہ
تمہیں علم کتاب تھا۔" یہ تقریر بچند وجہ باطل ہے۔

اوّلاً۔ ہماری عبارت کو نقل کرنے میں علمی دیانت داری سے کام نہیں لیا گیا ہے ہم نے صراحتاً تو کجا
اشارۃً بھی کہیں نہیں لکھا۔ یہ آیت مبارکہ واخرجکم من بطون امھاتکم۔ جناب رسول خدا کو شامل ہے جیسا کہ
ہماری منقولہ بالا عبارت سے واضح ہے اس طرح عبارت کو غلط انداز میں پیش کر کے عمداً لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے
کی مذموم کوشش کی گئی ہے بھلا جو شخص آں حضرتؐ کو ان کے ارشاد کے مطابق کنت نبیا و آدم بین الماء والطین
خلقت آدم سے بھی پہلے درجۂ نبوت کبریٰ پر فائز جانتا ہو (احسن الفوائد صـ) اس کے متعلق یہ وہم و گمان بھی کیا جاسکتا
ہے کہ وہ آں حضرت صلعم کو اس آیت کا مشمول تسلیم کرتا ہے ہماری عبارت پر ایک سرسری نگاہ کرنے سے بھی واضح ہو جاتا ہے
کہ یہ آیت عامۃ الناس کے لئے پیش کی گئی ہے اور آں حضرت صلعم کے متعلق علمک ما لم تکن تعلم اور ما کنت
تدری ما الکتاب۔ الخ پیش ہوئی ہیں۔

ثانیاً۔ اگر اس فرق کو تسلیم بھی کر لیا جائے جو صفت عین ذات اور صفت ذاتی کے درمیان قائم کیا گیا ہے۔ تب

خالق كل شئ لا اله الا هو له
الخلق والامر تبارك الله
رب العالمين من قال بالتشبيه
فهو مشرك ومن نسب الى الامامية
غير ما وصف فى التوحيد فهو كاذب

نہیں آتی۔ ہر چیز اس کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور عبادت کے
لائق نہیں ہے پیدا کرنا اور حکمرانی کرنا اسی کا حق ہے۔ تبارک اللہ رب العالمین
جو شخص خداوند عالم کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دے وہ مشرک ہے اور جو شخص
توحید سے متعلق ان عقائد کے علاوہ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ کچھ اور
غلط عقائد شیعوں کی طرف منسوب کرے وہ جھوٹا اور الزام تراش ہے۔

ترجمہ۔ وہ اللہ پیدا کرنے والا۔ تصویر بنانے والا ہے اور اس کے لئے بہترین نام ہیں۔ اس آیت مبارکہ سے ثابت
ہوتا ہے کہ خداوند عالم ہی خالق و مصور ہے۔

(۲) اھم يقسمون رحمت ربك نحن قسمنا بينهم معيشتهم فى الحيوة الدنيا

بھی علم کو انبیاء و آئمہ کی صفت ذاتی قرار دینا مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر درست نہیں ہے۔

الف۔ جو صفت ذاتی ہے اس میں تشکیک (شدت و ضعف، زیادتی و کمی، اولیت و لا اولیت) نہیں ہوتی بلکہ یہ
تشکیک تو موصوف کے غیر ذاتی صفت کے ساتھ متصف ہونے میں ہوتی ہے جیسا کہ منطق کی علمی کتاب سلم العلوم صفحہ ۳۰
پر مرقوم ہے۔ ولا تشكيك فى الماهيات ولا فى العوارض بل فى اتصاف الافراد بها فلا تشكيك ف
الجسم ولا فى السواد بل فى اسود۔ تشکیک نہ ماہیات میں ہے اور نہ عوارض میں بلکہ افراد کے عارض کے
ساتھ متصف ہونے میں ہے۔ حالانکہ یہاں علم رسولؐ میں اضافہ اور ازدیاد کا ہونا بنص قرآنی "رب زدنی علماً" ثابت ہے

کتب احادیث میں مختلف طرق و اسناد سے علم انبیاء و آئمہ کے سال بسال ماہ بماہ ہفتہ بہ ہفتہ لمحہ بہ لمحہ ازدیاد کی بابت مستقل
ابواب موجود ہیں۔ بعد ازیں علم کو کس طرح ان حضرات کی صفت ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔

(ب) قرآن مجید میں کئی ایسی آیات موجود ہیں جن سے ذوات انبیاء اور ان کے علم کے درمیان علیحدگی اور جدائی
ظاہر ہوتی ہے جیسے وہ آیت مبارکہ جس میں حضرت یوسفؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔ ولما بلغ اشده
اتيناه حكما وعلما (پ ۱۲ س يوسف ع ۱۳) اور جب یوسفؑ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو حکم (نبوت)
اور علم عطا کیا (ترجمہ فرمان) (اور جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچ گیا ہم نے اس کو حکمت و علم عطا کیا)۔ (ترجمہ مقبول)
(مزید تفسیر و تشریح کے لئے تفسیر مجمع البیان ج ۱ ص ۵۹۳ تفسیر برہان ج ۲ ص ۲۵۵، تفسیر صافی دیکھی جا سکتی ہیں
اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے بارے میں وارد ہے۔ ولما بلغ اشده واستوى اتيناه حكما و
علما (پ ۲۰ س قصص ع ۵) اور جب موسیٰ اپنی جوانی کو پہنچے اور ہاتھ پاؤں نکال کے درست ہوگئے تو ہم
نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا (ترجمہ فرمان) (اور جب کہ موسیٰ اپنی پوری قوت کو پہنچے اور خوب ہاتھ پاؤں نکالے تو ہم نے ان
کو فیصلہ کی قوت اور علم عطا کیا) (ترجمہ مقبول) (باقی صفحہ ۱۶۲ پر)

وكل خبر يخالف ما ذكرت في التوحيد فهو موضوع مخترع وكل حديث لا يوافق كتاب الله فهو باطل وان وجد في كتب علمائنا فهو مدلس[1]

اور جن عقائد کو ہم نے توحید کے ضمن میں بیان کیا اگر کوئی روایت ان کے خلاف پائی جائے تو وہ یقیناً وضعی اور جعلی ہوگی کیونکہ جس حدیث و روایت کا مضمون کتاب خدا کے موافق نہ ہوگا وہ روایت سراسر باطل ہے اگر اس قسم کی کوئی روایت ہمارے علماء کی کتب میں موجود ہو تو وہ مدلس سمجھی جائے گی۔

(پ۲۵ سورہ زخرف ع ۹) آیا وہ تمہارے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں ہم نے زندگانی دنیا میں ان کے مابین ان کی روزی تقسیم کر دی ہے۔ اس آیت سے کالشمس فی نصف النہار واضح و آشکارہ ہوتا ہے کہ خدا ہی رازق اور قاسم رزق ہے۔

(مزید وضاحت کے لئے تفسیر صافی ص۳۱۹ مجمع البیان ج ۲ ص۲۲۴ تفسیر برہان ج ۳ ص۲۲۳ پر دیکھی جا سکتی ہے)
بعد ازیں کیونکر یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ "علم ذوات انبیاء و آئمہ علیہم السّلام سے جدا نہیں ہے۔"
(ج) آیت مبارکہ "نحن نقص علیک احسن القصص بما اوحینا الیک ھذا القران وان

---

[1] حدیث کے من جملہ ان اقسام کے جو نا قابل قبول ہیں۔ ایک قسم خبر مدلس بھی ہے۔ تدلیس دلس بمعنی تاریکی سے ماخوذ ہے چونکہ اس خبر کا کذب مخفی ہوتا ہے اس لئے اسے مدلس کہا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) تدلیس در اسناد (۲) تدلیس در شیوخ۔ تدلیس در اسناد دو طرح متصور ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ یہ روایت کرنے والا کسی ایسے معتبر آدمی سے روایت نقل کرے جس سے اس کی ملاقات ہو اور وہ اس کا ہمعصر ہو مثلاً اس طرح کہے قال فلاں یا سمعت عن فلاں حالانکہ اس نے وہ روایت بیان نہ کی ہو۔ دوم سلسلہ سند میں کوئی ضعیف راوی ہو اس کو درمیان سے نکال دے اور اس کی جگہ کسی اچھے راوی کا نام رکھ دے ایسی کارروائی سے اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ حدیث معتبر بن جائے اور تدلیس در شیوخ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے شیخ سے کوئی روایت نقل کرے مگر کسی غرض کے تحت چاہے کہ اس (شیخ) کی شناخت نہ ہو سکے۔ لہٰذا اس کے مشہور نام کی بجائے اسے کسی غیر معروف لقب یا کنیت یا شہر کی نسبت کے ساتھ یاد کرے اگرچہ ایسا کرنا بھی ناجائز ہے مگر اس پر کوئی خاص ضرر مترتب نہیں ہوتا مگر پہلی قسم کا ضرر بہت زیادہ ہے اور بوجہ ارتکاب کذب حرام ہے (ہدیۃ المحدثین ص۱۵ نہایۃ الدرایۃ ص۱۰۳) اسی قسم کی احادیث برادران ایمانی کی کتب میں بکثرت موجود ہیں جن پر ان کے اکثر عقائد و اعمال کا دارومدار ہے اور مدلسین کی جو تخریبی غرض و غایت تھی وہ مسلمانوں نے اپنی غفلت سے پوری کر دی۔ اطمینان کے لئے برادران ایمانی کی مذہبی کتب کی سیر کرنا کافی ہے۔ ہماری کتب احادیث میں اس قسم کی احادیث النادر فی حکم المعدوم کا حکم رکھتی ہیں۔ اور یہ نتیجہ ہے ہمارے علماء اعلام و محدثین عظام کی جد و جہد اور کد و کاوش کا جو انہوں نے احادیث کے جمع و ترتیب اور ان کی تصحیح میں کی ہے۔ شکر اللہ سعیہم و اجزل اجرہم۔

والاخبار التی یتوهّمها الجهّال تشبیهًا للّٰه تعالیٰ بخلقه فمعانیها محمولة علیٰ ما فی القرآن من نظائرها لان ما فی القرآن کل شئ هالك الّا وجهه ومعنی الوجه الدین والوجه الذی یؤتی اللّٰه منه ویتوجّه الیه

وہ روایات جن کے دیکھنے سے جاہلوں اور کم سواد لوگوں کو یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ ان میں، خداوند عالم کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دی گئی ہے ان کے معانی بھی وہی مراد لینے چاہییں جو اس قسم کی آیاتِ قرآنیہ کے سلسلے میں لئے جاتے ہیں مثلاً قرآنِ حکیم میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ کل شئ ھالك الّا وجھه یعنی وجہ خدا کے سوا ہر چیز فناہ ہونے والی ہے۔ اس مقام پر وجہ کے معنی دین اسلام کے ہیں یا اس وسیلہ کے بھی ہو سکتے ہیں جس کے ذریعہ سے معرفتِ خدا حاصل کی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے خدا کی طرف توجہ کی جاتی ہے بنا بریں مطلب یہ ہو گا کہ دین اسلام اور وسیلۂ خدا کے سوا باقی ہر چیز

---

(۳) اللّٰه الذی خلقکم ثمّ رزقکم ثمّ یمیتکم ثمّ یحییکم ط هل من شرکائکم

کنت من قبله لمن الغفلین ۔ اس قرآن میں ہم نے جو کچھ تمہاری طرف وحی کی اس میں سب سے اچھا قصہ (اب) ہم تم سے بیان کرتے ہیں اور پہلے تم اس سے ضرور ناواقف تھے۔

(ہم تم پر قرآن نازل کر کے تم سے ایک نہایت عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں اگرچہ تم اس سے پہلے (اس سے) بالکل بے خبر تھے (ترجمہ فرمان)

اور اس کی مانند دوسری آیات سے بھی آں حضرت کی ذات اور علم کے درمیان جدائی مترشح ہوتی ہے بنا بریں حصائق علم کو کیونکر ان کی صفت ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔

(د) یہ علم نتیجہ روح نبوتی و اماموتی ہے جسے روح القدس بھی کہا جاتا ہے اور جب یہ روح نبی و امام کی صفت ذاتی نہیں ہے بلکہ خلقت کے بعد عطا ہوتی ہے جیسا کہ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے تو جو چیز اس کی فرع ہے وہ کیونکر صفت ذاتی قرار دی جا سکتی ہے۔ انّ ھذا الّا اختلاق۔

ثالثاً۔ یہ درست ہے کہ قضیہ سالبہ جس طرح باوجود موضوع کے موجود ہونے کے صرف محمول کے انتفاء کی وجہ سے صادق ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات موضوع کے انتفاء سے بھی صادق آتا ہے مگر یہ فیصلہ کرنا کہ فلاں جگہ فلاں قضیہ سالبہ کا صدق موضوع کے انتفاء کی وجہ سے ہے یا محمول کے انتفاء کے سبب سے ہے؟ یہ ہر جگہ دلائل اور قرائن داخلیہ و خارجیہ پر غور کرنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا یہ مسئلہ خالص عقلی تو ہے نہیں بلکہ نقلی ہے۔ لہٰذا قرآن کے حقیقی مفسرین کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ آیا یہاں اس مسئلہ کی کیا نوعیت ہے؟ احادیث معصومین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حالت ایسی تھی کہ ذاتِ نبی موجود تھی مگر علم کتاب وغیرہ [illegible] تھا جیسا کہ اصول کافی [illegible] ۱۳۳ [illegible]

وفی القرآن یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود وھم سالمون والساق وجہ الامر وشدتہ

اسی طرح ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے " یوم یکشف عن ساق " (پ سورۂ قلم ع) روز قیامت " جب کشف ساق ہوگا " ۔ اور لوگوں کو سجدہ کا حکم دیا جائے گا ۔ اس مقام پر اگر ساق کا معنی پنڈلی کیوں لیا جائے جیسا کہ بعض عامہ کا خیال ہے

من یفعل من ذلکم من شئ ط سبحانہ وتعلیٰ عما یشرکون (پ سورہ الروم ع)

(بقیہ حاشیہ صـ۱۴۳)

تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث وارد ہے کہ بلی لقد کان فی حال لایدری ما الکتاب ولا الایمان حتی بعث اللہ عزوجل الروح الخ ۔ ہاں آں حضرت ایک ایسی حالت میں موجود تھے کہ انہیں علم کتاب و ایمان نہ تھا یہاں تک کہ خدا نے ان کو وہ روح عطا فرمائی جس کا آیت میں تذکرہ ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بات اس وقت کی ہے کہ جب آں حضرت کی ذات موجود تھی مگر یہ علم نہ تھا لیکن یہ ملحوظ رہے کہ یہ عالم ظاہری میں آنے سے پہلے کی بات ہے ، لہٰذا بعد ازیں بھی یہ کہنا کہ یہ قضیہ سالبہ صادق بانتفاء موضوع ہے ۔ تفسیر بالرائے نہیں تو اور کیا ہے ؟ ومن فسر القرآن برأیہ فلیتبوء مقعدہ من النار (مجمع البیان) یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد سبطین صاحب سرسوی نے مسئلہ قرأت وکتاب کے موضوع پر جس موضوع پر جناب شیخ ہروی اور علمائے لکھنو کے درمیان طویل بحث ہوئی تھی ایک مبسوط کتاب بنام کشف الاسرار لکھی ہے جس میں اس آیت پر مفصل گفتگو کی ہے اس میں انہوں نے بھی اتنا تو تسلیم کر لیا ہے کہ خلقتِ روحانی کے بعد روح نبوتی کے اتصال تک ان پر ایک حال ایسا گزرا ہے ۔ کشف الاسرار صـ۳۳ ۔ اسی لئے ہم نے بھی اصول الشریعہ صـ۳۲ پر لکھا ہے کہ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے کہ کتنا وقت اس حالت میں گزرا ۔ آیا یہ کیفیت کسی وقت میں تھی ؟ یا مکان میں یا صرف ایک حالت تھی ؟ مگر محتاط سے محتاط الفاظ میں اتنا تو اس آیت مبارکہ سے بعبارۃ النص واضح ہوتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ آنحضرت موجود تھے لیکن وحی نبوت کا سلسلہ ہنوز جاری نہ ہوا تھا ۔ وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنا ہ ھباءً منثورا

وقل للذی یدعی فی العلم فلسفۃً حفظت اشیاء وغابت عنک اشیاء

تو یہ خداوند عالم کی نسبت تشبیہ و تجسیم کا اقرار ہوگا) الخ

(۴) ام جعلوا للّٰہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم قل اللّٰہ خالق کلّ شیءٍ وھو الواحد القھار۔ (پ ۱۳ سورہ الرعد ع ۸) یا انہوں نے اللہ کے ایسے شریک مقرر کئے ہیں جنہوں نے اسی کی سی مخلوق پیدا کردی ہے کہ ان پر مخلوق کی شناخت مشتبہ ہوگئی ہو تم یہ کہہ دو کہ اللہ ہر چیز کے پیدا کرنے والا ہے اور وہ یکتا و زبردست ہے۔

(۵) امن یبدؤ الخلق ثمّ یعیدہٗ ومن یرزقکم من السّماء والارض ءالٰہ مع اللّٰہ ط (پ ۲۰ سورہ نمل ع ۱) آیا وہ کون ہے جو خلقت کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر اس کو دوبارہ پھیر دے گا۔ اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین میں سے تم کو رزق دیتا ہے کیا خدا کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟

(۶) وربک یخلق مایشاءُ ویختار۔ اور تمہارا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور منتخب کرتا ہے (پ ۲۰ سورہ قصص ع ۱۰)

(۷) ان یمسک اللّٰہ بضرّ فلا کاشف لہٗ الّا ھو ط وان یمسک بخیر فھو علی کلّ شیءٍ قدیر (پ ۷ سورۃ انعام ع ۸) اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دفع کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی خیر و خوبی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفع و نقصان کا مالک خداوند عالم ہی ہے۔

(۸) قل من ینجیکم من ظلمت البرّ والبحر تدعونہ تضرّعًا وخفیۃً لئن انجٰنا من ھذہٖ لنکوننّ من الشّٰکرین ہ قل اللّٰہ ینجیکم منھا ومن کل کرب ثم انتم تشرکون (پ ۷ سورۃ الانعام ع ۱۴) تم کہہ دو کہ خشکی اور تری کی اندھیریوں سے تم کو نجات کون دیتا ہے۔ جس سے تم رو رو کے اور چپکے دعا مانگتے ہو کہ اگر اس نے اس سے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار بن جائیں گے۔ کہہ دو کہ اللہ تم کو ان (اندھیریوں) سے اور ہر رنج سے نجات دیتا ہے۔ پھر تم (اس کا) شریک کرتے ہو۔

(۹) امن یجیب المضطرّ اذا دعاہ ویکشف السّوء ویجعلکم خلفاء الارض ءالٰہ مع اللّٰہ (پ ۲۰ سورۃ النمل ع ۱) آیا وہ کون ہے جو مضطر کی دعا قبول کر لیتا ہے جب بھی وہ دعا مانگے

اور تکلیف کو رفع کر دیتا ہے۔ اور تم کو زمین کا حاکم مقرر کرتا ہے۔ آیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔

ان آیات کریمہ سے ظاہر ہے کہ دعاؤں کا سننے والا اور مہالک سے نجات دینے والا خداوند عالم ہی ہے۔

(۱۰) الذی خلقنی فھو یھدین والذی ھو یطعمنی و یسقین ہ واذا مرضت فھو یشفین والذی یمیتنی ثم یحیین۔ (پ ۱۹ سورۃ الشعراء ع ۹) جس نے مجھے پیدا کیا پس وہی مجھے راہ بتائے گا۔ اور وہ وہی ہے جو مجھے کھانا کھلاتا ہے اور مجھے پانی پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔ اور وہ وہی ہے جو مجھے موت دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ خالق و رازق۔ محی و ممیت اور شافی خدا ہی ہے۔

(۱۱) الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العالمین (پ سورہ اعراف ع ۱۴) آگاہ رہو کہ بنانا اور حکم دینا اسی کا کام ہے اللہ کل عالموں کا پرورش کرنے والا صاحب برکت ہے۔

(۱۲) قل افاتخذتم من دون اللہ اولیاء لایملکون لانفسھم نفعا ولا ضرا (پ ۱۳ س رعد ع ۸) تم کہو کہ کیا اس کو چھوڑ کر تم نے ایسوں کو اپنا ولی بنایا ہے جو اپنے آپ کے لئے کسی نفع کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی نقصان کا۔

(۱۳) وما بکم من نعمۃ فمن اللہ (پ ۱۴ س نحل ع ۱۰) اور جو نعمت (بھی) تم کو ملی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

(۱۴) واتخذوا من دونہ آلھۃ لا یخلقون شیئا وھم یخلقون (پ ۱۸ س فرقان ع ۱۴) اور انہوں نے اسے چھوڑ کر۔۔۔۔۔۔ ایسے خدا بنا لئے ہیں جو ایک چیز بھی نہیں بناتے بلکہ خود بنائے جاتے ہیں۔

(۱۵) وخلق کل شیٔ فقدرہ تقدیرا۔ (پ س فرقان ع ۱۶) اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر اس کا ایسا اندازہ کر دیا جیسا کہ اندازہ کرنے کا حق ہے۔

(۱۶) امن خلق السموت والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنا بہ حدائق ذات بھجۃ ما کان لکم ان تنبتوا شجرھا ءالہ مع اللہ بل ھم قوم یعدلون۔ (آیا وہ کون ہے۔ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے بارونق باغات پیدا کر دئے تمہاری تو یہ طاقت نہ تھی کہ تم ان باغوں کے درختوں کو اگالو۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ارے تو نہیں) لیکن یہ لوگ ہیں کہ حق سے منحرف ہوئے جاتے ہیں۔

(۱۷) ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض لا الہ الا ھو فانی تؤفکون (پ ۲۲ س فاطر ۱۲) آیا اللہ کے سوا کوئی اور پیدا کرنے والا بھی ہے جو آسمان و زمین سے تم کو روزی دے دے سوائے اس کے کوئی معبود نہیں پھر تم کدھر بہکے چلے جاتے ہو۔ معلوم ہوا کہ رازق و خالق خدا ہی ہے۔

(۱۸) للہ ملک السمٰوٰت والارض یخلق ما یشاء یھب لمن یشاء اناثا و یھب لمن یشاء الذکور۔ آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی خدا ہی کے لئے (مسلّم) ہے وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے۔ جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے عنایت فرماتا ہے۔

معلوم ہوا کہ خالق رازق اور اولاد دینے والا خدا ہی ہے۔

(۱۹) اللہ لطیف بعبادہ یرزق من یشاء بغیر حساب (اللہ اپنے کل بندوں پر مہربان ہے جسے چاہتا ہے جس طرح چاہتا ہے) رزق عطا فرماتا ہے

(۲۰) اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر (س رعد پ ۱۳ ع ۹) اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رزق کم و زیادہ کرنا بھی قبضۂ قدرت میں ہے۔

(۲۱) قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیئ قدیر۔ (کہو) اے اللہ۔ اے سلطنت کے مالک تو جس کو چاہتا ہے سلطنت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تو ذلت دیتا ہے۔ تمام خیر و خوبی تیرے ہی ہاتھ ہے بے شک تو ہر شئی پر قادر ہے۔

اس آیت مبارکہ سے واضح ہو گیا کہ خدا ہی مالک الملک ہے اور عزت و ذلت اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے

(۲۲) ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین۔ (پ س ذاریات ع ۲)

اس آیت سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ روزی دینے والا خدا ہی ہے اور وہ بڑی قوت و طاقت والا ہے۔

توحید کا یہی وہ مرتبہ ہے جہاں پہنچ کر اکثر لوگ اپنے پیشواؤں کی محبت میں مبتلا ہو کر جادۂ اعتدال سے

روحی وھو روح مخلوقہ جعل اللہ منہا فی آدم وعیسیٰ و انما | اسی طرح آیت مبارکہ بھی ہے۔ ان تقول نفسی یاحسرتی علی ما فرطت فی جنب اللہ (پ سورہ زمر رکوع ۴) حسرت اور افسوس کرتے ہوئے

بہت جاتے ہیں۔ اور توحید افعالی کا دامن چھوڑ کر شرک کے عمیق گڑھوں میں جا گرتے ہیں۔ من حیث لا یشعرون۔ اسی لئے ہمارے ہادیانِ دین یعنی حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام نے ایسے لوگوں کے خیالات کی بڑی پرزور تردید فرمائی ہے۔ جو ان اُمور میں مخلوق کو خالق کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کی احادیث بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم باب غلو و تفویض میں ذکر کریں گے انشاء اللہ۔ یہاں فقط ایک دو احادیث شریفہ ذکر جاتی ہیں۔

(۱) حضرت امام رضا علیہ افضل التحیۃ والثنا بارگاہ خدا جلّ وعلا میں جو مناجات کرتے تھے۔ اس میں فرماتے ہیں۔ اللّٰھم لا تلیق الربوبیۃ الا بک ولا تصلح الالھیۃ الا لک فالعن النصاریٰ الذین صغروا عظمتک والعن المضاھئین الذین نسبوک بالاجسام لقولھم من بریتک اللّٰھم انا عبیدک وابناء عبیدک لا نملک لانفسنا نفعا ولا ضرا ولا موتا ولا حیوۃ ولا نشورا۔ اللّٰھم من زعم انا ارباب فنحن عنہ براء ومن زعم ان الینا الخلق وعلینا الرزق فنحن الیک منہ براء کبرائۃ عیسیٰ بن مریم من النصاریٰ اللّٰھم انا لم ندعھم الیٰ ما یزعمون فلا تؤاخذنا بما یقولون واغفرلنا ما یزعمون۔ الخ۔۔۔

بارالہا! ربوبیت تیری شان کے لائق ہے۔ اور معبود ہونے کی صلاحیت تو ہی رکھتا ہے۔ یا اللہ تو نصاریٰ پر لعنت بھیج جنہوں نے تیری عظمت و جلالت کو کم کر دیا ہے۔ اور اپنی مخلوق میں سے ان لوگوں پر بھی لعنت بھیج۔ جو نصاریٰ کے ساتھ مشابہت رکھتے ہوئے تجھے جسموں کے ساتھ نسبت دیتے ہیں۔ یا اللہ ہم تیرے بندے ہیں اور تیرے بندوں کے بیٹے ہیں۔ ہم بذاتِ خود نہ اپنے نفع کے مالک ہیں۔ اور نہ نقصان کے اور نہ موت و حیات کے اور نہ حیات بعد الموت کے یا اللہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے۔ کہ ہم رب ہیں۔ پس ہم اس سے بیزار ہیں۔ اور جو شخص یہ گمان کرے کہ ہم خلق کرتے اور ہم رزق دیتے ہیں تو ہم اس سے اس طرح بیزار ہیں۔ جیسے جناب عیسیٰ علیٰ نبینا و آلہ و علیہ السلام نصاریٰ سے بیزار ہیں۔ بارالہا جو کچھ یہ لوگ گمان کرتے ہیں۔ ہم نے ان کو اس کی دعوت نہیں دی۔ اس لئے تو ہم سے ان کے بد عقیدہ کا مواخذہ نہ کر۔ اور جو کچھ یہ گمان کرتے ہیں تو ہمیں اس کی معافی دے (عیون اخبار الرضا)

ان بزرگواروں کو وسیلہ اور شفیع ماننے کا صحیح مفہوم وہی ہے جو جناب امام صاحب العصرؑ نے بیان فرمایا ہے

قال روحی کما قال بیتی وعبدی و جنبی ای مخلوقی و ناری وسمائی و ارضی وفی القران بل یداہ مبسوطتان یعنی نعمۃ الدنیا

ایک شخص کہے گا کہ میں نے خداوند کریم کے جنب یعنی پہلو میں کوتاہی سے کام لیا ہے۔ اس مقام پر جنب اور پہلو سے مراد اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ (۲) ایک اور جگہ فرمایا۔ "ونفخت فیہ من روحی" میں نے آدم علیہ السلام میں اپنی روح کو پھونکا اس سے مراد خداوند عالم کی پیدا کردہ روح مراد ہے جس سے آدم و عیسیٰ علیہما السلام کو پیدا کیا گیا تھا خداوند پاک نے روح کو جو اپنی طرف نسبت دی ہے تو وہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اس نے دوسرے مقامات پر میری زمین میرا آسمان، میرا

چنانچہ احتجاج علامہ طبرسیؒ میں احمد بن دلال سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیعوں میں مسئلہ تفویض کے متعلق نزاع بہت زور پکڑ گئی۔ بعض حضرات یہ کہتے تھے کہ خداوند عالم نے یہ اُمور حضرات معصومینؑ کے سپرد کئے ہیں، اور بعض اس کی نفی کرتے تھے۔ ایک مردِ مومن نے کہا کہ تم آپس میں کیوں جھگڑتے ہو۔ اور جناب محمد بن عثمان حضرت امام زمانہؑ کے نائب خاص کی طرف کیوں رجوع نہیں کرتے ہو سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور جناب شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض مدعا کیا۔ جناب شیخ نے اس مسئلہ کو حضرت صاحب الزمانؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ جس کا ناحیہ مقدسہ سے یہ جواب باصواب برآمد ہوا۔ ان اللّٰہ خلق الاجسام و قسم الارزاق لانہ لیس بجسم ولا حال فی جسم انہ سمیع بصیر فاما الائمۃ فیسئلون فیخلق و یسئلونہ فیرزق اجابۃ لمسئلتھم و اعظاما لشانھم یعنی اللہ عزوجل نے ہی جسموں کو پیدا کیا ہے۔ اور اسی نے ہی ان کا رزق تقسیم کیا ہے۔ کیونکہ نہ تو وہ جسم ہے۔ اور نہ ہی کسی جسم میں حلول کرتا ہے بتحقیق وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ باقی رہے آئمہ طاہرینؑ سو وہ خدا تعالےٰ سے سوال کرتے ہیں۔ پس وہ خلق فرماتا ہے۔ اور یہ اس سے سوال کرتے ہیں اور وہ رزق عطا فرماتا ہے وہ ان کے سوال کو پورا کرتے ہوئے اور ان کی شان و شوکت کو بڑھاتے ہوئے ان کے سوال یعنی شفاعت کو مسترد نہیں فرماتا۔

توحید عبادتی کا بیان

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ مقام عبادت میں کسی کو خداوند عالم کا شریک قرار نہ دیا جائے جیسا کہ کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللّٰہ کا مفاد ہے کہ سوائے خداوند عالم کے اور کوئی معبودِ برحق نہیں ہے۔ اور اس کے علاوہ اور کوئی ذات پرستش کے لائق نہیں ہے۔ بُت پرستوں کو اسی بنا پر مشرک قرار دیا گیا ہے کہ وہ خود ساختہ اصنام کی عبادت کرتے تھے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے وہ ہرگز ان کو حقیقی خدا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ تو ان بتوں کی عبادت کو باعثِ تقربِ خدا قرار دیتے تھے۔ چنانچہ خلاقِ عالم نے ان کے اس نظریہ فاسدہ

ونعمة الاخوة
وفی القرآن
والسماء بنینٰها
بأید والاید
القوة۔

بہشت وغیرہ کے الفاظ سے ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اس مقام پر ید
لغت مجازی طور پر ہے۔ (۲) منجملہ دیگر آیات کے قرآن حکیم میں وارد ہے "بل یداہ
مبسوطتان" (پ سورہ مائدہ ع ۹) خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔ یہ معنی نعمت اور دونوں
سے دنیا و آخرت کی نعمت مراد ہے نہ ہاتھ۔ ایک اور مقام پر یوں ارشاد فرمایا ہے "والسماء
بنینٰها بأید" (پ سورہ ذاریات ع ۳) ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی قوت

کی اس طرح ترجمانی فرمائی ہے۔ والذین اتخذوا من دونه اولیاء ما نعبدهم الا لیقربونا الی الله زلفیٰ ان الله یحکم بینهم فیما کانوا فیه یختلفون (پ سورۃ زمر ع ۱۵) اور جن لوگوں نے اس کے سوا اوروں کو اپنا کارساز بنا لیا ہے (وہ یہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کے نزدیک کر دیں۔ ضرور خدا تعالیٰ ان تمام باتوں کو جن میں وہ آپس میں اختلاف کیا کرتے ہیں، فیصلہ فرما دے۔

اس کے باوجود ان کو اصطلاح شرع اقدس میں مشرک کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ایشرکون ما لا یخلق شیئا وهم یخلقون ۝ ولا یستطیعون لهم نصرا ولا انفسهم ینصرون (پ سورۃ اعراف ع ۱۴) کیا ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے۔ اور وہ خود ہی پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور نہ وہ ان (شریک ٹھہرانے والوں) کی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔ اور نہ اپنی ذات ہی کی مدد کرتے ہیں۔ وقضیٰ ربک ان لا تعبدوا الا ایاه۔ تمہارے پروردگار نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ سوائے اس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو۔

معلوم ہوا کہ غیر خدا کی پرستش خواہ کسی نوعیت کی ہو۔ اور خواہ کسی نیّت و ارادہ سے ہو۔ اگرچہ سجدۂ تعظیمی ہی ہو۔ وہ شرک فی العبادت ہے جس سے اجتناب واجب و لازم ہے۔ ارشادِ قدرت ہے اعبدوا الله مخلصین له الدین۔ اخلاص کے ساتھ اللہ سبحانہ کی عبادت کرو۔ اور اخلاص کا حقیقی مفہوم یہ ہے۔ کہ اس کی عبادت میں کسی غیر کو شریک نہ کیا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے فمن کان یرجوا لقاء ربه فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادة ربه احدا ۝ (پ سورہ کہف رکوع ۳۔) پس جس کو اپنے پروردگار کے حضور میں جانے کی اُمید ہو۔ اُسے لازم یہ ہے کہ نیک عمل بجا لائے۔ اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے (مقبول ترجمہ)

واعبدوا الله ولا تشرکوا به شیئا (سورہ ن پ) اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

ومنہ قولہٗ واذکر
عبدنا داؤد ذوالاید
یعنی ذوالقوۃ وفی القرآن
یاابلیس ما منعک ان

اور طاقت کے بنایانہ ہاتھوں سے بنایا اس امر کی تائید ایک اور آیت
بھی ہوتی ہے واذکر عبدنا داؤد ذالاید (پ ۲۳ سورہ ص ع ۲)
یعنی یاد کر ہمارے داؤد کو جو اید والا تھا۔ مراد یہ ہے کہ وہ صاحب
ہمت تھا ابلیس کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور مقام پر قرآن مجید

خدا اور رسول اور اوصیاء رسول کو تو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ اگرچہ بظاہر عبادتِ خدا کی ہو۔ مگر اس سے قصد ریا و سمعہ ہو چنانچہ خداوند عالم ریاکاروں کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔ یراؤن الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلا۔ یہ لوگ محض لوگوں کے دکھانے کے لئے عبادت کرتے ہیں۔ اللہ کا ذکر تو بہت ہی کم کرتے ہیں اصول کافی میں آیت مبارکہ ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا الرجل یعمل شیئا من الثواب لا یطلب بہ وجہ اللہ انما یطلب تزکیۃ الناس یشتہی ان یسمع بہ الناس فہذا الذی اشرک بعبادۃ ربہ۔ آدمی کوئی کار ثواب کرتا ہے لیکن اس کی غرض خوشنودیٔ خدا نہیں ہوتی بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی مدح و ثنا کریں کہ فلاں بڑا عبادت گذار ہے۔ یہ شخص عبادتِ خدا میں شرک کا مرتکب ہوا ہے۔ بکثرت احادیث شریفہ میں وارد ہے کہ الریاء مشرک۔ ریا شرک ہے۔ اس لئے ایسا عمل درجۂ قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت باقر العلوم فرماتے ہیں۔ ولا یقبل اللہ عمل مرائی۔ خداوند عالم ریاکار کا عمل قبول نہیں کرتا۔

ان حقائق کی روشنی میں ان کے مشرک ہونے میں کیا شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے۔ جو نماز وغیرہ عبادات میں اپنے مرشد کے تصور کو ضروری سمجھتے ہیں کیا یہ صاف مرشد پرستی نہیں ہے ؟ اسی طرح ان لوگوں کی جہالت اور ضلالت اور شرک میں کوئی کلام نہیں جو نماز میں حضرت امیر المومنین یا دیگر آئمہ طاہرین کے تصور کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ سورہ الحمد کی آیت ایاک نعبد وایاک نستعین کا خطاب حضرت امیر المومنین کو ہے۔ جیسا کہ پنجاب کے بعض غالی و مفوضہ قسم کے جاہل مدعیان تشیع کے متعلق معتبر ذرائع سے مسموع ہوا ہے۔ اعاذنا اللہ من امثال ہذہ الخرافات یہ ہیں توحید کے وہ چار اساسی و بنیادی مراتب جن کا اعتقاد اہل ایمان کو رکھنا ضروری ہے۔ ان کے اعتقاد کے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ پس حقیقی اور سچا خدا پرست وہ ہے جو ان چاروں قسم کے شرک سے پاک اور چاروں قسم کی توحید میں کامل ہو۔ توحید فی الذات۔ توحید فی الصفات۔ توحید فی الطاعۃ۔ توحید فی العبادت کا صحیح عقیدہ رکھتا ہو۔ اور دین حق وہ ہے جس میں تعلیم توحید اس درجہ مکمل ہو کہ شرک کا شائبہ تک نہ پایا جائے اور یہی تعلیم اسلام ہے۔

(پیغام توحید مولانا محمد سبطین صاحب مرحوم)

ان تسجد لما خلقت بیدی یعنی بقدرتی وقوتی وفی القران والارض جمیعًا قبضتہ یوم القیمۃ یعنی ملکہ لا یملکہا معہ احد وفی القران والسمٰوٰت مطویات بیمینہ یعنی بقدرتہ

میں خداوند عالم ابلیس کو مخاطب کرکے ارشاد فرماتا ہے یا ابلیس ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی (پ ۲۳ سورہ ص ع ۱۴) اے ابلیس تو نے اس کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔ جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا تھا۔ یہاں منشاء خداوندی یہ ہے کہ جسے میں نے اپنی قوت وقدرت سے پیدا کیا۔

رزقنا اللہ حلاوۃ التوحید والتفرید وجنبنا من وساوس الشیطان العنید بجاہ النبی والہ سادۃ العبید انہ قریب مجیب

توحید کے بعض دیگر مراتب کا اجمالی بیان

مذکورہ بالا مراتب کے علاوہ توحید کے بعض اور مراتب بھی ہیں۔ جو ایمان کی تکمیل میں دخیل ہیں۔ ان کا جاننا بھی ضروری ہے (۱) ان میں سے ایک توحید فی التوکل ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ اپنے تمام امور میں خداوند عالم ہی کی ذات پر توکل وبھروسہ کریں۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے۔ وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔ چاہیے کہ اہل ایمان اللہ ہی پر توکل کریں۔ کیونکہ من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ جو لوگ اللہ پر توکل کرتے ہیں اللہ سبحانہ ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔

معانی الاخبار ج ۱ص۔ میں ایک طویل حدیث کے ضمن میں آں حضرتؐ سے توکل کا یہ مفہوم منقول ہے۔ فرمایا العلم بان المخلوق لا یضر ولا ینفع ولا یعطی ولا یمنع واستعمال الیأس من الخلق فاذا کان العبد کذلک لم یعمل لاحد سوی اللہ ولم یرج ولم یخف سوی اللہ ولم یطمع فی احد سوی اللہ فھذا ھو التوکل۔ یہ یقین رکھنا کہ کوئی بھی مخلوق نہ ضرر پہنچا سکتی ہے اور نہ نفع۔ نہ کچھ دے سکتی ہے اور نہ روک سکتی ہے۔ غرضکہ پوری طرح مخلوق سے مایوس ہونا جب آدمی اس طرح متوکل بن جائے تو اس وقت وہ جو عمل بھی کرتا ہے وہ صرف خدا کے لئے۔ وہ اُمید نہیں کرتا مگر خدا سے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا سوائے خدا کے اور اُسے سوائے خدا کی ذات کے اور کسی سے کوئی طمع ولالچ نہیں ہوتا۔

(۲) توحید فی الامر والنہی۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے۔ الا لہ الخلق والامر۔ الا لہ الحکم۔ وللہ الدین الخالص۔ حقیقی امرونا ہی وہی ہے۔ انبیاء واوصیاء اس کے اوامر ونواہی پر عمل کرانے اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ لہٰذا جہاں خالق اور مخلوق کی اطاعت میں اختلاف واقع ہو جائے

وفی القرآن وجآء ربک والملک صفا صفا یعنی وجاء امر ربک وفی القرآن کانہم عن ربہم وفی القرآن هل ینظرون الا ان یأتیہم اللہ فی ظلل

والارض جمیعا قبضتہ یوم القیامۃ قیامت کے دن تمام زمین خدا کے قبضہ میں ہوگی یعنی اس کی ملکیت میں ہوگی کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہوگا (پ ۲۴ سورہ زمر ع ۸) والسمٰوٰت مطویات بیمینہ (پ سورہ زمر ع) تمام آسمان خدا کے داہنے ہاتھ میں لپیٹ دے جائیں گے مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت میں ہوں گے ۔ وجآء ربک والملک صفا صفا. (پ س فجر ع) تمہارا رب آئے گا اور فرشتے صف بصف حاضر

والی اللہ کے احکام کو مقدم رکھنا چاہیے حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق جہاں خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو۔ وہاں مخلوق کی اطاعت روا نہیں ہے (نہج البلاغہ) (۳) توحید فی مالکیۃ النفع والضرر۔ یعنی نفع ونقصان کا مالک خداوند عالم ہی کو سمجھنا چاہیئے۔

اوپر توحید افعالی کے بیان میں کئی ایک ایسی آیات ذکر ہو چکی ہیں۔ جن میں خداوند عالم کا یہ ارشاد مذکور ہے کہ وہی نفع وضرر کا مالک ہے۔ امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء۔

لہٰذا مومنین کو سوائے خدا کے اور کسی سے خائف وہراساں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ع

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست

(۴) توحید فی الطاعۃ۔ یعنی جن لوگوں کی اطاعت خدا نے واجب نہ کی ہو۔ ان کی اطاعت کرنے اور ان کو اپنا ہادی ورہبر قرار دینے سے اجتناب کرنا چاہیے چنانچہ حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ امر الناس بمعرفتنا والرد الینا والتسلیم لنا وان صاموا وصلوا وشہدوا ان لا الٰہ الا اللہ وجعلوا فی انفسہم ان لا یردوا الینا کانوا بذالک من المشرکین (ہدایۃ المعین) لوگوں کو ہماری معرفت حاصل کرنے اور ہماری طرف معاملات کو لوٹانے اور ہمارے احکام کو تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اگر وہ روزے رکھیں، نمازیں پڑھیں، شہادت توحید دیں لیکن اس کے باوجود ان کا یہ ارادہ ہو کہ وہ اپنے معاملات کو ہماری طرف نہیں لوٹائیں گے تو وہ مشرک قرار پائیں گے۔

نوٹ۔ ان تمام مراتب توحید کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ معمولی سی غفلت کرنے سے انسان شرکِ خفی یا جلی میں مبتلا ہو جاتا ہے چنانچہ ارشادِ قدرت ہے۔ وما یؤمن اکثرہم باللہ الا وہم مشرکون (پ سورہ یوسف ع) اکثر لوگ اس حال میں خدا پر ایمان لاتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ مشرک بھی ہوتے ہیں۔

تفسیر صافی میں بحوالہ تفسیر عیاشی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا یہ آیت مبارکہ ایسے

من الغمام والملئکۃ ای عذاب اللہ وفی القرآن. وجوہ یومئذ ناضرۃ ہوں گے یہاں خدا کے آنے سے مراد امر خداوندی کے ہیں یعنی تمہارے پروردگار کا حکم آئے گا۔ کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون ذپ سورہ ع ۱۰۸ یعنی وہ لوگ یقیناً اپنے پروردگار سے محجوب رہیں گے مطلب

لوگوں کے بارے میں آئی ہے جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو میں مرجاتا۔ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو مجھ پر ایسی اور ایسی مصیبت نازل ہوجاتی۔ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو میرا کنبہ اور قبیلہ ہلاک ہوجاتا۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ ایسا کہنے والا اختیاراتِ خداوندی میں غیروں کو شریک کرتا ہے؟ کیونکہ رزق دینا اور بلا و مصیبت کا دفع کرنا خاص خداوند عالم کا کام ہے۔ اس پر کسی شخص نے خدمتِ امام میں عرض کیا کہ ایسے مواقع پر اگر کوئی شخص یوں کہے کہ خداوند عالم فلاں شخص کے باعث مجھ پر احسان نہ کرتا تو میں ہلاک و برباد ہوجاتا یہ کہنا کیسا ہے؟ امام عالی مقام نے فرمایا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

فرقہ مجسّمہ کا تذکرہ

یہ فرقہ جو مجسّمہ و مشبّہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اہل سنّت والجماعت کا ہی ایک فرقہ ہے یہ خداوند عالم کے لئے جسم اور اس کے تمام اعضاء و جوارح مثل ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ، ناک اور قلب و زبان وغیرہ کا قائل ہے۔ یہ فرقہ پہلی صدی ہجری کے بعد پیدا ہوا۔ اس کے بانی مضر و کہمش اور احمد ہجیمی بیان کئے جاتے ہیں۔ اسی فرقہ کا ایک عالم داؤد ظاہری تو یہاں تک کہا کرتا تھا۔ اعفونی عن الفرج واللحیۃ واسئلونی عما وراء ذلک۔ اعضائے خداوندی میں سے مجھے فقط فرج اور ڈاڑھی کے متعلق معاف کرو (ان کے متعلق سوال نہ کرو) ان کے علاوہ جس عضو کے متعلق مجھ سے چاہو سوال کرو (میں اس کی کیفیت بتانے کے لئے حاضر ہوں) (الملل والنحل شہرستانی ص۶۴ طبع ایران) اگر اس فرقہ باطلہ کی مزید خرافات اور دعاوی باطلہ دیکھنے ہوں تو اسی کتاب یا اس موضوع پر جو دوسری کتب لکھی گئی ہیں۔ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ جیسے الفصل ابن حزم ظاہری اور المذاہب اشعری وغیرہ۔ ہمارے آئمہ طاہرین نے ایسے نظریات فاسدہ کی بڑے شدّ و مدّ سے رد فرمائی ہے۔ اور ایسے نظریات کو مشرکانہ و کافرانہ خیالات قرار دیا ہے۔ یہاں بطور نمونہ فقط ایک طویل حدیث کا ایک حصّہ نقل کیا جاتا ہے۔ یونس بن ظبیان جناب امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے آں جناب کی خدمت میں بعض لوگوں کے خیالات کا اظہار کیا جو خداوند عالم کے جسم اور اعضاء و جوارح کے بارے میں رکھتے تھے۔ آپ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے یہ سنتے ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ اللّٰھم عفوک عفوک۔ پھر فرمایا یا یونس من زعم ان للہ وجھًا کالوجوہ فقد اشرک ومن زعم ان للہ جوارح کجوارح المخلوقین فھو کافر باللہ فلا تقبلوا شہادتہ ولا تاکلوا ذبیحتہ تعالی عما یصفہ المشبھون بصفۃ

الی ربها ناظرة یعنی مشرقة تنظر ثواب ربها وفی القرآن ومن یحلل علیه غضبی فقد هوی و غضب الله عقابه

یہ کہ خداوند کریم ان کو اپنے ثواب سے محروم کر دے گا ۔ هل ینظرون الا ان یاتیهم الله فی ظلل من الغمام (پ۲ سورۃ بقرہ رکوع ۹) کیا وہ لوگ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ خداوند عالم بادلوں کے سایہ میں ان کے پاس آئے یعنی اس کا عذاب آئے ۔ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربها ناظرۃ (پ۲۹ سورۃ قیامت ع۱۰) روز قیامت اکثر چہرے چمکتے ہوئے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کی رحمت اور ثواب کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ومن یحلل علیه غضبی فقد هوی (پ ۱۶ سورہ طٰہٰ ع ۱۳) جس پر میرا غضب نازل ہوگا وہ ہلاک ہو جائے گا یہاں غضب خداوندی سے اس کا عذاب اور رضا الٰہی سے ثواب مراد ہے

المخلوقین (پ سورۂ یونس ع) جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ خدا کا منہ ہے وہ مشرک ہے اور جو یہ گمان کرتا ہے، کہ مخلوق کی طرح خدا کے بھی اعضاء وجوارح ہیں وہ کافر ہے، تم اس کی گواہی قبول کرو۔ نہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھاؤ۔ خدا ان باتوں سے بلند و بالا ہے، جو اسے مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینے والے لوگ بیان کرتے ہیں (بحار الانوار ج ۲)

خلاصہ یہ کہ من شبه الله بخلقه فهو مشرک ۔ جو شخص خدا کو اس کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دے وہ مشرک ہے (عیون اخبار الرضا)

بہر حال اس فرقۂ باطلہ کے نظریات فاسدہ جنگل کی آگ کی طرح کم عقل و علم سادہ لوح مسلمانوں میں پھیلنے شروع ہو گئے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید میں کچھ آیاتِ متشابہات اس قسم کی تھیں۔ جن سے ایک ظاہر بین شخص کو اس قسم کا توہم ہو سکتا تھا کیونکہ عوام الناس بلکہ اکثر خواص بھی قرآنی آیات متشابہات کی صحیح تاویل اور ان کے حقیقی مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور نہ ہی سب لوگ حقیقی و مجازی معنوں میں امتیاز کر کے ان کے موارد استعمال کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے جہاں اس قسم کے الفاظ دیکھے۔ انہیں ان کے ظاہری اور لغوی معنوں پر محمول کر کے خدا کے لئے جسم و اعضاء کے قائل ہو گئے اور اس طرح اپنی توحید خراب کر کے آخرت بھی برباد کر بیٹھے۔ من حیث لا یشعرون۔ چونکہ آیات متشابہات کا ذکر آگیا ہے۔ ان کے بارہ میں چند ضروری امور کا ذکر ناگزیر ہے۔ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بلند اور تمام مکاتیب فکر کے مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہے کہ قرآن مجید میں کچھ آیات محکمات ہیں، اور کچھ متشابہات ہیں۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ منه آیات محکمات هن ام الکتاب و اخر متشابهات (پ۳ سورہ آل عمران ع۲)

ورضاه ثوابه وفی القرآن تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك ای تعلم غیبی ولا اعلم غیبك وفی القرآن

تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك (پ ، سورہ مائدہ ع ۶) میرے نفس کی اندرونی کیفیت کو تو جانتا ہے مگر میں تیرے نفس کی پوشیدہ چیزوں کو نہیں جانتا۔ یعنی تو تو میرے راز کو جانتا ہے لیکن میں تیرے بھیدوں سے واقف نہیں ہوں۔

آیاتِ متشابہات کا مفہوم

اس وقت اس سے بحث کرنا مقصود نہیں کہ آیاتِ متشابہات کے قرآن میں رکھنے سے قدرتِ کاملہ کا منشاء و مقصد کیا ہے؟ یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ آیت متشابہ کا مفہوم کیا ہے؟ اور اسے کون سمجھ سکتا ہے۔ ارباب علم جانتے ہیں کہ متشابہ کے معنی یہ ہیں کہ ما اشتبہ به مراد المتکلم۔ وہ کلام جس سے متکلم کی مراد مشتبہ ہو جائے اور ہر شخص اس کے مقصد کو نہ سمجھ سکے"

سوائے خدا و رسول اور آلِ رسول کے اور کوئی شخص متشابہات کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتا

چونکہ کلام متشابہ میں ایک سے زائد معنوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اس لئے اس کلام کا صحیح مفہوم ہر وہ شخص نہیں سمجھ سکتا۔ جو اس زبان پر عبور رکھتا ہو۔ جس زبان میں وہ کلام ہے بلکہ اس کا حقیقی مطلب یا خود متکلم سمجھتا ہے۔ یا وہ شخص جسے متکلم اپنا منشا بتا دے۔ اسی بنا پر مذکورہ بالا آیت کے بعد خدا فرمایا ہے۔ وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم (پ سورۂ آل عمران ع ۸) کہ قرآنی متشابہات کی حقیقی تاویل خود خدا جانتا ہے۔ یا وہ ذواتِ تقدس صفات جانتے ہیں جو علم میں راسخ ہیں۔ اور علم لدنی و وہبی کے حامل ہیں۔ اور معلمِ تعلیم الٰہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے بزرگوار جناب رسولِ مختار اور ان کی عترتِ اطہار ہی ہو سکتے ہیں۔ آں حضرت کے بارہ میں ارشادِ رب العزت ہے۔ وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیهم (پ ۱۴ سورۂ نحل ۴۴) اے میرے حبیب ہم نے قرآن تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے لئے بیان کرو کہ ان کی طرف کیا نازل کیا گیا ہے۔ اور منشائے قدرت کیا ہے؟ اور آں حضرت کے بعد ان کی عترتِ طاہرہ کے متعلق خدا فرماتا ہے۔ ثم اورثنا الکتب الذین اصطفینا من عبادنا۔ پھر ہم نے اپنی کتاب (کے علم) کا وارث ان لوگوں کو بنایا ہے جن کو ہم نے اپنے تمام بندوں میں سے منتخب کر لیا ہے (پ ۲۲ سورہ فاطر ع ۱۶) ینابیع المودۃ، ارجح المطالب فرائد السمطین حموینی وغیرہ کتب میں کئی ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مخصوص مصطفٰے بندوں

ویحذرکم اللہ نفسہ یعنی انتقامہ وفی القرآن	ویحذرکم اللہ نفسہ (پ سورہ آل عمران ع۳) خداوند عالم تم کو اپنے نفس سے ڈراتا ہے یعنی اپنے انتقام سے خوف دلاتا ہے

سے مراد آلِ رسولؐ ہیں، اور ان کی تشخیص وتعیین کے لئے مسلّم بین الفریقین حدیث ثقلین ہی کافی روانی ہے۔ انی تارک فیکم الثقلین کتب اللہ وعترتی اھلبیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی وانھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض۔ لہٰذا آیات متشابہات کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے جناب رسول خدا اور آئمہ ہدیٰ کی بارگاہ قدس میں حاضر ہونا ضروری ہے اس کے بغیر کبھی یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ولنعم ما قیل۔ ع۔

محکم کہیں کہیں متشابہ ترا کلام — یارب عجیب راز یہ قرآں میں بھر دیا
اب حکم مختصوں کا الجھنا دلیل ہے — دنیا کو اہلبیت کا محتاج کر دیا

اور چونکہ رسولؐ وآل رسول علیہ وعلیہم السلام نے ان آیات مبارکہ کے وہی معانی بتلائے ہیں جو متن رسالہ میں مذکور ہیں، لہٰذا انہیں صحیح تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ ماننا پڑے گا کہ خداوند عالم کا منشاء یہی ہے۔ جو کچھ ترجمان وحی خانوادہ نے بیان کر دیا ہے۔ ان معانی کے علاوہ جو شخص حسن گھڑت معنی تراشے گا وہ بوجہ تفسیر بالرائے ہونے کے سراسر ضلالت وگمراہی ہوگی۔ قال رسول اللہ من فسر القرآن برائہ فلیتبوأ مقعدہ من النار جو شخص قرآن کی تفسیر وتاویل اپنی ذاتی رائے سے کرے وہ اپنی جگہ جہنم میں مہیا سمجھے۔ (متفق بین الفریقین)

ایک عقلائی مسلّمہ قاعدہ کا بیان

ایک مسلّمہ قاعدہ وقانون ہے کہ جب کوئی مطلب براہین عقلیہ اور دلائل شرعیہ سے محقق ومبرہن ہو جائے اور پھر کوئی نقلی دلیل اس کے بظاہر مخالف معلوم ہو تو وہ اگر خبر واحد ہو تو اُسے مسترد کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی قرآنی آیت یا متواتر روایت ہو تو اس کی کوئی ایسی تاویل کرنا واجب ہوتی ہے کہ اس کا مفہوم دلائل عقلیہ اور آیات محکمات سے ثابت شدہ مطلب سے متصادم ومخالف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ محقق شیخ بہائی اپنے رسالہ اعتقادات الامامیہ میں اسی قاعدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ونحمل آیات القرآن علی ظاھرھا الا ما قام الدلیل علی خلافہ کقولہ تعالیٰ ید اللہ فوق ایدیھم الخ۔ یعنی ہم آیاتِ قرآنیہ کو ان کے ظاہری معانی پر ہی محمول کرتے ہیں ہاں جب وہ کسی عقلی دلیل سے متصادم ہوں تو پھر ان کی تاویل کرتے ہیں جیسا آیت مبارکہ ید اللہ میں لفظ ید کی تاویل لازم ہے۔

بنا بریں اصول بھی ان آیات کے ظاہری معنوں سے ہٹ کر انہی معانی کو اختیار کرنا لازم ہے جن کا مصنف علام نے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ حسب سابقہ مباحث میں دلائل عقلیہ ونقلیہ سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ خداوند عالم جسم وجسمانیات

ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یا ایہا الذین امنوا صلوا علیہ (پ ۲۲ سورہ احزاب ع ۴) خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود بھیجا کرو۔	ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی وفیہ ھو الذی یصلی علیکم ف

سے منزہ و مبرا ہے۔ اور یہ کہ اس کا دامن ربوبیت تمام شرور و قبائح اور عیوب و نقائص سے پاک و صاف ہے تو اب اگر کسی متشابہ آیت کا ظاہری مفہوم اسکے مخالف معلوم ہوتا ہو تو لازماً اس کے ایسے معنی مراد لئے جائیں گے جن سے یہ ظاہری تصادم ختم ہو جائے کیونکہ قرآن میں فی الحقیقت ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ خود ارشاد قدرت ہے ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً (پ ۵ سورۃ نساء ع ۸) اگر یہ قرآن غیر اللہ کا کلام ہوتا تو ضرور اس میں اختلاف موجود ہوتا ہے۔ قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا اس کے کلام خدا ہونے کی ایک قطعی دلیل ہے۔ خصوصاً جب کہ ان معانی کی تائید لغت عرب اور اس کے محاورات سے بھی ہوتی ہو جیسا کہ ہماری متعلقہ آیات میں مصنف کے بیان کردہ معانی و مفاہیم کی محاورات و لغات عرب سے تائید مزید ہوتی ہے تو پھر ان معانی کے اختیار کرنے میں کیا مانع ہو سکتا ہے؟ چنانچہ حضرت مصنف نے کشف ساق کے جو معنی مراد لئے ہیں۔ یہ محاورہ عرب کے عین مطابق ہیں۔ عربوں کا یہ دستور ہے کہ وہ کسی امر کی انتہائی شدت کو کشف ساق سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ جنگ کی شدت وحدت کا تذکرہ کرنا چاہیں تو کہتے ہیں۔ "قامت الحرب علی ساق" جنگ ساق پر کھڑی ہو گئی یعنی بہت سخت ہو گئی۔ شاعر حماسی سعد بن خالد کہتا ہے۔ ؎

کشفت لھم عن ساقھا   وبدا من الشر الصراح

کہ ان دشمنوں اسکے لئے جنگ بہت سخت ہو گئی۔ اور خالص شر و فساد ظاہر ہو گیا۔

اور یہ ایسے صاف و صریح و صحیح معنی ہیں کہ اہل خلاف کے بعض اہل انصاف، اہل علم بھی ان کی صحت کا اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی اپنے ترجمہ قرآن ص ۴۳۱ حاشیہ ۲ مطبوعہ قاسمی دہلی پر رقمطراز ہیں۔ "یوم یکشف عن ساق کے لفظی معنی ہیں کہ جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور یہ عرب کا محاورہ ہے۔ اور پنڈلی کھولنے سے سختی اور مصیبت کا پیش آنا مراد ہوتا ہے کیونکہ کوئی بڑا مشکل کام کرنا پڑتا ہے تو آدمی پاجامہ یا تہمد اوسچا کر کے اس کے کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ یا دریا اترنا ہوتا ہے تو اس طرح بھی کپڑا اٹھانا پڑتا ہے اور مفسرین نے کہا ہے کہ مراد ہے مصیبت کا کھل جانا۔ ہم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے جس دن پردہ اٹھایا جائے گا۔"

اسی طرح "ید" کے جو معانی حضرت شیخ نے بیان فرمائے ہیں ان کے علاوہ ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی میں "ید" کے دو اور معنی بھی ممکن ہیں۔ ایک بمعنی نعمت۔ اس طرح اس آیت کے

ملئكته والصّلوٰة من الله رحمته ومن الملئكة استغفار و تزكية ومن الناس دعاء وفی القرآن ومكروا ومكرالله والله خير الماكرين وفی القرآن يخادعون الله وهو خادعهم وفيه الله يستهزئ بهم وفی القرآن سخرالله منهم وفيه نسوا الله فنسيهم و معنی ذلك كلّه انّه عزّوجل يجازيهم جزاء المكر وجزاء النسيان وهو ان ينسيهم انفسهم كما قال عزّوجل ولا تكونوا كالذين نسوا الله فانسيهم انفسهم

ایک دوسری جگہ فرمایا ھوالذی یصلی علیکم وملائکتہ خدا اور فرشتے تم پر درود بھیجتے ہیں۔ یہاں خدا کے درود بھیجنے سے اُس کی پاکیزگی بیان کرنا اور لوگوں کے درود بھیجنے سے دُعا مراد ہے۔ مکروا ومکراللہ واللہ خیرالماکرین (پ سورہ آل عمران ع ۱۳) انہوں نے مکر کیا تو خدا نے بھی مکر کیا۔ اور خداوند عالم تمام مکر کرنے والوں سے بہترین مکر کرنے والا ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے یخٰدعون اللہ وھو خادعھم (پ سورہ نساء ع ۱۸) وہ لوگ خدا سے دھوکا کرتے مگر خدا بھی ان کے ساتھ ایسا ہی کرنے والا ہے۔ ایک دوسری جگہ بھی ایسا ہی فرماتا ہے اللہ یستھزی بھم ویمدھم (پ سورہ بقرہ ع ۲) خدا ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے۔ ایسی ہی آیات میں سے ایک یہ بھی ہے۔ نسوا اللہ فنسیھم (پ سورہ توبہ ع) وہ لوگ خدا کو بھول گئے اور خدا نے انہیں بھلا دیا۔ سخر اللہ منھم۔ خداوند عالم ان سے استہزاء کرتا ہے۔ ان تمام آیات قرآنیہ کا منشاء و مطلب یہ نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر کلام

معنی یہ ہوں گے۔

اے شیطان تجھے کس چیز نے روکا کہ اسے سجدہ کرے جسے میں نے اپنی دونوں (اخروی و دنیوی) نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے (کذا فی الانتصاف مطبوعہ بر حاشیہ تفسیر کشاف ج ۲ صفحہ ۳۳۵ طبع مصر)

حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اس معنی کو متن والے معنی پر یہ کہہ کر ترجیح دی ہے کہ اس صورت میں تکرار لازم آتا ہے۔ کیونکہ قوت و قدرت کے ایک ہی معنی ہیں۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک "ید" بمعنی قوت اور دوسرا بمعنی نعمت۔ تو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے جسے میں نے اپنی قوت و نعمت سے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح "وجہ" کے دو معنی تو وہی ہیں جو متن میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں خود ذات ایزدی مراد ہو۔ کیونکہ وجہ (بمعنی چہرہ) کا مجازاً ذات پر بھی اطلاق ہوتا رہتا ہے۔ اب معنی یوں ہوں گے ہر شے ہلاک ہوگی سوائے ذات باری

كما قال عزّ وجلّ ولا تكونوا كالذين نسوا الله فانسيهم انفسهم لانّه عزّ وجلّ في الحقيقة لا يمكر ولا يخادع ولا يتهزء ولا يسخر ولا ينسى تعالى الله عن ذلك علوّا كبيرًا وليس يرد في الاخبار التي يشنع بها اهل الخلاف والالحاد الا بمثل هذه الالفاظ ومعانيها معاني الفاظ القرآن

سے مستفاد ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں خداوند عالم کے مکر، تمسخر، استہزاء، خدع اور اُس کے بھول جانے کا مطلب ایسا کرنے والوں کے لئے اُن کے اعمال کی جزاء اور افعال کا بدلہ ہے حقیقت میں خدا نہ مکر کرتا ہے۔ اور نہ ہی دھوکا دیتا ہے۔ ہنسی۔ مذاق۔ مسخرہ پن اور نسیان وغیرہ عوارض تو عیوب میں داخل ہیں۔ اور خلاق عالم کی ذات ان تمام عیبوں سے بلند و بالا اور مبرا و منزہ ہے۔ جن آیات کا تذکرہ ہم نے اس باب میں کیا ہے اور جن سے بظاہر تشبیہ کا وہم پیدا ہو سکتا ہے۔ انکے الفاظ کے مترادف شیعہ کتب واحادیث میں بعض ایسی اخبار بھی پائی جاتی ہیں جن پر شیعوں کے بعض مخالفین اور بے دین لوگ حملہ کرتے ہیں ان کا مطلب بھی وہی مراد لیا جائے گا جو متذکرہ بالا آیات میں پیش کیا جا چکا ہے۔

ے (کذا فی التفسیر البیضاوی ج ۲ صفحہ ۳ طبع مصر وکذا فی الکشاف ج ۲ صفحہ ۱۹۸)

نیز وجہ کا اطلاق دین پر بھی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح چہرہ ذریعہ معرفت ہوتا ہے۔ اسی طرح دین بھی ذریعہ معرفت ہوتا ہے۔ بعض روایات میں یہ وارد ہے کہ اس سے مراد حضرات آئمہ طاہرین ہیں جو کہ معرفتِ خدا کا ذریعہ ہیں کما لایخفیٰ۔ یہ سب معانی احادیث اہل بیت میں مذکور ہیں۔

ان معانی کی تائید میں ہم یہاں بعض اخبار معصومیہ پیش کئے دیتے ہیں۔ جناب محمد بن مسلم روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقرؑ سے آیت مبارکہ یا ابلیس الخ کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا الید فی کلام العرب القوة والنعمة قال الله واذكر عبدنا داؤد ذا الايد والسماء بنيناها بايد اى بقوة ... ويقال لفلان عندي ايادي كثيرة اى فواضل واحسان ولفلان عندي يد بيضاء اى نعمة۔ نیز [illegible] نعمت استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت جاء قرد اور آیت والسماء ... میں ید انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ نیز محاورات میں کہا جاتا ہے۔ فلاں شخص کے مجھ پر ایادی کثیرہ ہیں۔ یعنی ان کے بہت سے مجھ پر احسانات ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا مجھ پر ید بیضاء ہے۔ یعنی مجھ پر اس کا انعام ہے۔

(توحید شیخ صدوق وغیرہ)

محمد بن عبیدہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے آیت مبارکہ بل یداہ مبسوطتان۔ کے بارے میں دریافت کیا فرمایا یدی کا مطلب ہے۔ بقدرتی وقوتی۔ (بحار الانوار ج)

ابی حمزہ کہتے ہیں کہ میں نے جناب امام محمد باقرؑ سے آیت کل شئی ھالك الا وجھه کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔ ان اللہ اعظم من ان یوصف بالوجه ولکن معناہ کل شئی ھالك الا دینه۔ خداوند عالم کی شان اس سے اعلیٰ وارفع ہے کہ اس کی چہرہ کے ساتھ توصیف کی جائے۔ آیت کا معنی یہ ہے ہر چیز ہلاک ہو جائے گی سوائے اس کے دین کے۔ (توحید شیخ صدوق)

ابن مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی نے آپ سے اسی آیت (کل شئی ھالك) کے معنی دریافت کئے آپ نے فرمایا نحن وجه اللہ الذی یؤتی منه۔ اس وجہ سے مراد ہم ہیں۔ جن کے ذریعہ خدا تک رسائی ہوتی ہے (بحار الانوار ۲ و توحید وغیرہ)

اسی طرح مصنف کے تمام بیان کردہ معانی ومفاہیم کی تائید میں بکثرت روایات موجود ہیں جو ان کی کتاب توحید اور بحار الانوار ۲ تفسیر برہان وغیرہ۔ کتب معتبرہ میں مل سکتی ہیں۔ مگر ہم بنظر اختصار اسی مقدار پر اقتصار کرتے ہیں شائقین تفصیل مذکورہ بالا کتب کی طرف رجوع کریں۔

جن آیات شریفہ میں مکر وخدلیعہ اور استہزاء وغیرہ الفاظ کا اطلاق باری تعالیٰ پر ہوا ہے یہ اطلاق من باب المجاز والمشاکلة والمقابلة ہے۔ یعنی کفار کے مکر، خدلیعہ، استہزاء وغیرہ افعال شنیعہ کے بدلہ پر انہی الفاظ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ فریقین کے علماء کی یہ تحقیق ہے کہ خداوند عالم کے اسماء باعتبار غایات وبلحاظ نتیجہ لئے جاتے ہیں نہ باعتبار مبادی ومآخذ مثلاً خداوند عالم رحمٰن ورحیم ہے اور رحمت کے لغوی معنی ہیں۔ دل کی وہ رقت ونرمی جو لطف ورحمت کی مقتضی ہو۔ اب اگر اس کے مبدأ کے اعتبار سے معنی لئے جائیں تو خدا کے لئے دل ثابت کرنا پڑے گا۔ اگر دل ثابت ہو گیا تو اس سے اس کا جسم ہونا بھی لازم آئے گا جو کہ محال ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ وہ رحمٰن ہے باعتبار نتیجہ وغایت کے یعنی لطف ورحمت کرنے والا ہے (بیضاوی ج اص۸ طبع مصر) یہی حال خدا کے قہر وغضب کا ہے۔ اور یہی کیفیت زیر بحث آیات مبارکہ میں مکر وخدلیعہ وغیرہ الفاظ کے اطلاق کی ہے۔ کہ خلاق عالم ان لوگوں کو جو اپنے زعم باطل میں خدا کے ساتھ مکر وفریب اور تمسخر واستہزاء کرتے ہیں۔ ان کے ان افعال شنیعہ اور حرکات قبیحہ کی وہی جزا دیتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں چونکہ ان افعال کی جزا ان افعال سے ملتی جلتی ہے لہٰذا مجازاً اس پر مکر وغیرہ الفاظ کا اطلاق کر دیا گیا ہے۔ اسے اصطلاح علم بدیع میں "مشاکلہ" کہا جاتا ہے جیسے یہ

باب الاعتقاد

فی صفات الذات وصفات الافعال

قال الشیخ ابو جعفر اعتقادنا فی صفات الذات هو انّ کلّما وصفت اللہ تع من صفات ذاتہ فانما نرید بکلّ صفۃ منہا نفی ضدّھا عنہ عزّ و جلّ ونقول لم یزل اللہ عزّ وجلّ سمیعًا بصیرًا علیمًا

دوسرا باب

خداوند کریم کی صفات ذات اور صفاتِ فعل

حضرت شیخ ابو جعفر ابن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب ہم خدا کی کوئی ایسی صفت بیان کرتے ہیں جس کا تعلق اس کی ذات سے ہوتا ہے تو ہماری غرض اس مقام پر اس صفت کے ضد کی نفی کرنا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا ہمیشہ سے سمیع و بصیر ہے۔ علیم و حکیم ہے صاحبِ قدرت و عزت ہے اور اپنا نفقہ قائم ہے کہ اسے زوال نہیں وہ قدیم ہے۔ اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ سب صفتیں

ارشادِ قدرت اسی بنا پر ہے۔ وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا (س شوریٰ پ ۲۵ ع ۵) کہ برائی کی جزاء بھی اسی کی طرح برائی ہے۔ حالانکہ واضح ہے کہ جزاء میں کوئی برائی نہیں ہوتی۔ نیز اس آیت میں بھی یہی مشاکلہ کارفرما ہے ومن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم (بقرہ پ ۲ ع ۸) جو شخص تم پر ظلم و تعدی کرے تم بھی اس پر اسی طرح ظلم و تعدی کرو۔ حالانکہ ظالم کا مقابلہ اور دفاع قطعاً ظلم نہیں ہے مگر اسے بطور مشاکلہ و مماثلہ مجازاً ظلم کہا گیا ہے اس قسم کے محاورات کلام عرب میں شائع و ذائع ہیں۔ کما لا یخفی علی من لہ ادنی المام بکلام العرب۔ واسماء اللہ تعالیٰ انما توخذ باعتبار الغایات التی ھی افعال دون المبادی التی تکون انفعالات (بیضاوی ج ۱ ص ۱۰)

اہل سنت کے علماء محققین کی بھی یہی تحقیق ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۱۵ طبع یجازیھم علی استھزائھم سمی جزاء الاستھزاء باسمہ کما سمی جزاء السیئۃ السیئۃ اما المقابلۃ اللفظ باللفظ او لکونہ مماثلا لہ فی القدر۔ الخ۔ کذا فی التفسیر الکشاف ج ۱ ص ۳۵ طبع مصر۔ سمی جزاء الاستھزاء باسمہ کقولہ وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا ومن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ الخ۔ ان ھذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلاً۔

حکیمًا قادرًا عزیزًا حیًّا
قیومًا واحدًا قدیمًا و
ھذہ صفات ذاتہ ولا نقول
انہ عزوجل لم یزل
خلاقًا فاعلًا شائیًا مریدًا
راضیًا ساخطًا رازقًا و
ھابًا متکلمًا لان ھذہ
الصفات افعالہ وھی محدثۃ
لایجوزان یقال لم یزل اللہ
موصوفًا بھا

اس کی ذات سے متعلق ہیں، اور عین ذات کہلاتی ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ خداوندعالم ازل سے ہی خالق اور شروع سے ہی فاعل ہے، اور اس کا ارادہ و مشیئت ہمیشہ سے اپنی مخلوق کے ساتھ متعلق رہا ہے۔ وہ ابتدا سے ہی راضی یا راضی ہے کسی پر ناراض نہیں۔ وہ برابر ہمیشہ سے روزی دے رہا ہے، سخاوت کر رہا ہے۔ اور ازل سے ہی کلام پیدا کرنے والا ہے۔ اس قسم کی تمام صفات فعلی کہلاتی ہیں اور حادث ہیں۔ اس لئے یہ مناسب نہیں کہ خداوند عالم کو ایسی صفات کے ساتھ ہمیشہ سے متصف مانا جائے۔

کی تین قسمیں ہیں (۱) کیونکہ وہ صفات یا تو ذاتِ ایزدی کے لئے ہمیشہ ثابت ہوں گی (۲) یا ہمیشہ اس سے منفی ہوں گی (۳) یا کبھی ثابت اور کبھی منفی ہوں گی۔ پہلی قسم کی صفات کا تعلق چونکہ ذاتِ باری سے ہے اس لئے ان کو صفاتِ ذاتیہ، صفاتِ کمالیہ، صفاتِ جمالیہ، صفاتِ حقیقیہ اور صفاتِ ذات الاضافہ کہا جاتا ہے۔
اور یہ بنا بر مشہور آٹھ ہیں۔ قدرت، علم، حیات، ارادہ، ادراک، قدم، تکلم، صدق۔ اگرچہ عند التحقیق خداوند عالم کی صفاتِ کمالیہ بے شمار اور غیر محدود ہیں۔ جیسا کہ اس مطلب پر سابقہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جا چکی ہے اور یہ امر بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ چونکہ یہ صفات عین ذات ہیں، یعنی ذات اور صفات میں کسی وقت بھی تفکیک وجدائی متصور نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جس طرح ذاتِ ایزدی کی کنہ حقیقت تک ہمارے عقول و افہام کی رسائی ممکن نہیں۔ اسی طرح ان صفات کی حقیقت تک بھی رسائی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر حضرت مصنف علام نے فرمایا ہے کہ جب ہم خداوندِ عالم کو ان صفات کے ساتھ متصف کرتے ہیں تو درحقیقت مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان صفاتِ جمیلہ کی اضداد کی نفی کی جائے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا عالم ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جاہل نہیں ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا قادر ہے۔ تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عاجز نہیں ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ورنہ ہم علم و قدرت خداوندی کی اصل حقیقت و کیفیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس مطلب جلیل کی تفصیل بھی پہلے گذر چکی ہے دوسری قسم کی صفات کو صفاتِ سلبیہ کہا جاتا ہے۔ جن کا تفصیلی تذکرہ سابقہ مباحث میں ہو چکا ہے۔ اور تیسری قسم کی صفات کو صفاتِ فعلیہ اور صفات اضافات محضہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق فعل خداوندی کے ساتھ ہوتا

باب الاعتقاد فی التکلیف

قال الشیخ ابو جعفر اعتقادنا فی التکلیف هو انّ اللہ تع لم یکلّف عبادہ الّا دون ما یطیقون کما قال تع لا یکلّف اللہ نفسًا الّا وُسعہا

تیسرا باب: بندوں کی شرعی تکلیف کس قدر ہے؟

جناب شیخ ابو جعفر فرماتے ہیں
ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ خدائے لم یزل نے اپنے بندوں کو ان کی طاقت سے کم ہی تکلیف دی ہے جیسا کہ وہ خود بھی ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے ولا یکلّف اللہ نفسًا الّا وسعہا۔ یعنی اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اور وسعت طاقت

صفات ذات و فعل کا باہمی فرق

ہے نہ کہ ذات کے ساتھ جیسے خالق و رازق و محی اور ممیت وغیرہ صفات۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ خداوند عالم سے خلق و رزق وغیرہ افعال صادر نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس وقت وہ خالق و رازق اور محی و ممیت نہیں تھا۔ ہاں بعد میں جب اس نے یہ کام انجام دیئے تو وہ خالق و رازق کہلایا۔ اسی جامع بیان سے صفاتِ ذاتیہ اور صفاتِ فعلیہ کا باہمی فرق بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کی بقدر ضرورت توضیح یہ ہے کہ وہ صفاتِ جلیلہ جن کا ذاتِ باری میں ہمیشہ پایا جانا ضروری ہو۔ اور ان کی اضداد سے اس کا متصف ہونا بوجہ لزوم نقص در ذات درست نہ ہو۔ انہیں صفاتِ ذات کہا جاتا ہے۔ جیسے علم و قدرت اور حیات وامثالہا کیونکہ خلاق عالم کو کسی وقت بھی ان صفات کی اضداد یعنی جہل و عجز اور موت سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس سے اس کی ذات میں نقص لازم آتا ہے اور وہ صفات جن سے اس کا ہمیشہ متصف ہونا ضروری نہ ہو بلکہ ان کی اضداد سے بھی اسے متصف کرنا صحیح ہو کیونکہ اس سے ذات باری میں کوئی نقص لازم نہیں آتا تو ان کو صفتِ فعل کہا جاتا ہے۔ جیسے خلق و رزق وامثالہا۔ کیونکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ایک وقت وہ تھا کہ خداوند عالم موجود تھا۔ لیکن بالفعل خالق اور رازق نہ تھا بلکہ اب بھی بعض چیزوں کا خالق نہیں ہے یہ ہے صفات ذات جو کہ عین ذات ہیں اور صفات فعل ہیں جو کہ زائد بر ذات ہیں
باہمی فرق جو کہ مصنف علام کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے اور حضرت ثقۃ الاسلام کلینی قدس سرہ نے بھی اُصول کافی میں ان کے درمیان یہی فرق بیان فرمایا ہے۔ اور بھی بہت سے محققین نے اسی طرح افادہ فرمایا ہے۔ بہر حال [illegible] صفات باری کا مبحث بہت طویل الذیل اور معرکۃ الآراء ہے۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی ضرورت۔ مزید تفصیل کے شائقین کتب مبسوطہ مثل عماد الاسلام وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔ ھذا بیان للناس وھدًی وموعظۃ للمتقین۔

تیسرا باب: تکلیف شرعی کے حُسن اور اس کی مقدار کے بیان میں

علماء متکلمین نے تکلیف شرعی کی ماہیت و حقیقت معلوم کرنے میں بڑی موشگافیاں کی ہیں جن کا یہاں نقل

والوسع دون الطاقة وقال الصادق علیہ السلام واللہ ما

سے کم درجہ کو کہا جاتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں، بخدا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو ان کی طاقت

کرنا چنداں مفید نہیں ہے۔ بہرحال اس کی شرعی تعریف یہ ہے۔ خداوند عالم کا اپنے بندوں کو بعض ایسے افعال کی بجاآوری یا ان کے ترک کرنے کا حکم دینا جن میں فی الجملہ مشقت ہو۔ اور یہ حکم وعدۂ ثواب یا وعیدِ عقاب پر بھی مشتمل ہو۔ یہ تکلیف دو قسم کی ہے۔ ایک تکلیفِ عقلی، دوم تکلیف شرعی۔ ان ہر دو تکالیف کی تفاصیل بیان کرنیکی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

شرعی تکلیف کی خوبی و عمدگی

جہاں تک شرعی تکلیف کے حسن اور اس کی عمدگی کا تعلق ہے وہ ارباب دانش وبینش پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں اجمالاً اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے، کہ یہ تکلیف خدائے حکیم نے عائد کی ہے۔ اور سابقہ مباحث میں ثابت کیا جا چکا ہے۔ کہ خدائے تعالیٰ کا کوئی فعل عبث اور حکمت ومصلحت سے خالی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کسی فعل قبیح وشنیع کا ارتکاب کرتا ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ تکلیف ضرور کسی نہ کسی غرض وغایت کے تحت ہی عمل میں آئی ہے، ورنہ اس کا عبث ہونا لازم آئے گا۔ اور خدا ہرگز کوئی عبث کام نہیں کرتا۔ افحسبتم انما خلقناکم عبثا وانکم الینا لاترجعون ہاں البتہ اس کا فائدہ مکلف ہی کی طرف عائد ہوتا ہے نہ کہ خدا کی طرف۔ کیونکہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ مزید براں ہم ذیل میں اس کی حسن وخوبی پر تنبیہ غافل وتنشیط عاقل کی خاطر ایک تفصیلی دلیل ذکر کرتے ہیں، جس سے شرعی تکلیف کے فوائد وعوائد نکھر کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تکلیف ہی وہ خدائی عطیہ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ ہے کہ جس کی وجہ سے حضرت انسان اور عام حیوان میں امتیاز قائم ہے ورنہ صاف ظاہر ہے کہ اگر انسان سے حلال وحرام، حسن وقبیح اور صحیح وغلط امور کے سمجھنے اور ان کی پابندی کرنے کی ذمہ داری ختم ہو جائے اور اس کا مطمح نظر صرف یہ ہو کہ جو چیز کھانے کے قابل مل جائے۔ اس سے تنورِ شکم کو پر کرلے اور تسکین شہوت کے لائق جو چیز مل جائے۔ اس سے جنسی خواہش کی تسکین کر لے تو پھر اس میں اور ایک حیوان میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے بلکہ اس صورت میں اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ایسا انسان حیوان کے برابر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جاتا ہے چنانچہ ارشاد رب العزت بھی اس کا مؤید ہے۔ اولئک کالانعام بل ھم اضل کہ ایسے لوگ چوپایوں کی مثل ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر، کیونکہ حیوان اگر کھانے اور شہوت مٹانے میں حلال وحرام اور جائز وناجائز کا امتیاز نہیں کرتا تو وہ عقل وادراک کی قوت نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ومعذور ہے۔ لیکن حضرت انسان اگر عقل وشعور رکھنے کے باوجود اس تفریق وتمیز کا قائل وعامل نہ ہو، تو یقیناً عقل سلیم یہی فیصلہ کرتی ہے کہ وہ حیوانات و

كلف الله العباد الا دون ما يطيقون لانه انما كلفهم فی | بھی کم تکلیف دی ہے۔ اسی بنا پر اس نے دن رات میں صرف پانچ نمازیں اور سال بھر میں صرف ماہ رمضان المبارک کے

حشرات سے بھی بدتر ہے۔ لہٰذا اس نعمتِ عظمیٰ پر خلاق عالم کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے وہ کم ہے کہ اس نے نعمتِ عقل کے ساتھ دولت تکلیف سے بھی نوازا ہے۔ تکلیف کے اسی حسن اور اس کی اسی خوبی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے امام چہارم حضرت امام زین العابدین علیہ السلام صحیفہ کاملہ کی پہلی دعا میں فرماتے ہیں۔ الحمد لله الذی لو حبس عن عباده معرفة حمده علی ما ابلاهم من مننه المتتابعة واسبغ علیهم من نعمه المتظاهرة لتصرفوا فی مننه فلم یحمدوه وتوسعوا فی رزقه فلم یشکروه ولو کانوا کذلك لخرجوا من حدود الانسانیة الی حد البهیمیة فکانوا کما وصف فی محکم کتابه ان هم الا کالانعام بل هم اضل سبیلا۔ تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں کہ جو اگر اپنے بندوں کو اپنے حمد و شکر کی معرفت سے باز رکھتا باوجود ان مسلسل عطیات کے جو اس نے مرحمت فرمائے ہیں۔ اور باوجود اپنی ان پے درپے نعمات کے جو اس نے ارزانی فرمائی ہیں تو وہ ان کے انعامات میں تصرف تو کرتے مگر اس کی حمد و ثنا نہ کرتے اور اس کے رزق سے نفع اندوز ہوتے مگر اس کا شکر ادا نہ کرتے اور اگر وہ اس طرح کرتے تو پھر اس طرح ہو جاتے کہ انسانیت کے حدود سے نکل کر چوپاؤں کے حدود میں داخل ہو جاتے اور اس طرح ہو جاتے جس طرح خداوند عالم نے اپنی محکم کتاب میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ چوپاؤں کی مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اسی لئے تو یہ کہا گیا ہے۔ ؎

لعمرك ما الادیان الا سعادة

وما الناس لولا الدین الا بهائم

تیری زندگی کی قسم یہ دین سراسر سعادت ہی سعادت ہے اور اگر یہ دین نہ ہو جو کہ چند تکالیف شرعیہ کے مجموعہ کا نام ہے تو لوگ شکل چوپاؤں کے ہو کر رہ جائیں۔

شرعی تکلیف کے شرائط

خالق حکیم نے ایسا بھی نہیں کیا کہ ہر جائز و ناجائز غلط اور صحیح تکلیف ہر ایک شخص پر ہر ایک حال میں ٹھونس دی ہو بلکہ جب تکلیف و مکلف کے شرعی حدود اور اس کے قیود و ضوابط پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی جاتی ہے۔ تو محسن حقیقی کے انعام و احسان کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اور ارشاد قدرت ما جعل علیکم فی الدین من حرج اور یرید الله بکم الیسر ولا

كلّ يوم وليلة خمس صلوٰة
وكلّفهم في السنة صيام
ثلثين يومًا وكلّفهم في

تیس روزے اور دو سو درہموں میں پانچ درہم سالانہ زکوٰۃ
اور ساری عمر میں صرف ایک دفعہ
حج کو واجب اور فرض قرار

دیں یہ دیکھ الحسیو کی حقانیت وصداقت اجاگر ہو جاتی ہے اور اسلام کا دینِ فطرت ہونا روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ اس سلسلہ میں چار قسم کی شرائط موجود ہیں۔ بعض کا تعلق خود مکلِّف (تکلیف دہندہ) کی ذات سے ہے اور بعض کا رابط مکلَّف (جس پر تکلیف عائد کی جا رہی ہے) سے ہے اور بعض کا واسطہ خود تکلیف اور بعض کا ارتباط مکلَّف بہ (فعل) کے ساتھ ہے۔ ہم یہاں بنظرِ اختصار قسمِ اوّل کے شرائط کو نظر انداز کر کے دیگر بعض شرائط کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں۔

شرطِ اوّل۔ یہ کہ مکلَّف موجود ہو۔ کیونکہ معدوم پر کسی قسم کی تکلیف عاید کرنا بالبداہت باطل ہے۔

شرطِ دوئم۔ یہ کہ مکلَّف بالغ و عاقل ہو۔ کیونکہ اطفال و مجانین پر شرعی تکالیف عاید کرنا عقلاً قبیح اور پھر مخالفت کی صورت میں ان کو سزا دینا سراسر شنیع اور ظلم صریح ہے۔ وما ربّك بظلام للعبيد۔

شرطِ سوئم۔ یہ کہ مکلَّف تکالیف کا مفہوم و مطلب سمجھنے کی اہلیت ولیاقت رکھتا ہو۔ اور اسے اس طرح مطلب سمجھا بھی دیا جائے کہ وہ سمجھ جائے۔ تکلیف قبل البیان درست نہیں ہے۔ وما ارسلنا من نبي الا بلسان قومه۔ وما كنا معذبين حتى نبعث رسولًا۔

شرطِ چہارم۔ یہ کہ وہ تکلیف مکلَّف کے لئے ممکن العمل ہو۔ اور اس کی طاقتِ برداشت سے باہر نہ ہو۔ کیونکہ کسی شخص کو اس کی طاقتِ برداشت سے زیادہ تکلیف دینا سراسر ظلم و جور ہے۔ اور الطاف و مراحم ربّانیہ کے منافی ہے۔ مثلاً ایک زمین گیر اپاہج کو دوڑنے یا بلا اسباب ہوا میں اڑنے کی تکلیف دینا۔ یا کسی انسان کو پہاڑ سر پر اٹھانے کا حکم دینا یا اسے اس امر کا پابند کرنا کہ خدا کی طرح کوئی مخلوق پیدا کرے اور پھر تعمیل نہ کرنے کی صورت میں اسے سزا دینا اس امر کی قباحت و شناعت میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اس لئے خداوند عالم بار بار ارشاد فرماتا ہے۔ لا يكلّف الله نفسًا الا وسعها۔ خدائے رحیم کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ ان مسلمانوں کی ذہنیت پر تعجب ہے جو تکلیفِ مالایطاق کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ افعال جو طاقت وقدرت کے تحت ہیں۔ اور وہ افعال جو طاقت وقدرت سے باہر ہیں۔ ان کا باہمی فرق تو گدھے بھی سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ابو الہذیل علاف معتزلی کہا کرتا تھا کہ "حمار بشر اعقل من بشر لان حمار بشر لو اتيت به الى جدول صغير

کل ماتی درهم خمسة دراهم وکلفهم فی العمر حجة واحدة وهم یطیقون اکثر من ذلك

دیا ہے۔ حالانکہ بندوں کی طاقت اس سے بھی زیادہ ہے۔

وضربته فانه یطفره ولو اتیت به الی جدول کبیر وضربته فانه لا یطفره ویروغ عنه لانه یفرق بین ما یقدر علی طفره وبین ما لا یقدر علیه وبشر لا یفرق بین المقدور وغیر المقدور" (استقصاء النظر مش) بشر اشعری، کا گدھا خود بشر سے زیادہ عقلمند ہے۔ کیونکہ اگر تم اس کے گدھے کو کسی چھوٹے سے نالے پر لے جاؤ۔ اور اسے عبور کرنے کے لئے ایڑ لگاؤ۔ تو وہ اسے جست لگا کر عبور کر جائے گا لیکن اگر اسے کسی بڑے نالے پر لے جاؤ تو اسے جس قدر مارو پیٹو وہ ہرگز جست نہیں لگائے گا۔ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کہاں جست لگا کر عبور کرنے پر قادر ہے اور کہاں قادر نہیں ہے؟ مگر جناب بشر مقدور اور غیر مقدور میں کوئی فرق نہیں سمجھتا" اس لئے تکلیف مایطاق اور تکلیف مالایطاق کو جائز قرار دیتا ہے۔ وما قدروا اللہ حق قدرہ۔ لهم قلوب لا یفقهون بها۔

شرط پنجم۔ یہ کہ وہ تکلیف ایسے امر کے متعلق ہو کہ اسے اس کی بجا آوری پر ثواب اور تعمیل نہ کرنے کی صورت میں عذاب کا استحقاق حاصل ہو۔ کیونکہ اگر جزا و سزا نہ ہو تو پھر مجرم و محسن اور صالح و طالح کا مساوی ہونا اور اس طرح تکلیف کا عبث ہونا لازم آئے گا۔ افنجعل المسلمین کالمجرمین۔ مالکم کیف تحکمون۔

شرط ششم۔ یہ کہ وہ تکلیف جو کسی امر کے بجا لانے کے متعلق ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ امر حرام نہ ہو اور اگر کسی امر کے ترک کے متعلق ہے تو وہ واجب نہ ہو۔ کیونکہ اگر ایک ہی امر ایک ہی اعتبار سے واجب بھی ہو اور حرام بھی ہو تو اس طرح اجتماع ضدین لازم آئے گا جو کہ محال ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ مطلب بالکل واضح و لائح ہو جاتا ہے کہ ان شرائط کی موجودگی میں خالق حکیم پر تکلیف کا عائد کرنا فقط جائز ہی نہیں بلکہ ضروری و لازمی ہے۔ ورنہ مخلوق کی خلقت کا عبث و بے فائدہ ہونا لازم آئے گا جو کہ بالضرورۃ باطل ہے۔ افحسبتم انما خلقناکم عبثا و انکم الینا لا ترجعون۔ (کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور تم ہماری بارگاہ میں پلٹ کر نہیں آؤ گے؟)۔ وما خلق السموت والارض باطلاً۔ ذلك ظن الذین کفروا۔ خدا تعالٰی نے زمین و آسمان کی خلقت عبث نہیں فرمائی۔ ایسا خیال کافر ہی کرتے ہیں۔ نیز اگر خالق اکبر انسانی خلقت میں قوائے شہویہ و غضبیہ وغیرہ محرکات معصیت ودیعت فرما کر گناہوں سے روک تھام کا کوئی انتظام نہ فرمائے تو اس طرح خالق عالم پر اغراء بر امر قبیح اور تحریص بر فعل شنیع کرنے کا سنگین الزام عائد ہوگا۔ جس سے اس کی شان ربوبیت کہیں اجل و ارفع ہے۔ تعالی اللہ عن ذلك علوا کبیرا۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

باب الاعتقاد فی افعال العباد۔ قال الشیخ اعتقادنا فی افعال العباد انها مخلوقة خلق تقدیر لا خلق تکوین و معنی ذلك انه لم یزل الله عالمًا بمقادیرها۔

چوتھا باب۔ بندوں کے افعال کے متعلق عقیدہ۔ حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ بندوں کے افعال کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ تقدیری خلقت کے اعتبار سے پیدا کئے ہوئے ہیں نہ کہ خلقت تکوینی کے لحاظ سے اور خلق تقدیری کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم ہمیشہ سے اپنے بندوں کے افعال اور اُن کی اچھائی و برائی کے اندازوں سے واقف و آگاہ رہا ہے

چوتھا باب

افعال العباد کے متعلق ہمارا عقیدہ

یہ مسئلہ فی الحقیقت مسئلہ جبر و اختیار کا ایک شعبہ ہے۔ جو کہ اسلامی مسائل میں سے ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے اور قدیم الایام سے مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ حالانکہ اگر بنظر عدل و انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہ تھا جتنا کہ اسے بنا دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص تعصب و عناد کی پٹی آنکھوں سے اتار کر سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع پر غور و فکر کرے تو حقیقت حال اس پر منکشف ہو جاتی ہے مصنف علام نے جو یہ فرمایا ہے کہ بندوں کے افعال بہ خلق تقدیری مخلوقِ خدا ہیں نہ بہ خلق تکوینی اور اس کا مطلب انہوں نے یہ بیان فرمایا ہے کہ خدا نے ان کو خود ایجاد و خلق نہیں فرمایا۔ ہاں وہ ہر ایک فعل کو اس کے صادر ہونے اور ظہور پذیر ہونے سے پہلے جانتا ہے۔" اس پر حضرت شیخ مفید اعلی اللہ مقامہ نے یہ کہہ کر کہ یہ ایک خبرِ ضعیف کا مضمون ہے۔ بحث لے دے فرمائی ہے۔ حالانکہ اس قسم کی متعدد روایات سوم بحار الانوار وغیرہ کتب احادیث میں موجود ہیں۔ وہ روائتیں ملاحظہ ہوں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ فرماتے ہیں۔ افعال العباد مخلوقة لله خلق تقدیر لا خلق تکوین والله خالق کل شئ۔ اسی طرح رسالہ ذہبیہ میں حضرت امام رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔ و افعال العباد مخلوقة خلق تقدیر لا خلق تکوین!! بہر حال جب دونوں بزرگواروں کا مقصد ایک ہی ہے کہ خداوند عالم ہمارے افعال کا خالق و موجد نہیں ہے۔ ہاں وہ ہمارے افعال اور ہمارے آغاز و انجام کا عالم ضرور ہے تو پھر یہ بحث کرنا کہ یہ ایک حدیث کا مضمون ہے یا متعدد احادیث کا مفاد ہے آیا خلق "بمعنی علم" استعمال ہوا ہے یا نہیں ہم اسے مغالطہ سے مغالطہ لفظوں میں بظاہر لفظی نزاع ہی کہا جاتا ہے بہر کیف اس مسئلہ کی احادیث و

اہمیت کے پیش نظر ہم اس پر قدرے تفصیلی گفتگو کر کے اس کے جملہ پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

افعال تکوینی و افعال تشریعی کا باہمی امتیاز

قبل اس کے کہ اصل موضوع پر گفتگو کی جائے بطور تمہید یہ جاننا ضروری ہے کہ بندوں کے افعال دو قسم کے ہیں۔

(۱) کچھ "افعال تکوینیہ" ہیں جیسے صحت و مرض قد و قامت کی درازی یا کوتاہی اور رنگ کی سفیدی یا سیاہی۔ خوبصورتی یا بدصورتی وغیرہ۔ اور (۲) کچھ "افعال تشریعیہ" ہیں جیسے نماز پڑھنا روزے رکھنا یا زنا کاری و شراب خواری کا ارتکاب کرنا وامثالہا۔ پہلی قسم کے بارہ میں تمام مکاتیب فکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ان میں انسان کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں بلکہ وہ ان افعال میں مجبور محض ہے۔ ہاں جو کچھ اختلاف ہے وہ دوسری قسم کے افعال میں ہے۔ اس سلسلہ میں اُمتِ اسلامیہ کے اندر تین قول ہیں (۱) جبر یعنی یہ کہ انسان بالکل بے اختیار ہے وہ جو کچھ نیک یا بد کرتا ہے۔ فی الحقیقت اس سے خود خدا کراتا ہے (۲) تفویض یعنی یہ کہ جو کچھ کرتا ہے بندہ ہی کرتا ہے۔ خدا کے اختیار یا اس کی قدرت کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں ہے (۳) نہ کامل جبر اور نہ مکمل اختیار۔ بل الامر بین الامرین۔ حقیقت ان دونوں نظریوں کے بین بین ہے۔ یہ تیسرا قول مذہب امامیہ کا مختار ہے۔ پانچویں باب میں اس کی کماحقہ وضاحت کی جائے گی انشاء اللہ۔ یہاں فقط جبر و اختیار کے اقوال کی رد کر کے تیسرے قول کے فی الجملہ مختار ہونے کی تائید کرنا مقصود ہے۔ اس پر ذیل میں چند ادلہ عقلیہ و نقلیہ قائم کئے جاتے ہیں۔ افعال کی اوپر جو تقسیم کی گئی ہے۔ یہ کلام معصوم سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہی جبر و اختیار کا مسئلہ دریافت کیا تو آنجناب نے فرمایا۔ ما استطعت ان تلوم العبد علیہ فہو فعلہ وما لم تستطع ان تلوم العبد علیہ فہو فعل اللہ یقول اللہ للعبد لم عصیت لم فسقت لم شربت الخمر لم زنیت فہذا فعل العبد ولا یقول لم مرضت لم قصرت لم ابیضضت لم اسوددت لانہ من فعل اللہ فی العبد (طرائف۔ بحار الانوار ج ۲) جس فعل پر تم بندہ کی ملامت کر سکو وہ بندہ کا فعل ہے اور جس پر تم اس کی ملامت نہ کر سکو وہ اللہ سبحانہ کا فعل ہے چنانچہ خداوند عالم بروز قیامت بندہ سے یہ باز پرس تو کرے گا کہ تو نے کیوں نافرمانی کی؟ فسق و فجور کیوں اختیار کیا؟ شراب کیوں پی؟ زنا کیوں کیا؟ اس لئے کہ یہ بندہ کے افعال ہیں۔ لیکن خدا بندہ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تو مریض کیوں ہوا تھا؟ تیرا قد چھوٹا کیوں تھا؟ تو سفید کیوں تھا؟ اور تو سیاہ کیوں تھا؟ اس لئے کہ یہ خدا تعالیٰ کے افعال ہیں۔ اگرچہ دیدہ و دل رکھنے والے حضرات کے لئے اس نزاعی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے امام عالی مقام کا یہی کلام حقیقت ترجمان کافی ہے۔ مگر ہم اس موضوع پر مزید تسلی و اطمینان کے لئے چند عقلی و نقلی دلائل قائم کرتے ہیں۔

نظریہ جبر کی ردّ اور بندوں کے فاعل بااختیار ہونے پر ادلۂ عقلیہ۔

دلیل اوّل: یہ کہنا کہ

بندے اپنے افعال تکلیفیہ میں مجبور ہیں۔ بالبداہت باطل ہے۔ کیونکہ انسان کی حرکاتِ اختیاریہ جیسے اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، چلنا، پھرنا وغیرہ اور حرکاتِ اضطراریہ مثل حرکت نبض اور حرکت مرتعش در رعشہ والے آدمی کی حرکت (اسی طرح مکان کی چھت سے بذریعہ سیڑھی اُترنے والے شخص کی حرکت اور چھت سے گرنے والے کی حرکت کے درمیان جو فرق ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ کوئی بھی عقلمند آدمی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ بلکہ بچے اور دیوانے بھی اسے سمجھتے ہیں۔ پس ہم پوچھتے ہیں کہ انسان جو اچھے کام مثلاً صوم و صلوٰۃ بجالاتا ہے یا بُرے کام مثلاً زنا و چوری کا ارتکاب کرتا ہے۔ آیا اس کے یہ افعال از قسم حرکاتِ اختیاریہ ہیں یا از قسم حرکاتِ اضطراریہ؟ اس سلسلہ میں انسانی ضمیر و وجدان کا فیصلہ عیاں راچہ بیان کا مصداق ہے! کل انسان علی نفسہ بصیرۃ و لو القی معاذیرہ۔

دلیل دوم۔ اگر انسان اپنے افعال میں مجبور ہوں اور درحقیقت فاعل خداوند عالم ہی ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ انسانوں کی بجائے (معاذ اللہ) خود خداوند عالم کاذب و خائن اور فاسق و فاجر اور ظالم و جابر قرار پائے اور خود ہی حدود و تعزیر کا مستحق ہو اور انسانوں پر حدود و تعزیر کو جاری کرنا اور ان کو سزا و جزا دینا محض ظلم اور بے انصافی پر مبنی ہو۔ تعالی عما یقول الظالمون علواً کبیراً۔

دلیل سوم۔ اگر انسان اپنے اچھے اور بُرے کاموں میں فاعل مختار نہ ہوں تو لازم آئے گا کہ انبیاء و مرسلین کی غرض بعثت لغو و عبث ہو کر رہ جائے کیونکہ اس صورت میں کافر و گنہگار لوگ بڑی جرأت و بے باکی کے ساتھ یہ کہہ کر انبیاء کو خاموش کر سکتے ہیں کہ جب خدا ہی ہم سے کفر و عصیان کراتا ہے تو پھر ہم کس طرح ایمان لا سکتے ہیں ؎

در کوئے نیک نامی ما را گذر ندادند　　　ما مانمی پسندی تغییر دہ قضا را

ہم تو خدا سے مقابلہ کی تاب و توانائی نہیں رکھتے تم جا کر خدائے عزوجل سے کہو کہ وہ ہم میں اسلام و ایمان پیدا کرے۔ اہل انصاف بتائیں۔ اس صورت میں انبیاء کرام علیہم السّلام کے پاس سکوت و خاموشی سے بہتر اور کیا جواب ہو سکتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ اس صورت میں ان کو ایمان لانے کی تکلیف دینے سے تکلیف مالایطاق لازم آتی ہے جس کا بطلان گذشتہ باب میں دلیل و برہان سے کیا جا چکا ہے۔ ہذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا۔

دلیل چہارم۔ اگر بندے اپنے افعال میں با اختیار نہ ہوں تو اس صورت میں مسئلہ ثواب و عقاب اور وجود جنت و نار اور انزال کتب و صحائف اور تشریع نظام شرائع سب لغو و بے فائدہ ہو کر رہ جائیں گے۔ کیونکہ اس صورت میں نہ کوئی اچھے کام کرنے پر مستحق مدح و ثنا رہے گا اور نہ کوئی برا کام کرنے پر مستوجب سزا قرار پائے گا۔ حالانکہ قرآن کریم صالحین کی تعریف و تمجید اور کفار و مشرکین اور فاسقین کی مذمت و تنقید سے بھرا پڑا ہے۔ نیز اس طرح اول الذکر حضرات کے لئے جو وعدہ ہائے نعیم اور ثانی الذکر کے لئے جو وعیدہائے جحیم کی گئی ہیں۔ اور اسی طرح دیگر قرآنی حقائق پر کیا اعتماد باقی رہ جاتا ہے؟ افنجعل المسلمین کالمجرمین۔ مالکم کیف تحکمون۔

دلیل پنجم - عقلی طور پر کوئی بھی انسانی فعل تین حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو بندے سے صادر ہوگا یا محض خدا سے سرزد ہوگا۔ یا خدا اور بندے کے اشتراک سے وجود میں آئے گا۔ اگر دوسری شق کو اختیار کیا جائے تو اس صورت میں گنہگار کو عذاب وعقاب کرنے میں سراسر ظلم وجور لازم آئے گا کیونکہ اس بنا پر تو مدح یا مذمت جزا یا سزا کا حقدار خود خالق کردگار ہی قرار پاتا ہے جب گناہ خود خدا تعالٰی نے کرایا ہے۔ تو پھر آدمی کو سزا دینا چہ معنی دارد۔ اور اگر تیسری شق کو اختیار کیا جائے تو تب بھی یہی خرابی لازم آئے گی۔ کیونکہ اس صورت میں چونکہ خدا کی شرکت کے ساتھ فعل وجود میں آیا ہے اور خدا شریک غالب ہے۔ لہٰذا باوجود اشتراک عمل کے کمزور شریک کو سزا دینا اور اسے مورد الزام قرار دینا صریح ظلم ہے۔ اور چونکہ خدائے قدوس کی ساحت اقدس ظلم وجور کی آلائش سے منزہ و مبرا ہے۔ (وما یظلم ربک احدًا) اس لئے ماننا پڑے گا کہ پہلی شق ہی صحیح ہے کہ بندہ ہی اپنے افعال کا خود فاعل ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ جزا و سزا اور مدح و مذمت کا استحقاق رکھتا ہے۔ انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا۔

دلیل ششم۔ اگر انسان اپنے افعال میں مختار نہ ہو، بلکہ اس کے اچھے اور برے افعال کا فاعل خدا ہی کو مانا جائے تو دریں صورت جہاں جہاں خداوند عالم نے ظالموں و کافروں اور گنہگاروں پر لعن طعن کیا ہے۔ جیسے لعنۃ اللہ علی الظالمین۔ لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ لعنۃ اللہ علی الکافرین وغیرہ تو اس لعنت کی بازگشت معاذ اللہ خود خدائے قدوس کی طرف ہوگی۔ اور وہی اس کا مستحق قرار پائے گا۔ تعالی اللہ عما یقولون علوًا کبیرًا۔

اس موضوع پر ادلۂ شرعیہ

خداوند عالم نے قرآن مجید و فرقان حمید میں بچند وجہ عقیدۂ جبر کی نفی و رد فرمائی ہے

وجہ اول:۔ قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیات شریفہ موجود ہیں جن میں بالتصریح یا بالتلویح بندوں کا فاعل مختار ہونا بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں چند آیات بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کی جاتی ہیں۔ (۱) لا اکراہ فی الدین (پ۳ سورہ بقرع ۱) دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے (۲) انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا (پ۲۹ سورہ دہرع ۱۹) ہم نے انسان کو راہ راست دکھا دیا ہے اب چاہے تو وہ شاکر بنے اور چاہے تو کافر بنے (۳) قل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر (پ۱۵ س کہف ع۱۶) اے رسول کہدو حق پروردگار عالم کی طرف سے ہے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے (۴) فمن شاء اتخذ الی ربہ مآبا (پ ۳۰ سورۃ نبا ع ۲) جو چاہے اپنے رب کی طرف رجوع کرے۔ صاحبان عقل و دانش غور فرمائیں کہ کس وضاحت وصراحت کے ساتھ انسان کے خود مختار ہونے کی ان آیات میں تصریح کی گئی ہے۔ جس فعل کا بجالانا اور ترک کرنا اختیار میں ہو اسی فعل کو ہی تو فعل اختیاری اور اس کے فاعل کو فاعل مختار کہا

جاتا ہے۔ بایں ہمہ جو شخص ایسی آیات محکمات کو چھوڑ کر بعض متشابہ آیات کے ساتھ تمسک کرے تو اس کج فہمی اور کج سلیقگی کا کیا علاج ہے؟ سچ ہے۔ والذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ (پ۳ سورہ آل عمران ع ۸) جن لوگوں کے دل ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ وہ فتنہ و فساد کی غرض سے متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔

وجہ دوم۔ ایسی آیات بھی قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں جن میں خداوند عالم نے اپنی ذات اقدس سے ظلم و جور اور کفر و شرک پر رضامند ہونے کی نفی فرمائی ہے۔ دو چار آیات مبارکہ بطور نمونہ ملاحظہ ہوں (۱) وما اللہ یرید ظلماً للعباد (ظلم کرنا تو بجائے خود) خداوند عالم اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا حالانکہ جبر کی صورت میں جزاو سزا سراسر ظلم و ستم ہے (۲) ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ۔ خداوند عالم ذرہ برابر بھی ظلم و جور نہیں کرتا (پ۵ سورۃ النساء ع ۳) (۳) وما ظلمناھم ولکن ظلموا انفسھم (پ۱۲ سورہ ہود ع ۹) ہم نے ہرگز ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنے نفوس پر ظلم کیا (۴) ولکن کانوا انفسھم یظلمون (پ ۱۴ سورہ النحل ع ۱۹) لیکن وہ خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے تھے (۵) ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر (پ۳ سورہ انشقاق ع ۹) خداوند عالم عدل و احسان کا حکم دیتا ہے اور فحشاء و منکر (افعال ناشائستہ) سے روکتا ہے! بھلا کوئی باعقل و انصاف آدمی یہ باور کر سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ بُرے کاموں سے روکے اور پھر خود ہی جبراً بندوں سے کرائے۔ نعوذ باللہ من ھذہ العقیدۃ الفاسدۃ (۶) واذا فعلوا فاحشۃ قالوا وجدنا علیہا آباءنا واللہ امرنا بھا قل ان اللہ لا یامر بالفحشاء ولا یرضیٰ لعبادہ الکفر۔ یہ لوگ جب خود کوئی برا کام کرتے ہیں تو اس کے جواز میں یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو اسی طریقہ پر پایا ہے۔ اور خداوند عالم نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ خلاقِ عالم کبھی بُرے کاموں کا حکم نہیں دیتا اور نہ ہی وہ اپنے بندوں کے کفر پر راضی ہوتا ہے۔ انصاف شرط ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کس طرح انسانی اختیار کا اثبات اور جبر کا ابطال کیا جا سکتا ہے۔

وجہ سوئم۔ وہ آیات ہیں جن میں انسانی افعال کی نسبت انسان ہی کی طرف دی گئی ہے اور آخر میں جزاو سزا کو انہی کے افعال خیر یا شر کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ (۱) فویل للذین یکتبون الکتب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ (پ۱ سورہ بقرہ ع ۹) افسوس ہے ان لوگوں کے لئے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے (۲) انما تجزون ما کنتم تعملون (پ۲۸ سورہ تحریم ع ۱۹) آج (روز قیامت) تمہیں اسی کی جزاو سزا دی جائے گی جو کچھ تم کرتے تھے (۳) لتجزی کل نفس بما تسعیٰ (پ۱۶ سورہ طہٰ ع ۱۰) ہر آدمی کو اس کی کوشش کے مطابق جزا دی جائے گی (۴) الیوم

تجزی کل نفس بما کسبت (پ۲۴ سورہ ... ع ۱۰) آج ہر آدمی کو وہی جزا و سزا دی جائے گی۔ جو کچھ اس نے کیا ہے (۵) ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم یعنی ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا (پ۱۳ سورہ رعد ع ۸)

وجہ چہارم:۔ وہ آیات ہیں جن میں کفار و مشرکین کو ایمان نہ لانے پر زجر و توبیخ کی گئی ہے۔ اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہیں کفر اختیار کرنے پر کوئی مجبوری نہیں ہے (۱) ارشاد ہوتا ہے وما منع الناس ان یومنوا (پ۱۵ سورہ بنی اسرائیل ع ۱۱) لوگوں کو کیا چیز ایمان لانے سے روکتی ہے؟ (۲) فما لھم عن التذکرۃ معرضین (پ۲۹ سورہ مدثر ع ۱۶) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ نصیحت سے روگرداں ہیں (۳) لم تصدون عن سبیل اللہ (پ۴ سورہ اعراف ع ۱۸) تم کیوں لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے ہو (۴) لم تلبسون الحق بالباطل (پ۳ آل عمران ع ۱۵) تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ مخلوط کرتے ہو (۵) ما منعک ان تسجد لما خلقت (پ۲۳ سورہ ص ع ۱۴) اے شیطان تمہیں کس چیز نے روکا کہ تو اسے سجدہ کرے جسے میں نے خلق کیا ہے۔ (۶) ما لھم لا یومنون (پ۳۰ سورہ انفطار ع ۷) ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے؟ یہ آیاتِ مبارکہ بھی بندوں کے اختیار کے ثبوت اور اشاعرہ کے جبر و اضطرار کی نفی میں نص صریح ہیں۔ کیونکہ خداوند عالم نے ان آیات میں بندوں سے ان کے کفر و شرک اور عصیاں اختیار کرنے پر سوال کیا ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ تو اگر اشاعرہ کا مذہب صحیح ہوتا تو بندے جواب میں عرض کر سکتے تھے کہ بارالہا۔ تو ہی نے تو ہم میں کفر و شرک پیدا کر کے ہمیں کفر و شرک پر مجبور کیا ہے۔ اور پھر ہماری سرزنش بھی کرتا ہے۔ لیکن ان کا سکوت اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ جبر والا نظریہ بالکل غلط اور باطل ہے۔ وھو المقصود۔ اور یہ باطل نظریہ ہے کہ کفار مکہ بھی اس کے قائل نہ تھے۔

وجہ پنجم:۔ وہ آیات ہیں جن میں کافروں اور گنہگاروں کا اپنا اقرار و اعتراف موجود ہے۔ کہ کفر و گناہ خود انہی سے سرزد ہوا ہے (۱) فی جنّات یتساءلون عن المجرمین ما سلککم فی سقر قالوا لم نک من المصلّین ولم نک نطعم المسکین (پ۲۹ سورہ مدثر ع ۱۶) جنتی لوگ مجرموں سے سوال کریں گے کہ تمہیں کس چیز نے داخل جہنم کیا ہے؟ تو وہ جواب دیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مساکین کو طعام نہیں کھلاتے تھے (۲) کلما القی فیھا فوج سالھم خزنتھا الم یاتکم نذیر قالوا بلیٰ قد جاءنا نذیر فکذبنا وقلنا ما نزل اللہ من شئ (پ۲۹ سورہ ملک ع ۱) جب بھی کافروں کی کوئی فوج جہنم میں جھونکی جائے گی تو خازنانِ جہنم ان سے پوچھیں گے۔ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ جواب دیں گے ہاں یقیناً ڈرانے والا (نبی) تو ضرور آیا تھا لیکن ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا

کہ خدا نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔ قالوا ربنا انا اطعنا سادتنا وکبرائنا فاضلونا السبیل ربنا اٰتهم ضعفین من العذاب والعنهم لعناً کبیراً (پ ۲۲ سورہ احزاب ع ۵) کافر کہیں گے بارالہا! ہم نے اپنے بزرگوں کی اطاعت کی۔ اور انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ یا اللہ! تو ان پر دوہرا عذاب نازل کر اور ان پر بڑی لعنت بھیج۔ دیکھئے جہنمی بھی اقرار کر رہے ہیں۔ کہ کفر و عصیان ہم ہی سے سرزد ہوا ہے۔ یا ان کی ضلالت کا سبب ان کے بزرگ بنے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس الزام کا مورد خداوند عالم کو قرار نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اس سلسلہ میں خداوند عالم کو مورد الزام قرار دیتے ہیں وہ ان دوزخیوں سے بھی بدتر ہیں۔

وجہ ششم۔ بعض آیات ایسی بھی موجود ہیں جن میں خلّاق عالم نے مجبرے بندوں سے اور ان کی برائیوں سے اپنی برأت و بیزاری ظاہر فرمائی۔ جیسے انّ اللہ برئ من المشرکین (پ ۱۰ سورہ توبہ ع ۱) ظاہر ہے اگر خدا نے خود برائی کرائی ہوتی۔ اور خود ان کے اندر اسے پیدا کیا ہوتا تو پھر ان سے برأت ظاہر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا چنانچہ صاحب تفسیر المیزان نے شرح عقائد شیخ مفید علیہ الرحمۃ کے حوالہ سے ایک روایت نقل فرمائی ہے۔ کہ امام علی نقی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ "افعال العباد اهی مخلوقة للّٰہ" کیا بندوں کے افعال خدا کے مخلوق ہیں؟ فقال علیہ السلام لو کان خالقا لها لما تبرأ منها وقد قال سبحانه انّ اللہ برئ من المشرکین ولم یرد البرائة من خلق ذواتهم وانما تبرء من شرکهم وقبائحهم۔ فرمایا اگر خدا بندوں کے افعال کا خالق ہوتا تو ہرگز ان سے بیزاری ظاہر نہ کرتا۔ حالانکہ وہ ارشاد فرماتا ہے تحقیق خداوند عالم مشرکوں سے بیزار ہے۔ اس آیت مبارکہ میں خدا نے مشرکین کی ذوات کے پیدا کرنے سے بیزاری ظاہر نہیں کی بلکہ ان کے شرک اور قبیح اعمال سے اپنی برأت ظاہر فرمائی ہے۔

نظریہ تفویض کی ردّ

(۱) مباحث توحید میں اس مطلب کو محقق و مبرہن کیا جا چکا ہے کہ ہر ممکن الوجود شی واجب الوجود کی محتاج ہے۔ اور یہ کہ کوئی ممکن ایک لمحہ کے لئے بھی واجب الوجود کے فیض وجود سے مستغنی و بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ بنابریں یہ کہنا کہ بندہ اپنے افعال میں بالکل آزاد و مطلق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ممکن کو واجب کی احتیاج نہیں ہے۔ اور یہ بات واضح البطلان ہے۔

(۲) اس نظریہ سے خداوند عالم کا معطل ہونا لازم آتا ہے جو کہ شان خداوندی کے منافی ہے۔ حسن بن وشاء بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ افضل التحیۃ والثناء کی خدمت میں عرض کیا۔ انّ اللہ فوض الامر الی العباد کیا خدا نے افعال کو بالکل بندوں کے سپرد کر دیا ہے۔ فرمایا اللہ اعز من ذلک۔ خداوند عالم اس سے اجل و ارفع ہے۔ پھر میں نے کہا فاجبرهم علی المعاصی؟ کیا خدا نے بندوں کو گناہوں پر مجبور کیا ہے؟ فرمایا اللہ اعدل واحکم من ذلک۔ خدا اس سے عادل تر ہے کہ اس طرح ظلم و جور کرے۔ (راز توحید صدوق)

محمد بن عجلان نے جب یہی تفویض والا سوال حضرت امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا اللہ اکرم من ان یفوض الیھم۔ خداوند عالم اس سے بلند و بالا ہے کہ ان کے سپرد کرے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں ان الناس فی القدر علی ثلاثۃ اوجہ رجل یزعم ان اللہ عزوجل اجبر الناس علی المعاصی فھذا ظلم اللہ فی حکمتہ فھو کافر و رجل یزعم ان الامر مفوض الیھم فھذا اوھن اللہ فی سلطانہ فھو کافر و رجل یزعم ان اللہ کلف العباد ما یطیقون و لم یکلفھم ما لا یطیقون و اذا احسن حمد اللہ و اذا اساء استغفر اللہ فھذا مسلم بالغ (توحید شیخ صدوق) یعنی قضا و قدر کے متعلق لوگوں کے تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ خدا لوگوں کو گناہوں پر مجبور کرتا ہے۔ یہ گروہ چونکہ خدا کو اپنی حکمت میں ظالم و جائر سمجھتا ہے لہٰذا یہ کافر ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ یہ معاملات لوگوں کے سپرد ہیں چونکہ یہ گروہ خدا کو اپنی سلطنت و حکومت میں کمزور سمجھتا ہے لہٰذا یہ بھی کافر ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو انہی امور کی تکلیف دی ہے جو ان کی قوت برداشت کے مطابق ہیں۔ اور ان امور کی تکلیف نہیں دی جو ان کی طاقت سے زائد ہیں۔ یہ گروہ جب اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے تو اس کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ اور جب گناہ و عصیان کا ارتکاب کرتا ہے تو استغفار کرتا ہے۔ یہ گروہ ہی حقیقی طور پر مسلمان ہے۔ ثبتنا اللہ بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد۔

چند شکوک و شبہات کا ازالہ

بموجب الغریق یتشبث بکل حشیش۔ جبر و اضطرار کے قائلین چند عقلی و نقلی رکیک اور مہمل شبہات کو اپنے نظریہ فاسدہ کی تائید میں پیش کیا کرتے ہیں۔ مناسب ہے کہ ذیل میں بالاختصار ان کا تذکرہ کر کے ان کا ازالہ بھی کر دیا جائے تاکہ یہ مسئلہ ہر لحاظ سے بے غبار اور حقیقت بالکل آشکار ہو جائے۔

پہلا شبہ۔ جو کچھ عالم میں واقع ہوتا ہے۔ اور انسان جو کچھ اچھے یا برے کام کرتا ہے۔ ان کے وقوع سے پہلے خداوند عالم کو ان کا علم تھا اور جو کچھ واقع نہیں ہوتا خداوند عالم کو ازل سے اُس کے واقع نہ ہونے کا علم بھی تھا پس جس امر کے وقوع کا قدرت کو علم ہے۔ واجب ہے کہ وہ واقع ہو۔ اور جس امر کے عدم وقوع کا قدرت کو علم ہے اس کے لئے واقع ہونا ممتنع ہے ورنہ ہر دو صورت میں علم خداوندی جہل کے ساتھ تبدیل ہو جائے گا اور یہ محال ہے اور ظاہر ہے کہ امر واجب و امر ممتنع دونوں انسان کی قدرت سے باہر ہیں۔ لہٰذا جبر ثابت ہو گیا۔ اسی خیالِ فاسد کی عمر خیام نے ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے ؎

مے خوردن من حق ز ازل می دانست | گر مے نخورم علم خدا جہل بود

پہلا جواب ۔ اس شبہ کاسدہ کا مختصر مگر تحقیقی جواب یہ ہے کہ اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ قدرت کاملہ کو ہر شے کا علم ہے وعلمہ قبل خلق الاشیاء کعلمہ بعد خلقھا ۔ لیکن علم کو اپنے معلوم کے وقوع یا عدم وقوع کی ہرگز علت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بلکہ علم اپنے معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ اس میں موثر نہیں ہوسکتا کیونکہ موثر کے لئے متاثر سے قبل ہونا ضروری ہے اور تابع اپنے متبوع سے بالذات متوخر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ایک ماہر فلکیات اشکال و اوضاع فلک کو دیکھ کر یہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ فلاں وقت سورج گرہن اور فلاں وقت چاند گرہن لگے گا یا فلاں وقت قمر در عقرب لگے گا تو کوئی صاحب عقل و علم یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ اب آفتاب و ماہتاب وغیرہ مجبور ہیں۔ کہ وہ اسی وقت میں منکسف و منخسف ہوں بلکہ ہر صحیح العقل آدمی سمجھتا ہے کہ اس ماہر فلکیات کا علم اوضاع و اشکال کے تابع ہے وہ اوضاع و اشکال اس کے علم کے تابع نہیں ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ بعض اوقات ہمارے علم میں و حساب وغیرہ مقدمات علم میں غلطی رہ جانے کی وجہ سے غلطی ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ مشاہدہ شاہد ہے لیکن علم باری میں غلطی کا امکان نہیں ہے اسے جو علم کسی شخص کے متعلق اس کی خلقت سے پہلے تھا کہ فلاں شخص بڑا ہو کر اپنے ارادہ و اختیار سے فلاں اچھا کام کرے گا اور فلاں شخص فلاں برے کام کا ارتکاب کرے گا۔ اب یہ لوگ کریں گے تو اسی طرح جیسے خدا کو پہلے ان کا علم ہے لیکن علم باری کو ان میں مؤثر قرار دینا حقائق سے سراسر جہالت ہے۔ جبریہ کہتے ہیں وہ ایسے عقل و علم کے دشمن ہیں کہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ کسی واقعہ کا علم ہونا اور بات ہے اور واقعہ کو واقعہ بنانا اور بات خداوند عالم کو مومن کے ایمان لانے اور کافر کے کفر اختیار کرنے کا علم ہے نہ یہ کہ خدا کے علم نے مومن کو مومن اور کافر کو کافر بنایا ہے۔ کمالا یخفی۔

بہرحال یہ امر موجودہ تحقیقی دور میں محتاج بیان نہیں رہا کہ معلوم اپنے علل و اسباب کی وجہ سے موجود ہوتا ہے کسی عالم کے علم یا جاہل کے جہل کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے یہ تو اس شبہ کا تحقیقی و علمی جواب تھا۔

دوسرا الزامی جواب ۔ اب اس کا ایک الزامی جواب بھی سن لیں، اگر یہ درست ہے کہ جس چیز کا خدا کو علم ہو کر ہوگی وہ واجب ہو جاتی ہے۔ اور جس کے نہ ہونے کا علم ہو وہ ممتنع و محال۔ لہٰذا ہر دو قدرت سے خارج تو ہم پوچھتے ہیں کہ خدا جو خود کام انجام دیتا ہے آیا اس کو ان کا علم ہوتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو جہل خدا لازم آتا ہے۔ اور اگر اثبات میں ہے تو لازم آئے گا کہ خدا بھی فاعل مختار نہ رہے۔ عمر خیام کے شعر فاسد کا تحقیقی جواب شعر ہی میں جو جناب محقق طوسی نے دیا ہے وہ اہل ذوق کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

ایں نکتہ نگوید آنکہ او اہل بود | زیرا کہ جواب شبہ اش سہل بود
علم ازلی را علت عصیاں کردن | نزد عقلا ز غایت جہل بود

علاوہ ازیں اس شبہ کا یہ الزامی جواب بھی دیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ قاعدہ تسلیم کر لیا جائے کہ علم معلوم کی علت

ہوتا ہے تو اس سے خدا کا فاعل مختار ہونا باطل ہو جائے گا اور فاعل مضطر قرار پائے گا جو بالاتفاق غلط ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح خلاقِ عالم بندوں کے افعال کو ان کے واقع ہونے سے پہلے جانتا ہے۔ اسی طرح اسے اپنے افعال کا بھی ان کے وقوع سے قبل یقیناً علم ہوتا ہے۔ مثلاً اب ہم کہتے ہیں کہ اسے علم ہے کہ مثلاً فلاں سال میں زید کو پیدا کرے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سال وہ اسے پیدا نہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے یا نہیں اگر یہ کہا جائے کہ ہاں قدرت رکھتا ہے تو بقول خیام خدا کے علم کا مبدل بجہل ہونا لازم آتا ہے اور اگر قدرت نہیں رکھتا تو اسی طرح اس کا مجبور و مقہور ہونا ثابت ہوتا ہے حالانکہ وہ قادر و مختار ہے۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا ؟۔

اگر نظر غائر سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ جبر و اختیار انسانی بلند ہمتی و پست ہمتی کی پیداوار ہے۔ اسی عقیدۂ جبر نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا ہے کہ وہ اپنی ذاتی ناکامیوں اور پسپائیوں کو جبر و تقدیر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ حالیؔ نے اسی حقیقت کو اپنے انداز میں اس طرح بے نقاب کیا ہے۔

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار ۔۔۔ دیکھا تو نہ تھا اس کا مذہب پہ مدار

جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور ۔۔۔ جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

دوسرا شبہ ۔ چند متشابہ آیات ہیں جن کے ساتھ مجبرہ تمسک کر کے اپنے زعم باطل کو ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ یہ آیات مختلف الالفاظ ہیں۔ بعض میں اضلال اور بعض میں ختم و طبع وغیرہ الفاظ وارد ہیں جیسے (۱) یضلّ من یشاء و یھدی من یشاء (۲) ومن یضلل اللہ فما لہ من ھاد (۳) یضلّ بہ کثیراً (۴) ومن یضلل فاولئک ھم الخاسرون۔ ختم اللہ علی قلوبھم بل طبع اللہ علیھا۔ ان آیات سے بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے کہ خدا خود گمراہ کرتا ہے۔ اور خدا ہی دلوں پر مہریں لگاتا ہے جب خدا کسی کو گمراہ کر دے یا اس کے دل پر مہر لگا دے تو اسے کون ہدایت کر سکتا ہے؟

الجواب واللہ الموفّق للصواب ۔ ان آیات کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہ آیات متشابہات ہیں اور علماء محققین کا اتفاق ہے کہ خواہ مقام اعتقاد ہو یا مقام عمل متشابہ آیات و روایات کی ایسی تاویل واجب و لازم ہوتی ہے کہ جس سے وہ آیات محکمات کے موافق ہو جائیں اور ظاہری تضاد و اختلاف رفع ہو جائے اور کسی صورت میں بھی انہیں اپنے ظاہری معنوں پر باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ خلاقِ عالم نے ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو متشابہ آیات کی اتباع کرتے ہیں فامّا الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ (پ۳ سورۃ آل عمران ع۸) یعنی جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ و فساد کھڑا ہو۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا

ہے۔ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم (پ۳ سورہ آل عمران ع ۸) حالانکہ ان آیات کی صحیح تاویل وتفسیر بجز خداوند عالم اور راسخون فی العلم کے اور کوئی شخص نہیں جانتا۔ انہی مذکورہ بالا آیات ہی کو لے لیجئے۔ اگر ان کو اپنے ظاہری معنوں پر باقی رکھا جائے تو اس سے وہ سب خرابیاں لازم آئیں گی جو اوپر تکلیف مالا یطاق اور جبر واضطرار والے نظریہ فاسدہ کی تردید کے ضمن میں بیان ہو چکی ہیں۔ اور ان کے علاوہ ایک اور زبردست خرابی یہ لازم آئے گی کہ خداوند عالم نے چونکہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت شیطان یا شیطان صفت بعض انسانوں کی طرف دی ہے۔ جیسے ان آیات سے ظاہر ہے۔ ان الشیطان لکم عدو مضل مبین (پ۲۰ سورہ قصص ع ۵) شیطان تمہارا کھلم کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے" ولقد اضل منکم جبلاً کثیراً (پ۲۳ سورہ یسین ع ۴) شیطان نے تم میں سے بہت سوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ اضل فرعون قومہ (پ۱۶ سورہ طہٰ ع ۴) فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا" واضلھم السامری (پ۱۶ سورہ طہٰ ع ۱۳) ان کو سامری نے گمراہ کیا۔ ظاہر ہے کہ خدائے حکیم نے شیطان وفرعون اور سامری وغیرہ۔ ملاعین کی مذمت ومنقصت بیان کرتے ہوئے ہی اضلال کو ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ نہ کہ مدح وستائش کی بنا پر اگر نعوذ باللہ ان کی طرح خود خدائے تعالیٰ بھی اس فعل شنیع کا ارتکاب کرتا ہو پھر خاکِ بدہن قائل اس حیثیت سے خدا اور شیطانؑ وفرعونؑ وسامری میں کیا فرق رہ جاتا۔ مالکم کیف تحکمون بہر حال مذکورہ بالا حقائق سے ثابت ہو گیا کہ ان آیات کی ایسی تاویلات لازم ہیں جن سے یہ آیات مذکورہ بالا آیات محکمہ اور دلائل متقنہ کے موافق ہو جائیں۔ اور یہ ظاہری تصادم وتضاد ختم ہو جائے۔

دوسرا جواب۔ مخفی نہ رہے کہ "اضلال" جو کہ باب افعال اضل یضل کا مصدر ہے۔ لغت واصطلاح میں تین معنوں میں استعمال ہوا ہے (۱) کسی خلافِ حق امر کی طرف اشارہ کرنا (۲) کسی کے اندر ضلالت وگمراہی پیدا کرنا (۳) کسی چیز کو ہلاک کرنا۔ ضائع کرنا۔ عذاب وعقاب نازل کرنا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیتوں میں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ الم یجعل کیدھم فی تضلیل (پ۳۰ سورہ فیل ع ۱) کیا خدا نے ان کے مکر وفریب کو ضائع وبرباد نہیں کر دیا تھا؟ وما دعاء الکافرین الا فی ضلال (پ۲۴ سورہ مومن ع ۱) یعنی کافروں کی دعا وپکار ضائع اور غیر مقبول ہے۔ الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ اضل اعمالھم جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور راہ خدا سے روکا۔ خداوند عالم نے ان کے اعمال کو باطل کر دیا ہے (پ۲۶ سورہ ع ۵) ان المجرمین فی ضلال وسعر (پ۲۷ سورہ قمر ع ۱) مجرم لوگ عذاب وجہنم میں ہیں۔

اسی طرح اضلال کے بالمقابل اہدا بھی لغت واصطلاح کے اعتبار سے تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) کسی امر حق کی طرف راہبری کرنا (۲) کسی کے اندر ہدایت کا پیدا کرنا (۳) کسی شے کو ہلاک اور ضائع نہ کرنا۔ بلکہ

اس پر اجر و ثواب عطا کرنا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیت میں لفظ ہدایت اجر و ثواب دینے کے معنی میں مستعمل ہوا ہے
والذین قتلوا فی سبیل اللہ فلن یضل اعمالھم سیھدیھم (پ ۲۶ سورہ محمدؐ ع ۵)
جو لوگ راہِ خدا میں شہید ہو گئے۔ خداوند عالم ہرگز ان کے عمل کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ عنقریب انہیں اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ضلالت و ہدایت کے ان معانی میں سے کون سے معنی خداوند عالم کے حق میں صحیح ہیں۔ اور کون سے غلط اور محال۔ سو واضح رہے کہ ضلالت پہلے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے باری تعالیٰ کے حق میں استعمال کرنا ممنوع اور ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے وہ تمام مفاسد لازم آئیں گے جو اوپر ذکر ہو چکے ہیں۔ ہاں تیسرے معنی یعنی ہلاک و ضائع کرنے اور سزا دینے کے لحاظ سے اس لفظ کی نسبت خدائے قدوس کی طرف صحیح ہے اور ہدایت کے معانی سہ گانہ میں سے پہلے اور تیسرے معنی کے اعتبار سے اس لفظ کی نسبت خدائے قدوس کی طرف صحیح و درست ہے۔ بنابریں جن آیات میں خدا کے متعلق اضل یا یضل وغیرہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ان کے یہ معنی ہوں گے۔ یعذب و یھلک و یبطل عمل من یشاء خدا جسے چاہے عذاب کرے اور اس کے عمل کو ضائع و اکارت کر دے۔ وما یضل بہ الا الفاسقین (پ ۱ سورہ بقرہ ۲۶) لیکن وہ کسی نیک آدمی کے اعمال کو ضائع نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس کو عذاب کرتا ہے بلکہ وہ فاسقوں و فاجروں اور ریاکاروں کو عذاب و عقاب کرتا ہے۔ اور ان ہی کے اعمال کو ضائع و اکارت کرتا ہے فقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباءً منثورا۔ اور جہاں ہدی یا یہدی وغیرہ وارد ہے۔ وہاں یہ رشد راہِ راست کی طرف راہبری کرنا یا تثبیت و یجزی و اجر و ثواب عطا فرمانا مراد ہے۔ پس اس تاویل جمیل کی بنا پر ان آیات سے جبر و اضطرار کا جو وہم ہوتا ہے وہ رتفع ہو جاتا ہے۔ اور ان آیات کے معانی عقل صحیح و نقل صریح کے بالکل مطابق ہو جاتے ہیں۔ والحمد للہ علی وضوح الحق و الحقیقۃ۔

تیسرا جواب ۔ ان متشابہ آیات کا ایک اور جواب بھی دیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ چونکہ انسانی اعمال و افعال کی بنیادی قوتیں خدائے قہار کی عطا کردہ ہیں۔ اگرچہ ان میں تصرف کرنے میں انسان فاعل مختار ہے۔ اب اگرچہ ہدایت حاصل کرنا یا ضلالت میں مبتلا ہونا درحقیقت انسان کا ذاتی فعل ہے۔ لیکن چونکہ ان کی اصل بنیادی قوتیں خداوند عالم کی دی ہوئی ہیں۔ لہٰذا من باب المجاز اھدی اور اضلال کو اس کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ خدا نے انسان کو یہ طاقتیں اس لئے عطا نہیں کیں کہ وہ ان کو اس کی معصیت و نافرمانی میں صرف کرے۔ منعم حقیقی کی غرض تو یہ ہے کہ انسان اُس کی عطا کردہ قوتوں کو اُس کی اطاعت و فرمانبرداری میں صرف کرے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے جعل لکم السمع و البصر و الفؤاد لعلکم تشکرون ۔ وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون و لا یرضی لعبادہ الکفر ۔ مگر انسان اپنے سوئے اختیار سے معصیت ایزدی کا شکار ہو جاتا ہے۔

چوتھا جواب ۔ باقی رہیں وہ آیات جن میں لفظ "ختم" و "طبع" وارد ہے۔ ان کی بھی کئی ایک مناسب تاویلیں کی جاسکتی ہیں۔

تاویل اوّل ۔ یہاں حقیقۃً تو کوئی مہر وغیرہ نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر کفر و شرک اس قدر راسخ ہوچکا ہے کہ اس کا نکلنا اور ایمان کا اس کی جگہ داخل ہونا ایسا ہی مشکل ہے۔ جیسے کسی مہر کردہ شے سے کسی چیز کا نکالنا اور کسی اور چیز کا اس میں داخل کرنا اسی مطلب کو بطور کنایہ ختم و طبع سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تاویل دوم ۔ جب کسی کافر کا کفر اور مشرک کا شرک اس حد تک راسخ ہوجاتا ہے کہ اب ہرگز اس کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان نہیں رہتا تو ممکن ہے اس وقت خدائے قدیر ان کے قلب پر کوئی ایسی علامت مقرر کردیتا ہو جسے "نقطۂ سیاہ" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جسے انبیاء و ملائکہ دیکھ کر معلوم کرلیتے ہیں کہ یہ آدمی راہِ راست پر آنے والا نہیں ہے۔ پس وہ اس کی رشد و فلاح سے ناامید ہوکر اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اس تاویل کی تائید ان بعض روایات سے بھی ہوتی ہے۔ جن میں وارد ہے کہ جب کوئی آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر آپ توبہ سے اسے دھو ڈالے تو فبہا ورنہ اگر پے در پے گناہ پر گناہ کرتا رہے تو برابر اس نقطے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ پورا قلب تیرہ و تاریک ہوجاتا ہے۔ اور بالآخر اس سے قبول حق و حقیقت کی استعداد سلب ہوجاتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت شریفہ میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ **بل طبع اللہ علیہا بکفرھم** (پ۶ سورہ نساء ۲۶) ان کافروں کے مسلسل کفر و عصیان کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ مقام تدبر ہے۔ آیات درپیش میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کفار و عصاۃ کے کفر و عصیان کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگائی گئی ہے۔ تو گویا ان کا اپنا اختیاری کفر و عصیان مہر لگنے کا سبب ہے۔ یہ نہیں ہے کہ پہلے مہر لگائی گئی ہو جس کی وجہ سے ان سے کفر و عصیان سرزد ہوا ہو۔ جبر و اضطرار تب لازم آتا کہ آخری صورت ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ پہلی صورت میں جبر ہرگز لازم نہیں آتا۔ ایسا ہی مندرجہ ذیل آیات میں "اضلال و ازاغہ" کی نسبت خداوند عالم کی طرف مکافاتِ عمل اور خود مکلفین کے اعمالِ سیئہ کے نتیجہ میں دی گئی ہے۔ **فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم** (پ۲۸ سورہ صف ۶۹) جب وہ خود ٹیڑھے ہوگئے تو خلاق عالم نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کردیا۔ **کذلک یضل اللہ من ھو مسرف مرتاب** (پ۲۴ سورہ مومن ۶۹) اسی طرح خداوند عالم گمراہ کرتا ہے۔ اس شخص کو جو اسراف کرنے والا (حدود الٰہی توڑنے والا) ہو۔ اور شک کرنے والا ہو۔ **فتعجو نشکرو ولا تکن من الجاحدین** ۔

تیسرا شبہ ۔ کتب احادیث میں کچھ ایسی روایات بھی موجود ہیں۔ جن میں وارد ہے۔ **انا اللہ انا خلقت الخیر والشر فطوبیٰ لمن اجریت علی یدیہ الخیر** ۔ یعنی خدا فرماتا ہے کہ میں نے خیر و شر کو خلق کیا

ہے۔ اس شبہ کا بچند وجہ جواب دیا جا سکتا ہے۔

پہلا جواب ۔ بعض روایات معتبرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی روایات جو موہم جبر ہیں۔ وہ سب جعلی و وضعی ہیں، چنانچہ کتاب توحید شیخ صدوق عیون اخبار الرضا اور احتجاج طبرسیؒ میں حسین بن خالد سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کچھ لوگ آپ (آئمہ اہلبیت) کی طرف جبر و الاقول منسوب کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے آپ کے آباؤ اجداد کی طرف منسوب شدہ کچھ ایسی روایات ملتی ہیں، جو جبر پر دلالت کرتی ہیں۔ ان روایات کی حقیقت کیا ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا۔ اے فرزند خالد۔ اس سلسلہ میں جو روایات میرے آباؤ اجداد کی طرف منسوب ہیں۔ ان کی تعداد زیادہ ہے۔ یا ان روایات کی جو خود پیغمبر اسلام کی طرف منسوب ہیں؟ راوی نے عرض کیا فرزند رسولؐ! اس قسم کی جو روایات آنحضرتؐ کی طرف منسوب ہیں، ان کی تعداد زیادہ ہے۔ امام عالی مقام نے فرمایا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ جبر و تشبیہ والاقول آں حضرتؐ کی طرف منسوب نہیں کرتے؟ راوی نے عرض کیا حضورؐ! ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی سب احادیث وضعی و جعلی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی آں حضرتؐ کی صحیح حدیث نہیں ہے یہ سن کر امام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ یہی کیفیت ان روایات کی ہے جو میرے آباؤ اجداد کرام کی طرف منسوب ہیں۔ ان بزرگواروں میں سے کسی نے بھی کوئی ایسا ارشاد نہیں فرمایا۔ یا ابن خالد! انما وضع عنا الاخبار فی تشبیہ والجبر الغلاۃ الذین صغروا عظمۃ اللہ (عیون الاخبار ص۹۶)

دوسرا جواب ۔ ایسی روایات برادران اہل سنت کی روایات کے مطابق اور آئمہ طاہرینؑ کی احادیث معتبرہ کے مخالف ہیں۔ اور ہمارے قواعد و اصول میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر وہ روایت جو ہماری مسلمہ روایات کے مخالف اور مخالفین کے اصول کے مطابق ہو۔ تو ایسی روایات اگر سند کے اعتبار سے کمزور ہوں تو ان کو وضعی و جعلی تصور کیا جاتا ہے اور اگر سند کے اعتبار سے قوی ہوں تو انہیں تقیہ پر محمول کیا جاتا ہے لہٰذا بنا بریں اگر بالفرض ایسی روایات سند کے لحاظ سے قوی بھی ہوں تاہم تقیہ پر محمول ہوں گی۔ اس مضمون کی روایات ابن ماجہ وغیرہ کتب صحاح ستہ میں بکثرت موجود ہیں۔ "انا خلقت الخلق وخلقت الخیر والشر فطوبیٰ لمن قدرت علی یدیہ الخیر۔"

تیسرا جواب ۔ سابقہ جوابات سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر بالفرض ان روایات کو مستند تسلیم کر لیا جائے۔ اور ان کو تقیہ پر بھی محمول نہ کیا جائے تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان روایات میں جو لفظ خیر و شر وارد ہے اس کا وہ مفہوم نہیں ہے۔ جس سے ہم یہاں بحث کر رہے ہیں، بلکہ "خیر" سے مراد وہ مخلوق ہے جو مفید اور ملائم طبع ہو۔ جیسے گائے، بکری، پھل فروٹ وغیرہ۔ اور "شر" سے مراد وہ مخلوق ہے جو مضر اور ناملائم طبع ہے۔ جیسے سانپ

بچھو وغیرہ۔ چونکہ فرقۂ ثنویہ کا خیال یہ ہے کہ خالق کائنات دو ہیں۔ خیرات (مفید اشیا) کا خالق یزدان اور شرور (مضر اشیا) کا خالق اہرمن ہے۔ آئمہ طاہرینؑ نے اس فرقہ کے زعم باطل کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ خالق عالم ایک ہی ہے۔ اور تمہارے خیال میں جو اشیا مفید یا مضر ہیں ان سب کا خالق و مالک وہی ہے۔ و قل اللہ خالق کل شیئ۔ وھو الواحد القھار۔

چوتھا جواب:۔ اس تیسرے جواب سے بھی صرف نظر کرکے اگر خیر و شر کا وہی مفہوم مراد لیا جائے جو کہ مورد بحث ہے تو پھر یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ یہاں خیر و شر کے خلق سے مراد خلق تقدیری ہے۔ نہ خلق تکوینی۔ اور اس امر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض احادیث میں بجائے " اجریت " لفظ قدرت ' علی یدیہ الخیر۔ وارد ہے خلق تکوینی و تقدیری کا باہمی فرق متن رسالہ میں مذکور ہے۔ اور ہم نے بھی بحث کی ابتداء میں اس کی وضاحت کر دی ہے لہٰذا پھر بھی ان روایات سے جبر و الاقول لازم نہیں آتا۔ ایسا تب ہوتا کہ جب خلق سے مراد خلق تکوینی ہوتی مگر ایسا نہیں ہے۔

چوتھا شبہ۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان فاعل مختار ہے تو اس سے خدا کا عاجز ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ بنابریں ایک کافر چاہتا ہے کہ وہ کفر اختیار کرے۔ اور خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ ایمان لائے مگر وہ کفر اختیار کر لیتا ہے۔ تو اس سے خدا کا عاجز ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں کا مطلوب تو حاصل ہو گیا مگر خدا کا مقصود حاصل نہ ہو سکا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اچھے یا برے کام خدا ہی کرتا ہے۔ مومن کا ایمان اور کافر کا کفر خدا ہی کا فعل ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ اشکال اس وقت وارد ہوتا کہ اگر خداوند عالم کافر کو جبراً مومن بنانے پر قادر نہ ہوتا۔ لیکن اگر وہ اس بات پر قادر ہونے کے باوجود ان مفاسد و محاذیر کے پیش نظر جو جبر کی صورت میں لازم آتے ہیں۔ اسے ایمان لانے پر مجبور و مقہور نہیں کرتا۔ اور کافر اپنے ارادہ سے کفر کو اختیار کر لیتا ہے تو اس سے خدا تعالیٰ کا عجز و قصور کس طرح لازم آتا ہے؟ ولو شاء اللہ لآمن من فی الارض جمیعاً (پ سورۃ یونس ع ۱۰) اگر جبراً خدا چاہتا تو تمام لوگ مومن بن جاتے لیکن خدا ایسا کرتا نہیں۔ مثلاً اگر کوئی حاکم اپنے غلام کو کسی امر کا حکم دے۔ اور اس کے بجا لانے یا نہ بجا لانے کا اسے اختیار دے دے تو اگر اس صورت میں وہ تعمیل حکم نہ کرے تو حاکم کو عاجز و کمزور نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اگر حاکم اس سے بہر حال وہ کام انجام دلوانا چاہے خواہ بالاختیار اور خواہ بالجبر اور پھر وہ اسے انجام نہ دے تو اس صورت میں البتہ حاکم کا عجز لازم آئے گا۔ اور ان دونوں صورتوں کا باہمی فرق واضح و آشکار ہے ظاہر ہے کہ ہمارے متعلقہ مسئلہ میں پہلی صورت درپیش ہے نہ دوسری۔ لہٰذا خداوند عالم کا عجز ہرگز لازم نہیں آتا یہ شبہ محض ابلہ فریبی ہے یا پھر خود فریبی ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

پانچواں شبہ ۔ کچھ احادیث ایسی موجود ہیں جو احادیث طینت کے نام سے مشہور ہیں۔ ان سے بھی جبر کا قول ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان احادیث کا مضمون یہ ہے کہ مومن کی طینت پاک و پاکیزہ اور کافر کی طینت خبیث و نجس ہے۔ خلقت کے وقت ان دونوں طینتوں کو باہم مخلوط کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا اگر مومن سے کسی وقت کوئی برائی سرزد ہوتی ہے یا کافر سے کبھی نیکی صادر ہوتی ہے تو یہ اسی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اس شبہ کا بچند وجوہ جواب دیا جاسکتا ہے۔

احادیثِ طینت والے شبہ کا پہلا جواب

پہلا جواب ۔ بعض علماء اعلام نے انہی وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر دوسرے شبہ کے جوابات میں کیا جا چکا ہے ان اخبار کو ناقابل استدلال قرار دیا ہے۔ یہ جواب قابلِ مناقشہ ہے کیونکہ اس قدر اخبار کثیرہ کا رد کر دینا بڑی جرأت و جسارت ہے۔

دوسرا جواب ۔ بعض محتاط علماء نے یہ روش اختیار کی ہے کہ یہ اخبار متشابہ ہیں۔ لہٰذا ان پر اجمالاً ایمان لاتے ہوئے اور ان کے حقیقی مفاہیم و معانی کے سمجھنے سے اپنے عجز و قصور کا اعتراف کر کے ان کو آئمہ معصومین کی طرف لوٹانا چاہیے۔ جیسا کہ متشابہ آیات میں یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ جواب اگرچہ فی نفسہ صحیح ہے۔ مگر اس سے مخالف کی تسکین و تسلی نہیں ہوتی۔

تیسرا جواب ۔ بعض حضرات نے ان اخبار کو تشبیہ پر محمول کیا ہے۔ یعنی مومن ایمان کے قبول کرنے اور عقائد حقہ کو تسلیم کرنے میں اس طرح ہے کہ گویا اس کی طینت پاک و پاکیزہ ہے۔ اور کافر کفر و شرک کی طرف جھکنے اور اعمال سیئہ اختیار کرنے میں ایسا ہے گویا اس کی خلقت طینت خبیثہ سے ہوئی ہے ورنہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے کہ مومن کی خلقت طینت لطیف و طیب سے اور کافر کی خلقت طینتِ کثیف و خبیث سے ہوئی ہو۔ یہ سب بطور تشبیہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے۔ یہ جواب بھی اشکال سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ اس باب کی اکثر احادیث اس قدر صریح ہیں کہ ان کا تشبیہ و تمثیل پر حمل کرنا بعید معلوم ہوتا ہے۔

چوتھا جواب :۔ چونکہ خالق حکیم و علیم کو انسانوں کی خلقت سے پہلے اپنے ازلی و ذاتی علم سے معلوم تھا کہ مومنین اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان لا کر اعمال صالحہ بجا لائیں گے۔ اور کفار و مشرکین اپنی خواہش و اختیار سے کفر و شرک کو اختیار کریں گے۔ اس لئے اس نے مومن کو طینتِ علیین اور کافر کو طینت سجین سے پیدا کر دیا تاکہ مومن سہولت سے ایمان اور کافر آسانی سے کفر کو اختیار کر سکے کیونکہ اس طرح مومن کو کافر پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے اور ترجیح بلا مرجح لازم نہیں آتی اور پھر بھی یہ اختلاف طینت نیک یا بد اعمال بجا لانے کی علتِ تامہ نہیں ہے بلکہ اس میں زیادہ سے زیادہ اقتضا اور میلان یعنی نیک یا بد کاموں کی طرف فقط جھکاؤ کا مادہ پایا جاتا ہے۔ جس سے جبر و اکراہ اور اضطرار اور الجاء لازم نہیں آتا۔ یہ جواب بحمدہ تعالیٰ بالکل بے غبار ہے اور اس سے جملہ اشکالات مرتفع ہو جاتے ہیں

پانچواں جواب ۔ خداوند عالم نے تمام بندوں کی روحوں کو ایک ہی جوہر سے پیدا کیا۔ اور ان میں قوائے شہویہ کو بھی خلق کر دیا۔ اور ان روحوں کو فعل کے بجا لانے اور ترک کرنے کا بھی اختیار دے دیا۔ پھر قدرت کاملہ نے "عالم ذر" میں جب ان کا امتحان لیا تو بعض ارواح نے اطاعت و فرمانبرداری اور بعض نے معصیت و نافرمانی اختیار کی۔ اس وقت خلاق عالم نے ہر ایک روح کے لئے اس طینت کو اختیار کیا۔ جو اس کے لئے مناسب حال تھی اور پھر دونوں طینتوں کو باہم مخلوط کر دیا۔ اور اس اختلاط و امتزاج میں اصلیت و فرعیت کی رعایت کو ملحوظ رکھا۔ جو روح مستحق لطف و مرحمت تھی۔ اس پر لطف و کرم کو مبذول کیا اور جو روح مستوجب خذلان تھی۔ اس کو خذلان میں مبتلا کیا۔ اس جواب کو مرحوم مولانا سید ظہور حسین صاحب لکھنوی نے شرح اصول کافی میں اختیار کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اس سے جملہ اعتراضات برطرف ہو جاتے ہیں۔ اور ان سے پہلے محدث سید نعمت اللہ جزائری نے انوار نعمانیہ میں اور فاضل سید عبداللہ شبر نے مصابیح الانوار میں اختیار فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ جواب باصواب بعض اخبار معصومین سے مستفاد ہوتا ہے۔ وہو فی محلہ۔

اشاعرہ کے مسئلہ "کسب" پر تنقید

اب تک جس قدر عقلی اور نقلی دلائل و براہین بیان کئے گئے ہیں ان سے روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے افعالِ تکلیفیہ میں فاعل مختار ہے "نہ مجبور و مقہور" اور یہ بھی عیاں ہو چکا ہے کہ اگر جبر یا تفویض والا قول اختیار کیا جائے تو اس سے بے شمار محاذیر و مفاسد لازم آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب اشاعرہ نے دیکھا کہ ان کے نظریہ پر مفاسد عدیدہ و اشکالات شدیدہ لازم آتے ہیں تو انہوں نے بموجب عذر گناہ بدتر از گناہ۔ ان اشکالات سے بچنے کے لئے ایک مہمل مسئلہ "کسب" کو سپر بنانا چاہا۔ لیکن اس "کسب" سے مراد کیا ہے۔ اس میں کچھ اس طرح کھو گئے۔ اور ایسے پا در گل ہوئے کہ باوجود سعی بلیغ کے آج تک کوئی قابل فہم اور معقول معنی بیان نہ کر سکے۔ چنانچہ بعض یہ کہتے ہیں کہ ارادہ بندے کا ہوتا ہے اور فعل خدا کا۔ یعنی جب انسان کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو خدا وہ کام پیدا کر دیتا ہے اور نہ کرنا چاہے تو قدرت اس کام کو پیدا نہیں کرتی۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ کسب سے مراد یہ ہے کہ فعل تو بہر حال خدا ہی پیدا کرتا ہے۔ ہاں اس کا وصف کہ وہ طاعت ہے یا معصیت۔ یہ انسان کا کام ہے۔ اور بعض نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ بندہ طاعت و معصیت کے صدور کا محل ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ ایک ایسی قوت ہے کہ جس کی وجہ سے انسان کوئی مصمم ارادہ کر سکتا ہے لیکن اس کے بعد فعل خدا ایجاد کرتا ہے۔ اور بعض نے تو اس مقام پر ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ کسب بندہ میں موجود ہے لیکن اس کی حقیقت و کیفیت کیا ہے؟ ہم اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء کا قول ہے کہ زندگی ختم ہو گئی

باب الاعتقاد فی نفی الجبر

والتفویض. قال الشیخ اعتقادنا فی ذلك قول الصادقؑ لا جبر ولا تفویض بل امر بین امرین

پانچواں باب۔ جبر وتفویض

جبر وتفویض کے متعلق ہم شیعیان اہل بیت کا وہی عقیدہ ہے۔ جو جناب صادق آل محمد علیہ السلام نے فرمایا ہے یعنی نہ جبر ہے اور نہ تفویض بلکہ ایک ایسا امر ہے۔ جو ان دونوں امروں کے بین بین ہے۔

لیکن تین چیزوں کا مطلب سمجھ میں نہ آسکا۔ حضرات اشاعرہ کا "کسب" اور ان کی "کلام نفسی" اور فلاسفہ کا "حال"۔ ہمیں اس امر کی ضرورت نہیں کہ کسب کے ان معانی باطلہ کے ابطال میں اپنا وقت ضائع کریں۔ کیونکہ یہ معانی اس قدر واضح البطلان ہیں کہ یہ اپنے بطلان پر محتاج دلیل و برہان نہیں۔ ناظرین کرام غور فرمائیں کہ آیا ایسا مذہب بھی انسان کے لئے نجات دہندہ ہو سکتا ہے۔ جس کے مسائل ایسے رکیک اور خلاف عقل و شرع اور ناقابل فہم و ادراک ہوں۔ مسئلہ کی نزاکت و اہمیت نے عنان بیان کو قدرے دراز کرنے پر مجبور کر دیا۔

قد جاءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا وما انا علیکم بحفیظ۔

پانچواں باب، جبر و تفویض کا مسئلہ

یہ مسئلہ بھی سابقہ مسئلہ کی طرح بڑا معرکۃ الآراء اور مہتم بالشان مسئلہ ہے۔ اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ مسئلہ اختلاف امت کی آماجگاہ بن کر افراط و تفریط کا شکار ہو چکا ہے۔ اگرچہ حضرات اشاعرہ خدا تعالٰی کو افعال عباد کا خالق قرار دے کر بزعم خود اس کی قدرت مطلقہ کا اثبات اور اس سے ہر قسم کے شرکاء کی نفی کرتے ہیں۔ اور اسی طرح معتزلہ حضرات تفویض کا قول اختیار کر کے اس کی ساحت قدس کو جبر و جور سے منزہ و مبرا قرار دینے کی سعی کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں نظریے شان ربوبیت کے منافی ہیں۔ کیونکہ اشاعرہ کے قول کی بنا پر خداوند عالم کا ظالم و جابر اور مخلوق کا مظلوم و مقہور ہونا لازم آتا ہے جو سراسر قبیح ہے اور شان خداوندی کے خلاف ہے۔ اور معتزلہ کے نظریہ کی بنا پر ممکن الوجود کا استقلال اور واجب الوجود سے اس کا استغناء و بے نیاز ہونا اور قادر مطلق کا معطل ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ امر بھی قادر و قیوم کی شان قدرت و قیومیت کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث نبویہ میں قدریہ کی بہت مذمت کی گئی ہے۔ چنانچہ آں جناب کی ایک مشہور و معتبر حدیث ہے۔ فرمایا لعنت القدریہ علی لسان سبعین نبیاً۔ قدریہ پر ستر انبیاء کی زبانی لعنت کی گئی ہے۔ (شرح مقاصد ج ۲ صـ۱۴۳ طبع اسلامبول وغیرہ) اسی طرح ایک اور صحیح حدیث میں وارد ہے۔ القدریۃ مجوس ھذہ الامۃ۔ کہ

فقيل وما امر بين الامرين فقال ذلك مثل رجل رأيته على معصية فنهيته فلم ينته فتركته ففعل تلك المعصية

کسی شخص نے آنجناب کی خدمت میں عرض کیا کہ اس بین بین امر سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اس کی مثال یوں ہے کہ تم کسی انسان کو کسی بُرے کام پر آمادہ دیکھو کر منع کرو مگر وہ نہ رُکے اور تم اُسے اپنے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ گناہ کر بیٹھے؟

قدریہ اس اُمت کے مجوسی ہیں (شرح مقاصد ج ۲ ص۱۴۳ وغیرہ) ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص آں حضرتؐ کی خدمت بابرکت میں ایران سے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا تو نے جو کچھ دیکھا ہے اس میں سے جو چیز زیادہ تعجب خیز ہے اس کی مجھے خبر دو۔ اس نے عرض کیا کہ میں نے ایک ایسی قوم (مجوس) کو دیکھا ہے۔ ماؤں ، بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کرتے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جائے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ اللہ کی قضا و قدر میں ہمارے متعلق ایسا ہی مقرر ہے یہ سُن کر آں حضرتؐ نے فرمایا۔ میری اُمت کے اواخر میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوں گے۔ جو ایسی باتیں کہیں گے وہ میری اُمت کے مجوسی ہوں گے (شرح مقاصد ج ۲ ص۱۴۴ و سفینۃ البحار وغیرہ) اس قسم کی کثرت احادیث کتب فریقین میں موجود ہیں۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ اشاعرہ (جبریہ) اور معتزلہ (تفویضیہ) میں سے ہر فریق اپنے مدمقابل کو ان احادیث کا مصداق قرار دیتا ہے۔ قالت النصارىٰ ليست اليهود على شئ و قالت اليهود ليست النصارىٰ على شئ۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں فریق ایک دوسرے پر ان احادیث کو منطبق کرنے میں سچے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ احادیث سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں فریقوں پر قدریہ کا اطلاق ہوا ہے۔ اگرچہ جبریہ پر ان روایات کا انطباق زیادہ ظاہر ہے۔ کما لا يخفى۔

حضرت علامہ مجلسی فرماتے ہیں۔ سيتضح لك ان كلاً منهما ضال صادق فيما نسب الى الاخر وان الحق غيرما ذهبا اليه وهو الامر بين الامرين۔ تم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ دونوں گروہ گمراہ ہیں۔ اور جو نسبت ایک دوسرے کی طرف دیتے ہیں اس میں سچے ہیں۔ کیونکہ حق ان دونوں نظریوں کے خلاف ہے اور وہ ہے امر بین الامرین۔

پس ان حقائق کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ یہ دونوں نظریے بوجہ افراط و تفریط ناقابلِ قبول ہیں۔ اور صحیح نظریہ ان نظریات کے علاوہ کوئی ایسا ہونا چاہیے جو افراط و تفریط کی زد سے محفوظ ہو۔

اسی نظریۂ شریفہ کو آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے لا جبر ولا تفويض بل امر بين الامرين۔ دین میں نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ حقیقت ان کے بین بین ہے۔ انسان نہ تو مجبور محض ہے اور نہ مختار مطلق۔ بلکہ معاملہ ان ہر دو کے درمیان ہے۔ اور یہ ایسا بہترین نظریہ ہے کہ بعض اشعری علماء بھی اس کی

فليس حيث لم يقبل منك تركته كنت انت الذى امرته بالمعصية۔

چونکہ اس شخص نے تمہاری بات قبول نہیں کی اور تم نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نے اس کو گناہ کرنے کا حکم دیا ہے یا اس سے گناہ کرایا ہے۔

حقانیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ علامہ فخر الدین رازی نے مسئلہ جبر و تفویض میں ابحاث طویلہ کے بعد لکھا ہے و نحن نقول الحق ما قال بعض ائمۃ الدین انه لاجبر ولا تفویض لکن امر بین الامرین۔ اس مسئلہ میں حق وہی ہے جو بعض آئمہ دین نے فرمائی ہے کہ نہ بالکل جبر ہے اور نہ بالکل تفویض بلکہ حقیقت ان کے بین بین ہے۔ اس مضمون کی احادیث شہرت و کثرت میں حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان کی صحت و وثاقت کے متعلق تو بحث کرنا عبث ہے۔ البتہ غور طلب امر یہ ہے کہ اس بین بین امر اور اس منزلۂ ثالثہ سے مراد کیا ہے؟ یہ امر قابل توجہ اور لائق تفکر ہے۔ اس کے متعلق متعدد قول موجود ہیں۔ یہاں ان تمام اقوال کے نقل کرنے کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ہی چنداں ضرورت۔ لہٰذا ہم ان میں سے فقط ایک قول پیش کرتے ہیں۔ و فیها کفایة لمن له درایة۔

الامر بین الامرین کی تحقیق میں پہلا قول

یہ وہ قول ہے جسے حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اختیار فرمایا ہے۔ اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جبر سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو کسی فعل کے کرنے یا نہ کرنے پر اس طرح مجبور کرنا کہ اس کی اپنی طاقت و قدرت سلب ہو جائے۔ خلاصہ یہ کہ نظریہ جبر کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم ہی انسان میں اطاعت یا معصیت کو خلق کر دیتا ہے۔ اور انسان کی قدرت اور اس کے ارادہ و اختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور تفویض یہ ہے کہ افعال عباد میں سے وجوب و حرمت کو اٹھا لیا جائے۔ اور انسانوں کو بالکل مطلق العنان اور آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو ان کا جی چاہے سو کریں۔ جیسا کہ زنادقہ و ملاحدہ کہتے ہیں۔ ان دونوں نظریات کے درمیان جو واسطہ اور درمیانی نظریہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے بندوں کو اپنے افعال نیک و بد پر قدرت و تمکنت دی ہے۔ اور ان کے لئے حدود و قیود شرعیہ بھی مقرر فرمائے ہیں۔ اور پھر تعمیل کے مرحلہ میں وعدہ و عید اور زجر و توبیخ کو بھی عمل میں لایا گیا ہے۔ اب نہ تو بندوں کو افعال پر قدرت عطا کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا نے ان کو افعال پر مجبور کیا ہے۔ اور چونکہ حدود و قیود مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اوامر و نواہی کا سلسلہ قائم کر کے اطاعت و فرمانبرداری پر وعدہ ہائے اجر و ثواب اور مخالفت و نافرمانی پر وعید ہائے عقاب و عذاب فرمائے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ان کو بالکل مہمل اور شتر بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دیا ہے یہ ہے الامر بین الامرین اور واسطہ بین القولین۔ حضرت صادق آل محمدؐ کے ارشاد مندرجہ متن رسالہ سے

اس کی تائید مزید ہوتی ہے۔

دوسرا قول۔ وہ ہے جسے محدث جلیل ملا محمد امین استرآبادیؒ نے اپنی بعض کتب میں اختیار فرمایا ہے۔ کہ الامر بین الامرین کے یہ معنی ہیں کہ انسان اس طرح مطلق العنان نہیں ہیں کہ جو چاہیں کرتے پھریں بلکہ ان کا ہر ہر قول و فعل ارادۂ الٰہیہ حادثہ پر معلق ہوتا ہے جس کا تعلق تخلیہ یا منع کے ساتھ ہوتا ہے کہ خدا چاہے تو ان کے اور ان کے مقصد کے درمیان حائل ہو جائے اور چاہے تو ان کو اپنے حال پر چھوڑ دے۔ چنانچہ بہت سی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ کسی دوا یا جادو کی تاثیر اذن ایزدی تخلیہ پر موقوف ہوتی ہے۔ بندوں کی طاعت و معصیت کا حال بھی اسی طرح ہے۔ ہر امر حادث کا وقوع پذیر ہونا اسی طرح اذن باری پر موقوف ہے۔ جس طرح کوئی معلول اپنے وجود میں اپنے شرائط پر موقوف ہوتا ہے۔ یہ قول ہے تو عمدہ مگر اس میں نقص یہ ہے کہ عام فہم نہیں ہے۔

تیسرا قول۔ وہ ہے جو بعض احادیث سے مستفاد ہوتا ہے۔ جیسا کہ عیون اخبار الرضاؑ میں حضرت امام رضاؑ سے مروی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ خداوند عالم ہی ہمارے افعال کا خالق و فاعل ہے۔ اور پھر ہمیں ان پر عذاب و عقاب بھی کرتا ہے۔ وہ جبر کا قائل ہے۔ اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ خداوند عالم نے پیدا کرنے اور رزق دینے کا کام آئمہ معصومینؑ کے سپرد کر دیا ہے وہ تفویض کا قائل ہے۔ جبر کا قائل کافر اور تفویض کا قائل مشرک ہے۔ راوی نے عرض کیا۔ فرزند رسولؐ۔ امر بین الامرین کیا ہے؟ فرمایا جن امور کا خدا نے حکم دیا ہے ان کے بجالانے اور جن اُمور سے روکا ہے ان کے ترک کرنے کی انسان کو قدرت و طاقت دی ہے۔ راوی نے عرض کیا۔ آیا اس مرحلہ میں خداوند عالم کے ارادہ اور اس کی مشیت کو بھی کوئی دخل ہے؟ فرمایا جہاں تک طاعاتِ الٰہیہ کا تعلق ہے۔ ان میں اللہ سبحانہ کے ارادہ و مشیت کے دخل کا یہ مطلب ہے کہ خدا ان کو حکم دیتا ہے اور ان پر رضامند بھی ہے۔ اور ان کی بجا آوری پر معاونت و مساعدت بھی کرتا ہے۔ اور گناہوں میں اس کی مشیت اور اس کے ارادہ کے تعلق کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان سے نہی کرتا ہے اور ان کے ارتکاب سے ناراض ہوتا ہے۔ اور ان کی بجا آوری میں اس کا خذلان (ترکِ توفیق) شامل ہوتا ہے۔ راوی نے عرض کیا۔ آیا ان افعال میں خداوند عالم کی قضا کو بھی کچھ دخل ہے؟ فرمایا بندے اپنے افعال نیک یا بد کی وجہ سے جس چیز (جزا یا سزا) کے مستحق ہوتے ہیں خداوند عالم دنیا و آخرت میں ان کے بارہ میں وہی حکم اور فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ کلام الامام امام الکلام۔

چوتھا قول۔ وہ ہے جسے بعض اعلام نے اختیار کیا ہے کہ جبر کا مطلب تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا اور تفویض کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے افعال میں اس قدر مستقل و مستبد ہے کہ اگر خدا بھی اسے باز رکھنا چاہے تو نہیں رکھ سکتا اور الامر بین الامرین کا یہ مطلب ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو فاعل مختار تو بنایا ہے لیکن وہ قادر مطلق ہے۔ جب چاہے بندوں سے یہ قوت سلب کر سکتا ہے لہٰذا بندے جس امر کو بجالانا چاہتے ہیں وہ ان کو اس سے باز رکھ سکتا

ہے۔ اور جس امر کو وہ نہیں کرنا چاہتے وہ ان سے اسے کرا سکتا ہے لیکن بے شمار مصالح و حکم کی بنا پر ایسا کرتا نہیں ہے

پانچواں قول۔ وہ ہے جسے غواص بحار اخبار حضرت علامہ مجلسی اعلی اللہ مقامہ نے بحار الانوار میں اور فاضل سید عبداللہ شبر نے مصابیح الانوار میں اختیار فرمایا ہے۔ اس قول پر احادیث معصومین پوری طرح منطبق ہوتی ہیں اور عقل سلیم و طبع مستقیم اسے بآسانی قبول کرتی ہے۔ اس قول کا ماحصل یہ ہے کہ جس جبر کی آیات و روایات میں نفی کی گئی ہے۔ اس سے مراد اشاعرہ کا نظریہ فاسدہ ہے۔ اور جس تفویض کی تردید کی گئی ہے۔ اس سے مراد معتزلہ کی تفویض ہے۔ (ان ہر دو نظریات فاسدہ کی اوپر توضیح مع تردید گذر چکی ہے)، اور وہ بین بین امر جسے ثابت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم کی ہدایات اور اس کی توفیقات اور اس کے الطاف و مراحم کو انسان کے اعمال خیر میں اتنا دخل ہے جو جبر و اختیار کی حد تک نہیں پہنچتا۔ اور اسی طرح اس کے خذلان اور ترک توفیق کو بندوں کے گناہ و عصیان میں کسی قدر تعلق ضرور ہے لیکن وہ اجبار و اکراہ تک منتج نہیں ہوتا۔ اور یہ ایسا وجدانی مسئلہ ہے کہ ہر انسان اپنے مختلف حالات و کوائف میں اس حقیقت کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اس مطلب کی حضرت علامہ نے ایک مثال پیش کر کے وضاحت فرمائی ہے کہ ایک آقا اپنے کسی ملازم سے کوئی ایسی فرمائش کرتا ہے جس کی بجا آوری کا طور و طریقہ بھی اسے اچھی طرح بتا دیتا ہے۔ اور مزید برآں اس کی بجا آوری پر کچھ انعام دینے کا وعدہ اور مخالفت کی صورت میں کچھ سزا دینے کی وعید و تہدید بھی کرتا ہے۔ اب اگر اسے کسی طرح یہ معلوم بھی ہو جائے کہ ملازم اس کی فرمانبرداری نہیں کرے گا مگر وہ مذکورہ بالا مقدار پر اکتفا کرتے ہوئے اسے کچھ مزید تاکید وغیرہ نہ کرے اور نہ کوئی سہولت میسر کرے تو اندریں حالات نافرمانی کی صورت میں اگر آقا ایسے غلام کو کچھ سزا دے تو کوئی عقلمند اس کی مذمت نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے اپنے نوکر کو نافرمانی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے بالکل مہمل چھوڑ دیا ہے لیکن اگر مذکورہ بالا مثال میں آقا مذکورہ بالا وعدہ وعید اور افہام و تفہیم پر اضافہ کرتے ہوئے ایسا انتظام کر دے کہ مثلاً ایک آدمی کو مقرر کر دے کہ وہ غلام کو اپنے آقا کی اطاعت پر ترغیب و تحریص دلاتا رہے۔ اور اس کی نافرمانی کی صورت میں اس کے عذاب و عقاب سے ڈراتا رہے اور اس طرح وہ غلام اپنے ارادہ و اختیار سے فرمانبرداری کرے تو اندریں حالت بھی کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ آقا نے اپنے غلام کو اطاعت گذاری و فرمانبرداری پر مجبور کر دیا ہے یا مثال یوں تصور کر لیں کہ ایک سردار نے اپنے دو ملازموں کو کسی کام کے لئے کہیں جانے کا حکم دیا کہ وہاں تک بآسانی پیدل چل کر پہنچ سکتے تھے اور دونوں کو فرمانبرداری کی صورت میں انعام و اکرام کا وعدہ اور نافرمانی کی صورت میں سزا کی وعید و تہدید بھی کی۔ اندریں صورت اگر وہ سردار اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہ ان میں سے ایک ملازم بہرحال اطاعت کرے گا اور دوسرا نافرمانی کا مرتکب ہوگا اگر پہلے کے لئے سواری کا بھی انتظام کر دے اور دوسرے

باب الاعتقاد فی الارادۃ والمشیئۃ قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی ذلک قول الصادق شاء اللہ واراد ولم یحب و	چھٹا باب: خدا کی مشیّت اور ارادہ کے متعلق عقیدہ۔ حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں اس باب میں ہمارا عقیدہ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کے فرمان کے مطابق یہ ہے کہ خدا چاہتا ہے اور ارادہ بھی کرتا ہے لیکن پسند نہیں کرتا اور راضی نہیں ہوتا۔ ان چار اُمور

کے لئے انتظام نہ کرے تو اب جسے اس نے سواری مہیا کر دی ہے۔ نہ اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ سردار نے اسے اطاعت کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور نہ دوسرے ملازم کے بارہ میں یہ کہنا صحیح ہے کہ سردار نے اسے بالکل مہمل اور مطلق العنان چھوڑ دیا ہے۔ بل امر بین الامرین۔

باقی رہا یہ امر کہ خلاق عالم کن لوگوں پر یہ خصوصی لُطف و احسان کرتا ہے۔ اور کن پر نہیں کرتا یہ مکلفین کے اپنے حسن اختیار اور سُوئے اختیار، صفائی باطن اور کدورت باطن۔ حسن طبیعت اور سوء طینت پر منحصر ہے۔ ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ بنا تھا

چھٹا باب (خدا کی مشیّت و ارادہ کا بیان)

حضرت شیخ مفیدؒ کی تنقید

حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اس مقام پر جناب مصنف علامؒ پر بڑی کڑی تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مصنف نے اس باب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس میں صریح طور پر تضاد و تناقض پایا جاتا ہے۔ اور یہ ہر حدیث پر بلا تحقیق و تامل عمل کرنے کا نتیجہ ہے پھر فرمایا ہے اس مسئلہ میں حق یہ ہے کہ خداوند عالم ارادہ نہیں کرتا مگر افعال حسنہ کا اور نہیں چاہتا مگر اعمالِ خیر کو اور قبائح و شنائع کا ارادہ نہیں کرتا اور نہ ہی فواحش و منکرات کو چاہتا ہے۔ تعالیٰ عما یقول المبطلون علواً کبیراً۔ چنانچہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے۔ وما اللہ یرید ظلما للعباد (مومن پ۲۴) خداوند عالم بندوں پر ظلم و ستم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا۔ پھر ارشاد فرماتا ہے۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (پ۲ سورہ بقرع ۷) خدا تمہارے لئے آسائش کا ارادہ کرتا ہے اور تمہارے لئے تنگی و سختی کا ارادہ نہیں کرتا۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔ واللہ یرید ان یتوب علیکم و یرید الذین یتبعون الشہوات ان تمیلوا میلا عظیما (پ۵ سورہ نساء ع ۲) خدا تو یہ ارادہ رکھتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے۔ لیکن وہ

لم یرض شاء ان لا یکون شیٔ الا بعلمہ واراد مثل ذلک ولم یحب ان یقال لہ ثالث ثلثہ ولم یرض لعبادہ الکفر وقال اللہ عزوجل انک لا تہدی من احببت ولکن اللہ یہدی من یشاء وقال تم وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ وقال عزوجل ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ

کی تفصیل یوں ہے کہ خدا کے چاہنے اور ارادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا یہ ارادہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ اس کے علم کے بغیر نہ ہو۔ اور وہ اس بات کو دوست نہیں رکھتا کہ اسے تین میں کا ایک کہا جائے اور اس کی عدم رضا مندی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے کفر پر راضی نہیں ہے نیز خداوند عالم فرماتا ہے (۱) اے رسولؐ تم کسی کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے خدا جسے چاہتا ہے منزل مقصود تک پہنچاتا ہے (۲) نیز فرماتا ہے تم لوگ تو کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہی جو خدا چاہتا ہے (۳) اس کا ارشاد ہے اگر خداوند عالم (جبراً) چاہتا تو دنیا کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ (۴) فرماتا ہے

لوگ جو شہواتِ نفسانیہ کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے بھٹک جاؤ۔ ارباب فکر غور فرمائیں کہ خلاقِ عالم نے ان آیاتِ مبارکہ میں کتنی وضاحت وصراحت فرما دی ہے کہ ظلم وستم، سختی وتنگی اور ضلالت وگمراہی کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ بندوں کی آسائش وسہولت اور ان کی رشد وہدایت کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اگر خلاقِ عالم گناہ وعصیاں کا ارادہ بھی کرتا ہے۔ تو یہ ارادہ یقیناً سابقہ ارادہ کے منافی ومناقض ہوگا حالانکہ خدائے حکیم کے عزم وارادہ میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔

حضرت شیخ کی تنقید شدید کا جواب باصواب

نہ معلوم حضرت شیخ مفیدا علی اللہ مقامہ کی نگاہِ اقدس میں سرکار مصنف علام کے کلام حقائق ترجمان میں کون سا تضاد وتناقض پایا جاتا ہے؟ حالانکہ ان کی یہ فرمائش حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کی ایک مستند ومعتبر حدیث سے ماخوذ ہے۔ جو بروایت جناب فضیل بن یسار حضرت مصنف علام کی کتاب التوحید وغیرہ میں مذکور ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ حدیث قدرے غامض اور مشکل ہے۔ مگر اس باب میں حضرت مصنف علام نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ اگر اسے بنظر غائر دیکھا جائے تو اس میں کسی قسم کا اختلاف وتضاد نظر نہیں آتا۔ اس کلام سے درحقیقت فرقہ جبریہ (اشعریہ) کی تردید مقصود ہے۔ کیونکہ ان کا یہ نظریہ فاسدہ بالتفصیل اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا فاعل حقیقی خدا ہے۔ لہٰذا عالم میں جو کچھ خیر یا شر اور مومن کا ایمان یا کافر کا کفر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ وہ خدا کے ارادہ ومشیت کا نتیجہ ہے۔ اور وہ ان پر رضا مند بھی ہے۔ امام معصوم علیہ السلام کے

الناس حتی یکونوا مؤمنین
وقال عزوجل وما کان
لنفس ان تؤمن الا باذن
اللہ کتاباً مؤجلاً وکما
قال تہ وما کان لنفس ان
تموت الا باذن اللہ کتاباً
مؤجلاً وکما قال تہ یقولون
لوکان لنا من الامر شئ ما
قتلنا ھیہنا قل لو کنتم فی
بیوتکم لبرز الذین کتب
علیھم القتل الی مضاجعھم
قال تعالیٰ ولو شاء ربک ما فعلوہ
فذرھم وما یفترون وقال تہ ولو

کیا تم ان لوگوں پر جبر کرتے ہو کہ یہ سب مومن بن جائیں (۵) نیز اس کا فرمان ہے کوئی شخص بھی خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لاتا (۶)

(۶) نیز اس کا ارشاد ہے ہر ذی حیات خدا کے معین کئے ہوئے وقت پر اسی کی اجازت سے مرتا ہے۔

(۷) خدا فرماتا ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کچھ بھی غلبہ و اختیار ہوتا تو ہم اس مقام پر قتل نہ کئے جاتے۔ اے حبیب! ان سے فرما دیجئے کہ جن لوگوں کا قتل ہونا مقرر ہو چکا تھا۔ وہ اگر اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو بھی ضرور اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔

(۸) فرمایا اگر خداوند عالم (جبراً) چاہتا تو یہ لوگ ایسا نہ کرتے۔ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اور انہیں افترا پردازی کرنے دو۔

(۹) فرمایا اگر خدا (زبردستی) چاہتا تو یہ لوگ

فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس قدر بات تو صحیح ہے کہ خداوند عالم کا حتمی ارادہ اور اس کی قطعی مشیت ہے کہ عالم میں جو کچھ واقع ہو۔ وہ اس کے علم میں ہو۔ کیونکہ وہ ہر واقع ہونے والی چیز کا اس کے واقع ہونے سے پہلے علم رکھتا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع ہونے والی چیز کو پسند بھی کرے۔ اور اس پر رضامند بھی ہو۔ بلکہ ان واقع ہونے والی چیزوں میں سے بعض اشیاء ایسی بھی ہوتی ہیں کہ خداوند عالم نہ ان کو دوست رکھتا ہے۔ جیسے نصاریٰ کا اس کے متعلق "ثالث ثلاثۃ" (تین میں کا ایک) کہنا۔ کیونکہ اس نے خود اس عقیدۂ فاسدہ سے ممانعت فرمائی ہے کہ انتھوا خیرا لکم۔ عقیدۂ تثلیث سے باز آجاؤ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ اور نہ ہی ان پر رضامند ہوتا ہے۔ جیسے کافروں کا شرک اور فاسقوں کا فسق و فجور جیسا کہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے۔ ولا یرضیٰ لعبادہ الکفر (پ ۲۳ سورہ ۳۹ زمر ع ۱۵) کہ خدائے تعالےٰ بندوں کے کفر و شرک پر رضامند نہیں ہے۔

اگر یہ خیال کیا جائے کہ جب خدائے علیم کو ہر شے کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اس کا علم ہوتا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ چیز علم الٰہی کے مطابق واقع بھی ہو۔ لہٰذا جب خدائے حکیم کو سرکار سید الشہداء کی شہادت عظمیٰ کا علم تھا تو پھر امام عالی مقام شہید ہونے پر اور قاتل نابکار شہید کرنے پر مجبور تھا تو اس خیال محال کی باب چہارم

شآء الله ما اشرکوا وقال ولو شئنا لاٰتینا کل نفس ھدیھا وقال ته فمن یرد الله ان یھدیه یشرح صدرہٗ للاسلام ومن یرد ان یضله یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السمآء وقال ته یرید الله لیبیّن لکم ویھدیکم سنن الذین من قبلکم ویتوب علیکم وقال یرید الله ان لا یجعل لھم حظا فی الاخرۃ ۔ وقال تم یرید الله

شرک نہ کرتے۔ (۱۰) اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو (جبراً) راہِ راست پر گامزن کر دیتے (۱۱) نیز فرماتا ہے جس شخص کے متعلق خدا کا یہ ارادہ ہو کہ اسے ہدایت فرمائے۔ اس کے سینہ کو کشادہ کر دیتا ہے۔ اور جس کو اپنی رحمت سے دُور رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھنا چاہتا ہے (۱۲) فرماتا ہے خدا کا ارادہ ہے کہ وہ تمہارے لئے کھول کر بیان کر دے۔ اور تمہاری توبہ قبول کرے (۱۳) نیز فرماتا ہے خدا کا ارادہ یہ ہے کہ وہ آخرت میں کافروں کو اپنے ثواب سے بالکل محروم رکھے (۱۴) فرماتا ہے خدا کی مشیت یہ ہے کہ تمہاری تکلیف

میں بذیل "ازالۂ شکوک وشبہات" مکمل ردّ کی جاچکی ہے۔ اور اس زعم باطل کا تار پود بکھیرا جاچکا ہے اور دلائلِ قاطعہ وبراہین ساطعہ سے یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ علم کبھی معلوم کے واقع ہونے کی علت نہیں ہوتا۔ اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔ ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار۔

بعض متعلقہ آیات کے بارہ میں توضیحی بیان

جناب مصنف علام نے اس مقام پر جو آیاتِ شریفہ نقل فرمائی ہیں ان میں سے بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جن سے بادی النظر میں جبر کا توہم ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض کوتاہ اندیش ان سے اپنے زعمِ باطل کی تائید میں تمسک بھی کیا کرتے ہیں۔ جیسے آیت نمبر ۳، ۸، آیت نمبر ۹، ۱۰ اور آیت نمبر ۱۱ وغیرہ، لیکن جو حقائق باب چہارم میں بیان ہو چکے ہیں۔ ان کو پیشِ نظر رکھ کر ان آیات میں معمولی غور وفکر بھی کر لیا جائے تو ان کا حقیقی مطلب واضح وآشکار ہو جاتا ہے اور جبر والا توہم خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ ذیل میں ان آیاتِ مبارکہ پر اجمالاً کچھ تبصرہ کیا جاتا ہے۔ آیت نمبر ۳ کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس میں مشیت سے مراد مشیت قاہرہ ہے۔ یعنی خلاقِ عالم اپنی قدرتِ کاملہ کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ اگر وہ جبر واکراہ سے چاہتا تو تمام لوگ مومن کامل بن جاتے مگر چونکہ ایسا کرنا اس کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس مطلب کی تائید اسی آیت مبارکہ کے تتمہ سے بھی ہوتی ہے۔ افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (پ سورۂ یونس ع ۱۵) اے رسول! کیا تم لوگوں کو مجبور کرتے ہو کہ وہ ضرور

ان یخفف عنکم وقال تعالیٰ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر وقال واللہ یرید ان یتوب علیکم و یرید الذین یتبعون الشھوات ان تمیلوا میلا عظیماً وقال تعالیٰ ما اللہ یرید ظلما للعباد فھذا اعتقادنا فی الارادۃ والمشیۃ ومخالفونا یشنعون علینا فی ذلک ویقولون انا نقول ان اللہ اراد المعاصی واراد قتل الحسین بن علیؑ و

ہیں تخفیف کر دے (۱۵) نیز اس کا ارشاد ہے اللہ تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا بلکہ تمہارے لئے آسانی کا خواہشمند ہے (۱۶) نیز فرماتا ہے خدا چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ منظور کرے مگر جو لوگ اپنی خواہشات کے تابع ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم لوگ حق سے بالکل پھر جاؤ۔ (۱۷) نیز اس کا ارشاد ہے۔ خدا اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔ خداوند عالم کے ارادہ و مشیت کے بارے میں یہ ہے ہمارے اعتقادات کا خلاصہ مگر ہمارے مخالفین باوجود ان تصریحات کے ہم پر یہ طعنہ زنی کرتے ہیں کہ شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ بندوں سے خدا ہی گناہ کرواتا ہے۔ اور خدا ہی کا یہ ارادہ تھا کہ جناب امام حسین علیہ السلام قتل ہوں۔ حالانکہ ہم

ایمان لے آئیں؟ مقصد یہ کہ اگر اس طرح جبر و اکراہ سے ان کو مومن بنانا مطلوب ہوتا تو خود خدا اس پر قادر تھا۔ اس تحقیقی بیان سے واضح و عیاں ہو گیا کہ یہ آیت مبارکہ نظریۂ جبر کی رد پر دلیل محکم ہے نہ کہ صحتِ جبر پر۔ ہر معمولی عقل و خرد رکھنے والا انسان سمجھ سکتا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ لوگوں کے اختیاری طور پر ایمان لانے کو بھی نہیں چاہتا۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر انبیاء و مرسلین کیوں مبعوث کئے؟ اور صحف و کتب کیوں نازل فرمائے؟ انا ھدینہ السبیل اما شاکراً و اما کفوراً (سورۃ دھر) آیات نمبر ۹ و ۱۰ کا بھی بعینہ وہی مطلب ہے جو مذکورہ بالا آیت نمبر ۳ کا ہے اور آیت نمبر ۱ سے ملتی جلتی آیات کی باب چہارم میں کماحقہ وضاحت کی جا چکی ہے۔ وہاں رجوع کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت مبارکہ میں اسی عقیدۂ صحیحہ کی طرف اشارہ مقصود ہے جو اوپر باب پنجم میں بالوضاحت بیان ہو چکا ہے کہ لاجبر ولا تفویض بل امر بین الامرین۔ الطاف الٰہیہ جس شخص کے شامل حال ہو جائیں اسے ایمان لانا اور راہ راست پر آنا آسان اور جس سے توفیق الٰہی سلب ہو جائے اور خذلان ایزدی میں مبتلا ہو۔ اسے ایمان لانا اور صراط مستقیم پر گامزن ہونا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ توفیق و لطفِ الٰہی کن لوگوں کے شامل حال ہوتا ہے اور کون لوگ اس سے محروم رہتے ہیں؟ اس کی توضیح بھی سابقہ باب میں کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ جو لوگ راہ راست پر آنے اور اعمال صالحہ بجا لانے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ توفیق الٰہی ان کے شامل حال ہوتی ہے اور جو اس امر کی کوشش ہی نہیں کرتے وہ اس سعادت سے محروم رہتے ہیں۔ جیسا کہ

ليس هكذا نقول ولكنا نقول
ان الله اراد ان يكون معصية
العاصين خلاف طاعة المطيعين
واراد ان يكون المعاصي غير
منسوبة اليه من جهة الفعل و
اراد ان يكون موصوفا بالعلم
بها قبل كونها ونقول اراد الله
ان يكون قتل الحسين معصية
له خلاف الطاعة ونقول اراد
الله ان يكون قتله منهيا عنه غير
مامور به ونقول اراد الله تعالى ان

ایسا نہیں کہتے بلکہ اس سلسلہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خدا
کا یہ ارادہ ہے نافرمانوں کی نافرمانی اور اطاعت شعاروں
کی اطاعت شعاری اس کے نزدیک برابر نہ ہو۔ نیز وہ تو
چاہتا ہے کہ بُرے افعال کی نسبت بھی اس کی طرف نہ ہو۔ ہاں
وہ گناہوں کے سرزد ہونے سے قبل ہی ہر ایک گناہ کے متعلق
علم ضرور رکھتا ہے۔ نیز ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا ارادہ تھا
کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا قتل اس کی اطاعت کے
خلاف اور اس کی معصیت و نافرمانی میں داخل ہو۔ اور اس
بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ خداوند عالم کے ارادہ کے مطابق
قتل حسینؑ ممنوع تھا نہ مامور۔ اور یہ کہ آنجنابؑ کا قتل
(قاتلوں پر) خدا کی ناراضگی کا باعث ہوا۔ ہاں

ارشادِ قدرت ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا بل طبع اللہ علیھا بکفرھم۔ جو
تلاشِ حق وحقیقت میں جد وجہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستے دکھا دیتے ہیں اور جو لوگ اپنے کفر و شرک پر اڑے
رہتے ہیں۔ ان کے کفر کی وجہ سے خدا ان کے قلوب پر مہر لگا دیتا ہے۔

تذنیب

ارادۂ الٰہیہ کے بارہ میں علمائے اسلام کے درمیان بہت اختلاف ہے کہ آیا وہ صفاتِ ذات
سے ہے۔ اور ازلی ہے۔ یا صفاتِ فعل سے ہے اور حادث ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ
صفت عین ذات ہے اور ازلی ہے۔ ہاں اس کے متعلقات متجدد و حادث ہیں۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ارادہ
صفاتِ فعل میں سے ہے اور حادث ہے۔ حادثات و متجددات کے حدوث و تجدد کے ساتھ ساتھ وہ بھی
متجدد و حادث ہوتا رہتا ہے۔ اور بعض حضرات ارادہ کو بمعنی داعی اور محرک علی الفعل مراد لیتے۔ اور ظاہر ہے کہ
خدائے تعالٰے کا محرک و داعی اچھے کاموں پر مبنی ہوتا ہے۔ یرید الیسر ولا یرید العسر ویشاء الایمان
ولا یشاء الکفر۔ اور بعض کے نزدیک علم وارادہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ان کے نزدیک ارادۃ الٰہی بمعنی علم
بالمصلحۃ یا علم بالمفسدہ ہے اور یہی علم مختلف اشیاء کے مختلف اوقات میں پیدا کرنے کا مرجع بنتا ہے۔ اگرچہ اکثر
متکلمین کا رجحان پہلے اور آخری قول کی طرف ہے۔ یعنی یہ کہ ارادہ صفات ذات میں سے ہے۔ اور اس کا مطلب
علم بالمصلحۃ والمفسدہ ہے۔ لیکن بکثرت احادیث معصومین علیہم السلام سے دوسرے قول کی تائید و تقویت

يكون قتله مستقبحًا غير مستحسن ونقول اراد الله تعالى ان يكون سخط الله غير رضي ونقول اراد الله عزّ وجلّ ان لا يمنع من قتله بالجبر والقدرة كما منع منه بالنهي والقول ولو منع منه بالجبر والقدرة كما منع منه بالنهي والقول لا ندفع القتل عنه كما اندفع الحرق عن ابراهيم حين قال الله تعالى للنار التي القي فيها يا نار كوني بردًا وسلامًا على ابراهيم ونقول لم يزل الله تعالى عالمًا بان الحسين سيقتل جبرًا ويدرك بقتله سعادة الابد

خداوند عالم کا یہ ارادہ تھا کہ جناب کے قاتلوں کو اپنے قہر و غلبہ کی بنا پر ان کے قتل سے باز نہ رکھے۔ جس طرح بذریعہ قول کے اس کی ممانعت کی تھی۔ اگر وہ اپنی قدرت کاملہ سے زبردستی روکنا چاہتا تو یقیناً حضرت امام حسین علیہ السلام قتل نہ ہو سکتے۔ جیسا کہ اس نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو آگ میں جلنے سے محفوظ رکھنے کے لئے آگ کو حکم دیا تھا کہ اے آگ تو ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کے لئے سلامتی کا باعث بن جا۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کو ازل سے علم تھا کہ امام حسین علیہ السلام ظلم وجور سے شہید کئے جائیں گے اور اس شہادت عظمیٰ سے آپ ابدی سعادت حاصل کریں گے۔ اور ان کے قاتل ابد سے شقاوت و بدبختی کا شکار ہوں گے۔

ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ ارادہ صفات فعل سے ہونے کی وجہ سے حادث ہے۔ چنانچہ ثقۃ الاسلام حضرت شیخ محمد بن یعقوب کلینیؒ نے انہی احادیث سے متاثر ہو کر اصول کافی میں ایک مستقل باب منعقد کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "باب الارادۃ وانہا من صفات الفعل" اس باب کے ذیل میں انہوں نے متعدد احادیث معتبرہ درج فرمائی ہیں جو بصراحت اس قول پر دلالت کرتی ہیں۔ ذیل میں ایک دو حدیثیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔ عاصم بن حمید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا لم یزل اللہ مریداً۔ کیا خدائے تعالےٰ ہمیشہ سے مرید رہا ہے؟ قال ان المرید لا یکون الا المراد معہ فرمایا مرید نہیں ہوتا مگر یہ کہ مراد اس کے ساتھ ہوتی ہے (لہٰذا اگر ارادہ ازلی ہے تو کائنات کو بھی ازلی ماننا پڑے گا) پھر فرمایا لم یزل عالماً قادراً ثم اراد۔ خدا ہمیشہ سے عالم وقادر رہا ہے۔ پھر بعد میں ارادہ فرمایا (تب مخلوق وجود میں آئی)۔

ویشقی قاتلہ شقاوۃ الابد و نقول ماشاء اللہ کان و مالم یشاء لم یکن ھذا اعتقادنا فی الارادۃ والمشیۃ دون ماینسبہ الینا اھل الخلاف والمشنعون علینا من اھل الالحاد

بہرکیف ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ خدا جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا۔ وہ نہیں ہوتا۔ خداوند عالم کی مشیت اور اس کے ارادے وغیرہ کے متعلق ہمارے یہی عقائد ہیں۔ ہم ان لغویات اور بے سروپا امور سے قطعاً مبرّا اور بے تعلق ہیں۔ جو ہمارے مخالفین اور طعن وتشنیع کرنے والے ملحدین ہماری طرف منسوب کرتے ہیں۔

دوسری روایت صفوان بن یحیٰی سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ خالق ومخلوق کے ارادہ میں کیا فرق ہے؟ امام علیہ السلام نے مخلوق کے ارادہ کی تشریح فرمائی۔ پھر ارادۂ باری تعالےٰ کے متعلق فرمایا۔ واما من اللہ فارادتہ احداثہ لاغیر ذلک۔ یعنی ارادۂ خداوندی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ کوئی چیز پیدا کردے پھر کچھ کلام معجز نظام کے بعد فرمایا فارادۃ اللہ الفعل لاغیر خدا کا ارادہ سوائے فعل کے اور کچھ نہیں ہے۔ ناظرین کرام غور فرمائیں کہ ان احادیث شریفہ میں کس صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ارادہ صفات فعل میں سے ہے۔

بایں ہمہ بعض محققین کی فرمائش بہت متین ہے کہ ایسے دشوار گذار مقامات میں اجمالی عقیدہ ہی کافی ہوتا ہے مثلاً ارادہ کے متعلق یہی اجمالی اعتقاد کافی ہے کہ خداوند عالم مرید ہے۔ یعنی اعمال حسنہ اور خیرات کا ارادہ کرتا ہے اور شرور وقبائح کا ارادہ نہیں فرماتا۔ باقی رہا یہ امر کہ ارادہ کی کنہ حقیقت کیا ہے۔ اس بحث میں پڑنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور جب بھی کوئی آیت یا روایت مذکورہ عقیدہ کے بظاہر منافی معلوم ہو تو اس کی مناسب تاویل کرنا ضروری ہے۔

صفات ایزدی کی بحث میں یہ امر مبرہن کیا جا چکا ہے کہ جس طرح ذات باری کی کنہ حقیقت تک ہمارے عقول واوہام کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اس کی صفات کی تہہ تک بھی رسائی ناممکن ہے۔ لہٰذا اجمالی عقیدہ میں ہی سلامتی مضمر ہے۔

باب الاعتقاد فی القضاء والقدر

قال الشيخ ابو جعفر اعتقادنا فی ذلك قول الصادق لزرارة حين سأله فقال ما تقول يا سيدی فی القضاء

ساتواں باب (قضاء وقدر کے متعلق عقیدہ)

جناب شیخ علیہ الرحمۃ قضاء قدر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کے متعلق ہمارا وہی اعتقاد ہے جو جناب زرارہ بن اعین کے اس سوال کہ "میرے آقا آپ قضاء وقدر کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟" کے جواب میں حضرت صادق آل محمدؐ

ساتواں باب (قضاء وقدر کے بارے میں اعتقاد)

مسئلہ قضاء وقدر میں غور و خوض کرنے کی ممانعت

ارباب دانش و بینش پر یہ امر مخفی و مستور نہیں ہے کہ مسئلہ قضاء وقدر ان مسائل غامضہ اور عقائد عویصہ میں سے ہے کہ جن کی کنہ حقیقت تک بجز راسخون فی العلم کے دوسرے لوگوں کے عقول و افہام کی رسائی تقریباً ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ اس سلسلہ میں اپنے عقول ناقصہ اور آراء فاسدہ پر اعتماد کرکے افراط و تفریط کا شکار ہوکر راہ راست اور طریق مستقیم سے منحرف ہوگئے اور ابدی ہلاکت میں پڑ گئے۔ ع

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار   کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

چونکہ یہ مسئلہ بہت گہرا اور پرخطر تھا اس لئے حکماء ربانیین یعنی حضرات آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے اس میں غور و خوض کرنے اور بحث و مباحثہ کرنے سے بشدت تمام روکا ہے اور ممانعت فرمائی ہے۔ اور بظاہر یہ نہی سب لوگوں کے لئے مساوی حیثیت رکھتی ہے۔ خواہ علماء و حکماء ہوں۔ اور خواہ جہلاء و سفہاء۔ حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اس ممانعت کی جو یہ تاویل فرمائی ہے کہ یہ ممانعت تمام مکلفین کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ کمزور اور ضعیف العقل لوگوں کے لئے ہے۔ ہم جناب شیخ کی رائے سے اتفاق کرنے سے قاصر ہیں بلکہ ہماری ناقص تحقیق میں حضرت مصنف علام کا نظریہ درست ہے کہ ان نواہی کو اپنے عموم پر باقی رکھنا چاہیے۔ تفصیل کے قائلین (کہ اس مسئلہ میں خواص لوگ بحث کرنے کے مجاز ہیں) اپنے مدعا پر جب تک اخبار اہل بیتؑ میں سے کوئی قوی شاہد پیش نہ کریں۔ ہم ان کی اس تاویل و تفصیل کو قبول نہیں کر سکتے۔ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ ثالث بحار الانوار میں حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ والی تاویل نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ "من تفکر فی شبه الواردة علی اختیار العباد و فروع مسئلة الجبر و الاختیار و القضاء و القدر علم سر نهی المعصوم عن التفکر فيها فانه قل من

والقدر قال اقول ان اللّٰہ اذا جمع العباد یوم القیمة فسئلهم عما عهد الیهم ولم یسألهم عما قضی علیهم والکلام فی القدر منهیٌّ عنه کما قال امیر المومنین

علیہ السلام نے بیان فرمایا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ خدائے عزّ و جل جب بروزِ قیامت اپنے بندوں کو جمع کرے گا تو ان سے صرف ان اُمور کی بابت سوال کرے گا جن کا ان سے عہد و اقرار لیا تھا اور اس امر کے بارے میں ان سے بازپرس نہیں کرے گا جو اس نے اپنی قضا و قدر سے نافذ کیا ہو گا۔ مسئلہ قدر میں کلام اور گفتگو کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جیسا کہ حضرت امیر المومنین

امعن النظر فیها ولم یزل قدمه الا من عصمه اللّٰہ بفضله۔ جو شخص بھی مسئلہ جبر و اختیار اور مسئلہ قضا و قدر میں وارد شدہ شبہات میں غور و فکر کرے گا۔ اُسے ان مسائل میں غور و فکر کرنے کے متعلق معصوم کی ممانعت فرمانے کا راز معلوم ہو جائے گا کیونکہ سوائے ان کے جن کو خدا محفوظ رکھے۔ مشکل ہے کہ کوئی بھی شخص اس میں غور و فکر کرے اور اس کا قدم نہ پھسلے۔

قضا و قدر کی حقیقت سوائے راسخون فی العلم کے اور کوئی نہیں سمجھتا

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ نظامِ ربوبیت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور ذاتِ احدیت کے نظامِ عالم کو چلانے کے متعلق ہے۔ اس لئے نہ اس کا ہم سے تعلق ہے۔ اور نہ اس کے سمجھنے کی ہمیں تکلیف دی گئی ہے اور نہ ہی ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔ مشاہدہ شاہد ہے کہ جب ایک معمولی رئیس اپنی رعیت کے نظم و نسق کو بحال رکھنے کے لئے ایک پروگرام مرتب کرتا ہے تو اس کی عام رعایا کو (جن میں عقلاء و علماء بھی ہوتے ہیں)، اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب کسی چھوٹی یا بڑی مملکت کا سربراہ اپنی مملکت کے نظام کو چلانے کے لئے کچھ پالیسیاں بناتا ہے تو سوائے ان مخصوص نفوس کے جن کو بادشاہ خود آگاہ کر دے دوسرے اہلِ مملکت کو (جن میں علماء و فضلاء و قانون دان اور سیاستدان سب ہی حضرات شامل ہوتے ہیں)، ان پالیسیوں کا مطلقاً کوئی علم نہیں ہوتا۔ اور ان کے پاس سوائے ظنون و اوہام اور قیاس آرائیوں کے جو اکثر اوقات غلط ثابت ہوتی ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔ تو جب انسان کی کمزوری عقل و علم کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے جیسے انسان کے پروگرام کو نہیں سمجھ سکتا تو پھر وہ کس بل بوتے پر رب العالمین کے پروگرام کو سمجھنے کی توقع رکھتا ہے؟ علاوہ بریں بروزِ حشر ہم سے اس کے متعلق کوئی بازپرس بھی نہ ہوگی (جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ کی حدیث سے ثابت ہے جو کہ متن رسالہ میں درج ہے تو پھر اس بحث میں پڑنے اور اس کے دقائق میں غور و خوض کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب کہ اس بحث میں بہت سے خطرات موجود ہیں۔ ان دریں حالات اس سلسلہ میں گفتگو کرنا ایک عبث اور لایعنی کام نہیں تو اور کیا ہے؟

لرجل وقد سأله عن القدر فقال له بحر عميق فلا تلجه ثم سئل ثانية عن القدر فقال طريق مظلم فلا تسلكه ثم سأله ثالثة فقال سر الله فلا تتكلفه وقال امير المؤمنين فى القدر الا ان القدر سر من سر الله تعالى وستر من ستر الله وحرز من حرز الله مرفوع فى حجاب الله مطوى عن

علیہ السلام نے مسئلہ قدر کے متعلق ایک شخص کے استفسار پر ارشاد فرمایا تھا۔ مسئلہ قدر ایک گہرا سمندر ہے جس میں تجھے داخل نہ ہونا چاہیے۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا تو آپ نے فرمایا وہ ایک تاریک راستہ ہے اس پر نہ چل۔ جب تیسری بار پھر اس شخص نے یہی سوال کیا تو حضرت نے فرمایا وہ خدا کا ایک راز ہے۔ اس کو معلوم کرنے کے لئے تو تکلیف نہ کر۔ نیز جناب امیر علیہ السلام مسئلہ قدر کی بابت فرماتے ہیں۔ خبردار یہ اسرار الٰہی میں سے ایک سربستہ راز ہے اس کے مخفی پردوں میں سے ایک پردہ ہے۔ اس کے خزانوں میں سے ایک چھپا ہوا خزانہ ہے۔ حجاب قدرت میں وہ بلند

سچی بات تو یہ ہے کہ مسئلہ قضا و قدر ایک ایسا سربستہ راز ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک نہ کوئی فلسفی و منطقی اسے کھول سکا ہے اور نہ آئندہ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ کوئی اس عقدہ کو وا کر سکے گا۔ کیا خوب کہا حافظ شیرازی نے

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

حضراتِ آئمہ اطہار علیہم صلوات الملک الجبار نے اگرچہ لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر ان کے حالات و اطوار کے مطابق اس مسئلہ کو سمجھانا چاہا لیکن وما اوتيتم من العلم الا قليلا کے مصداق لوگ آئمہ طاہرین کے ان تشریحی و توضیحی بیانات کو بھی نہ سمجھ سکے اور وہ احادیث بجائے خود احادیث معضلہ و آثار مشکلہ میں سے شمار ہونے لگیں اور علماء ابرار یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ "هذه الاحاديث من غوامض الاخبار ومتشابهات الآثار والموكول علم حقيقتها الى معادن الوحي والاسرار۔ (مصابیح الانوار فی حل مشکلات الاخبار) اور اگر کچھ ان کے متعلق لکھا گیا تو وہ بھی بنا بر ظن و تخمین نہ بطور جزم و یقین۔ والله يهدى من يشاء الى صراط مستقيم۔

مسائل قضا و قدر میں اجمالی اعتقاد رکھنا کافی ہے

انہی مذکورہ بالا حقائق کی بنا پر بعض علمائے محققین نے تو صاف صاف لکھ دیا کہ

وجدير بالمرء ان يقنع فى هذه الورطة باعتقاد ان الله سبحانه مريد فقط ولا يريد شيئا من السيئات والقبائح قط دون ان يتعمق فى كنه الارادة والمشية هذا ما يقتضيه العقل والعدل وتقتضى به ظواهر الكتاب والسنة (حاشیہ شرح عقائد للشیخ المفید علیہ الرحمۃ)

خلق الله مختوم بخاتم الله
سابق فی علم الله و منع الله عن
العباد علمه و رفعه فوق
شهاداتهم و مبلغ عقولهم
لانهم لا ینالونه بحقیقة الربّانیة
ولا بقدرته الصمدانیة ولا
بعظمته انیة ولا بعزّته

مقام پر ہے اور خلق خدا سے پوشیدہ ہے اس پر خدا کی مہر
لگی ہوئی ہے۔ وہ پہلے سے خدا کے علم میں ہے اور اس
نے اپنے بندوں کو اس کے علم سے محروم رکھا اور اسے ان
کے مشاہدہ اور ان کی عقول و ادراک کی حدود سے بہت
ہی بلند و بالا رکھا ہے۔ کیونکہ بندے اس کی حقیقت ربانی
کو نہیں پا سکتے۔ اور نہ ہی اس کی بے نیاز قدرت کا ادراک
کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی نورانی عظمت کو پا سکتے ہیں اور

یعنی انسان کے لئے اس مشکل مرحلہ پر بہتر یہ ہے کہ یہ اجمالی اعتقاد رکھے کہ خدا بری ہے اور کسی قسم کے گناہ اور برائی کا ارادہ نہیں کرتا۔ باقی رہا یہ امر کہ ارادہ و مشیتِ ایزدی کی کنہ حقیقت کیا ہے۔ اس میں غور و خوض نہیں کرنا چاہیے یہ ہے وہ امر جس کا عدل و عقل تقاضا کرتے ہیں اور ظواہر کتاب و سنت کا بھی یہی فیصلہ ہے۔

اسی طرح علامہ مجلسی اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں۔ لیس لک التفکر فی شبه القضاء و القدر والخوض فیهما فان الائمة قد نهوا عن التفکر فیهما فان فیهما شبه قویة یعجز عقول اکثر الخلق عن حلها وقد ضل فیها کثیر من العلماء فایاک والتفکر والتامل فیها فانه لا یزیدک الا ضلالاً ولا یزیدک الا جهلاً۔ یعنی تمہارے لئے قضاء و قدر کے مسائل اور ان کے متعلق شبہات میں غور و فکر کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے ہمیں اس امر کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس لئے کہ ان میں اس قدر قوی شبہے ہیں کہ اکثر لوگوں کی عقلیں ان کے حل کرنے سے قاصر ہیں اور اس غور و خوض کی وجہ سے بہت سے اہل علم گمراہ ہو گئے ہیں لہٰذا ان میں ہرگز غور و فکر نہ کرو۔ اس میں فکر کرنے سے سوائے گمراہی اور جہالت میں اضافہ کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور ایسے امور میں ایک عقلمند و متدین انسان کا یہی شیوہ ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة۔ خلاق حکیم کے ہر ہر فعل میں سینکڑوں حکمتیں کارفرما ہیں۔ اور اس کا کوئی کام بھی عبث و بے فائدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے وما خلقنا السماء والارض لاعبین نیز ارشاد فرمایا افحسبتم انما خلقناکم عبثا؟ نیز ارشاد فرمایا ہے۔ انا خلقنا کل شئ بقدر۔ ہمیں اس میں کوئی کلام نہیں جو کچھ کلام ہے وہ صرف اس میں ہے کہ انسان ضعیف البنیان قدرت کے افعال و اقوال کے حقیقی علل و اسباب کو سمجھنے کی لیاقت و اہلیت نہیں رکھتا۔ الا من اعلمه الله تعالیٰ۔

اس نازک مسئلہ کی کچھ تشریح و توضیح

ہاں چونکہ اس تحقیقی و سائنسی دور میں لوگ ہر ہر بات کی اصلیت اور علت

الوحدانية لانه بحر زاخر مواج خالص لله عزّ وجلّ عمقه ما بين السّماء والارض عرضه ما بين المشرق والمغرب اسود كالليل الدامس كثير الحيات والحيتان تعلو مرّة و تسفل اخرىٰ فى قعره شمس تضئ

(اس کی عزت یکتائی تک ان کی رسائی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ موجزن اور تلاطم خیز سمندر صرف خدا ہی کے لئے ہے۔ اس کی گہرائی زمین و آسمان کے فاصلہ کے برابر ہے اور اس کا عرض مشرق سے مغرب تک اور اندھیری رات کی طرح تیرہ و تار ہے۔ اس میں بکثرت سانپ اور مچھلیاں موجود ہیں جو نیچے سے اوپر، اوپر سے نیچے آتی جاتی رہتی ہیں۔ اس کی گہرائی میں ایک سورج چمک رہا ہے،

معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے بغیر ان کی متجسسانہ طبیعت کی تسکین نہیں ہوتی۔ بالخصوص اس مسئلہ کے متعلق تو کئی قسم کی موشگافیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے شاید نامناسب نہ ہوگا۔ اگر ایسے افراد کی ضیافتِ طبع کے لئے اس مسئلہ پر کچھ تبصرہ کر دیا جائے وباللہ التوفیق وبیدہ ازمة التحقیق۔

سو واضح ہو کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جو کچھ کائنات میں ہوتا ہے وہ علم و ارادہ اور قضا و قدر الٰہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسا کہ متعدد روایات میں وارد ہے۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے فرمایا۔ سبحان من لا یجری فی ملکہ الا ما یشاء (سبیل النجاة فی اصول الاعتقادات) پاک ہے وہ خدا جس کے ملک میں وہی واقع ہوتا ہے جسے وہ چاہتا ہے۔ اصول کافی میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے فرمایا علم وشاء واراد وقدر وقضیٰ وامضیٰ فامضیٰ ما قضیٰ وقضیٰ ما قدر وقدر ما اراد بعلمہ کانت المشیة و بمشیتہ کانت الارادة وبارادتہ کان التقدیر وبتقدیرہ کان القضاء وبقضائہ کان الامضاء۔ الخبر۔ خداوند عالم جب کوئی کام کرتا ہے تو اس کام کو چھ مراتب طے کرنا پڑتے ہیں۔ علم، مشیت، ارادہ، قدر، قضا اور امضا۔ امضا اسی چیز کا فرمانا ہے جو پہلے قضا میں آتی ہے اور قضا میں وہی آتی ہے جو اس سے قبل قدر میں ہو اور قدر کے مرحلہ میں وہی چیز قدم رکھتی ہے جو پہلے ارادہ الٰہی میں ہو۔ اس کے علم سے مشیت، مشیت سے ارادہ، ارادہ سے تقدیر، تقدیر سے قضا اور قضا کے بعد امضا ہوتا ہے۔

لیکن اس سے جبر و اکراہ لازم نہیں آتا اور نہ اس کا وہ مطلب ہے جو اشاعرہ نے سمجھا ہے کہ خداوند عالم ہمارے افعال کے خیر و شر کا خالق ہے۔ اور انسان مجبور محض ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ قضا و قدر کے متعدد معانی میں سے ایک معنی فیصلہ کرنا و اندازہ لگانا بھی ہیں، اور قدرت کاملہ کا یہ فیصلہ اور اندازہ اس کے افعال تکوینیہ اور افعال تشریعیہ میں مختلف ہوتا ہے۔ افعال تکوینیہ (جیسے خلق کرنا، رزق دینا اور مارنا جلانا وغیرہ) ان میں اس کا فیصلہ و اندازہ

لا ینبغی ان یطلع علیھا الا الواحد الفرد الصمد فمن تطلع علیھا فقد ضاد اللہ فی ملکہ حکمہ و نازعہ فی سلطانہ و کشف عن سرہ و سترہ و باء بغضب

خدائے واحد و یکتا اور بے نیاز کے سوا کوئی اس پر مطلع نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اس کی حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ حکم خدا کی نافرمانی کرنے والا اس کی سلطنت میں جھگڑا کرنے والا۔ اسرار خداوندی کو فاش کرنے والا اور قہر و غضب الٰہی میں گرفتار ہونے والا قرار پائے گا۔

یہ ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے کائنات میں تصرف فرماتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے ارادہ کی تکمیل میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا اور نہ کوئی رکاوٹ ہوتی ہے۔ لا راد لقضائہ انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون۔ ان اُمور الٰہیہ میں انسان مجبور ہے۔ چنانچہ کتاب التوحید میں بروایت عبداللہ بن میمون القداح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے اور وہ جناب اپنے والد ماجد حضرت امام زین العابدینؑ سے اور وہ اپنے آباء و اجداد طاہرین کے سلسلۂ سند سے جناب امیر المومنینؑ سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت امیر المومنینؑ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ایک آدمی مشیت ایزدی کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کو میرے پاس لاؤ چنانچہ جب اسے حاضر خدمت کیا گیا تو آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ یا عبداللہ خلقک اللہ لما شاء او لما شئت؟ اے بندۂ خدا! خدا نے تجھے پیدا کیا تو اس وقت کیا جب اُس نے چاہا یا جب تو نے چاہا؟ اُس نے عرض کیا کہ لما شاء۔ جب اُس نے چاہا! پھر فرمایا فیمرضک اذا شاء او اذا شئت جب وہ چاہتا ہے تو تجھے بیمار کرتا ہے۔ یا جب تو چاہتا ہے؟ عرض کیا۔ اذا شاء جب وہ چاہے؟ پھر فرمایا فیشفیک اذا شاء او اذا شئت پھر جب وہ چاہے تو تجھے شفا دیتا ہے یا جب تو چاہے؟ عرض کیا اذا شاء جب وہ چاہے۔ فرمایا فیدخلک حیث شاء او حیث شئت۔ پس جس حالت میں وہ چاہے اس میں تجھے رکھتا ہے یا جس حالت میں تو چاہے؟ عرض کیا۔ حیث یشاء جس حالت میں چاہے۔ اس شخص کے یہ صحیح جوابات سن کر آپ نے فرمایا لو قلت غیر ھذا لضربت الذی فیہ عیناک اگر تو اس کے علاوہ کوئی اور جواب دیتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔

ہمیں تو بہر حال راضی بالقدر و القضا رہنے کا حکم ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں وارد ہے۔ من لم یرض بقضائی ولم یصبر علی بلائی ولم یشکر علی نعمائی فلیخرج من ارضی و سمائی ولیطلب ربا سوائی جو شخص میری قضا و قدر پر راضی نہ ہو اور نہ میری بلا و مصیبت پر صبر کرے اور نہ ہی میری نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ اُسے چاہیے کہ میری زمین اور میرے آسمان سے نکل جاتا جائے۔ اور میرے سوا کوئی اور خدا تلاش کرے

من الله ومأويه جهنّم و بئس المصير و روی انّ امیر المومنینؑ عدل من عند حائط مائل الی مکان اخر فقیل له یا امیر المؤمنینؑ اتفر من قضاء الله فقال افر من

اس کا ٹھکانا یقیناً جہنم میں ہوگا۔ اور یہ بہت بُری بازگشت ہے۔ ایک دفعہ حضرت امیر علیہ السّلام ایک گرنے والی دیوار سے بچ کر گذرے۔ کسی نے عرض کیا یا امیر المومنین کیا آپ قضا الہٰی سے بھاگنا چاہتے ہیں؟ فرمایا ہاں میں (غیر حتمی) قضا خداوندی سے بھاگ کر (حتمی) تقدیر الہٰی کی طرف جاتا ہوں۔ حضرت

(البحار السفینہ) جو افعال تشریعیہ ہیں (جیسے واجبات و محرمات وغیرہ احکام شرعیہ) تو ان میں اس کا فیصلہ و اندازہ یہ ہے کہ واجبات کا حکم دیتا ہے اور محرمات سے نہی فرماتا ہے اور ان احکام کی بجا آوری اور تعمیل کو انسان کے ارادہ و اختیار پر چھوڑ دیتا ہے (جیسا کہ سابقہ مسئلہ میں اس کی تفصیل ذکر ہو چکی ہے) لیکن بایں ہمہ وہ جانتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ سے کس شق کو اختیار کریگا آیا واجبات پر عمل کرے گا۔ یا محرمات کا ارتکاب کرے گا۔ لیکن اس کے ذاتی علم سے انسان کا اپنے افعال میں مجبور ہونا لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ سابقاً اس امر کو ثابت کیا جا چکا ہے کہ علم کو اپنے معلوم کے وجود میں ہرگز کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود اپنے علل و اسباب کی وجہ سے وجود میں آتا ہے عالم کے علم یا جاہل کے جہل کو اس کے وجود یا عدم میں کوئی مدخلیت نہیں ہے۔ اگر ہمیں کسی ذریعہ سے یہ علم ہو جائے کہ کل آفتاب فلاں بجے طلوع کرے گا یا ہمیں یقین حاصل ہے کہ امام زمانہ ظہور فرمائیں گے یا قیامت آئے گی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے علم کو آفتاب کے طلوع کرنے یا امامؑ زمانہ کے تشریف لانے یا قیامت کے آنے میں کچھ دخل ہے۔ بلکہ علم تو معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ علم کا تعلق تو حقیقتِ واقعیہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس اگر معلوم کا حقیقت واقعیہ ہونا علم پر موقوف ہو تو اس سے "دور" لازم آئے گا جو کہ بالبداہت باطل ہے۔ ہاں علم کا کمال یہ ہے کہ معلوم کے مطابق ہو۔ چونکہ ہمارے علوم ناقص ہیں۔ اس لئے بعض بلکہ اکثر اوقات انکشاف خلاف ہو جاتا ہے لیکن علمِ ازلی چونکہ سراسر صحیح اور کامل بلکہ اکمل ہے۔ لہٰذا وہاں انکشافِ خلاف نہیں ہوتا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا ہے یہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ معادنِ وحی و تنزیل کی فرمائشاتِ عالیہ سے ماخوذ و مستنبط ہے۔ اور سب سے زیادہ جس حدیث شریف سے اس مطلب پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ شیخ شامی والی روایت ہے جو کہ حضرت امیر المومنین علیہ السّلام سے منقول اور کتب فریقین میں موجود ہے (چنانچہ اصول کافی اور شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی ج ۴ اور شرح مقاصد ج ۲ وغیرہ میں جناب اصبغ بن نباتہ سے روایت ہے کہ جناب امیر المومنینؑ جنگ صفین سے فراغت کے بعد واپس کوفہ تشریف لا رہے تھے تو ایک مقام پر آپ کے اصحاب میں سے ایک

قضا الله الی قدر الله وسئل الصادق عن الرقی هل تدفع من القدر شیئا فقال هی من القدر

صادق علیہ السلام سے کسی نے دریافت کیا کہ تقدیر خداوندی کو تعویذ روک سکتے ہیں۔ فرمایا تعویذ بھی قدر میں سے ہی ہیں۔

شامی شیخ نے آں جناب کی خدمت میں عرض کیا۔

شیخ شامی۔ مولا! یہ فرمایئے کہ ہمارا صفین کی طرف جانا خدا کی قضا و قدر سے تھا؟

حضرت امیر علیہ السلام۔ خالق کائنات کی قسم ہم کسی جگہ نہیں گئے۔ اور کسی وادی میں نہیں اُترے۔ مگر خدائے تعالیٰ کی قضا و قدر سے۔

شیخ شامی۔ تو پھر ہم نے اس سلسلہ میں جس قدر مصائب و آلام جھیلے۔ وہ سب رائیگاں گئے۔ اور اجر و ثواب ختم ہو گیا (کیونکہ پھر تو ہم مجبور تھے)

حضرت امیر علیہ السلام۔ اے شیخ جلدی نہ کرو۔ تم وہاں جانے اور پھر آنے میں مجبور و مضطر نہ تھے۔ بلکہ یہ تکالیف تم نے اپنے ارادہ و اختیار سے برداشت کی ہیں۔ لہٰذا تمہیں ان کا اجر و ثواب ضرور ملے گا۔

شیخ شامی۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ جب ہمارا جانا اور آنا قضا و قدر کے ماتحت تھا تو پھر تو ہم کو قضا و قدر مجبور کر کے وہاں لے گئی۔ (اختیار کہاں رہا)

حضرت امیر علیہ السلام۔ خدا تم پر رحم کرے تم شاید یہ سمجھے ہوئے ہو کہ وہ قضا و قدر حتمی و لازمی تھی (جس کی وجہ سے تم مجبور تھے) حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو پھر ثواب اور عذاب کا سلسلہ باطل ہو کر رہ جائے گا۔ اور خدا کے وعدہ ہائے (جنت) اور وعید ہائے (دوزخ) بے کار محض ہو جائیں گے۔ اور اس کے امر و نواہی ساقط ہو جائیں گے۔ پھر تو نہ کوئی نیکوکار تعریف کا حقدار رہے گا۔ اور نہ کوئی بدکار مذمت کا مستوجب ہوگا۔ یہ نظریہ تو دشمنان رحمٰن اور گروہ شیطان، پرستاران اصنام کے برادران اور اس اُمت کے قدریہ و مجوس کا ہے۔ بے شک خداوند عالم نے کچھ تکالیف شرعیہ مقرر فرمائی ہیں، لیکن تعمیل اور عدم تعمیل کا لوگوں کو اختیار دیا ہے۔ اسی طرح بعض اُمور سے ڈرانے کے لئے نہی فرمائی ہے وہ تھوڑے سے عمل پر اجر کثیر عطا فرماتا ہے۔ اس کی نافرمانی اسی لئے نہیں کی جاتی کہ وہ مغلوب و مقہور ہے۔ اور نہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری اس لئے کی جاتی ہے کہ اس نے مخلوق کو مجبور کر دیا ہے اور نہ اس نے زمین و آسمان کو بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی اس نے انبیاء و مرسلین کو عبث و بے فائدہ بھیجا ہے۔ ذلک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار۔

عیون الاخبار اور کتاب التوحید میں اس روایت کا تتمہ یوں مروی ہے کہ جب حضرت علیؑ نے یہ فرمایا کہ تم اس

سفر میں مجبور نہ تھے تو۔

شیخ شامی۔ نے عرض کیا تو پھر وہ کونسی قضا و قدر تھی جس کے مطابق ہم نے یہ سفر کیا؟

حضرت امیر علیہ السلام:۔ نے فرمایا الامر من اللہ والحکم ثم تلا ھذہ الایۃ وہ امر و حکم خداوندی تھا۔ پھر اس کے ثبوت میں کہ قضا بمعنی حکم استعمال ہوتی ہے۔ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا۔ ای امر ربک۔ یعنی تمہارے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ تم عبادت نہ کرو مگر اپنے خدا کی اور اپنے والدین کے ساتھ احسان کرو۔

احتجاج طبرسی میں یہ تتمہ یوں مروی ہے۔

شیخ شامی:۔ وہ قضا و قدر کونسی ہے۔ جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے؟

حضرت امیر علیہ السلام:۔ الامر بالطاعۃ والنھی عن المعصیۃ والتمکین من فعل الحسنۃ و ترک المعصیۃ والمعونۃ علی القرب الیہ والخذلان لمن عصاہ والوعد والوعید والترغیب والترھیب کل ذلک قضاء اللہ فی افعالنا وقدرہ لاعمالنا اما غیر ذلک فلا تظنہ فان الظن لہ محبط للاعمال۔ یعنی اس قضا و قدر کا مطلب یہ ہے کہ طاعت کا حکم دینا اور معصیت سے نہی کرنا۔ اچھے کام کے انجام دینے، معصیت کے ترک کرنے کی طاقت دینا۔ قرب ایزدی حاصل کرنے پر امداد کرنا اور جو اس کی نافرمانی کرنا چاہے اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا۔ نیز (مقام امتثال میں) وعدہ جنت اور وعید (دوزخ)، (جنت کی) رغبت دلانا اور (دوزخ سے) ڈرانا ہمارے افعال و اعمال کے متعلق قضا و قدر الہی کا یہ مطلب ہے اس کے علاوہ اور کوئی گمان نہ کرنا کیونکہ ایسا گمان تمام اعمال کو حبط کر دیتا ہے۔

بہر صورت تمام روایات کے آخر میں وارد ہے کہ شیخ شامی امام عالی مقام کے ان اجوبۂ شافیہ سے بہت مسرور و شادکام ہوا۔ اور عرض کیا فرجت عنی فرج اللہ عنک آپ نے عقدہ حل کر کے مجھے کشائش عطا کی خدا آپ کو کشائش عطا کرے۔ پھر شیخ نے خوشی میں یہ شعر انشا کر کے پڑھے۔ ع

انت الامام الذی نرجو بطاعتہ ۔۔۔ یوم النشور من الرحمن غفرانا

آپ ہی وہ امام برحق ہیں کہ جن کی اطاعت سے ہمیں امید کامل ہے کہ خداوند عالم قیامت کے دن ہمیں بخش دیگا۔

اوضحت من دیننا ما کان ملتبسا ۔۔۔ جزاک ربک بالاحسان احسانا

آپ نے ہمارے دین میں سے ان امور کو واضح کر دیا ہے جو مشتبہ تھے خداوند عالم آپ کو اس احسان کی جزا احسان کے ساتھ دے۔

یہ روایت شریفہ اس امر پر بطور نص صریح دلالت کرتی ہے کہ افعال تشریعیہ میں قضا و قدر بمعنی امر بالطاعۃ و نہی

باب الاعتقاد فی الفطرة والهدایة۔ قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی ذلک ان اللہ تعٰ

آٹھواں باب (فطرت اور ہدایت کی بابت عقیدہ

حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فطرت اور ہدایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے۔ کہ

از معصیت ہے۔ اور انسان اس کی تعمیل میں مختار ہے نہ مجبور۔ ہاں افعال تکوینیہ میں قضا و قدر کے معنی دوسرے ہیں جو اوپر بیان کر دئے گئے ہیں۔

تکوینی قضا و قدر کی تقسیم

وہ قضا و قدر جس کا تعلق افعال تکوینیہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) قضاء مبرم و محتوم و قدر حتمی جو ٹل نہیں سکتی ہے۔ اس کے متعلق جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ تذل الامور للمقادیر حتی یکون الحتف فی التدبیر امور اس طرح تقدیر کے تابع ہوتے ہیں۔ کہ بعض اوقات تقدیر کے خلاف تدبیر اختیار کرنے میں ہی ہلاکت مضمر ہوتی ہے۔ قال الصادقؑ اذا جاء القدر عمی البصر جب قدر آجاتی ہے تو آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔ ولنعم ما قیل۔ ع۔

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود   روغن بادام خشکی می کند

اور دوسری قضائے غیر محتوم و قدر جو کہ صدقہ دینے اور دعا و پکار کرنے یا اس قسم کے دیگر اسباب و وسائل اختیار کرنے سے ٹل جاتی ہے۔ جیسا کہ متعدد احادیث میں وارد ہے لا یرد البلاء الا الصدقۃ ولا یرد القضا الا الدعاء کہ بلا و مصیبت کو رد نہیں کرتا مگر صدقہ اور قضا کو رد نہیں کرتی مگر دعا۔ نیز ارشاد قدرت ہے۔ قل ما یعبأ بکم ربی لولا دعائکم۔ اے رسولؐ کہہ دو اگر تمہاری دعا و پکار نہ ہو تو میرا پروردگار تمہاری کوئی پرواہی نہ کرے۔ لیکن مخلوق سے یہ امر مخفی رکھا گیا ہے کہ کن امور میں قضا حتمی ہے اور کن میں قضا غیر حتمی ہے تا کہ ان کی دعا و پکار اور صدقات و خیرات و تعویذات اور دیگر وسائل و اسباب کا سلسلہ برابر جاری و ساری رہے اور بارگاہ قدس سے برابر ربط و تعلق برقرار و قائم رہے۔ یمحو اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب۔ سھل اللہ امورنا و وفقنا لما یحب و یرضٰی۔ مذکورہ بالا مطلب کی مزید وضاحت باب دہم میں بذیل حقیقت بدا کی جائے گی انشاء اللہ۔ فانظروا انی معکم من المنتظرین

آٹھواں باب فطرت و ہدایت کے بیان میں

معنی فطرت کی وضاحت

قبل اس کے کہ اصل مقصد پر دلائل پیش کئے جائیں فطرت کے معنوں کی وضاحت ضروری ہے تا کہ مقصد کے اثبات میں آسانی ہو۔ نیز واضح ہو کہ فطرت کے معنی ہیں ما یقتضیہ الشیٔ لو خلی و نفسہ بدون مانع۔ یعنی جب کسی چیز کو اپنی

فطر جمیع الخلق علی التوحید و ذلک قولہ عزّوجلّ فطرۃ اللہ الّتی فطر النّاس علیہا وقال الصّادقؑ	خداوند عالم نے تمام بندوں کو معرفت توحید پر پیدا کیا ہے جیسا کہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے یہ اسلام وہ دین ہے جس پر خدا نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

اصلی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی مانع موجود نہ ہو تو اس وقت وہ چیز جس حالت کا تقاضا کرے اس کو اس چیز کی فطرت کہا جائے گا مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ سچ بولنا انسان کی فطرت ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مانع موجود نہ ہو تو انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سچ بولے یا جیسے جب یہ کہا جائے کہ ثقیل چیز کا نیچے گرنا فطری و طبعی ہے، تو اس سے بھی مُراد یہی ہوتی ہے کہ اگر کوئی مانع قوی موجود نہ ہو تو ایسی چیز نیچے ہی کو آتی ہے۔

اب یہ فطرت اکثر اوقات تو اپنی اصلی حالت پر برقرار رہتی ہے مگر کبھی کبھی بعض وجوہ کی بنا پر بدل بھی جاتی ہے یعنی جب تک کوئی مانع قوی موجود نہ ہو تو وہ اصلی حالت پر برقرار رہتی ہے اور جب کوئی مانع قوی آجائے تو وہ بدل جاتی ہے۔ مثلاً ابھی اُوپر ذکر کیا گیا ہے کہ انسان کی فطرت سچ کی متقاضی ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ثقیل شے کا تقاضا تو نیچے گرنا ہے۔ لیکن بعض اوقات قسر قاسر سے خلافِ فطرت اُوپر کو چلی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب خارجی دباؤ کا اثر ختم ہو تو پھر کل شئی یرجع الی اصلہ۔

اس تمہید کے بعد اب قابلِ غور امر یہ ہے کہ آیا انسان کی فطرت ہستی باری تعالیٰ کے اقرار کی متقضی ہے یا انکار کی؟ اس امر کی کماحقہٗ تحقیق اس کتاب کے دیباچہ میں کی جا چکی ہے۔ اور ادلّہ و براہین قطعیہ سے توحید کا فطری و جبلّی ہونا محقق و مبرہن کیا جا چکا ہے اور جو شخص بھی انسانی وارداتِ قلبیہ اور اس کے تقاضا ہائے فطریہ اور اس کے عقائد مذہبیہ کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرے گا، وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا کہ اقرار توحید صانع عالم انسان میں فطری و طبعی ہے چنانچہ عقلِ سلیم و قرآنِ کریم اور احادیث پیمبر اسلامؐ و آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین اور مشاہدۂ قطعیہ سے بھی اس امر کی تائید و تشئید ہوتی ہے۔ چنانچہ آیۂ مبارکہ فطرۃ اللہ التی فطر النّاس علیہا کی تفسیر میں آئمہ اطہار کی متعدد احادیث کتب معتبرہ میں موجود ہیں جن میں یہ وارد ہے کہ یہاں فطرۃ سے مراد توحید ہے (تفسیر صافی و برہان) اسی طرح پیغمبر اسلام کی یہ حدیث عند الفریقین مشہور و مسلّم ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرۃ ثم ابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ۔ یعنی ہر بچہ فطرت اسلامیہ توحیدیہ پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد ازاں اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اور مشاہدہ بھی شاہد ہے کہ جب بھی کسی خالی الذہن انسان سے یہ سوال کیا جائے کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ فوراً یہ کہہ دیتا ہے کہ

فی قولہ تعـ وما کان اللہ لیضل قوماً بعد اذ ھدٰیھم حتی یبیّن لھم ما یتقون قال حتی یعرّفھم ما یرضیہ و ما یسخطہ وقال فی قولہ تعـ فالھمھا فجورھا وتقوٰیھا

نے خدا کے اس ارشاد کہ اللہ کسی کو ہدایت کرنے کے بعد اس سے توفیق سلب نہیں کرتا جس سے وہ گمراہ ہو جائے یہانتک کہ ان کے لئے وہ چیزیں کھول کر بیان کر دے جن سے بندوں کو ڈرنا چاہیے۔ کی تفسیر میں کہ خدا کے کھول کر بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بطور اتمام حجت اپنے بندوں کے لئے وہ تمام

خدا نے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس امر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے ولئن سألتھم من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن اللہ۔ اے رسولؐ! اگر تم کفار سے یہ پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ کہہ اٹھیں گے اللہ نے انسان تو انسان یہاں تو یہ حالت ہے کہ ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید — وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

بالاختصار جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے حضرت مصنف علام کی فرمائش کی تائید مزید ہو جاتی ہے۔

توحید کے فطری ہونے کے متعلق ایک شبہ کا ازالہ

بعض اعلام نے اس نظریہ پر جو یہ اعتراض کیا ہے کہ "لو کان الامر کذلک ما کان مخلوق الا موحداً و فی وجودنا من المخلوقین من لا یوحد اللہ؟ یعنی اگر یہ بات درست ہوتی کہ توحید فطری امر ہے تو پھر چاہیے تھا کہ تمام مخلوق موحد و خدا پرست ہوتی۔ حالانکہ ایسے آدمی موجود ہیں۔ جو کہ توحید کے قائل نہیں ہیں۔ یہ اعتراض بالکل درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ کیونکہ یہ اشکال اس خام خیالی پر مبنی ہے کہ توحید لوگوں کے اندر خلق کر دی گئی ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اور یہ سراسر غلط ہے کیونکہ اوپر واضح کر دیا گیا ہے کہ کسی چیز کے فطری ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر مانع مفقود ہو اور کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو تو اس وقت کسی چیز کا فطری اثر ظاہر ہوتا ہے۔ جسے علمی الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ فطرت میں فقط اقتضا پائی جاتی ہے نہ الجاء و اکراہ۔ لہٰذا موانع کی وجہ سے مقتضائے فطرت میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اس امر کا تذکرہ خود حدیث نبوی فابواہ یھودانہ الخ... میں موجود ہے۔ لہٰذا دنیا میں منکرین خدا موجود ہیں تو وہ یا تو برے ماحول اور غلط سوسائٹی کا شاہکار ہیں۔ یا شیاطین انسی و جنی کے دام تزویر میں گرفتار ہو کر یا خواہشات نفسانیہ کی قید میں مقید اور ظنون و اوہام کے شکنجے میں مبتلا ہو کر توحید کا انکار کرتے ہیں۔ جیسا کہ رب العزت نے اپنے کلام پاک میں اس امر کی خبر دی ہے۔ قالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الا الدھر ومالھم بذلک من علم ان ھم الا یظنون۔ (پ ۲۵ سورہ جاثیہ) یعنی (منکرین توحید) کہتے ہیں کہ سوائے زندگانی دنیا کے اور کوئی زندگی نہیں

قال بین لھا ما تاتی وما تترک من المعاصی وقال تعہ انا ھدینہ السّبیل اما شاکرًا و اما کفورًا

امور واضح طور پر بیان کر دے جو اس کی خوشنودی کا باعث ہوں اور ان باتوں سے بھی آگاہ فرما دے جو اس کی ناراضی کا سبب ہیں نیز انہی جناب سے خدا کے اس ارشاد کہ خدا نے ہر آدمی کو بدکاری اور پرہیزگاری کے متعلق پہچان عطا کر دی ہے کی تفسیر

ہم اب زندہ ہیں۔ پھر مر جائیں گے۔ اور ہمیں نہیں مارتا مگر زمانہ۔ ان لوگوں کی یہ باتیں کسی علم و یقین کی بنا پر نہیں بلکہ یہ ان کے محض ظنون و اوہام ہیں۔ ایک اور مقام پر ان کے ان پریشان خیالات کو قدرت نے "خرص" یعنی گمان و تخمین" سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ مالھم بذلک من علم ان ھم الا یخرصون۔

دینِ اسلام کے دینِ فطرت ہونے نیز معیارِ صداقت کا بیان

انہی حقائق سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ کیونکہ جس کی اصل الاصول فطری ہے۔ اس کے دیگر اصول و فروع بھی فطری ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں فطرت اللّٰہ التی فطر الناس علیہا کی تفسیر دینِ اسلام سے کی گئی ہے چنانچہ کتاب توحید میں بروایت عبداللّٰہ بن سنان حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ فطرت سے مراد دینِ اسلام ہے۔ اس حقیقت کی مختصر توضیح یہ ہے کہ اس وقت دنیا کے اندر بے شمار مذاہب و ادیان پائے جاتے ہیں۔ اور ہر دین اس کا مدعی ہے کہ وہی دینِ خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اور وہی انسانوں کی دنیوی نجاح اور اخروی فلاح کا کفیل ہے اور یہ کہ وہی برحق اور دوسرے سب ادیان باطل ہیں سچ ہے۔ ؎

عاقل بعقلِ خود نازد و مجنوں بجنوں

کل حزب بما لدیھم فرحون

لیکن ان کے اصول و فروع کا باہمی اختلاف اس امر کی قطعی دلیل ہے۔ کہ نہ تو یہ سب مذاہب صادق ہو سکتے ہیں اور نہ ہی سب کاذب (کیونکہ اجتماع ضدین و ارتفاع نقیضین محال ہے) ان دنوں حالات عقل سلیم مجبور کرتی ہے کہ کوئی ایسا معیار ہونا چاہیے جس سے سچے اور جھوٹے مذہب کے درمیان امتیاز قائم کیا جا سکے۔ معیار و میزان کس چیز کو قرار دیا جائے؟ یہ امر بہت غور طلب ہے اگر آسمانی کتب کو معیار قرار دیا جائے تو اتفاق نہ ہو سکے گا۔ ہر صاحب دین علیحدہ کتاب پیش کرے گا۔ اگر علماء کو میزان قرار دیا جائے تو ان کا باہمی اختلاف معلوم۔ اگر عقول و افہام کو کسوٹی بنایا جائے تو ان کا افتراق مشاہد و محسوس۔ معیار تو ایسا ہونا چاہیے کہ جسے تمام ادیان بخوشی قبول کر لیں۔ اور ہر شخص خواہ جس مسلک کا سالک اور جس ملک کا ساکن اور جس نسل کا فرد ہو اس معیار کو بلا چون و چرا تسلیم کرلے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا جامع و مانع مکمل معیار سوائے فطرت صحیحہ کے اور کوئی نہیں ہے۔ یہی فطرت سلیمہ ہی وہ چیز ہے جو بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا افتراق ملک و

قال عرفناه امّا اخذاً و امّا تاركاً و فی قوله عزّ وجلّ و امّا ثمود فهديناهم فاستحبّوا العمی علی الهدی: قال وهم

میں مروی ہے۔ فرمایا خدا نے وہ اُمور بھی بتا دیئے ہیں۔ جن کو بجالانا چاہیے اور ان گناہوں سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ جن سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایک اور مقام پر خداوند عالم فرماتا ہے ہم نے انسان کو حق کا راستہ دکھایا ہے اب اس کی مرضی خواہ وہ

ملّت اور بلا تمیز مرد و زن سب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہی فطرت ہی معیار حق و باطل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اب صحیح اور قابلِ قبول دین وہی ہوگا جس کے اُصول و آئین قوانین فطرت کے مطابق ہوں گے۔

دینِ اسلام کے فطری ہونے کا اثبات

پس جب یہ امر مبرہن ہو گیا کہ کسی مذہب اور دین کی صداقت و حقانیت معلوم کرنے کا معیار فطرت ہے۔ یعنی یہ کہ اس کے تمام اُصول و عقائد اور فروع و احکام فطرت سلیمہ کے مطابق ہوں تو اب ہم بہانگِ دہل اور بلا خوفِ ردّ کہہ سکتے ہیں کہ تمام ادیان عالم میں فقط دینِ اسلام ہی اس معیار پر پُورا اترتا ہے اور تنہا یہی دین فطرت کہلانے کا حقدار اور خالق فطرت کا مقرر کردہ آئین ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ باقی جس قدر ادیان ہیں۔ وہ اس معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ اگرچہ اس دعویٰ کو متعدد طرق و اسالیب سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مگر بنظرِ اختصار ہم یہاں صرف چند طرق کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں

طریق اوّل۔ یہ امر اپنے مقام پر محقق و مبرہن کیا جا چکا ہے کہ انسان کی حقیقت یہی جسم مادی و محسوس نہیں ہے جو چند عناصر سے مرکب ہے جو وقتاً فوقتاً بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے اور بالآخر فنا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ مادیین کا خیال ہے بلکہ اس جسم کے ساتھ ایک اور ایسا جوہر لطیف بھی موجود ہے جو درحقیقت جوہر انسانیت ہے جسے روح کہا جاتا ہے جو آثار و خواص میں جسم سے بالکل مختلف اور متضاد ہے۔ مثلاً جسم کثیف ہے۔ اور وہ لطیف جسم مادی ہے وہ نورانی جسم فانی ہے اور وہ باقی۔ الی غیر ذلك من الفوارق الكثيرة۔

یہاں اس بحث میں پڑنا مقصود نہیں ہے کہ انسان تین اُمور (جسم و روح اور نفس) یا دو امور (جسم و روح) کے مجموعہ کا نام ہے۔ بلکہ یہاں اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ انسان میں مادی و روحانی دو جنبے ہیں۔ اور چونکہ کوئی بھی دین انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا ضامن و کفیل ہوتا ہے۔ لہٰذا کامل دین اور دین فطرت وہ ہوگا جو انسان کے تمام جسمانی و روحانی شعبوں پر حاوی ہو۔ اور اس کے جسمانی و روحانی تقاضوں کو پورا کرنے پر قادر ہو اور اس کی دنیوی و دینی نجاح و فلاح کی کفالت کر سکتا ہو۔ اور ایسا دین جس میں انسان کے ان جملہ تقاضوں کو پورا کرنے کا خاص خیال رکھا گیا ہو۔ بجز دین اسلام کے اور کوئی دین موجود نہیں ہے۔ باقی تمام ادیان میں یہ نقص موجود ہے کہ ان میں یا تو محض مادی ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ جس سے انسان کی اخروی حیات کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے یا فقط اخروی

یعرفون وسئل عن الصادق وھدیناہ النجدین قال نجد الخیر و نجد الشر و قال و ما حجب اللہ علمہ عن العباد فھو موضوع

شکر گذار بنے یا کفر اختیار کرے اس کی تفسیر میں امام فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان کو نیک و بد افعال کی معرفی کرا دی ہے اب ان کو بجالانا یا ترک کرنا اس کے متعلق ہے۔ قولِ خدا "ہم نے قوم ثمود کو حق کا راستہ دکھا دیا مگر انہوں نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو پسند کیا" کی تفسیر میں حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ ان لوگوں نے حق کو پہچاننے کے باوجود گمراہی کو اختیار

حیات اور روحانی غذا کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ دنیوی زندگی اور مادی تقاضوں کو بالکل کچل کر رکھ دیا گیا ہے لیکن دین اسلام ہی ایک ایسا دین ہے۔ جو انسان کو اس کی زندگی کے ہر ہر شعبے میں رہبری کرتا ہے۔ اور دین و دنیا کا بہترین امتزاج پیش کرتا ہے۔ اسلام دنیا کو مزرعہ آخرت قرار دیتے ہوئے بتلاتا ہے کہ جو کچھ کروگے اس کا ثمرہ وہاں پاؤگے ترک دنیا اسلام میں جائز نہیں امام علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔ لیس منا من ترک الدنیا للاخرۃ و من ترک الاخرۃ للدنیا۔ وہ شخص ہم سے نہیں یعنی ہمارا پیروکار نہیں جو آخرت کے لئے دنیا اور دنیا کے لئے آخرت چھوڑ دے۔ اور یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ اسلام میں روح و جسم کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور دونوں کی غذا بطریق احسن مہیا کی گئی ہے۔ یوں سمجھئے کہ دینِ اسلام اعتقاد و عمل کی ایک معجونِ مرکب ہے۔ جس کا اثر انسان کی دنیوی اور اخروی زندگی پر برابر پڑتا ہے جس طرح ہر معجون کے لئے کچھ اجزا ہوتے ہیں جن کی مقدار کم و بیش ہوتی ہے اسی طرح اسلام کی معجون میں نماز کی کچھ رکعتیں ہیں صوم کے کچھ ایام ہیں، حج کے کچھ ارکان ہیں، زکوٰۃ و خمس کے کچھ مقادیر ہیں نکاح و طلاق اور تعزیرات و دیات کے کچھ حدود ہیں۔ ان کو اخلاقِ حسنہ کی کھانڈ پر عقائد صحیحہ کے پانی میں قوام دے کر اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ توتی اکلھا کل حین۔ فیہ ما تشتہیہ الانفس و تلذ الاعین۔

طریق دوم۔ اسلام کے عقائد اور قوانین اس امر کے شاہد عادل ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی انسان کی صحیح فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس کے برعکس دیگر مذاہب فطرتِ انسانی کے بالکل مخالف ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن اختصار مانع ہے۔ رہبانیت، ترک لذائذ، ایذا، نفس وغیرہ امور جو بعض مذاہب میں داخل ہیں، اسلام میں ان کا نام و نشان نہیں۔ اس میں لذائذ دنیا اور حظوظ عاجلہ اپنے مقررہ قواعد و ضوابط کے ساتھ جائز و مباح ہیں۔ اسلام میں یہ سہولت پائی جاتی ہے کہ وہ انسان کی فطرت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ کہیں اس کے خلاف نہیں جاتا۔ اور یہی امر اس کا مابہ الامتیاز ہے ارشاد قدرت ہے۔ یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر (پ ۲ سورۂ بقرہ ع ۷) نیز ارشاد ایزدی ہے و ما جعل اللہ فی الدین من حرج

عنھم دقال ان اللہ تع احتج علی الناس بما اٰتیھم وعرفھم۔

کیا۔ ارشادِ الٰہی ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں کے متعلق کسی نے حضرت صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ ان دو راستوں سے مراد کونسے راستے ہیں؟ فرمایا یہ نیکی اور بدی کے راستے ہیں۔ پھر فرمایا خدا نے جن باتوں کا علم اپنے بندوں سے مخفی رکھا ہے۔ ان کی تکلیف بھی ان سے ساقط کردی ہے۔ ہاں جو احکام ان کے پاس بھیجے اور ان کا علم بھی عطا کیا (انہی کی بندوں کو تکلیف دی ہے) اور انہی کے ذریعہ ان پر حجت قائم کی ہے۔

دین اسلام کا کوئی اصولی یا فروعی مسئلہ ایسا نہیں جسے عقل سلیم اور طبع مستقیم قبول کرنے سے ابا وانکار کرے۔ اسلام کے ہر ہر حکم میں اس قدر فوائد وعوائد اور ہر ہر نہی میں اس قدر مضار ومفاسد مضمر ہیں کہ جب ان کی کنہ میں غور کیا جاتا ہے تو عقل انسانی حیران ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوں جوں علوم وفنون میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ جس سے دیگر ادیانِ عالم کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ وہاں اسلام کی صداقت وحقانیت بحمدہ تعالےٰ اور زیادہ روشن واجاگر ہو رہی ہے۔

طریق سوم۔ اسلام میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے (اوّل) یہ کہ انسان اپنی کوشش کے ساتھ ساتھ اپنے معاملات کو قدرتِ کاملہ کے سپرد کردے۔ اور کامیابی وکامرانی حاصل کرنے میں اس کی ذات پر بھروسہ کرے اور (دوم) یہ کہ مخلوقِ خدا کے ساتھ اپنے تعلقات وروابط اچھے رکھے۔ ارشادِ قدرت ہے۔ ومن احسن دینا ممن اسلم وجھہ للہ وھو محسن۔ اس سے بہتر کس کا دین ہو سکتا ہے۔ جو اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے۔ اور مخلوقِ خدا کے ساتھ صلح وآشتی سے پیش آئے۔ اور یہی فطرت کا تقاضا ہے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

پس ان حقائق کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ دینِ اسلام دینِ فطرت ہے۔ جو خالقِ فطرت کا مقرر کردہ دین ہے فاقم وجھک للدین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (پ ۲۱ سورہ روم)

طریق چہارم اسلام میں نجاح وفلاح کی بنیاد ایمان وعمل پر رکھی گئی ہے۔ اعتقادِ صحیح کے بغیر عمل خواہ کتنا ہی عمدہ اور زیادہ کیوں نہ ہو نجات کے لئے ناکافی قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اعتقاد کیسا ہی مضبوط ہو۔ اگر اس کے ساتھ عمل صالح نہیں تو وہ بھی نجات کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں بھی کسی گروہ سے نجاتِ اخروی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ وہاں ایمان وعمل کو توام بیان کیا ہے۔ ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت۔ تکمل

باب الاعتقاد فی الاستطاعت	نانواں باب (بندوں کی استطاعت کے متعلق عقیدہ)
قال الشیخ ابو جعفر اعتقادنا فی ذالک ما قالہ موسی بن جعفر علیہما السّلام حین قیل لہٗ	حضرت ابن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس مسئلہ میں ہمارا وہی عقیدہ ہے جو امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام نے ایک شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا جب کہ اس نے آں جناب کی خدمت

اسلام و ایمان کیا ہے؟ الاقرار باللسان والتصدیق بالجنان والعمل بالارکان۔ نجات کے لئے نہ تنہا اعتقاد کافی ہے اور نہ عمل۔ لیکن اسلام کے علاوہ جس قدر مذاہب ہیں۔ ان میں نجات کا دارومدار ان دو میں سے فقط ایک پر رکھا گیا ہے۔ بودھ مذہب وجین مت میں عمل پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن اعتقاد کو ہرگز درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اور یہودیت و مسیحیت نے عمل کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ پاپائے اعظم کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ رقم لے کر عملی خامیوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ دین اسلام ہی دین فطرت ہے۔ اسی بنا پر ارشاد قدرت ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ خداوند عالم کے نزدیک دین اسلام ہی برحق ہے۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین۔ جو شخص بھی دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ الحمد للہ الذی ھدانا لدینہ الذی ارتضاہ۔ وسبیلہ الذی اجتباہ۔

نواں باب استطاعت کا بیان

مسئلہ استطاعت میں اہل اسلام کے اختلاف کا اجمالی بیان

دیگر اکثر مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہے۔ اور یہ مسئلہ درحقیقت مسئلہ جبر و اختیار کے فروع میں سے ہے۔ چنانچہ بعض فرقے تو بندہ کی استطاعت و قدرت کے بالکل ہی منکر ہیں اور بعض حضرات عند الفعل اس کے قائل اور قبل از فعل منکر ہیں۔ جیسا کہ کتاب التوحید میں عوف بن عبد ازدی سے مروی ہے۔ وہ اپنے چچا سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے جناب صادق علیہ السّلام سے استطاعت کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے از روئے تعجب فرمایا وقد فعلوا۔ آیا ان لوگوں نے اس مسئلہ میں بھی بحث شروع کر دی ہے؟ راوی نے عرض کیا ہاں۔ زعموا انہا لا یکون الا عند الفعل وارادۃ الفعل لا قبلہ۔ ان لوگوں کا گمان

يكون العبد مستطيعًا قال نعم بعد اربع خصال ان يكون مخلى السرب صحيح الجسم سليم الجوارح له سبب وارد من الله تعالى فاذا تمت هذه فهو مستطيع فقيل له مثل اى شئ فقال يكون الرجل مخلى السرب صحيح الجسم سليم الجوارح ولا يقدر ان يزنى الا ان يرى امرأة فاذا وجد المرأة فاما ان يعصم فيمتنع كما امتنع يوسف واما ان يخلى السرب بينه وبينها فيزنى فهو زان ولم يطع الله باكراه ولم يعص بغلبة وسئل الصادقؑ عن قول الله عزوجل وقد كانوا يدعون الى السجود وهم

میں عرض کیا۔ کہ یا ابن رسول اللہ! کیا بندوں کے لئے بھی کچھ قدرت و استطاعت ثابت ہے؟ فرمایا ہاں چار شرطوں کے بعد انسان مستطیع ہو جاتا ہے (اوّل) یہ کہ اس کا راستہ صاف ہو کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ صحیح الجسم و تندرست ہو۔ تیسرے یہ کہ اس کے اعضاء و جوارح صحیح و سالم ہوں۔ اور چوتھی شرط یہ ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے ایک سبب خاص حاصل ہو۔ جس وقت یہ چاروں شرطیں انسان میں پائی جائیں۔ اس وقت وہ مستطیع کہلاتا ہے۔ عرض کیا گیا اس کی مثال کیا ہے؟ آں جناب نے فرمایا کہ ایک شخص بالکل آزاد ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ بدن اس کا صحیح اور اعضاء اس کے سالم ہیں۔ بایں ہمہ اگر وہ زنا کرنا چاہے تو وہ اس پر قادر نہیں۔ جب تک اسے کوئی عورت نہ ملے۔ اب جب عورت اسے مل گئی۔ تو پھر یا تو وہ بتوفیقِ خداوندی زنا سے باز رہے گا۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام باز رہے تھے۔ یا اس عورت کے ساتھ تخلیہ میں زنا کر کے زانی کہلائے گا۔ پس نہ تو اس نے مجبور ہو کر خدا کی اطاعت کی ہے۔ اور نہ ہی خدا پر غلبہ پا کر اس نے اس کی نافرمانی کی ہے۔ خداوند عالم کے اس قول کہ لوگوں کو سجدہ کا حکم دیا جاتا تھا اس حال میں کہ وہ صحیح و سالم تھے کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

ہے کہ استطاعت فعل کرتے وقت تو ہوتی ہے مگر اس سے قبل نہیں ہوتی۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا۔ اشرک القوم۔ یہ لوگ مشرک ہیں۔

اس مسئلہ میں شیعہ خیر البریہ کے نظریہ کا بیان

اس مسئلہ میں اہل حق کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ قدرت بندہ میں فعل سے قبل اور اس کی بجا آوری کے وقت بلکہ امر و نہی سے بھی پہلے موجود ہوتی ہے۔ جیسا کہ کتاب التوحید میں بروایت جناب ہشام بن سالم حضرت صادق علیہ السلام

سالمون قال مستطیعون الاخذ بما امروا به وبترك ما نهوا عنه وبذالك ابتلوا وقال ابوجعفر فی التوراية مكتوب يا موسٰى انی خلقتك واصطفيتك وهديتك وقويتك وامرتك بطاعتی ونهيتك عن معصيتی فان اطعتنی اعنتك علی طاعتی وان عصيتنی لم اعنك علی معصيتی ولی المنة عليك فی طاعتك ولی الحجة عليك فی معصيتك لی

کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا کہ یہ لوگ احکام خدا بجا لانے اور ممنوع اُمور سے باز رہنے کی قدرت رکھتے تھے اسی بنا پر ان کا امتحان لیا گیا تھا۔ امام پنجم حضرت باقر العلوم علیہ السّلام ارشاد فرماتے ہیں کہ توریت میں یہ لکھا ہوا ہے خداوند کریم نے فرمایا اے موسٰی! میں نے تمہیں پیدا کر کے اپنے بندوں سے چُن لیا۔ تجھے ہدایت فرمائی اور اپنی اطاعت کا حکم دیا اور نافرمانی سے منع کیا اگر تم میری اطاعت کرو گے تو میں تمہاری اعانت کروں گا۔ اور اگر تم نے میرے احکام کی خلاف ورزی کی تو میں دست تعاون روک لوں گا جب تم میری اطاعت کرو گے تو اس موقع پر میرا اعانت کرنا تم پر احسان ہوگا۔ اور نافرمانی کے وقت میری طرف سے تم پر حجت تمام ہوگی۔

سے مروی ہے کہ آں جناب نے فرمایا۔ ما كلف الله العباد كلفة فعل ولا نهاهم عن شئ حتّٰی جعل لهم الاستطاعة ثم امرهم ونهاهم فلا يكون العبد اخذاً ولا تاركاً الّا باستطاعة متقدمة قبل الامر والنهی وقبل الاخذ والترك وقبل القبض والبسط۔ یعنی خداوند عالم نے اس وقت تک اپنے بندوں کو کسی امر یا نہی کی تکلیف نہیں دی۔ جب تک پہلے ان کو استطاعت عطا نہیں فرمائی۔ اس کے بعد ان کو کسی چیز کا حکم یا کسی چیز کی ممانعت فرمائی ہے۔ پس بندہ کسی امر پر عمل نہیں کرتا اور نہ ہی کسی ممنوع امر کو ترک کرتا ہے مگر اس استطاعت کے ذریعہ سے جو امر و نہی اور فعل و ترک اور حرکت و سکون سے پہلے موجود ہوتی ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ یہ استطاعت و قدرت سب کی اپنی ذاتی اور استقلالی نہیں ہے بلکہ خداوند عالم کی عطا کردہ ہے۔ جیسا کہ جناب امیر المومنینؑ نے ایک ایسے آدمی سے دریافت فرمایا تھا جو قضا و قدر کے مسئلہ میں گفتگو کر رہا تھا کہ ابالله تستطيع ام مع الله ام من دون الله۔ کیا تو اللہ سبحانہ کے ذریعے مستطیع ہے۔ یا اللہ جل شانہ کے ساتھ شریک ہو کر یا بغیر اللہ عزّ و جل کے خود بخود مستطیع ہے؟ اس شخص نے جواب دیا۔ لا بل بالله استطيع۔ نہیں جناب! میں تو اللہ کے ذریعے مستطیع ہوں۔ آں جنابؑ نے اس کا یہ جواب باصواب سن کر ارشاد فرمایا اما انك لو قلت غير هذا لضربت عنقك۔ آگاہ باش! اگر تو اس

دسواں باب عقیدہ بدا اور اُس کی حقیقت	باب الاعتقاد فی البداء
حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں یہودی اس بات کے قائل ہیں کہ خداوند تبارک وتعالےٰ تمام کاموں سے فراغت پاکر اب بیکار ہوگیا ہے مگر اس بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے	قال الشیخ ابوجعفر ان الیہود قالوا ان اللہ تبارک وتعالیٰ قد فرغ من الامر قلنا بل ھو تع

کے علاوہ کوئی اور جواب دیتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا اور یہ امر بھی واضح ہے کہ استطاعت وقدرت انہی شرائط کی موجودگی میں حاصل ہوتی ہے جو اس حدیث شریف میں مذکور ہے جو کہ متن رسالہ میں موجود ہے۔ کتاب التوحید میں ایسی ہی ایک روایت جناب امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے۔ اور اس کی مؤید اور بہت سی روایات کتاب التوحید اور بحار الانوار وغیرہ میں مروی ہیں۔

بہر حال اس مسئلہ میں بھی صحیح عقیدہ وہی ہے جو مسئلہ جبر واختیار میں گذر چکا ہے کہ لاجبر ولا تفویض بل امر بین الامرین۔ اور یہ وہ معقول ومکمل نظریہ صحیحہ ہے کہ مخالفین کے بعض سر آمد روزگار علمائے اعلام بھی اس کی صحت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ علامہ فخر الدین رازی مسئلہ جبر واختیار میں طویل گفتگو اور بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ونحن نقول الحق ما قال بعض ائمۃ الدین لاجبر ولا تفویض بل امر بین الامرین اس مسئلہ میں حق بات وہ ہے جو بعض آئمہ دین (آئمہ اہل بیت علیہم السلام) نے فرمائی ہے کہ نہ جبر ہے نہ تفویض۔ بلکہ امر اس کے بین بین ہے۔ سچ ہے الحق یعلو ولا یعلیٰ علیہ۔

ازالہ شبہ۔ بعض روایات میں بندے کی استطاعت کی نفی وارد ہے۔ جیسا کہ اصول کافی وغیرہ میں ایسی بعض روایات موجود ہیں تو ان روایات کا جواب یہ ہے کہ ایسی سب روایات استطاعتِ مستقلہ کی نفی پر محمول ہیں یعنی بندہ خود بخود بالذات مستطیع نہیں ہے۔ اور یہ امر درست بھی ہے جیسا کہ اوپر اس کی وضاحت کی جا چکی ہے نیز ممکن ہے کہ یہ روایات مقام تقیہ میں وارد ہوئی ہوں بہر کیف ان سے نفی استطاعت پر استدلال کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

"انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا واما کفورا"

دسواں باب: اعتقاد بدا اور اس کی اصل حقیقت کا بیان

مسئلہ بدا کی اہمیت اور اس میں اختلاف کے نزاع لفظی ہونے کا بیان

مسئلہ بدا ان معرکۃ الآرا اسلامی مسائل میں سے ہے کہ جن پر ق لفظ... کی طرف سے ایک دوسرے پر بہت کچھ نقد وتبصرہ اور نقض وابرام ہو چکا ہے ہمارے برادران اسلامی

كلّ يوم هو في شان لا يشغله شان عن شان يحيي و يميت و يخلق و يرزق و يفعل ما يشآء و قلنا	کہ خدا ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا ہے اور ایک کام کرنا اسے دوسرے کام سے باز نہیں رکھ سکتا۔ وہی زندہ کرتا ہے۔ اور وہی مارتا ہے۔ وہی پیدا کرتا ہے اور وہی روزی دیتا

اپنی خوش فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ مسئلہ بدا مذہب امامیہ کے خصائص میں سے ہے اس لئے حقیقت حال سے جہالت یا تجاہل کی وجہ سے ہمیشہ اہل حق پر زبان اعتراض دراز کرتے رہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی یا پھر اپنی بعض مخصوص مصلحتوں کے تحت اسے غلط طریقہ پر پیش کر کے محل نزاع اور معرکۃ الآراء بنا دیا ہے۔ جیسا کہ اکثر اختلافی مسائل کی یہی کیفیت ہے۔ اگر چند لمحات کے لئے ہر قسم کے تعصبات اور جذبات سے بالاتر ہو کر اس مسئلہ کی کنہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے اور اس معمہ کو حل کرنے کے لئے تھوڑے سے غور و فکر اور امعان نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ اختلاف ہے اس کی نزاع لفظی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ورنہ فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ فریقین کے نزدیک حقائق اسلامیہ سے ایک عظیم الشان حقیقت اور عقائد صحیحہ میں سے ایک صحیح عقیدہ ہے۔ اس کا اقرار و اعتقاد رکھنا صفات الٰہیہ میں سے ایک نہایت اہل ارفع صفت یعنی ارادہ باری اور صفت قدرت کے مظاہر میں سے ایک جلیل القدر مظہر کے اعتراف کے مترادف ہے۔ عقیدۂ بدا کے ذریعہ یہودیوں یا ان کے ہم مسلک دوسرے ان لوگوں کے اس غلط نظریہ کی رد ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خدا نے جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکا۔ جفّ القلم بما کان وما هو کائن۔ قلم خشک ہو گیا ہے اور اس نوشتہ میں اب کسی قسم کا تغیر و تبدل بھی نہیں ہو سکتا۔ یا یہ عقیدۂ فاسدہ رکھتے ہیں کہ خدا نے اپنے خدائی اختیارات اپنی بعض مخلوق کے حوالہ کر دیئے ہیں اور اب خود معطل اور بیکار محض ہے۔ یقولون ید الله مغلولة۔ نیز اس سے ان فلاسفہ کے نظریۂ فاسدہ کی نفی کرنا بھی مطلوب ہے۔ جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا نے فقط عقل اوّل کو خلق کیا ہے۔ اس کے بعد اس کی قدرت کی تاثیر ختم ہو گئی۔ بعد ازاں عقل اوّل نے عقل ثانی کو اور ثانی نے ثالث کو و ہکذا۔ . . . . . یہاں تک کہ عقل عاشر نے تمام عالم کو پیدا کیا۔ اور بھی اس قسم کے بعض نظریات باطلہ ہیں۔ جن سے قدرت کاملہ کا تعطل لازم ہے عقیدۂ بدا سے ان سب خیالات واہیہ کا بطلان واضح و عیاں ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ لوگوں کے یہ خیالات غلط اور از قسم محالات ہیں بلکہ سب اختیارات خود خداوند عالم کے قبضۂ قدرت میں ہیں بل یداه مبسوطتان ینفق کیف یشاء۔ وہ صاحب ارادہ و اختیار اور قادر و قہار ہے اور ہمیشہ اس کے فیوض و برکات اور کائنات میں اس کے تصرفات جاری و ساری ہیں۔ جس امر کو چاہتا ہے۔ مقدم کرتا ہے

يمحوا الله ما يشاء ويثبت وعنده ام الكتاب وانه لا يمحو الا ما كان ولا يثبت الا ما لم يكن وهذا ليس

ہے، جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ اسی کے پاس ام الکتاب ہے وہ اسی چیز کو

اور جسے چاہتا ہے موخر کرتا ہے۔ کسی کو مارتا ہے۔ کسی کو جلاتا ہے۔ کسی کو مریض کرتا ہے۔ کسی کو شفا دیتا ہے۔ کسی کو وسعتِ رزق عطا کرتا ہے۔ اور کسی کو تنگی معیشت میں مبتلا کرتا ہے۔ کسی سے سلطنت کو چھینتا ہے اور کسی کو عنانِ ملک عطا فرماتا ہے۔ صلہ رحمی وغیرہ کارِ خیر کی وجہ سے کسی کی عمر بڑھاتا ہے۔ اور قطع رحمی وغیرہ جرائم سے کسی کی عمر گھٹاتا ہے۔ زنا وغیرہ معاصی کے ارتکاب سے کسی کے رزق اور اس کی عمر کو کم کرتا ہے۔ اور عفت و عدالت وغیرہ محاسن سے کسی کے رزق میں وسعت اور عمر میں طوالت عطا کرتا ہے جیسا کہ خود خلاقِ عالم کا ارشاد ہے۔ کل یوم هو فی شان۔ خداوند عالم ہر روز نئی شان میں ہوتا ہے يمحوا الله ما يشاء ويثبت وعنده ام الكتاب وہ چیز جس کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے ثابت کر دیتا ہے کیونکہ اس کے پاس ام الکتاب (لوح محفوظ) ہے۔ الا له الخلق والامر۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ خلق کرنا اور حکم دینا ہے۔ کیونکہ ع۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

بلکہ ع ہر لحظہ ہے خالق کی نئی شان نئی آن،

اس مسئلہ میں منشاء اشتباہ کی نشاندہی

جس چیز نے اس مسئلہ کو زیادہ غامض و پیچیدہ بنا دیا ہے۔ وہ لفظ بدا کا لغوی استعمال ہے کیونکہ یہ لفظ عربی زبان میں عموماً ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ جدید معلومات کی وجہ سے سابقہ عزم وارادہ یا سابقہ رائے کو ترک کر کے اس کے برخلاف کسی دوسرے عزم وارادہ یا کام کو کرنا ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے اس لفظ کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف ہرگز جائز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس سے اس کا جہل لازم آتا ہے۔ اسی لغوی معنی کی آڑ لے کر مفاد پرست اغیار نے ہمیشہ اہلِ حق کو عوام الناس میں بدنام کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا۔ اور عوام الناس کو مذہب حق سے متنفر کرنے کے لئے یہ تاثر دینے کی سعی نا فرجام کی کہ اس مذہب میں (معاذ اللہ) خداوند عالم کو جاہل سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ کہ اس میں خدا کے متعلق یہ نظریہ ہے کہ وہ آج کوئی کام شروع کرتا ہے یا کوئی رائے قائم کرتا ہے مگر کل جب اس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کام یا رائے غلط ہے تو اسے چھوڑ کر اس کے مخالف فعل یا رائے پر کاربند ہو جاتا ہے سبحان اللہ۔ هذا بهتان عظيم۔ بھلا کوئی متدین اور عقیل و فہیم انسان خدائے حکیم و علیم کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھ سکتا ہے؟ اور ایسے امر کی نسبت اس کی ساحتِ قدس کی طرف دے سکتا ہے۔ حاشا و کلا۔

بدا کما قالت الیھود واتباعھم فنسبتا فی ذلک الی القول بالبداء وتبعھم علی ذلک من خالفنا من اھل الاھواء المختلفۃ وقال

محو کرتا ہے جو پہلے موجود ہوتی ہے۔ اور اسی کو ثابت کرتا ہے جو پہلے موجود نہ ہو۔ یہ بدا وہ نہیں جس کے یہودی اور ان کے اتباع کے قائل ہیں، اور اسی بدا کو یہ ملعون یہودی ہماری طرف منسوب کرتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی مختلف ارامر واہواء رکھنے والے

فاعظم الناس ھنذ کانوا   ما قدروا اللہ حق قدرہ

اس قسم کی افترا پردازیوں، فتنہ سازیوں اور حقائق کو غلط طریقہ پر توڑ مروڑ کر کے پیش کرنے کا نتیجہ ہے کہ آج باہمی فتنہ وفساد کا بازار گرم ہے۔ اور علم وحقیقت کا فقدان ہے ع۔

ھکذا یفسد الزمان ویفنی   علم فیہ ویدرس الاثر

ارباب علم وفہم جانتے ہیں کہ ہر لفظ کے ہر جگہ ایک ہی معنی مراد نہیں لئے جا سکتے بلکہ لفظ کے متعلق کے بدلنے سے اس کے مناسب حال معانی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اس امر کی بعض مثالیں سابقہ مباحث میں بعض آیات متشابہات کے ضمن میں پیش کی جا چکی ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر اتقان ج ص پر جملہ اہدنا الصراط المستقیم کے سات معانی تحریر کئے ہیں۔ جیسا نمازی ہوگا ایسے ہی اس کے حال کے مطابق اس کے معنی مراد لئے جائیں گے۔ اگر غیر ہدایت یافتہ ہے تو اس کا معنی ہوگا۔ اہدنا الصراط المستقیم کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اور اگر ہدایت یافتہ ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے ثبتنا کہ ہمیں سیدھے راستہ پر ثابت قدم رکھ اور اگر اسے ثبات بھی حاصل ہے۔ تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ زدنا معرفۃ۔ ہماری ہدایت ومعرفت میں اضافہ فرما۔ وعلی ہذا القیاس۔

اسی اصول کے تحت جب اس لفظ (بدا) کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی جائے تو اس وقت اس کے لغوی معنی ظہور بعد الخفاء (کسی چیز کا مخفی ہونے کے بعد ظاہر ہونا) مراد نہیں ہوتے بلکہ وہاں ذات باری کیلئے اظہار اور لوگوں کیلئے ظہور مقصود ہوتا ہے۔ یعنی خداوند عالم کسی ایسے امر کا اظہار کرتا ہے جو لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ وہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے۔ وبدا لھم من اللہ مالم یکونوا یحتسبون۔ ان لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ کچھ ظاہر ہوا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا۔ لہٰذا بدا للہ۔ خدا کو فلاں معاملہ میں بدا ہوا ہے۔ کا مطلب یہ ہوگا کہ۔ بدا من اللہ۔ خدا کی طرف سے لوگوں پر ظاہر ہوا۔ نہ یہ کہ اللہ کے لئے ظاہر ہوا۔ اور اس طرح ممکن ہے کہ۔ للہ میں جو۔ لام۔ ہے۔ اسے بمعنی۔ من۔ لیا جائے۔ اور۔ لام۔ کا بمعنی۔ من۔ استعمال ہونا نحویوں کے نزدیک مسلم ہے چنانچہ نحو کی معتبر ترین کتاب مغنی اللبیب ج اص طبع مصر لکھا ہے۔ الرابع عشر موافقۃ۔ من۔ نحو سمعت

الصّادقؑ ما بعث الله نبیّا قطّ حتّی یاخذ علیه الاقرار لله بالعبودیّة وخلع الانداد وانّ الله یؤخّر ما یشاء ویقدّم

ہمارے مخالفین بھی ان کے ہمکلام ہو کر ہمیں مطعون کرتے ہیں۔ حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ جلّ جلالہٗ نے اس وقت تک کوئی نبی نہیں بھیجا جب تک اس سے تین اقرار نہیں لے لئے (۱) خدا کی معبودیت (۲) خدا کے شریکوں سے بیزاری (۳) یہ کہ خدا

له من اخاً وقول جریر نخ

لنا الفضل فی الدّنیا وانفك راغم　　　ونحن لکم یوم القیامة افضل

خلاصہ مطلب یہ کہ لام کا جو دوسرا معنی مِن کی موافقت ہے۔ جیسا کہ سمعت له من اخاً اور جریر کے شعر لنا الفضل کے اندر نحن لکم میں لام بمعنی "من" استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ یہاں معنی مراد سمعت منه من اخاً اور نحن منکم افضل" ہیں۔ لہذا اس لحاظ سے اس طرح اس لفظ کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف بے غبار اور اس کی صحت بالکل واضح وآشکار ہو جاتی ہے۔

خداوند عالم کو کبھی جہل ونادانی کی وجہ سے بدا نہیں ہوتا

سابقہ تحقیق متین سے معلوم ہو گیا کہ اس معنی کے اعتبار سے ہرگز خدائے علیم کا معاذ اللہ جاہل ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی لئے معصومین علیہم السلام نے فرمایا ہے۔ ان الله لم یبد له من جهل۔ خداوند عالم کو ہرگز کبھی جہالت کی وجہ سے بدا نہیں ہوتا۔ نیز فرمایا ہے۔ ما بدا لله فی شیئ الّا کان فی علمه قبل ان یبد وله خدا کو کسی امر میں بدا نہیں ہوتا مگر یہ کہ بدا سے پہلے اسے اس امر کا علم ہوتا ہے۔ بلکہ حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام نے تو ایسے لوگوں کو بددعا دی ہے جو بدا کو جہل خدا کا ثمرہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ منصور بن حازم سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ هل یکون الیوم شیئ لم یکن فی علم الله بالامس۔ فرزند رسولؐ! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آج کوئی چیز واقع ہو جو کل خدا کے علم میں نہ تھی؟ قال لا من قال هذا اخزاه الله۔ فرمایا نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس طرح کہے۔ خدا اسے ذلیل وخوار کرے۔ پھر میں نے عرض کیا۔ ارأیت ما کان وما هو کائن الی یوم القیامة الیس فی علم الله۔ میرے آقا! کیا یہ درست ہے کہ جو کچھ گذر چکا ہے اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے وہ سب اللہ کے علم میں ہے قال بلی قبل ان یخلق الخلق۔ فرمایا۔ ہاں ان اشیاء کو پیدا کرنے سے پہلے خالق کو ان کا علم تھا (اصول کافی) ان الله لا یخفی علیه شیئ فی الارض ولا فی السماء۔

کس قدر افسوسناک بات ہے کہ بایں ہمہ تصریحات مخالفین یہ کہتے ہیں کہ مذہب شیعہ میں عقیدہ بدا کے

ما یشآء ونسخ الشرائع والاحکام بشریعۃ نبیتنا واحکامہ من	جس چیز کو چاہے مؤخر کرے اور جسے چاہے مقدم کرے ہمارے رسولؐ کی شریعت اور احکام سے پہلے تمام انبیاء کی شریعتیں اور ان کے احکام منسوخ ہو گئے ہیں۔

ذریعہ خداوند عالم کی تجہیل کی جاتی ہے ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اگر مخالفین میں ہمت و جرأت ہے تو اپنے مدعائے باطل کی تائید میں ہمارے کسی امام معصومؑ کا ارشاد یا کسی عالم دین کی تحقیق متین پیش کریں۔ ورنہ اس افترا پردازی سے باز آئیں۔ کیونکہ ارشادِ قدرت ہے انما یفتری الکذب الذین لا یؤمنون۔ افترا پردازی وہی لوگ کرتے ہیں جو بے ایمان ہوتے ہیں۔

خداوند عالم کے بدا کے مختلف مظاہرے ہم ہر روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ غنا کے بعد فقر۔ فقر کے بعد غنا صحت کے بعد مرض۔ مرض کے بعد صحت۔ حیات کے بعد موت۔ موت کے بعد حیات۔ عزت کے بعد ذلت۔ ذلت کے بعد عزت وغیرہ۔ یہ سب بدا ہی کے تو مظاہر ہیں۔ قل اللّٰھم مالک الملک توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیٔ قدیر۔

عقیدۂ بدا کی اصطلاحی تحقیق انیق

جب عقیدۂ بدا کی لغوی حقیقت معلوم ہو چکی تو اب اصطلاحی طور پر بھی اس کی قدرے توضیح کی جاتی ہے۔ ارباب بصیرت پر مخفی و مستور نہیں ہے کہ خداوند کریم کے دو نظام ہیں ایک "نظام تشریعی" اور دوسرا "نظام تکوینی" نظام تشریعی میں جس چیز کا نام "نسخ" ہے (ایک حکم شرعی ختم کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کرنا) نظام تکوینی میں اس چیز کا نام بدا ہے (کسی انسان کی ایک حالت کو ختم کر کے اسے دوسری حالت کے ساتھ بدل دینا) علمی الفاظ میں یوں سمجھیں کہ النسخ کانہ بدا تشریعی والبداء کانہ نسخ تکوینی۔ نسخ گویا کہ تشریعی بدا اور بدا گویا کہ تکوینی نسخ ہے۔ نسخ میں زمان و مکان اور افراد کے بدلنے سے وقتاً فوقتاً احکام بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس کی صحت و وقوع پر تمام فرق اسلامیہ کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت بھی ہے۔ ما ننسخ من ایۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا (پ س بقرہ ع ۱۳)

بدا میں بھی یہی ہوتا ہے کہ مختلف علل و اسباب سے خداوند عالم لوگوں کے حالات و کوائف کو بدلتا رہتا ہے یہ ایک ایسی واضح اور روشن حقیقت ہے کہ کوئی عاقل و بابصیرت انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس سے نہ تو خدا کی جہالت لازم آتی ہے۔ اور نہ کوئی اور نقص و عیب۔ بلکہ اس سے اس کی قدرتِ کاملہ، شہنشاہیت مطلقہ اور اختیاراتِ واسعہ

ذلک و نسخ الکتاب بالقرآن من ذلک وقال الصادقؑ من	اور قرآن کریم سے سابقہ تمام کتب سماوی منسوخ ہو گئی ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی لئے معصومین علیہم السلام نے فرمایا ہے۔ ما عبد اللہ بشیء مثل البداء۔ عقیدہ بداءؑ کی طرح کسی چیز کے ساتھ خدا کی عبادت نہیں کی گئی۔ اور بروایت ہشام بن سالم حضرت صادق آل محمدؑ سے یوں مروی ہے۔ ما عظم اللہ بمثل البداء۔ جس طرح بداء کے ذریعہ خدا کی عظمت وجلالت کا اظہار ہوتا ہے اس طرح اور کسی شے سے نہیں ہوتا (اصول کافی) ان لوگوں کی حالت قابلِ تعجب ہے۔ جو احکامِ شرعیہ میں نسخ کو تو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ مگر احکامِ تکوینیہ میں بداء کو غلط سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی حقیقت مشترک ہے۔ وہ جو ایراد بداء پر کرتے ہیں وہی اعتراض نسخ پر بھی وارد ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جو جواب وہ نسخ کے بارے میں دیں گے۔ وہی بداء کے بارے میں ہماری طرف سے سمجھا جائے۔ بداء کی اور بھی مختلف طریقوں سے توضیح وتشریح کی گئی ہے۔ مگر جس طرح ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ وہ حضرت شیخ مفید اعلی اللہ مقامہ کی اوائل المقالات میں اور حضرت سید میر محمد باقر داماد کی نبراس الضیاء میں بیان کردہ تحقیق کے مطابق ہے جو عام فہم ہونے کے علاوہ بہت متین بھی ہے۔ شیخ الطائفہ جناب شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے عدۃ الاصول میں اس مسئلہ کی جو تحقیق فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا میلان بھی اسی طرف ہے

بداء خداوند عالم کے علم مخزون و مکنون میں ہوتا ہے نہ علم مکشوف میں

بکثرت روایات معتبرہ سے مستفاد ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مخزون ومکنون جس پر اس نے نہ کسی نبی مرسل کو مطلع کیا ہے اور نہ کسی ملک مقرب کو۔ اور دوسری قسم ہے علم مکشوف جس پر وہ حسب مصلحت اپنے مقربان بارگاہ یعنی ملائکہ کرام اور انبیاء و اوصیاء علیہم السلام کو آگاہ کرتا رہتا ہے۔ متعدد احادیث معصومینؑ سے مستفاد ہوتا ہے کہ بداء پہلی قسم کے علم میں ہوتا ہے نہ دوسری قسم میں۔ کیونکہ اگر دوسری قسم کے علم میں بھی بداء واقع ہو۔ تو اس سے اس کے مقربین بارگاہ کی تکذیب لازم آتی ہے اور خدا ہرگز اپنے مقربین کی تکذیب نہیں کرتا۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت امام محمد باقر علیہما السلام سے مروی ہے۔ فرمایا ان العلم علمان فعلم مخزون لم یطلع علیہ احدا من خلقہ وعلم علمہ ملائکتہ ورسلہ فما علمہ ملائکتہ ورسلہ فانہ سیکون فانہ لا یکذب نفسہ ولا ملائکتہ ولا رسلہ وعلم مخزون عندہ یقدم منہ ما یشاء و یثبت ما یشاء (اصول کافی) خداوند عالم کے دو علم ہیں۔ ایک علم مخزون جس پر اس نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی مطلع نہیں کیا۔ دوسرا وہ علم ہے جو اس نے اپنے ملائکہ اور رسل کو تعلیم دیا ہے۔ پس جو علم اس نے اپنے

ملائکہ اور انبیاء کو تعلیم دیا وہ ضرور ہو کر ہی رہے گا کیونکہ خداوند عالم اپنی تکذیب نہیں کرتا اور نہ ہی اپنے فرشتوں اور رسولوں کو جھٹلاتا ہے ہاں جو علم اس کے پاس مخزون و مکنون ہے۔ اس میں جس طرح چاہتا ہے تقدیم و تاخیر کرتا رہتا ہے۔

ایک اشکال اور اُس کا جواب

مذکورہ بالا اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و اوصیاء کے اخبار میں بداواقع نہیں ہوتا۔ مگر کتب سیر و تواریخ میں کچھ ایسے آثار موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کے اخبار میں بھی بداواقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مصابیح الانوار میں بحوالہ عیون اخبار الرضا حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ خداوند عالم نے ایک نبی کو وحی فرمائی، کہ فلاں بادشاہ کو جا کر خبر دو کہ میں اسے فلاں وقت مارنے والا ہوں۔ چنانچہ جب انہوں نے جا کر اطلاع دی تو بادشاہ چارپائی سے گھبرا کر گر پڑا۔ اور بارگاہِ الٰہی میں تضرع و زاری کرنے لگا کہ بارالہا مجھے اتنی مہلت دے کہ میرا بیٹا جوان ہو جائے اور میں اپنی آرزوؤں کو پورا کرلوں۔ ادھر اسی نبی کو دوبارہ وحی ہوئی کہ اس بادشاہ کو اطلاع دو کہ میں نے اس کی عمر میں پندرہ سال کا اضافہ کر دیا ہے۔ نبی نے عرض کیا بارالہا تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لہٰذا یہ دوسری خبر کس طرح بادشاہ کے گوش گذار کروں ارشاد ہوا تم عبدِ مامور ہو تم پیغام پہنچاؤ۔

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

نیز کتاب مذکور میں بحوالہ اصول کافی باب الصدقہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بجائے صحیح سلام کے کہا السام علیک جس کا معنی موت ہے اجناب نے جواب میں فرمایا وعلیک۔ جب وہ چلا گیا تو صحابہ نے عرض کیا کہ حضور! اس نے آپ پر موت کے ساتھ سلام کیا جنابؐ نے فرمایا میں نے بھی ایسا ہی جواب دیا ہے پھر فرمایا یہ یہودی لکڑیاں کاٹنے جا رہا ہے۔ ابھی اسے ایک سیاہ رنگ کا سانپ ڈسے گا۔ اور یہ ہلاک ہو جائے گا مگر ہوا یہ کہ وہ کچھ دیر کے بعد بہت سی لکڑیاں لے کر وہاں سے صحیح و سالم گذرا اصحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ نے تو فرمایا تھا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا۔ آپؐ نے یہودی سے فرمایا۔ لکڑیاں نیچے اُتارو۔ جب اُس نے نیچے اُتاریں تو دیکھا گیا کہ لکڑیوں میں ایک سیاہ رنگ کا بڑا سانپ موجود ہے جو ایک لکڑی کو منہ میں دبائے ہوئے بیٹھا ہے۔ آپ نے یہودی سے دریافت کیا کہ تم نے آج کونسا اچھا کام کیا ہے۔ اُس نے عرض کیا کہ مجھے تو اس کے سوا کوئی کام یاد نہیں کہ میرے پاس دو عدد روٹیاں تھیں۔ ایک خود کھائی اور دوسری ایک سائل کو دے دی۔ یہ سُن کر جناب نے فرمایا۔ اسی صدقہ کی وجہ سے خدا نے یہ بلا دفع کر دی ہے۔ پھر فرمایا صدقہ انسان سے بُری موت کو دُور کرتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق بھی کتب میں مذکور ہے

شیٔ ولم یعلمہ امس فانا برأ منہ و قال من زعم ان اللہ بدالہ فی | میں یہ خیال ہو کہ اس کو آج جس چیز میں بدا ہوا ہے کل اس سے خبر تھا میں ایسے شخص سے بیزار ہوں۔

کہ انہوں نے ایک لکڑہارے کو موت کی خبر دی مگر وہ بچ گیا۔ اس اشکال کے کئی جوابات دئے جا سکتے ہیں۔ ہم فقط دو جوابات پر اکتفا کرتے ہیں۔

پہلا جواب ۔ یہ ہے کہ ان بزرگواروں کی خبریں دو قسم کی ہوتی ہیں حتمی و یقینی اور غیر حتمی۔ اول الذکر میں بدا نہیں ہو سکتا۔ مگر دوسری قسم میں بدا واقع ہو سکتا ہے اور بعض اوقات وہ خود بھی اس امر کی طرف لطیف پیرایہ میں اشارہ فرمایا کرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السّلام نے سنہ ۷۰ھ کے حوادث کی طرف اشارہ فرمانے کے بعد فرمایا تھا۔ یمحو اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب ۔ خدا جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت کرتا ہے اس کے پاس ام الکتاب ہے۔

دوسرا جواب ۔ یہ ہے کہ چونکہ جن روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انبیاء و اوصیاء کی خبروں میں بدا واقع نہیں ہوتا۔ ان میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے ان بزرگواروں کی تکذیب لازم آتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی وقت ان کی بعض اخبار میں بدا واقع ہو جائے مگر اس کی مصلحت بھی ساتھ ہی ظاہر ہو کہ فلاں وجہ سے وہ خبر وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ جیسا کہ ان واقعات میں اس بدا کی مصلحت مذکور ہے تو اس طرح چونکہ ان حضرات کی تکذیب لازم نہیں آتی۔ بلکہ الٹا ان کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں ان کی اخبار میں بدا کے واقع ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت اور لوح محفوظ و لوح محو و اثبات کا بیان

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم مسئلہ کی یہاں قدرے اور وضاحت کر دی جائے۔ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ معصومیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے پاس دو لوحیں ہیں ایک کا نام ہے لوح محفوظ! کائنات میں جو کچھ ہوتا رہتا ہے۔ وہ سب اس میں بالتفصیل لکھا ہوا ہے۔ اس میں کسی قسم کا تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا۔ دوسری کا نام ہے لوح محو و اثبات۔ اس کے نوشتہ جات میں مختلف علل و اسباب اور مصالح و حکم کے پیشِ نظر محو و اثبات اور تغیّر و تبدّل کا سلسلہ برابر جاری و ساری رہتا ہے۔ کیونکہ بعض امور بعض شروط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان شروط و اسباب میں تغیّر و تبدّل ہونے کی وجہ سے خود ان امور میں بھی تبدیلی کا واقع ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ مثلاً لوح محو و اثبات میں یوں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ کہ فلاں شخص کی عمر پچاس سال ہوگی۔ بشرطیکہ وہ کوئی ایسا کام انجام نہ دے جس سے اس کی عمر کی لمبائی یا کوتاہی پر اثر پڑتا ہو۔ لہٰذا اگر اس نے صلہ رحمی کی یا صدقہ دے

شئ بدا لله انه فهو عندنا کافر باللہ العظیم و انما قول الصادق ما بدا اللہ فی شئ کما بدالہ فی اسمعیل ابنی فانہ یقول

اور فرمایا جس کا گمان یہ ہو کہ خداوند عالم کو کسی شے کے جاننے کے بعد ندامت اور شرمندگی ہوتی ہے وہ ہمارے نزدیک خدا کا منکر ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ خدا کو ایسا بدا کبھی نہیں ہوا۔ جیسا کہ میرے بیٹے اسمٰعیل کے بارے میں

دیا تو پچاس کو کاٹ کر اس کی جگہ ساٹھ سال درج کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر اس نے قطع رحمی کا ارتکاب کیا تو بجائے پچاس کے چالیس سال لکھ دئے جاتے ہیں۔ لیکن لوح محفوظ میں پہلے سے اجل نتیجہ درج ہوتا ہے جو صلہ رحمی کی صورت میں ساٹھ اور قطع رحمی کی حالت میں چالیس سال ہے۔ اسی طرح لوح محو و اثبات میں یوں لکھا ہے کہ مثلاً فلاں شخص پر فلاں وقت میں فلاں مصیبت نازل ہو گی۔ بشرطیکہ اس نے اس وقت دعا نہ کی یا صدقہ نہ دیا۔ چنانچہ جب وہ شخص اس مقررہ وقت پر دعا یا صدقہ کو عمل میں لاتا ہے۔ تو لوح سے وہ مصیبت محو کر کے اس کی جگہ اس کی عافیت و سلامتی لکھ دی جاتی ہے مگر لوح محفوظ میں بطور نتیجہ اس کی سلامتی ہی درج ہوتی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

اجل محتوم اور اجل غیر محتوم کا بیان

اس بیان حقیقت ترجمان سے واضح و عیاں ہو گیا کہ تقدیرات و آجال الٰہیہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تقدیر و اجل مشروط۔ اور دوسری تقدیر و اجل غیر مشروط جسے اجل مسمّی بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ ثم قضی اجلا واجل مسمی عندہ (سورہ انعام) اجل و تقدیر مشروط میں شروط کے تغیر و تبدل سے کمی و بیشی اور تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے مگر اجل غیر مشروط یعنی اجل مسمّی میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر یا زیادتی و کمی نہیں ہو سکتی۔ ارشاد قدرت ہے وما یعمر من معمر و لا ینقص من عمرہ الا فی کتاب (سورۂ فاطر پ۲۲ ع) کسی شخص کی عمر نہ بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے مگر یہ کہ وہ کتاب (لوح) میں درج ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کی زبانی قرآن مجید میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو نصیحت کی استغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا ویمددکم باموال و بنین ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انہارا (سورہ نوح پ۲۹ ع) تم خداوند عالم سے طلب مغفرت کرو۔ وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسائے گا اور مال و اولاد سے تمہاری مدد فرمائے گا۔ اور تمہارے لئے باغات و نہریں جاری کرے گا مگر قوم نے اپنی حماقت و نالائقی سے ان کی اس زریں نصیحت پر عمل نہ کیا۔ لہٰذا وہ ہلاک و برباد ہو گئی اور حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ معلوم ہوا کہ اگر قوم اس نصیحت پر عمل کر لیتی تو اس ابدی ہلاکت سے بچ جاتی۔ اسی طرح خلاق عالم اہل القریٰ کے بارہ میں ارشاد فرماتا ہے۔ ولو ان اهل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکات من السماء والارض (سورۂ اعراف پ۹ ع)

ما ظهر لله سبحانہ امر فی شی کما ظهر کہ فی ابنی اسمٰعیل اذا اخترمہٗ قبلی لیعلمان لیس بامام بعدی۔

ہوا ہے۔ آنجناب کا اس ارشاد سے مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کی ایسی مصلحت کبھی ظاہر نہیں ہوئی جیسے کہ میرے فرزند اسمٰعیل کے بارے میں ظاہر ہوئی ہے۔ میری زندگی میں اسے موت دے دی تاکہ لوگوں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ میرے بعد امام نہیں ہے

یعنی اگر یہ بستیوں والے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں نازل کرتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا ان فیوض و برکات سے محروم رہ گئے۔ اسی بنا پر تو قرآن میں وارد ہے قل ما یعبا بکم ربی لولا دعائکم (سورہ فرقان پ۱۹ ع ۴) اگر تمہاری دعا و پکار نہ ہو تو خدا تمہاری کوئی پروا نہ کرے۔

ایک سوال اور اُس کا جواب

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب آخری و حتمی فیصلہ لوح محفوظ میں لکھ دیا جاتا ہے تو پھر لوح محو و اثبات میں اس کے لکھنے اور پھر اس میں بار بار تغیر و تبدل کرنے میں کیا حکمت و مصلحت ہے اس سوال کا کئی طرح جواب دیا جاسکتا ہے۔ اوّلاً یہ کہ چونکہ یہ امر نظام ربوبیت اور قضا و قدر کے متعلق ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق جستجو کرنا ہم پر لازم نہیں بلکہ ہم اسے کما حقہٗ سمجھ ہی نہیں سکتے جیسا کہ ہم سابقاً مسئلہ قضا و قدر میں تفصیلاً اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں۔ اور یہ حقیقت ظاہر ہے کہ ہمارے نہ جاننے سے اُس میں حکمت کی نفی لازم نہیں آتی۔ کیونکہ عدم علم دلیل عدم نہیں ہو سکتا۔

ثانیاً یہ کہ بنا بر احتمال کہا جاسکتا ہے (والعلم عند اللہ) کہ ممکن ہے کہ اس میں یہ مصلحت ہو کہ خلاق حکیم ان ملائکہ کرام پر جو اس محو و اثبات کے کام پر مامور ہیں۔ بندوں کے ساتھ اپنے الطاف و مراحم کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ وہ دار آخرت سے پہلے کس طرح اپنے بندوں کو ان کے اچھے یا بُرے اعمال کے ثمرات سے دوچار کرتا رہتا ہے۔ اور کس طرح قانون مکافات کا عمل جاری و ساری ہے۔

ثالثاً یہ کہ ممکن ہے کہ اس سے یہ غرض و غایت ہو کہ خداوند عالم اپنے سفراء یعنی انبیاء و آئمہ کے ذریعہ یہ امر لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ ان کے اعمالِ صالحہ کو ان کے احوال کی اصلاح میں اور ان کے اعمال سیئہ کو ان کے حالات کے بگاڑ میں کافی حد تک دخل ہے۔ اس طرح وہ اچھے اعمال کو شوق سے بجالائیں گے اور بُرے اعمال سے اجتناب کریں گے۔ کیونکہ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا ہے وہ درحقیقت ان کے اعمال و افعال اختیاریہ کا ہی نتیجہ و ثمرہ ہے۔

رابعاً یہ کہ عین ممکن ہے کہ اس سے مقصود یہ ہو کہ محو و اثبات کے طمع میں لوگوں کی دعا و پکار اور صدقات و خیرات کا سلسلہ جاری رہے۔ جو کہ بجائے خود ایک عبادت ہے آیت مبارکہ ادعونی استجب لکم ان

الذین یستکبرون عن عبادتی سید خلون جھنم داخرین - میں عبادتی سے مُراد دعا ہے علاوہ بریں صدقات وخیرات میں تو غرباء و مساکین کا فائدہ بھی ہو جاتا ہے جو بہترین کار خیر ہے - خیر الناس من نفع الناس - ظاہر ہے کہ اگر یہ محو و اثبات کا سلسلہ نہ ہوتا تو یہ دُعا و پکار اور صدقات و خیرات کا سلسلہ بھی موقوف ہو جاتا - جس سے انسان ان سعادات و برکات سے محروم ہو جاتا جن سے اب فیضیاب ہو رہا ہے - الی غیر ذالک من الحکم والاسرار - واللہ العالم بالحقائق ولنعم ما قیل ؎

رموز مملکت خویش خسرواں دانند　　　تو گدائے گوشہ نشینی حافظا مخروش

تحقیقات و روایات اہل سنت سے مسئلہ بدا کی تائید مزید

اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ برادران اسلامی کو جو کچھ نفرت و وحشت ہے - وہ تقیہ[1] کی طرح صرف لفظ بداء سے ہے - ورنہ اس کے معنی و مفہوم کا وہ خود بھی ہماری طرح اقرار و اعتراف کرتے ہیں - اس سلسلہ میں ان کے چند علماء اعلام کی تحقیقات اور ان کی بعض روایات نقل کرتے ہیں جن سے ہمارے مدعا کی حرف بحرف تائید ہوتی ہے - علامہ زمخشری اپنی تفسیر کشاف ج ۳ صفحہ ۲۷۵ طبع مصر میں ذیل آیت مبارکہ وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہ الا فی کتاب (سورۃ فاطر پ ۲۲ ع ۲) لکھتے ہیں - وفیہ تاویل اٰخر وھو ان لا یطول عمر انسان ولا ینقص الا فی کتاب وھو ان یکتب فی اللوح ان حج فلان اوغزا فعمرہ اربعون سنۃ وان حج وغزا فعمرہ ستون سنۃ فاذا جمع بینھما فبلغ الستین فقد عمر واذا افرد احدھما فلم یتجاوز بہ الاربعون فقد نقص من عمرہ الذی ھو الغایۃ وھو الستون والیہ اشار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الصدقۃ والصلۃ تعمران الدیار وتزیدان فی الاعمار الخ..... اس آیت مبارکہ کی ایک اور تاویل یہ بھی ہے کہ کسی بھی انسان کی عمر بڑھتی یا گھٹتی نہیں مگر یہ کہ وہ پہلے کتاب (لوح محفوظ) میں موجود ہوتی ہے - اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ لوح (محو و اثبات) میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اگر فلاں شخص نے فقط حج یا صرف جہاد کیا تو اس کی عمر چالیس سال ہوگی - اور اگر وہ حج و جہاد ہر دو کو بجا لایا تو پھر اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی - پس اگر وہ ہر دو کو جمع کر دے اور ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کی عمر گویا بڑھ گئی ہے - اور اگر فقط ایک چیز پر اکتفا کرے - اور اس کی عمر چالیس سال سے متجاوز نہ ہو تو گویا اس

---

[1] ہم انشاء اللہ چالیسویں باب کے ذیل میں دلائل قاطعہ سے ثابت کریں گے کہ ان حضرات کو جو کچھ چڑ ہے وہ فقط لفظ "تقیہ" سے ہے ورنہ جہاں تک اس کے مطلب و مفہوم کا تعلق ہے اس میں وہ ہمارے ساتھ متفق ہیں - فانتظروا انی معکم من المنتظرین -

کی عمر گھٹ گئی ہے اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ صدقہ دینا اور صلہ رحمی کرنا شہروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتے ہیں۔

اسی طرح علامہ قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر انوار التنزیل ج ۲ صفہ طبع مصر پر مذکورہ بالا آیت وفی ابدایہ کی تفسیر میں لکھا ہے۔ وقیل الزیادۃ والنقصان فی عمر واحد باعتبار اسباب مختلفۃ اثبتت فی اللوح مثل ان یکون فیہ ان حج عمرو فعمرہ ستون سنتہ والا فاربعون - الخ۔ اس عبارت کا مطلب تقریباً وہی ہے جو زمخشری کی عبارت کا بیان ہو چکا ہے۔ علامہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر ج ۵ صفہ طبع مصر میں آیت مبارکہ یمحوا اللہ ما یشآء ویثبت وعندہ ام الکتٰب (سورہ رعد پ ۱۳ ع) کی تفسیر میں چند اقوال درج کئے ہیں۔ ان میں سے پہلا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہا عامۃ فی کل شئی کما یقتضیہ ظاھر اللفظ یمحوص الرزق و یزید فیہ وکذا القول فی الاجل والسعادۃ والشقاوۃ والایمان والکفر وھو مذھب عمرو بن مسعود والقائلون بھذا القول کانوا یدعون ویتضرعون الی اللہ تعالیٰ فی ان یجعلھم سعداء لا اشقیاء وھذا التاویل رواہ جابر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ محو و اثبات کا سلسلہ تمام اشیاء میں جاری و ساری ہے۔ جیسا کہ آیت کے ظاہری الفاظ بھی اسی امر کا تقاضا کرتے ہیں۔ خدا رزق میں کمی بھی کرتا ہے اور زیادتی بھی۔ اور یہی کیفیت موت و حیات اور سعادۃ وشقاوت اور کفر و ایمان کی ہے (کہ ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے) یہی عمرو بن مسعود (مشہور عالم اہل سنت) کا نظریہ ہے۔ اس قول کے قائل خداوند عالم کی بارگاہ میں انتہائی تضرع و زاری کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کو سعید بنائے نہ شقی و بدبخت۔ اس تاویل کو جناب جابر بن عبد اللہ انصاریؓ نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم سے روایت کیا ہے۔ پھر آٹھواں قول یہ نقل کیا ہے کہ انہ فی الارزاق والمحن والمصائب یثبتھا فی الکتٰب ویزیلھا بالدعاء والصدقۃ وفیہ حث علی الانقطاع الی اللہ تعالیٰ۔ یہ محو و اثبات فقط رزق اور مصائب و آلام کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ پہلے خدا یہ امور لوح میں درج کرتا ہے۔ پھر دعا و صدقہ دینے کی وجہ سے زائل کر دیتا ہے۔ اس میں لوگوں کو خدا کی طرف متوجہ ہونے پر ترغیب و تحریص دلانا مقصود ہے۔ یہی وہ بداء ہے جس کے حضرات شیعہ خیر البریہ قائل ہیں۔ تعجب ہے کہ فخر رازی یہ سب حقائق لکھنے کے بعد صفہ پر شیعوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ قالت الرافضۃ البداء جائز علی اللہ۔ رافضی لوگ کہتے ہیں کہ بداء خدا پر جائز ہے ع۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

مگر یہ سوچ کر ... را حافظہ نباشد" یہ تعجب کم ہو جاتا ہے۔

باب الاعتقاد فی التناھی عن الجدل والمراء فی اللہ
قال الشیخ ابو جعفر الجدل

گیارہواں باب: خداوند عالم کے بارے میں جدل و جدال کی ممانعت۔ حضرت شیخ
قدس سرہ فرماتے ہیں کہ خداوند عالم کے بارے میں

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور ج ۴ صفحہ پر اس قسم کے اخبار و آثار نقل کئے ہیں جو بالصراحت بدا پر دلالت کرتے ہیں۔ دو چار ملاحظہ ہوں، مستدرک حاکم سے بسند صحیح ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا لا ینفع الحذر من القدر ولکن یمحو بالدعا ما یشاء من القدر۔ یعنی ڈرنا اور خوف کرنا قضاء و قدر سے نہیں بچا سکتا۔ ہاں البتہ خداوند کریم دعا کے ذریعے سے چاہے تو قضا کو بھی محو کر دیتا ہے۔ جناب ابن مسعود کی یہ دعا نقل کی ہے کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں دعا کیا کرتے تھے۔ اللھم ان کتبتنی فی السعداء فاثبتنی فی السعداء وان کتبتنی فی الاشقیاء فامحنی من الاشقیاء واثبتنی فی السعداء فانک تمحو ما تشاء و تثبت وعندک ام الکتٰب۔ اے اللہ اگر تو نے مجھے سعداء میں لکھا ہے تو مجھے ان ہی میں ثابت رکھ۔ اور اگر تو نے مجھے اشقیاء میں درج کیا ہے تو وہاں سے میرا نام محو کر کے سعداء میں درج کر، کیونکہ تو جسے چاہتا محو کر دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے۔ تیرے ہی پاس ام الکتاب ہے۔ نیز کعب کا یہ قول بھی نقل کیا۔ ہے کہ ایک بار انہوں نے جناب عمر سے کہا۔ لولا اٰیۃ فی کتاب اللہ لانبئتک بما ھو کائن الی یوم القیامۃ قال ما ھی قال قول اللہ یمحو اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتٰب۔ اگر قرآن میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں تم کو قیامت تک ہونے والے واقعات بتا دیتا۔ عمر نے پوچھا وہ کونسی آیت ہے تو انہوں نے کہا۔ یمحو اللہ ما یشاء الآیۃ۔۔۔ ان حقائق سے بحمدہ تعالیٰ واضح و آشکار ہو گیا کہ عقیدۂ بدا عند الفریقین مسلم و مبرہن ہے۔ من ینکرہ انما ینکرہ باللسان وقلبہ مطمئن بالایمان۔ اب بھی اگر کوئی لکیر کا فقیر اس بات پر مصر ہو کہ خدا کے لئے لفظ بدا ان کی کتب سے دکھایا جائے تو وہ اپنی کتاب نہایہ ابن اثیر لغت بدا۔ اور انوار اللغۃ حصہ اول باب الباء صفحہ پر یہ حدیث ملاحظہ کرے۔ بدا اللہ ان یبتلیھم جس کا ترجمہ مولوی وحید الزمان مترجم صحاح ستہ نے یہ کیا ہے "اللہ کو یہی منظور ہوا کہ ان کو آزمائے"۔ الحمد للہ علی وضوح الحجۃ وکشف المحجۃ قل ھذہ سبیلی ادعو الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی وسبحان اللہ وما انا من المشرکین۔

گیارہواں باب: مجادلہ کا بیان

اس باب میں حضرت مصنف علام نے دو باتوں پر زور دیا ہے۔

في الله منهي عنه لانه يؤدي الى ما لا يليق به وسئل الصادق عن قول الله عزّ و جلّ و انّ الى ربّك المنتهى قال اذا انتهى الكلام الى الله فامسكوا وكان الصادق يقول يابن آدم لو اكل قلبك طائر ما اشبعه وبصرك لو وضع عليه خرق ابرة لغطاه تريد ان تعرف بهما ملكوت السموات والارض ان كنت صادقاً فهذه الشمس

جدل و جدال، کج بحثی اور فضول گفتگو سے ممانعت کی گئی ہے کیونکہ اس قسم کی غلط بحثیں ایسی چیزوں تک پہنچاتی ہیں۔ جو اس ذات ایزدی کی شانِ قدوسیت کے ہرگز لائق نہیں ہوتیں۔ خدا کے اس قول کہ خدا کی طرف انتہا ہوتی ہے کی تفسیر کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا۔ آپ نے فرمایا جب خدا کے بارے میں سلسلہ کلام شروع ہو تو اس وقت خاموش ہو جاؤ۔ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ اے فرزند آدم! تیرا دل تو اتنا ہے کہ اگر اسے کوئی پرندہ کھا جائے تو سیر نہ ہو اور تیری آنکھ کی یہ کیفیت ہے کہ اگر اس پر سوئی کا ناکہ رکھ دیا جائے تو وہ چھپ جائے کیا تو اپنی انہی دو طاقتوں کے بل بوتے پر آسمان و زمین کی سلطنت کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے؟

اوّل۔ یہ کہ خداوند عالم کی ذات جامع جمیع صفات کی کنہ و حقیقت میں بحث کرنا ممنوع ہے کیونکہ اس سلسلہ میں مباحثہ و مباہلہ کرنے سے بجائے فائدہ کے الٹا دینی نقصان اور ضیاع ایمان ہوتا ہے۔

دوم۔ یہ کہ جو لوگ کلام معصومین سے کما حقہ واقف ہیں اور بطریق احسن استدلال و احتجاج قائم کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کے لئے مخالفینِ مذہب سے گفتگو کرنا اور ان کو دعوت الی الحق دینا اور بطور دفاع حکمتِ بالغہ سے ان کے اعتراضات کے جوابات دینا فقط جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن و مستحب بلکہ بعض اوقات واجب ہو جاتا ہے اور جو لوگ اس امر کی اہلیت نہیں رکھتے ان کے لئے ان امور میں مداخلت کرنا ناجائز و حرام ہے چونکہ ہم ان دونوں امور پر کتاب کے ابتدائی صفحات میں سیر حاصل تبصرہ کر چکے ہیں اور ان مطالب کو دلائل و براہین سے ثابت کر چکے ہیں لہٰذا یہاں ان کے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ نشان دادہ مقامات کی طرف رجوع کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ کنہ حقیقتِ خداوندی تک ہمارے عقول و افہام کی رسائی ناممکن ہے اس لئے خداوند حکیم نے ہمیں اس کے سمجھنے کی تکلیف ہی نہیں دی جس پر دیگر ادلہ و براہین کے علاوہ اصول کافی کی یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جناب سہل نے بذریعہ خط حضرت امام حسن عسکری سے استدعا کی کہ حقیقت باری سے آگاہ فرمائیں۔ آں جناب نے ان کو جواب میں لکھا ہے۔ سئلت عن التوحید وھذا عنکم معزول۔ تو نے حقیقت توحید باری کے متعلق سوال کیا ہے۔ سو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ امر تم سے ساقط ہے۔ یعنی تمہیں اس کے سمجھنے کی تکلیف

خلق من خلق الله ان قدرت
فاملأ عينك منها فهو كما تقول
والجدل في جميع امور الدين
منهي عنه وقال امير المؤمنينؑ
من طلب الدين بالجدل تزندق
وقال الصادقؑ يهلك اصحاب
الكلام وينجو المسلمون ان
المسلمين هم النجباء فاما
الاحتجاج على المخالفين بقول الله
وقول رسولهؐ وبقول الائمةؑ او
بمعاني كلامهم لمن يحسن الكلام
فمطلق وعلى من لا يحسن
فمحظور محرم وقال الصادقؑ
حاجوا الناس بكلامي فان
حاجوكم كنت انا المحجوج
لا انتم وروي عنهؑ انه قال
كلام في حق خير من سكوت على
باطل وروي ان ابا الهذيل

اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اس سورج کو جو خدا کی ایک مخلوق
ہے ذرا آنکھ بھر کر اس کی طرف تو دیکھ اگر تو نے ایسا کر لیا تو ظاہر ہو
جائے گا کہ جیسا تو کہتا ہے بات ویسی ہی ہے۔ دین کی باتوں
میں مجادلہ کرنا ممنوع ہے۔ حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں جو شخص
بذریعہ جدل وجدال دینی اعتقادات حاصل کرنے کی کوشش
کرے گا وہ ملحد و زندیق ہو جائے گا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام
فرماتے ہیں، اصحاب کلام یعنی دین میں کج بحثی کرنے والے گمراہ
ہو جائیں گے۔ اور تسلیم خم کرنے والے نجات پا جائینگے۔ یہی تسلیم
کرنے والے لوگ ہی نجیب و شریف ہیں۔ ہاں خدا کے کلام،
حدیثِ رسولؐ اور اقوال معصومین علیہم السلام یا ان بزرگواروں کے
معانی کلام سے مخالفین پر احتجاج کرنا اور ان کے مقابلہ میں دلیل
قائم کرنا اس شخص کے لئے جائز ہے جو خدا و رسولؐ اور معصومین
علیہم السلام کے فرمودات کو بخوبی سمجھتا ہو اور اچھی طرح کلام بھی
کر سکتا ہو اور جو ان صفات کا حامل نہ ہو اس کے لئے اس
سلسلہ میں کلام کرنا حرام ہے۔ حضرت صادق علیہ السلام
فرمایا کرتے تھے تم میرے کلام سے لوگوں پر حجت قائم کرو اگر پھر بھی
بحث میں وہ غالب آجائیں تو مغلوب میں ہوں گا نہ تم۔ آنجناب
نے یہ بھی فرمایا کہ باطل پر خاموشی سے امر حق میں گفتگو کرنا بہتر ہے منقول

نہیں دی گئی۔ ہاں توحید باری کے متعلق اس قدر عقیدہ کافی ہے کہ۔ الله واحد احد، لم یلد ولم یولد ولم
یکن له کفواً احد خالق ولیس بمخلوق یخلق تبارك وتعالیٰ ما یشاء من الاجسام وغیر
ذلك ولیس بجسم ویصور ما یشاء ولیس بصورة جل ثناؤه وتقدست اسمائه ان یکون
له شبیه هو لا غیر لیس کمثله شئ وهو السمیع البصیر۔ اللہ ذات و صفات میں یگانہ ہے۔ نہ اس
کے ہاں اولاد ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ وہ خالق ہے مخلوق نہیں۔ وہ جس قدر چاہتا ہے جسمانی اور غیر جسمانی
مخلوق پیدا کرتا ہے لیکن خود جسم نہیں رکھتا۔ وہ جس قدر چاہتا ہے تصویر کشی فرماتا ہے لیکن خود صورت نہیں رکھتا۔ اس

العلّاف قال لهشام بن الحکم انا ظرك على انّك ان غلبتني رجعت الى مذهبك وان غلبتك رجعت الى مذهبي فقال هشام ما انصفتني بل انا ظرك على انّني ان غلبتك رجعت الى مذهبي وان غلبتني رجعت الى امامي۔

ہے کہ ایک بار ابوالہذیل علاف نے جناب ہشام بن حکمؓ سے کہا میں اس شرط پر آپ سے مناظرہ کرتا ہوں کہ اگر آپ مجھ پر غالب آجائیں تو میں تمہارا مذہب اختیار کر لوں گا اور اگر میں غالب رہا تو آپ میرے دین و مذہب کو قبول کر لیں ہشام نے جواب دیا تم نے انصاف نہیں کیا میں تو اس شرط پر مناظرہ کرتا ہوں کہ اگر میں تم پر غالب آجاؤں تو آپ میرا مذہب اختیار کر لیں اور اگر کسی وجہ سے تم مجھ پر غالب آگئے تو میں اپنے امام کی طرف رجوع کروں گا یعنی اس امر کا جواب اپنے امام علیہ السلام سے طلب کرونگا۔

کی ذات اس سے اجل وارفع ہے کہ اس کا کوئی شبیہ و مثیل ہو۔ یہ اسی کی شان ہے نہ کسی اور کی کہ اس کا کوئی مثیل و نظیر نہیں، وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

ازالۂ اشتباہ

یہاں اگر یہ شبہ عائد کیا جائے کہ جب مسئلہ توحید میں مزید غور و فکر اور مباحثہ و مجادلہ کرنا ممنوع ہے۔ تو پھر اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اس مرحلہ میں تقلید کی جائے۔ قطع نظر اس سے کہ اصول عقائد میں تقلید جائز ہے یا ناجائز؟ اس شبہ کا جواب ظاہر ہے کہ اصل مسئلہ توحید اور صانع عالم کے اثبات میں غور و فکر اور مکالمہ و مباحثہ کرنا ممنوع نہیں ہے تا کہ یہ شبہ وارد ہو بلکہ مقصد یہ ہے کہ خداوند عالم کی کنہ اور اصل حقیقت میں مجادلہ و مباحثہ اور گفتگو کرنا ممنوع ہے۔ جس کے جاننے کی ہمیں تکلیف ہی نہیں دی گئی لہٰذا اس میں اجتہاد یا تقلید کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اجتہاد یا تقلید وہاں ہوتی ہے جہاں شرعی تکلیف عائد ہو اور اس سے عہدہ برآ ہونا ہو لیکن جہاں تکلیف ہی ساقط ہو وہاں اجتہاد یا تقلید کرنا چہ معنی دارد؟

تنبیہ

متن رسالہ میں ابوالہذیل علاف اور جناب ہشام بن الحکم کا شرائط مناظرہ طے کرنے کے سلسلہ میں جو واقعہ درج ہے۔ اس میں مناظرہ کرنے اور شرائط مناظرہ طے کرنے والوں کے لئے درس عبرت موجود ہے کہ وہ اس سلسلہ میں مذہب تبدیل کرنے والی احمقانہ شرط سے مکمل اجتناب کریں کیونکہ تبدیلی مذہب کی شرط تو وہ شخص کرے جس کی نگاہ میں اپنے مذہب کی صداقت مشکوک و مشتبہ ہو ورنہ جسے اپنے مذہب کی صداقت و حقانیت کا یقین کامل ہے وہ اپنے ایک مولوی و مناظر کی شکست کی صورت میں اپنے مذہب سے ہرگز دستبردار نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مخالف کے ایراد و اعتراض کے جواب میں اپنے کسی اور بڑے عالم دین کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ کیونکہ فوق کل ذی علم علیم۔ چونکہ شرائط ہی میں قریباً نصف مناظرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس

باب الاعتقاد فی اللوح والقلم قال الشیخ اعتقادنا فی اللوح والقلم انھما ملکان

بارھواں باب (لوح وقلم کے متعلق عقیدہ)

حضرت شیخ (ابن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ) ارشاد فرماتے ہیں کہ لوح وقلم کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ دو فرشتے ہیں۔

لئے بعض اوقات مخالفین ہمارے سادہ لوح مومنین سے ایسی ایسی کڑی شرائط لکھوا لیتے ہیں کہ جن کا بعد میں مناظر کو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں متعلقہ حضرات کو پوری پوری احتیاط سے کام لے کر اپنی قیاست و فراست کا ثبوت دینا چاہیے۔ مخفی نہ رہے کہ متن رسالہ میں جو ایسی بعض روایات موجود ہیں جن سے علم کلام و متکلمین کی مذمت مترشح ہوتی ہے ہم نے کتاب کے پیش لفظ میں بذیل ایک عظیم شبہ اور اس کا ازالہ" ان کے حقیقی مطلب و مفہوم کی کماحقہ وضاحت کر دی ہے اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔

بارھواں باب' لوح وقلم کا بیان'

جو امر اہل مذہب میں مشہور اور بکثرت احادیث میں مذکور ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوح اس چیز کا نام ہے جس میں کائنات کے اندر قیامت تک ہونے والے تمام واقعات وحادثات کا حال مرقوم ہے اور قلم اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز لکھی جائے۔ خواہ وہ جس نوعیت وماہیت کی بھی ہو۔ تفسیر قمی میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ اول ما خلق اللہ القلم فقال لہ اکتب فکتب ما کان وما ھو کائن الی یوم القیامۃ سب سے پہلے خدا نے قلم کو خلق فرمایا اور پھر اس سے کہا لکھ۔ پس اس نے جو کچھ گذر چکا ہے اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے سب لکھ دیا۔ لیکن اس سلسلہ میں جو کچھ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے تحریر فرمایا ہے کہ لوح وقلم دو فرشتوں کے نام ہیں۔ اس مضمون کی ایک روایت انہی کی کتاب معانی الاخبار میں موجود ہے جو بہر حال خبر واحد ہے اور مقام اعتقاد میں اس پر اعتماد مشکل ہے!

مصنف کے بیان کردہ نظریہ پر جناب شیخ مفیدؒ کی تنقید

جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ نے اس مقام پر مصنف علام کے بیان کردہ مطلب پر تنقید کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے ومن ذھب الی ان اللوح والقلم ملکان فقد ابعد بذلک ونای من الحق اذ الملائکۃ لا تسمی الواحا ولا اقلاما ولا یعرف فی اللغۃ اسم ملک ولا بشر لوح ولا قلم۔ یعنی جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ لوح وقلم دو فرشتے ہیں وہ اس سلسلہ میں حق سے بہت

باب الاعتقاد فی الکرسی

تیرہواں باب (کرسی کے متعلق اعتقاد)

قال الشیخ اعتقادنا فی الکرسی انه وعاء جمیع الخلق والعرش

حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ کرسی کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کرسی ایک ایسا عظیم ظرف ہے۔ جس میں

وُور ہو گئے ہیں کیونکہ ملائکہ کے نام لوح وقلم نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی لغت میں کسی فرشتہ یا انسان کا نام آج تک لوح و قلم معلوم ہو سکا ہے۔

مصنف کے بیان کردہ مسلک اور مشہور نظریہ کے درمیان جمع و توفیق

لیکن قولِ مشہور اور حضرت شیخ صدوقؒ کے قول میں اس طرح جمع و توفیق ممکن ہے۔ کہ مشہور نظریہ کی بنیاد ان الفاظ کے ظاہری معنوں پر ہے اور شیخ کا مسلک ان الفاظ کے باطنی معنوں پر مبنی ہے لان للقران ظهرا وبطنا وللبطن بطنا الی سبعة ابطن قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن پھر باطن کا باطن۔ یہاں تک کہ اس کے سات سات باطن ہیں (تفسیر صافی و برہان وغیرہ) اور ان بواطن قرآنیہ کو سوائے وارثان علم قرآن یعنی سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کے اور کوئی نہیں جانتا۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔ ولا یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم۔ علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے۔ جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ہے، کہ واقعاً لوح وقلم دو ایسے فرشتے ہوں کہ ایک سے آلۂ تحریر کا کام اور دوسرے سے لوح (تختی) والا کام لیا جاتا ہو۔ نیز ممکن ہے کہ لوح وقلم بنا بر مشہور اپنے ظاہری معنوں پر محمول ہوں لیکن ان کے حامل دو فرشتے ہوں اور مجازاً خود لوح وقلم کو فرشتہ سے تعبیر کر دیا گیا ہو بہرحال لعل الایمان بمثل ذلك علی الاجمال اسلم من الخطاء والضلال (درایۃ عشر بحار الانوار)

قول فیصل

اس قسم کے امور کی بے جا تاویلات کے متعلق حضرت علامہ مجلسی ارشاد فرماتے ہیں۔ تورد ما ورد فی الکتاب والسنة من امثال ذالك لا یجوز تاویله والتصرف فیه بمحض استبعاد الوهم بلا برهان وحجة ونص معارض یدعوا الی ذلك (۱۴ بحار) یعنی میں کہتا ہوں کہ اس قسم کے جو امور کتاب و سنت میں وارد ہوتے ہیں ان کی محض وہمی استبعاد کی بنا پر بغیر کسی دلیل و برہان اور بغیر کسی معارض نص کے تاویل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ایسے امور کو اپنے ظاہری معنوں پر باقی رکھنا چاہیئے۔ واللہ العالم بحقائق الامور

تیرہواں باب کرسی کا بیان

کرسی کے متعلق جو کچھ حضرت شیخ قدس سرہ نے بیان فرمایا ہے اس کی تائید بکثرت احادیث معصومین علیہم السلام

والسّمٰوات والارض وکلّ شیءٍ خلق اللہ تعالیٰ والکرسی فی وجہ آخر ھو العلم وقد سئل الصادق عن قول اللہ عزّوجل وسع کرسیّہ السّموات والارض قال ھو علمہ

زمین و آسمان اور عرش غرضیکہ اس میں خدا کی سب پیدا کردہ چیزیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کرسی سے علم بھی مراد لیا گیا ہے حضرت صادق علیہ السّلام سے ارشاد ایزدی وسع کرسیّہ السّمٰوٰت والارض (اللہ کی کرسی تمام آسمانوں اور زمینوں سے وسیع ہے) کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا آپ نے فرمایا کرسی سے خدا کا علم مراد ہے۔

سے ہوتی ہے۔ چنانچہ کتاب التوحید میں اس مضمون کی متعدد احادیث موجود ہیں۔ یہاں صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں فضیل بن یسار بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السّلام سے ارشاد باری وسع کرسیّہ السّمٰوٰت والارض۔ کہ خداوند عالم کی کرسی زمین و آسمان پر حاوی ہے، کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا یا فضیل السّمٰوٰت والارض وکلّ شیءٍ فی الکرسی۔ اے فضیل! زمین و آسمان اور ہر شئی کرسی کے اندر موجود ہے۔

دوسری حدیث جناب زرارہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السّلام سے دریافت کیا کہ آیت مبارکہ وسع کرسیّہ السّمٰوٰت والارض کا کیا مطلب ہے۔ آیا زمین و آسمان کرسی کو گھیرے ہوئے ہیں یا کرسی ان کو محیط ہے؟ فرمایا بل الکرسی وسع السّمٰوٰت والارض والعرش وکلّ شیءٍ فی الکرسی۔ بلکہ کرسی زمین و آسمان کو محیط ہے۔ اور عرش اور ہر چیز کرسی کے اندر ہے۔ اس قسم کی اور بھی متعدد روایتیں موجود ہیں۔ اسی طرح کرسی کے دوسرے معنی یعنی علم کے متعلق بھی متعدد روایتیں موجود ہیں۔

کرسی کے مذکورہ بالا معنی کی کتب لغت سے تائید مزید!

یہی نہیں کہ کرسی کا معنی علم ہونا صرف احادیث آئمہ اہل بیت ہی میں وارد ہے بلکہ بڑے بڑے آئمہ لغت عرب کے اقوال سے بھی اس کی تائید مزید ہوتی ہے چنانچہ صاحب القاموس المیطرج ص پر رقمطراز ہیں الکرسی العلم یعنی کرسی کے معنی ہیں علم۔ اسی طرح صاحب لسان العرب نے ج ۸ ص پر لکھا ہے الکرسی العلم نیز منتہی الارب فی لغۃ العرب میں کرسی کے معنی علم و دانش لکھے ہیں۔ وکذا فی بیان اللسان ص ۶۲۵ اور درحقیقت کرسی کے ان ہر دو معانی میں جو حضرت مصنف علّام نے بیان فرمائے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ صرف ظاہر و باطن کا فرق ہے۔ کرسی کے متعلق بعض لوگوں کا جو یہ خیال ہے کہ وہ ہماری کرسیوں کی مانند ایک کرسی ہے جس پر خداوند عالم معاذ اللہ جلوس فرماتا ہے تو یہ ایک انتہائی لغو اور مضحکہ خیز نظریہ ہے۔ اس کا رد ہم معانی عرش کے ضمن میں عنقریب بیان کریں گے۔ انشاء اللہ فانتظر۔

بَابُ الْاِعْتِقَادِ فِی الْعَرْشِ

قال الشیخ ابو جعفرؒ اعتقادنا فی العرش انہ جملۃ جمیع الخلق والعرش فی وجہ اٰخر ھو العلم

چودہواں باب (عرش اور اس کی حقیقت)

جناب شیخ ابوجعفرؒ فرماتے ہیں۔ عرش کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ تمام مخلوق خدا کے مجموعے کا نام عرش ہے۔ اور علم خدا کو بھی عرش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آیت مبارکہ رحمٰن عرش پر

چودہواں باب عرش کا بیان

عرش کا صحیح مفہوم سمجھنے میں مسلمانوں کے اشتباہ کی اصل وجہ

عرش کے مشہور معنی لغت میں سریر الملک یعنی بادشاہ کا پایۂ تخت کے ہیں۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہو گیا۔ اور حقیقت سے دور ہو گئے چنانچہ فرقہ مجسمہ اور حضرات حشویین نے اس مطلب کو بار و برگ دے کر کچھ اس طرح پیش کیا کہ دنیوی شہنشاہوں کی طرح خداوند عالم کو ایک مجسم شہنشاہ اعظم تصور کر کے عرش پر بٹھا دیا۔ اور اس کی جسامت اور قد و قامت کے متعلق یہاں تک لکھ دیا۔ یئیط بالعرش کما یئیط الرحل بالراکب۔ کہ جب خدا عرش پر جلوہ افروز ہوتا ہے تو عرش اس طرح چرچراتا ہے۔ جیسے نئی زین سوار کے بیٹھنے سے چرچراتی ہے (کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۵ وغیرہ) لیکن جب یہ امر اپنے مقام پر ادلۂ عقلیہ و نقلیہ سے محقق و مبرہن کیا جا چکا ہے کہ خداوند عالم جسم و جسمانیات سے منزہ و مبرا ہے تو پھر اس کی ذات و الاصفات کے متعلق اس قسم کے واہیات اعتقادات رکھنے کی سرے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ ہاں اصطلاح شریعت میں جن معنوں پر عرش کا اطلاق صحیح ہے اور لغت سے بھی فی الجملہ اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا ذیل میں اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عرش کے معانی و مفاہیم کی تفصیل جمیل

مخفی نہ رہے کہ جو کچھ لغت عرب اور اصطلاح شرع انور سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ عرش کا کئی معانی پر اطلاق ہوا ہے

عرش کے پہلے معنی

یہ ہیں کہ اس سے مراد عالم مملکتِ خداوندی ہے۔ جیسا کہ حضرت مصنف علامؒ نے بیان کیا ہے۔ اور لغتِ عرب سے بھی عرش کے معنی ملک استعمال ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعرِ عرب کہتا ہے ؎

اذا ما بنو مروان ثلت عروشھم　　　واودت کما اودت ایاد و حمیر

یعنی بنی مروان کی مملکت اس طرح تباہ و برباد ہو گئی جس طرح ایاد و حمیر نامی قومیں تباہ ہوئی تھیں۔

وسئل الصادقؑ عن قول اللّٰہ عزوجل الرحمٰن علی العرش استوی فقال استویٰ من کل شیئ فلیس شیئ اقرب الیہ

غالب ہوگیا" کی تفسیر حضرت صادق علیہ السلام سے دریافت کی گئی۔ فرمایا خدا اپنی تمام مخلوق کے ساتھ یکساں نسبت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک چیز سے دوسری اس کے زیادہ نزدیک ہو۔ اور

روایات اہل بیتؑ سے بھی اس معنی کی تائید مزید ہوتی ہے چنانچہ جناب سدیر روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام سے عرش و کرسی کے معانی دریافت کئے۔ آپ نے فرمایا۔ ان للعرش صفات کثیرۃ مختلفۃ لہ فی کل سبب و وضع فی القران صفۃ علیحدۃ ففولہ رب العرش العظیم یقول رب الملک العظیم۔ یعنی عرش صفات و نعوت کثیرہ کا حامل ہے اور قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں استعمال ہوا ہے۔ ہر ہر مقام پر اس کے مناسب حال مختلف معنی مراد ہیں۔ چنانچہ آیت مبارکہ وھو رب العرش العظیم میں اس کے معنی ہیں کہ خدا ملک عظیم کا مالک ہے بنا بریں آیت مبارکہ ان اللّٰہ علی العرش استویٰ کے معنی یہ ہوں گے کہ عظیم سلطنت پر غالب ہے باقی اس بات کی تحقیق کہ ملک و سلطنت کو عرش سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ کسی بادشاہ کی عظمت و جلالت کا مظہر اس کا عرش یعنی پایۂ تخت ہوتا ہے اسی سے اس کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہاں یہ کیفیت ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے پروردگار کی عظمت و جبروت اور اس کی صنعت و کاری گری پر اس قدر شواہد و دلائل رکھتا ہے کہ جن کا عد و احصا نہیں ہو سکتا ؏

وفی کل شیئ لہ آیۃ   تدل علی انہ واحد

اس اعتبار سے اشیا عالم کے مجموعہ کو خدا کا عرش کہنا صحیح ہے کیونکہ یہ اس کی شان و شوکت کا مظہر اتم ہے۔

استواء علی العرش کے معنوں کی تحقیق

علاوہ ان معنوں کے جو مصنف علام نے بیان فرمائے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خداوند عالم مملکت و سلطنت پر مستوی یعنی غالب ہے۔ فرقہ مجسمہ نے عرش کے معنی کی طرح۔ استواء کے مفہوم سمجھنے میں بھی بڑی ٹھوکر کھائی ہے انہوں نے اس کے معنی سیدھے ہو کر بیٹھنے کے لئے۔ اور یہ نہ سوچا کہ آیا یہ معنی شان ایزدی کے مطابق بھی ہیں یا نہیں؟ سچ ہے یلک من علمہ واہلہ من عقل باید۔ ہر لفظ کے ہر جگہ بلا لحاظ مورد و متعلق ایک ہی معنی مراد لینا اپنی عقل و خرد کا جنازہ نکالنے کے مترادف ہے حالانکہ استواء کے صرف وہی ایک معنی نہیں جو ان حضرات نے لئے ہیں۔ بلکہ استوا لغت عرب میں بمعنی استیلاء و غلبہ بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ عرب کا ایک شاعر (لبعیث) کہتا ہے ؎

قد استوی بشر علی العراق   من غیر سیف و دم مہراق

من شئ فاما العرش الذی ھو جملۃ جمیع الخلق فحملۃ ثمانیۃ من الملائکۃ لکل واحد منھم ثمانیۃ اعین کل عین طباق	وہ عرش جو تمام دنیا کا مجموعہ ہے۔ اس کو اٹھانے والے آٹھ فرشتے ہیں۔ جن میں ہر ایک کی آٹھ آٹھ آنکھیں ہیں اور ان کی ہر آنکھ اتنی بڑی ہے کہ وہ ساری دنیا کو ڈھانپ سکتی ہے

ایک آدمی عراق پر مستطر، غالب ہوگیا ہے۔ بغیر کسی قسم کی شمشیر زنی اور خون ریزی کے۔

اور یہی معنی شانِ ربوبی کے لائق ہیں۔

عرش کے دوسرے معنی

یہ ہیں کہ اس سے مُراد وہ جسم عظیم ہے جو خلاقِ عالم نے آسمانوں کے اوپر خلق فرمایا ہے۔ جو آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ آیا وہ کرسی کو محیط ہے یا کرسی اس کو محیط ہے۔ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ بعض روایتوں سے کرسی کا اس کو محیط ہونا ثابت ہے جیسا کہ ہم باب سیزدہم میں ایسی بعض روایتیں نقل کر چکے ہیں۔ اور بعض دوسری روایات (جن کو علامہ مجلسی نے تعداد میں زیادہ قرار دیا ہے۔ وھو قدس سرہٗ اعلم بما قال وان کان عندنا محل نظر و تامل و لکن فقول اجلالہٗ لمقامہ الرفیع ان القول قولہ ۔

(واذا قالت حظام فصدقوھا فان القول ما قالت حظام)

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کرسی کو محیط ہے اور حکماء کے اقوال سے بھی اسی امر کی تائید ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے۔ کہ کرسی سے مُراد فلک ہشتم اور عرش سے مُراد فلک نہم ہے۔ لیکن احادیثِ معصومینؑ میں عرش و کرسی کے جو اوضاع و اشکال اور خواص بیان کئے گئے ہیں۔ ان سے حکما کے بیان کردہ معانی کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ واللہ العالم

بہر حال بنا بریں عرش ایک بہت بڑا جسم ہے جس کی خلقت زمین و آسمان کی خلقت سے پہلے ہوئی تھی وکان عرشہ علی الماء۔ اور کئی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جسم عظیم مختلف رنگ کے انوار سے خلق کیا گیا ہے۔ اور اس کی جسامت اور بڑائی کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے جسے علامہ شہر ابن آشوب نے اپنی کتاب بیان التنزیل میں حضرت صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے (علی ما نقل فی البحار) عرش کے ستونوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ ایک ستون سے دوسرے ستون تک دس ہزار سال تک ایک پرندہ اڑ سکتا ہے۔ ان ارکان میں سے ہر ہر رکن کے پاس اس قدر ملائکہ کرام دن رات تسبیح و تقدیس الٰہی میں مشغول ہیں۔ جن کی تعداد سوائے ان کے خالق کے اور کوئی نہیں جانتا۔ شائد نئی روشنی کے بعض جدت پسند حضرات اس قسم کی احادیث کو بنظر استبعاد دیکھیں۔ ان کے رفع استبعاد کے لئے اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اگر وہ خداوند عالم کو علی کل شئ قدیر جانتے ہیں تو پھر ان کا یہ استبعاد کوئی

الدنیا واحد منهم علی صورۃ بنی آدم فھو یسترزق اللہ لولا آدم وواحد منهم علی صورۃ الثور یسترزق اللہ للبھائم کلھا وواحد منهم علی صورۃ الاسد یسترزق اللہ للسباع و واحد منهم علی صورۃ الدیک یسترزق للطیور فھم الیوم اربعۃ فاذا کان یوم القیٰمۃ صاروا ثمانیۃ واما العرش الذی ھو العلم تحملہ اربعۃ من الاولین فنوحؑ وابراھیمؑ وموسیٰؑ وعیسیٰؑ علیھم السلام

ان فرشتوں میں ایک فرشتہ آدمی کی شکل میں ہے جو اولادِ آدم کے لئے خدا سے روزی طلب کرتا رہتا ہے۔ دوسرا فرشتہ بیل کی شکل میں ہے جو چوپایوں کے واسطے رزق مانگتا ہے تیسرا فرشتہ شیر کی صورت میں ہے جو درندوں کے لئے روزی طلب کرتا ہے۔ چوتھا فرشتہ مرغ کی ہیئت رکھتا ہے جو اللہ سے تمام پرندوں کے لئے رزق مانگتا ہے۔ حاملانِ عرش اس وقت یہی چار فرشتے ہیں مگر قیامت کے روز آٹھ ہو جائیں گے۔ لیکن جو عرش علم کے معنوں میں ہے۔ اس کے اٹھانے والے چار تو اوّلین میں سے ہیں اور چار آخرین میں سے۔ جو اوّلین میں سے ہیں۔ وہ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور جناب عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ اور جو

معنی نہیں رکھتا۔ اور اگر ہنوز اس کی قدرت کاملہ میں ہی تردّد ہے تو پھر انہیں پہلے اپنا اعتقاد صحیح کرنا چاہیے۔ اس کے بعد یہ استبعاد خود بخود دُور ہو جائے گا۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ ارشادِ خداوندی اور فرمانِ نبوی سے زیادہ اہمیت اپنے جغرافیہ کے نقشوں کو دیتے ہیں اگر خدا اور رسولؐ کسی شے کی نشان دہی کریں لیکن وہ چیز ان کے نقشہ میں موجود نہیں ہے تو یہ حضرات اسے باور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کی اس کیفیت کا اکبر الٰہ آبادیؒ نے اپنے مخصوص انداز میں یوں نقشہ کھینچا ہے ؎

قائل خدا کے عرش کے کیونکر ہوں یہ عزیز جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا۔

موجودہ نظامِ تعلیم کے ناقص ہونے کی طرف اشارہ

اور یہ اس نظامِ تعلیم کے بُرے اثرات ہیں جو انگریزوں نے مسلمانوں کے مذہبی معتقدات کو کمزور کرنے کے لئے مسلّط کیا تھا۔ اب اگرچہ ہم بفضلہٖ تعالیٰ جسمانی طور پر آزاد ہو چکے ہیں اور انگریز رختِ سفر باندھ کر یہاں سے جا چکا ہے مگر ہنوز ذہنی غلامی قریباً قریباً بدستور باقی ہے۔ جس سے گلو خلاصی کرانے کے لئے محکمۂ تعلیم کے اربابِ بست و کشاد کو خصوصی توجہ کرنا چاہیے۔ خدا کرے وہ اپنے فرضِ منصبی کو سمجھیں اور موجودہ نظام و طرزِ تعلیم میں مناسب تغیر و تبدّل کرکے اصلاحِ احوال کریں کیونکہ ؎

واما الاربعة من الاخرين فمحمد و علیؑ والحسنؑ والحسینؑ صلوات اللہ علیهم هكذا روی بالاسانید الصحیحة عن الائمة فی العرش وحملته وانما صار هولاء حملة العرش الذی هو العلم لان الانبیا الذین کانوا قبل نبینا محمد علی شرائع الاربعة من

آخرین میں سے ہیں وہ جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ جناب امام حسنؑ اور حضرت امام حسین علیہم السلام ہیں۔ یہ خلاصہ ہے ان احادیث کا۔ جو آئمہ علیہم السلام سے بسندِ صحیح عرش اور حاملانِ عرش کے بارے میں منقول ہوئی ہیں۔ ان ذواتِ مقدسہ کے عرش یعنی علم خداوندی کے حامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل وہ انبیاء جن کی شریعتوں پر سب انبیا عمل کرتے تھے۔ اور ان کے توسط سے ان کو

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم   ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

جہاں تک زبانی طور پر موجودہ نظامِ تعلیم کے ناقص بلکہ بعض وجوہ سے گمراہ کن ہونے کا تعلق ہے اس کا اقرار واعتراف ملک کے باخبر دردمندان دین کے علاوہ خود محکمۂ تعلیم کے ارباب حل وعقد کو بھی ہے۔ خدا کرے کہ عملی طور پر بھی ان کو توفیق ہو کہ کوئی اصلاحی اقدام کر کے نئی پود کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنائیں۔ اور آئندہ نسلوں کے مذہبی معتقدات اور اسلامی روایات کے تحفظ کا کوئی مکمل انتظام وانصرام کریں۔ آج کل کی تعلیم بقول اکبر الٰہ آبادی یہ ہے ع۔

تعلیم جو دی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط بازاری ہے   جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اور اس تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہمارے اکثر نوجوان زبان حال سے یہ کہہ کر مذہب کا جوا اپنی گردن سے اُتار دیتے ہیں کہ ؎

یہ آپ کا فرمانا ہے بجا قرآن بھی ہے اللہ بھی ہے
مشکل تو یہ ہے لیکن کہ ادھر آذر بھی ہے اور تنخواہ بھی ہے

مسلمانوں نے خداوند عالم سے یہ عہد وپیمان کر کے پاکستان ایسی عظیم اسلامی سلطنت مانگی تھی کہ ہم اس میں اسلامی قانون رائج کریں گے۔ اور شریعت محمدی کے مطابق زندگی گزاریں گے۔ مقام ہزار شکر ہے کہ خدائے منان نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا اور عدیم النظیر اسلامی سلطنت عطا فرمائی۔ مگر افسوس کہ ہم اپنا کیا ہوا عہد وپیمان بھول گئے۔ آج پاکستان بنے ہوئے بیس سال سے زائد عرصہ ہو رہا ہے۔ مگر افسوس کہ آج تک اس کے اکثر قوانین وآئین غیر اسلامی ہیں اس کا طرز تعلیم ہنوز مغربی نہج پر جاری وساری ہے۔ ہمارا اندازِ فکر غیر اسلامی ہے۔ ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ قدرت کا وعدہ ہے لئن شکرتم لازیدنکم اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو میں نعمتوں میں برابر اضافہ کرتا رہوں گا اور ساتھ ہی یہ

نوحؑ و ابراهیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ و من قبل هولآء صارت العلوم الیهم و کان صار العلم من بعد محمد و علی و الحسنؑ و الحسینؑ الی من بعد الحسینؑ من الائمۃ۔

علوم حاصل ہوتے تھے وہ حضرت نوحؑ۔ ابراہیمؑ۔ موسیٰؑ و عیسیٰ علیہم السّلام ہی تھے۔ اور اسی طرح محمد مصطفےٰؐ، جناب امیرؑ، امام حسنؑ اور امام حسین علیہم السّلام سے منتقل ہو کر بعد والے اماموں کو علم حاصل ہوا ہے۔

تہدید بھی فرمائی ہے کہ لئن کفرتم ان عذابی لشدید۔ لیکن اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا تو پھر یاد رکھو میرا عذاب بہت سخت ہے۔ خدا کی گرفت (اعاذنا اللہ منہ) دیر سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن جب شروع ہو جائے تو بہت سخت ہوتی ہے۔ انّ بطش ربّک لشدید۔ اصلاحِ احوال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے ورنہ خدانخواستہ کچھ عرصہ تک یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں جب ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی ۔۔۔ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو کہ سیّال قلم سے صفحۂ قرطاس پر منقش ہو گیا عرش الٰہی کے دوسرے معنی کا ذکر ہو رہا تھا اس بڑے جسم کو عرشِ خدا جو کہا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خداوند عالم اس پر تشریف رکھتا ہے بلکہ یہ محض اس کی عظمت و جلالت کی وجہ سے ہے۔ جس طرح خانۂ کعبہ کو بیت اللہ یا حضرت صالحؑ کی ناقہ کو ناقۃ اللہ کہا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خانۂ کعبہ (معاذ اللہ) خدا کا رہائشی مکان اور ناقۂ صالحؑ اس کی سواری کا جانور ہے۔ بلکہ یہ اضافت و نسبت محض ان اشیاء کی عظمت و جلالت ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

عرش الٰہی میں کیا ہے؟

اب رہا یہ امر کہ اس عرش اعظم میں ہے کیا؟ تو اس کا صحیح علم تو علام الغیوب کو ہی ہے یا ان بزرگوں کو ہے جن کی عرش و فرش کی خلقت سے پہلے ہوئی۔ ہاں جو کچھ بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے اگرچہ ان امور پر یقین کرنا مشکل ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں موجود ہے۔ اس کی مثال (بلا مادہ و مدت) عرش الٰہی میں موجود ہے۔ چنانچہ کتاب روضۃ الواعظین مؤلفہ حضرت شیخ فتال نیشاپوری میں جناب امام جعفر صادق علیہ السّلام سے بسلسلہ سند ان کے آبا و اجداد کے مروی ہے کہ فرمایا فی العرش تمثال ما خلق اللہ فی البر و البحر و قال ھذا تاویل قولہ تعالیٰ و ان من شیئ الا عندنا خزائنہ۔ عرش میں ہر اس چیز کی تمثال موجود ہے۔ جسے خداوند عالم نے خشکی و تری میں پیدا کیا ہے اور یہی مطلب ہے اس آیت مبارکہ کا کہ کوئی چیز ایسی نہیں جس کا خزانہ ہمارے پاس نہ ہو۔

علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ چہاردہم بحار میں فرماتے ہیں۔ فی بعض الکتب عن علی ابن الحسین علیہما السلام ان فی العرش تمثال جمیع ما خلق اللہ۔ یعنی بعض کتب میں جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا عرش میں ہر اس چیز کی تمثال موجود ہے۔ جسے خداوند عالم نے خلق فرمایا ہے۔ اسی طرح دعائے مبارکہ یا من اظہر الجمیل و ستر القبیح۔ الخ۔ اے وہ خدا جو ہمارے اچھے کام کو ظاہر کرتا ہے اور ہمارے بُرے کام پر پردہ ڈالتا ہے۔ کی شرح میں جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث ملتی ہے کہ ہر شخص کی ایک تمثال عرش میں موجود ہے جو کام انسان دنیا میں انجام دیتا ہے اس کی وہ تمثال بھی وہی کام وہاں کرتی ہے۔ اگر یہ نماز پڑھتا ہے تو وہ تمثال بھی نماز پڑھتی ہے اور اگر وہ یہاں چوری کرتا ہے تو وہ تمثال بھی اسی طرح چوری کرتی ہے وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ لیکن رب العزت نے اپنے خاص فضل و کرم سے یہ سلسلہ جاری کیا ہے کہ جب انسان کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو وہ تصویر بے حجاب ہوتی ہے۔ فرشتے انسان کی نیکیوں کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ اور جب وہ کسی برائی کا ارتکاب کرنے لگتا ہے تو حکم خدا سے اس تمثال پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے تاکہ فرشتے انسان کی اس برائی کا مشاہدہ نہ کریں (خزینۃ الجواہر وغیرہ) اس معنی کے اعتبار سے اسے عرش کہنے کی جو مناسبت ہے۔ اور اس سے جس طرح شانِ ربوبیت ظاہر ہوتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

عرش کے تیسرے معنی

یہ ہیں کہ اس سے مراد علم ہے جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے۔ چنانچہ آیت مبارکہ وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض کی تفسیر میں حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا السمٰوٰت والارض وما بینہما فی الکرسی والعرش العلم الذی لا یقدر احد قدرہ۔ تمام آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ وہ کرسی کے اندر موجود ہے۔ اور عرش سے مراد خداوند عالم کا وہ علم ہے جس کا کوئی شخص اندازہ نہیں لگا سکتا (کتاب التوحید) اس معنی کی مناسبت بھی ظاہر ہے کہ چونکہ بندوں کے لئے خلاقِ عالم کی معرفت اور اس کی قدرت کا ظہور علم ہی کی بدولت ہوتا ہے۔ اس لئے عرش کا اطلاق علم پر بھی جائز ہے اور اس علم کے حاملین بعض انبیا و سلف اور ہمارے نبی اعظم اور آئمہ طاہرین ہیں۔ اس کی وجہ متن رسالہ میں مذکور ہے کہ یہی بزرگوار اللہ سبحانہٗ کے علم کے معدن اور خزانہ دار ہیں۔

عرش کے چوتھے معنی

اس سے مراد قلب مومن ہے جیسا کہ حدیثِ قدسی میں وارد ہے۔ لا یسعنی سمائی والارضی ویسعنی قلب عبدی المومن۔ میری گنجائش آسمان میں ہے نہ زمین میں ہاں اگر میری گنجائش ہے تو فقط اپنے بندۂ مومن کے دل میں ہے

جنہیں ہم ڈھونڈتے تھے آسمانوں میں زمیں میں   وہ نکلے آخر اپنے خانۂ دل کے مکینوں میں!

واضح رہے کہ عرش کے جو معانی و مفاہیم بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر مفاہیم ہیں۔ کرسی بھی عرش کے ساتھ

شریک ہے۔ اس میں بھی یہی سلسلۂ کلام جاری ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر ان کے درمیان کچھ فرق ہے تو فقط اس قدر ہے کہ جسم ہونے کی صورت میں کرسی عرش سے بڑی ہے یا عرش کرسی سے بڑا ہے الاخبار والاثار فی ذلك مختلفة والله العالم بالاسرار او نوابه القائمون مقامه من الانبیاء والائمة الاطهار علیهم صلوات الملك الجبار فی آناء اللیل واطراف النهار۔

اظہار حقیقت بعض احادیث میں حاملین عرش ملائکہ کرام کے جو شکل و شمائل بیان کئے گئے ہیں کہ بعض آدمی کی شکل پر ہیں اور بعض پرندے کی شکل میں جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہیں۔ اس کے متعلق ہم حضرت شیخ سعید علیہ الرحمۃ کی تنقید کی تائید کرتے ہیں کہ والاحادیث التی رویت فی صفة الملائکة الحاملین العرش احادیث احاد وروایات افراد لا یجوز القطع بها والوجه الوقوف عندها۔ یعنی جو احادیث حاملانِ عرش ملائکہ کرام کی صفت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ چونکہ یہ اخبارِ احاد ہیں۔ اس لئے ان کے مضمون پر قطع و یقین نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر ہے کہ اس سلسلہ میں توقف سے کام لیا جائے سرکارِ علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے یہ احادیث درج کرنے کے بعد لکھا ہے۔ قد تحمل هولاء الحملة علی ارباب الانواع التی قال بها افلاطون واضرابه وما یظهر من صاحب الشریعة لاینا سب ما ذهبوا الیه کما لا یخفی علی العارف بمصطلحات الفریقین۔ ان حاملین عرش کو ان ارباب انواع پر بھی محمول کیا جاتا ہے جن کے افلاطون اور ان کے ہم خیال حکماء قائل ہیں لیکن جو کچھ صاحب شریعت مقدسہ کی تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ جیسا کہ فریقین (حکماء و ارباب شریعت) کی اصطلاحوں سے واقف کار حضرات پر مخفی نہیں ہے۔

حاملین عرش کے سلسلہ میں جن انبیاء کے اسماء گرامی مذکور ہیں یہ اولوالعزم پیغمبر اور تمام انبیاء کے سردار ہیں۔ چنانچہ اصولِ کافی و تفسیر صافی وغیرہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا جو حضرات انبیاء و مرسلین کے سردار ہیں اور جن پر وحی الٰہی کا دار و مدار ہے اور بمنزلہ قطب اسیائے وحی ہیں وہ پانچ ہیں۔ حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اور یہی حضرات صاحبانِ شریعت ہیں۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے۔ شرع لکم من الدین ما وصّٰی به نوحًا والذی اوحینا الیك وما وصینا به ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ (سورۃ شوریٰ پ۲۵) اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام بزرگواروں سے افضل ہیں۔ کیونکہ اب دیگر حضرات کی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں مگر آپ کی شریعتِ مقدسہ قیامت تک جاری و ساری ہے حلال محمد حلال الی یوم القیامة وحرامه حرام الی یوم القیٰمة (اصول کافی)، ثم جعلناك علی شریعة من الامر فاتبعها۔

باب الاعتقاد فی النفوس والارواح، قال الشیخ اعتقادنا فی النفوس انہا ھی الارواح التی بہا تقوم الحیٰوۃ و انہا

پندرہواں باب نفس اور روح کے متعلق اعتقاد

جناب شیخ اعلی اللہ مقامہ بیان کرتے ہیں کہ نفس کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ نفوس سے مراد وہ ارواح ہیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ اور انہی کے ساتھ اس کا قیام وابستہ ہے مخلوقِ خداوندی میں سب سے پہلے

آں حضرتؐ کے بعد یہ اشرفیت وافضلیت حضرت امیرالمومنینؑ اور دوسرے آئمہ طاہرینؑ کو حاصل ہے۔ تمام انبیاء و مرسلینؑ کے علوم وفضائل اور کمالات کے مع شئی زائد یہی حضرات وارث ہیں اور یہی بزرگوار خداوند عالم کے علم کے خزینہ دار اور اس کے امین اور تمام کائنات عالم پر اس کی حجتیں ہیں۔ فهم خزان علمه فی ارضه وسمائه وامنائه علی وحیه وحججه علی من فوق الارض وما تحت الثری۔

پینتیسویں باب کے ذیل میں ہم جناب رسولِ خدا و آئمہ ہدیٰ کی افضلیت پر تفصیلی دلائل وبراہین پیش کریں گے۔ ان شاء اللہ العزیز فی ذٰلک لآیات لقوم یعقلون۔

پندرہواں باب نفس اور روح کے متعلق اعتقاد

اس باب میں سرکارِ مصنف علامؒ نے چند امور کی طرف اشارہ فرمایا ہے ۱۔ حقیقت نفس وروح ۲۔ اجسام سے پہلے ان کی خلقت ۳۔ فنا اجسام کے بعد ان کی بقا ۴۔ عالم ذر میں ان کا اقرار توحید ۵۔ تناسخ کا ابطال۔

ذیل میں ہم ان تمام امور پر قدرے شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔

حقیقت نفس و روح کا معلوم کرنا بہت مشکل ہے

اتنا تو سب لوگ ہی جانتے ہیں کہ ایک ایسی چیز موجود ہے، جسے ہم لفظ "انا" "من" اور "میں" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے "انا سعیت"۔ "من کوشش نمودم" میں نے کوشش کی۔ وہی چیز جسے "انا" و "من" اور میں سے تعبیر کیا جاتا ہے روح اور نفس ناطقہ کہلاتی ہے اسی سے انسان کی انسانیت ہے۔ اور اسی طرح تکالیف شرعیہ وارد ہوتی ہیں اور اسی پر جزا وسزا کا انحصار ہے۔ لیکن نفس وروح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ مسئلہ ان مسائل مشکلہ ودقائق غامضہ میں سے ہے کہ دنیا کے حکماء وعلماء نے ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ہمیشہ اس کی حقیقت کو معلوم کرنے کیلئے مدتوں سر مارے اور ٹھوکریں کھائیں مگر اس عقدہ دشوار گذار کو طے نہ کر سکے اور نہ ہی آئندہ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ناخن علم وتدبر سے اس عقدہ کو وا کر سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ روح کی حقیقت کا ادراک عام عقل انسانی کی دسترس سے بالاتر ہے

الخلق الاوّل لقول النبیؐ ان اوّل ما ابدع اللّٰہ سبحانہ ھی النفوس المقدسۃ المطھرۃ فانطقھا بتوحیدہ ثم خلق

انہی نفوس کو پیدا کیا گیا۔ جیسا کہ جناب سرور کائناتؐ کا ارشاد ہے سب سے اوّل خدائے تعالےٰ نے مقدس اور پاکیزہ نفوس کو خلق فرمایا اور ان سے اپنی توحید کا اقرار اور عہد لیا بعد ازاں اپنی تمام مخلوقات کو پیدا کیا

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں ؎ کا ینجا ہمیشہ باد بدست است دام را[1]

یہی وجہ ہے کہ جب بھی لوگوں نے انبیاء و مرسلین علیہم السّلام سے رُوح کی حقیقت دریافت کی تو انہوں نے ہمیشہ اس کا مجمل جواب دینے پر اکتفا کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کی حقیقت سمجھنے کی ان لوگوں میں اہلیت وقابلیت ہی نہیں ہے۔ چنانچہ جب یہودیوں نے سرکار ختمی مرتبت صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم سے حقیقتِ رُوح معلوم کرنے کی استدعا کی تو آں جنابؐ نے بحکم الٰہی فقط اتنا جواب دیا کہ رُوح میرے پروردگار کا ایک امر ہے۔ اس سوال وجواب کو قدرت نے ان الفاظ میں قرآن مجید کے اندر بیان کیا ہے۔ یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی اے رسولؐ یہ لوگ تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ رُوح میرے پروردگار کے اُمور میں سے ایک امر ہے۔ پھر قدرت نے تفصیلی جواب دہی سے پہلو تہی کرنے کی وجہ بھی بتا دی کہ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا کہ تمہیں بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے تم اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر و عاجز ہو۔ چنانچہ مشہور ارشاد نبوی (یا علوی)، من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس شخص نے اپنے نفس کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے رب کو پہچان لیا) کے متعلق اکثر علماء محققین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ ارشاد تعلیق الامر علی المحال کی قسم سے ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خداوند عالم کی کنہ حقیقت کی معرفت محال و ناممکن ہے۔ اسی طرح نفس وروح کی کنہ حقیقت معلوم کرنا بھی محال ہے۔ (بحار الانوار ج ۱۴ وغیرہ) لیکن بایں ہمہ چونکہ خالق فطرت نے انسان کی فطرت میں تجسس وجستجو کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت جو کچھ چہل پہل اور رنگ ورونق موجود ہے وہ انسان کی اسی فطری وجبلّی قوت کا نتیجہ ہے۔ اسی فطری تڑپ کا اثر ہے کہ آج چودھویں صدی کا انسان ارضی طاقتوں کو مسخر کرنے کے بعد چاند پر کمند ہمت ڈال رہا ہے۔ بہر کیف ہمیشہ سے انسان کا یہ دستور رہا ہے کہ اسی فطری جذبہ سے سرشار ہو کر بعض ایسی چیزوں کی جستجو بھی شروع کر دیتا ہے جو فی الحقیقت اس کی دسترس سے بالاتر ہوتی ہیں۔ من جملہ ان اُمور کے ایک یہی نفس وروح کی حقیقت معلوم کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ چنانچہ جب سے حضرت انسان نے ہوش سنبھالا

---

[1] بجا اسے اپنی بلند ہمتی کے دام میں گرفتار کر چکا ہے (منہ عفی عنہ)

بعد ذلك سائر خلقه واعتقادنا فيها انها خلقت للبقاء ولم تخلق للفناء لقول النبی ما خلقتم للفناء بل خلقتم للبقاء

نیز نفوس کی بابت ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ انہیں باقی رکھنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے نہ فنا کے واسطے۔ جیسا کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمہیں فنا کے واسطے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ تمہاری پیدائش بقاء کے لئے ہوئی ہے

ہے۔ وہ حقیقتِ روح کو اپنے دامِ عقل و دانش میں گرفتار کرنے کی جستجو میں مشغول رہا ہے۔ چنانچہ حکماء و فلاسفروں کے آراء و انظار اس سلسلہ میں دس بیس نہیں، سو دو سو نہیں بلکہ بقول علامہ خوارزمی (در کتاب مفید العلوم و مبید الہموم ص طبع مصر) سو تک پہنچ چکے ہیں۔ لیکن شوقِ تجسس و جستجو کا پھر بھی یہ عالم ہے کہ ہنوز روزِ اوّل است والا معاملہ ہے۔ اور یہ اختلافات مختلف نوعیت کے ہیں۔ مثلاً پہلا اختلاف تو حقیقتِ روح کے متعلق ہے کہ وہ کیا ہے؟ دوسرا اختلاف اس کے حدوث و قدم کے بارے میں ہے کہ آیا روح قدیم ہے یا حادث؟ تیسرا اختلاف یہ ہے کہ آیا وہ فانی ہے یا باقی۔ اور اگر باقی ہے تو فنا بدن یعنی موت کے بعد کہاں جاتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بیسیوں اختلافات ہیں جن سے کتب لبریز ہیں۔ بہرحال چونکہ سرکار مصنّف علام اس مسئلہ کو متعرض ہوئے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اور بھی بعض مسائل معرضاً آ گئے ہیں۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ ان مباحث میں سرکار شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اپنی شرح میں حضرت مصنّف پر بڑی نکتہ چینی فرمائی ہے۔ اس لئے بعون اللہ تعالیٰ ارشادات معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین کی روشنی میں بقدر وسعت و طاقت اس مسئلہ اور دیگر ضمنی مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ یہ کفرانِ نعمت ہوگا۔ اگر ہم یہ اعتراف نہ کریں کہ اس مرحلہ میں ہم نے علاوہ دیگر بیسیوں کتب کے خاص طور پر بحار الانوار جلد چہاردہم، انوار نعمانیہ اور رسالہ شریفہ ابطالِ تناسخ سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔ شکر اللہ مساعی مولفیہا رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اطلاقاتِ روح

لفظ روح عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی زبان میں بالعموم اور قرآن و حدیث میں بالخصوص علاوہ اس معنی کے جو اس وقت محلِ بحث ہے اور متعدد معانی پر اس کا اطلاق ہوا ہے یہاں صرف چند معنوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ (عند البعض)

(۱) بمعنی قرآن۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے وکذلک اوحینا الیک روحاً من امرنا (سورہ شوریٰ) اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے قرآن کو بطور وحی تم پر نازل کیا۔

(۲) بمعنی وحی۔ ارشادِ قدرت ہے۔ یلقی الروح من امرہ علی من یشاء (مومن پ ۲۴) خداوند عالم اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی نازل کرتا ہے۔

(۳) بمعنی ایمان۔ قرآن مجید میں وارد ہے۔ وایدھم بروح منہ (مجادلہ) خدا نے ان کی روح یعنی ایمان

وانما تنقلون من دار الی دار و انها فی الارض غریبة و فی الابدان مسجونة واعتقادنا فیها انها اذا فارقت الابدان	ہاں تم ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہو جاتے ہو۔ یہ نفوس و ارواح زمین میں مسافر اور بدنوں میں بمنزلہ قیدی کے ہیں، ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے کہ جب یہ ارواح بدنوں سے علیحدہ ہوتی ہیں

سے مدد کی۔

(۴) بمعنی نور، چنانچہ کہا جاتا ہے۔ خرج منه روح الایمان۔ یعنی اس سے نور ایمان سلب ہوگیا۔

(۵) جناب جبرئیل پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ قل نزّله روح القدس من ربّك (نحل) اے رسول کہہ دو اس (قرآن) کو روح القدس (جبرئیل) تمہارے پروردگار کی طرف لایا ہے۔

(۶) اس کا اطلاق اس فرشتہ پر بھی ہوا ہے جو جسامت اور قد و قامت میں جناب جبرئیل و میکائیل سے بھی بڑا ہے۔ تنزّل الملئكة والرّوح فيها۔ شب قدر کو عام فرشتے اور روح نامی فرشتہ نازل ہوتے ہیں۔

(۷) بمعنی رحمت جیسا کہ بعض مفسرین نے اس آیت میں لکھا ہے ینزّل الملئكة بالرّوح من امره (سورہ نمل) خدائے تعالیٰ رحمت کے ساتھ فرشتوں کو نازل کرتا ہے۔

(۸) حضرت عیسیٰ پر بھی روح کا اطلاق ہوا ہے۔ کلمة الله و روح منه (سورۃ نسا) جناب عیسیٰ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں۔ الی غیر ذلك من الاطلاقات۔

رُوح کے متعلق چار اہم اقوال کا بیان

ویسے تو روح کے متعلق سینکڑوں اقوال و نظریات موجود ہیں جیسا کہ ابھی اُوپر اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان اقوال میں سے جو قول زیادہ مشہور اور اہم ہونے کی وجہ سے زیادہ قابل توجہ ہیں وہ چار ہیں۔

اوّل۔ یہ کہ روح اس کیفیت کا نام ہے جو عناصر کی ترکیب کے بعد پیدا ہوتی ہے جسے اطبا مزاج کہتے ہیں خلاصہ یہ کہ رُوح بمعنی مزاج ہے۔

دوم۔ یہ کہ روح اور بدن ایک ہی چیز ہے۔ یعنی اسی ہیکل محسوس و مشاہد جسے بدن کہتے ہیں، کا دوسرا نام رُوح ہے۔

سوم۔ یہ کہ رُوح ایک جوہر درّاک ہے جس کا تعلق بدن کے ساتھ تدبیر و تصرف والا ہے اس تعلق کے انقطاع کا نام موت ہے اور یہ جوہر مادہ جسمانیہ اور اس کے عوارض سے منزّہ و مبّرا ہے۔

چہارم۔ یہ کہ رُوح ایک جوہر درّاک ہے لیکن وہ ایک لطیف و نورانی جسم رکھتا ہے جو بدن میں اس طرح جاری

فھی باقیۃ منھا منعمۃ و منھا معذبۃ الی ان یردھا اللہ عزّو جلّ بقدرتہ الی ابدانھا و قال عیسی بن مریم للحواریین

تو وہ اس حالت میں باقی رہتی ہیں کہ بعض منعم رہتی ہیں اور بعض مبتلائے عذاب۔ آخر کار خداوند عالم اپنی قدرت کاملہ سے ان کو ان کے اصلی بدنوں کی طرف لوٹا دے گا۔ حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں سے فرمایا میں تم سے سچی بات کہتا ہوں

ساری ہوتا ہے جیسے گل گلاب کے اندر پانی یا تلوں میں تیل اور انگارہ میں آگ اس کے جسم سے خارج ہو جانے سے موت واقع ہوتی ہے۔

پہلا قول بعض حکماء اور اکثر اطباء کا ہے۔ دوسرا قول طبیعیین و دہریین کا ہے۔ تیسرا قول علماء اشراقیین اور اکثر متکلمین اور کثیر علماء امامیہ کا ہے۔ اور چوتھا قول بعض محققین علماء امامیہ اور بعض حکماء ربانیین کا مختار ہے۔

اب ہم ان چہارگانہ اقوال میں سے جو قول عقل و نقل کی رو سے صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اثبات کے ساتھ ساتھ دوسرے اقوال کے ابطال پر بھی چند دلائل پیش کرتے ہیں۔

پہلے قول کا ابطال

یہ قول بچند وجہ باطل ہے

دلیل اول۔ یہ کہ مزاج وقتاً فوقتاً تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے کبھی حرارت زیادہ ہو جاتی اور کبھی برودت کبھی یبوست کم ہو جاتی ہے اور کبھی رطوبت وعلیٰ ہذا القیاس مگر روح میں اس قسم کا کوئی تغیر نہیں ہوتا اس کے ادراک کی کیفیت ہر حال میں برابر باقی رہتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ روح اور چیز ہے اور مزاج اور چیز!!

دلیل دوم۔ اگر روح اور مزاج ایک ہوتے تو لازم تھا کہ دونوں کا فعل و مقتضاء بھی ایک ہی ہوتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ روح کی خواہش کچھ اور ہوتی ہے اور مزاج کا اقتضاء کچھ اور۔ مثلاً مزاج انسانی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اگر بلندی پر ہو تو پستی کی طرف آئے لیکن ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ عین اس وقت روح بلندی کی طرف جانے کی خواہش کرتی ہے اور انسان اوپر سے اوپر چڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح مزاج کا تقاضا سکون ہے۔ کیونکہ اس میں ارضی مادہ غالب ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب روح خواہش کرتی ہے تو بدن حرکت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح کسی رعشے والے انسان کو دیکھیے اس کا بدن حرکت کر رہا ہے مگر اس کے روح کی یہ خواہش ہے کہ سکون اختیار کرے پس جب مزاج و روح کے آثار اور تقاضے علیحدہ علیحدہ ہیں تو پھر دونوں کو ایک شی کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے؟

دلیل سوم۔ موجودہ دور میں تو یہ امر حیات میں داخل ہو۔ کہ روح کی حقیقت مزاج اور جسم کے علاوہ ہے علم احضار ارواح کی وجہ سے بڑے بڑے منکرین روح بھی اس کے وجود کا اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بلکہ ان

بحق اقول لکم انہ لا یصعد الی السماء الا ما نزل منہا و قال اللہ جل ثنائہ ولو شئنا لرفعنا بہا و لکنہ اخلد الی الارض

آسمان کی طرف وہی چیز بلند ہوتی۔ جو وہاں سے نازل ہوتی ہے۔ خداوند عالم اپنی کلام میں ارشاد فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اس (بلعم بن باعور) کو اپنی آیات کے سبب بلند مرتبہ عطا کر دیتے لیکن اس نے تو خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہوئے مادی زندگی کی

میں سے بعض منکرین خدا کے وجود کا بھی اعتراف کر رہے ہیں۔ اور اپنے سابقہ نظریہ کہ ہر موجود شئی کے لئے دکھائی دینا ضروری ہے کو غلط ماننے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

دوسرے قول کا ابطال

یہ قول بچند وجوہ درجہ اعتبار سے ساقط ہے۔

دلیل اول۔ یہ امر بداہتہً معلوم ہے اور کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں کہ جسم انسانی متغیر ہوتا رہتا ہے کبھی موٹا ہے کبھی کمزور۔ کبھی بڑھ رہا ہے اور کبھی گھٹ رہا ہے۔ کبھی تندرست ہے۔ اور کبھی بیمار لیکن رُوح بدن کے ان تمام حالات میں ایک ہی حالت پر باقی رہتی ہے۔ اس سے یہ قطعی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جسم اور روح ایک چیز نہیں بلکہ الگ الگ دو حقیقتیں ہیں۔

دلیل دوم۔ ہر آدمی اپنے تمام اعضاء و جوارح کو اپنے نفس و روح کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے میرا سر۔ میرے پاؤں۔ میرے ہاتھ۔ میرا بدن۔ ظاہر ہے کہ جسے منسوب کیا جا رہا ہے۔ یہ اور چیز ہے اور جس کی طرف نسبت دی جا رہی ہے وہ چیز دیگر ہے۔ کسی صورت میں دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔

دلیل سوم۔ جسم کے اعتبار سے سب افراد انسانی زید۔ بکر۔ عمر۔ وغیرہ برابر ہیں جنسیت و نوعیت میں مساوی ہیں لیکن بایں ہمہ وہ پھر بھی باہم مختلف ہیں وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے زید اپنے تئیں عمر کا غیر سمجھتا ہے اور عمر اپنے آپ کو بکر کا غیر تصور کرتا ہے؟ پس معلوم ہوا کہ جسم کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے ایک ہی نوع کے افراد کے درمیان اختلاف و افتراق پایا جاتا ہے۔ اور وہ چیز وہی ہے جسے عربی میں "انا" فارسی میں "من" اور اُردو میں "میں" کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کو ہم نفس ناطقہ یا روح کہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جس چیز کی وجہ سے مشارکت ہے وہ اور ہے اور جس کی وجہ سے مفارقت ہے وہ اور ہے۔

دلیل چہارم۔ یہ امر بدیہی ہے کہ انسان کی کیفیت زندگی اور موت میں یکساں نہیں ہوتی۔ زندگی میں وہ کلام کرتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ ادراک و تعقل کرتا ہے وغیرہ وغیرہ اور مرنے کے بعد باوجودیکہ وہی بدن موجود ہے۔ لیکن ان افعال میں سے کوئی فعل اب اس سے صادر نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ زندگی میں اس کے جسم کے اندر جسم کے علاوہ کوئی اور شئے ایسی تھی جس کی وجہ سے اس سے یہ افعال صادر ہوتے تھے۔ جس کے چلے جانے

وانتم هو به فما لم یرفع منها الی الملکوت بقی یهوی فی الهاویۃ وذٰلک ان الجنۃ درجات والنار درکات وقال عزّ وجلّ تعرج

طرف جھکاؤ اختیار کیا پس ہر وہ چیز جو عالم ملکوت کی جانب بلند نہیں کی جاتی وہ آتش جہنم میں ڈالی جاتی ہے۔ کیونکہ بہشت میں بہت سے (اُونچے) درجات ہیں اور دوزخ میں بہت سے (نچلے) درکات ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے ملائکہ اور روح اس کی

کے بعد اب جسم بے کار ہو گیا ہے وہی دوسری چیز نفس ناطقہ اور رُوح ہے۔ پس اس سے روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ جسم اور ہے۔ اور رُوح اور جو دونوں کو ایک سمجھتا ہے گویا وہ موت و حیات میں فرق نہیں کرتا۔

تیسرے قول یعنی روح کے مجرد ہونے پر دلائل

دلیل اوّل۔ روح اپنے افعال میں مادہ کی محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا فعل ادراک و علم ہے۔ اور جب وہ اپنی ذات کا علم حاصل کرتی ہے تو اس وقت اس کو کسی آلہ جسمانی کے استعمال کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ پس جب وہ اپنے فعل میں محتاج مادہ نہیں تو اسے مجرد تسلیم کرنا پڑے گا۔

دلیل دوم۔ اگر روح مادی ہوتی تو چاہیے تھا کہ جسم کے قوی ہونے کے ساتھ قوی اور کمزور پڑ جانے کے ساتھ کمزور پڑ جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جُوں جُوں جسم بوجہ قلتِ غذا کمزور ہوتا جاتا ہے اور کثافت جسمانیہ کم ہوتی جاتی ہے۔ رُوح قوی سے قوی تر ہوتی جاتی ہے۔ جیسا کہ اہل ریاضات کرتے ہیں اور اس وقت ان پر عجیب غریب نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ ادراک و تعقل کی حدت بڑھ جاتی ہے۔ کثرت غذا وغیرہ سے جس قدر جسم کا ثقل اور اس کی کثافت بڑھتی جائے۔ اسی قدر روح ضعیف اور کمزور ہوتی جاتی ہے اور اس کا ادراک و علم کم ہوتا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ رُوح مادی نہیں بلکہ مجرّد ہے۔

دلیل سوم۔ مادی و جسمانی چیز کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جس قدر زیادہ کام کرے اسی قدر زیادہ تھک جاتی ہے۔ لیکن رُوح کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کا کام یعنی اس کے ادراکات جس قدر بڑھتے جاتے ہیں۔ اسی قدر اس میں اور زیادہ قوت اور بالیدگی آتی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روح اور جسم کی اصل حقیقت میں فرق ہے۔ یعنی جسم مادی ہے اور روح مجرد۔

دلیل چہارم۔ مادی اشیاء خود اپنا ادراک و احساس نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ مادہ میں شعور نہیں ہے۔ لیکن روح کو ہر وقت اپنا احساس و علم ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ روح مادی نہیں ہے۔

دلیل پنجم۔ جسم اور جسمانی چیزوں کی قوتیں محدود ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کے افعال بھی محدود ہوتے ہیں۔ لیکن رُوح اور نفسِ ناطقہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کے معلومات و مدرکات غیر محدود ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ

الملٰئکۃ والروح الیہ۔ وقال ان المتقین فی جنات ونھر فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر وقال ولاتحسبن الذین

طرف بلند ہوتے ہیں یعنی اپنی مقررہ جگہ پر جاتے ہیں پھر فرماتا ہے۔ متقی و پرہیزگار اپنے قادر مطلق بادشاہ کے پاس جنت کے باغوں اور نہروں میں بہترین مقامات میں قیام پذیر ہوں گے ایک اور مقام پر فرماتا ہے جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کئے گئے انہیں مردہ

جسم و روح کی حقیقت مختلف ہے۔ لہٰذا جب جسم مادی ہے تو روح کو مجرد ماننا پڑے گا۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

روح کے مجرد ماننے پر بالعموم اسلامی حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ خداوند عالم کی ذات مجرد ہے۔ لہٰذا اگر روح یا کسی اور چیز کو بھی مجرد تسلیم کر لیا جائے تو اس میں شرک لازم آتا ہے کیونکہ بنابریں خدا و روح کا جسم نہ رکھنے میں اشتراک لازم آتا ہے۔ لیکن عند التحقیق یہ شبہ بالکل کمزور ہے اور بچند وجہ مدفوع ہے۔

اولاً۔ اس لئے کہ یہ مساوات صفات سلبیہ میں ہے کہ خدا تعالےٰ بھی جسم نہیں رکھتا۔ اور روح بھی جسم نہیں رکھتی۔ اور یہ امر اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے کہ صفات سلبیہ میں مساوات مماثلت ومشابہت کی متقاضی نہیں ہے ایسا سمجھنا فاحش غلطی ہے کیونکہ اگر صفات سلبیہ میں مساوات بھی مشابہت ومماثلت کی متقاضی ہو تو پھر لازم آئے گا کہ تمام مختلف ماہیات وحقائق مساوی ہو جائیں۔ کیونکہ بعض سلوب میں وہ مشترک ہوتی ہیں۔ آپ جو بھی دو مختلف ماہیتیں لے لیں۔ اور نہیں تو کم از کم یہ دونو اس بات میں تو ضرور ہی شریک ہوں گی کہ ان دونوں میں ایک تیسری ماہیت والے خواص وآثار نہیں پائے جاتے۔ مثلاً گھوڑا اور گدھا دو مختلف نوعیں ہیں۔ لیکن ان صفات کے نہ پائے جانے میں باہم شریک ہیں جو انسان میں پائی جاتی ہیں مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کیطرح دو قدموں پر نہیں چلتے یا انسان علم وعقل کا حامل ہے لیکن گھوڑا اور گدھا عقل وعلم نہیں رکھتے وعلیٰ ہذا القیاس اب گھوڑا اور گدھا کئی سلبی صفات میں باہم شریک ہیں۔ لیکن پھر بھی گھوڑا گھوڑا ہے اور گدھا گدھا۔ پس معلوم ہوا کہ صفاتِ سلبیہ میں اشتراک مشابہت ومماثلت کا متقاضی نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ گھوڑا اور گدھا ایک ہو جائیں۔

ثانیاً۔ اس لئے کہ اگر روح کو مجرد تسلیم کر لیا جائے تو اس سے شرک لازم نہیں آتا کیونکہ جس طرح خالق ومخلوق کی دوسری مشترکہ صفات جیسے سمع وبصر اور علم وقدرت وغیرہ کے معانی میں اختلاف ہے کہ جن معنوں کے اعتبار سے خدا سمیع و بصیر اور علیم وقدیر ہے۔ ان معنوں کے اعتبار سے مخلوق سمیع وبصیر نہیں ہے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خالق کے تجرد اور روح کے تجرد کی حقیقت میں بھی اختلاف ہو۔ فقط لفظی اشتراک کی وجہ سے حقیقت میں اشتراک لازم نہیں۔ کما لایخفیٰ۔ اگرچہ اس قول کو بالکل غلط محض تو قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ مگر چوتھا قول اقرب الی الصواب ہے۔ جیساکہ ذیل میں عنقریب واضح ہوگا۔ یہاں مذکورہ بالا ادلّہ کی صحت وسقم پر مزید نقض وابرام کی گنجائش نہیں ہے۔

ولا تحسبن الذين قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما اتاھم اللہ من فضلہ

خیال نہ کرو کیونکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے رزق پا رہے ہیں۔ اور خدائے عزوجل نے اپنے فضل و کرم سے جو کچھ انہیں عطا کیا ہے اس پر وہ خوش و خرم ہیں

چوتھے قول یعنی روح کے جسم لطیف نورانی ہونے پر دلائل

دلیل اوّل۔ ہر آدمی یقیناً جانتا ہے کہ وہ چیز جسے "انا" یا "من" یا "میں" کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے وہ صفاتِ جسمانیہ کے ساتھ متصف ہوتی رہتی ہے۔ جیسے نقل و انتقال اور قیام و قعود وغیرہ مثلاً کہا جاتا ہے۔ میں بیٹھا ہوں، میں کھڑا ہوں، میں جا رہا ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز جسم کی صفات کے ساتھ متصف ہو وہ جسم ہی ہوتی ہے۔

دلیل دوم۔ یہ کہ روح کلیات و جزئیات ہر دو کو ادراک کرتی ہے۔ جیسے آگ گرم ہے اور پانی ٹھنڈا ہے۔ اور یہ آگ گرم ہے اور یہ پانی ٹھنڈا ہے۔ اور یہ امر اپنے مقام پر واضح ہو چکا ہے کہ مدرک جزئیات جسم ہی ہوتا ہے۔ علاوہ بریں جزئی ادراک تو حیوانات میں بھی موجود ہے۔ لیکن ان کے اندر تو کوئی شخص روح مجرد کا قائل نہیں ہے۔

دلیل سوم۔ یہ قول آیات و اخبار سے مستنبط ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس قول کے قائلین کے پاس اگر کوئی بہترین دلیل ہے تو وہ دلیل نقلی ہی ہے کیونکہ آیات و روایات میں روح کے جو خواص و آثار بیان کئے گئے ہیں وہ اس کی جسمانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً احتجاج طبرسی میں بروایت ہشام بن الحکم حضرت صادق علیہ السلام کی ایک طویل حدیث مروی ہے جو ایک زندیق کے جواب میں آں جناب نے ارشاد فرمائی۔ اس میں ایک جگہ آنجناب روح کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں والروح جسم رقیق قد البس قالباً کثیفاً۔ یعنی روح ایک جسم لطیف ہے۔ جس پر ایک جسم کثیف (بدن) کا خول چڑھا دیا گیا ہے یا جیسے وہ حدیث جو کتاب منتخب بصائر الدرجات میں بروایت جناب مفضل حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا مثل روح المومن و بدنہ کجوھرۃ فی صندوق اذا اخرجت الجوھرۃ منہ طرح الصندوق۔ مومن کی روح اور اُس کے بدن کی مثال ایک قیمتی جوہر اور صندوق کی سی ہے کہ جب اس سے وہ نفیس جوہر نکال لیا جائے تو صندوق پھینک دیا جاتا ہے اس حدیث سے بھی ظاہر ہے کہ روح بدن کے اندر داخل ہے نہ یہ کہ اس سے خارج ہے اور بدن سے فقط تدبیر و تصرف والا تعلق رکھتی ہے جیسا کہ اس تیسرے قول کے قائلین کا خیال ہے۔

دلیل چہارم۔ وہ روایات جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ارواح کو ابدان سے دو ہزار سال قبل پیدا کیا گیا (جیسا کہ اس کی تفصیل عنقریب آرہی ہے) اسی طرح وہ احادیث جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ روحیں بدن کے

وقال تعالیٰ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات الخ وقال النبی الارواح

اسی طرح ایک جگہ فرمایا جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ نہ سمجھو کیونکہ وہ زندہ ہیں۔ صرف بات یہ ہے تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

فنا ہو جانے کے بعد باقی رہتی ہے۔ مثلاً وارد ہے کہ رُوح دفن تک جنازہ کے اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے۔ پھر اسے جنّت یا دوزخ میں داخل کیا جاتا ہے یا اس قسم کی اور احادیث جن میں رُوح کے لئے اجسام وابدان والے صفات و خواص بیان کئے گئے ہیں۔ اسی طرح آیت مبارکہ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ میں نفس مطمئنہ یعنی روح کو خطاب کیا گیا ہے اور اسے عباد الرحمٰن کے ساتھ جنّت میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح قبض روح کی جو کیفیت آیت کلا اذا بلغت الحلقوم وغیرہ آیات وروایات میں مذکور ہے اس سے بھی تجسم روح ظاہر ہوتا ہے۔ بہر حال ان تمام امور سے واضح ہوتا ہے کہ روح مجرد محض نہیں ہے بلکہ وہ ایک قسم کا لطیف اور نورانی جسم ضرور رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے متشرعین اور علماء ربانیین نے اسی قول کی طرف رجحان ومیلان فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ بھی اسی قول کے قائل ہیں۔ جیسا کہ ان کے رسالہ اجوبہ مسائل الرائیہ سے ظاہر ہے (علی ما نقل عنہ) علامہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں اسی قول کی طرف اپنے رجحان کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے آیت مبارکہ یسئلونک عن الروح کی تفسیر ج ۵ ص۴۱۱ طبع مصر میں مفصل بحث کرتے ہوئے اس قول کے متعلق لکھا ہے۔ فھذا مذھب قوی شریف یجب التامل فیہ فانہ شدید المطابقۃ لما ورد فی الکتب الالٰھیۃ من احوال الحیٰوۃ والموت۔ یعنی روح کے بارے میں یہ مذہب بہت ہی قوی اور متین ہے۔ اس میں غور وفکر واجب ولازم ہے۔ کیونکہ یہ قول ان مطالب سے جو کتب الٰہیہ میں وارد ہوئے ہیں۔ جیسے موت وحیات کی کیفیت وغیرہ بہت مطابقت ومناسبت رکھتا ہے۔ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے بحار الانوار کی چودھویں جلد میں نفس وروح کے مباحث کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اپنی تحقیق انیق کا یوں اظہار فرمایا ہے۔ اقول بعد ما احطت خبراً بما قیل فی ھذا الباب من الاقوال المتشتتۃ والآراء المتخالفۃ وبعض دلائلھم علیھا لا یخفی علیک انہ لم یقم دلیل عقلی علی التجرد ولا علی المادیۃ و ظواھر الآیات والاخبار تدل علی تجسم الروح والنفس وان کان بعضھا قابلاً للتاویل وما استدلوا بہ علی التجرد لا یدل دلالۃ صحیحۃ علیہ وان کان فی بعضھا ایماء الیہ فما یحکم بہ بعضھم من تکفیر القائل بالتجرد افراط وتحکم کیف وقد قال بہ جماعۃ

جنود مجندة فما تعارف منها ائتلف وما تناكر منها اختلف وقال الصادق ان الله آخى بين الارواح

ارشاد فرماتے ہیں کہ روحوں کے متعدد لشکر ہیں جن لوگوں کی روحوں میں باہمی تعارف تھا یہاں بھی ملے جلے رہتے ہیں اور جن کی روحوں میں باہمی نفرت تھی وہ لوگ یہاں بھی ایک دوسرے سے متنفر رہتے ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

من علماء الامامية وغيرهم وجزم القائلين بالتجرد ايضا محض شبهات ضعيفة مع ان ظواهر الآيات والاخبار تنفيه ايضا جرأة وتفريط فالامر مردد ان يكون جسما لطيفا نورانيا ملكوتيا داخلا في البدن تقبضه الملائكة عند الموت وتبقى معذباً او منعما بنفسه او بجسد مثالي يتعلق به كما مر في الاخبار او يلهى عنه الى ان ينفخ في الصور كما في المستضعفين ولا استبعاد في ان يخلق الله جسما لطيفا يبقيه ازمنة متطاولة كما يقول المسلمون في الملائكة والجن ويمكن ان يرى في بعض الاحوال بنفسه او بجسده المثالي ولا يرى في بعض الاحوال بنفسه او بجسده بقدرة الله سبحانه او يكون مجردا يتعلق بعد قطع تعلقه عن جسده الاصلي بجسده المثالي ويكون قبض الروح وبلوغه الحلقوم وامثال ذلك تجوزاً عن قطع تعلقها واجرى عليها احكام ما تعلقت اولاً به وهو الروح الحيواني البخاري مجازاً

یعنی حقیقت روح کے متعلق آراء مختلفہ و اقوال متفرقہ اور فریقین کے بعض دلائل و براہین معلوم کر لینے کے بعد تم پر یہ بات واضح و آشکار ہو گئی ہوگی کہ روح کے مجرد و مادی ہونے پر کوئی (ناقابل تردید) دلیل عقلی قائم نہیں ہو سکی ہاں آیات و روایات کے ظواہر روح کے جسم ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بھی بعض قابل تاویل ہیں۔ تجرد روح کے قائلین نے اس کے تجرد پر جو دلائل قائم کئے ہیں وہ اس پر صریحی دلالت نہیں کرتے اگرچہ ان میں فی جملہ اس مطلب کی طرف کچھ تھوڑا سا اشارہ پایا جاتا ہے۔ لہذا تجرد روح کے قائلین پر کفر و شرک کا جو حکم لگایا جاتا ہے یہ محض افراط و سینہ زوری ہے جب کہ جید علماء امامیہ کی ایک جماعت اس امر کی قائل ہے اسی طرح تجرد کے قائلین کا اپنے نظریہ پر جزم و یقین بھی جو کہ محض بعض شبہات ضعیفہ پر مبنی ہے۔ حالانکہ ظواہر آیات و روایات اس کی نفی کر رہے ہیں سراسر تفریط اور جسارت ہے۔ بعد ازیں حقائق حقیقت امر دو حال سے خالی نہیں یا تو روح ایک جسم لطیف نورانی ملکوتی ہے جو بدن میں داخل ہے جسے موت کے وقت فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور پھر عالم برزخ میں قیامت تک بنفسہ یا جسم مثالی کے ذریعہ منعم یا معذب رہتا ہے جیسا کہ روایات میں گذر چکا ہے

في الاظلة قبل ان يخلق الابدان
بالفي عام فلو قد قام قائمنا
اهل البيت لورث الاخ الذي
آخى بينهما في الاظلة ولم يورث

کہ خداوند عالم نے عالم ظلال و اشباح (عالم ذر) میں جسموں کی
پیدائش سے دو ہزار سال قبل روحوں کے درمیان اخوت اور
بھائی چارہ قائم کیا جب ہمارے قائم آل محمد علیہ السلام کا دورِ
سلطنت آئے گا تو وہ لوگ جو عالم ذر میں ایک دوسرے کے

یا اس عالمِ برزخ میں نفخ صور تک اس سے بالکل غفلت برتی جاتی ہے (نہ اسے جزا دی جاتی ہے اور نہ سزا) جیسا کہ مستضعفین کے بارے میں وارد ہے۔ اور اس قول میں ہرگز کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ خلاقِ عالم ایک جسمِ لطیف پیدا کر دے اور زمانہائے دراز تک اسے باقی رکھے۔ جیسا کہ مسلمانوں کا ملائکہ اور جنات کے متعلق یہی عقیدہ ہے اور وہ جسمِ لطیف قدرتِ خداوندی سے بعض اوقات بنفسہٖ اور بعض اوقات جسمِ مثالی کے ذریعہ بعض اشخاص کو دکھائی بھی دے اور بعض حالات میں دکھائی نہ دے یا پھر یہ روح مجرد ہے جسمِ اصلی سے قطع تعلق کے بعد جسمِ مثالی کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتی ہے۔

بنا بریں شق روح کا قبض ہونا اور (بوقتِ مرگ) اس کا حلقوم تک پہنچنا حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے بدن سے تعلق قطع کرنے کا کنایہ ہے یا اس روح مجرد پر روح بخاری (جو کہ مادی ہے) والے احکام مجازاً جاری کئے گئے ہیں۔ علامہ سید نعمت اللہ الجزائری علیہ الرحمہ، انوار نعمانیہ میں مباحثِ نفس و روح میں اپنی تحقیق پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

والانصاف ان الروح وان طوى عنا الاطلاع على حقيقتها ولذا قال الاكثر المراد من قوله عليه السلام من عرف نفسه فقد عرف ربه انه لا يمكن معرفة النفس كما لا يمكن معرفة الرب لكن الذي اشارت اليه الكتب والاخبار على ما قيل انه يقرب من المذهب السابع وهو انها جسم لطيف سائر في البدن وليست مجردة ۔ انصاف یہ ہے کہ اگرچہ روح کی حقیقت ہم پر مخفی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء نے حدیث "من عرف نفسہ" الخ کے یہ معنی کئے ہیں کہ جس طرح خداوند عالم کی حقیقی معرفت ناممکن ہے۔ اسی طرح نفس (روح) کی حقیقی معرفت بھی ناممکن ہے مگر کتب سماویہ اور اخبار نبویہ و ولویہ سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے وہ روح کے متعلق ساتویں نظریہ کے قریب تر ہے یعنی یہ کہ روح ایک جسم لطیف ہے جو جسم کے اندر جاری و ساری ہے اور وہ مجرد محض نہیں ہے۔ انہی علامہ جزائری مرحوم نے انوار نعمانیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ونقل من شيخنا المفيدؒ انه كان يقول بتجرد النفس فتاب الى الله سبحانه وقال قد ظهر لنا انه

الاخ من الولادة وقال الصادقؑ ان الارواح تلتقی فی الهوا فتعارف وتسائل فاذا اقبل روح من الارض فقالت الارواح

بھائی بن چکے ہیں، وہ ایک دوسرے کے وارث نہ بنائے جائیں گے۔ اور نسبی بھائیوں کو محروم رکھا جائیگا انہی جناب سے یہ بھی مروی ہے فرمایا روحیں ہوا میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتی ہیں اور ایکدوسرے کو پہچان کر سوال و جواب بھی کرتی ہیں جبکہ کوئی روح زمین سے جا کر ان

لو مجرد فی الوجود الا اللہ ۔ یعنی حضرت شیخ مفیدؒ کے متعلق منقول ہے کہ وہ پہلے نفس کے مجرد ہونے کے قائل تھے پھر بارگاہ الٰہی میں اس قول سے توبہ کی اور فرمایا اب ہم پر یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ سوائے خداوند عالم کے کائنات میں اور کوئی چیز مجرد محض نہیں ہے۔ لہٰذا ان حقائق سے واضح و آشکار ہو گیا کہ اگرچہ تیسرے قول کی بالکل نفی نہیں کی جا سکتی مگر جو کچھ ظواہر قرآن و حدیث سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ چوتھا قول ہی اقرب الی الحق والصواب ہے اور اسی قول کو سرکار علامہ مجلسی نے ایک مقام پر ما هو الاصوب کہہ کر اختیار فرمایا ہے۔

جناب علامہ سید علی خان شرح صحیفہ سجادیہ صفحہ پر تحریر فرماتے ہیں۔ قال بعض علمائنا المتاخرین المستفاد من الاخبار عن الائمۃ الاطہار ان الروح جسم مثالی علی صورۃ البدن وکذلک عرفہ المتالہون لمجاہداتہم وحققہ المحققون بمشاہداتہم فهو لیس بجسمانی محض ولا بعقلانی صرف بل برزخ بین الامرین ومتوسط بین النشاتین من عالم الملکوت الخ۔ ہمارے بعض علماء متاخرین نے فرمایا ہے کہ روح کے متعلق جو کچھ آئمہ اطہار کے اخبار سے واضح و آشکار ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روح بدن کی شکل و صورت پر ایک جسم مثالی ہے۔ اسی طرح متالہین نے اپنے مجاہدات سے اور محققین نے اپنی تحقیقات سے اس کی معرفت کرائی ہے پس بنابریں روح نہ تو بالکل جسمانی ہے اور نہ بالکل عقلانی بلکہ ان ہر دو کے بین بین ہے واللہ العالم بحقائق الامور۔

روح کے قدیم و حادث ہونے کی بحث

چونکہ مصنف علامؒ نے اس بحث کی طرف بھی لطیف اشارہ فرمایا ہے۔ لہٰذا روح کی بحث نامکمل رہے گی۔ اگر اس امر پر بھی کچھ روشنی نہ ڈالی جائے۔ اس سلسلہ میں بہت اختلاف ہے کہ آیا روح قدیم ہے یا حادث۔ اور اگر حادث ہے تو پھر جسم سے پہلے پیدا ہوئی ہے یا جسم کی خلقت کے ساتھ۔ حکماء یونان اور ہنود جو کہ تناسخ ارواح کے قائل ہیں وہ روح کو قدیم اور ازلی و ابدی جانتے ہیں لیکن بعض حکماء یونان اور تمام ارباب ملل اس کے حدوث پر متفق ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک سوائے خداوند عالم کے اور کوئی قدیم نہیں ہے۔ ہاں ان کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا وہ خلقت جسم سے قبل پیدا ہوئی ہیں یا خلقت جسم کے ساتھ تو اس سلسلہ میں مسلمان علماء محققین اس بات کے قائل ہیں کہ ارواح کی خلقت اجسام کی

دعوه فقد افلت من هول عظیم ثم سئلوه ما فعل فلان وما فعل فلان فکلما قال قد بقی رجوه ان یلحق بهم وکلما قال قد مات قالوا هوی هوی قال له ومن یحلل علیه غضبی فقد هوی وقال	میں جاملتی ہے تو وہ روحیں ایک دوسری سے کہتی ہیں کہ چونکہ یہ بہت ہی خوفناک مرحلے سے گلو خلاصی کرا کے آئی ہے اس لئے ابھی اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ پھر اس سے وہ احوال پرسی کرتی ہیں کہ فلاں شخص کس حال میں ہے اور فلاں کا کیا بنا۔ اگر نئی روح یہ جواب دے کہ وہ ابھی زندہ ہے تو وہ ارواح اُمید رکھتی ہیں کہ ایک دن آئے گا، اور اگر وہ یہ کہہ دے کہ وہ مر گیا تو روحیں کہتی ہیں (افسوس) وہ ہلاک ہوا، ہلاک ہوا چنانچہ

خلقت سے پہلے ہوئی ہے۔ اور بعض علماء قائل ہیں کہ خلقت اجسام کے ساتھ ارواح کی بھی خلقت ہوتی ہے۔

پہلے امر یعنی روح کے حادث ہونے پر یہاں دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ تمام مکاتیب فکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے مسلمانوں کا اس نظریہ کی صحت پر اتفاق و اجماع ہے۔ اس لئے سردست دوسرے امر کے متعلق تحقیقِ حق کی جاتی ہے۔

خلقتِ اجسام سے پہلے خلقتِ ارواح کا بیان

سو واضح ہو کہ اکثر فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ ارواح کی خلقت ابدان و اجسام کی خلقت سے پہلے ہوئی ہے۔ ان کے اس اعتقاد کی بنا علاوہ عقلی دلائل و براہین کے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک متفق علیہ حدیث شریف پر ہے کہ خلق اللہ الارواح قبل الاجساد بالفی عام کہ خداوند عالم نے ارواح کو ابدان سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ حدیث میں وارد شدہ اجساد سے مراد نوع جسد و بدن ہے جو کہ ایک بدن کی خلقت سے بھی متحقق ہو جاتی ہے، جیسے حضرت آدم کا بدن۔ ورنہ اگر ہر ہر روح کو اس کے مخصوص ہر ہر بدن کی نسبت دیکھا جائے تو کئی کئی ہزار بلکہ کئی کئی لاکھ سال کا تقدم و تاخر لازم آتا ہے اور اس سلسلہ میں یعنی ارواح کے ابدان سے دو ہزار سال یا اس سے بھی زائد عرصہ پہلے خلق ہونے کے متعلق اخبار حدِ تواتر تک پہنچے ہوئے ہیں، جیسا کہ علامہ سید نعمت اللہ جزائری نے انوار نعمانیہ میں فرمایا ہے۔ الاخبار الدالۃ علی ان الروح مخلوقۃ قبل البدن بالفی عام او اکثر علی ما وردت بہ اخبار مستفیضۃ بل متواترۃ حتی لا یبقی الریب فی نقد مہا۔ یعنی وہ اخبار جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ارواح دو ہزار سال یا اس سے بھی زائد عرصہ ابدان سے پہلے پیدا ہوئے ہیں، حدِ استفاضہ بلکہ حدِ تواتر تک پہنچے ہوئے ہیں۔ جن کے دیکھنے کے بعد اس مطلب کی صحت میں ہرگز کسی قسم کا کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اس قسم کی روایات کا کافی ذخیرہ علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے چہاردہم بحار میں جمع کر دیا ہے۔ یہاں دو چار روایتیں بغرض جلا ایمانی ذکر کی جاتی ہیں بحار الانوار

ومن خفت موازینہ فامہ ھاویۃ وما ادرٰلک ماھیہ؟ نار حامیۃ ومثل الدنیا و صاحبھا کمثل البحر والملاح والسفینۃ وقال لقمٰن لابنہ یا بنیّ ان الدنیا بحر عمیق وقد ھلک فیھا عالم کثیر فاجعل سفینتک فیھا الایمان

خداوند عالم فرماتا ہے جس شخص پر میرا عذاب نازل ہو جائے وہ ہلاک ہو جاتا ہے نیز فرمایا جس شخص کا نامۂ اعمال خفیف ہو گا اس کا مقام ہاویہ میں ہو گا۔ تمہیں کیا خبر کہ ہاویہ کیا ہے؟ وہ بہت ہی گرم آتش ہے دنیا اور اہل دنیا کی مثال ایسی ہے جیسی سمندر ملاح اور کشتی کی ہے جناب لقمانؑ نے اپنے فرزند سے کہا۔ اے بیٹا! دنیا ایک گہرا سمندر ہے جس میں بہت سے عالم ہلاک ہو گئے۔ تم اس میں ایمان باللہ کو کشتی اور تقوٰے و پرہیزگاری کو اپنا

میں بحوالہ بصائر الدرجات مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا امیر المومنینؑ بخدا میں آپ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ آں جنابؑ نے فرمایا۔ بخدا تو مجھے ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ وہ شخص ناراض ہو کر کہنے لگا۔ یا علیؑ! گویا آپ میرے دل کی کیفیت بتلا رہے ہیں؟ جناب نے فرمایا کہ بات دراصل یوں ہے کہ خداوند عالم نے ارواح کو ابدان سے دو ہزار سال قبل پیدا فرمایا۔ پس جو روحیں وہاں آپس میں مانوس تھیں وہ یہاں بھی مانوس ہوتی ہیں۔ اور جن میں وہاں میل ملاپ نہ تھا۔ اُن کے اندر یہاں بھی اُنس نہیں ہے۔ اور میری روح وہاں تیری روح سے مانوس نہ تھی یا بروایتے یوں فرمایا کہ میں نے تجھے وہاں نہیں دیکھا تھا۔ اس مضمون کی متعدد روایتیں کتاب مذکور میں مذکور ہیں۔ نیز بحار میں بحوالہ اُصول کافی اور محاسن برقی وغیرہ سے اس قسم کی متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں وارد ہے کہ مختلف اوقات میں بعض مومنین نے حضرات آئمہ اطہارؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض اوقات بغیر اس کے کہ ان کو یا ان کے اہل و عیال کو کوئی صدمہ پہنچے بلا وجہ ان کی طبیعت محزون و پریشان کیوں ہو جاتی ہے؟ حضرات آئمہ علیہم السلام نے فرمایا کہ چونکہ اہل ایمان کی روحیں ظاہری خلقت سے پہلے آپس میں مانوس تھیں۔ لہٰذا اس عالم میں جس وقت دنیا کے کسی گوشہ میں کسی مومن کا انتقال ہو جاتا ہے یا وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو پھر اس سے تم جہاں بھی ہو ضرور متاثر ہو جاتے ہو۔

عالمِ ذر و عہد الست کا اجمالی تذکرہ

عالمِ ذر میں اقرار ربوبیت و نبوت رب العالمین خاتم النبیین اور مطابق بعض روایات اقرار ولایت آئمہ طاہرین بھی اسی عقیدہ کے شئون میں سے ہے۔ جس کی تفاصیل مشہور و معلوم ہیں۔ جیسا کہ آیۂ مبارکہ واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلیٰ شھدنا

باللہ عزوجل واجعل زادك فيها تقوى الله واجعل شراعها التوكل على الله	زادِ راہ اور توکل علی اللہ کو اس کشتی کا بادبان بناؤ، پھر بھی اگر تم صحیح و سلامت اس سمندر سے پار اتر گئے تو یہ خدا کی خاص رحمت کا نتیجہ ہوگا۔ اور اگر اس میں ہلاک و برباد ہو گئے

ان تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ھذا غافلین (پ ۹ س اعراف ع ۲۲)

"کہ اس خلقت سے مراد خلقت تقدیری و علمی ہے۔ نہ خلقت حقیقی و ذاتی اور عالم ذر والے عہد الست کی ان حضرات نے یہ تاویل فرمائی ہے۔"

کی تفسیر میں فریقین کے کتب تفاسیر و احادیث لبریز ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ خداوند عالم نے صلب آدم سے قیامت تک ہونے والی اولاد ذکور و اناث کے ارواح کو جمع کر کے ان سے اپنی ربوبیت اور سرکار ختمی مرتبت کی رسالت کا اقرار لیا اور ہماری روائتوں کے مطابق آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی امامت کا بھی اقرار لیا۔ چنانچہ بعض ارواح نے قبول کر لیا۔ اور بعض نے انکار پر اصرار کیا اور بعض نے توقف و تردد کا اظہار کیا (تفسیر برہان و تفسیر صافی وغیرہ)

بعض علماء کے عالم ذر اور تقدم خلقتِ ارواح کا انکار اور ان کے شبہات کے جوابات

مذکورہ بالا حقائق کے باوجود مقام تعجب ہے کہ ہمارے مشاہیر علماء اعلام میں سے حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ اور جناب سید اجل سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور علامہ طبرسی صاحب مجمع البیان نے تقدم ارواح اور عالم ذر کے واقعہ کا سرے سے انکار کرتے ہوئے ان روایات صریحہ و صحیحہ کی بعید از کار تاویلات فرمائی ہیں۔ جب ان حضرات کے انکار کے علل و اسباب پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس تعجب میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تقدم ارواح کے انکار کی بنیاد ان حضرات کے اس خیال پر ہے کہ اس سے تناسخ لازم آتا ہے جو کہ باطل ہے جیسا کہ حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اس مقام پر اپنی شرح اعتقادیہ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے اور دوسرے مطلب یعنی عالم ذر کے انکار کا دارو مدار اس بات پر قرار دیا ہے کہ اگر کسی وقت ایسا واقعہ درپیش آیا ہوتا تو لازم تھا کہ وہ واقعہ ہمیں یاد بھی ہوتا یا کم از کم اس کے متعلق اجمالی علم تو ضرور ہوتا لیکن جب کچھ بھی معلوم نہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ کسی عالم میں درپیش نہیں آیا اور حدیث خلق اللہ الارواح قبل الاجساد بالفی عام کی شرح اعتقادیہ میں یہ علیل تاویل فرمائی ہے کہ اس جگہ ارواح سے مراد ملائکہ ہیں۔ یعنی خداوند عالم نے ملائکہ کو آدمیوں سے دو ہزار سال قبل پیدا کیا۔ اور اپنے رسالہ مسائل سرویہ میں (علی ما نقل عنہ) اس کی یہ تاویل

فان نجوت فبرحمة الله و ان هلكت فبذنوبك لا من الله واشد ساعات ابن آدم	تو یہ ہلاکت تمہارے گناہوں کے سبب ہوگی نہ کہ خدا کی طرف سے فرزند آدم پر تین ساعتیں بڑی ہی سخت اور کٹھن ہیں پیدائش کا دن، مرنے کا دن اور قبر سے زندہ ہو کر اٹھنے کا دن۔ انتہی

فرمائی ہے کہ اس سے مراد انسان کی مخصوص خلقت اور ہستی باری تعالیٰ پر آیاتِ انفسیہ و آفاقیہ کا موجود ہونا ہے جن کے ذریعہ خدا گویا کہ اپنے بندوں سے دریافت فرما رہا ہے الست بربکم کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اور گویا انسان اپنی فطرتِ سلیمہ کی بنا پر بزبانِ حال کہہ رہے ہیں۔ بلیٰ، ہاں تو ضرور ہمارا پروردگار ہے۔

احادیثِ آلِ رسولؐ کے مشکل ہونے اور ان کو رد کرنے کی مذمت کا بیان

ان علماء اعلام کی جلالت قدر و عظمتِ شان کچھ لب کشائی کرنے سے مانع ہے ورنہ یہ ایک تلخ حقیقت اور تکلیف دہ بات ہے کہ ایسے معمولی شبہات اور استبعادات کی بنا پر رسولؐ و آلِ رسولؐ کی احادیثِ معتبرہ کا انکار کر دیا جائے یا بلا کسی معقول وجہ کے ان کی تاویل کر دی جائے یہ ایک بہت بڑی جرأت اور جسارت ہے۔ حالانکہ آئمہ طاہرین علیہم السلام کی متعدد احادیث اس مضمون کی موجود ہیں کہ ان حديثنا صعب مستصعب لا يحتمله الا ملك مقرب او نبی مرسل او مومن امتحن الله قلبه للايمان۔ یعنی ہماری احادیث بہت مشکل ہیں۔ ان کو ملک مقرب یا نبی مرسل یا مومن ممتحن ہی برداشت کر سکتا ہے۔ اصولِ کافی میں اسی عنوان کا ایک پورا باب موجود ہے اسی مشکل کے پیشِ نظر حضرات آئمہ طاہرینؑ نے ہمیں ایک زریں اصول تعلیم دیا ہے کہ جب ہماری احادیث معتبرہ تمہارے پاس پہنچیں اور ان کا مطلب تمہاری سمجھ میں آجائے تو شکرِ خدا بجالاؤ۔ اور اگر مطلب سمجھ میں نہ آئے تو عالمِ آلِ محمدؐ (امام) کی خدمت میں لوٹاؤ تاکہ وہ تمہیں ان کا صحیح مفہوم بتلائیں۔ لیکن خبردار انکار نہ کرنا فان الانكار هو الكفر (اصول کافی)۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے حالات میں ہمیشہ محتاط علماء اعلام کا یہی طریقہ کار رہا ہے اور ہے کہ جن احادیثِ مبارکہ کا تفصیلی علم ہو جائے فہو المراد ورنہ ان کے مضامین پر اجمالی ایمان کو کافی سمجھتے ہیں بہرحال ان بزرگواروں کے ایرادات کے ادب کے ساتھ ذیل میں جوابات عرض کئے جاتے ہیں۔

ان کا پہلا شبہ یہ ہے کہ اگر ارواح کی خلقت کو ابدان سے پہلے تسلیم کیا جائے تو اس سے تناسخ لازم آتا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ درحقیقت تناسخ کے مفہوم کو معلوم کرنے میں تسامح کرنے اور تناسخ کے باطل ہونے کی اصلی وجہ میں کما حقہٗ امعانِ نظر اور غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

تناسخ کا صحیح مفہوم | تناسخ کے معنی اصطلاحِ فلاسفہ و حکماء میں یہ ہیں کہ ایک انسان کا نفسِ ناطقہ یعنی

ثلث ساعات یوم ولد ویوم یموت یبعث حیاً وقد سلم الله علی یحییٰ فی ھذہ الساعات فقال الله تع سلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیاً وقد سلم فیھا عیسیٰ علی نفسہ فقال والسلم علیّ

تین اوقات پر خدا نے حضرت یحییٰؑ کو سلامتی عطا فرمائی ہے۔ جیساکہ اس کا ارشاد ہے یحییٰؑ کے لئے سلامتی ہو جس روز وہ متولد ہوئے جس دن مریں گے اور جس روز زندہ ہو کر اٹھیں گے۔ حضرت عیسےؑ نے بھی انہی تین اوقات میں اپنے اوپر سلامتی کا اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں میرے لئے سلامتی ہے

روح اس کے جسم سے نکل کر بطور جزا یا سزا کسی دوسرے انسانی جسم میں چلا جائے (ابطال تناسخ، بحار الانوار کشکول بہائی) بنابریں واضح ہے کہ جو روح بدن سے پہلے خلق ہو چکی ہو، اس کو بعد میں پیدا ہونے والے جسم میں داخل کرنا ہرگز تناسخ نہیں قرار پاتا۔

ابطال تناسخ کے اصلی وجوہ

اور تناسخ باوجودیکہ عقلی طور پر ممکن ہے۔ لیکن شرع اقدس نے جو اس کو باطل قرار دیا ہے، اس کی دو وجہیں ہیں۔

وجہ اوّل۔ یہ کہ اس سے حشر و نشر کا انکار لازم آتا ہے۔ کیونکہ قائلین تناسخ قیامت کے منکر ہیں۔ اور وہ جزاء و سزا کے مقصد کو تناسخ (آواگون) کے ذریعہ پورا کر لیتے ہیں۔ حضرت مصنف علام نے بھی اٹھارہویں باب میں ابطال تناسخ کی یہی وجہ بیان فرمائی۔ لان فی التناسخ ابطال الجنۃ والنار کہ تناسخ کو صحیح ماننے سے جنت و دوزخ کا ابطال لازم آتا ہے اور فخر الدین رازی نے نہایۃ العقول میں لکھا ہے۔ ان المسلمین یقولون بحدوث الارواح وردھا الی الابدان لا فی ھذا العالم والتناسخیہ یقولون بقدمھا وردھا الی ما فی ھذا العالم وینکرون الجنۃ والنار وانما کفروا من اجل ھذا الانکار (بحوالہ اربعین بہائی) یعنی مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ارواح حادث ہیں اور دوسرے عالم میں ان کا تعلق ان ابدان کے ساتھ ہوگا مگر اہل تناسخ ان کو قدیم جانتے ہیں اور اسی عالم میں ان کے نقل و انتقال کے قائل اور جنت و جہنم کے منکر ہیں اور اسی انکار کی وجہ سے کافر سمجھے جاتے ہیں۔

وجہ دوم۔ یہ کہ اس سے روح و مادہ ہر دو کا قدم لازم آتا ہے کیونکہ تناسخ کے قائل ان ہر دو کو قدیم مانتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں عالم کو بھی قدیم تسلیم کرتے ہیں اور وہ جو قدیم ہوتا ہے وہ ابدی بھی ضرور ہوتا ہے کیونکہ مالا بدایۃ لہ لا نہایۃ لہ مسلم قانون ہے) چنانچہ حضرت علامہ شیخ بہاؤ الدین عاملی فرماتے ہیں۔ ولیس انکارنا

يوم ولدت ويوم اموت و يوم ابعث حيًّا والاعتقاد فى الروح انه ليس من جنس البدن وانه خلق اخر لقوله تع ثمّ انشأناه خلقًا اخر و

جس روز میں پیدا ہوا، جس روز مروں گا اور جس روز زندہ ہو کر اٹھایا جاؤں گا۔ روح کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ بدن کی جنس سے نہیں بلکہ ایک اور قسم کی مخلوق ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا "پھر ہم نے اس (انسان) کو ایک دوسری پیدائش میں پیدا کیا

على التناسخية وحكمنا بكفرهم بمجرد قولهم بانتقال الروح من بدن الى اخر فان المعاد الجسمانى كذلك عند كثير من اهل الاسلام بل لقولهم بقدم النفوس وترددها فى اجسام هذا العالم وانكارهم المعاد الجسمانى فى النشأة الاخروية

(کتاب اربعین بہائی حدیث چہلم) یعنی ہمارا تناسخ والے نظریہ کا انکار کرنا اور اس کے قائلین پر کفر کا حکم لگانا محض اس لئے نہیں ہے کہ وہ ایک بدن سے دوسرے بدن کی طرف روح کے منتقل ہونے کے قائل ہیں کیونکہ کثیر مسلمانوں کے نزدیک معاد جسمانی اسی طرح ہے بلکہ ہمارا یہ انکار اور ان کے کفر کا فیصلہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ نفوس و ارواح کے قدیم ہونے کے قائل ہیں، نیز وہ یہ کہتے ہیں کہ روحیں اسی عالم میں قالب بدلتی رہتی ہیں۔ اور قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔ قالوا ماهى الا حياتنا الدنيا نموت ونحى وما يهلكنا الا الدهر۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم زندہ ہیں پھر مر جائیں گے اور ہمیں زمانہ ہی مارتا ہے۔ خدا فرماتا ہے "وما لهم بذلك من علم ان هم الا يظنون۔ یہ ان کا گمان ہی گمان ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بہر حال یہ امر ظاہر ہے کہ یہ دونوں نظریئے روح اسلام کے سراسر منافی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اہل تناسخ کو کافر سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اسلام نے اس عقیدۂ فاسدہ کی بڑی شدومد سے رد فرمائی ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ روح کی خلقت کو جسم کی خلقت سے پہلے ماننے کی صورت میں ان دونوں خرابیوں میں سے کوئی بھی خرابی لازم نہیں آتی۔ کیونکہ عام روایتوں میں تو ان کے تقدم خلقت کی مدت فقط دو ہزار سال بیان کی گئی ہے حالانکہ دو ہزار سال کی تو حقیقت ہی کیا ہے! دو لاکھ بلکہ دو کروڑ یا اس سے بھی زائد عرصہ ارواح کی خلقت۔ اجسام سے پہلے تسلیم کر لی جائے تب بھی وہ حادث ہی ہوں گی اس سے ان کا قدیم ہونا ہرگز لازم نہیں آتا۔ اسی طرح دوسرا نقص یعنی انکار حشر و نشر بھی لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اگر روح کی خلقت کو جسم سے پہلے تسلیم کر لیا جائے تو اس سے کسی طرح بھی حشر و نشر کا انکار لازم نہیں آتا اور یہ امر انکار حشر پر دلالات ثلاثہ میں سے کوئی دلالت بھی نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قول کے قائلین میں سے کوئی بھی معاذ اللہ منکرِ معاد نہیں ہے۔

اعتقادنا فی الانبیاء والرسل	ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ انبیاء و
والائمۃ ان فیھم خمسۃ ارواح	رسلؑ اور آئمہ میں پانچ روحیں ہوتی ہیں

حضرت شیخ مفید اعلی اللہ مقامہٗ نے ان خلقِ مقدم ارواح والی احادیث کی جو تاویلات فرمائی ہیں یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ جب تک کلام معصومین علیہم السلام سے ان تاویلات کی صحت پر کوئی قطعی شاہد نہ پیش کیا جائے۔ اس وقت تک وہ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ اس سلسلہ میں بہت مذبذب ہیں۔ کہیں کوئی تاویل فرماتے ہیں اور کہیں کوئی جو ان کے عدمِ اطمینان قلب کی بیّن دلیل ہے۔ سرکار علامہ مجلسیؒ نے ان کی اس تاویل کے متعلق ارشاد فرمایا ہے جو ہم نے اوپر نقل کی ہے۔ "والتاویل الذی ذکرہ للحدیث فی غایۃ البعد" یعنی شیخ مرحوم نے حدیث کی جو تاویل فرمائی ہے وہ بہت ہی بعید از کار ہے (رابع عشر بحار)

دوسرا شبہ۔ جو حضرت شیخ قدس سرہٗ اور ان کے اتباع نے عالمِ ذر والی احادیث پر عائد کیا ہے کہ اگر یہ واقعہ درپیش آیا ہوتا تو لازم تھا کہ ہمیں یاد بھی ہوتا۔ اس کا جواب علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے جلد سیوم بحار الانوار اور دیگر محققین علماء ابرار نے یہ دیا ہے کہ اما ما ذکرہ من انہ لابد ان یذکر الانسان تلک الحالۃ فغیر مسلم مع بعد العھد وتخلل حال الجنینیۃ والطفولیۃ وغیرھما بینھما ولا استبعاد فی ان ینسیہ اللہ تعالیٰ لکثیر من المصالح مع انا لا نذکر احوال الطفولیۃ فای استبعاد فی نسیان ما قبلھا۔ یعنی یہ کہنا کہ اگر یہ واقعہ درپیش آیا ہوتا تو ضروری تھا کہ ہمیں یاد بھی ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ **اولاً** تو زمانہ زیادہ گذر چکا ہے۔ جس کے بعد فراموشی کا لاحق ہونا عین قرینِ عقل ہے۔ **ثانیاً** اس واقعہ اور ہمارے موجودہ زمانہ کے درمیان جنین اور طفولیت وغیرہ اور ان کے درمیان احوال و ازمان (علقہ و مضغہ وغیرہ) بھی حائل ہو چکے ہیں۔ **ثالثاً** ممکن ہے کہ اس نسیان میں کچھ مصالح و حکم موجود ہوں جن کی وجہ سے قدرتِ کاملہ نے وہ واقعہ ہمارے صفحۂ حافظہ سے محو کر دیا ہو۔ **رابعاً** جب ہم کو اپنے بچپن کے حالات یاد نہیں۔ جسے کوئی زیادہ عرصہ بھی نہیں گذرا تو اگر اس سے بہت مدت پہلے کا واقعہ یاد نہ ہو تو اس میں کیا تعجب ہے؟ سرکار علامہ کے ان تحقیقی و الزامی جوابات کے علاوہ اس شبہ کے دو جواب اور بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ واقعہ چونکہ تنہا روح کے ساتھ پیش آیا تھا جو کہ محل اختلاف الانظار مجرد محض ہے۔ یا جسم لطیف و نورانی۔ بہرکیف اس وقت اس پہ یہ موجودہ مادی غلاف نہیں چڑھا تھا لیکن جب وہ اس جسم کثیف میں مقید ہو گئی تو سابقہ واقعات فراموش کر بیٹھی اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے وہ بھولا ہوا سبق یاد آ جائے

روح القدس و روح الایمان	روح قدس (۲) روح ایمان (۳)
و روح القوۃ و روح الشھوۃ	روح قوت (۴) روح شہوت
و روح المدرج و فی المؤمنین	اور (۵) روح مدرج ۔ یعنی روح
اربعۃ ارواح روح الایمان	حس و حرکت اور مومنین میں چار

تو اسے چاہیے کہ علائق جسمانیہ و شہوانیہ سے قطع تعلق کر کے نورِ ایمان کو جلا دے اور ریاضاتِ شرعیہ کے ذریعہ اپنے رُوح کو کثافاتِ نفسانیہ سے صاف و شفاف کرے۔ پھر دیکھے کہ بھولے ہوئے سبق کس طرح یاد آتے ہیں۔ ولنعم ما قیل ؎

ہاں مجرد شو مجرد را ببیں   دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

یہی وجہ ہے کہ جنہوں نے یہ مراحل طے کر لئے ہیں اُن کی نگاہ بلند میں ماضی، مستقبل اور حال برابر روشن ہوتے ہیں اور وہ علم ماکان و مایکون کے عالم ہیں اور جب کسی بات کے معلوم کرنے کی طرف توجہ فرماتے ہیں تو اُن کی نگاہوں میں یہ اشجار و احجار حاجب و حائل نہیں ہوتے اور ان کو عالم ذر والے سب عہد و پیمان بالکل یاد ہیں چنانچہ کتاب الیواقیت والجواہر مؤلفہ شیخ عبدالوہاب شعرانی مطبوعہ مصر ج ا ص۲۶ میں لکھا ہے کہ کان علی بن ابی طالب یقول انی لاذکر العھد الذی عھد الیّ ربی واعرف من کان عن یمینی و من کان عن شمالی" یعنی جناب علی بن ابی طالب (علیہ السلام) فرمایا کرتے تھے کہ مجھے وہ عہد و پیمان اچھی طرح یاد ہے۔ جو میرے پروردگار نے مجھ سے لیا تھا۔ اور میں ان آدمیوں کو بھی پہچانتا ہوں جو اس وقت میرے دائیں اور بائیں طرف موجود تھے۔ ایسا ہی تفسیر فتح البیان ج ۳ ص۲۰۹ پر مذکور ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ شبہ ایک عقلی استبعاد ہی ہے! جس کی وجہ سے قرآن و حدیث سے ایک ثابت شدہ مسلّم حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کما لا یخفٰی۔

آیا جسم کے فنا ہونے کے ساتھ روح بھی فنا ہو جاتی ہے یا باقی رہتی ہے؟

رُوح کے سلسلہ میں

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ آیا وہ جسم فنا ہونے کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے۔ یا اس کی فنا کے بعد باقی رہتی ہے؟ اور باقی رہنے کی صورت میں آیا اس کی فنا ممکن ہے یا ممکن ہے؟ سو واضح ہو کہ وہ بے دین جو کہ روح و جسم کو ایک سمجھتے ہیں یا جو رُوح کو مزاج کے معنوں میں لیتے ہیں وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جسم کی موت کے ساتھ روح بھی ختم ہو جاتی ہے اور نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ لیکن جو نفس کو مجرد محض یا اسے جسم نورانی سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ روح فنائے جسم

وروح القوة وروح الشهوة وروح المدرج وفی الکافرین والبهائم ثلثة ارواح روح القوة وروح الشهوة وروح المدرج واما قوله تعالیٰ ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی

روحیں ہوتی ہیں۔ روح ایمان۔ روح قوت۔ روح شہوت اور روح مدرج اور کافروں اور چوپایوں میں صرف تین روحیں ہوتی ہیں۔ روح قوت۔ روح شہوت اور روح مدرج۔ خداوند عالم کے اس قول میں کہ لوگ تم سے حقیقت روح معلوم کرنے کی بابت سوال کرتے ہیں، تم ان سے کہہ دو کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے

کے بعد باقی رہتی ہے اور فنا نہیں ہوتی اس امر پر اگرچہ حکماء یونان و متکلمین اسلام کا اتفاق ہے لیکن ان کے نظریوں میں فرق یہ ہے کہ حکماء اس کے فنا کو ناممکن سمجھتے ہیں کہ یہ فنا ہو سکتی ہی نہیں کیونکہ ان کے نزدیک روح قدیم ہے اور جو چیز قدیم ہو وہ لازماً دائمی و ابدی بھی ہوتی ہے لیکن متکلمین اسلام اسے باقی ضرور مانتے ہیں لیکن قابلِ فنا تسلیم کرتے ہیں کہ اگر خدا چاہے تو اسے فوراً فنا کر سکتا ہے لیکن وہ فنا کرتا نہیں مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ روح جسم سے مفارقت کرنے کے بعد علی اختلاف الانظار استقلالی طور پر یا جسم مثالی کے ساتھ عالم برزخ میں متنعم یا معذب رہتی ہے (اس مطلب کی تحقیق سترھویں باب میں آرہی ہے)

علامہ مجلسیؒ اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ بقاء النفوس بعد خراب الابدان مذهب اکثر العقلاء والملیین والفلاسفة ولم ینکره الا فرقة قلیلة کالقائلین بان النفس هی المزاج وامثالهم ممن لا یعبا بهم ولا بکلامهم وقد عرفت ما یدل علیه من الاخبار الجلیة وقد اقیمت علیه البراهین العقلیة (بحار ۳) یعنی بدنوں کے ختم ہونے کے بعد ارواح کا باقی رہنا اکثر عقلا اور اکثر ارباب ملل و فلاسفہ کا نظریہ ہے سوائے ایک قلیل گروہ کے جو روح کو بمعنی مزاج سمجھتا ہے اور کسی نے اس مطلب کا انکار نہیں کیا اور اس قلیل گروہ کے کلام و اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے تم سابقاً معلوم کر چکے ہو کہ اس نظریہ کی صحت پر جلی اخبار دلالت کرتے ہیں اور اس پر براہین عقلیہ بھی قائم کئے گئے ہیں محقق شیخ بہائیؒ نے بھی اپنی کتاب اربعین بذیل شرح حدیث چہلم بھی اسی طرح افادہ فرمایا ہے۔ اور قیامت کے دن پھر خداوند عالم اپنی قدرت کاملہ سے اسے اپنے اصلی بدن کی طرف واپس لوٹا دے گا جس میں اس کا حشر و نشر ہوگا اور اسی میں اسے سزا یا جزا دی جائے گی اور اس عقیدہ کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی اصول کے مطابق چونکہ انسان کو عبث پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس سے بہت سی تکالیف شرعیہ الٰہیہ متعلق ہیں، جن میں اصول و فروع سب داخل ہیں۔ ارشاد قدرت ہے۔ افحسبتم انما خلقناکم عبثاً وانکم الینا لا ترجعون دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

فانہ خلق اعظم من جبرئیل و میکائیل کان مع رسول اللہ و مع الملئکۃ و مع الائمۃ

روح سے مراد وہ روح ہے جو (قدر و منزلت میں) جبرئیل اور میکائیل سے بھی ایک عظیم تر مخلوق ہے جو رسولِ خدا، ملائکہ اور آئمہ ہدیٰ کے ساتھ رہتی ہے

لہٰذا عدل و انصاف خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اپنی طاعت یا معصیت پر ضرور جزا یا سزا بھی دے ورنہ تکالیف شرعیہ کا عبث و بے فائدہ ہونا لازم آئے گا جو کہ عقلاً قبیح ہے۔ اور حکیم عادل کی حکمت و عدالت کے منافی ہے پس اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ابدان کے فنا کے ساتھ ساتھ پروردگار عالم روحوں کو بھی فنا کردیتا ہے تو مذکورہ بالا قاعدہ عقلائیہ کی مخالفت لازم آئے گی حالانکہ حکیم علی الاطلاق کبھی قاعدۂ حکیمانہ کی مخالفت نہیں کرتا لہٰذا یہ امر ماننا پڑے گا کہ بدن کے فنا کے ساتھ روح فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ جزا و سزا حاصل کرنے کے لئے باقی رہتی ہے۔ اب وہ جزا و سزا دو طریقہ پر متصور ہو سکتی ہے۔ بطور تناسخ یا بطور حشر و نشر لیکن چونکہ تناسخ باطل ہے جیسا کہ اٹھارہویں باب کے ذیل میں اسے ثابت کیا جائے گا، تو لامحالہ قیامت تک ان روحوں کا باقی رہنا بالضرور تسلیم کرنا پڑے گا بلکہ اس کے بعد بھی تاکہ وہ اپنے اعمال خیر و شر کی پوری پوری جزا یا سزا پا سکیں۔ ھم فیھا خلدون۔

جناب پیغمبر اسلام کی متفق بین الفریقین حدیث شریف کہ خلقتم للبقاء لا للفنا کہ تمہیں بقا کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ نہ فنا کے لئے بھی اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے جسے مصنف علامؒ نے اپنے مقصد کی تائید کے لئے ذکر فرمایا ہے لیکن یہاں پر بھی حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے مصنف پر بے جا سخت تنقید فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔

والذی حکاہ و توھمہ ھو مذھب کثیر من الفلاسفۃ الملحدین الذین زعموا ان النفس لا یلحقھا الکون والفساد و انھا باقیۃ و ھذا من اخبث قول و ابعدہ من الصواب۔ یعنی شیخ صدوقؒ نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہت سے ملحد و بے دین فلسفیوں کا نظریہ ہے جن کا یہ گمان ہے کہ نفس کون و فساد سے بالاتر ہے۔ فنا صرف جسم کے لئے ہے اور نفس باقی رہتا ہے یہ بہت ہی خبیث اور درستی سے بہت دور قول ہے۔ ہم یہاں بھی اور اکثر مقامات کی طرح حضرت شیخ مفیدؒ کی موافقت کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ مذکورہ عقیدہ صحیحہ سے ہرگز ملحد حکماء کی موافقت لازم نہیں آتی۔ کیونکہ اس حدیث شریف کا دراصل مقصود یہ ہے کہ تمہاری خلقت محض اس لئے نہیں ہوئی کہ دنیا میں اگر چند روزہ زندگی بسر کرو اور پھر بالکل فنا ہو جاؤ نہ کوئی باز پرس ہو اور نہ کوئی جزا اور نہ کوئی سزا۔ جیسا کہ دہریہ کا خیال ہے اور قرآن مجید نے ان کے اس اعتقاد فاسد کی یوں خبر دی ہے وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحی و ما یھلکنا الا الدھر (جاثیہ) وہ کہتے ہیں کہ ہماری تو صرف یہ زندگی ہے۔ اب زندہ ہیں پھر مر جائیں گے اور ہمیں مارنے والا زمانہ ہی ہے۔ یعنی نہ کوئی خالق ہے اور نہ کوئی جزا و سزا۔

وهو من الملكوت و انا اصنف فی هذا المعنی کتابًا اشرح فیه معانی هذہ الجمل

اور اس کا تعلق عالم ملکوت سے ہے (یعنی فرشتہ ہے) روح اور اس نے احوال کے متعلق میں ایک کتاب لکھوں گا جس میں ان تمام مجمل باتوں کی تشریح و توضیح ہو گی (انشاء اللہ)

اسلام نے اس عقیدہ کی تردید فرمائی اور یہ حدیث بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اگر ایسا ہی ہے تو پھر انسان اور ایک عام حیوان مثل کلب و حمار میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے؟ اس لئے اس حدیث کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمہاری روحیں فنا نہیں ہوتیں۔ البتہ اس دار دنیا سے دار آخرت کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ جہاں اپنے اعمال کا عوض پاتی ہیں۔ فلاسفہ تو یہ کہتے ہیں کہ روحیں فنا ہو سکتی ہی نہیں۔ شیخ صدوق علیہ الرحمہ یا دیگر مسلمان علماء یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ روحیں فنا نہ ہوں گی لیکن وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ فنا ہو سکتی ہی نہیں بلکہ قدرت کاملہ جب چاہے انہیں فنا کرنے پر قادر ہے لیکن اگر فنا کرنے میں مصلحت نہیں تو انہیں فنا نہیں کیا جاتا تو اب فنا نہ ہو سکنے (جو فلاسفہ کا نظریہ ہے) اور فنا نہ ہونے (جو مسلمان کہتے ہیں) میں جو فرق ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔! اور اس کے باوجود پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ مصنف علام نے فلاسفہ ملاحدہ کی ہمنوائی فرمائی ہے۔ ان ھذا الا اختلاق (شارح مقاصد نے اس مطلب پر علاوہ نصوص قرآنیہ و حدیثیہ کی دلالت کے اجماع امت کا دعویٰ بھی کیا ہے) ان حقائق سے واضح و لائح ہو گیا کہ جسم کے فنا ہونے سے روح فنا نہیں ہوتی۔ یہی وہ صحیح عقیدہ ہے جو ایک مسلمان کو رکھنا چاہیے۔ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں۔ و یجب الایمان بان الروح باق بعد مفارقۃ الجسد۔ الخ۔ اس بات پر ایمان رکھنا واجب ہے کہ جسم سے جدا ہونے کے بعد روح باقی رہتی ہے ؎

ترا یک نکتہ سربستہ گویم اگر درس حیات از من بگیری
بمیری گر بہ تن جانے نہ داری و گر جانے بہ تن داری نہ میری

اقبال

لیکن قبر میں عذاب و ثواب اور عالم برزخ میں جزا و سزا تنہا روح کو ہوتی ہے یا اسے جسم مثالی کے اندر رکھ کر دی جاتی ہے؟ اگرچہ اس مبحث کے اندر اس کا اجمالی تذکرہ موجود ہے۔ لیکن ہم اس مسئلہ پر تفصیل روشنی آئندہ باب مقدم میں ڈالیں گے۔ انشاء اللہ فانتظر!!

تتمہ مہمہ در بیان اختلاف انواع ارواح

مخفی نہ رہے کہ اب تک جس انسانی روح کے بارے میں ہم نے گفتگو کی ہے وہ ہر شخص میں صرف ایک ہی ہوتی ہے جو کہ متحد النوع اور متعدد الافراد ہے۔ یہ متعدد ارواح جن کا ذکر مصنف علام نے فرمایا ہے اور احادیث میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ در حقیقت بعض قوتیں ہیں جن کو من باب المجاز روح کہا گیا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے

موجودات عالم میں سے ہر نوع کی روحیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مثلاً انسان۔ خرگوش اور موش وغیرہ باوجودیکہ ایک چیز میں باہم شریک ہیں۔ جیسے جسم دار ہونے میں یا حیوان ہونے میں لیکن بایں ہمہ انسان کی کوئی فرد گدھے کی فرد نہیں۔ اور گدھے کی کوئی فرد انسان نہیں لہذا سوچنا چاہیے کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے انسان کو انسان اور گدھے کو گدھا اور شیر کو شیر اور فیل کو فیل بنا رکھا ہے وہ ما بہ الامتیاز کیا ہے؟ اگر بنظر غائر اس امر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب جانداروں کی روحیں الگ الگ خاص طور پر بنائی گئی ہیں اور ہر ہر نوع کا خاصہ جدا جدا ہے۔ نہ انسان کی روح میں شیر کے خواص پائے جاتے ہیں اور نہ شیر کی روح میں انسان کے خواص وعلیٰ ہذا القیاس۔ اسی لئے ہر نوع کے خواص اور طبعی افعال اور جسمانی قویٰ ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ اور ان کی غذائیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اور بسر بر وحیات کے طریقے جدا جدا ہیں جو حیوانات گوشت خوار ہیں وہ نبات خوار نہیں ہو سکتے اور جو نبات خوار ہیں وہ گوشت خور نہیں ہو سکتے اگر بجبر ایسا کیا گیا تو یہ امر ان کے لئے موجب ہلاکت ہوگا۔

ان حقائق سے بآسانی یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر ذی حیات کی روح دوسرے ذی حیات کی روح سے جداگانہ اور مختلف ہے۔ اسی طرح ہر ہر نوع کے ہر ہر فرد کی روح بھی علیحدہ ہے۔ اگرچہ متحد النوع ہے۔

روح کے بعض احوال کا بیان

احادیث میں روح کے مختلف حالات وکوائف مذکور ہیں چونکہ یہ مبحث غیر معمولی طور پر طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے اس پر کچھ مزید خامہ فرسائی تو نہیں کی جا سکتی۔ البتہ یہاں فقط ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباؤ اجداد طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین کے سلسلۂ سند سے جناب امیر المومنین علیہ السلام سے روایت فرماتے ہیں کہ آنجناب نے فرمایا ان للجسم ستۃ احوال الصحۃ والمرض والحیوۃ والموت والنوم والیقظۃ کذالک الروح فحیاتہا علمہا و موتہا جہلہا و مرضہا شکہا و صحتہا یقینہا و نومہا غفلتہا و یقظتہا حفظہا (کتاب التوحید للصدوقؒ) جسم کی چھ حالتیں ہوتی ہیں۔ صحت۔ مرض۔ حیات۔ موت۔ نیند اور بیداری۔ اسی طرح روح کی بھی چھ حالتیں ہوتی ہیں۔ پس روح کی حیات علم۔ اس کی موت جہالت۔ اس کا مرض شک اور اس کی صحت یقین۔ اس کی نیند غفلت اور بیداری حفظ اور یاد کرنا ہے۔ لہذا عقلمند انسان وہ ہے جو ہمیشہ روح کے حالات وکوائف کا نگران رہے۔ اور ان امور سے اس کی حفاظت کرے جن سے اس کی حالت میں نقص پیدا ہوتا ہے تاکہ ان عیوب و نقائص روحانیہ سے محفوظ و مصؤن رہ سکے اور ان باتوں کو بجا لائے جن سے اس کی روح مدارج ترقی پر فائز ہوتی ہے واللہ الموفق۔ انّ فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون۔

ایضاح مخفی نہ رہے کہ روح القدس کی وجہ سے نبی و امام کی نوع ہرگز تبدیل نہیں ہو جاتی جس طرح روح ایمان کی وجہ سے مومن کی نوع نہیں بدلتی کیونکہ انبیاء و مرسلینؑ ہوں یا آئمہ طاہرینؑ بنی نوع انسان کے

باب الاعتقاد فی الموت

قال الشیخ قیل لامیر المومنینؑ صف لنا الموت فقال علی الخبیر سقطتم هو

سولهواں باب (موت کے متعلق اعتقاد)

جناب شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے آقا موت کی کیفیت و حالت بیان کیجئے۔ حضرت نے فرمایا

ہی افراد کاملہ ہیں اور درحقیقت انہی ذوات مقدسہ کی بدولت انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ اس مطلب کی مزید وضاحت اور روح القدس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ہماری کتاب اصول الشریعہ کے پہلے باب کی طرف رجوع کیا جائے۔

سولهواں باب (موت اور اُس کی حقیقت کا بیان)

موت کے متعلق قدرے اختلاف ہے کہ آیا وہ امر وجودی ہے یا امر عدمی۔ تحقیق یہ ہے کہ موت ایک امر وجودی ہے جس کی یہ تعریف ہے۔ الموت صفۃ وجودیۃ مضادۃ للحیاۃ۔ یعنی موت ایک صفت وجودی ہے جو حیات کی ضد ہے اس کی تائید آیات قرآنیہ جیسے ھو الذی خلق الموت والحیوۃ وغیرہ سے بھی ہوتی ہے کیونکہ ان آیات مبارکہ میں خلاق عالم نے موت کو خلق فرمانے کا تذکرہ فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز خلق کی جاتی ہے وہ وجودی ہی ہوتی ہے کیونکہ عدم محض مخلوق نہیں ہوتا۔ مگر بعض نے اسے امر عدمی قرار دیتے ہوئے اس کے متعلق یہ کہا ھو عبارۃ عن عدم ھذہ الصفۃ یعنی موت صفت حیات کے معدوم ہونے کا نام ہے تعریف کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور لفظی۔ تعریف حقیقی جنس و فصل قریب سے ہوتی ہے۔ جس سے مقصود کسی شی کی حقیقت و ماہیت کا معلوم کرنا اور اسے تمام اعداد و اغیار سے تمیز دینا ہوتا ہے۔ اور تعریف لفظی سے فقط شرح اسم اور بعض اغیار سے امتیاز دینا مطلوب ہوتا ہے اور یہ مطلب بعض آثار و لوازم اور خواص کے ذکر کر دینے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ مصنف علام نے موت کی تعریف بالآثار کر کے اس کی تعریف لفظی فرمائی ہے۔ لہٰذا ان پر یہ اعتراض عائد نہیں ہوتا کہ انہوں نے عنوان تو موت کی حقیقت بیان کرنے کا قرار دیا تھا لیکن اثنائے بحث میں فقط اس کے آثار ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصنفؒ کوئی منطق کی کتاب نہیں لکھ رہے تھے کہ اس میں منطقی تعریف کے حدود و قیود کی پابندی کرتے بلکہ وہ عقائد بیان کر رہے ہیں۔

فلسفۂ موت و حیات کا بیان

اس مختصر تمہید سدید کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ موت و حیات پر مختصر کچھ تبصرہ کر دیا جائے یہ امر تو بالبداہت معلوم و محسوس

احد امور ثلثة يرد عليه اما بشارة بنعيم الابد و اما بشارة بعذاب الابد و اما تخويف وتهويل وامر مبهم لا يدري من اي

تم نے ایسے شخص سے سوال کیا جو حقیقت موت سے کما حقہ واقف ہے
پھر فرمایا: جب کسی مرنے والے کے پاس موت آتی ہے تو وہ تین
چیزوں میں سے ایک چیز ضرور ہوتی ہے یا تو دائمی نعمتوں کی بشارت اور
خوشخبری ہوتی ہے یا دائمی عذاب و عقاب کی خبر ہوتی ہے اور یا مرنے
والے کے لئے خوف و ہراس ہوتی ہے اور مرنے کا انجام مبہم ہوتا

ہے کہ خلاق کائنات نے اپنی تمام ذی روح مخلوق کو موت و حیات کی دو آہنی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑ دیا ہے کہ اس سلسلہ میں انسان بالکل بے بس اور مجبور ہے کہ نہ اُسے دنیا میں آنے میں کچھ اختیار اور نہ یہاں سے جانے میں کوئی اختیار ۔ بقولِ ذوق ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ ما للانسان وللتکبر اولہ نطفة و آخره جيفة بھلا انسان کو تکبر اور کبریائی سے کیا تعلق ہے؟ اس کی اول ایک نطفہ گندیدہ ہے اور آخر مردار اور کمزور و ناتواں اس قدر ہے کہ لا يملك لنفسه ضرا ولا نفعا ولا موتا ولا حيوة ولا نشورا ۔ کہ نہ اپنی موت کا مالک ہے نہ حیات کا اور نہ اپنے نفع کا مالک ہے نہ نقصان کا اور نہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھنے کا اختیار رکھتا ہے (نہج البلاغہ)

اس سلسلہ میں اجمالی جواب

اب رہا یہ سوال کہ اس سلسلہ موت و حیات کو کیوں جاری کیا گیا ہے اس میں کیا کیا اسرار و رموز پوشیدہ ہیں؟ تو اس سوال کا سب سے پہلا اور مکمل جواب تو یہی ہے کہ جب ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ خالق کائنات حکیم مطلق و مدبر کامل ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة کسی حکیم کا کوئی فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا تو اگر بالفرض اس کے کسی فعل کی حقیقی حکمت و مصلحت سمجھ میں نہ بھی آئے تو اس میں ہماری عقل و فہم کا قصور ہوگا ۔ حکیم علی الاطلاق کے کسی فعل میں کوئی نقص و عیب نہیں ہو سکتا اور نہ وہ مصالح و حکم سے خالی ہو سکتا ہے ۔

دوسرا جواب ۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ سلسلۂ موت و حیات کوئی ایسا غامض مسئلہ نہیں کہ اس کے اسرار و رموز تک انسانی عقول کی رسائی نہ ہو ۔ آج تک عقل انسانی نے بھی اس کے بہت سے فوائد و عوائد معلوم کر لئے ہیں ۔ نیز کتاب ربانی نے بھی اس سلسلہ میں ہماری کافی رہبری فرمائی ہے اور معصومینؑ کے ایسے فرامین بھی بکثرت موجود ہیں ۔ جو اس سلسلہ میں خضر راہ کا کام دیتے ہیں ۔ ہم بنظر اختصار ذیل میں ان مصالح و حکم میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

الفرق هو امّا ولیّنا والمطیع لامرنا فهو المبشّر بنعیم الابد وامّا عدونا والمخالف لامرنا فهو المبشر بعذاب الابد

ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ پہلے یا دوسرے اکس گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو شخص ہمارا دوست اور فرمانبردار ہے اسے ابدی نعمتوں کی خوشخبری دی جاتی ہے اور جو ہمارا دشمن اور ہمارے حکم کی مخالفت کرنے والا ہے اسے ابدی عذاب کی خبر سنائی جاتی ہے

سلسلۂ موت و حیات کی پہلی اور اہم مصلحت

ارشادِ قدرت ہے ھو الذی خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً (سورۂ ملک پ۲۹ ع ۱) خداوند عالم وہ قادر و حکیم ہے جس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا تاکہ یہ معلوم ہو کر تم میں سے زیادہ اچھے کام کرنے والا کون ہے؟ اس آیت مبارکہ نے فلسفۂ موت و حیات کے چہرہ سے نقاب الٹ دیا ہے۔ اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ موت و حیات کی خلقت کا مقصد اقتضی اعمالِ صالحہ کا بجالانا اور اعمالِ سیئہ سے اجتناب کرنا ہے چنانچہ آیتِ مبارکہ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (سورہ ذاریات پ۲۷ ع ۲) سے بھی اسی مطلب کی تائید مزید ہوتی ہے لہٰذا جو شخص جس قدر زیادہ اپنے اس مقصد خلقت کی تکمیل میں حصہ لے گا۔ اسی قدر وہ نگاہِ خالق میں زیادہ مکرّم و معظم ہو گا۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (سورۂ حجرات پ۲۶ ع ۱۴) اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ مکرم و محترم وہ ہے جو اس سے زیادہ ڈرتا ہے اور جو شخص جس قدر اس مقصد عظیم سے علیحدگی اور دوری اختیار کرے گا۔ اسی قدر ساحتِ قدس سے دُور اور مرتبۂ انسانیت سے گرتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ گرتے گرتے بعض صورتوں میں عام حیوانات سے بھی بدتر ہو جائے گا۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا اولٰئک کالانعام بل ھم اضل (پ۹ اعراف ع ۱۲) کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے قلوب تو ہیں لیکن ان سے سوچتے نہیں۔ کان ہیں لیکن (حق کو) سنتے نہیں۔ آنکھیں ہیں لیکن (حق کو) دیکھتے نہیں۔ ایسے لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر اور بدتر۔

دوسری مصلحت

سرکار سید الشہداء علیہ الاف التحیۃ والثناء کا ارشاد ہے۔ خط الموت علی ابن ادم کما خط القلادۃ علی جید الفتاۃ۔ یعنی موت فرزند آدم کے لئے اس طرح باعثِ زیب و زینت ہے۔ جس طرح ہار نوجوان لڑکی کی گردن کی زینت ہوتا ہے (نفس المہموم) اس بلیغ تشبیہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موت فرزندِ آدم کے لئے بمنزلۂ زیور کے ہے جس کے بغیر اس کا حسن و جمال نکھرتا ہی نہیں۔ سچ ہے ع۔

واما المبهم امره الذی لا یدری ما حاله فهو المومن المسرف علی نفسه لا یدری ما یؤول الیه حاله یاتیه الخبر مبهما مخوفا ثم لن یسویه الله تعالیٰ باعدائنا ولکن	لیکن وہ شخص جس کا امر مشتبہ اور انجام مبہم ہے وہ ایسا مومن ہے کہ جس کا عقیدہ تو درست ہے لیکن اس نے اپنے نفس پر بوجہ نافرمانی خدا زیادتی کی ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہے کہ اس کا مآل اور انجام کیا ہوگا؟ ایسے شخص کے پاس (انجام کی) خوفناک اور مبہم خبر آتی ہے۔ خداوند عالم ایسے شخص کو ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہرگز نہ ملائے گا۔ بلکہ

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

قاعدہ ہے کہ الاشیاء تعرف باضدادھا کسی شے کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اُس کی ضد سے ہوتا ہے کما قال المتنبیؒ ؎

وندیمھم وبھم عرفنا فضلہ وبضدھا تتبین الاشیاء

ہمیں موت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس لئے نہیں کہ ہم نے ہمیشہ زندہ رہنے کی تکالیف کو نہ خود جھیلا ہے۔ اور نہ کسی کو اس بلائے بے درماں میں مبتلا دیکھا ہے۔ ایک نبی کی اُمّت سے دائمی حیات طلب کرنے کی حماقت سرزد ہو گئی تھی۔ پس ان سے پوچھئے کہ پھر اُن پر کیا بیتی؟ واقعہ یوں ہے کہ ایک نبیؑ کی اُمّت نے اُن کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ بارگاہِ ایزدی میں دعا فرمائیں کہ وہ سلسلۂ موت کو موقوف کر دے۔ چنانچہ نبیؑ نے دعا کی جو مستجاب ہوئی اور موت کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب اُنہوں نے جو جینا شروع کیا تو نوبت بایں جا رسید کہ ایک شخص اپنے باپ اور دادا اپنے باپ کے دادا۔ اسی طرح اپنے نانا اور پھر نانا کے نانا وعلیٰ ہذا القیاس سب بزرگوں کو دیکھنے لگا۔ اور وہ زندہ درگور بوڑھے بچوں کی طرح پڑے ہیں نہ چلنے پھرنے کی سکت نہ خود اُٹھ کر بول و براز کرنے کی طاقت اور نہ ہاتھ ہلا کر خود کھانے پینے کی قدرت۔ لہٰذا ان کے عزیز ان کی خدمت میں مشغول اور ان زندہ درگور لاشوں کی دیکھ بھال میں منہمک ہو گئے اور سلسلۂ کسب و اکتساب ختم ہو کر رہ گیا۔ دائمی حیات ان کے لئے ایک مصیبت عظمیٰ بن گئی اور ان کا نظامِ زندگی درہم برہم ہونے لگا اور وہ اس مطالبۂ بے جا پر بہت نادم و پشیمان ہوئے۔ پھر پیغمبرؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ دعا کریں کہ خداوند عالم اسی سابقہ سلسلہ کو جاری و ساری فرمائے۔ چنانچہ انہوں نے دوبارہ دعا کی اور بدستور سابق سلسلۂ موت و حیات جاری ہوا اور جب ملک الموت کی آمد و رفت شروع ہوئی تو اس وقت ان لوگوں نے آرام و اطمینان کا سانس لیا (انوار نعمانیہ) ولنعم ما قال الحماسی ع

ولا للمرء خیر فی حیاۃ اذا ما عد من سقط المتاع

يخرجه من النار بشفاعتنا فاعملوا واطيعوا ولا تتكلوا ولا تستصغروا عقوبة الله فانّ من المسرفين من لا تلحقه شفاعتنا الّا بعد عذاب الله بثلثمائة الف سنة وسُئل عن الحسن بن ابيطالب ما الموت

ہماری شفاعت کی وجہ سے اسے ضرور آتشِ جہنم سے نکالے گا۔ پھر فرمایا تم عمل صالح کرو۔ واجب الاطاعت ہستیوں کی اطاعت کرو اور اپنے نفسوں یا خوش نصیبوں پر بھروسہ کرکے بیٹھ نہ جاؤ۔ اور عذاب خداوندی کو حقیر نہ سمجھو۔ کیونکہ کچھ ایسے گنہگار لوگ بھی ہوں گے جنہیں تین تین لاکھ سال تک عذاب الٰہی میں گرفتار رہنے کے بعد ہماری شفاعت نصیب ہوگی حضرت امام حسن علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ موت کیا ہے؟

اس زندگی میں انسان کے لئے کوئی خیر و خوبی نہیں جب کہ وہ ردی کی ٹوکری کا مال شمار ہونے لگے۔

بقول متنبی البتہ یہ درست ہے کہ ؎

وادنٰی حیاۃ الغابرین لصاحب حیاۃ امرء خانتہ بعد مشیب

تیسری مصلحت

اگر سلسلۂ موت نہ ہوتا تو دنیا میں جو کچھ چہل پہل چمک دمک اور رعنائی و دلربائی موجود ہے وہ ختم ہو کر رہ جاتی۔ کیونکہ یہ سب کچھ اس جذبہ کا نتیجہ ہے کہ ہر انسان کو مرنے کا یقین ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اس نے جو کچھ بیان کرنا ہے اُسے جلد سرانجام دے لے نہ معلوم کب فرشتۂ اجل آکر اس کے رشتۂ نفس کو قطع کر دے۔ لیکن اگر اسے یہ یقین ہوتا کہ اس نے مرنا تو ہے ہی نہیں تو پھر ہر کام کی انجام دہی میں سستی و کاہلی سے کام لیتا کہ کیا جلدی ہے۔ آج نہیں تو کل کر لیں گے۔ کل نہیں تو پرسوں کر لیں گے۔ و ہکذا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ تمام کام ناقص اور نا تمام رہ جاتے اور دنیا کی یہ رونق اور یہ شان و شوکت ایک دم ختم ہو کر رہ جاتی اور انسان تنگی معیشت وغیرہ مختلف تکالیف میں گرفتار ہو جاتا۔ پس معلوم ہوا کہ دنیا کی تمام دل کشی اور دلبری کا راز سلسلۂ موت میں پوشیدہ ہے۔ اسی مطلب کو مرزا غالب مرحوم نے اپنے خاص انداز میں یوں ادا کیا ہے ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

چوتھی مصلحت

موت سے انسان کو اپنے مقصدِ خلقت کی تکمیل میں کافی مدد ملتی ہے اور کبر و نخوت اور انانیت و خود بینی ایسے صفاتِ رذیلہ کو دور کرنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے اور اس سے بارگاہِ ایزدی میں سرِ تسلیم خم کرنے کا صالح جذبہ پیدا ہوتا ہے جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ شاہد ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سرکش اور جبار و قہار انسانوں کو بھی اپنی سرکشی و طغیانی کے وقت جب کبھی موت کا تصور آجاتا ہے۔ تو ان کے تمام خم و پیچ نکل جاتے ہیں اور طلسمِ کبر و نخوت ٹوٹ جاتا ہے اسی مطلب کو شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے۔

الّذی جھلوہ فقال اعظم سرور یرد علی المومنین اذا نقلوا عن دار النکد الی نعیم الابد واعظم ثبور یرد علی الکافرین اذا نقلوا من جنتھم الی نار لا تبید ولا تنفد ولما اشتد الامر بالحسین بن علی بن ابی طالب نظر الیہ

جس سے لوگ ناواقف ہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ مومنین کے لئے موت زبردست مسرت و شادمانی ہے کیونکہ موت کی وجہ سے ہی وہ دنیوی مصیبت کدہ سے چھٹکارا پاکر خدا کی ابدی نعمتوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں مگر یہی موت کافروں کے لئے بہت بڑی بلا و مصیبت ہے اس لئے کہ موت ہی ان کو دنیوی نعمت کدوں سے نکال کر نہ بجھنے اور نہ ختم ہونے والی آگ کی طرف لے جاتی ہے (روز عاشورا) جب کہ حضرت امام حسین علیہ السلام

موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

پس ان حقائق سے معلوم ہوا کہ موت انسان کے لئے مقرب الی الطاعۃ (طاعتِ ایزدی کے قریب کرنیوالی) اور مبعّد عن المعصیۃ (نافرمانی سے دور کرنے والی) ہے اور اسی چیز کو اصطلاحِ متکلمین میں "لطف" کہا جاتا ہے۔ جس کی انجام دہی قدرتِ کاملہ پر لطفاً واجب ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر ہادیانِ دین نے موت کو بکثرت یاد کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

موت کو بکثرت یاد کرنے کے فوائد

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ کفاکم بالموعظۃ الموت۔ تمہیں پند و نصیحت حاصل کرنے کے لئے موت کا یاد کر لینا کافی ہے (تحف العقول) جناب امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں اکثروا ذکر ھادم اللذات جس قدر ہو سکے لذتوں کے ملیامیٹ کرنے والی (موت) کو بکثرت یاد کرو (نہج البلاغۃ) نیز انہی جناب کا ارشاد ہے اکثروا ذکر الموت ویوم خروجکم من القبور وقیامکم بین یدی ربکم عزوجل تھون علیکم المصائب۔ فرمایا مرنے، قبروں سے نکلنے اور بارگاہِ قدرت میں کھڑا ہونے کو بکثرت یاد کرو۔ اس سے تم پر دنیا کے مصائب و آلام آسان ہو جائیں گے (خصال شیخ صدوق) داؤد روایت کرتے ہیں کہ میں نے جناب امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کوئی ایسی چیز تعلیم فرمائیں۔ جس سے میں فائدہ حاصل کروں۔ فرمایا یا ابا عبید ما اکثر ذکر الموت احد الا زھد فی الدنیا (بحار ج ۳) اے ابو عبیدہ! کوئی شخص موت کو بکثرت یاد نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ دنیا میں زاہد (بے رغبت) ہو جاتا ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔ ذکر الموت یمیت الشھوات فی النفس ویقلع منابت الغفلۃ ویقوی القلب بمواعد اللہ ویرق الطبع ویکسر اعلام الھوی

من کان معہ واذا ھو بخلافھم
لانھم کانوا اذا اشتد بھم الامر
تغیّرت الوانھم وارتعدت
فرائصھم ووجلت قلوبھم
ووجبت جنوبھم وکان الحسینؑ
وبعض من معہ من خواصہ
تشرق الوانھم وتھدأ جوارحھم
وتسکن نفوسھم فقال بعضھم
لبعض انظروا الیہ لا یبالی
بالموت فقال لھم الحسینؑ
صبراً بنی الکرام فما الموت
الّا قنطرۃ تعبر بکم عن البؤس
والضرّاء الی الجنان الواسعۃ
والنّعم الدائمۃ فایّکم یکرہ
ان ینتقل من سجن الی قصر
وامّا ھو لاعدائکم الّا کمن ینتقل
من قصر الی سجن وعذاب الیم

سخت آزمائش میں مبتلا تھے۔ سخت جنگ ہو رہی تھی۔ آپ کے
بعض اصحاب نے آپ کی طرف دیکھا کہ آپ کی حالت دوسرے
لوگوں سے مختلف ہے۔ کیونکہ جب ان لوگوں پر معاملہ سخت
ہو جاتا تھا تو ان کے رنگ متغیر ہو جاتے۔ کاندھے کانپنے
لگتے، دل ہراساں ہو جاتے اور پہلو شکستہ ہو
جاتے تھے مگر جناب سید الشہدا علیہ السلام اور ان کے
بعض خاص احباب کی ان شدائد میں یہ کیفیت تھی کہ رنگ
میں چمک۔ اعضاء میں سکون اور دلوں میں پوری طرح
اطمینان تھا۔ ان کی یہ اطمینانی حالت دیکھ کر آں جنابؑ کے
اصحاب ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ دیکھو آں جنابؑ کو
موت کی کوئی پرواہ تک نہیں ہے۔ جناب امام حسین علیہ السلام
نے ان سے فرمایا۔ اے شریف زادو صبر کرو! یہ موت
ایک پل کی مانند ہے جو تمہیں اس تنگی و سختی اور ہولناک مصیبت
سے پار کر کے وسیع و عریض باغات اور ابدی نعمتوں تک
پہنچا دے گی۔ تم میں کون ایسا شخص ہے جو اس دنیا کے قید خانہ
سے رہا ہو کر جنت کے عالی شان محلوں میں جانا پسند نہیں
کرتا؟ اور یہ جو تمہارے دشمن ہیں ان کی مثال اس شخص کی

ویطفی نار الحرص ویحقر الدنیا الحدیث۔ یعنی موت کا یاد کرنا نفس کی شہوات کو مارتا ہے غفلت
کی بیخ کنی کرتا ہے۔ اللہ کے وعدوں سے دل کو تقویت پہنچاتا ہے۔ طبیعت کو رقیق و نرم کرتا ہے۔ ہوا و ہوس
کے جھنڈوں کو سرنگوں کرتا ہے۔ آتش حرص و ہوس کو بجھاتا ہے اور نگاہوں میں دنیا کو حقیر کرتا ہے (بحار الانوار ۲)
بکثرت احادیث میں وارد ہے کہ جب گناہوں کے سیاہ بادل تمہارے سروں پر منڈلانے لگیں اور دنیا
اپنے مادی جاہ و جلال کی طرف تمہیں کھینچے تو قبرستان میں جا کر عبرت و نصیحت حاصل کیا کرو۔ گناہوں کے
بادل چھٹ جائیں گے اور دنیا کی دھوکہ دہی و فریب کاری سے دامن محفوظ رہے گا۔

ے ہر روز زیر زمیں لوگ چلے جاتے ہیں — نہیں معلوم تہہ خاک تماشہ کیا ہے؟

ان ابی حدثنی بذلک عن رسول اللہ ان الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر والموت جسر ھولاء الی جناتھم و جسر ھولاء الی جحیمھم ماکذب و ماکذبت وقیل لعلی بن الحسین ما الموت قال للمومن کنزع ثیاب وسخۃ قملۃ اوفک قیود واغلال ثقیلۃ والاستبدال با فخر الثیاب واطیبہا روایح واوطی المراکب وانس المنازل و للکافر کخلع ثیاب فاخرۃ والنقل عن منازل انیسۃ والاستبدال باوسخ الثیاب واخشنہا واوحش المنازل و اعظم العذاب و قیل لمحمد بن علی الباقر

سی ہے جو عظیم الشان محل سے نکل کر قید خانہ اور دردناک عذاب کی طرف منتقل ہو۔ میرے پدر بزرگوار نے میرے جدّ نامدار کی یہ حدیث مجھ سے بیان فرمائی ہے کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے۔ اور کافر کے لئے جنت اور موت مومنوں کے لئے جنت میں داخل ہونے اور کافروں کے لئے دوزخ میں جانے کے واسطے ایک پل ہے نہ میرے والد محترم نے جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی میں نے جھوٹ بولا ہے (یعنی یہ حدیث بالکل سچی ہے)

جناب زین العابدین علیہ السلام سے کسی نے موت کے متعلق سوال کیا۔ کہ یہ کیا چیز ہے؟ فرمایا مومن کے لئے موت ایسی ہے جیسے ایک انسان میلے کچیلے اور جوؤں والے کپڑے اتار پھینکے یا ثقیل طوق وسلاسل کے بوجھ سے نجات پائے اور اس کے عوض معطر لباس فاخرہ زیب تن کرے۔ اور تیز رو سواریاں اور بہترین دلچسپ مکانات حاصل کرے۔ اس کے برعکس کافر کے لئے موت ایسی ہے۔ جیسے لباس فاخرہ اتار لیا جائے اور بہترین مرغوب طبع مکانات سے نکال کر ان کے عوض بہت گندا اور درشت لباس پہنایا جائے اور سخت وحشتناک مکان میں قیام اور دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے امام پنجم حضرت باقر العلومؑ نے

معیارِ صداقت تمنائے موت ہے

سلسلۂ موت کا جریان تبلاتا ہے کہ دنیا ہماری منزل و قرارگاہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک پل ہے جسے عبور کر کے ہم نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے ارشادِ قدرت ہے۔ انما الحیوۃ الدنیا لھو و لعب والاخرۃ ھی دار الحیوان لو کانوا یعقلون۔ زندگانی دنیا تو ایک لہو و لعب اور بچوں کا کھیل ہے۔ ہاں آخرت زندہ رہنے کا گھر ہے۔ اے کاش لوگ اس حقیقت کو سمجھتے۔ اسی لئے متفق بین الفریقین حدیث میں وارد ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ الدنیا سجن للمؤمن وجنۃ للکافر۔ یہ

ما الموت قال هو النوم الذی یاتیکم فی کل لیلة الا انہ طویل مدتہ لاینتبہ منہ الا یوم القیمة فمن رأی فی منامہ من اصناف الفرح مالایقادر قدرہ ومن رأی فی نومہ من اصناف الاھوال مالایقادر قدرہ

کسی شخص کے سوال پر کہ موت کیا چیز ہے؟ فرمایا! موت نیند کی مانند ہے۔ جو ہر رات تم کو آتی ہے مگر اس کی مدت اتنی لمبی ہے کہ موت کی نیند سونے والا قیامت سے پہلے بیدار نہیں ہوگا۔ تم میں سے بعض لوگوں کو خواب میں مختلف خوشکن چیزیں دیکھنے سے اس قدر فرحت و شادمانی حاصل ہوتی ہے جو تمہارے اندازے سے باہر ہے۔ اور بعض کو مختلف ہولناک چیزوں کے مشاہدہ کرنے سے اس قدر رنج و الم حاصل ہوتا ہے۔ جس کا وہ اندازہ نہیں کرسکتے

یہ دنیا مومن کے لئے بمنزلہ قید خانہ کے ہے، اور کافر کے لئے بمنزلہ جنت۔ اور فطرت کا مقتضا یہ ہے کہ انسان قید سے رہائی اور اصلی منزل تک پہنچنے کی تمنا اور خواہش کرتا ہے۔ اسی سے لوگوں کے دعوئی ایمان و ایقان کو پرکھنے کا معیار قدرتِ کاملہ نے تمنائے موت کو قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ فتمنوا الموت ان کنتم صادقین (سورہ جمعہ) تم اگر اپنے دعوائے محبت الہیہ اور ایمان باللہ میں سچے ہو تو موت کی خواہش کرو۔ یہی وجہ ہے کہ جن کو اپنی حقانیت و صداقت اور دار آخرت کی آبادی و شادابی کا یقین کامل تھا۔ وہ موت سے ڈرنے کی بجائے موت سے کھیلا کرتے تھے۔ اور اکثر و بیشتر جنگ میں زرہ بھی استعمال نہ فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب امام الصدیقین جنگ صفین میں بغیر زرہ کے میدانِ کارزار میں تشریف لے جانے لگے تو کسی نے عرض کیا۔ آقائے نامدار! یہ بھی لڑنے کا کوئی طریقہ ہے؟ یہ سن کر جناب نے فرمایا۔ واللہ لابن ابی طالب لانس بالموت من الطفل بثدی امہ۔ بخدا ابوطالبؑ کا بیٹا اس سے زیادہ موت سے مانوس ہے جتنا بچہ اپنی ماں کے سینہ سے مانوس ہوتا ہے (نہج البلاغہ) یہی وجہ ہے کہ جب شقی ازلی ابن ملجم مرادی نے قاتلانہ وار کیا تو پہلا جملہ جو دہن اقدس امام سے نکلا جو آج تک سینۂ تاریخ میں محفوظ ہے یہ تھا بسم اللہ وباللہ علی ملة رسول اللہ فزت برب الکعبة۔ رب کعبہ کی قسم میں آج اپنے مقصد میں کامیاب و کامران ہوگیا (ناسخ بحار الانوار) حضرت امیر علیہ السلام تو پھر بھی بزرگ تھے۔ تلخ و شیریں چشیدہ تھے۔ امام تھے مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس مقدس خاندان کے تو خورد سال بچوں کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ موت کو شہد سے زیادہ شیریں جانتے تھے چنانچہ روز عاشورا جب شہزادہ قاسم نے میدان کارزار میں جانے کے لئے اپنے عم نامدار سرکار سید الشہداء علیہ السلام سے اذن جہاد طلب کیا تو جناب نے امتحاناً پوچھا۔ بنی کیف عندك الموت؟ بیٹا قاسم! موت تمہارے

فكيف حال من فرح في الموت ووجل فيه هذا هو الموت فاستعدوا له وقيل للصادق صف لنا الموت فقال هو للمؤمن كاطيب ريح يشمه فينعس بطيبه فينقطع التعب والالم كله عنه وللكافر كلسع الافاعي ولدغ العقارب واشد قيل له فان قوما يقولون هو اشد من نشر بالمناشير وقرض بالمقاريض ورضخ بالحجارة وتدوير قطب الارحية في الاحداق فقال كذلك هو على بعض الكافرين والفاجرين الاترون من منهم من يعاين تلك الشدائد فذلك الذي هو اشد من عذاب الدنيا

تم خود ہی اندازہ لگاؤ کہ موت کے وقت جب کہ حقیقی ثواب یا عذاب کا سامنا ہوگا تو اس وقت مرنے والے کی خوشی یا اس کی غمی کی کیا کیفیت ہوگی؟ یہ موت ہے تم اس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ حضرت صادق علیہ السّلام سے موت کے متعلق سوال کیا گیا کہ موت کی کیفیت بیان فرمائیے۔ آپ نے فرمایا کہ مومن کے لئے موت بہترین خوشبو کی مانند ہے جس کی عطر بیز ہوا کے سونگھنے سے انسان سو جاتا ہے اور اس کی تمام تکان و تکلیف یکسر ختم ہو جاتی ہے اور کافروں کے لئے موت ایسی ہے جیسے کسی کو سانپوں اور بچھوؤں نے کاٹ کھایا ہو۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ حضرت کی خدمت میں کسی نے عرض کیا کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ موتؒ کی شدت آروں سے چیرنے اور قینچیوں سے کترنے پتھروں سے کوٹنے اور آنکھوں میں چکی کی کیلی گھمانے سے بھی زیادہ سخت ہے فرمایا ہاں بعض کافروں اور گنہگاروں کی حالت موت کے وقت ایسی ہی ہوتی ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ ان میں سے بعض اس حالت کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور جھیلتے ہیں پس یہ موت ان کے لئے دنیوی عذاب سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے

نزدیک کیسی ہے؟ عرض کیا۔ عم محترم احلی من العسل شہد سے زیادہ شیریں معلوم ہوتی ہے۔ (حاشیہ بحار الانوار)

عام لوگوں کے موت سے خائف ہونے کی وجہ

لیکن ہم ہیں کہ موت کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور اس سے حد درجہ گھبراتے ہیں اس کی وجہ وہی ہے جو متن رسالہ میں حضرت ابوذرؓ کی زبانی مذکور ہے کہ ہم نے اپنی دنیا کو آباد اور آخرت کو خراب کر رکھا ہے۔ اس لئے آبادی کو چھوڑ کر خرابی کی طرف منتقل ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ اسی جواب سے ملتا جلتا لیکن اس سے بھی زیادہ لطیف جواب باصواب وہ ہے جو سرکار سید الشہداءؑ نے اس شخص کو دیا تھا۔ جس نے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ مالنا نکرہ الموت وانتم لا تکرھونه۔ آقا! اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم لوگ موت سے گھبراتے ہیں لیکن آپ نہیں گھبراتے؟ آپ نے فرمایا۔ لانکم عمرتم منازلکم هذه وخربتم تلك المنازل فلا تحبون

قيل له فما لنا نرى كافرا
يسهل عليه النزع فينطفئ وهو
يتحدث ويضحك ويتكلم
وفي المؤمنين من يكون ايضا
كذلك وفي المؤمنين والكافرين
من يقاسي عند سكرات الموت
هذه الشدائد فقال ما كان من
راحة للمؤمنين فهو من
عاجل ثوابه وما كان من شدة
فهو تمحيصه من ذنوبه
ليرد الى الآخرة نقيا طاهرا
نظيفا مستحقا لثواب الله ليس
له مانع دونه وما كان هناك
من سهولة على الكافرين
فليتوفى اجر حسناته في
الدنيا ليرد الى الآخرة وليس
له الا ما يوجب عليه العذاب
وما كان من شدة على الكافرين
هناك فهو ابتداء عقاب الله بعد
نفاد حسناته ذلك بان الله عزو
جل عدل لا يجور ودخل موسى
بن جعفر على رجل وقد غرق

حضرت سے پوچھا گیا۔ اس کا کیا سبب ہے کہ بعض کفار پر بوقت
مرگ جانکنی آسان ہو جاتی ہے۔ اور وہ نہایت خوشی و خرمی کی
حالت میں باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے مرجاتے ہیں۔ اور بعض
مومنین کی بھی اسی طرح موت واقع ہوتی ہے۔ مگر اس کے
برعکس کچھ مومن اور کچھ کافر نزع کے وقت موت کے
شدائد سے دوچار ہوتے ہیں۔ آں جناب نے فرمایا جن
مومنین کو جانکنی کے وقت راحت نصیب ہوتی ہے۔ ان
کا ثواب جلد اسی دنیا میں شروع ہو جاتا ہے اور جن مومنین کو
بوقتِ نزع شدت و تکلیف ہوتی ہے وہ ان کو گناہوں سے پاک
کرنے کے لئے ہوتی ہے تاکہ بروز حشر صاف ستھرے، اور
طیب و طاہر اور مستحق ثواب خدا ہو کر اس طرح آخرت میں وارد
ہوں کہ حصول ثواب میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اور بعض کافروں پر
بوقت مرگ جو سہولت و آسانی ہوتی ہے تو یہ اس کی دنیاوی
نیکیوں کا ارحاول حقیقی کی طرف سے بدلہ ہے۔ تاکہ جب عرصۂ
قیامت میں آئے تو اپنے عقائد و اعمال سیئہ کی وجہ سے سوائے
عذاب الٰہی کے اور کسی چیز کا حقدار نہ ہو۔ اور عند الموت جن کفار پر شدت
و سختی ہوتی ہے اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ چونکہ انہوں نے اپنے دنیوی
اعمال خیر کا بدلہ دنیا میں ہی حاصل کر لیا ہوتا ہے۔ اس لئے ان پر عذاب
خداوندی کی ابتداء یہیں سے ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس وجہ
سے ہے کہ خداوند کریم عادل ہے وہ کسی پر ظلم و ستم نہیں
کرتا۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک ایسے
شخص کے پاس تشریف لے گئے جو موت و حیات کی

الانتقال من عمران الى خراب واما نحن فنقلنا كل ما عندنا من الاثاث الى تلك الدار
فخربنا هذه وعمرنا تلك فنحن نحب الانتقال من خراب الى عمران۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم

في سكرات الموت وهو لا يجيب
داعيا فقالوا له يا بن رسول الله
وددنا لو عرفنا كيف حال صاحبنا
وكيف الموت فقال ان الموت
هو المصفي يصفي المومنين من
الذنوب فيكون آخر الم يصيبهم
وكفارة آخر وزر عليهم ويصفي
الكافرين من حسناتهم فيكون
آخر لذة او نعمة او راحة تلحقهم
وهو آخر ثواب حسنة لهم واما
صاحبكم فقد نخل من الذنوب
نخلا وصفي من الاثام تصفية
وخلص حتى نقي كما ينقى الثوب
من الوسخ وصلح لمعاشرتنا اهل
البيت في دارنا دار الابد ومرض
رجل من اصحاب الرضا فعاده
الرضا فقال له كيف تجدك؟ فقال
لقيت الموت بعدك يريد به ما
لقيه من شدة مرضه فقال له كيف
لقيته فقال الماشديدا فقال له ما
لقيته ولكن لقيت ما ينذرك ويعرفك

کش مکش میں مبتلا اور سکرات موت کے پسینہ میں شرابور ہو رہا
تھا۔ اور کسی بلانے والے کو جواب نہ دیتا تھا۔ کچھ حضرات نے
امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا اے فرزند رسولؐ! ہم چاہتے
ہیں کہ اپنے ساتھی کی موجودہ حالت اور موت کی کیفیت معلوم کریں
جناب نے فرمایا موت صاف کرنے والی ہے مومنوں کو گناہوں سے
پاک و صاف کرتی ہے۔ یہ مومنین کے لئے آخری تکلیف ہے جو
ان کو پہنچتی ہے۔ اور ان کے آخری گناہ کا کفارہ ہے اور یہی موت
کافروں کو نیکیوں سے صاف اور تہی دامن کر دیتی ہے۔ اور یہ
ان کے واسطے آخری لذت یا آخری نعمت یا آخری راحت اور
ان کے آخری عمل خیر کی آخری جزا ہے۔ پھر فرمایا یہ تمہارا دوست
گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا ہے۔ جس طرح پاک ہونے کا
حق ہے۔ اور تمام گناہوں کی آلائش سے اس طرح صاف ہو گیا
ہے جس طرح کپڑا میل کچیل سے پاک و صاف ہو جاتا ہے اور اب
ہم اہل بیتؑ کے ساتھ ہمارے دار الابد میں دائمی زندگی گزارنے
کے قابل ہو چکا ہے۔ حضرت ثامن الائمہ امام علی رضا علیہ السلام
کے اصحاب میں سے ایک بار ایک آدمی بیمار ہو گیا۔ آنجناب
اس کے پاس بیمار پرسی کے لئے تشریف لے گئے اور دریافت
فرمایا اپنے تئیں کس طرح پاتے ہو؟ ——— بیمار نے عرض
کیا۔ حضورؐ! میں تو آپ کے بعد قریب قریب مر ہی چکا تھا (شدت
مرض کا بیان مقصود تھا) فرمایا آخر تو نے کس طرح موت کا منہ دیکھا ہے؟
اُس نے عرض کیا کہ مجھے بہت ہی سخت رنج و الم کا سامنا ہوا۔

لوگوں نے اپنے دنیوی منازل کو تو آباد کر رکھا ہے۔ لیکن اُخروی گھروں کو خراب و برباد کر دیا ہے۔ اس لئے تم آباد جگہ کو
چھوڑ کر خرابہ کی طرف منتقل ہونا پسند نہیں کرتے۔ لیکن ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہمارے پاس اثاثۃ البیت
تھا وہ سب ہم نے اُس گھر (آخرت) کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ اس طرح ہم نے اس دار دنیا کو تو خراب کر دیا ہے

بعض حاله انما الناس رجلان مستريح بالموت ومستراح به فجدد الايمان بالله والنبوة والولاية تكن مستريحاً ففعل الرجل ذلك وهٰذا الحديث طويل اخذنا منه موضع الحاجة وقيل لمحمد بن علي بن موسى الرضا ما بال هؤلاء المسلمين يكرهون الموت فقال لانهم جهلوه فكرهوه ولو عرفوه وكانوا من اولياء الله حقاً لاحبوه وليعلموا ان الاخرة خير لهم من الدنيا ثم قال يا عبد الله ما بال الصبي والمجنون يمتنعان من الدواء المنقي لبدنه والنافي للالم عنه فقال لجهلهم بنفع الدواء قال والذي بعث محمداً بالحق نبياً ان من قد استعد للموت حق الاستعداد فهو انفع لهم من هٰذا الدواء لهٰذا المعالج اما انهم لو عرفوا ما يؤدي اليه الموت

امام علیہ السلام نے فرمایا وہ کیفیت جو تم پر گذری ہے وہ موت نہ تھی بلکہ ایک ایسی حالت تھی جس نے تمہیں موت سے ڈرایا اس کی حالت کی کچھ معرفی کرائی۔ پھر فرمایا انسان دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو موت کی وجہ سے راحت پاتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے مرنے سے دوسرے لوگ آرام حاصل کرتے ہیں۔ اب تم توحید و رسالت اور ہماری ولایت کا اقرار کرکے تجدید عہد کرلو، تاکہ تمہیں راحت نصیب ہو۔ پس اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ یہ حدیث بہت لمبی تھی، ہم نے بقدر ضرورت اس کا کچھ حصّہ یہاں درج کر دیا ہے۔ حضرت امام محمد تقی علیہ السّلام کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ان مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جو موت کو ناپسند کرتے ہیں حضرت نے فرمایا چونکہ یہ لوگ موت کی حقیقت سے ناواقف ہیں اس لئے اس سے کراہت کرتے ہیں۔ اگر یہ موت کی حقیقت سے آگاہ ہوتے اور خدا کے سچے دوست بھی ہوتے تو ضرور موت کو پسند کرتے اور ان کو یقین ہو جاتا کہ آخرت ان کے لئے دنیا سے بہتر ہے پھر فرمایا۔ اے بندۂ خدا! کیا وجہ ہے کہ بچے اور دیوانے لوگ دوا نہیں پیتے۔ حالانکہ یہ دوا ان کے بدن کا تنقیہ و تطہیر اور بیماری کو ان سے دور کیا کرتی ہے؟ سائل نے عرض کیا۔ اس لئے کہ یہ دوا کے نفع و فائدہ سے ناواقف ہیں، آنجناب نے فرمایا مجھے قسم ہے اس پروردگار عالم کی جس نے جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث برسالت کیا ہے کہ جو شخص موت کے لئے کما حقہ مستعد و آمادہ ہو تو موت اُس کے لئے اس دوا سے بھی زیادہ

لیکن دارِ آخرت کو آباد و شاداب بنا دیا ہے اس لئے ہم اس خرابہ سے آباد مقام کی طرف منتقل ہونا پسند کرتے ہیں (انوار نعمانیہ)
جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بھی کسی شخص نے یہی سوال کیا تھا۔ کہ کیا وجہ ہے میں موت سے گھبراتا ہوں۔ آپ نے فرمایا الک مال؟ کیا تمہارے پاس کچھ مال بھی ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا۔ اقدمته امامك؟ آیا تو نے اُسے اپنے آگے بھیج دیا ہے؟ اُس نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا فمن ثم لا تحب الموت:

من النّعم لاستدعوه و احتبوه اشدّ ممّا يستدعی العاقل الحازم الدّواء لدفع الآفات واجتلاب السّلامات ودخل علی من محمّد علی مريض من اصحابه وهو يبکی ويجزع من الموت فقال له يا عبدالله تخاف من الموت لانّك لا تعرفه ارأيتك اذا اتّسخت ثيابك وتقذّرت فتاذّيت من کثرة القذر والوسخ عليك واصابك قروح وجرب وعلمت ان الغسل فی الحمام يزيل عنك ذلك کلّه امّا تريد ان تدخله

سودمند ثابت ہوتی ہے جو بیمار مذکور کے لئے مفید ہوتی ہے۔ اگر ان لوگوں کو اس بات کا علم ہوتا کہ موت کی تمنا کرتے۔ اور جس طرح ایک عقلمند مریض اپنے جسم کی سلامتی اور امراض کے دفعیہ کے لئے دوا کی خواہش کرتا ہے یہ لوگ اس سے بھی زیادہ موت کو چاہتے۔

حضرت امام علی نقی علیہ السلام اپنے ایک صحابی کے پاس اس وقت تشریف لے گئے۔ جب کہ وہ موت کی وحشتناک حالت کو دیکھ کر رو رہا تھا۔ امام نے یہ کیفیت دیکھ کر اس صحابی سے فرمایا۔ اے بندۂ خدا! تو موت سے صرف اس لئے ڈر رہا ہے کہ تو اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ جب تمہارا لباس میلا کچیلا ہو جائے اور تمہیں اس کی نجاست و کثافت سے تکلیف محسوس ہونے لگے۔ اور اسی گندگی و غلاظت کی وجہ سے زخم اور خارش کی تکلیف میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور تمہیں اس بات کا علم بھی ہو کہ حمام میں غسل کرنے سے ان تمام مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔ تو کیا تم اس وقت اس بات کو پسند نہیں کرو گے کہ اس میں جا کر

اس موت سے گھبرانے کی یہی وجہ ہے (بحار الانوار ج ۲)

موت کیلئے استعداد و آمادگی کیونکر حاصل ہوتی ہے

دعا ہے کہ خلاق عالم ہمیں موت کے لئے مستعد و آمادہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے

اور یہ استعداد یونہی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے کچھ کرنا بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ موت کے لئے کس طرح استعداد حاصل ہوتی ہے؟ فرمایا اداء الفرائض واجتناب المحارم والاشتمال علی المکارم ثمّ لا يبالی اوقع علی الموت او وقع الموت عليه (کتاب معاد بحوالہ نامۂ بابرہ بجوالہ ثالث) بجا لانا فرائض وغیرہ ادا کرنے، محرمات شرعیہ سے اجتناب کرنے اور مکارم اخلاق حاصل کرنے سے۔ جب یہ تینوں امور حاصل ہو جائیں تو پھر انسان کو کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ وہ موت پر جا گرے یا موت اس پر آ گرے۔

رزقنا الله الاستعداد للموت ولما بعد الموت قبل حلول الفوت بجاہ النبیّ وآله الطاهرين

فتغتسل فيزول ذلك عنك وما تكره ان لا تدخله فيبقى ذلك عليك فقال بلى يا ابن رسول الله ثم قال ذلك الموت هو ذلك الحمام وهو اخر ما بقي عليك من تمحيص ذنوبك و تنقيتك من سيئاتك فاذا انت وردت عليه وجاوزته فقد نجوت من كل غم وهم واذى ووصلت الى كل سرور و فرح فسكن الرجل ونشط واستسلم وغمض عين نفسه ومضى لسبيله وسئل عن الحسن بن علی العسکری

غسل کرو؟ اور کیا تم اس بات کو ناپسند نہیں کرو گے کہ حمام میں نہ جاؤ اور اس مصیبت میں بدستور گرفتار رہو۔ صحابی نے عرض کیا ہاں فرزند رسول! یقیناً اس حال میں غسل کرنا پسند کروں گا حضرت نے فرمایا یہ موت اسی حمام کی مانند ہے۔ جو کچھ تمہارے گناہ باقی رہ گئے ہیں۔ ان سے گلو خلاصی کرانے اور اپنے برے اعمال سے پاک ہونے کا آخری موقع یہی موت ہے تم جب موت کے گھاٹ پر اترو گے۔ اور پھر اس کے پار ہو جاؤ گے تو تمہیں ہر رنج و الم اور ہر مصیبت و غم سے چھٹکارا مل جائے گا اور ہر طرح کی مسرت و شادمانی اور راحت و اطمینان کے مقام تک پہنچ جاؤ گے (امام کا یہ کلام سن کر) اس صحابی سے سب خوف و ہراس زائل ہو گیا اور اس کے اندر فرحت و انبساط کی لہر دوڑ گئی اور مرنے کے لئے سر تسلیم خم کر دیا چنانچہ آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنے راستہ پر چل (مرحوم ہو گیا) جناب امام حسن عسکری علیہ السلام

دعائے طولِ حیات کرنے کا طریقہ

ان حقائق سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ علی الاطلاق طولِ عمر کی دعا کرنا مذموم ہے۔ ہاں اعمال صالحہ بجا لانے اور خدمات دینیہ انجام دینے کی غرض سے اور وہ بھی مشروطی طور پر اس طرح کہ جب تک ان اعمالِ صالحہ بجا لانے کی توفیق شاملِ حال رہے۔ اس وقت تک خداوندِ عالم زندگی عطا کرے اور جب خدانخواستہ توفیقِ ایزدی سلب ہونے لگے اور انسان قہر و غضب الٰہی کا مستوجب قرار پانے لگے تو اس وقت قدرت اپنی بارگاہ میں بلا لے رجیسا کہ آئمہ اطہار سے اسی قسم کے ادعیہ معتبرہ مروی ہیں جن میں بارگاہِ ربّ العزت میں ہمیں عرض و نیاز کرنے کے طور و طریقے بتلائے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام بارگاہِ رب جلیل میں یوں عرض کرتے ہیں۔ اللّٰھم عمرنی ما کان عمری بذلۃ فی طاعتک فاذا کان عمری مرتعاً للشیطان فاقبضنی الیک قبل ان یسبق غضبک الیّ۔ بارالٰہا! جب تک میری زندگی تیری اطاعت میں صرف ہو۔ اس وقت تک مجھے زندہ رکھ اور جب میری زندگی شیطان کی چراگاہ بننے لگے تو فوراً مجھے اپنی بارگاہ میں بلا لے۔ قبل اس کے کہ میں تیرے غضب کا مستحق بنوں۔ (صحیفہ کاملہ)

عن الموت ما ھو فقال ھو التصدیق بما لا یکون ان ابی حدثنی بذلک عن ابیہ عن جدی عن الصادقؑ انہ قال ان المؤمن اذا مات لم یکن میتاً وان الکافر ھو المیت لان اللہ عزوجل یقول یخرج قال لا فتال فمن ثم

سے سوال کیا گیا کہ موت کیا ہے؟ فرمایا موت ان چیزوں کی تصدیق کرنے سے عبارت ہے جو ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ پھر فرمایا میرے والد محترم نے اپنے آباؤ اجداد کے سلسلۂ سند سے جناب امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث مجھ سے بیان کی ہے کہ جب مومن مرتا ہے تو وہ در حقیقت مردہ نہیں ہوتا بلکہ کافر ہی در حقیقت مردہ ہے جیسا کہ کلام الٰہی میں موجود ہے کہ خداوہ ہے جو زندہ کو میت اور میت کو زندہ سے پیدا کرتا ہے یعنی مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے پیدا کرتا ہے یہی جناب (امام یازدہم) ایمان

اس طرح ان آیات و روایات کے درمیان جمع بھی ہو جاتی ہے جن میں بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض بارگاہِ ایزدی میں حضوری کی طلب اور موت کی آرزو کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور بعض سے طلب موت کی مذمت ظاہر ہوتی ہے اس جمع بین الروایات کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زندگی کو محض دنیا اور اس کے لذائذِ فانیہ حاصل کرنے کے لئے محبوب سمجھے۔ اور موت کو مبغوض۔ تو یہ امر مذموم اور قبیح ہے۔ لیکن اگر طاعت الٰہی بجالانے، خدا کی خوشنودی حاصل کرنے اور سعادتِ اخرویہ کے کثرت وسائل و اسباب مہیا کرنے کی غرض سے عمر دراز طلب کرے۔ تو یہ امر شرعاً مرغوب اور مستحسن ہے۔ ومن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا۔

ایک عام غلط فہمی کا ازالہ اور بیماری کے فوائد

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں اکثر عوام بلکہ بعض خواص بھی مبتلا ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی قسم کی تکلیف کے بغیر اور بغیر بیماری کے جامِ مرگ نوش کر لینا بیمار رہ کر اور تکلیف جھیل کر مرنے سے بہتر ہے اس لئے وہ ناگہانی موت کو بیماری والی موت پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ خیال سراسر غلط اور حقائق کے خلاف ہے احادیثِ معصومین علیہم السلام سے اس خیال کی نفی ہوتی ہے۔ اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ بیماری بھی خدا کی ایک نعمت ہے جس سے انسان کو کئی ایک فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اوّل ۔ یہ کہ اکثر اوقات صحیح المزاج آدمی یادِ خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب مریض ہوتا ہے تو یادِ خدا تازہ ہو جاتی ہے۔ اور توبہ کرنے کا ایک عمدہ موقع مل جاتا ہے۔ اس لئے احادیث میں مرض کو بریدالموت (موت کا ایلچی) قرار دیا گیا ہے۔

دوم ۔ یہ کہ صحت کی حالت میں اکثر و بیشتر انسان وصیت کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر کسی کو کچھ دینا ہے یا کسی سے کچھ لینا ہے۔ یا حقوق اللہ یا حقوق العباد اس کے ذمہ ہیں۔ تو ان کی ادائیگی کی وصیت واجب و لازم

لا تحب الموت قال و جاء رجل عند ابی ذرؓ و قال ما لنا نکرہ الموت فقال لانکم عمرتم الدنیا و خربتم الآخرۃ فتکرھون ان تنقلوا من عمران الی خراب وقیل له

فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے جناب سرور کونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ مجھے کیا ہے کہ میں موت کو ناپسند کرتا ہوں۔ جناب نے فرمایا کیا تیرے پاس کچھ مال و دولت ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا کیا تو نے اسے اپنے آگے بھیج دیا ہے اس نے عرض کیا نہیں! آپ نے فرمایا اسی وجہ سے تو موت کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی زندگی میں اس مال کو راہ خدا میں خرچ کرکے آگے بھیج دیا ہے اس نے عرض کیا نہیں۔ آنحضرت نے فرمایا بس اسی بنا تو موت کو پسند نہیں کرتا۔ انہی جناب سے یہ بھی روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ

ہوتی ہے۔ اور وصیت کی اس قدر تاکید ہے کہ محدث جزائری نے انوار نعمانیہ میں کتاب مستطاب روضۃ الواعظین کے حوالہ سے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی ہے من مات بغیر وصیۃ مات میتۃً جاھلیۃ۔ فرمایا جو شخص بغیر وصیت کے مر جائے وہ جہالت کی موت مرتا ہے۔ نیز آپ کا ارشاد ہے۔ لا ینبغی لامرء منکم ان یبیت لیلۃ الا و وصیتہ تحت رأسہ۔ فرمایا مسلمان آدمی کو چاہیے کہ جب رات کو سوئے تو اس کی وصیت اس کے سر کے نیچے ہو (وسائل الشیعہ) ظاہر ہے کہ ناگہانی موت میں اکثر اوقات انسان وصیت کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

سوم۔ یہ کہ مرض کی وجہ سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور درجات کی بلندی کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں چنانچہ روایت میں ہے کہ ایک دن کا بخار ایک سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ اور جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا ایک رات کے بخار کا ثواب ایک سال کی عبادت کے برابر ہے۔ دو رات کے بخار کا ثواب دو سال کی عبادت کے برابر۔ اور تین رات کے بخار کا اجر ستر سال کی عبادت کے برابر ہے (انوار نعمانیہ) ظاہر ہے کہ ناگہانی موت مرنے والا اس سعادت سے بھی محروم ہوتا ہے۔

چہارم۔ یہ کہ مرض کی وجہ سے عیادت اور بیمار پرسی کرنے والوں کو بھی اجر و ثواب حاصل کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ چنانچہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا جب کوئی شخص کسی بندہ مومن کی مزاج پرسی کرنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے ہر ہر قدم پر ہزار ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور ستر ستر ہزار برائیاں محو کی جاتی ہیں (انوار نعمانیہ) لیکن ناگہانی موت مرنے والے کے بارہ میں لوگ اس شرف سے بھی محروم رہتے ہیں۔ الی

ہم لوگ موت کو ناپسند کرتے ہیں؟ جناب ابوذر نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے دنیا کو تو آباد و شاداب مگر آخرت کو برباد کر رکھا ہے اس لئے آبادی کو چھوڑ کر بربادی کی طرف جانا تم پسند نہیں کرتے۔ کسی اور شخص نے عرض کیا کہ آپ کے خیال میں ہمارا اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم خدا	کیف تری قدومنا علی اللہ تعالیٰ فقال اما المحسن فکالغائب یقدم علی اھلہ و اما المسیٔ

غیر ذلک من الفوائد الکثیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ اخبار و ادعیہ میں ناگہانی موت سے پناہ مانگی گئی ہے اللّٰھم انی اعوذ بک من الموت الفجأۃ۔ اعاذنا اللہ منہ۔

افادۂ جدیدہ

بعض اخبار و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علی نبینا و آلہ و علیہ السّلام کے زمانہ سے پہلے بیماری نہ تھی۔ لوگ اچانک مر جاتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ رب العزت میں دعا کی کہ بارالہا! کوئی ایسی علامت مقرر فرما جس سے مرنے والے کو بھی فائدہ ہو۔ اور پس ماندگان کو بھی تسلی ہو اس وقت خداوند عالم نے بیماری مقرر کی۔ (اصول کافی)

پس ثابت ہوا کہ بیماری وہ چیز ہے کہ جسے انبیاء علیہم السّلام نے منعم حقیقی سے بذریعہ دعا مانگ کر حاصل کیا ہے لہٰذا مومن کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ اور نہ اس پر شکوہ و شکایت کرنا چاہیے بلکہ صبر و شکیبائی سے کام لینا چاہیے خداوند عالم چاہتا ہے کہ مومن کو جنت میں داخل کرے اور چونکہ وہ بعض گناہوں کی لوث میں بھی ملوث ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کے بعض گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اور اگر بالفرض اس سے بھی متجاوز ہوں تو پھر فشار قبر ان کا کفارہ قرار پاتا ہے اور اگر خدانخواستہ اس سے بھی زائد ہوں تو پھر عالم برزخ کے شدائد ان کا کفارہ بن جاتے ہیں تاکہ قیامت کو پاک و صاف ہو کر داخل جنت ہو سکے۔ اور اگر برزخ کے شدائد بھی کفارہ نہ بن سکیں تو قیامت کو جناب شفیع امت اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی شفاعتِ کبریٰ سے سب داغ عصیاں دھل جائیں گے۔ رزقنا اللہ شفاعتھم فی الدنیا والاخرۃ وسھل علینا سکرات الموت وشدائد القبر والبرزخ بجاہ النبی والہ الطاھرین صلوات اللہ علیھم اجمعین

نیند اور موت میں مشابہت

حکماء ربانیین یعنی آئمہ طاہرین نے محض اس خیال کے پیش نظر کہ ہم موت سے خوف و ہراس کرنا چھوڑ دیں اور اس کے لئے ہر وقت مستعد و آمادہ رہیں مختلف طریقوں سے موت کو بالکل آسان کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں متن رسالہ میں متعدد روایات موجود ہیں مگر بالخصوص جناب امام محمد باقر علیہ السّلام نے موت کو النوم (نیند) کہہ کر موت اور نیند کے درمیان بڑی بلیغ تشبیہ قائم کی ہے۔ اس کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے کہ روح کو اپنے جسم کے ساتھ دو قسم کا تعلق ہے ایک ادراک و

فکلا یقدم علی مولاہ وھو منہ خائف قیل فکیف تری حالنا عند اللہ قال اعرضوا اعمالکم علی کتاب اللہ تعالی حیث یقول

کے حضور میں حاضر کئے جائیں گے ۔ جناب نے فرمایا ۔ پرہیزگار لوگ تو اسی طرح حاضر ہوں گے ۔ جس طرح ایک مسافر خوش و خرم ہو کر اپنے اہل و عیال کی طرف واپس آتا ہے لیکن بدکار اس طرح حاضر کئے جائیں گے جس طرح ایک بھگوڑا غلام اپنے آقا کے حضور میں خوف و ہراس کی حالت میں حاضر ہوتا ہے ۔ عرض کیا گیا آپ کے خیال میں خدا کے حضور ہمارا کیا حال ہوگا ؟ فرمایا تم اپنے اعمال کو قرآن پر پیش کرو ۔ خدا فرماتا ہے

احساس کا دوسرا تدبیر و تصرف کا ۔ نیند میں ادراک و احساس والا تعلق ختم ہو جاتا ہے ۔ اس لئے آلات تعقل و ادراک اپنے گردوپیش کے حالات سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں ۔ مگر اس حالت میں روح کا تدبیر و تصرف اور تغذیہ والا تعلق برقرار رہتا ہے ۔ وہ جسم کی نشوونما اور بقا میں برابر مشغول رہتی ہے ۔ اور موت میں یوں ہوتا ہے کہ روح کے یہ دونوں قسم کے تعلق سے منقطع ہو جاتے ہیں ۔ اب نہ ادراک و احساس رہتا ہے ۔ اور نہ تدبیر و تصرف ۔ خلاق عالم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے ۔ وھو الذی یتوفکم باللیل ویعلم ما جرحتم بالنھار ثم یبعثکم فیہ لیقضی اجل مسمّیٰ (سورہ انعام) خدا وہی ہے جو تم کو رات کے وقت مارتا ہے ۔ اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو ۔ اُسے جانتا ہے ۔ پھر تم کو دن میں جلاتا (بیدار کرتا) ہے تاکہ مقررہ وقت پورا ہو سکے ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے ۔ اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمّی ان فی ذلک لایت لقوم یتفکرون (سورۂ زمر) خداوند عالم ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے ۔ اور جو نہیں مری ہیں ۔ ان کو ان کی نیند کے وقت (وفات دیتا ہے) جس کے متعلق اس نے موت کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ اسے روک لیتا ہے ۔ اور دوسری روحوں کو ایک وقت مقرر تک چھوڑ دیتا ہے ۔ اس میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے قدرت کاملہ کی نشانیاں موجود ہیں ۔

مومن و کافر کی موت میں فرق

جناب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے مومن و کافر کی موت کے درمیان جو فرق بیان فرمایا ہے یہ تفریق قرآن مجید میں نمایاں ہے ۔ اللہ اللہ موت کا وقت بھی عجیب کش مکش کا وقت ہوتا ہے ۔ خصوصاً کفار و عصاۃ کے لئے ۔ ان کے گذشتہ اعمال ان کے

ان الابرار لفی نعیم وانّ الفجّار لفی جحیم قال رجل فاین رحمۃ اللہ قال انّ رحمۃ اللہ قریب من المحسنین۔

نیکوکار انسان خدا کی نعمتوں میں مسرت کی زندگی بسر کریں گے اور بدکار بندے جہنم میں رہیں گے۔ ایک آدمی نے اپنی جناب سے دریافت کیا کہ رحمتِ خداوندی کہاں ہوگی؟ فرمایا! رحمتِ الٰہی خدا کے نیکوکار بندوں کے قریب ہوگی۔

پردہ چاک ہو جاتا ہے فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید۔ خداوند عالم نے موت کا نقشہ بدیں الفاظ پیش کیا ہے۔ کلا اذا بلغت التراقی وقیل من راق وظن انہ الفراق والتفت الساق بالساق الی ربک یومئذ المساق۔ جب روح ہنسلی تک آجائے گی اور کہا جائے گا۔ اس وقت کون ہے۔ جھاڑ پھونک کر کے موت سے بچانے والا اور وہ سمجھے گا کہ یہ جدائی کا وقت ہے۔ اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔ وہ وقت تیرے پروردگار کی طرف ہنکائے جانے کا ہوگا۔ بُرے لوگوں کی موت کی کیفیت خالقِ موت وحیات نے اس طرح بیان فرمائی ہے۔ ولو تری اذ الظالمون فی غمرات الموت والملائکۃ باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تقولون علی اللہ غیر الحق وکنتم عن ایاتہ تستکبرون ولقد جئتمونا فرادیٰ کما خلقنکم اول مرۃ وترکتم ما خولنکم ورآء ظھورکم (سورۃ انعام پ ۶ ع ۱۱) اگر تم دیکھو کہ جب ظالم و گنہگار لوگ شدائدِ موت میں مبتلا ہوں۔ اور فرشتے ہاتھ کھولے یہ کہہ رہے ہوں اپنی روحوں کو نکالو۔ آج تم کو ذلت و رسوائی والی سزا ملے گی۔ کیونکہ تم خدا کے بارے میں غلط باتیں کرتے تھے۔ اور اس کی آیات سے تکبر کرتے تھے۔ آج تم ہمارے پاس اسی طرح تنہا آئے ہو۔ جس طرح ہم نے تم کو تنہا پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ مال واسباب ہم نے تم کو دیا تھا۔ اسے آج اپنے پیچھے چھوڑ آئے" ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ ولو تریٰ اذ یتوفی الذین کفروا الملائکۃ یضربون وجوھھم وادبارھم وذوقوا عذاب الحریق ذلک بما قدمت ایدیکم وان اللہ لیس بظلام للعبید (سورۃ انفال ع پ ۶) اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان قبض کرتے ہیں کہ ان کے منہ اور پیٹھ پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں جلنے کے عذاب کا ذائقہ چکھو۔ یہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کا بدلہ ہے۔ خدا اپنے بندوں پر ہرگز ظلم وستم نہیں کرتا۔

نیک لوگوں کی موت کا نقشہ اس سے بالکل علیحدہ ہے۔ ان کو بوقتِ مرگ جنتِ نعیم کی بشارتیں سنائی جاتی ہیں اور ہر طرف شادمانی وکامرانی کے اسباب نظر آتے ہیں۔ ارشادِ قدرت ہوتا ہے انّ الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون نحن اولیاؤکم

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ فلولا اذا بلغت الحلقوم و انتم حینئذ تنظرون و نحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون فلولا ان کنتم غیر مدینین ترجعونھا ان کنتم صٰدقین فاما ان کان من المقربین فروح و ریحان و جنّت نعیم و اما ان کان من اصحاب الیمین فسلام لک من اصحب الیمین (سورۃ واقعہ پ۲۷ ع) تو کیا جب جان گلے تک آ پہنچتی ہے۔ اور تم اس وقت (کی حالت) پڑے دیکھا کرتے ہو اور ہم اس (مرنے والے) سے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی کے دباؤ میں نہیں ہو تو اگر (اپنے دعوے میں) تم سچے ہو تو روح کو پھیر کیوں نہیں دیتے۔ پس اگر وہ (مرنے والا) خدا کے مقربین سے ہے تو اس کے لئے آرام و آسائش ہے اور خوشبودار پھول اور نعمت کے باغ اور اگر وہ داہنے ہاتھ والوں میں سے ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ تم پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام ہو اسی لئے مومن خوش ہو کر موت سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لب او

ایقاظ و تنبیہ

اس باب کی ابتداء میں سلسلۂ کیفیتِ موت حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا جو کلام حقیقت ترجمان موجود ہے وہ قواصم ظہور میں سے ہے۔ اور ان لوگوں کو جو خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں۔ اور زبانی دعوائے محبت اہل بیت کر کے بغیر اس کے کہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اپنی اخروی نجات کے خواب دیکھتے ہیں، کو جھنجھوڑ کر بیدار کر رہا ہے۔ آنجناب نے تمام لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم فرما دیا ہے کہ بعض وہ ہیں جن کو موت کے وقت نعیم ابدی کی بشارت دی جاتی ہے۔ اور کچھ وہ ہیں جن کو دائمی عذاب کی نذارت کی جاتی ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن کا معاملہ مجمل و مبہم ہوتا ہے نہ معلوم انجام کیا ہو۔ پھر آنجناب واضح الفاظ میں ارشاد فرما رہے ہیں، کہ نعیم ابدی کی بشارت کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ولایت اہل بیتؑ، دوسری اطاعتِ اہل بیتؑ بلکہ اگر بنظرِ غائر حقائق کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ ولایت اہل بیتؑ بلا اطاعت اہل بیتؑ کے متحقق ہو ہی نہیں سکتی۔ جیسا کہ اصولِ کافی میں حضرت باقر العلوم علیہ السلام کا یہ فرمان موجود ہے۔ لا تنال ولا یتنا الا بالعمل والورع۔ ہماری ولایت عمل صالح اور حرام سے اجتناب کئے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

ع
تعصی الالہ و انت تظہر حبہ — ھذا لمحال فی القیاس بدیع
لو کان حبک صادقاً لاطعتہ — ان المحب لمن یحب مطیع

پھر یہ امر بھی بلا کسی اجمال و ابہام کے بیان فرما دیا ہے کہ جو لوگ اہل بیتؑ کے دشمن اور ان کے احکام کے مخالف ہیں۔ وہ ابدی عذاب و عقاب میں مبتلا ہوں گے۔ ان کی نجات کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

اسی طرح جناب امیر المومنین علیہ السلام نے ان خوش عقیدہ اور فریب خوردہ لوگوں کے ڈھول کا پول بھی کھول کے رکھ دیا ہے۔ جو آئمہ اہل بیتؑ کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کی تاسی و اطاعت گذاری کے بغیر فقط زبانی جمع خرچ کرتے ہوئے علیؑ علیؑ کر کے سیدھے جنت جانا چاہتے ہیں۔ حضرت سید الموحدینؑ نے واضح فرما دیا ہے کہ ایسے لوگوں میں اور دشمنانِ اہلبیتؑ میں یہ فرق ہے کہ مخالفین خلد فی النار ہوں گے اور یہ لوگ مخلد فی النار نہ ہوں گے۔ شفاعت اہلبیتؑ کی وجہ سے داخلِ جنت ضرور ہوں گے۔ مگر اپنے اپنے گناہوں کی مقدار کے مطابق آتش دوزخ میں ان کی تطہیر ضرور کی جائے گی۔ حتیٰ کہ کچھ بدعمل ایسے بھی ہوں گے جو تین تین لاکھ سال تک گرفتارِ عذاب رہنے کے بعد شفاعتِ اہل بیتؑ کا استحقاق پیدا کریں گے۔ الامان والحفیظ۔

ان امور کی مزید وضاحت باب شفاعت میں کی جائے گی انشاء اللہ۔ ان حقائق کی روشنی میں ایسے لوگوں کا فرض ہے جو اس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنے نظریہ پر نظرثانی کریں۔ اور فقط زبانی دعوائے محبت اہل بیتؑ پر اعتماد و بھروسہ کر کے عقائد و اخلاق اور اعمال میں ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ کیونکہ افعال و اقوال میں اہل بیتؑ نبوتؐ کی پیروی کے بغیر ہرگز ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایمان کے ساتھ عمل کو توأم بیان کیا گیا ہے اور جہاں کہیں بھی جنت یا ثواب کی بشارت دی گئی ہے وہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کی قید ضرور لگائی گئی ہے الذین امنوا و عملوا الصّٰلحٰت۔ ان الذین امنوا و عملوا الصّٰلحٰت کی بار بار تکرار نظر آتی ہے۔ سچ ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ شیعتنا من تابعنا فی افعالنا و لم یخالفنا۔ ہمارے شیعہ وہ ہیں جو ہماری متابعت و پیروی کرتے ہیں اور ہماری مخالفت نہیں کرتے (محاسن برقیؒ)

ان الذین امنوا و عملوا الصّٰلحٰت طوبیٰ لھم و حسن مآب۔

تتمہ مہمہ در حضور آئمہ عند الاحتضار

مخفی نہ رہے کہ من جملہ ان اعتقادات حقہ کے جن میں حضرات شیعہ خیر البریہ منفرد ہیں یہ ہے کہ ہر مرنے والے کو خواہ نیک ہو یا بد۔ اور خواہ مسلمان ہو یا کافر و منافق۔ جناب رسول خدا اور آئمہ ہدیٰ کی زیارت ہوتی ہے۔ ان کی زیارت سے اہلِ ایمان کے شدائد و مصائب، موت میں سہولت و آسانی اور اہلِ کفر و عناد کے شدائد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس عقیدہ کی صورت

پر اخبار متظافرہ و معتبرہ موجود ہیں جن کی کافی مقدار ثالث بحار الانوار میں جمع کر دی گئی ہے جن کے انکار یا تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ آیا حضرات معصومینؑ اپنے مراکز پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور ہر مرنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ میرے پاس موجود ہیں۔ جس طرح آفتاب اپنے محور پر ہوتا ہے اور ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ میرے سر پر ہے یا خود بنفس نفیس مرنے والے کے پاس تشریف لاتے ہیں۔ اور اس صورت میں آیا اپنے اصلی اجسادِ مبارکہ کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ یا اجساد مثالیہ کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اجمالی ایمان کافی ہے جیسا کہ غواص بحار الاخبار سرکار علامہ مجلسی نے اپنے رسالہ لیلیہ اعتقادیہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ ثم اعلم انه یجب الاقرار بحضور النبی والائمة الاثنا عشر علیهم السلام عند موت الابرار والفجار والمومنین والکفار فینفعون المؤمنین بشفاعتهم فی تسهیل غمرات الموت وسکراته علیهم وتشدد ون علی المنافقین و اهل البیت علیهم السلام ...... الی ان قال ویجب الاقرار به مجملا التفکر فی کیفیة انك انهم یحضرون فی اجسادہ الاصلیة او امثالیة او بغیرہ لك ولا یجوز التاویل بالعلم وانتقا الصور فی القوی الخیالة فان تحریف لما ثبت فی الدین وتضیع لعقائد المومنین۔ یعنی ہر نیک و بد اور مومن و کافر کی موت کے وقت جناب رسولِ خدا و آئمہ ہدیٰ کے حضور کا اعتقاد رکھنا واجب ہے۔ یہ ذوات مقدسہ اہلِ ایمان کو اپنی شفاعت سے سکرات و شدائد موت میں فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اور اہلِ نفاق اور دشمنانِ اہل بیت کی شدتِ نزع میں اور اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ اس بات پر اجمالی ایمان رکھنا کافی ہے۔ اس امر میں غور و فکر کرنا لازم نہیں ہے کہ آیا یہ بزرگوار اپنے اصلی اجسادِ مبارکہ میں تشریف لاتے ہیں یا مثالی اجسام کے ساتھ یا کسی اور طریقہ سے؟ یہ تاویل کرنا جائز نہیں ہے کہ مرنے والے کو صرف علم ہوتا ہے یا یہ کہ قوتِ متخیلہ میں ان کی صورتیں منتقش ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح کرنے سے ایک ثابت شدہ دین حقیقت میں تحریف اور اہلِ ایمان کے عقائد حقہ کی تضیع لازم آتی ہے۔

موت طبعی و اختر امی کا بیان

موت کی دو قسمیں ہیں ایک کو طبعی کہا جاتا ہے جو مرض وغیرہ خدا کے مقرر کردہ عام عادی علل و اسباب کے ماتحت واقع ہوتی ہے۔ دوسری کا نام ہے اختر امی وہ عادی اسباب کے ماتحت واقع نہیں ہوتی بلکہ کسی ظالم کے زبردستی رشتۂ حیات قطع کرنے سے واقع ہوتی ہے جیسے قتل وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ پہلی قسم کی موت تو من جانب اللہ مقدر ہوتی ہے جس کی تفصیل

بعض سابقہ ابواب میں بلکہ قضا و قدر کے ضمن میں گذر چکی ہے۔ باقی رہی دوسری موت اس کا علم تو خداوند عالم کو ضرور ہوتا ہے مگر اس نے یہ موت مقدر نہیں کی ہوتی۔ بلکہ قاتل حکم خدا کی مخالفت کرتے ہوئے مقتول کے رشتۂ حیات کو قطع کرتا ہے اسی بنا پر مستحق عذاب و عقاب قرار پاتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ قاتل مقتول کی شمع حیات گل نہ کرتا تو مقتول کس قدر زندہ رہتا؟ اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے ایک طویل عرصہ دار البقا کی طرف رحلت کرجاتا۔ واللہ العالم بحقائق الامور

ستر ھواں باب قبر میں سوال و جواب

قبر میں نکیرین کے سوال ، فشارِ قبر اور عالم برزخ کے ثبوت پر تمام اہل ایمان بلکہ قریباً سب اہل اسلام کا اتفاق ہے فقط ملاحدہ و دہریہ ان اُمور کے منکر ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ نموت و نحیٰی و ما یہلکنا الا الدھر کہ ہم زندہ ہیں پھر مرجائیں گے وبس۔ نہ کوئی سوال و جواب ہوگا۔ اور نہ حساب و کتاب۔ نہ حشر و نشر ہوگا۔ اور نہ جنت و دوزخ۔ لیکن ان کا یہ خیال باطل اور زعم عاطل ہے (کما سیتضح انشاء اللہ) دیوان منسوب بحضرت امیر المومنین علیہ السلام میں وارد ہے ع۔

ولو انا اذا متنا ترکنا — لکان الموت راحۃ کل حی
ولکنا اذا متنا بعثنا — ونسئل بعدہ عن کل شئی

یعنی اگر یوں ہوتا کہ مرنے کے بعد ہم کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو پھر تو یقیناً موت ہر زندہ آدمی کے لئے باعث راحت و سکون ہوتی۔ لیکن (ایسا نہیں ہے) کیونکہ جب ہم مرجائیں گے تو اس کے بعد دوبارہ (قبر میں) زندہ کئے جائیں گے اور اس کے بعد ہر چیز کے متعلق سوال و جواب ہوگا۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ ع

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ موت کا مرحلہ بھی بہت کٹھن ہے لیکن بعد والے مراحل و منازل اس سے زیادہ خطرناک اور ہولناک ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ یا عباد اللہ ما بعد الموت لمن لا یغفر لہ اشد من الموت .... القبر فاحذروا ضیقہ وضنکہ و ظلمتہ ان القبر یقول کل یوم انا بیت الغربۃ انا بیت التراب انا بیت الوحشۃ انا بیت الدود والھوام والقبر روضۃ من ریاض الجنۃ او حفرۃ من حفر النار (نہج البلاغہ) اے اللہ کے بندو! یاد رکھو اس شخص کے لئے جس کی بخشش نہ ہوئی ہو (اعاذنا اللہ منہ) موت کے بعد جو کچھ ہے۔ وہ موت سے بھی زیادہ سخت و سنگین ہے (موت کے بعد قبر کا مرحلہ ہے۔ پس قبر کی تنگی اور تاریکی سے ڈرو۔ قبر ہر روز زبان حال سے کہتی ہے۔ میں وحدت و تنہائی کا گھر ہوں میں مٹی کا گھر ہوں۔ میں وحشت و گھبراہٹ کا گھر ہوں۔ میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں۔ یاد رکھو۔ قبر یا جنت کے باغوں میں

انها حق لابد منها فمن اجاب بالصواب فاز بروح وريحان فی قبره وجنة النعيم فی الاخرة ومن لم يجب بالصواب	جو شخص ان سوالات کا صحیح جواب دے گا اُسے قبر میں راحت اور خوشی و خوشبو اور آخرت میں جنت نعیم حاصل ہوگی ۔ اور جو شخص صحیح جواب نہ دے سکے گا

سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے ۔ سهل الله علينا هذه المراحل

عالمِ برزخ اور اُس کے بعض شدائد کا بیان

لغوی اعتبار سے ہر اُس چیز کو جو دو چیزوں کے درمیان حاجب و حائل ہو اسے "برزخ" کہا جاتا ہے ارشادِ قدرت ہے ۔ بينهما برزخ لا يبغيان ۔ ان ہر دو دریاؤں کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے ۔ جس کی وجہ سے ایک دوسرے پر نہیں چڑھتا ۔ اسی مناسبت سے موجودہ زندگی اور آخرت والی زندگی کے درمیان جو زمان حائل ہے یعنی موت سے لے کر قیامِ قیامت تک جو درمیانی زمانہ ہے ۔ اُسے اصطلاحِ شریعت میں برزخ کہا جاتا ہے و من ورائهم برزخ الی يوم يبعثون بعض لوگ اس عالم کو "عالم مثال" "عالم اشباح" "عالم ظلال" وغیرہ اسماء سے بھی تعبیر کرتے ہیں ۔ ولا مشاحة فی الاصطلاح ۔ اور یہ عالمِ برزخ والا مرحلہ بہت ہی مشکل ہے اَئمہ طاہرین علیہم السّلام نے اس سے بہت ہی ڈرایا ہے اور اس میں درپیش آنے والے مصائب و شدائد سے نجات حاصل کرنے کے لئے اعمالِ صالحہ کا ذخیرہ جمع کرنے کی تاکید شدید فرمائی ہے ۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں ۔ والله ما اخاف عليكم الا البرزخ فاما اذا صار الامر الينا فنحن اولى بكم ۔ بخدا مجھے تمہارے متعلق جس قدر خوف و ہراس ہے وہ عالمِ برزخ ہی کے متعلق ہے لیکن جب قیامت کا دن ہوگا اور معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا ۔ تو اس وقت ہم تمہاری شفاعت کرنے کے سب سے زیادہ حق دار ہیں ۔ (حق الیقین از علامہ سیّد عبداللہ شبّر رحمہ) اسی طرح اُصولِ کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے روایت ہے ۔ راوی کہتا ہے میں نے خدمت میں عرض کیا ۔ میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ كل شيعتنا فی الجنة علی ما كان فيهم ۔ ہمارے سب کے سب شیعہ خواہ ان کے عمل کیسے ہی ہوں جنت میں جائیں گے ۔ امام نے فرمایا ۔ ہاں میں نے یہ ضرور کہا ہے ۔ راوی نے عرض کیا میرے آقا میں آپ پر قربان ہوں ۔ آپ کے نام لیوے کچھ ایسے بھی ہیں جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہیں (تو پھر سب کے سب جنت میں کیسے جا سکتے ہیں) امام عالی مقام نے فرمایا ۔ اما فی القيامة فكلكم فی الجنة بشفاعة النبی المطاع صلی الله عليه و اله وسلم او وصی النبی عليه السلام ولكن والله اتخوف عليكم فی البرزخ جہاں تک قیامت کا تعلق ہے اس روز تو تم سب ہی جنت میں داخل ہو گے ۔ نبی مطاع یا ان کے اوصیاء کی شفاعت کی وجہ

فله نزول من حميم فی قبره وتصلية جحيم فی الاخرة و اکثر مايکون عذاب القبر	اس کی قبر میں آگ نازل ہوگی ۔ اور بروز حشر اسے آتشِ جہنم میں جھونکا جائے گا۔ اور اکثر و بیشتر عذابِ قبر کا باعث

کی وجہ سے ۔ ہاں البتہ خدا کی قسم مجھے تمہارے متعلق اگر خوف ہے تو وہ برزخ کا ہے ۔ راوی نے عرض کی ۔ آقا وہ برزخ کیا ہے فرمایا القبر منذ موته الی يوم القيامة ۔ وہ موت سے لے کر قیامت تک قبر والا درمیانی زمانہ ہے جیسے ارشادِ ربّ العزت ہے ۔ و من ورائهم برزخ الی يوم يبعثون ان کے پیچھے عالمِ برزخ ہے یوم حشر تک

موت کے بعد قیامت تک درمیانی عرصہ میں انسان پر کیا گذرتی ہے

اگرچہ یہ بحث بہت طویل الذیل ہے ۔ جس کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ۔ ہاں جو کچھ اخبارِ معصومین علیہم السلام سے ثابت ہوتا ہے ۔ اس کا جامع خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے تو وہ میّت کے ساتھ ساتھ رہتی ہے ۔ جب میّت کو دفن کیا جاتا ہے تو اسی جسم میں دوبارہ اس کی رُوح کو داخل کیا جاتا ہے ۔ باقی رہا یہ امر کہ آیا اسے تمام جسم میں داخل کیا جاتا ہے یا فقط کمر تک بالائی حصّہ میں ؟ اس کی تفاصیل میں اختلاف ہے اگرچہ اکثر روایات سے دوسرا قول ظاہر ہوتا ہے بہرکیف اتنا تو عقلاً بھی ثابت ہے کہ جب میّت سے سوال وجواب ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ جب تک اس میں روح نہ ہو ۔ اور وہ تفہیم و تفہیم کے قابل نہ ہو ۔ اس وقت تک اُس سے سوال و جواب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ بہرحال اس وقت خداوند عالم کے مقرر کردہ دو فرشتے جن کے صفاتی نام منکر و نکیر ہیں جو انتہائی قبیح المنظر اور ہولناک شکل و صورت رکھتے ہیں اور ان کی آواز بجلی کی کڑک کی طرح تند و تیز ہوتی ہے ۔ قبر میں سوال وجواب کے لئے داخل ہوتے ہیں ۔ البتہ اس امر میں قدرے اختلاف ہے کہ آیا ہر مرنے والے کے پاس خواہ مومن ہو یا کافر یہی دو فرشتے آتے ہیں یا بعض کے پاس کچھ اور ملائکہ آتے ہیں ؟ چنانچہ بعض روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مرنے والے کے پاس یہی دو فرشتے جاتے ہیں اور یہی مشہور بھی ہے ۔ لیکن بعض روایات سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ مومن کی قبر میں جو فرشتے آتے ہیں ان کے صفاتی نام "مبشر و بشیر" ہیں ۔ جو بہت ہی خوش منظر و خوبصورت اور خوش آواز ہوتے ہیں جو آکر مومن کو جنت الفردوس اور خوشنودیٔ خدا کی بشارت دیتے ہیں ۔ بہرحال جو شخص ان فرشتوں کے سوالات کے صحیح جوابات دے دے وہ اُسے جنت کی بشارت دے کر چلے جاتے ہیں ۔ اور جو صحیح جواب نہ دے سکے اُسے آہنی گرزوں سے سزا دیتے ہیں ۔ فشارِ قبر کی تکلیف اس کے علاوہ ہے ۔ اس کے بعد وہ فرشتے چلے جاتے ہیں ۔ اور انسان دوبارہ مرجاتا ہے ۔ اب اس کا جسم تو وہیں قبر میں ہی رہ جاتا ہے ۔ البتہ روح عالم برزخ میں منعّم یا معذب رہتی ہے ۔ اب اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا یہ جزا یا سزا تنہا روح کو دی جاتی ہے یا اسے جسم مثالی میں

من النمیمة و سوء الخلق والاستخفاف من البول واشدّ ما یکون عذاب القبر علی المؤمن المحق مثل اختلاج العین او شرطة الحجامة و یکون .

چغل خوری ، بد خلقی اور پیشاب (کی نجاست) کو خفیف (سمجھنا) اور اس لئے اس سے اجتناب کرنے سے ہوتا ہے ۔ مومن کے لئے قبر میں سخت سے سخت عذاب آنکھ کے پھڑکنے یا پچھنے لگانے کی تکلیف کے برابر ہوگا ۔ اور یہ اس کے

داخل کر کے دی جاتی ہے جو شکل و صورت میں تو دنیوی جسم کی مانند ہوتا ہے ۔ لیکن اس میں مادی گوشت و پوست وغیرہ اجزاء نہیں ہوتے ۔ جو قول بکثرت اخبار معتبرہ سے پایۂ ثبوت تک پہنچا ہے وہ یہی دوسرا قول ہے ۔ لیعنی یہ کہ روح کو جسم مثالی میں رکھ کر جزا یا سزا دی جاتی ہے ۔ مومنین کی روحیں وادی السلام (جو کہ سرزمین عراق میں نجف اشرف کے پاس ایک عظیم الشان قبرستان ہے) میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی ہیں ۔ اور کفار و مشرکین اور نصاب و خوارج کی روحیں وادی برہوت (جو کہ یمن میں ایک وادی ہے) میں مبتلائے عذاب و عقاب رہتی ہیں ۔

قوی یقین ہے مجھ کو دیکھ لیں وہاں یہ مومنیں اٹھوں گا میں بروز حشر وادی السلام سے

عالم برزخ اور واقعات بعد الموت کے کل مباحث کا یہ ہے جامع خلاصہ جو آیات و روایات آئمہ اطہار اور بیانات علماء کبار سے ماخوذ و مستفاد ہے ۔

باوجود علم باری کے پھر منکر و نکیر کے سوال کی کیا ضرورت ہے ؟

مذکورہ بالا مطالب میں سے چند امور قدرے تشریح طلب اور مزید غور و فکر کے مستدعی ہیں ۔

امر اوّل

جب خود خداوند عالم کو لوگوں کے اعمال کا علم ہے تو پھر اس نے سوال و جواب کے لئے یہ فرشتے مقرر کیوں کئے ہیں ؟ اس سوال کا اجمالی مگر تحقیقی جواب یہ ہے کہ یقیناً خداوند عالم کو ذرہ ذرہ کا علم ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے ولا یعزب عن علمه مثقال ذرة فی الارض ولا فی السماء (سورۃ سبا پ ع) اس کے علم سے زمین و آسمان میں کوئی ذرہ بھی مخفی نہیں ہے " وہ علیم بذات الصدور عالم السر و اخفیٰ ہے ۔ لہٰذا اس نے اپنے معلومات میں اضافہ کی غرض سے یہ نظام قائم نہیں کیا بلکہ اس نے بعض ملائکہ کی یہی عبادت مقرر کی ہے جیسے کراماً کاتبین کی عبادت کتابت اعمال ہے ۔ اور بعض کی عبادت بندگان خدا کی حفاظت و حراست ہے ۔ اور بعض کی عبادت تسبیح و تہلیل اور بعض کی رکوع و سجود ہے ۔ اور یہ اس کا نظام ربوبیت ہے ۔ جس کی جو چاہی ڈیوٹی مقرر کر دی اور وہی ڈیوٹی اس کی عبادت ہو گئی ۔ عباد مکرمون لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون ۔

اس میں کوئی شک نہیں قبر کے سوال و جواب کا اقرار ضروریات دین میں سے ہے اور نہیں تو اس کے ضروریات مذہب

ذلك كفارة لما بقي عليه من الذنوب التي لم تكفرها الهموم والغموم والامراض وشدة النزع

ان گناہوں کا جو دنیوی تکلیفوں، مصیبتوں اور بیماریوں یا جان کنی کی سختیوں کے جھیلنے کے بعد بھی باقی رہ گئے تھے کا کفارہ ہوگا۔

سے ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے۔ حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ من انکر ثلاثة اشیا فلیس منا المعراج والمسآئلة فی القبر والشفاعة (امالی شیخ صدوق) جو شخص تین چیزوں کا انکار کرے وہ ہمارے شیعوں سے نہیں ہے وہ تین امور یہ ہیں۔ معراج جسمانی۔ سوال قبر اور شفاعت رسول خدا و آئمہ ہدیٰ۔

امر دوم آیا قبر میں ہر شخص سے سوال و جواب ہوتا ہے

لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ آیا قبر میں ہر شخص سے سوال و جواب ہوتا ہے۔ یا فقط بعض سے اور بعض کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے؟ اس کے متعلق اگرچہ مشہور یہی ہے کہ ہر مرنے والے سے قبر میں سوال و جواب ہوتا ہے لیکن جواہر عترت طاہرہ کے اخبار معتبرہ سے پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سوال و جواب خالص مومنین اور خالص کفار و مشرکین (جن میں ناصبی و خارجی بھی شامل ہیں) سے ہوتا ہے۔ باقی بچے اطفال، مجانین اور مستضعفین یعنی درمیانی طبقہ کے مسلمین ان کو بالکل نظر انداز کر کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ زمانۂ برزخ میں نہ ان کے لئے کوئی جزا ہے اور نہ کوئی سزا۔ ان کی کیفیت یوں ہے جیسے کوئی سویا ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب حشر و نشر ہوگا اور وہ محشور ہوں گے تو پکار اٹھیں گے من بعثنا من مرقدنا کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے بیدار کر دیا ہے؟ (سورۂ یٰسین) اذ یقول امثلهم طريقة ان لبثتم الا يوما (سورۂ طہٰ) ان میں سے جو زیادہ اچھا ہے وہ کہے گا کہ تم تو فقط ایک دن عالم برزخ میں ٹھہرے ہو۔ اس سلسلہ میں روایات بکثرت ہیں۔ دو چار بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

ابی بکر حضرمی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ لا يسئل في القبر الا من محض الايمان محضا او محض الكفر محضا۔ قبر میں سوال نہیں کیا جائے گا مگر اسی سے جو خالص مومن ہوگا یا خالص کافر۔ راوی نے عرض کیا۔ دوسرے لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔ فرمایا يلهى عنهم انہیں بالکل مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ (بحار الانوار جلد ۳)

اسی طرح عبد اللہ بن سنان جناب صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا انما يسئل في القبر من محض الايمان محضا او الكفر محضا واما سوى ذلك فيلهى عنه۔ یعنی قبر میں صرف اسی سے سوال کیا جائے گا جو محض مومن ہوگا یا محض کافر اور جو لوگ ان کے علاوہ ہیں۔ انہیں نظر انداز کر دیا جائے گا (اصول کافی)

عند الموت فان رسول الله كفن فاطمة بنت اسد ام امير المومنين بقميصه بعد ما فرغ النساء

جب عورتیں جناب فاطمہ بنت اسد مادر امیر المومنینؑ کے غسل سے فراغت پا چکیں تو جناب رسولؐ خدا نے اپنی قمیص مبارک میں ان کو کفن دیا

اسی طرح جناب محمد بن مسلم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا لا یسئل فی القبر الا من محض الایمان محضا او محض الکفر محضا (اصول کافی) الی غیر ذلک من الاخبار الکثیرۃ المعتبرۃ۔ انہی اخبار کے پیش نظر علمائے اعلام نے اپنی کتب اعتقادیہ و کلامیہ میں بطور جزم و یقین اسی نظریہ کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ ثالث بحار الانوار میں اس سلسلہ میں مباحث طویلہ لکھنے کے بعد قمطراز ہیں۔ اعلم ان الذی ظهر من الایات الکثیرۃ والاخبار المستفیضة والبراهین القاطعة هو ان النفس باقیة بعد الموت اما معذبة ان کان ممن محض الکفر او منعمة ان کان ممن محض الایمان او یلهی عنه ان کان من المستضعفین۔ الخ۔ یعنی جو کچھ آیات کثیرہ اخبار مستفیضہ اور براہین قاطعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ موت کے بعد نفس باقی رہتا ہے یا گرفتار عذاب ہو کر۔ اگر خالص کافر ہو یا نعمات الٰہیہ سے متنعم ہوتا ہے۔ اگر خالص مومن ہے۔ اور اگر مستضعفین میں سے ہے تو اسے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے

اسی طرح جناب علامہ سید عبد اللہ شبّر نے اپنی کتاب حق الیقین میں اس قسم کی بعض اخبار نقل کرنے کے بعد سرکار علامہ مجلسیؒ کی اس فرمائش کو نقل کر کے اس پر اظہار پسندیدگی فرمایا ہے۔

اسی طرح شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے بھی تصحیح الاعتقاد میں اسی قول کو والذی ثبت من الحدیث فی الباب ان الارواح بعد موت الاجساد علی هذین کہہ کر اختیار کیا ہے لیکن انہوں نے ان احادیث سے جن میں مستضعفین کو نظر انداز کرنے کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی روحیں بالکل فنا ہو جاتی ہیں لیکن ان احادیث شریفہ میں سے کسی حدیث سے بھی یہ امر ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ان احادیث میں یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ ان کی روحیں فنا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ صرف اس قدر موجود ہے کہ ان روحوں کو بالکل نظر انداز کر کے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور وہ عالم خواب کی طرح غنودگی میں پڑی رہتی ہیں۔ جیسا کہ بعض آیات سے بھی یہی ظاہر ہے۔ کما قدمنا واللہ العالم۔

محدث سید جزائری نے انوار نعمانیہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ ان درمیانے طبقہ کے لوگوں سے مراد جنہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کم عقل، مجنون، دو نبیوں کے درمیانی زمانہ والے لوگ اور وہ بوڑھے مرد و عورتیں ہیں جو زیادتی عمر کی وجہ سے ضعیف العقل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو نہ خالص مومن ہیں اور نہ ہی انہیں خالص کافر کہا جا سکتا ہے۔ پس

من غسلها وحمل جنازتها على عاتقه فلم يزل تحت جنازتها حتیٰ اوردها فی قبرها واضطجع

اس کے بعد ان کے جنازے کو قبر میں اتارنے تک اپنے کندھے پر اٹھایا۔ بعد ازاں خود بنفس نفیس قبر میں داخل ہو کر لیٹے پھر کھڑے ہو کر

یہ لوگ قبور میں اپنے حال پر باقی رہتے ہیں یہاں تک کہ خلاق حکیم بروز قیامت انہیں کامل العقل بنا کر ان کا اس طرح امتحان لے گا کہ آگ روشن کرکے ان کو اس میں داخل ہونے کا حکم دے گا۔ پس اگر وہ فرمانبرداری کرتے ہوئے اس میں داخل ہو گئے تو آتش نمرود کی طرح وہ آتش اُن پر گلزارِ جنت بن جائے گی۔ اور اگر مخالفت کی تو اُس میں زبردستی دھکیل دیئے جائیں گے۔ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے حق الیقین میں اسی تاویل کو پسند فرمایا ہے۔ نیز علامہ محسن فیض نے اپنے رسالہ شریفہ منہاج النجاۃ میں اسی عقیدہ کو اختیار فرمایا ہے۔ وھو الحق الحقیق بالاتباع۔ وللناس فیما یعشقون مذاھب۔

امر سوم قبر میں کن چیزوں کے متعلق سوال ہوتا ہے؟

یہ امر قابل غور ہے کہ قبر میں جو سوال و جواب ہوتا ہے۔ وہ آخر کن اُمور کے متعلق ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں احادیث معتبرہ سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہاں اُصول عقائد اور بعض فروع کی پرسش ہوتی ہے۔ چنانچہ اُصولِ کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے ایک طویل روایت منقول ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبر میں دو فرشتے آکر میّت سے سوال کرتے ہیں۔ من ربک (تیرا رب کون ہے)، ما دینک (تیرا دین کیا ہے؟) من نبیک (تیرا نبی کون ہے؟) من امامك (تیرا امام کون ہے؟) پس اگر میّت ٹھیک ٹھیک جواب دے دے تو فرشتے اس کی قبر کی طرف جنّت کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے سکے تو اس کے برعکس اس کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں یعنی جہنّم کا ایک دروازہ اس کی قبر کی طرف کھول دیتے ہیں۔ غرضکہ پوری جزا یا سزا تو قیامت میں مکمل حساب و کتاب کے بعد ہی ملے گی مگر جزا و سزا کا کچھ سلسلہ اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ نیز اسی کتاب مستطاب میں انہی جناب سے مروی ہے۔ فرمایا قبر میں میّت سے پانچ چیزوں کے متعلق سوال کیا جاتا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور محبت اہل بیت۔

بحار الانوار کی بعض روایات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اُمور کے علاوہ بعض اور اُمور کے بارے میں بھی سوال و جواب ہوتا ہے۔ چنانچہ سوم بحار میں حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام سے جو روایت مروی ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ عقائد اسلامیہ کے متعلق پرسش کے بعد میّت سے دریافت کیا جاتا ہے عن عمرك فیما افنیتہ ومالك من این اکتسبتہ وفیما اتلفتہ کہ تو نے اپنی عمر عزیز کو کن باتوں میں ختم کیا؟ اور مال و متاع حاصل کہاں سے کیا اور پھر اُسے خرچ کہاں کیا؟ کتاب محاسن برقی میں بروایت ابو بصیر حضرت امام محمد باقر یا حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ جب مومن کا انتقال ہوتا ہے تو اس کی قبر میں اس کے ہمراہ چھ صورتیں داخل

فیه ثم قام فاخذها علی یدیہ ووضعها فی قبرها ثم انکب علیها یناجیها طویلاً ویقول لها ابنک ابنک

اپنے ہاتھوں پر ان کی میت کرکے قبر میں اتارا پھر ان کی طرف جھک گئے اور کافی دیر تک ان سے کچھ آہستہ آہستہ فرمانے کے بعد دو مرتبہ فرمایا ابنک ابنک اس کے بعد قبر سے باہر تشریف لائے اور قبر پر مٹی کو ہموار کیا پھر قبر کی طرف جھک گئے اس حالت میں

ہوتی ہیں جو ویسے تو سب ہی حسین ہوتی ہیں مگر ان میں سے ایک صورت بہت ہی زیادہ حسین وجمیل ہوتی ہے۔ یہ صورتیں اس طرح مومن کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں کہ ایک اس کی دائیں طرف کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور دوسری بائیں طرف تیسری آگے کی طرف اور چوتھی پیچھے کی جانب۔ پانچویں پائنتی کی جانب اور جو زیادہ جمیل وحسین ہوتی ہے وہ اس کے سر کے اوپر منڈلاتی رہتی ہے۔ اور جس طرف سے فشار قبر ہو۔ یہ صورتیں اُسے روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور یہ آخری صورت دیگر تمام صورتوں کی مساعدت کرتی ہے۔ جب وہ مرحلہ ختم ہو جاتا ہے تو یہ زیادہ جمیل صورت دوسری صورتوں سے پوچھتی ہے کہ تم کون ہو؟ اس وقت دائیں طرف والی صورت کہتی ہے۔ میں اس مومن کی نماز ہوں۔ بائیں طرف والی کہتی ہے۔ میں اس کی زکوٰۃ ہوں۔ آگے والی کہتی ہے میں اس کا روزہ ہوں۔ پیچھے والی کہتی ہے میں اس کا حج وعمرہ ہوں۔ پاؤں والی کہتی ہے میں برادر مومن کے ساتھ اس کا حسن سلوک اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی ہوں۔ جب سب صورتیں اپنی اپنی معرفی کرا لیتی ہیں تو پھر وہ مل کر اس زیادہ خوبصورت وخوش منظر صورت سے پوچھتی ہیں کہ تو کون ہے؟ وہ کہتی ہے میں آل محمدؐ کی ولایت ہوں۔ مخفی نہ رہے کہ یہ روایت تجسم اعمال پر دلالت کرتی ہے۔ ہم مبحث قیامت میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کریں گے انشاء۔ نیز اس روایت شریفہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ولایت اہل بیتؑ صرف اس کمی کو پورا کرتی ہے جو بتقاضائے بشریت دیگر اعمال میں رہ جاتی ہے۔ ایسا نہیں کہ دیگر اعمال بالکل نا دارد ہوں اور ولایت ان کے قائم مقام ہو جائے۔ فتدبر۔

امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔ من کان للہ مطیعا فھو لنا ولی ومن کان للہ عاصیا فنحن منہ براء (اصول کافی) جو شخص خدا کا فرمانبردار ہے وہ ہمارا دوست وموالی ہے اور جو خدا کا نافرمان ہے ہم اس سے بیزار ہیں۔

امر چہارم فشار قبر کا اثبات

فشار قبر یا اس قسم کے دیگر مسائل جو عالم برزخ اور عالم آخرت سے متعلق ہیں یہ سب امر ایمان بالغیب میں داخل ہیں جن پر ایمان رکھنا اہل ایمان کا فریضہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے ویؤمنون بالغیب! اس امر کے برحق ہونے پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے چنانچہ شارح مقاصد ج ۲ ص ۲۱۲ پر لکھتے ہیں۔ اتفق الاسلامیون علی حقیقۃ سوال منکر ونکیر فی القبر وعذاب الکفار وبعض العصاۃ فیہ۔ تمام اہل اسلام کا قبر میں منکر ونکیر کے سوال کرنے اور کفار اور بعض گنہگاروں

ثمّ خرج وسوّى عليها التراب ثمّ انكبّ على قبرها فسمعوه وهو يقول لا اله الّا الله اللّٰهمّ انی استودعها ایاك ثمّ انصرف فقال له المسلمون

لوگوں نے سُنا کہ آپ بارگاہِ احدیت میں یوں عرض کر رہے ہیں۔ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اے اللہ! میں ان (فاطمہؑ) کو تیرے ہی حوالہ کرتا ہوں

کے اس میں معذّب ہونے پر اتفاق ہے۔ یہ وہ مشکل منزل ہے کہ خدا محفوظ رکھے۔ کچھ مخصوص مومن کامل ہی اس سے سلامت رہیں گے ورنہ اکثر لوگوں کو اس سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اُصول کافی میں جناب ابوبصیر سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کی خدمت میں عرض کیا۔ ایفلت من ضغطۃ القبر احد؟ فرزندِ رسول! آیا کوئی شخص فشارِ قبر سے محفوظ بھی رہے گا؟ جناب نے فرمایا۔ نعوذ باللّٰہ ما اقل من یفلت من ضغطۃ القبر۔ ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ کس قدر کم ہیں وہ لوگ جو اس سے بچ سکیں گے۔" (اعاذنا الله منها بجاه النبیّ واله الطاهرینؑ)

اہلِ عقل و ایمان حضرات کے لئے اس اعتقاد میں ہرگز کسی قسم کا کوئی استبعاد نہیں ہے۔ کیونکہ جب یہ امر عقلاً ممکن ہے (اس سے کوئی استحالۂ عقلیہ لازم نہیں آتا) اور مخبرینِ صادقین نے اس کے واقع ہونے کی خبر دی ہے تو اسے صحیح تسلیم نہ کرنے کی سوائے کمزوریٔ ایمان کے اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ حضرت محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے تجرید میں اس امر کے اثبات پر یہی مختصر دلیل بایں الفاظ پیش کی ہے۔ عذاب القبر واقع لا مکانہ وتواتر السمع جو قوعہٖ عذاب قبر واقع ہوگا۔ کیونکہ یہ امر عقلاً ممکن ہے اور سمعاً اس کا وقوع پذیر ہونا بالتواتر ثابت ہے۔

مغرب زدہ مسلمانوں کے رویّہ پر تنقید

مگر افسوس آج سوءِ اتفاق سے مسلمانوں کا ایک خاصا طبقہ مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی علوم جدیدہ سے اس قدر مرعوب ہے کہ وہ دیکھتا ہے تو مغرب کی آنکھ سے۔ سوچتا ہے تو مغرب کے دماغ سے اور سنتا ہے تو مغرب کے کان سے۔ یہ طبقہ ظاہری طور پر گو آزاد ہے لیکن ذہنی طور پر ہنوز بدستور سابق غلام ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ ذہنی حریت حاصل نہیں ہوتی دوسری ہر قسم کی آزادی ہیچ ہے۔ خدا مسلمانوں کی حالت پر رحم کرے اور انہیں اس ذہنی غلامی سے نجات دے۔ اب ان مغرب زدہ افراد کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ جب اس قسم کے مسائل سنتے ہیں جو ان کے حواسِ خمسہ کی دسترس سے بالا ہیں تو فوراً ان کی تاویل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی وہ تاویل بالکل علیل ہی کیوں نہ ہو۔ اور ان کے ظاہری مفاہیم و معانی پر اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ قدیم الایام سے یونان زدہ طبقہ موجود رہا ہے۔ جن کا محبوب مشغلہ ایسے دینی اُمور کی تاویلات علیلہ کرنا رہا ہے۔ لیکن آج کل یہ بات بہت زوروں پر ہے۔ اور آج ایسے

یارسول اللہ انا ماینالک صنعت الیوم شیئاً لم تصنعہ قبل الیوم فقال فی الیوم فقدت بر ابی طالب انھا کانت لیکون عندھا الشئ فتوثرنی بہ علی نفسھا وولدھا وانی ذکرت یوم القیمۃ یوماً وان الناس یحشرون عراۃ فقالت واسوأتاہ فضمنت

بعدازاں آنجناب واپس تشریف لائے مسلمانوں نے آپ کی خدمت بابرکت میں عرض کیا۔ یارسول اللہ! آج ہم نے آپ کو ایسا کام انجام دیتے ہوئے دیکھا ہے کہ اس سے قبل کبھی آپنے ایسا نہیں کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا آج میں نے اپنے چچا بزرگوار جناب ابی طالبؑ کی نیکی و بھلائی کو گم کیا ہے جناب فاطمہؑ کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے پاس کسی قسم کی کوئی چیز ہوتی تھی تو اس سلسلہ میں مجھے اپنی ذات اور اپنی اولاد پر ترجیح دیتی تھیں۔ میں نے اُن کے رُوبرو ایک دفعہ قیامت کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ لوگ بروز قیامت برہنہ محشور ہوں گے تو جناب فاطمہؑ نے گھبرا کر کہا ہائے رسوائی و برائی! تو میں نے ان کو ضمانت دی تھی

غیر محسوس اُمور کا انکار فیشن میں داخل اور ترقی یافتہ ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی سائنسی مسئلہ دلائل و براہین سے تجاوز کر تجربہ و مشاہدہ کی حد تک پہنچ چکا ہو۔ اور بعض ظواہر نصوص شرعیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہو تو اس تطبیق میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستحسن امر ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں افراط یقیناً نقصان دہ ہے کیونکہ اس سلسلہ جو سب سے بڑا نقص ہے وہ یہ ہے کہ فلسفۂ یونان ہو یا موجودہ سائنس اس کے نظریات روز بروز بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اگر اس کے نظریات کے مطابق نصوص شریعتِ مقدسہ کی تاویلات کا سلسلہ جاری رکھا جاتا تو آج تک شریعت کا مبارک حلیہ ہی بگڑ جاتا ہوتا۔ لیکن یہ دین کی حقانیت کی بیّن دلیل ہے۔ اور خداوند کریم کا خاص فضل و کرم ہے کہ ہمیشہ ہر زمانہ میں بموجب لکل فرعون موسیٰ۔ ہر فرعون صفت انسان کے مقابلہ میں موسیٰ صفت علماء حق ایسے رہے ہیں جنہوں نے ایسے جہّال و ضلّال کی تاویلات کا ابطال کر کے شریعت کے مقدس چہرہ کو محفوظ رکھا ہے۔ شکر اللہ سعیہم و کثر فی الاسلام امثالہم۔

بعض ایرادات کے جوابات

حضرت متجددین کی طرف سے فشار قبر کے سلسلہ میں جو بعض ایرادات کئے جاتے ہیں۔ ذیل میں وہ ایرادات مع جوابات پیش کئے جاتے ہیں

پہلا اعتراض اور اس کا جواب - بعض اوقات قبر کھود کر جب دیکھا جاتا ہے تو مردہ اسی طرح قبر میں موجود ہوتا ہے جس طرح دفن کیا گیا تھا۔ نہ سوال و جواب کے کچھ آثار آشکار ہوتے ہیں۔ اور نہ فشار و عذاب قبر کے کوئی علامات ہویدا ہوتے ہیں۔ اس اعتراض کا کئی طرح جواب دیا جا سکتا ہے۔

اوّلاً یہ کہ یہ محض ایک شبہ ہے جس کی وجہ سے قرآن و حدیث اور اتفاق مسلمین سے ثابت شدہ حقیقت کا انکار

لها ان یبعثها اللہ کاسیۃ وذکرت ضغطۃ القبر فقالت واضعفاہ فضمنت لها ان یکفیها اللہ تعالی ذلک فکفنتها بقمیصی واضطجعت

کہ خدا تعالے ان کو لباس کی حالت میں محشور کرے گا۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں نے فشار قبر کا ذکر کیا تھا تو جناب فاطمہؑ نے کہا تھا ہائے میری کمزوری۔ تو میں نے ان کو ضمانت دی تھی کہ خدا ان کو اس سے محفوظ رکھے گا۔ اس لئے آج میں نے اپنی قمیص کا انہیں کفن دیا ہے

نہیں کیا جا سکتا۔

ثانیاً یہ کہ موت کے بعد دوسرا عالم شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس کے حالات وکوائف ان مادی حواس ظاہرہ سے معلوم ومحسوس نہیں ہو سکتے۔ ان حالات کے معلوم کرنے کے لئے اسی عالم کے حواس درکار ہیں۔ مرتے وقت فرشتے آتے ہیں مگر سوائے مرنے والے کے اور کوئی شخص ان کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ یہی کیفیت عالم برزخ کے حالات کی ہے۔

ثالثاً ۔ یہ کہ اس استبعاد کو رفع کرنے کے لئے یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ آپ نے کئی دفعہ اس امر کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ کہ چند آدمی اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور وہاں ایک آدمی سویا ہوا ہے وہ خواب میں کوئی انتہائی ڈراؤنا۔ ہولناک اور پریشان کن منظر دیکھتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے کہ آگ میں جل رہا ہے یا اسے سانپ بچھو کاٹ رہے ہیں۔ یا اس قسم کی کسی اور شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔ اور وہ اس وقت بہت داد وفریاد اور آہ وفغاں کرتا ہے۔ لیکن اس کے پاس سوئے ہوئے یا بیٹھے ہوئے لوگوں کو قطعاً اس کا کوئی احساس بھی نہیں ہوتا۔ نہ کوئی سانپ نظر آتا ہے اور نہ اس کے ڈسنے کے کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں۔ حتّٰی کہ اسی حالت میں بعض اوقات وہ سویا ہوا انسان گھبرا کر بیدار ہو جاتا ہے۔ اور حاضرین سے اپنی حالت کے بارے میں استفسار بھی کرتا ہے مگر وہ اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ پس اسی طرح اگر عالم برزخ کے فشار قبر کے حالات کا دنیا میں رہنے والے لوگوں کو علم نہ ہو تو اس میں کونسی تعجب خیز بات ہے؟ یہ جواب محض استبعاد کو رفع کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ فشار وعذاب قبر بھی محض خواب کی طرح بے حقیقت ہوتا ہے۔

محقق شیخ بہائی علیہ الرحمۃ اربعین میں بذیل حدیث بستم رقمطراز ہیں۔ والذی یجب علینا هو التصدیق المجمل بعذاب واقع بعد الموت وقبل الحشر فی الجملۃ واما کیفیاتہ وتفاصیلہ فلم نکلف بمعرفتها علی التفصیل واکثرها مما لا تسعها عقولنا الخ۔ جو امر ہم پر واجب ہے وہ اس بات پر اجمالی عقیدہ رکھنا ہے کہ عالم برزخ میں قیامت سے قبل ضرور عذاب ہوتا ہے۔ باقی رہی اس کی کیفیت وتفصیل تو ہمیں اسکے معلوم کرنے کی تکلیف نہیں دی گئی۔ اور نہ ان کی حقیقت تک ہمارے عقول کی رسائی ممکن ہے۔

دوسرا اعتراض اور اس کا جواب ۔ بعض اوقات ایک انسان قبر میں دفن ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے یا وہ غرق ہو جاتا ہے یا اسے درندے کھا جاتے ہیں تو اسے فشار قبر کیونکر ہوگا جو بدا عضاء انتہائی مسلم اور

فی قبرھا لذلک وانکبت علیھا	اور ان کی قبر میں خود لیٹا ہوں۔ اور ان کی میت کی طرف اس لئے جھکا تھا
فلقنتھا ما تسئل عنھا و اخذھا	تاکہ ان کو وہ چیزیں بتادوں جن کی بابت ان سے سوال ہونا تھا

گھٹیا قسم کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اور قدرتِ خداوندی کو بالکل محدود سمجھنے اور قبر کی حقیقت سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے ورنہ جن لوگوں کو یہ یقین ہے کہ خداوند عالم علیٰ کل شئی قدیر ہے۔ اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ قبر اسی جگہ کا نام ہے جہاں مرنے کے بعد انسان کا جسم ہو۔ خواہ ہوا میں ہو اور خواہ دریا میں یا کسی درندہ کے پیٹ میں تو پھر وہ ہرگز اس قسم کا اعتراض نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو خدا قبر کے پیٹ میں میت کو فشار میں گرفتار کر سکتا ہے۔ وہی خدا دریا یا درندوں کے شکم کے اندر رکھ کر بھی مرنے والے کو فشار میں گرفتار کر سکتا ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہی سوال امام رضا علیہ السلام سے بھی کیا گیا تھا۔ چنانچہ جناب یونس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ جو شخص تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ آیا اسے بھی عذاب قبر ہوتا ہے امام علیہ السلام نے فرمایا۔ ہاں۔ ان اللّٰہ عزّ وجلّ یامر الھوا ان یضغطہ۔ خداوند عالم ہوا کو حکم دے دیتا ہے کہ اسے فشار دے۔ (حق الیقین از علامہ شبّر)

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ قبر درحقیقت اسی عالم برزخ کا نام ہے۔ اس مخصوص گڑھے کا نام نہیں جس میں میّت کو دفن کیا جاتا ہے۔ اس کی تائید مزید آیت مبارکہ و ان اللّٰہ یبعث من فی القبور۔ خدا تعالےٰ تمام اہلِ قبور کو محشور فرمائے گا۔ چونکہ یہ عالم برزخ ہے۔ اس لئے عالم دنیا اور عالمِ آخرت دونوں کے ساتھ فی الجملہ مشابہت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کی جزا و سزا میں دنیوی اور اُخروی جزا و سزا کے ساتھ کچھ نہ کچھ مشابہت و مناسبت موجود ہے۔

عالم برزخ کی جزا و سزا کی قرآنی آیات سے تائید

قیامت کبریٰ سے پہلے اچھی روحوں کو فی الجملہ جزا اور بُری روحوں کو فی الجملہ سزا دی جاتی ہے۔ چنانچہ منافقین کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہے۔ سنعذ بھم مرّتین ثمّ یردون الی عذاب عظیم (سورہ توبہ) ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے۔ اور پھر ان کو ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس عذاب عظیم سے مراد دوزخ کا عذاب ہے جو قیامت کے بعد ہوگا۔ اس سے قبل جو دو عذاب گذر چکے ہوں گے وہ عذاب دنیا اور عذاب برزخ ہی ہو سکتے ہیں۔ آلِ فرعون کے بارہ میں قرآن میں ہے۔ وحاق باٰل فرعون سوء العذاب النار یعرضون علیھا غدوا وعشیا ویوم تقوم الساعۃ ادخلوا اٰل فرعون اشد العذاب (سورۃ المؤمن) آلِ فرعون پر بُرا عذاب الٹ پڑا۔ آگ جس پر وہ ہر صبح و شام پیش کئے جاتے ہیں۔ اور جب قیامت قائم ہوگی۔ تو ندا آئے گی۔ آلِ فرعون کو پہلے سے زیادہ سخت عذاب میں ڈال دو۔ قوم نوح کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ اغرقوا فادخلوا نارا فلم یجدوا من دون اللّٰہ انصارا (سورہ نوح) وہ لوگ غرق کئے گئے۔ اور اس

سئلت عن ربہا فقالت اللہ ربی وسئلت عن نبیہا فاجابت محمد نبی وسئلت عن ولیہا و امامہا فما دنجح علیہا و

چنانچہ جب ان سے پوچھا گیا کہ تمہارا رب کون ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اللہ میرا پروردگار ہے اور جب نبی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا محمد مصطفےٰ میرے نبی ہیں۔ لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ تمہارا ولی اور امام کون ہے۔ تو وہ یہ سن

کے بعد ہی آگ میں ڈال دیئے گئے " کلام عرب میں "فا" تعقیب بلامہلت کے لئے آتی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم نوحؑ غرق ہوتے ہی آتش برزخی میں داخل کر دی گئی۔ ان آیتوں میں اس عذاب سے مراد عذاب برزخ ہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سخت گنہگاروں کو قیامت سے پہلے عذاب کا کچھ نہ کچھ ذائقہ چکھایا جاتا ہے۔ اسی طرح کامل مومنین کے لئے بھی قیامت سے پہلے فی الجملہ راحت و آرام کے اسباب مہیا کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ شہداء کے متعلق ارشادِ قدرت ہے ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما اتٰھم اللہ من فضلہ ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (سورۃ آل عمران پ۴ ع۸) جو لوگ راہِ خدا میں شہید ہو گئے ان کو مردہ مت کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں وہ مقرب بارگاہ ہیں ان کو رزق ملتا ہے۔ خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ اس پر خوش ہیں۔ اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے۔ ان کے متعلق بھی ان کو یہ مسرت ہے کہ (ان کی طرح) ان کو بھی کوئی حزن و ملال نہ ہوگا " اگر انسان کے اندر یقین موجود ہو تو ان تمام امور کا چشم بصیرت سے مشاہدہ کر سکتا ہے۔ کلا لو تعلمون علم الیقین لترون الجحیم (تکاثر پ۳۰ ع) افسوس کہ چشم بصارت نہیں بلکہ چشم بصیرت کور ہو چکی ہے۔ لا تعمی الابصار بل تعمی القلوب التی فی الصدور۔

امر پنجم یہ فشارِ قبر کن گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے

یہ فشارِ قبر کن گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں جو کچھ مصنف علام نے افادہ فرمایا ہے۔ اس کی تائید متعدد روایات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ثالث بحار الانوار میں جناب ابن عباس سے مروی ہے۔ فرمایا عذاب القبر ثلاثۃ اثلاث ثلث للغیبۃ وثلث للنمیمۃ وثلث للبول۔ یعنی عذاب قبر کے تین حصے ہیں۔ ایک حصہ غیبت (گلہ کرنے) کی وجہ سے ایک حصہ چغلخوری کے سبب سے۔ اور ایک حصہ پیشاب سے اجتناب نہ کرنے کے باعث ہوتا ہے " اسی طرح بعض روایات و واقعات سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ بدخلقی بھی خصوصاً گھر والوں کے ساتھ فشارِ قبر کا موجب ہوتی ہے۔ چنانچہ سعد بن معاذؓ صحابی کا واقعہ مشہور ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ اس جلیل القدر صحابی کی وفات پر جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاص اہتمام سے اپنی نگرانی میں اسے غسل و کفن دلایا

توقفت فنقلت لها ابنك ابنك
فقالت اما هي ولدي فانصرفا
عنها وقالا لا سبيل لنا عليك

کر دبوجہ حیا) خاموش ہوگئیں۔ میں نے انہیں یہ بتایا کہ تمہارا بیٹا امام ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میرا بیٹا میرا امام ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں فرشتے یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے کہ تم پر ہمارا کوئی بس نہیں ہے

جب جنازہ اٹھا تو جناب بغیر کفش و ردا کے جنازہ کے ہمراہ تھے۔ چاروں طرف سے کندھا دیا۔ خود اسے قبر میں اتارا اور پھر خود ہی لحد کو بند کیا۔ بایں ہمہ جب والدۂ سعدؓ نے بیٹے کو مخاطب کر کے یہ کہا۔ یا سعد هنيئاً لك الجنة۔ بیٹا سعد! تمہیں جنت مبارک ہو! تو جنابؐ نے اُسے جھڑک کر فرمایا تو جزم و یقین کے ساتھ یہ کیسے کہہ سکتی ہے؟ تجھے معلوم نہیں کہ تیرے بیٹے کو اس وقت فشار قبر ہو رہا ہے۔ جب حضرت واپس لوٹے تو صحابہ نے بڑے تعجب کے ساتھ عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے آج سعد کے ساتھ وہ حُسن سلوک فرمایا ہے جو کبھی کسی مرنے والے کے ساتھ نہیں فرمایا۔ آپؐ نے اپنی کفش و ردا کیوں اتاری تھی۔ فرمایا چونکہ مشایعت کرنے والے ملائکہ کی یہی کیفیت تھی۔ میں نے بھی ایسا کیا۔ عرض کیا گیا آپؐ کبھی جنازہ کو دائیں طرف سے پکڑتے تھے اور کبھی بائیں طرف سے اس کا سبب کیا تھا؟ فرمایا جہاں سے جبرئیل کاندھا دیتے تھے۔ میں بھی وہیں کاندھا دیتا تھا۔ عرض کیا گیا۔ یا رسول اللہ! آپ نے اس کو خود غسل دلایا۔ خود نماز جنازہ پڑھی۔ خود دفن کیا۔ مگر بایں ہمہ پھر فرماتے ہیں کہ اسے فشار قبر ہو رہا ہے؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ انه كان في خلقه مع اهله سوء وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ قدرے بد خلقی کیا کرتا تھا (اصول کافی) اللہ اللہ۔ جائے عبرت ہے۔ ارباب عقل و خرد غور کریں کہ کج خلقی کس قدر مہلک صفتِ رذیلہ ہے۔ اور انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ آں حضرتؐ کا اس قدر اہتمام و انتظام بھی اس کے مہلک اثرات سے نجات نہیں دلا سکتا (اعاذنا الله وجميع المومنين منه)

انہی حقائق سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر مذکورہ بالا رذائل کا ازالہ کر دیا جائے تو اس کٹھن منزل سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مومن مرد یا مومنہ عورت شب جمعہ یا روز جمعہ کو مرے۔ خدا تعالیٰ اس کو فشار قبر سے محفوظ رکھتا ہے۔

چنانچہ محاسن برقی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے اور وہ اپنے آباؤ اجداد طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ من مات يوم الجمعة اوليلة الجمعة رفع عنه عذاب القبر۔۔ جو شخص شبِ جمعہ یا بروز جمعہ مرے وہ عذاب قبر سے محفوظ رہتا ہے۔" اس قسم کی متعدد احادیث موجود ہیں۔ بعض روایتوں میں خمیس بعد از زوال کا اضافہ بھی وارد ہے اسی طرح بعض آثار سے مترشح ہوتا ہے کہ مشاہد مقدسہ میں دفن ہونے سے بھی اس عذاب سے نجات مل جاتی ہے۔ ولنعم ما قيل ع۔

ناهی کما تنام العروس فی خدرها ثم ماتت موتۃ ثانیۃ و تصدیق ذلک فی کتاب اللہ قولہ

تم اس طرح آرام سے سو جاؤ جس طرح نئی دلہن اپنے حجلۂ عروسی میں آرام سے سوتی ہے پھر ان پر دوبارہ موت طاری ہو گئی۔ اس بات کی تصدیق قرآن میں خدا کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ کہ

اذا امت فادفنی الی جنب حیدر ابی شبر اکرم بہ و شبیر

فلست اخاف النار عند جوارہ ولا اتقی من منکر و نکیر

رزقنا اللہ الموت فی لیلۃ الجمعۃ او فی یومہا وجعل مستقرنا عند النبی و الہ الطاہرین صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین۔

امر ششم عالم برزخ میں روحیں کس حال میں رہتی ہیں

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ تو اصلی جسم مع الروح کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان واقعات کے بعد روح جسم سے مفارقت کر جاتی ہے۔ اور جسم قبر میں پڑا رہتا ہے۔ قیامت کو دوبارہ اسی جسم میں اس کی روح کو ڈال کر محشور کیا جائے گا۔ بہر حال اب یہاں جو چیز قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بعد والا زمانہ برزخ جو قیام قیامت تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں جو روحیں نعمات الٰہیہ سے متمتع یا عذاب ایزدی سے معذب ہوتی ہیں۔ ان کی کیفیت کیا ہے؟ آیا یہ جزا و سزا تنہا روح کو دی جاتی ہے یا اسے جسم مثالی (جس کی تشریح سابقاً کی جا چکی ہے) میں داخل کر کے دی جاتی ہے۔ اس میں دو قول ہیں۔ اس مقام پر مصنف علام کے کلام سے اگرچہ پہلا قول مترشح ہوتا ہے۔ مگر تاہم کلام مجمل ہے حضرت شیخ مفیدؒ نے ہر دو قول کو جائز و ممکن قرار دیتے ہوئے پہلے قول کی طرف اپنا میلان ظاہر فرمایا ہے۔ لیکن جو امر معصومینؑ کی معتبر روایات اور اکثر علماء محققین کی تحقیقات سے پایۂ ثبوت کو پہنچا ہے وہ یہی ہے کہ روح کو جسم مثالی میں داخل کیا جاتا ہے اور پھر وہ اڑ کر عالم ارواح میں پہنچ جاتی ہے۔ اگر مومن ہے تو وادی السلام میں اور بعض اوقات اپنی قبور کے پاس رہتی ہیں اور بعض اوقات جنت دنیوی میں چلی جاتی ہیں۔ اور اگر غیر مومن ہے تو وادی برہوت میں قیام کرتی ہے اور بعض اوقات جہنم دنیوی میں معذب ہوتی ہیں۔ اور اسی جسم مثالی میں عالم برزخ کے اندر اسے جزا یا سزا دی جاتی ہے۔ اس قسم کی متعدد روایات معتبرہ کتب احادیث میں موجود ہیں جن کے پیش نظر علماء اعلام نے یہ نظریہ قائم کیا ہے۔ یہاں ان سب روایات کا عدو احصا تو ممکن نہیں۔ فقط جلاء ایمانی کی خاطر ایک دو روایتیں درج کی جاتی ہیں تہذیب الاحکام شیخ طوسی علیہ الرحمہ میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ نے یونس بن ظبیان سے دریافت فرمایا ما یقول الناس فی ارواح المؤمنین۔ لوگ مومنین کی روحوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ یونس نے عرض کیا کہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ فی حواصل طیر خضر فی قنادیل تحت العرش۔ کہ وہ عرش

ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین فاعترفنا بذنوبنا فھل الی خروج من سبیل؟

داہل دوزخ کہیں گے اے ہمارے پروردگار تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی، اور دوبارہ زندہ کیا ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کیا (جہنم سے) نکلنے کی ہمارے لئے کوئی سبیل ہے۔؟

الہی کے نیچے قندیلوں کے اندر سبز رنگ کے پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں۔ امام علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا سبحان اللہ المؤمن اکرم علی اللہ عزّوجلّ من ان یجعل روحہ فی حوصلۃ طائر اخضر۔ مومن خداوند عالم کے نزدیک اس سے کہیں عزیزتر ہے کہ اس کی روح کو سبز رنگ کے پرندے کے پوٹے میں داخل کرے پھر فرمایا اذا کان ذلک اتاہ محمدؐ وعلیؑ و فاطمہؑ والحسنؑ والحسینؑ والملائکۃ المقربون صلوات اللہ علیھم اجمعین۔ کہ جب مومن مرنے لگتا ہے تو اس کے پاس پنجتن پاک علیہم السلام اور ملائکہ مقربین تشریف لاتے ہیں، پھر فرمایا۔ انّ المؤمن اذا قبضہ اللہ تعالی صیر روحہ فی قالب کقالبہ فی الدّنیا فیا کلون ویشربون فاذا قدم علیھم القادم عرفوہ بتلک الصورۃ۔ جب مومن کی روح قبض ہو جاتی ہے تو خداوند عالم اس کی روح کو ایک ایسے جسم میں ڈال دیتا ہے جو اس کے دنیوی جسم کے ساتھ مشابہ ہوتا ہے۔ جب کوئی (نیا مرنے والا) ان کے پاس پہنچے تو وہ اس کو اسی صورت سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں ہے۔ یہ روایات میں وارد ہیں کہ اگر تم ان کو اس جسم میں دیکھو تو کہو اٹھو یہ فلاں ہے۔ اور یہ فلاں۔ یہ بھی روایات میں موجود ہے کہ جب کوئی نئی روح ان میں جاتی ہے تو روحیں اس سے اپنے پس ماندگان کے حالات دریافت کرتی ہے اور ان کی موت وحیات کے متعلق سوال کرتی ہیں اگر وہ یہ کہے کہ ہنوز زندہ ہیں تو امید کرتی ہیں کہ انشاء اللہ مرنے کے بعد وہ ہمارے پاس آئیں گے۔ اور اگر وہ یہ کہے کہ وہ مر چکے ہیں تو وہ افسوس کرتی ہیں کہ چونکہ وہ ہمارے پاس نہیں آئے۔ لہذا وہ ہلاکتِ ابدی میں مبتلا ہو گئے۔ علامہ جزائری فرماتے ہیں والاخبار الواردۃ بھذہ الجنۃ ومکانھا وکیفیتھا مستفیضۃ بل متواترۃ۔ یعنی اس برزخی جنت اور اس کے مکان (وادی السلام) اور اس کی کیفیت کے متعلق وارد شدہ اخبار مستفیض بلکہ متواتر ہیں (انوار نعمانیہ)

غواص بحار اخبار آئمہ اطہار سرکار علامہ مجلسی ثالث بحار الانوار میں عالم برزخ کے مباحث کو بالتفصیل لکھنے کے بعد بطور نتیجہ کلام تحریر فرماتے ہیں۔ ثم یتعلق الروح بالاجساد المثالیۃ اللطیفۃ المشبھۃ باجسام الجن والملائکۃ المضاھیۃ فی الصورۃ للابدان الاصلیۃ فینعم ویعذب بھا۔ یعنی قبر کے سوال وجواب وغیرہ امور سے فراغت کے بعد ارواح کو اجسام مثالیہ لطیفہ میں داخل کر دیا جاتا ہے جو لطافت میں جنوں اور فرشتوں کے اجسام سے مشابہ اور شکل وصورت میں اپنے اصلی بدنوں سے مشابہ ہوتے ہیں، ان میں ان کو انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے یا انہیں عذاب وعقاب کیا جاتا ہے۔ اس جسم مثالی میں آنے کے بعد روح ہوا میں اڑ بھی سکتی ہے اور مسافات بعیدہ

کہ چشم زدن میں طے بھی کر سکتی ہیں (انوار نعمانیہ وغیرہ)

بلکہ سرکار علامہ مجلسیؒ کا تو یہ خیال ہے کہ عالم خواب میں انسانی روح اسی جسم مثالی کے قالب میں سیر و تفریح کرتی ہے چنانچہ علامہ مرحوم فرماتے ہیں۔ لا یبعد القول بتعلق الروح بالاجساد المثالیۃ عند النوم ایضا کما یشھد بہ ما یری فی المنام (ثالث بحار) نیند کے وقت روح کا جسم مثالی کے ساتھ تعلق پیدا کرنا بعید نہیں ہے۔ جیسا کہ عالم خواب کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔"

جسم مثالی والے نظریہ پر وارد شدہ بعض شکوک و شبہات کا ازالہ

مذکورہ بالا مطلب پر جو بعض اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا ازالہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پہلا شبہ:۔ یہ ہے کہ اس سے تناسخ لازم آتا ہے جو کہ مسلمانوں کے نزدیک باطل ہے۔ لہذا یہ اجساد مثالیہ میں روحوں کے داخل ہونے والا قول غلط ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ تناسخ باطل کا مفہوم نہ سمجھنے پر مبنی ہے معترض نے معنی تناسخ میں اس امر کو تو یاد رکھا کہ نقل روح من بدن الی بدن۔ لیکن اس کے دوسرے قیود کو نظر انداز کر دیا کہ یہ نقل و انتقال اسی عالم مادی اور جسم مادی میں ہو۔ اور وہ بھی بطور سزا یا جزا کے ہو۔ ایسے معترض کی حالت پر یہ شعر اچھی طرح منطبق ہوتا ہے ع

وقل للذی یدعی فی العلم فلسفۃ ۔ حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء

حضرت محقق شیخ بہائی علیہ الرحمۃ اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ وھذا توھم سخیف لان التناسخ الذی اطبق المسلمون علی ابطالہ ھو تعلق الارواح بعد خراب اجسادھا فی ابدان اخر فی ھذا العالم واما القول بتعلقھا فی عالم آخر بابدان مثالیۃ مدۃ البرزخ الی ان تقوم قیامتھا الکبری فتعود الی ابدانھا الاصلیۃ باذن مبدعھا۔ فلیس من التناسخ فی شئ (بحوالہ ثالث بحار الانوار)

یعنی یہ وہم بالکل باطل ہے کیونکہ وہ تناسخ جس کے باطل ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اسی عالم مادی میں روحیں اپنے بدنوں کے خراب ہونے کے بعد دوسرے اجسام سے تعلق پیدا کر لیں۔ لیکن یہ قول کہ ایک اور عالم (برزخ) میں روحوں کا تعلق قیامت تک ابدان مثالیہ کے ساتھ ہو جائے اور اس کے بعد اپنے خالق کے اذن سے پلٹ کر اپنے اجساد اصلیہ میں داخل ہو جائیں تو یہ ہرگز تناسخ باطل نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تناسخ کے لئے اسی دنیا میں متبادل اجسام کا ہونا ضروری ہے نہ کہ دوسرے عالم میں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ عالم برزخ اس عالم میں سے نہیں ہے۔ نیز تناسخ میں روح کا انتقال ایک بدن سے دوسرے جسم مادی کی طرف ضروری ہے اور جسم مثالی لطیف ہے نہ مادی و کثیف۔

دوسرا شبہ:۔ روح نے دار دنیا میں اطاعت یا معصیت تو اس جسم مادی کے ذریعہ سے کی ہے تو چاہیے جزا و سزا بھی اسی جسم کے ساتھ ہو۔ حالانکہ جسم مثالی کے ساتھ تو اس جسم مثالی نے نہ کوئی اطاعت کی ہے جو مستحق انعام و اکرام

بنے اور نہ ہی اس کے ساتھ اس نے کوئی نافرمانی کی ہے تاکہ مستوجب عقوبت قرار پائے؟ لہٰذا جسم مثالی کے ساتھ اسے کس طرح جزا یا سزا دی جا سکتی ہے یہ بات تو عدلِ خداوندی کے منافی ہے؟ اس شبہ کا کئی طرح جواب دیا جا سکتا ہے۔

اس شبہ کا پہلا جواب۔ اوّلاً یہ اجسام مثالیہ انہی اجسام دنیویہ کے ظلال (سائے) اور انہی کے عکس و پرتو ہیں۔ دارِ دنیا میں بھی روح کو ان کے ساتھ عالم خواب وغیرہ میں کچھ نہ کچھ ضرور تعلق رہتا تھا جیسا کہ اوپر علامہ مجلسیؒ کے کلام حقیقت ترجمان سے اس امر کا بیان ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس دنیوی تعلق و علاقہ کی وجہ سے عقلاً ارواح کو ان اجسام مثالیہ برزخیہ میں جزا یا سزا دینا جائز ہے۔ اس سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔

دوسرا جواب۔ یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے یہ اجسام مثالیہ ابدان دنیویہ عنصریہ کے اجزاء اصلیہ سے پیدا ہوئے ہوں۔ خداوند عالم کی قدرت سے یہ امر کچھ بعید نہیں ہے۔ لہٰذا ان اجسام میں روح کو جزا یا سزا دینا گویا اس جسم مادی دنیوی میں جزا یا سزا دینے کے مترادف ہے چنانچہ آیت مبارکہ کلما نضجت جلودھم بدلنھم جلوداً غیرھا کہ جب اہل جہنم کے چمڑے گل سڑ جائیں گے۔ تو ہم ان کے چمڑوں کو بدل دیں گے، سے پیدا شدہ سوال کہ اس دوسرے چمڑے نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے آتش جہنم میں جلایا جائے؟ کا بھی یہی جواب دیا جاتا ہے کہ وہ دوسرا چمڑا چونکہ اسی اصلی چمڑے کے مادے سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے گویا وہ وہی پہلا چمڑا ہی ہے۔ اس طرح بھی اس شبہ کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔

تیسرا جواب۔ ممکن ہے عالم برزخ میں خود روح جسم مثالی کی شکل میں مصوّر و مجسم ہو جائے۔ یہ احتمال روح کی جسامت والے قول کی بنا پر اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔ بنا بریں جزا و سزا اسی روح ہی کو دی جائے گی نہ کسی اور چیز کو۔ اس تیسرے جواب کو صاحب خزینۃ الجواہر نے اختیار فرمایا ہے اور اس پر بعض شواہد بھی پیش فرمائے ہیں۔ وان کان الاول اولیٰ بہرکیف جس جواب کو بھی اختیار کیا جائے۔ اصل شبہ ھباءً منثوراً ہو کر رہ جاتا ہے۔ فقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباءً منثوراً۔

تتمہ مہمہ مصنف علیہ الرحمۃ نے حضرت فاطمہ بنت اسدؑ کے متعلق جو روایت نقل فرمائی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بروز قیامت مردے برہنہ محشور ہوں گے۔ اسی طرح اور بعض روایات بھی بالصراحت اس امر پر دلالت کرتی ہیں لیکن ان روایات کے بالمقابل بکثرت ایسی روایتیں بھی موجود ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت میں مردے اپنے کفنوں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ ان روایات میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اپنے مُردوں کو اچھے کفن دو۔ کیونکہ وہ بروز حشر انہی کفنوں میں محشور ہوں گے اور کفن کی عمدگی پر نازاں و فرحاں ہوں گے (وسائل الشیعہ

بَابُ الْاِعْتِقَادُ فِی الرَّجْعَۃِ

قَالَ الشَّیْخ اَبُوْجَعْفَرؒ اِعْتِقَادُنَا فِی الرَّجْعَۃِ اَنَّہَا حَقٌّ وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ

اٹھارواں باب رجعت کے متعلق عقیدہ

جناب شیخ صدوق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ رجعت کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ برحق ہے جیسا کہ خداوند عالم

جمع و توفیق فرمائی ہے۔

وجہ اوّل ۔ ممکن ہے کہ یہ اختلاف لوگوں کے ایمان و کفر کے اختلاف کی وجہ سے ہو۔ یعنی جو مومن ہوں گے ۔ وہ کفنوں میں محشور ہوں گے اور جو کافر ہوں گے وہ برہنہ محشور ہوں گے ۔ اور چونکہ مومن بہت کم ہیں۔ اس لئے تغلیباً یہ کہہ دیا گیا کہ گویا تمام لوگ عریاں محشور ہوں گے۔

وجہ دوم ۔ ممکن ہے عرصۂ محشر کے مختلف مقامات پر لوگوں کے مختلف حالات ہوں۔ بعض مقامات پر کفن کے ساتھ ہوں ۔ اور بعض میں عاری ہوں کیونکہ بروز قیامت کوئی معمولی سا دن تو نہیں ہے بلکہ وہ ان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون (سورہ ۱۷ پ ۱۶) قیامت کا ایک دن دنیوی ایک ہزار سال کے برابر ہے، کا مصداق ہے اس لئے ممکن ہے کہ ابتداء میں کفن موجود ہوں مگر بعد میں بوجہ شدت تنگی پارہ پارہ ہو کر ختم ہو جائیں۔

وجہ سوم ۔ ممکن ہے کہ بروز حشر انسانوں کے ساتھ ان کے شرم و حیا کے مطابق سلوک کیا جائے یعنی جو لوگ حیادار تھے وہ کفنوں میں محشور ہوں لیکن جو لوگ قادر قیوم سے حیا نہیں کیا کرتے تھے وہ عریاں محشور ہوں ۔ بہر حال اگر سب لوگ عریاں ہی محشور ہوئے تو جب بھی کسی انسان کی پردہ دری نہیں ہوگی کیونکہ کوئی انسان کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ کیونکہ نفسی نفسی کا وہ عالم ہوگا کہ کسی کو کسی کا خیال تک نہ ہوگا ۔ یوم یفر المرء من اخیہ و امہ و ابیہ و صاحبتہ و بنیہ لکل امرء یومئذٍ شان یغنیہ (پ ۳۰ س عبس ۵۴)

اٹھارواں باب (عقیدۂ رجعت کا بیان)

اگرچہ حضرت مصنف علام نے رجعت کے موضوع پر اس قدر جامع تبصرہ فرمادیا ہے جو ایک چشم بصیرت رکھنے والے طالب حق کے لئے کافی و وافی ہے لیکن مومنین کی مزید جلائے ایمان کی خاطر اس کی بعض تفاصیل ذکر کی جاتی ہیں۔ اور اس بارے میں حضرات مشککین کے شکوک و شبہات زائل کر کے ان کی تسکین قلب کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔

مفہوم رجعت کی تعیین اور اس کا ضروریات مذہب سے ہونا

رجعت کا مطلب یہ ہے کہ

جب حضرت امام عصر عجل اللہ فرجہ

عزوجل فی کتابہ العزیز الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم وھم الوف حذر الموت فقال لھم اللہ موتوا ثمّ احیاھم کان ھولاء سبعین الف بیت وکان قد یقع فیھم الطاعون کل سنۃ فیخرج الاغنیاء لقوتھم ویبقی الفقراء لضعفھم فیقل الطاعون فی الذین یخرجون ویکثر فی الذین یقیمون فیقول الذین یقیمون لو خرجنا لما اصابنا الطاعون ویقول الذین خرجوا لو اقمنا لا صابنا کما اصابھم

اپنی کتاب عزیز میں فرماتا ہے۔ کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ خدا نے انہیں حکم دیا کہ تم مرجاؤ (جب وہ مرچکے تو) پھر انہیں زندہ کیا یہ لوگ ستر ہزار گھروں کے رہنے والے تھے اور ہر سال مرض طاعون میں مبتلا ہوتے تھے۔ مالدار تو اپنی دولت و طاقت کی بنا پر باہر نکل جاتے مگر غریب لوگ اپنی کمزوری اور غربت کی وجہ سے گھروں میں رہ جاتے (نتیجہ یہ ہوتا کہ) جو لوگ باہر نکل جاتے وہ بہت کم طاعون کا شکار ہوتے اور جو گھروں میں رہ جاتے وہ بکثرت اس میں مبتلا ہوتے تو جو لوگ باقی رہ جاتے وہ یہ کہتے کہ کاش ہم بھی نکل سکتے تو طاعون سے محفوظ رہتے جو لوگ باہر نکل جاتے وہ یہ کہتے کہ اگر ہم بھی وہاں مقیم رہتے تو جس طرح ان لوگوں پر مصیبت نازل ہوئی ہے ہم بھی اس آفت

کا ظہور موفور السرور ہوگا تو اس وقت جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بعض دیگر انبیاء علیہم السلام، تمام یا بعض آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین، کامل مومنین اور بعض کفار و منافقین بھی دوبارہ دار دنیا میں بھیجے جائیں گے تاکہ اہل بیت نبوت دنیا میں شہنشاہی کر سکیں۔ اور انبیاء و آئمہ کے ظالموں اور قاتلوں سے اُخروی عذاب و عقاب سے پہلے انتقام لیا جا سکے۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے۔ ولنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر۔ ہم ان لوگوں کو بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے اور کامل مومنین اپنے آئمہ طاہرین کی سلطنت اور ظالموں سے انتقام لینا دیکھ کر مسرور و شادکام ہوں۔ یہ عقیدہ ضروریات مذہب شیعہ خیر البریہ میں سے ہے۔ یعنی اس کا انکار کرنے والا اس مذہب حق سے خارج ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ احادیث کثیرہ میں معصومین علیہم السلام سے مروی ہے۔ فرمایا لیس منا من لم یقر برجعتنا۔ جو شخص ہماری رجعت کا اقرار نہ کرے وہ ہم سے نہیں ہے (حق الیقین، شرح وغیرہ)

سرکار علامہ مجلسی اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں۔ ویجب ان تؤمن بالرجعۃ فانھا من خصائص الشیعۃ واشتھر ثبوتھا عن الائمۃ بین الخاصۃ والعامۃ وقد روی عنھم لیس منا

فاجمعوا ان یخرجوا جمیعا من
دیارھم اذا کان وقت الطاعون
فخرجوا جمیعھم فنزلوا علی شطٍّ
فلمّا وضعوا رحالھم فاداھم اللّٰہ
موتوا فماتوا جمیعاً فکنّستھم
المارۃ عن الطریق فبقوا بذلک
ماشاء اللّٰہ فمرّ بھم نبی من
انبیا بنی اسرائیل یقال لہ
ارمیا فقال لو شئت یا ربّ
لاحییتھم فیعمروا بلادک و
یلدوا عبادک و یعبدونک مع
من یعبدک فاوحی اللّٰہ تع الیہ
افتحب ان احییھم لک ؟ قال
نعم یا ربّ فاحیاھم اللّٰہ لہ و
بعثھم معہ فھؤلاء ماتوا و
رجعوا الی الدنیا ثمّ ماتوا
باجالھم فقال اللّٰہ تع
او کالّذی مرّ علی قریۃ
وھی خاویۃ علی عروشھا
قال انّی یحیی ھذہ اللّٰہ

میں گرفتار ہو جاتے (بالآخر) ان تمام لوگوں نے اس بات پر
اتفاق کر لیا کہ اب جب وبائے طاعون کا وقت آئے تو تمام
کے تمام گھروں سے نکل جائیں۔ چنانچہ انہوں نے (مقررہ وقت پر)
ایسا ہی کیا اور سب نے گھروں سے نکل کر ایک دریا کے کنارے
جا کر رحلِ اقامت ڈال دیا۔ اس وقت خدائے جبار نے آواز دی
کہ تم سب کے سب مر جاؤ۔ چنانچہ وہ تمام مر گئے۔ رہگذاروں
نے انہیں راستہ سے ہٹا دیا اور جب تک خدا نے چاہا۔ وہ
اسی حال میں پڑے رہے یہاں تک کہ انبیاء بنی اسرائیل میں
سے ایک نبی کا وہاں سے گذر ہوا جن کو ارمیا کہا جاتا تھا (جو کہتے ہیں
اس نبی کا نام عزیر تھا) اس نبی نے خدا کی بارگاہ میں عرض کیا
اے پروردگار! اگر تیری مرضی اور مشیت ہو تو انہیں زندہ کر دے
تاکہ یہ لوگ تیرے شہروں کو آباد و شاداب کریں، تیرے بندوں
کو جنیں اور تیرے عبادت گذاروں کے ساتھ مل کر تیری عبادت
کریں۔ خدا نے ان کو وحی کی کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے سبب
سے انہیں زندہ کر دوں؟ انہوں نے عرض کیا ہاں اے میرے
پروردگار! چنانچہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے نبی کے وسیلے
انہیں دوبارہ زندگی عطا کی اور ان سب کو آنجناب کے ساتھ روانہ
کر دیا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ان لوگوں کی مرنے کے بعد دوبارہ
دنیا میں رجعت ہوئی اور بعد میں اپنی مقررہ اجلوں پر وفات پائی
اسی طرح قرآن میں ایک مقام پر خدا فرماتا ہے

اور اس کا مذہب اہل بیتؑ ہونا شیعہ اور سنّی دونوں کے درمیان مشہور و معروف ہے۔ حضرات معصومینؑ سے مروی
ہے۔ کہ جو شخص ہماری رجعت کا اقرار نہ کرے وہ ہمارے مذہب سے خارج ہے۔

رجعت کا اثبات

رجعت کی صحت و حقانیت اور اس کے وقوع پذیر ہونے پر علاوہ فرقۂ محقّہ کے
اجماع و اتفاق کے آیات متکاثرہ اور روایات متواترہ بھی دلالت کرتی ہیں [illegible]

بعد موتها فاماته الله مائة
عام ثمّ بعثه قال كم لبثت
يومًا او بعض يوم قال بل
لبثت مائة عام فانظر الى
طعامك وشرابك لم يتسنّه
وانظر الى حمارك ولنجعلك
اية للنّاس وانظر الى العظام
كيف ننشزها ثم نكسوها
لحمًا فلمّا تبيّن له قال
اعلم انّ الله علىٰ كلّ شيءٍ
قدير فهذا اماته مائة عام
ثمّ رجع الى الدنيا وبقي
فيها ثم مات باجله
وهو عزير وروي
انّه ارميا وقال الله

اس شخص کا واقعہ یاد کرو جو ایک بستی کے پاس سے اس وقت
گذرا جب کہ وہ اپنی چھتوں کے بل اوندھی پڑی ہوئی تھی اس شخص
نے ازراہِ تعجب) کہا۔ اس کے نیست و نابود ہو جانے کے بعد
کیونکر خدا اسے دوبارہ زندہ کرے گا؟ اس پر خدا نے وہیں اس شخص
کو سو برس تک کے لئے موت دے دی پھر اسے زندہ کر کے فرمایا
تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے ہو؟ اس نے کہا ایک روز یا اس سے بھی کچھ
کم۔ خدا نے فرمایا بلکہ تم تو یہاں سو سال تک پڑے رہے ہو! اب
اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو جن میں بدبو نہیں پڑی اور اپنے گدھے
کو بھی دیکھو یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ہم تمہیں انسانوں کے لئے
اپنی خاص نشانی قرار دیں۔ اب (گدھے) کی ہڈیوں کی طرف ذرا دیکھو
کہ ہم کس طرح انہیں زندہ کر کے ان پر گوشت چڑھاتے ہیں پس جب
اس پر اصل حقیقت واضح ہو گئی تو اس نے کہا کہ مجھے کامل یقین ہے کہ
خدا ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے اب اس شخص کو دیکھو جو پورا سو سال
تک مرا رہنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوا دنیا میں آیا اور اس میں زندہ رہا اور
بالآخر مقررہ وقت پر انتقال کیا۔ یہ بزرگوار جناب عزیر اور بروایتے جناب ارمیا تھا

ہمیشہ اس مسئلہ کی وجہ سے اہلِ حق پر زبانِ طعن و تشنیع دراز کرتے ہیں جو کہ بالکل بلا وجہ ہے کیونکہ رجعت میں عقلاً و نقلاً ہرگز
کوئی اشکال نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا عقلاً ممکن ہے۔ اور خداوندِ عالم کی قدرتِ کاملہ کے تحت ہے ورنہ پھر معترضین
کو قیامت کا بھی انکار کرنا پڑے گا اور اس کے ممکن ہونے کی سب سے قوی دلیل اس کا امم سابقہ میں وقوع پذیر ہونا
ہے (جیسا کہ ہم ذرا آگے چل کر ثابت کریں گے) لہٰذا جب یہ ممکن ہے اور مخبرین صادقین نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے
تو پھر اہلِ عقل و انصاف یہ بتائیں کہ اس کا انکار کرنا کہاں تک قرینِ عقل ہو سکتا ہے۔

اثباتِ رجعت قرآنِ کریم کی روشنی میں

اس سلسلہ میں کئی آیاتِ شریفہ پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن میں سے
چار پانچ آیتیں تو جناب مصنف علام نے پیش کر دی ہیں۔ اور
ان کی وجہ دلالت بھی بالاختصار بیان فرما دی ہے اگرچہ ان کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن
بخوف طوالت ہم اس کو نظر انداز کر کے مزید دو چار آیات مبارکہ پیش کرتے ہیں جو کہ عقیدۂ رجعت کی صحت و حقانیت

فی قصة المختارین من بنی اسرائیل من قوم موسیٰ لمیقات ربه ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون وذلك انهم لما سمعوا کلام الله تعالیٰ قالوا لا نصدق به حتی نری الله جهرة فاخذتهم الصاعقة بظلمهم فماتوا فقال موسیٰ یا رب ما اقول لبنی اسرائیل اذا رجعت الیهم فاحیاهم الله فرجعوا الی الدنیا فاکلوا واشربوا ونکحوا النسآء وولدلهم الاولاد وبقوا فیها ثم ماتوا باجالهم وقال الله تعالیٰ یا عیسیٰ بن مریم اذ تخرج تحی الموتیٰ باذنی نحمیع الموتیٰ الذین احیاهم عیسیٰ باذن الله

قرآن مجید میں خداوند عالم نے جناب موسیٰ کی قوم بنی اسرائیل میں سے ان لوگوں کے قصے میں فرمایا ہے جن کو حضرت موسیٰؑ نے میقاتِ پروردگار کے لئے منتخب کیا تھا ہم نے تمہیں مرنے کے بعد اس لئے دوبارہ زندہ کیا ہے تاکہ تم میرا شکر کرو۔ واقع اس طرح ہے کہ قوم موسیٰؑ نے جب اللہ کا کلام سنا تو کہا ہم جب تک اللہ کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں۔ اس وقت تک اس کی تصدیق نہ کریں گے ان کو اس کج بحثی اور زیادتی کی وجہ سے آسمانی بجلی نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب وہ سب مرگئے تو جناب موسیٰؑ نے بارگاہ احدیت میں عرض کیا اے میرے پروردگار! جب میں اپنی قوم بنی اسرائیل کے پاس جاؤں گا تو انہیں کیا جواب دوں گا؟ اس پر خدائے قدیر نے ان کو زندہ کر دیا اس طرح ان سب کی دنیا کی طرف رجعت ہوئی۔ دنیا میں کھاتے پیتے رہے۔ شادیاں کیں اور ان کے ہاں اولادیں پیدا ہوئیں۔ اس طرح کافی عرصہ تک زندہ رہنے کے بعد اپنی مقررہ اجلوں پر پیک اجل کو لبیک کہا۔ خداوند عالم حضرت عیسیٰؑ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے اے عیسیٰؑ اس وقت کو یاد کرو جبکہ تم میرے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ جناب عیسیٰؑ کے ہاتھوں پر بحکم خدا زندہ ہوئے

پر دلالت کرتی ہیں۔

پہلی آیت مبارکہ

ارشادِ قدرت ہے ھو الذی ارسل رسوله بالھدٰی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (س توبہ پ ع ۱) خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ ان کے دین کو دوسرے تمام ادیان پر غلبہ دے۔ اگرچہ مشرک اس بات کو ناپسند ہی کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اب تک حاصل نہیں ہوسکا۔ حالانکہ قرآن کی صداقت میں تو کوئی مسلمان شک وشبہ کر نہیں سکتا لہذا ماننا پڑے گا کہ ایک ایسا زمانہ آنا ضروری ہے جس میں دین اسلام کو مکمل تسلط و غلبہ حاصل ہو۔ اور یہی زمانہ رجعت ہے جیسا کہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں متعدد روایات موجود ہیں حتیٰ کہ بعض مفسرین اہل سنت نے بھی اس کی تفسیر میں

رجعوا الی الدنیا وبقوا فیھا ما بقوا ثم ماتوا باجالھم واصحاب الکھف لبثوا فی کھفھم ثلثمائة سنین وازدادوا تسعا ثم بعثھم اللہ فرجعوا الی الدنیا لیتسائلوا بینھم وقصتھم معروفة فان قال قائل ان اللہ تم قال وتحسبھم ایقاظا وھم رقود قیل لھم فانھم کانوا موتی وقد قال اللہ عزوجل یاویلنا من بعثنا من مرقدنا ھذا ما وعد الرحمٰن وصدق المرسلون وان قالوا کذلک فانھم کانوا موتی

ان سب کی دنیا میں رجعت ہوئی اور وہ دنیا میں زندہ رہے اور پھر اپنے مقررہ وقتوں پر وفات پا گئے۔ اسی طرح اصحاب کہف بھی تین سو نو برس تک غار میں مرے پڑے رہے۔ پھر دنیا میں اُن کی رجعت ہوئی۔ اور خدا نے انہیں دوبارہ زندہ کیا۔ تاکہ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں۔ اصحاب کہف کا یہ قصہ مشہور ہے (اور کتب سیر وتواریخ اور تفاسیر میں مذکور ہے) اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ خدا فرماتا ہے۔ اے میرے حبیب! تم خیال کروگے کہ وہ (اصحاب کہف) بیدار ہیں۔ حالانکہ وہ تو سوئے ہوئے ہیں (لہٰذا سوکر اٹھنا تو رجعت نہیں ہے) اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ مر چکے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں خداوند عالم کفار کی زبانی فرماتا ہے ہائے افسوس! کس نے ہمیں اپنی خواب گاہوں سے اٹھایا (جواب میں کہا جائے گا)

صراحت کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ ذلک عند نزول عیسیٰ وخروج المھدی فلا یبقیٰ اھل دین الا دخلوا فی الاسلام (تفسیر فتح البیان وابن کثیر وغیرہ)

یعنی یہ وعدہ حضرت مہدیؑ کے ظہور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت پورا ہوگا۔ اس وقت تمام ادیان والے لوگ دینِ اسلام میں داخل ہوجائیں گے۔

اس تفسیری بیان نیز تبادر الی الاذہان سے یہ بات بالکل واضح وعیاں ہے کہ غلبہ سے مراد ظاہری تمکنت وتسلط جس کے لئے دوسرے ادیان کا بالکل نیست ونابود یا کالعدم ہوجانا ضروری ہے۔ نہ غلبہ بالدلیل کیونکہ یہ تاویل خود بوجہ بلا دلیل ہونے کے بالکل علیل ہے۔ کما لایخفیٰ۔

دوسری آیت مبارکہ

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اتیتکم من کتٰب وحکمة ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ قال ءاقررتم واخذتم علی ذلکم اصری قالوا اقررنا قال فاشھدوا وانا معکم من الشٰھدین (پ ۳ س آل عمران ع ۱۷) اور جس وقت خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ میں تم کو کتاب اور حکمت دوں گا۔ پھر ایک رسول تمہارے پاس والی چیزوں کی تصدیق کرتا ہوا آئے گا تو تم ضرور بالضرور اُس پر ایمان لانا۔ اور

ومثل هذا كثير فقد صح ان الرجعة كانت فى الامم السابقة فقد قال النبى يكون فى هذه الامة ما كان فى الامم السابقة حذو النعل بالنعل والقذة بالقذة فيجب على هذا الاصل ان يكون فى هذه الامة رجعة وقد نقل مخالفونا انه اذا خرج المهدى نزل عيسى بن مريم من السماء فصلى خلفه ونزوله الى الارض

یہ وہی (یوم آخرت) ہے جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا۔ اور سچی خبر دی تھی خدا کے رسولوں نے پس اگر وہ یہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ کفار موت کے بعد اٹھیں گے مگر اس کے باوجود قبور کو مرقد (خوابگاہ) کہا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اصحاب کہف کی بھی یہی کیفیت تھی وہ مردہ تھے جو دوبارہ زندہ کئے گئے حاصل کلام یہ ہے کہ جس طرح قبور کو مجازاً خوابگاہ کہا گیا ہے اسی طرح اصحاب کہف کی موت کو مجازاً نیند سے تعبیر کیا گیا ہے اور موت اور نیند میں جو مشابہت ہے وہ مخفی نہیں ہے اس کی مثل اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں پس ان حقائق کی روشنی میں ثابت ہوا کہ گذشتہ امتوں میں رجعت ہوتی رہی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو واقعات اگلی امتوں میں ہو چکے ہیں وہ بعینہٖ میری امت میں بھی ضرور ہوں گے جس طرح ایک کفش دوسرے کفش کے اور ایک تیر دوسرے تیر کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس ہمارے مخالفین نے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت مہدی کا ظہور ہوگا تو اس جناب عیسےٰ آسمان سے اتریں گے اور امام کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے۔

ضرور بالضرور اس کی مدد کرنا۔ پھر خدا نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کا اقرار کیا؟ اور کیا تم نے میرا یہ بوجھ اپنے ذمہ لے لیا؟ تو سب نے کہا کہ ہم نے اقرار کیا۔ خدا نے فرمایا کہ اب تم سب گواہ رہو۔ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی دینے والا ہوں۔؟ یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ خداوند عالم نے انبیاء کرام سے جو عہد و پیمان لیا تھا وہ تا حال پورا نہیں ہوا۔ نہ تا حال حضرات انبیاء علیہم السلام نے کبھی اس دار دنیا میں جناب پیغمبر اسلام علیہ وآلہ السلام کی نصرت و امداد کی ہے اور نہ ہی ظاہر ہو کر آں جناب پر ایمان لائے۔ حالانکہ اس وعدہ کی ایفاء بہر حال لازم ہے ورنہ عصمت تو کیا خود ان کی نبوت بھی معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ اس آیت کی تفسیر جو معادن وحی و تنزیل نے بیان فرمائی ہے اس میں مذکور ہے کہ یہ وعدہ زمانۂ رجعت میں پورا ہوگا۔ حضرت علیؑ تمام انبیاء کرام کی نیابت میں ان ہر دو فریضہ کو انجام دیں گے بلکہ انبیاء بنفس نفیس تشریف لا کر اس فرض سے سبکدوش ہوں گے اور رسول اسلامؐ کی مسند کے حقیقی وارث کی نصرت کا فریضہ انجام دے کر بالواسطہ خود نصرت رسولؐ کا فرض انجام دیں گے (تفسیر صافی وغیرہ)

تیسری آیت مبارکہ خلاقِ عالم اپنے کلام میں فرماتا ہے۔ **ونريد ان نمن على الذين استضعفوا**

رجوعه الی الدنیا بعد موته لان الله عزوجل قال انی متوفیک ورافعک الیّ و قال عزوجل وحشرناهم فلم نغادر منهم احدًا

حضرت عیسیٰ کا یہ زمین پر نازل ہونا اور دنیا میں رجوع کرنا ان کی موت کے بعد ہوگا جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے اے عیسیٰ میں تمہیں وفات دینے والا اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں خداوند عالم ایک مقام پر فرماتا ہے : ہم انہیں اس طرح محشور کریں گے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑیں گے ۔ اور دوسری جگہ

فی الارض ونجعلهم ائمة ونجعلهم الوارثین (س قصص پ ۲۰ ع ۴) اور ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو اس سرزمین میں کمزور کر دیئے گئے ہیں ، احسان کریں ، اور ان کو امام بنائیں اور ان کو ہم وارث قرار دیں ۔ دنیا جانتی ہے کہ جس قدر کمزور و ناتواں ہمارے آئمہ اہل بیت علیہم السلام کو سمجھا گیا ۔ اتنا کسی اور شخص کو نہیں سمجھا گیا لیکن خداوند عالم نے ان کے ساتھ جو وراثت ارضیہ اور سلطنت آفاقیہ کا وعدہ کیا تھا ۔ وہ تا حال پورا نہیں ہوتا ۔ لہٰذا اس ایفائے عہد کے لئے کوئی زمانہ ضرور ہونا چاہیئے ۔ احادیث معدن عصمت و طہارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عہد زمانۂ رجعت میں پورا ہوگا (تفسیر البرہان وصافی وغیرہ)

چوتھی آیت مبارکہ خداوند عالم کا فرمان ہے ۔ وعد الله الذین امنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضیٰ لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنًا یعبدوننی لایشرکون بی شیئًا ومن کفر بعد ذالک فاولئک هم الفاسقون (س نور پ ۱۸ ع ۱۳) ان سب لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ۔ اللہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ ضرور ان کو اس زمین میں جانشین بنائے گا ۔ جیسا کہ اُن سے پہلوں کو جانشین بنایا تھا اور ضرور ان کے دین کو جو اس نے اُن کے لئے پسند کر لیا ہے ۔ اُن کی خاطر سے پائدار کر دے گا ۔ اور ضرور اُن کے خوف کو امن سے بدل دے گا ۔ اُس وقت وہ میری ہی عبادت کریں گے ۔ اور کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد ناشکری کرے گا ۔ پس نافرمان رہی ہیں ۔ (ترجمہ مقبول)

حقیقت یہ ہے کہ یہ وعدۂ خداوندی بھی ابھی تک پورا نہیں ہوا ۔ چنانچہ ایک روایت میں وارد ہے کہ مفضل نے حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا ۔ فرزند رسولؐ! ناصبی لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ آیت فلاں وفلاں کے حق میں نازل ہوئی ہے ۔ حضرت نے یہ سُن کر فرمایا ۔ لایهدی الله قلوب الناصبة متی کان الدین الذی ارتضاه الله ورسوله متمکناً بانتشار الامن فی الامة وذهاب الخوف من قلوبها وارتفاع الشك من

وقال اللہ تعالیٰ ویوم نحشر من کل اُمّة فوجًا ممن یکذب بآیاتنا فالیوم الّذی یحشر فیہ الجمیع غیر الّذی یحشر فیہ الفوج وقال اللہ عزّوجلّ واقسموا باللہ

فرماتا ہے "ہم ہر اُمّت میں سے ایک گروہ کو جو ہماری آیات کو جھٹلاتا تھا محشور کریں گے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس روز قیامت، تمام لوگوں کو محشور کیا جائے گا وہ دن اور ہے اور جس روز رجعت، بعض گروہوں کو محشور کیا جائے گا وہ اور ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے خدا کے نام کی سخت قسمیں کھائی ہیں۔ کہ جو

ایامھم والحروب التی تنشب بین الکفار وبینھم۔ "خداتعالےٰ ناصبیوں کے دلوں کو ہدایت نہ کرے۔ بھلا ان لوگوں کے زمانہ میں دین کے حق میں یہ آیت کا نزول بتاتے ہیں۔ اس دین کو جو خدا اور رسُول کا پسندیدہ ہے، کب اس طرح تمکنت حاصل ہوئی تھی کہ تمام اُمّتِ اسلامیہ میں امن وامان قائم ہوا ہو۔ اور ان کے دلوں سے خوف وہراس اور شک وشبہات دُور ہوگئے ہوں ہم تو دیکھتے ہیں کہ ان کے درمیان جنگوں کا سلسلہ برابر جاری وساری رہا۔" (تفسیر صافی) لہٰذا اس آیت میں جو وعدہ بعض مخصوص ذواتِ قدسیہ سے کیا گیا ہے۔ اس کے پورا ہونے کے لئے بھی ایک زمانہ درکار ہے۔ اور وہ زمانۂ رجعت ہی ہے۔ جیسا کہ تفاسیر اہلبیت میں وارد ہے (ملاحظہ تفسیر برہان وصافی وغیرہ)

پانچویں آیت مبارکہ

ارشادِ ایزدی ہے وحرام علی قریة اھلکنا انّھم لا یرجعون (س انبیاء ۲۱ پ ع ۷) جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا ہے اس کے اہل پر رجعت حرام ہے، ظاہر ہے کہ یہ آیت قیامت کے متعلق تو نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں تو سب لوگ ہی محشور ہوں گے خواہ وہ ہلاک شدگان ہوں اور خواہ اپنی طبعی موت مرنے والے ہوں، جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے وحشرناھم فلم نغادر منھم احدًا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا۔ کہ یہ ہلاک ہونے والوں کا رجوع نہ کرنا کسی اور وقت سے متعلق ہے۔ اور وہ یہی زمانۂ رجعت ہی ہے جیسا کہ تفسیر قمی وغیرہ میں مروی ہے۔

اثباتِ رجعت احادیث معصومین کی روشنی میں

اس سلسلہ میں وارد شدہ روایات حدِ تواتر تک پہنچی ہیں۔ اور بوجہ کثرت ان کا عدد واحصا بیان ممکن نہیں ہے۔ محدّث جلیل سیّد نعمت اللہ جزائری انوار نعمانیہ میں فرماتے ہیں۔ والاخبار الدالة علی رجوع الحسین وامیر المؤمنین علیھما السّلام متواترة وفی رجوع سائر الائمة قریبة التواتر فلقد نقل بعض مشائخنا تقریبًا من مائتی حدیث عن اربعین رجلًا من ثقات المحدثین من خمسین کتابًا۔ الاصول المعتبرہ۔ یعنی حضرت امام حسینؑ اور حضرت امیر المؤمنینؑ کے زمانۂ رجعت میں تشریف

جهد ایمانهم لا یبعث الله من	شخص مرجائے گا خدا اسے زندہ نہیں کرے گا
یموت بلی وعدا علیه حقا	حالانکہ خدا کا وعدہ حق ہے (وہ ضرور اٹھائے گا)
ولکن اکثر الناس لا یعلمون	مگر اکثر لوگ حقیقتِ حال سے بے خبر ہیں

لانے کے متعلق تو روایات متواترہ ہیں۔ اور دوسرے آئمہ طاہرین کے متعلق بھی قریب تواتر ہیں۔ ہمارے بعض مشائخ عظام (حضرت علامہ مجلسیؒ) نے اس سلسلہ میں تقریباً دو سو روایتیں قابلِ وثوق چالیس محدثین اور کتب معتبرہ میں پچاس معتبر کتابوں سے (بحار الانوار میں) نقل کی ہیں "حق الیقین مولانا سید عبداللہ شبر وغیرہ کتب مبسوطہ میں چالیس چالیس صفحوں تک یہ احادیث پھیلی ہوئی ہیں۔ خوفِ طوالت مانع ہے ورنہ کچھ اخبار ضرور یہاں درج کی جاتیں ؎

عاقلاں را اشارتے کافیست

کیفیت رجعت پر اجمالی ایمان رکھنا کافی ہے

باقی رہیں اس رجعت کی تفاصیل کہ آیا جناب رسولِ خدا اور تمام آئمہ ہدیٰ علیہ وعلیہم السلام تشریف لائیں گے یا بعض اور تمام کے تشریف لانے کی صورت میں آیا سب بزرگوار یکبارگی تشریف لائیں گے یا یکے بعد دیگرے ؟ اور یکبارگی تشریف لانے کی صورت میں آیا ان کی سلطنت وحکومت ان کی سابقہ ظاہری وجودی ترتیب کے مطابق ہوگی یا اس کے بالعکس ؟ اور ان کی مدتِ حکومت وسلطنت کس قدر طویل ہوگی ؟ یہ اور اس قسم کی دیگر بعض تفاصیل کے متعلق اخبار و آثار قدرے مختلف ہیں۔ بعض علماء اعلام نے اس اختلاف کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ جزائری لکھتے ہیں۔ الحق ان الاخبار الواردة فی الرجعة مختلفة جدا مع کثرتها فمن جملة اختلافها ترتیب ملك الائمة علیهم السلام - الخ۔ یعنی حق وانصاف یہ ہے کہ رجعت کے بارے میں اخبار باوجود کثیر التعداد ہونے کے باہم بہت مختلف ہیں۔ من جملہ ان کے باہمی اختلاف کے ایک اختلاف یہ ہے کہ آئمہ اطہار علیہم السلام کی بادشاہی کی ترتیب کس طرح ہوگی ؟"

انہی اختلافات کے پیش نظر علمائے محققین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان اُمور کے متعلق اجمالی ایمان وایقان رکھنے اور تفاصیل کا علم حضرات آئمہ علیہم السلام کے سپرد کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ علامہ سید عبداللہ شبر (جنہیں مجلسی ثانی کہا جاتا ہے) اپنی کتاب حق الیقین عربی جلد ثانی میں کمل اٹھائیس صفحات تک مباحث رجعت لکھنے کے بعد بعنوان (تنبیہ) رقمطراز ہیں: " قد عرفت من الآیات المتکاثرة والاخبار المتواترة وکلام جملة من المتقدمین والمتاخرین من شیعة الائمة الطاهرین ان اصل الرجعة حق لا ریب فیه ولا شبهة تعتریه ومنکرها خارج من ربقة المومنین فانها من ضروریات مذهب الائمة الطاهرینؑ

يعنى ذلك فى الرّجعة وذلك	یہاں اٹھائے جانے سے رجعت میں اٹھانا مراد ہے کیونکہ اس کے
انّه يقول بعد ذلك ليبيّن	بعد خدا فرماتا ہے۔ اس لئے ان کو اٹھائیگا تاکہ خدا ان پر وہ بات
لهم الذى اختلفوا فيه	واضح کر دے جس کی بابت یہ لوگ باہم اختلاف کرتے ہیں

وليست الاخبار فى الصراط والميزان ونحوها مما يجب الاذعان بها اكثر عدداً واوضح سنداً واصرح دلالة وافصح مقالةً من اخبار الرجعة واختلاف خصوصياتها لا يقدح فى حقيقتها كوقوع الاختلاف فى خصوصيات الصراط والميزان ونحوها فيجب الايمان باصل الرجعة اجمالاً وان بعض المؤمنين وبعض الكفار يرجعون الى الدنيا وايكال تفاصيلها اليهم (ع) والاحاديث فى رجعة امير المومنين والحسين متواترة معنىً وفى باقى الائمة قريبة من التواتر وكيفية رجوعهم هل على الترتيب او غيره فكل علمها الى الله سبحانه والى اوليائه (ع) یعنی آیات متکاثرہ، اخبار متواترہ اور بہت سے شیعہ علماء متقدمین و متاخرین کے کلام سے تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ اصل رجعت برحق ہے۔ اس میں ہرگز کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اور اس کا منکر زمرۂ ایمان سے خارج ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ ضروریاتِ مذہب امامیہ میں سے ہے۔ صراط و میزان وغیرہ وہ اُمورِ اُخرویہ جن پر ایمان رکھنا واجب ہے کے متعلق جو روایات وارد ہیں وہ ان روایات سے جو عقیدۂ رجعت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ نہ سند کے لحاظ سے زیادہ معتبر ہیں اور نہ عدد کے اعتبار سے زیادہ ہیں۔ اور نہ دلالت کے لحاظ سے زیادہ واضح ہیں رجعت کے بعض خصوصیات میں اختلاف کا ہونا اصل رجعت کی حقانیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ جس طرح کہ صراط و میزان وغیرہ امور کی خصوصیات میں اختلاف موجود ہے (جس کی تفصیل بعد میں بیان ہوگی) لہٰذا اصل رجعت پر ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اس میں بعض مخلص مومن اور بعض خالص کافر دوبارہ زندہ ہوں گے اور اس کے باقی تفصیلات کو آئمہ اطہارؑ کے سپرد کرو۔ حضرت امیر المومنینؑ اور جناب سید الشہداءؑ کی رجعت کے بارے میں تو احادیث تواترِ معنوی تک پہنچے ہوئے ہیں اور باقی آئمہ طاہرینؑ کی رجعت کے متعلق قریب بہ تواتر ہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ جب وہ تشریف لائیں گے تو یکبارگی تشریف لائیں گے یا یکے بعد دیگرے۔ اور پھر سابقہ ترتیب کے مطابق یا اس کے خلاف۔ ان حقائق کو خداوند عالم اور اس کے اولیاء علیہم السلام کے سپرد کرو۔

رجعت کے بارے میں بعض شُبہات کے جوابات

آخر کلام میں رجعت کے متعلق بعض شبہات کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب

: آخر عقیدۂ رجعت میں کیا فائدہ ہے کہ ہم اس کے قائل ہوں؟ اس شبہ کا جواب یہ

والتبیین یکون فی الدنیا لا فی الاخرۃ وساجرد کتابا فی الرجعۃ ابین فیہ کیفیتہا والادلۃ علی ۔

ظاہر ہے اس اختلاف کی وضاحت اور اس کا نتیجہ دنیا میں ہی ظاہر ہوتا ہے نہ آخرت میں رجعت کے متعلق میں ایک مستقل کتاب لکھونگا جس میں رجعت کی حقیقت اس کی صحیح کیفیت اور اس کے وقوع پذیر ہونے پر

ہے کہ رجعت کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کی سلطنت ربانیہ و حکومت الٰہیہ قائم ہوگی ۔ اور کفر و شرک صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا ۔ اور دین اسلام کا بول بالا ہوگا ۔ اور اسے تمام ادیان پر غلبہ و تسلط حاصل ہوگا اس وقت شیعیانِ علی و موالیان آل عبا کی آنکھیں یہ ایمان افزا مناظر دیکھ کر ٹھنڈی ہوں گی اور غلت گریہ کن کو اسی دنیا میں آلِ رسول کی شہنشاہی دیکھ کر اور قاتلینِ حضرتِ المبارت سے انتقام لیتے ہوئے دیکھ کر دائمی مسرت و شادمانی حاصل ہوگی کیونکہ رجعت کے زمانِ سعادت، قرآن میں وہ سب کچھ ہوگا جسے تشتھیہ الانفس وتلذ الاعین ۔ یہ روح پرور مناظرات دیکھ کر یفرح المؤمنون بنصر اللہ ۔ اہل ایمان خوش و خرم ہوں گے ۔

زمانۂ رجعت میں کیا ہوگا

ان سب امور کا تذکرہ جو اس وقت وقوع پذیر ہوں گے تو موجب طوالت ہے ۔ ہاں مومنین کرام کی جلاء ایمانی کی خاطر مختلف احادیث شریفہ سے منتخب کر کے یہاں چند امور کی ایک اجمالی فہرست درج کی جاتی ہے ۔

(۱) امام زمانہ کے مظفر و منصور لشکر میں جن و انس اور فرشتے شامل ہوں گے (۲) تمام حیوان و طیور درند و پرند اور چرند کی موجودہ باہمی نفرت مبدل بالفت ہو جائے گی اور وہ سب باہم ہل مل کر نہایت خوشگوار زندگی بسر کریں گے (۳) زمین اپنے تمام مخفی خزانے خدمت امام عالی مقام میں پیش کر دے گی (۴) بارش بر وقت ہوگی اور اس کی وجہ سے میوہ جات اور دیگر ہر قسم کی نعمات بکثرت ہوں گی (۵) تمام اہل ایمان کے پاس مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہوگی کہ حقوق مالیہ (زکوٰۃ و خمس وغیرہ) کا مستحق ملنا دشوار ہو جائے گا (۶) امام زمانہ کے وجود ذی جود کی برکت سے اہل ایمان کی عقلیں کامل ہو جائیں گی (۷) لوگوں کے سینہ میں حسد اور بغض و کینہ کا جو غبار ہوگا وہ محبت و آشتی کے پانی سے دھل جائے گا (۸) موالیانِ اہل بیت کی قوت بصارت و سماعت میں غیر معمولی ترقی ہو جائے گی ۔ یہاں تک کہ شرق و غرب میں رہنے والے مومنین ایک دوسرے کو دیکھ کر باہم گفتگو کر سکیں گے ۔ (۹) اہل ایمان کی تمام جسمانی بلیات و آفات اور امراض و عاہات دور ہو جائیں گی (۱۰) زمین عدل و انصاف اور آں جناب کے مراحم و الطاف سے لبریز ہو جائے گا (۱۱) تمام ادیانِ باطلہ روئے کائنات سے حرفِ غلط کی طرح محو کر دیئے جائیں گے ۔ اور بجز دین حق اور کوئی مذہب اور دین باقی نہیں رہے گا (۱۲) حضرت عیسےٰ علیٰ نبینا و آلہ و علیہ السلام آنجناب کی نصرت و ہمرکابی کا شرف حاصل کرنے کے لئے آسمان سے زمین پر نزول اجلال فرمائیں گے ۔ اور امام زمانہ کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے ۔ الیٰ غیر

صحۃ کونہا۔ والقول بالتناسخ باطل ومن دان بالتناسخ وھو کافر لان فی التناسخ ابطال الجنۃ والنار ،	محکم دلائل پیش کروں گا۔ تناسخ کا عقیدہ باطل ہے۔ اور جو شخص اس کا قائل ہے وہ کافر ہے۔ کیونکہ تناسخ کے عقیدہ کی بنا پر جنّت و دوزخ کے عقیدہ کا غلط ہونا ، اور ان کے وجُود کا انکار لازم آتا ہے۔"

ذلك من الوقائع الوفيرة المفرحة للمؤمنين والمقرحة للمعاندين لكمال الدين۔ منن الرحمن۔ (غایۃ المقصود وبحار الانوار وغیرھا) اللّٰھم عجّل فرجہ وسھل مخرجہ واکحل ناظرینا بنظرۃ منا الیہ واجعلنا من اعوانہ وانصارہ۔

دُوسرا شبہ اور اُس کا جواب ہو سکتا ہے کہ کفار و منافقین رجعت میں رجوع کرتے ہی اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرلیں تو پھر ان سے انتقام کس طرح لیا جائے گا۔ اس شبہ کا کئی طرح جواب دیا جا سکتا ہے۔

اوّلاً۔ رجعت چونکہ قیامت صغریٰ ہے۔ اس میں قیامت کبریٰ کی طرح باب توبہ بند ہو جائے گا۔ اس لئے اس وقت کفار و مشرکین اور ظالمین کی کوئی توبہ منظور نہ ہوگی۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے۔ یوم یاتی بعض ایات ربك لا ینفع نفسا ایمانہا لم تکن امنت من قبل۔ یعنی جب اللہ سبحانہ کی بعض نشانیاں ظاہر ہو جائیں گی تو کسی نفس کو اس وقت ایمان لانا فائدہ نہ دے گا۔ جو اس سے قبل ایمان نہ لا چکا ہوگا۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر زمانۂ رجعت کے ساتھ کی گئی ہے۔

ثانیاً۔ اس وقت ان لوگوں کو بطور مکلف ہونے کے نہیں اٹھایا جائے گا تاکہ کسی عمل خیر یا شر کو بجا لائیں۔ ان کو انتقام و عذاب کے لئے زندہ کیا جائے گا۔ لہٰذا ان کے توبہ کرنے یا اس کے قبول ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ثالثاً۔ جب عذاب کے نزول کا وقت ہو۔ اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی۔ جیسا کہ فرعون و قارون وغیرہ کے قرآنی واقعات سے ظاہر و ہویدا ہے۔

رابعاً۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کی شقاوت و طغاوت اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ دوبارہ دنیا میں آنے کے باوجود بھی توبہ نہ کریں گے۔ چنانچہ خداوند عالم بعض بدبخت لوگوں کے متعلق خبر دیتا ہے کہ وہ عذابِ الٰہی کو دیکھ کر دنیا میں دوبارہ آنے اور عمل صالح کرنے کی استدعا کریں۔ لیکن ارشادِ قدرت ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ۔ اگر بالفرض انہیں دوبارہ بھیج بھی دیا جائے تو یقیناً پھر بھی وہ انہی افعالِ ناشائستہ کا ارتکاب کریں گے۔ جن سے ان کو روکا گیا تھا۔ معلوم ہوا

کہ کچھ ایسے سرکش انسان بھی ہوتے ہیں کہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی عبرت و نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ چنانچہ رجعت کے متعلق بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں شیطان یہ بات ڈال دے گا کہ تمہیں آزادانہ زندگی گذارنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا وہ توبہ کے لئے موفق ہی نہ ہو سکیں گے۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

رجعت کے عقیدہ سے تناسخ لازم آتا ہے لہٰذا اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ تناسخ کے معنی کو نہ سمجھنے یا پھر تجاہلِ عارفانہ کرنے پر مبنی ہے ورنہ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو رجعت کو تناسخ سے ہرگز کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ تناسخ میں ایک روح کا ایک جسم سے بطور جزا یا سزا دوسرے جسم میں منتقل ہونا ضروری ہے۔ لیکن رجعت میں ایسا ہرگز نہیں ہوگا بلکہ اجسام بھی وہی ہوں گے اور روحیں بھی وہی ہوں گی جو پہلے تھیں جیسا کہ یہ امر احادیث رجعت سے کالشمس فی رابعۃ النہار واضح و آشکار ہے۔ لہٰذا مخالفین کا رجعت کے صحیح اسلامی عقیدہ سے اس بنا پر انکار کرنا کہ اس سے تناسخ لازم آتا ہے بالکل غلط اور عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔ واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

تذییل جلیل

دلائل رجعت کے ضمن میں حضرت مصنف علام نے حضرت عیسٰیؑ کے متعلق وارد شدہ آیت کے ساتھ جو تمسک فرمایا ہے اس سے وفات عیسٰیؑ مترشح ہوتی ہے جو کہ مسلمانوں کے مشہور نظریہ کے خلاف ہے۔ فریقین کے اکثر علماء محدثین و مفسرین اور متکلمین اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ تاحال خداوند عالم کی قدرت کاملہ سے بقید حیات آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ زمانہ رجعت میں دنیا میں تشریف لائیں گے اور پھر اپنی طبعی موت انتقال کریں گے۔ اس امر پر قریباً تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور فریقین کی روایات اس سلسلہ میں حدِ استفاضہ تک پہنچی ہوئی ہیں بلکہ بعض علماء نے تو ان کے تواتر کا بھی ادعا کیا ہے۔ ہاں ایک شاذ و نادر قول یہ ہے کہ ان کی وفات واقع ہو گئی مگر یہ قول النادر فی حکم المعدوم کا مصداق ہے۔ قرون سابقہ میں اس مسئلہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ مگر پنجاب کے جدید نبی اور اس کے بعد اس کی اُمتِ مرزائیہ نے خواہ مخواہ اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دے کر معرکۃ الآراء بنا دیا ہے۔ آئے دنوں اس موضوع پر بڑے بڑے مناظرے اور مکالمے ہوتے رہتے ہیں حالانکہ ہمارے خیال میں یہ سب کچھ عبث ہے۔ اس مسئلہ کو ہرگز اس قدر اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ حضرت عیسٰیؑ کو اس وقت زندہ تسلیم کیا جائے یا بالفرض انہیں مردہ مانا جائے کہ خدا ان کو دوبارہ زندہ کر کے دنیا میں بھیجے گا۔ بہر تقدیر اسے پنجاب کے اس بزرگ کی خانہ ساز نبوت کے ساتھ کیا ربط و تعلق ہے؟ حضرت عیسٰیؑ وفات پا گئے لہٰذا قادیانی صاحب نبی ہیں، یہ کس منطقی شکل کا نتیجہ ہے؟ یا دلالات ثلاثہ (مطابقی۔ تضمنی اور التزامی) میں سے یہ دعویٰ کس دلالت سے ثابت ہے؟ کسی مدعی نبوت کی نبوت کے اثبات کا یہ ہرگز کوئی عقلائی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اثباتِ نبوت کے طرق و اسالیب اور ہیں اور کسی شخص کو نبی ماننے کے میزان و معیار اور۔ جن کا تذکرہ ہم اسی شرح میں باب نبوت کے ذیل میں کریں گے۔

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو ایں جاست ۔۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند!!

بہر حال مسلمانوں کو اس جدید اُمت کی فریب کاریوں اور ابلہ فریبیوں سے آگاہ رہنا چاہیے۔ اور اس قسم کے لایعنی مسائل میں اُلجھ کر اپنا وقتِ عزیز ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

وفاتِ عیسیٰ پر کئے گئے استدلال کا جواب

چونکہ وفاتِ عیسیٰ کے قائلین قرآن مجید کی بعض آیات سے تمسک کیا کرتے ہیں۔ ان میں سے سرفہرست وہی آیت ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہے۔ یا عیسیٰ انی متوفیک و رافعک الی مطھرک من الذین کفروا۔ الایۃ جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اے عیسیٰ میں تجھے مارنے والا ہوں اور اپنی طرف بلند کرنے والا ہوں۔

اس استدلال کا بچند وجوہ جواب دیا جا سکتا ہے۔

پہلا جواب باصواب

توفّی، باب تفعّل کا مصدر ہے جس کا مادہ ہے "وفا" جس کے معنی ہیں پورا ہونا جس طرح "ایفاء" کے معنی ہیں پورا کرنا۔ اس مصدر کے جس قدر مشتقات ہیں ان سب میں یہی مصدری معنی کارفرما ہیں۔ خواہ وفی یوفی توفیۃ ہو۔ اور خواہ توفی یتوفی توفیاً ان کے معنی ہیں اخذ الشیٔ وافیاً یا اعطاء الشیٔ وافیاً کسی شے کا پورا پورا لینا یا پورا پورا دینا۔ جیسے انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب (سورہ مرتیر پ ع ۱۴) صابروں کو پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ بنا بریں "توفی" کے معنی ہوں گے پورا پورا لینا۔ چونکہ یہودیوں کا خیال تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو تختۂ دار پر لٹکا دیا ہے۔ لہٰذا ان کا جسم یہاں رہ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی روح اٹھالی جائے گی۔ لیکن خدائے قادر نے اپنے نبی کو تسلی دی کہ فکر نہ کرو۔ میں تمہیں پورا پورا یعنی جسم کو روح سمیت اٹھالوں گا۔ چنانچہ ایک مقام پر خداوند عالم یہودیوں کے اس زعم باطل کی انا قتلنا المسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا ہے۔ نفی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔ وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم وما قتلوہ یقیناً بل رفعہ اللہ الیہ وکان اللہ عزیزاً حکیماً۔ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا ہے اور نہ سولی پر لٹکایا ہے۔ انہیں شبہ ہوا ہے (یا ان کی شبیہ بنا دی گئی تھی) انہوں نے یقیناً اسے قتل نہیں کیا بلکہ خدائے قادر نے ان کو اپنی بارگاہ کی طرف اٹھا لیا۔ کیونکہ خدا غالب و حکمت والا ہے۔

ان قرآنی تصریحات کے باوجود حضرت عیسیٰ کو مردہ تصور کرنا بہت بڑی جرأت و جسارت ہے۔

دوسرا جواب باصواب

ابھی اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ توفی کے معنی پورا پورا لینے یا دینے کے ہیں۔ لہٰذا بنا بریں یہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے عیسیٰ میں تمہاری عمر کو پورا کروں گا۔ اور تمہیں اپنی طرف اٹھالوں گا (اپنے وقت پر ماروں گا) لہٰذا خداوند عالم حسب وعدہ ہنوز ان کی عمر کو پورا کر رہا ہے۔ نزول کے بعد اپنے وقت پر ان کو وفات دے گا۔ چنانچہ اس وقت جو نصاریٰ موجود ہوں گے وہ ان پر ایمان بھی لائیں گے جیسا کہ

ارشادِ قدرت ہے۔ وان من اھل الکتب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ۔ اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو جناب عیسٰیؑ کی وفات سے قبل ان پر ایمان نہیں لائے گا۔!

تیسرا جواب باصواب

توفّی کے ایک معنی نیند بھی ہیں چنانچہ ارشادِ قدرت ہے۔ وھو الذی یتوفاکم باللیل ویعلم ما جرحتم بالنہار۔ (خدا وہی ہے جو رات کے وقت تمہیں نیند دیتا ہے۔ اور جو کچھ دن میں کرتے ہو اسے جانتا ہے) اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "النوم اخت الموت" نیند موت کی بہن ہے۔ لہٰذا اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔ اے عیسٰیؑ میں تم کو سلاؤں گا اور پھر اس حالت میں بلند کروں گا۔ چنانچہ بعض روایات میں وارد ہے کہ ان کو نیند کے عالم میں اٹھایا گیا تھا۔

چوتھا جواب باصواب

مذکورہ بالا اجوبۂ شافیہ سے قطع نظر کرکے اگر بالفرض چند لمحات کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ توفّی بمعنی موت ہی ہے تو پھر اس سے آں جناب کی موت کا واقع ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ آیت مبارکہ میں "متوفیک اور رافعک" میں "واو" کے ساتھ جو عطف کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق نحویوں کا اتفاق ہے کہ واو کے عطف میں ترتیب ملحوظ نہیں ہوتی۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ جاء زید وعمرو۔ زید اور عمرو آئے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ زید پہلے آیا اور عمرو بعد میں بلکہ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو اور ممکن ہے دونوں اکٹھے آئے ہیں بلکہ ممکن ہے عمرو پہلے آیا ہو اور زید بعد میں اس صورت میں تینوں احتمال برابر قائم ہوتے ہیں لہٰذا یہاں بھی یہی احتمالات ہو سکتے ہیں لہٰذا یہیں ممکن ہے کہ رفع الی السماء پہلے ہو۔ اور موت بعد میں واقع ہو۔ ظاہر ہے کہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

اگرچہ اس سلسلہ میں اور بھی بہت سے جوابات دیئے جا سکتے ہیں مگر طالبانِ حق و حقیقت کے لئے یہی چار جوابات کافی و وافی ہیں ؂

اگر در خانہ کس است یک حرف بس است

جو شخص ان جوابات کو بنظرِ غائر دیکھ لے گا وہ اس سلسلہ میں منکرینِ حیاتِ مسیحؑ کی پیش کردہ دیگر بعض آیات مثل وکنت علیھم رقیبا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وغیرھا کے حقیقی مفہوم کو سمجھ کر ان کمزور استدلالات کے جوابات بآسانی دے سکے گا۔ واللہ الھادی۔ یاایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم وشفاء لما فی الصدور وھدی ورحمۃ للمومنین۔

عقیدۂ تناسخ کا ابطال اور اس کے اقسام کا بیان

اگرچہ پندرھویں باب کے مباحث میں تناسخ (آواگون) کی تعریف بیان ہو چکی ہے۔ تاہم یہاں پھر بغرض افادہ اس کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ حکماء کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے کہ ایک انسان کی روح اس کے جسم سے نکل کر

دار دنیا میں کسی دوسرے جسم انسانی کے اندر بطور جزا یا سزا چلی جائے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضمناً یہاں اختلافی تناسخ کے بعض دیگر اقسام کی تعریف بھی بیان کر دی جائے کیونکہ بعض ظاہر بین حضرات تناسخ اور ان کے درمیان فرق نہ کرنے کی وجہ سے بعض غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں، اس لئے ان کا تذکرہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔ وہ تین اصطلاحیں یہ ہیں (۱) **تماسخ** - اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کی روح کسی دوسرے حیوان کے بدن میں چلی جائے (۲) **تراسخ** اس کا مطلب یہ ہے کہ روح انسانی اس کے بدن سے نکل کر کسی معدنی جسم میں منتقل ہو جائے (۳) **تفاسخ** - اس کا مطلب یہ ہے کہ روح انسانی کسی جسم نباتی میں تبدیل ہو جائے فاحفظہ فانہ مفید۔ بہرحال عقیدۂ تناسخ جس کے آریہ سماج اور بعض حکماء قائل ہیں، اسلامی عقائد کے سراسر منافی اور خلاف ہے۔ اور اس کا قائل دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ جس کی وجہ سابقہ مباحث میں بیان ہو چکی ہے کہ اس سے روحوں کا قدیم ہونا اور حشر و نشر کا انکار لازم آتا ہے۔ اور درحقیقت اس عقیدۂ فاسدہ کا دار و مدار انہیں دو چیزوں پر ہے۔ اور اس کے ابطال پر بیسیوں دلائل و براہین قائم کئے گئے ہیں۔ سب کے ذکر کرنے کی تو علاوہ عدم گنجائش کے یہاں ضرورت بھی نہیں ہے۔ لہٰذا فقط چند عام فہم اور محکم دلائل اس کے ابطال پر پیش کئے جاتے ہیں۔

ابطال تناسخ پر پہلی اجمالی دلیل

تناسخ کا دار و مدار، حشر و نشر اور جسمانی معاد کے انکار پر ہے چونکہ تناسخ کے قائل معاد کو صحیح نہیں سمجھتے اور عقلاً جزا و سزا کی تکمیل بھی ضروری ہے اس کے لئے انہوں نے عقیدۂ تناسخ اختراع کر رکھا ہے۔ لیکن جب دلائل قاطعہ کے ساتھ حشر و نشر کا برحق ہونا ثابت ہے جیسا کہ عنقریب بحث معاد میں ظاہر ہوگا انشاء اللہ۔ تو اس سے خود بخود تناسخ کا بطلان بھی واضح و عیاں ہو جائے گا کیونکہ جزا و سزا کے لئے معاد یا تناسخ میں سے ایک ہی صورت صحیح ہو سکتی ہے۔ دونوں صورتیں صحیح نہیں ہو سکتیں اور جب معاد کا عقیدہ صحیح ہے تو لامحالہ تناسخ کو غلط ماننا پڑے گا۔

دوسری دلیل

عقیدۂ تناسخ کی بنیاد ارواح کے قدیم ہونے پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ امر پہلے باب میں دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ سوائے خداوند عالم کے دوسری تمام کائنات مع ارواح کے حادث ہے نہ قدیم۔ تو اس سے خود بخود تناسخ کا عقیدہ باطل ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہ نظریہ بناء الفاسد علی الفاسد کا مصداق ہے۔ اور جب مبنیٰ غلط ہے تو بنا بھی بالضرور غلط ہی ہوگی۔ کیونکہ ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج — تا ثریا مے رود دیوار کج!!

تیسری دلیل

قائلین تناسخ نے اس فاسد عقیدہ کو محض اسی بناء پر تسلیم کیا ہے کہ اس سے نیک یا بد لوگوں کو ان کے اعمال صالحہ یا طالحہ کی جزا یا سزا مل سکے کیونکہ ان کی غلط بین نگاہ میں اس سزا یا جزا کے ملنے کا کوئی اور طریقہ نہ تھا۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ جزا یا سزا کے سلسلہ میں جزا یا سزا پانے والے شخص کو یہ معلوم ہونا چاہیے۔ کہ یہ فلاں عمل صالح یا طالح کی جزا یا سزا ہے اور اگر یہ معلوم ہی نہ ہو تو وہ جزا یا سزا بے کار محض سمجھی جائے گی۔ اور یہ امر وجدانی

اور بدیہی طور پر معلوم ہے کہ آج تک کسی شخص کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اس جنم میں اپنے کسی سابقہ عمل کی جزا یا سزا پا رہا ہے اگر سب کو نہیں تو کم از کم کسی نہ کسی شخص کو تو ضرور یہ امر معلوم ہوتا لیکن مشاہدہ اس کے خلاف شاہد ہے۔ لہٰذا واضح ہوا کہ اس جنم میں کسی کو کوئی جزا یا سزا نہیں مل رہی ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تناسخ کا عقیدہ غلط ہے۔

چوتھی دلیل

اگر روحوں کا تناسخ جائز و صحیح ہوتا تو چاہیے تھا کہ روزانہ مرنے والوں اور پیدا ہونے والوں کی تعداد برابر رہتی۔ لیکن یہ امر مشاہدہ و وجدان کے خلاف ہے۔ کیونکہ بداہۃً معلوم ہے کہ کبھی مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اور کبھی پیدا ہونے والوں کی۔ پہلی صورت میں بہت سی روحوں کا معطل و بیکار رہنا لازم آئے گا۔ جسے اہل تناسخ تسلیم نہیں کرتے اور دوسری صورت میں بعض نئی روحوں کا پیدا ہونا لازم آئے گا جو کہ اہلِ تناسخ کے عقیدہ کے خلاف ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ تناسخ کا عقیدہ فاسد ہے۔

پانچویں دلیل

اگر عقیدۂ تناسخ صحیح ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ ہر روز چاہیے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مردہ حیوان یا انسان زندہ ہو جایا کریں کیونکہ اہلِ تناسخ کے پاس اس امر کی کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے کہ مرنے والے کی رُوح کو ضرور کسی تازہ پیدا ہونے والے جسم ہی کے اندر داخل ہونا چاہیے۔ لہٰذا بنا بر عقیدہ تناسخ جائز ہوگا کہ انسان جو آج مرا ہے۔ اس کی روح اپنے اعمال کے مناسب حال کسی مردہ آدمی یا کتے یا بندر وغیرہ حیوان کے جسم میں داخل ہو جائے۔ اور وہ زندہ ہو جائے۔ لیکن آج تک کبھی ایک مرتبہ بھی ایسا ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ اور نہ اس پر کوئی دلیل یا شاہد موجود ہے۔ لہٰذا اس سے لازم آتا ہے کہ عقیدۂ تناسخ بالکل غلط اور مہمل ہے۔

چھٹی دلیل

یہ امر غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی روح ابتدائے ولادت کے زمانہ میں بظاہر لاتعقل ہوتی ہے۔ اور اس میں تعقل و ادراک کی شان بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ جوں جوں انسان بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے ادراکات و تعقلات بھی بڑھتے جاتے ہیں حتیٰ کہ حد کمال تک پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے حکماء نے انسان کی اس قوت کے چار درجے قرار دیئے ہیں۔ عقل ہیولانی۔ عقل بالملکہ۔ عقل بالفعل اور عقل مستفاد۔ جب وہ بچہ ہوتا ہے اس وقت اس کی عقل ہیولانی ہوتی ہے۔ جب کچھ بڑھتا ہے اور اس میں ہر شئی کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت عقل بالملکہ ہوتی ہے۔ جب اس سے بھی ترقی کرتا ہے اور بالفعل علوم حاصل کرتا ہے تو اس وقت اس کی عقل بالفعل ہوتی ہے۔ اور جب اس سے بھی زیادہ ترقی کرتا ہے تو عقل مستفاد کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم کہتے ہیں کہ اگر تناسخ ارواح ممکن ہو یا واقع ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ وہ روحیں جو عقل مستفاد یا عقل بالفعل کے درجہ تک پہنچ چکی ہیں۔ وہ پلٹ کر از سرِ نو عقلِ ہیولانی کے درجہ میں آ جائیں۔ حالانکہ مشاہدہ شاہد ہے کہ کوئی شئی فعلیت سے قوت کی طرف منتقل نہیں ہوتی۔ مثلاً کبھی کوئی بوڑھا آدمی دوبارہ بچہ ہوتا نہیں دیکھا گیا۔ کوئی حکیم و فیلسوف انسان دوبارہ طفل مکتب بنتا نہیں دیکھا گیا اور کبھی مضغہ و علقہ پھر نطفہ نہیں بنتا۔ لہٰذا جب ایسا کبھی نہیں ہوا تو پھر وہ روح جو عقل مستفاد یا

عقل بالفعل کے درجہ تک پہنچ چکی ہے وہ کس طرح عقل ہیولانی کے درجہ میں آسکتی ہے جو کہ لازمۂ تناسخ ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ عقیدۂ تناسخ بالکل ایک بے بنیاد اور بے برہان عقیدہ ہے۔ جس کا کوئی صحیح العقل انسان قائل نہیں ہو سکتا۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

ساتویں دلیل

تناسخ کا یہ چکر ایسا ہے کہ جس کا کوئی آغاز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ انسان ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات یا حیوان ہو اور نبات وحیوان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے انسان ہو کیونکہ تناسخ کی بنیاد ہی صعود وہبوط پر قائم ہے۔ یعنی وہ اچھے اعمال سے زندگی کے اعلیٰ طبقات کی طرف صعود کرتا ہے۔ اور بُرے اعمال کی بدولت ادنیٰ طبقات کی طرف ہبوط کرتا ہے۔ اور یہ کھلا ہوا دور ہے۔ جو عقلاً محال و ناممکن ہے۔

آٹھویں دلیل

اگر تناسخ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کے چکر کو ازلی و ابدی ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اس نظریہ کی بنا پر ارواح قدیم ہیں، اور جب ان کا یہ چکر قدیم ہے تو اس سے لازماً یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح جو بار بار قالب بدلتی رہتی ہیں قدیم ہیں بلکہ وہ مادے بھی جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں ازلی اور ابدی ہوں۔ اور یہ زمین اور یہ نظام شمسی اور یہ قوتیں جو اس نظام میں کام کر رہی ہیں یہ سب ازلی و ابدی ہوں لیکن عقل کا یہ فیصلہ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شاہد ہیں۔ کہ ہمارا نظام شمسی نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔ اس کتاب کے پہلے باب توحید میں حدوث عالم پر بکثرت دلائل پیش کئے جا چکے ہیں۔

نویں دلیل

اگر بعد والی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ بُرے کرموں کا پھل بُرا ہی ہونا چاہیے اور جب دوسرے جنم میں وہ بُرا پھل ہم کو ملا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس بُرے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں۔ لامحالہ اس سے بُرے اعمال ہی صادر ہوں گے اور پھر تیسرے جنم میں ان کا پھل اور بھی زیادہ بُرا ہو گا۔ اس طرح بدکار انسان کی روح ہمیشہ پست سے پست تر طبقات کی طرف گرتی چلی جائے گی۔ اور اس سے کبھی ابھرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ انسان سے حیوان تو بن سکتا ہے مگر حیوان سے انسان بننا ممکن نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو اس وقت انسان ہیں وہ کس حسن عمل کے نتیجے میں انسان ہوئے اور کہاں سے آئے؟ کیا انسانی عقل اس گتھی کو سلجھا سکتی ہے؟

دسویں دلیل

اس میں شک نہیں ہے کہ تناسخ کا اعتقاد اس سے بہتر ہے کہ موت کو فنائے محض اور عدم مطلق سمجھا جائے اور اس سے عقیدہ جزا و سزا اور اچھے یا بُرے افعال کے انجام نیک یا بد کے نظریہ کی بھی فی الجملہ تائید ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو عقیدہ عقل و علم کے خلاف ہے اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں مانع و مزاحم ہو (عقیدہ اور رہبانیت دراصل اعتقاد تناسخ کی پیداوار ہیں۔ فتدبر) اس کی گرفت انسانی دل و دماغ پر کبھی مضبوط نہیں ہو سکتی بلکہ یہ عقیدہ اپنے آخری نتیجہ کے اعتبار سے اپنی اخلاقی قیمت بھی کھو دیتا ہے کیونکہ جب کسی انسان کو یہ یقین ہو کہ تناسخ کا چکر بالکل ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس میں ہر ایک فعل کا جو نتیجہ مقرر ہے وہ ظاہر ہو کر ہی رہے گا اور کسی توبہ و استغفار یا کفارہ سے اس نتیجہ کو بدلا نہیں جا سکتا تو اس عقیدہ کا اثر یہ ہو گا کہ ایک مرتبہ گناہ کرنے کے بعد ایسا شخص ہمیشہ کے لئے گناہ کے پھیر میں آ جائے گا

باب الاعتقاد فی البعث بعد الموت۔ قال الشیخ ابو جعفر اعتقادنا فی البعث بعد الموت

انیسواں باب (مرنے کے بعد قیامت کبریٰ میں اٹھنے کے بارے میں اعتقاد)

جناب شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی بابت ہمارا اعتقاد "

اور ہوئے گا کہ جب مجھے جانور بنناہی ہے تو کیوں نہ اس انسانی جون میں تمام لذتوں سے دل کھول کر فائدہ اٹھالوں

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول

ان دلائل و براہین سے واضح ہو گیا کہ عقیدہ تناسخ بالکل غیر معقول نظریہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ یہ نظریہ ایک زمانہ میں بہت مقبول رہا ہے۔ یونان میں مسیح سے کئی صدیاں پہلے فیثا غورس وغیرہ اس کے قائل تھے۔ روم میں بھی مسیحیت سے پہلے اس کا چرچا تھا مصر قدیم کی تاریخ میں بھی اس کے کچھ آثار ملتے ہیں۔ لیکن اب تو یہ اعتقاد یا تو ہندی الاصل مذاہب برہمنیت، بودھ مت اور جین مت میں پایا جاتا ہے۔ یا پھر مغربی و جنوبی افریقہ۔ وسطی آسٹریلیا اور انڈونیشیا وغیرہ کی بعض یا نیم وحشی اقوام میں یہ خیال پایا جاتا ہے۔ باقی تمام مہذب قومیں اس کو رد کر چکی ہیں۔ قد جاءکم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبینا

انیسواں باب، قیامت کبریٰ کا بیان

قیامت کے شرعی مفہوم کی تعیین اور اس کے جسمانی و روحانی ہونے کا بیان

معاد (جسے قیامت کبریٰ بھی کہا جاتا ہے)، کا اصطلاح شریعت میں مطلب یہ ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جس میں خلاقِ عالم تمام لوگوں کی روحوں کو ان کے اصلی بدنوں میں داخل کر کے حساب و کتاب اور جزاء و سزا کے لئے زندہ کر کے محشور فرمائے گا۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے۔ ان الاولین و الاخرین لمجموعون الی میقات یوم معلوم (سب اولین و آخرین ایک مقرر تاریخ پر جمع کئے جائیں ایک اور مقام پر فرماتا ہے ھذا یوم الفصل جمعناکم والاولین۔ یہ فیصلہ کا دن ہے اس لئے ہم نے تم کو اور تمام گذشتگان کو جمع کر دیا ہے۔ اس عقیدہ پر تمام اہلِ اسلام بلکہ تمام سماوی ادیانِ عالم کے ماننے والوں کا اتفاق ہے۔ اور یہ عقیدہ ضروریات دینِ اسلام میں سے ہے جس کے منکر کے لئے دائرہ اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں ملاحدہ، دہریہ اور ہنود (آریہ سماج) قیامت کے قائل نہیں ہیں۔ اول الذکر حضرات تو چونکہ کسی مذہب و ملت اور مبدا کو مانتے ہی نہیں اس لئے وہ کسی جزاء و سزا کے بھی قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کے قیامت کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ثانی الذکر اس ضرورت کو عقیدہ تناسخ کے ذریعہ پورا کر لیتے ہیں۔ باقی معاد کے قائلوں میں صرف یہ اختلاف ہے کہ آیا معاد فقط جسمانی

انہ حق قال النبیؐ یا بنی عبد المطلب ان الرائد لا یکذب اھلہ والذی بعثنی بالحق

یہ ہے کہ وہ برحق ہے جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ اے اولادِ عبد المطلب! مناسب منزل کا نشان بتانیوالا کبھی اپنے اہل سے جھوٹی بات بیان نہیں کرتا اس ذات کی قسم جس نے مجھے برحق مبعوث

ہوگی یا صرف روحانی یا جسمانی و روحانی ہوگی۔ فقط جسمانی کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد روح کو نہ کوئی ثواب ملتا ہے اور نہ کوئی عذاب ہوتا ہے۔ ہاں بروز قیامت اس کو اپنے اصلی بدن میں داخل کر کے اس کا حساب و کتاب لیا جائے گا۔ اور اس کے بعد جزا یا سزا کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اور صرف روحانی معاد کا مفہوم یہ ہے کہ مرنے کے بعد روح اپنے اچھے اعمال و معلومات سے متنعم و متلذذ یا اپنے بُرے اعمال و معلومات سے معذّب و معاقب رہتی ہے۔ یہی اس کی جزا یا سزا ہے۔ بدن جسمانی کبھی محشور نہ ہوگا مقصد یہ کہ جزا یا سزا صرف روحانی ہے۔

اسی بیان سے تیسرے نظریہ یعنی معاد جسمانی و روحانی کا مطلب و مفہوم بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے چنانچہ بعض متکلمین اسلام فقط معاد جسمانی کے قائل ہیں اور بعض حکما، فقط روحانی کے لیکن علمائے محققین بلکہ جمہور مسلمین معاد جسمانی و روحانی ہر دو کے قائل ہیں۔ قرآن کریم اور احادیث معصومینؑ سے بھی اسی عقیدہ کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ اپنی کتاب حق الیقین میں اس آخری نظریہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔ "موقف گویدایں مذہب اقوی مذاہب است و منافاتی میان لذاتِ جسمانی و روحانی نیست و احادیث نیز دلالت برایں دارد" یعنی موقف کہتا ہے کہ یہ نظریہ تمام نظریات سے زیادہ قوی ہے جسمانی و روحانی لذات کے حاصل ہونے میں ہرگز کوئی باہمی منافات نہیں ہے۔ اور احادیث بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔ اسی طرح علامہ سید عبد اللہ شبر اپنی کتاب حق الیقین میں فرماتے ہیں۔ اقول القول بالمعاد الجسمانی والروحانی معًا اقوی المذاهب وهو الذی دلت علیه الایات القرانیه والاحادیث المعصومیّة والمؤیدات العقلیّة۔ میں کہتا ہوں معاد جسمانی و روحانی والا نظریہ تمام نظریات سے زیادہ قوی ہے اور اسی پر آیات قرآنیہ۔ احادیث معصومیہ دلالت کرتی ہیں اور عقلی مؤیدات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

بہرکیف یہاں دو دعوے ہیں۔ ایک اصل معاد کی ضرورت اور اس کا اثبات دوسرا جسمانی و روحانی معاد کی صحت اور اس کا اتفاق ذیل میں بالترتیب ان ہر دو دعووں کو دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ فاستمع لما یتلیٰ علیک۔

قیامت کے ضروری ہونے کا اثبات

معاد کے ضروری و لازمی ہونے اور عقیدۂ اسلامیہ کی صحت و صداقت پر بیسیوں عقلی و نقلی دلائل و براہین موجود ہیں۔ لیکن ہم اپنے طریقہ کے مطابق بنظر اختصار یہاں اس سلسلہ میں فقط چند دلائل ساطعہ پیش کرتے ہیں جن کو بنظر غائر و

ثُمَّ اِنَّکُمْ لَتَمُوتُنَّ کَمَا تَنَامُونَ وَ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُونَ وَمَا بَعْدَ الْمَوْتِ دَارٌ | بہ نبوت کیا ہے۔ کہ تم ضرور مرجاؤ گے۔ جس طرح کہ سویا کرتے ہو۔ اور پھر ضرور تم زندہ کئے جاؤ گے۔ جس طرح تم بیدار ہوتے ہو۔ اور مرنے کے بعد

بہ نگاہِ انصاف دیکھنے سے یہ امر روشن ہو جائے گا کہ قیامت کا ہونا اشد ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر تشریع شرائع و ارسال رسل و رسائل کا سلسلۂ جلیلہ عبث اور بے کار محض ہو کر رہ جائے گا۔ نیز ہمارے ان دلائل و براہین سے یہ امر بھی واضح ہو جائے گا کہ معاد کا جو اصلی مقصد ہے وہ تناسخ کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ضرورتِ معاد پر پہلی دلیل

جس طرح ہر عاقل و عادل اور مہربان بادشاہ اپنی رعایا کی صلاح و فلاح کے لئے ایک قانون مقرر کرتا ہے۔ اور پھر عدالت قائم کرتا ہے۔ تاکہ اس میں قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف تادیبی کاروائی کی جا سکے۔ اور ظالم و مظلوم کے درمیان فیصلہ ہو سکے مدعی و مدعا علیہ کی پیشی کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جس میں وہ مع گواہاں پیش ہوتے ہیں اور سماعت کے بعد علی رؤس الاشہاد فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ اور مجرم کو قرار واقعی سزا دی جاتی ہے بلاتشبیہ اسی طرح عادل حقیقی احکم الحاکمین نے اپنے بندوں کی اصلاح احوال کے لئے دنیا میں اپنے انبیاء و مرسلین اور قانون کی مختلف کتابیں بھیجیں، سب سے آخر میں سرکار ختمی مرتبت کو ایک کامل و اکمل شریعت دے کر مبعوث فرمایا قانونِ قدرت کی پوری پوری وضاحت کر دی گئی۔ لہٰذا اب ایک ایسا دن ضروری ہے۔ جس میں لوگوں کا محاسبہ ہو سکے اور محسن و مسئی کو جزا یا سزا دی جا سکے۔ اسی دن کا نام اصطلاح شریعت میں قیامت ہے۔ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰکُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ۔

دوسری دلیل

خداوند عالم نے جو تکالیف اپنے بندوں پر عائد کی ہیں ان کے ماننے اور نہ ماننے کی وجہ سے تمام لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ کچھ مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اور کچھ عاصی و نافرمان عدل و حکمت خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ مطیع کو اجر و ثواب ملنا چاہیے اور عاصی کو عتاب و عذاب ہونا چاہیے تاکہ نیک و بد میں امتیاز ہو سکے۔ اور یہ امر مشاہدہ سے ثابت ہے کہ دنیا میں ان تمام لوگوں کو نہیں تو اکثر کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا نہیں ملتی ہزاروں مطیع و فرمانبردار حضرات مصائب و محن اور رنج و الم سے لبریز زندگی گذارنے کے بعد یہاں سے سدھار گئے اور لاکھوں سرکش و نافرمان انسان ایسے ہیں جو نہایت شاہانہ جاہ و جلال اور شان و شکوہ کی زندگی گذار کر چلے گئے۔ عقل سلیم فیصلہ کرتی ہے کہ ان کی جزا و سزا کے متعلق کوئی مکمل انتظام ہونا لازم ہے۔ جس میں صالح و طالح، شقی و سعید اور ظالم و مظلوم کا فرق ظاہر ہو۔ ورنہ پھر یہ سب گروہ برابر ہو جائیں گے۔ بلکہ بروں کی حالت اچھوں کی حالت سے بھی بہتر رہے گی۔ اور اس طرح تکالیف شرعیہ کا عبث و فضول ہونا لازم آئے گا۔ جو کہ خلاقِ حکیم کی شان کے سراسر منافی ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ معاد کا ہونا اشد ضروری ہے۔ ارشاد قدرت ہے۔ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ۔ آیا ہم ان لوگوں

الّا الجنّة والنّار وخلق جميع الخلق وبعثهم على الله عزّ و جلّ كخلق نفس واحدة ۞	سوائے جنّت یا جہنم اور کوئی گھر نہیں ہے۔ تمام مخلوق کو پیدا کرنا اور پھر سب کو زندہ کرنا خدائے قادر و توانا کے لئے ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک آدمی کو پیدا کرنا

کہ جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے مفسدین کی طرح بنا دیں گے ؟ یا کیا ہم متقین کو فجار و فاسقین کی طرح قرار دیں گے ؟ (ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ایک اور جگہ قرآن مجید میں اس مطلب پر تنبیہ کی گئی ہے۔ ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلهم کالذین امنوا و عملوا الصّالحات سواء محیاهم و مماتهم ساء ما یحکمون (پ۲۵ س جاثیہ ع ۲) جن لوگوں نے دل کھول کر بدکاریاں اور بدمعاشیاں کی ہیں کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو اپنے ان نیک بندوں کی طرح کر دیں گے۔ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اور ان کا جینا و مرنا اور انجام ایک جیسا اور یکساں ہوگا ؟ ان کا یہ خیال بالکل غلط اور بیہودہ ہے بہرحال جب ہم یہ بات کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ انسان کے مادی اعمال کا نتیجہ اور ثمر تو یہاں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اخلاقی اور روحانی اعمال کا کوئی اثر اور نتیجہ یہاں ظاہر نہیں ہوتا تو ہماری عقل و دانائی فیصلہ کرتی ہے کہ اس دنیوی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ایسی ہونی چاہیے جس میں اچھے یا برے اخلاقی و روحانی اعمال کے آثار و خواص اور نتائج ظاہر ہوں۔ اور انسانوں کو ان کی نیکوکاریاں یا بدکاریوں کی جزا اور سزا مل سکے۔

تیسری دلیل

اطاعت و فرمانبرداری کرنے پر بندگانِ خدا سے اجر و ثواب عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کے پورا کرنے کے لئے معاد کا ہونا ضروری ہے ورنہ خداوند عالم کا کذب اور بندوں پر ظلم و جور لازم آئے گا جس سے خالق عالم کا دامن ربوبیت منزہ ہے۔ اس کا ارشاد ہے وما ربّك بظلام للعبید۔ وانّ الله لا یخلف المیعاد۔ اسی طرح نافرمانوں کو عذاب و عقاب کی وتہدید کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ دارِ دنیا میں یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ مشاہدہ شاہد ہے کہ دنیا میں کتنی ظالم و کافر لوگ اہل ایمان و ایقان پر مسلط رہے ہیں۔ اور کئی مومن مظلوم و مقہور رہ اور اسی حالت پر ہر دو کا خاتمہ ہوا ہے۔ پس اگر معاد اور لوگوں کا حشر و نشر نہ ہو۔ اور ظالموں سے مظلوموں کا انتقام نہ لیا جائے تو خلاقِ عالم کی طرف سے یہ ظلم عظیم ہوگا جس سے اس کی شان اجل و ارفع ہے۔ لہٰذا معاد کا ہونا واجب و لازم ہے ورنہ وعدہ وعید کا یہ سلسلہ غلط ہو کر رہ جائے گا۔ اسلام عدل کامل پر مبنی ہے۔ حشر و نشر کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کے ساتھ عدل کامل ہو جو ظلم انسان کے ساتھ دنیوی زندگی میں ہوا ہے۔ ظالم کو اس کی سزا اور مظلوم کو اس کی جزا مل جائے۔ اسی لئے قرآن میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن عدل ہوگا و لا یظلمون فتیلا ان پر ذرہ بھی ظلم و زیادتی نہ ہوگی۔ و من یعمل مثقال ذرة خیرا یره و من یعمل مثقال ذرة شرا یره۔ جو شخص ذرہ برابر اچھا کام کرے گا اس کا اچھا ثمرہ پائے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا اس کا برا نتیجہ بھی دیکھے گا۔

ذلک قولہ تعالیٰ ما خلقکم و لا بعثکم الّا کنفس واحدۃ

چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔ تم سب کا پیدا کرنا اور مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا نہیں ہے مگر ایک آدمی کی خلقت و بعثت کے مانند

چوتھی دلیل

اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ انسان اس دار دنیا میں امتحان و آزمائش میں مبتلا ہے کیونکہ خالق کائنات نے اسے احکام شریعت ماننے کی تکلیف دی ہے لہٰذا ان تکالیف شرعیہ کی اسے کہیں نہ کہیں جزا و سزا ضرور ملنی چاہیے۔ اب اس کے دو طریقے ہیں۔ اہل تناسخ نے اس مقصد کے لئے تناسخ ارواح کا عقیدہ اختراع کیا ہے اور پیغمبر اسلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے اس کا طریقہ معاد اور حشر و نشر بیان فرمایا ہے۔ لیکن چونکہ تناسخ باطل ہے۔ کیونکہ اس کے ابطال پر ہم سابقہ باب میں دلائل قاطعہ قائم کر چکے ہیں۔ جن میں سے ایک عام فہم اور آسان دلیل یہ بھی تھی کہ عقل حاکم ہے کہ جزا یا سزا اس طرح ہونی چاہیے کہ انسان کو اس امر کا احساس ہو کہ اسے فلاں عمل خیر یا فلاں عمل بد کی جزا یا سزا دی جا رہی ہے لیکن اگر وہ اس امر کو سمجھ ہی نہ سکے تو پھر جزا و سزا بے کار ہو کر رہ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ تناسخ ارواح میں یہ احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو کر بادشاہ بن جاتا ہے اور نہایت عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے ہرگز یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ اسے گذشتہ زندگی کے کس عمل صالح کے معاوضہ میں بادشاہی ملی ہے۔ اسی طرح ایک بندر یا بلی کو کیا خبر ہے کہ کس عمل بد کی پاداش میں اسے بندر یا بلی بنایا گیا ہے۔ پس جب تناسخ باطل ہے تو اس سے خود بخود دوسرے طریقہ جزا و سزا یعنی معاد کی صحت ثابت ہو جاتی ہے۔ ولا یلزم من ھذا البیان الدور نعوذ باللّٰہ من الحور بعد الکور۔ فتدبر۔

پانچویں دلیل

یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کہ خداوند عالم سے بڑا اور کوئی سلطان و شہنشاہ نہیں ہے وہی ہر چیز کا خالق و مالک ہے۔ کائنات میں اس کا کوئی ہمسر و نظیر نہیں ہے وہ اپنی ذات و صفات میں واحد و یگانہ ہے۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ تمام مخلوقات خداوندی میں حضرت انسان سے بڑھ کر کوئی اشرف و اعلیٰ مخلوق نہیں ہے۔ حضرت انسان کو ہی اشرفیت و افضلیت کا تاج پہنایا گیا ہے۔ اب اگر یہ اشرف المخلوقات خالق کائنات کی اطاعت یا معصیت کرے تو اس کو عوض کیسے ملنا چاہیے؟ قاعدہ یہ ہے کہ ہمیشہ جزا و سزا دہندہ و گیرندہ کی حیثیت کے مطابق ہوا کرتی ہے جو شخص جس مرتبہ کا مالک ہو گا وہ جزا و سزا بھی ویسی ہی دے گا اور پانے والا جس منزلت کا ہو گا جزا یا سزا بھی اس کو ایسی ہی دی جائے گی۔ اس امر کی وضاحت اس حکایت سے بخوبی ہو جاتی ہے جو رسالہ ابطال تناسخ میں منقول ہے۔ کہ سکندر اعظم ایک مرتبہ کسی آدمی سے خوش ہوا۔ اور اس سے کہا مجھ سے انعام طلب کر۔ اس نے کہا ایک درہم دے دو۔ سکندر نے کہا یہ تو میری شان کے خلاف ہے۔ اس نے کہا اچھا تو پھر ایک ملک دے دو۔ سکندر نے کہا یہ تیری حیثیت سے زیادہ ہے معلوم ہوا کہ ہمیشہ جزا یا سزا دہندہ اور گیرندہ کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے۔ بنابریں لازم ہے کہ خالق و مخلوق کی جزا و سزا کے سلسلہ میں اس قاعدہ کو ملحوظ رکھا جائے۔ اب ناظرین کرام انصاف سے بتائیں کہ اس جزا و سزا کا وہ طریقہ ٹھیک ہے جو اہل تناسخ

نے تجویز کیا ہے یا وہ طریقہ انسب واولیٰ ہے جو اسلام اور دیگر آسمانی ادیان نے پیش کیا ہے؟

کسے انکار ہے کہ دنیا کا راحت و رنج اور آسائش و غم دونوں فانی و بے حقیقت ہیں۔ اس میں نہ عیش و راحت کو دوام حاصل ہے اور نہ رنج والم کو بقاء۔ ایک شخص آج بادشاہ ہے کل گدا۔ آج غریب ہے کل امیر۔ ایک آدمی آج تندرست ہے کل مریض۔ آج مریض ہے کل تندرست۔ یہ زندگی نہیں بلکہ ایک کھیل ہے۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ ان الحیوٰۃ الدنیا لھو ولعب وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون۔ تو بھلا مالک الملک اور شہنشاہوں کا شہنشاہ جو کہ ازلی و ابدی اور غیر فانی ہے۔ انسان ایسے اشرف المخلوقات کو ایسی بے حقیقت جزا یا سزا دے سکتا ہے؟ حاشا وکلا یہ امر تو قانون عقل و حکمت کے بالکل خلاف ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہیے جس کے ذریعہ جزا یا سزا عقل و قانون کے مطابق دی جا سکے اور وہ طریقہ سوائے معاد کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جس میں جزا و سزا دینے اور لینے والے کی حیثیت کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

بحمدہ تعالیٰ ان دلائل و براہین سے واضح و لائح ہو گیا کہ معاد کا ہونا عقلاً ضروری ہے۔ اور کوئی عقلمند انسان اس کی ضرورت کا انکار نہیں کر سکتا اور شریع انور بھی اس کے اثبات کے تذکرہ سے مملو و مشحون ہے مخبر صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے۔ قرآن مجید میں شاید ہی کوئی ایسا سورہ ہو جس میں چند بار معاد کا اجمالاً یا تفصیلاً ذکر نہ کیا گیا ہو۔ ارشاد قدرت ہے

وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ما فرطنا فی الکتٰب من شئ ثم الیٰ ربھم یحشرون (پ س ع) زمین میں جو چلنے پھرنے والا (حیوان) یا اپنے دونوں پروں سے اڑنے والا پرندہ ہے ان کی بھی تمہاری جماعتیں ہیں (اور سب کے سب لوح محفوظ میں موجود ہیں) ہم نے کتاب (قرآن) میں کوئی بات فروگذاشت نہیں کی ہے پھر سب کے سب (چرندے ہوں یا پرندے) اپنے پروردگار کے حضور میں لائے جائیں گے۔

ان اللہ یبعث من فی القبور (سورہ حج پ ع ۸) اور بے شک جو لوگ قبروں میں ہیں ان کو خدا دوبارہ زندہ کرے گا۔ والموتی یبعثھم اللہ (سورہ انعام پ ع ۱۰) اور مردوں کو تو خدا قیامت ہی میں اٹھائے گا زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا قل بلیٰ وربی لتبعثن ثم لتنبؤن بما عملتم (سورۃ تغابن پ ع) کافروں کا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے (اے رسول) تم کہہ دو۔ ہاں اپنے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر جو جو کام تم کرتے رہے وہ تمہیں بتا دے گا۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ (سورۃ زلزال پ ع ۲۳) تو جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہے تو اسے دیکھ لے گا۔ وان الساعۃ اٰتیۃ لا ریب فیھا (سورۃ حج پ ع ۸) اور قیامت یقیناً آنے والی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ فسیقولون من یعیدنا قل الذی فطرکم اول مرۃ (سورہ بنی اسرائیل پ ع ۵) تو یہ لوگ عنقریب ہی تجھ سے پوچھیں گے

کر بھلا ہمیں دوبارہ کون زندہ کرے گا۔ تم کہہ دو کہ وہی (خدا) جس نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا۔ وھو الذی یبدأ الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ (سورہ روم پ ۲۱ ع ۳) اور وہ ایسا (قادر مطلق) ہے جو مخلوقات کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ (قیامت کے دن) پیدا کرے گا اور یہ اس پر آسان ہے۔ الیہ مرجعکم جمیعًا وعد اللّٰہ حقًا انہ یبدی الخلق ثم یعیدہ لیجزی الذین آمنوا وعملوا الصالحات بالقسط (پ ۱۱ سورہ یونس ع ۶) تم سب کو (آخر) اسی کی طرف لوٹنا ہے خدا کا وعدہ سچا ہے وہی یقینًا مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر (مرنے کے بعد) وہی دوبارہ زندہ کرے گا تاکہ جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کئے ان کو انصاف کے ساتھ جزائے (خیر) عطا فرمائے۔ ان الساعۃ اٰتیۃ اکاد اخفیہا لتجزیٰ کل نفس بما تسعٰی (سورہ طٰہٰ پ ۱۶ ع ۱۵) (کیونکہ) قیامت ضرور آنے والی ہے اور میں اسے لامحالہ چھپائے رکھوں گا تاکہ ہر شخص (اس کے خوف سے نیکی کرے اور) جیسی کوشش کی ہے اس کا اسے بدلہ دیا جائے۔ وما خلقنا السمآء والارض وما بینہما باطلًا ذٰلک ظن الذین کفروا (سورہ صٓ پ ۲۳ ع ۱۲) اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں بیکار نہیں پیدا کیا یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو کافر ہو بیٹھے۔ افحسبتم انما خلقناکم عبثًا وانکم الینا لا ترجعون (سورہ مومنون پ ۱۸ ع ۶) تو کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو (یوں ہی) بیکار پیدا کیا اور یہ کہ تم ہمارے حضور میں لوٹا کر نہ لائے جاؤ گے۔ ام نجعل الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار (سورہ ص پ ۲۳ ع ۱۲) کیا جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے کام کئے ان کو ہم ان لوگوں کے برابر کر دیں جو روئے زمین میں فساد پھیلایا کرتے ہیں یا ہم پرہیزگاروں کو مثل بدکاروں کے بنا دیں۔ لیعلموا ان وعد اللّٰہ حق وان الساعۃ لا ریب فیہا (سورہ کہف پ ۱۵ ع ۱۵) تاکہ وہ لوگ دیکھ لیں کہ خدا کا وعدہ یقینًا سچا ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لیں کہ قیامت (کے آنے) میں کچھ بھی شبہ نہیں۔ (ترجمہ فرمان) الیٰ غیر ذٰلک من الآیات الکثیرۃ۔

ان آیات مبارکہ میں غور و فکر کرنے سے قیامت کے قائم ہونے کے بعض اسرار و رموز کا انکشاف اور اس کے ضروری الوقوع ہونے کا فلسفہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ ان فی ذٰلک لآیات لقوم یعقلون۔

اعتقاد آخرت کے اخلاقی پہلو

اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے عالم آخرت کا از روئے عقل و شرع ضروری ہونا معلوم ہو گیا۔ اب اس لحاظ سے بھی غور کرنا چاہیے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی انسانی زندگی کے سدھارنے میں عقیدۂ آخرت کو کتنا دخل ہے؟ دنیا کی تاریخ سے واقفیت اور غور و فکر کی کچھ صلاحیت رکھنے والا انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ برائیوں اور بداخلاقیوں سے جس طرح آخرت کا عقیدہ بچاتا ہے۔ اور بچا سکتا ہے۔ اس طرح کوئی دوسری چیز نہیں بچا سکتی۔ اس طرح اسلام نے یوم آخر کے اعتقاد کو اپنے ضابطۂ اخلاق اور نظام شرعی کے لئے ایک زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے۔ جس میں صلاح و تقویٰ پر عمل کرنے اور شر و فساد

سے اجتناب کرنے کے لیے عقلی ترغیب بھی موجود ہے۔ اور نیکی و بدی پر یقین جزا و سزا کا خوف بھی دامن گیر ہے۔ تجربہ و مشاہدہ شاہد ہے کہ بدکاریوں اور عیاریوں کی گنجائش اسی معاشرہ میں ہوتی ہے۔ جو آخرت اور مرنے کے بعد خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونے اور جزا و سزا کے تصور سے خالی ہو۔ نیز آخرت کا انکار کرنے سے انسانی اخلاق و اقدار کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ اور خیر و شر کا معیار و میزان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایسا انسان جو قیامت کا قائل نہیں وہ دو حال سے خالی نہیں یا حالات اس کے ناموافق ہوں گے تو اس عقیدے سے وہ شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی میں مبتلا ہو جائے گا۔ جب وہ اپنی نیکی کا کوئی نتیجہ دنیا میں نہ دیکھے گا تو اس کی قوتِ عمل سرد پڑ جائے گی اور جب وہ شر پرور اور ظالموں کو برسرِ اقتدار دیکھے گا تو وہ یہ خیال کرے گا کہ عالمِ ہستی میں شر ہی کا بول بالا ہے اور خیر صرف نیچا دیکھنے کے لئے ہے۔ اور اگر اس کے حالات موافق و مساعد ہوئے تو اس اعتقاد سے انسان ایک نفس پرست حیوان ہو کر رہ جائے گا وہ یہی خیال کرے گا کہ جو دن عیش و عشرت میں بسر ہو جائیں وہی غنیمت ہیں۔ کما قیل۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ ایسا انسان ظلم و ستم کرے گا۔ لوگوں کے حقوق غصب کرے گا۔ ان کی آبروریزی میں عار محسوس نہیں کرے گا۔ اور اپنی جنسی اور ذاتی خواہشات کی تکمیل میں بد سے بدتر فعل کرنے میں اس کو باک نہ ہوگا۔ اس کی نگاہ میں جرائم بس وہی ہوں گے جن کا نتیجہ کوئی دنیوی سزا یا کسی مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہو۔ اور اس کی نظر میں نیکیاں وہی ہوں گی جن کا نفع اور فائدہ اسے دنیا میں مل جائے۔ غرضکہ اس طرح اخلاقی تصورات بدل جائیں گے۔ اور اس کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہوگا۔ نیکی و بدی دنیوی فائدہ اور نقصان کی ہم معنیٰ و مترادف ہوگی۔ بنا بریں جھوٹ اگر دنیا میں نقصان کا موجب ہو تو گناہ اور اگر فائدہ کا ذریعہ بن جائے۔ تو عین صواب ہوگا۔ و علیٰ ہذا القیاس۔ ظاہر ہے کہ ایسے نظریات رکھنے والا خود غرض انسان ہرگز کسی مہذب انسانی سوسائٹی کیلئے مفید نہیں ہو سکتا لیکن ایسے اخلاقی معیار پر جو انسان اُبھرے گا وہ جانوروں سے بھی بدتر ہوگا۔ اور پوری طرح اولئک کالانعام بل ھم اضل کا مصداق ہوگا۔

ایک سوال اور اُس کا جواب

اس مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے بلکہ کہا بھی جاتا ہے کہ جو فوائد اعتقادِ آخرت سے حاصل ہوتے ہیں۔ دنیوی قانون اور حکومت کے زور سے بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حکومت کا اثر صرف انسان کے ظاہر پر ہوتا ہے۔ یعنی جہاں انسان کو خیال ہو کہ حکومت کا کوئی آدمی اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے۔ وہاں تو وہ ضرور جسمانی سزا کے ڈر سے حرکاتِ ناشائستہ سے اجتناب کرے گا۔ بلکہ خلوت وغیرہ میں جونہی اسے یہ خیال ہوگا کہ یہاں حکومت کا کوئی آدمی نہیں دیکھ رہا تو وہ سب کچھ کر گزرے گا جو آئینِ حکومت کے خلاف ہوگا اور یہی حشر قانون کا ہوگا۔ علاوہ بریں وہ جرم کرے گا اور دنیوی قانون کی زد سے بچنے کے لئے جھوٹی شہادتیں فراہم کرے گا۔ ناجائز اثر و رسوخ سے کام لے گا۔ رشوتیں دے کر گلو خلاصی کرائے گا۔ پولیس کی نگاہوں سے بچ کر شرارت کر گزرے گا۔ لیکن آخرت کا اعتقاد وہ چیز ہے جو انسانی قلب و ضمیر پر پہرہ بٹھا دیتا ہے۔ اس لئے خلوت و جلوت برابر ہوتی ہے

اس عقیدہ والا انسان یقین رکھتا ہے کہ نہ قدرت کی پولیس (کراماً کاتبین) کی نگاہ سے بچ سکتا ہے۔ اور نہ خدا کی عدالت کوئی دنیوی عدالت ہے کہ جھوٹی شہادتوں یا دیگر ناجائز ذرائع سے اس کی گرفت سے بچ جائے گا۔ بلکہ یہ ایسی پولیس ہے جو ہر حال میں اس کی نگرانی کر رہی ہے۔ اور یہ ایسی عدالت ہے جس کے گواہوں کی نظر سے وہ کسی طرح نکل نہیں سکتا اور نہ اس میں کوئی غلط حربہ کارآمد ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا و آخرت کے یقین و ایمان کا نور موجود ہو ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ بُرے اعمال کرنا تو بجائے خود بُرے خیالات کو بھی دل میں پیدا نہیں ہونے دیتے اور ان سے گھبراتے ہیں وہ اپنے آئینہ قلب کو خیالِ گناہ کے غبار سے بھی پاک و صاف رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ الغرض یہی یقین ہے جو آدمی کو وہاں بھی گناہ کرنے سے روکتا ہے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ اور دنیا کے کسی قانون کی پکڑ اور سزا کا خطرہ و اندیشہ نہ ہو اور یہ اعتقاد و ایمان انسان کے اندر ایک طاقتور ضمیر تشکیل کرتا ہے جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو نیکیوں کی طرف راغب اور برائیوں سے اجتناب پر آمادہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جگہ جگہ اسی عقیدہ کو مکارمِ اخلاق کی تعلیم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے واتقوا اللہ واعلموا انکم ملاقوہ (البقرہ) اللہ سے ڈرو اور یقین رکھو کہ تم کو اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ سخت سے سخت مشکلات کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کی قوت یہ کہہ کر پیدا کی جاتی ہے۔ نار جهنم اشد حرا (التوبہ) جہنم کی آگ دنیا کی حرارت سے زیادہ گرم ہے۔ صدقات و خیرات دینے پر یہ کہہ کر آمادہ کیا جاتا ہے۔ وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون (البقرہ) تم جو کچھ خیرات کرو گے اس کا تمہیں پورا پورا اجر و ثواب ملے گا اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ سودخواری کے دنیوی فائدوں سے یہ کہہ کر دستبرداری اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ (البقرہ) اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی بارگاہ میں لوٹ کر جاؤ گے۔ الی غیر ذالک من الآیات الکثیرۃ ہذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا۔

معادِ جسمانی و روحانی کا اثبات

جب بعونہ تعالیٰ ہم اپنے دو دعووں میں سے پہلے دعوے کے اثبات سے بطریقِ احسن فارغ ہو چکے ہیں تو اب دوسرے دعوی کو ثابت کرتے ہیں یعنی یہ کہ معاد جسمانی و روحانی طور پر ہو گی اس کے متعلق ذیل میں چند دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

اثباتِ معادِ جسمانی و روحانی پر پہلی اجمالی دلیل

سابقہ مباحث میں ہم موت کے بعد روح کی بقاء اور عالم برزخ میں اس کے منعم یا معذب ہونے کے متعلق جس قدر دلائل لکھ چکے ہیں وہ سب کے سب ہمارے اس دعوی کی پہلی دلیل قرار دئے جا سکتے ہیں اور ان سے صرف معاد جسمانی والے نظریہ کا بطلان بخوبی واضح و عیاں ہو جاتا ہے۔ اور یہاں جو دلائل قائم کئے جا رہے ہیں۔ ان سے صرف معاد روحانی والے قول کی نفی ہو جاتی ہے

دوسری اجمالی دلیل

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیک یا بد اعمال کے کرنے میں جسم و روح دونوں کا تعلق ہے۔ ان دونوں کے بغیر کوئی انسان دنیا میں کوئی اچھا یا بُرا کام انجام نہیں دے سکتا۔ لہٰذا عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جزا و سزا بھی دونوں کو ملنی چاہیے۔ اور یہ جبھی ممکن ہے کہ حشر و نشر بھی دونوں کا ہو۔ اسی کا نام معاد جسمانی و روحانی ہے۔

تیسری دلیل

جو فرقے حشر و نشر کے قائل ہیں وہ کم از کم اتنا ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ انسان محشور ہوگا اور ظاہر ہے کہ درحقیقت انسان جسم و روح دونوں کے مجموعہ کا نام ہے حقیقتاً نہ تنہا جسم انسان ہے اور نہ فقط روح جیسا کہ یہ امر سابقاً روح کی بحث میں محقق و مبرہن کیا جا چکا ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جب انسان محشور ہوگا تو لامحالہ جسم و روح دونوں ہی محشور ہوں گے۔ وھو الحق من ان یخفی۔ ارشادِ قدرت ہے کما بدأنا اول خلق نعیدہ (سورہ انبیاء پ ۱۷) جس طرح ہم نے پیدا کیا۔ اسی طرح دوبارہ اس کو لوٹا دیں گے۔

ظاہر ہے کہ دار دنیا میں نہ تنہا جسم آیا ہے اور نہ تنہا روح بلکہ دونوں اکٹھے آئے ہیں۔ لہٰذا معاد میں بھی دونوں اکٹھے ہوں گے۔

چوتھی دلیل

اگر یہ کہا جائے کہ معاد میں تنہا روح عود کرے گی۔ اس کے ساتھ جسم نہ ہوگا تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ بدن کیوں محشور نہ ہوگا۔ آیا اس لئے کہ حشر کنندہ اس سے عاجز و قاصر ہے؟ یا اس لئے کہ بدن حشر کے قابل نہیں ہے۔ جواب میں جو شق بھی اختیار کی جائے وہی باطل ہے کیونکہ خداوند عالم علیٰ کل شئی قدیر ہے جو پہلے انسان کو نیستی سے نکال کر عرصۂ ہستی میں لا سکتا ہے۔ وہ متفرق اجزا کو جمع کر کے دوبارہ زندہ بھی کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ کام زیادہ آسان ہے جیسا کہ خود ارشادِ قدرت ہے۔ وھو اھون علیہ۔ دوبارہ زندہ کرنا زیادہ آسان ہے۔ اور جو بدن پہلے باوجود عدم محض ہونے کے قابل ایجاد و ابداع تھا۔ وہ دوبارہ عود کرنے کے بطریق اولیٰ قابل ہوگا۔ قال من یحیی العظام و ھی رمیم قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ وھو بکل شئی علیم۔ لہٰذا جب بدن کا حشر ممکن ہے اور ضرورت کا تقاضا بھی ہے کہ وہ محشور ہو اور کوئی عقلی یا شرعی مانع بھی موجود نہیں ہے۔ (موانع مزعومہ کا ہم ذیل میں بطلان ظاہر کریں گے انشاء اللہ) تو پھر بدن کیوں محشور نہ ہوگا؟

معاد کے متعلق ایک عام استبعاد

بعض منکرین معاد تو وہ ہیں جو اپنے اس انکار پر سوائے استبعاد کے اور کوئی دلیل یا شبہ پیش نہیں کرتے۔ چنانچہ کفار کی یہی کیفیت قرآن میں نقل کی گئی ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ان کے قول کو نقل فرمایا ہے وقالوا ءاذا ضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید (سورہ السجدہ پ ۲۱ ع ۱۴) کہتے ہیں۔ آیا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو پھر ہم ایک خلق جدید دوبارہ زندہ ہونے سے دوچار ہوں گے؟

واذا متنا وکنا ترابا وعظاما ائنا لمدینون (سورۃ صافات پ ۲۳ ع ۱۱) آیا جب ہم مر جائیں گے اور گل سڑ کر مٹی اور بوسیدہ ہڈیوں کی شکل میں ہو جائیں گے تو ہمیں جزا یا سزا دی جائے گی (یہ کیسے ہو سکتا ہے) اسی طرح ایک اور مقام پر ان کا اس طرح قول نقل کیا گیا ہے۔ قال من یحیی العظام وھی رمیم۔ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ (یس)، اذا متنا وکنا ترابا ذلک رجع بعید (سورۃ ق) کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے) یہ اٹھنا تو بہت دور ہے۔

اس استبعاد کا جواب

ظاہر ہے کہ اس قسم کا استبعاد وہی شخص کر سکتا ہے جو خداوند عالم کو قادرِ مطلق نہیں سمجھتا۔ ورنہ جو شخص خالق کو قادرِ علی الاطلاق تسلیم کرتا ہے۔ وہ ہرگز ایسے رکیک استبعاد کی بنا پر انکارِ معاد نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایسے حضرات کو پہلے معرفت صانع عالم حاصل کرنا چاہیے۔ چنانچہ خداوند عالم نے اس قول کے قائلین کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ ضرب لنا مثلا ونسی خلقہ۔ یعنی جو یہ کہتے ہیں کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون پیدا کرے گا، وہ اپنی خلقت کو بھول چکے ہیں ورنہ اگر انہیں اپنی خلقت کا ماجرا یاد ہوتا تو یہ ہرگز استبعاد پیش کرکے انکارِ معاد کرنے کی جسارت نہ کرتے۔ قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ۔ اے رسولؐ! تم ان سے کہدو کہ ان ہڈیوں کو وہی (خدا) دوبارہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ کتمِ عدم سے نکال کر عرصۂ وجود میں داخل کیا تھا" اور اگر وہ اس پر یہ کہیں کہ کچھ اجزاء پریشان ہو گئے۔ بلکہ کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط ہو گئے۔ ان کو کس طرح اکٹھا کیا جائے گا۔ تو تم جواب میں کہدو وھو بکل شیٔ علیم (سورۃ یس)، خدا تعالےٰ اپنی تمام مخلوق کا کماحقہٗ علم رکھتا ہے۔ اسے ہر چیز کے اجزاءِ اصلیہ کا علم ہے۔ تمہیں اشتباہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اُسے اشتباہ نہیں ہوتا۔ اور اگر بایں ہمہ وہ یہ کہیں کہ یہ کام تو بڑا مشکل ہے تو ان سے کہدو اولیس الذی خلق السموات والارض بقادر علی ان یخلق مثلھم بلی وھو الخلاق العلیم۔ (یٰس) کہ تمہاری عقلوں پر کیوں پتھر پڑ گئے ہیں، بھلا وہ قادرِ مطلق جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان لوگوں کو دوبارہ پیدا کرے؟ ہاں وہ یقیناً اس پر قادر ہے اور وہ خلاق اور علیم ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے افعیینا بالخلق الاول بل ھم فی لبس من خلق جدید (سورۃ ق پ ۲۶ ع ۱۵) کیا ہم ایک مرتبہ پیدا کر کے تھک گئے ہیں؟ (اور دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے؟) دراصل بات یہ ہے کہ ان (کفار) کو نئی پیدائش میں شک ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جس ذات نے اس تمام کارخانۂ کائنات کو بلا کسی مثال کے نیستی سے ہست اور معدوم سے موجود کیا ہے۔ کیا وہ اسے معدوم کرنے کے بعد دوبارہ زندہ و موجود نہیں کر سکتا؟ جس نے نقشِ اول کھینچا تھا کیا وہ نقشِ ثانی کھینچنے پر قادر نہیں؟ مالکم کیف تحکمون۔

منکرین قیامت کے چند شبہات مع جوابات

بعض منکرین قیامت نے چند بودے شکوک و شبہات کی بنا پر اس کا انکار کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان کے

شبہات کو مع ان کے تحقیقی جوابات کے ذکر کرتے ہیں۔

پہلا شبہ اعادۂ معدوم محال ہے

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا جسم امتدادِ زمانہ سے بالکل گل سڑ کر معدوم اور ہیامیٹ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اسے دوبارہ کس طرح زندہ کیا جاسکتا ہے؟ بالفاظِ دیگر اعادۂ معدوم ناممکن ہے کوئی معدوم چیز موجود نہیں ہوسکتی یہ ہے وہ شبہ جسے مختلف الفاظ وعبارات کے ساتھ بہت کچھ بار و برگ دے کر شدومد کے ساتھ منکرین معاد پیش کیا کرتے ہیں۔ حکمائے اسلام اور علمائے اعلام نے اس شبہ کے کئی طرح جواب باصواب دئے ہیں۔ نیز قرآن مجید میں بھی اس شبہ کو کئی مقامات پر اجمالاً ذکر کرکے باطل کیا گیا ہے۔

اس شبہ کا پہلا جواب باصواب

کسی چیز کے معدوم ہونے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شئی بالکل فنا ہوجائے اور اس کے اجزاء بھی باقی نہ رہیں۔ دوسرے یہ کہ اس شئے کے اجزاء ترکیبیہ متفرق ہوجائیں اور اپنی اجتماعی ہیئت وصورت پر باقی نہ رہیں جیسے اگر کسی درخت کو کاٹ کر ریزہ ریزہ کردیا جائے۔ تو وہ درخت درخت نہ رہے گا اور اسے معدوم کہا جائے گا۔ لیکن اس کے اجزاء موجود ہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد یہ امر واضح ہوجانا چاہیے کہ اہلِ اسلام کے قول کے مطابق جو اعادۂ معدوم لازم آتا ہے۔ اور جس کے علماء محققین قائل ہیں۔ وہ معدوم اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے ہے۔ کیونکہ جو انسان قیامت کو محشور ہوں گے وہ اس سے قبل ہرگز معدوم محض نہیں ہوں گے بلکہ صرف ان کے اجزاء ترکیبیہ متفرق ہوگئے تھے کیونکہ مرنے کے بعد عناصر جسمیہ اپنے اپنے عنصر میں چلے جاتے ہیں۔ مٹی مٹی میں اور پانی پانی میں وعلیٰ ہذا القیاس۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ بالکل ہی نیست ونابود ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ان متفرق شدہ اجزاء کو جمع کرکے دوبارہ صورتِ انسانیہ دے کر ان میں روح داخل کرکے زندہ کردینا خلاقِ عالم کے لئے کوئی دشوار کام نہیں ہے۔ ایک انسان ایک مکان کو گرا کر اسی مٹی اور لکڑی وغیرہ سے دوبارہ ایسا ہی ایک مکان تعمیر کرلیتا ہے۔ ایسے ہی خداوند عالم انسانوں کو بروزِ قیامت زندہ کرے گا اور اس سے ہرگز کسی محال وناممکن امر کا ممکن ہونا لازم نہیں آتا بلکہ درحقیقت یہ کام خلقتِ اولیہ سے مدرجہا آسان ہے۔ کیونکہ خلقتِ اولیہ میں عدم محض سے چیز کو وجود میں لایا جاتا ہے اور اس خلقتِ ثانیہ میں فقط متفرق اجزاء کو جمع کردیا جائے گا۔ اسی لئے ارشادِ قدرت ہے **وھو الذی یبدء الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ** (سورۂ روم پ۲۱) خدا وہی ہے جس نے مخلوق کو پہلے پیدا کیا اور پھر وہی اس کو دوبارہ لوٹائے گا اور یہ دوبارہ لوٹانا اس کے لئے زیادہ آسان ہے لہٰذا مشکل کا اقرار اور آسان کا انکار کسی عقلمند آدمی کا طریقہ کار نہیں ہوسکتا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے **ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ**۔ تمہارا پیدا کرنا اور پھر مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا نہیں مگر مثل ایک نفس کے پیدا کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے کے؟ خداوند عالم نے منکرین قیامت کو عجیب انداز میں ان کی غلطی پر تنبیہ کی ہے۔ **ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب** (سورۂ حج پ ۱۷) اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے (تو ذرا غور کرو) ہم تم کو اسی مٹی سے پیدا کرچکے ہیں (تو کیا ہم تمہیں دوبارہ اس سے زندہ نہیں کرسکتے؟)

دوسرا جواب

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انسان مرنے کے بعد بالکل معدوم محض ہو جاتا ہے جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے۔ علامہ مجلسیؒ اور دیگر بعض علماء نے اس سلسلہ میں توقف فرمایا ہے کہ موت کے بعد فقط اجزاء متفرق ہو جاتے ہیں جنہیں بروز حشر جمع کر کے زندہ کیا جائے گا۔ یا اجسام بالکل معدوم محض ہو جاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ تسلیم کیا ہے۔ کہ اکثر متکلمین امامیہ پہلے قول کے قائل ہیں۔ اس سلسلہ میں اگرچہ اخبار و آثار بادی النظر میں بظاہر قدرے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک پہلا قول ہی زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ اسی لئے ہم نے اسے جواب اوّل میں اختیار کیا ہے۔ بہر حال اگر عدم محض والے قول کو بھی اختیار کیا جائے تب بھی جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ اس بنا پر معاد کا انکار کرنا قرین عقل نہیں ہے۔ کیونکہ جو خدائے قدیر پہلی مرتبہ عدم محض سے نکال کر خلعتِ وجود عطا کر سکتا ہے وہ لازماً اس بات پر بھی قادر ہے کہ انہیں معدوم کرنے کے بعد دوبارہ نعمتِ وجود سے مالا مال کر دے۔ قدرت نے اسی شبہ کا جواب اس طرح دیا ہے۔ یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ۔ یعنی وہی خدا دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا جب کہ وہ کچھ نہ تھے۔ اسی طرح وہ دوبارہ بھی اسی حالت سے زندہ کر سکتا ہے۔

ایک توہم کا ازالہ

بعض بال کی کھال اُتارنے والے متشککین نے جو یہ کہا ہے کہ اعادہ معدوم اس لئے ناممکن ہے کہ اس کے ساتھ اس کے زمان و مکان کا اعادہ بھی لازم ہے جس میں وہ موجود تھا اور یہ ناممکن ہے تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ امر اپنے مقام پر مبرہن ہو چکا ہے کہ زمان و مکان مشخصات وجود میں سے نہیں ہیں تا کہ اعادہ معدوم کے ساتھ ان کا اعادہ بھی ضروری ہو چنانچہ منقول ہے کہ شیخ بو علی سینا کا ایک شاگرد اس بات پر مصر تھا کہ زمان بھی مشخصات میں سے ہے۔ دوران بحث میں شیخ نے کہا کہ مجھے تمہارے اشکال کا جواب دینا لازم نہیں۔ کیونکہ اب (وقت گذرنے سے) میں وہ نہیں رہا جو تم سے بحث کر رہا تھا۔ اور نہ تم وہ ہو جو بحث کر رہے تھے۔ اس پر وہ شاگرد مبہوت ہو کر ساکت و صامت ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ زمان یا مکان کو کسی انسان کے مخصوص انسان ہونے میں کوئی دخل نہیں ہے ورنہ دنیا میں بھی لازم آئے گا کہ ایک انسان زمان و مکان کے بدلنے سے بدل جائے جو کہ بالبداہت باطل ہے۔

دوسرا شبہ آکل و ماکول

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ درندے یا پرندے انسان کو کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کو دوبارہ کس طرح زندہ کیا جا سکتا ہے؟ یہ اشکال اس وقت اور بھی قوی تر ہو جاتا ہے۔ جب کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو کھا جائے اور اس ماکول (کھائے ہوئے) انسان کے اجزاء آکل (کھانے والے) انسان کے اجزاء کے ساتھ مخلوط ہو جائیں۔ اب اگر یہ ماکول انسان دوبارہ زندہ ہو تو دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو آکل کے بدن کے ساتھ محشور ہو گا۔ اس صورت میں ماکول کے اجزاء باقی نہیں رہیں گے وہ کس طرح محشور ہو گا؟ یا یہ ماکول اپنے بدن میں محشور ہو گا۔ اس صورت میں آکل کے اجزاء نہ رہیں گے۔ لہٰذا وہ دوبارہ محشور نہیں ہو سکے گا۔ یہ شبہ آکل و ماکول کے نام سے مشہور ہے۔

اس شبہ کا پہلا مقنع جواب

اس شبہ کا بھی بچند وجہ جواب دیا جا سکتا ہے۔ پہلا اقناعی جواب وہی ہے جس کی طرف خداوند عالم نے قرآن مجید کے اندر اشارہ کیا ہے۔ وھو بکل خلق علیم۔ یعنی خدا اپنی ہر مخلوق کا کماحقہ علم رکھتا ہے۔ چونکہ اس شبہ کا دارومدار اجزاء کے باہم مخلوط و مشتبہ ہو جانے پر ہے کہ آکل و ماکول کے اجزاء باہم اس طرح مل جاتے ہیں کہ اب تمیز نہیں ہو سکتی کہ کون سے اجزا آکل کے ہیں اور کون سے ماکول کے ہیں تو خداوند عالم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تم خداوند عالم کا اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ اگر تمہیں آکل و ماکول کے اجزاء کا علم نہیں تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ خالق کو بھی اس امر کا علم نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو پھر تم میں اور خالق میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟ ایسا نہیں بلکہ اسے اپنی ہر ہر مخلوق کا پوری طرح علم ہے۔ لہٰذا وہ آکل و ماکول کے اجزاء کو پہچان کر علیحدہ علیحدہ کر کے ان کو دوبارہ محشور کر سکتا ہے اور ضرور ایسا کرے گا۔ اس جواب کی بقدر ضرورت توضیح یہ ہے کہ ہر انسان کے خواہ وہ آکل ہو یا ماکول دو قسم کے اجزا ہوتے ہیں: ایک اجزاء اصلیہ جو اس کے قوام وجود میں دخیل ہیں۔ اور ابتدائے عمر سے آخر عمر تک بہرحال برقرار رہتے ہیں اور دوسرے اجزاء فضلیہ زائدہ جو اس کے قوام وجود میں دخیل نہیں ہوتے جو صحت و مرض اور صغر و کبر وغیرہ اسباب کی وجہ سے گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں۔ لہٰذا جب کوئی درندہ یا پرندہ یا کوئی انسان کسی انسان یا حیوان کو کھا جائے تو ماکول کے اجزاء اصلیہ آکل کے اجزائے فضلیہ بن کر اس کے جسم سے خارج ہو جاتے ہیں اور آکل کے اجزاء اصلیہ بدستور باقی رہتے ہیں اور چونکہ خداوند عالم کو ہر شخص کے اجزاء اصلیہ و فضلیہ کا بخوبی علم ہے اس لئے وہ قیامت کو آکل و ماکول کے اجزاء اصلیہ کو جمع کر کے ان میں اس کی روح کو داخل کر کے اسے دوبارہ زندہ کر دے گا اور یہ امر اس کی قدرت کاملہ کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا وہ فعال لما یرید اور علی کل شئی قدیر کا مصداق ہے۔ اسی لئے وہ ارشاد فرماتا ہے ایحسب الانسان الن نجمع عظامہ بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ (سورۃ قیامت پ۲۹ ع۱) کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کے مرنے کے بعد پھر اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکتے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ ہم تو اس کے پوروں کو بھی (دوبارہ درست) کر سکتے ہیں۔

دوسرا جواب باصواب

یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کے امکان یا عدم امکان میں کلام ہو تو اس چیز کا واقع ہو جانا اس کے ممکن الوجود ہونے کی سب سے قوی دلیل ہوتی ہے۔ بنابریں ہم کہتے ہیں کہ منکرین معاد کا اس امر کو ناممکن سمجھنا غلط ہے۔ جب کہ ایسا امر پہلے وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ ارشاد قدرت ہے۔ او کالذی مر علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا قال انی یحیی ھذہ اللہ بعد موتھا فاماتہ اللہ مائۃ عام ثم بعثہ قال کم لبثت قال لبثت یوما او بعض یوم قال بل لبثت مائۃ عام فانظر الی طعامک و شرابک لم یتسنہ وانظر الی حمارک ولنجعلک آیۃ للناس وانظر الی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما فلما تبین لہ قال اعلم ان اللہ علی کل شئی قدیر (سورۃ البقرہ پ۳ ع۳)

(اے رسول!) تم نے، مثلاً اس (بندے کے حال) پر بھی نظر کی جو ایک گاؤں (کے پاس) سے ہو کر گذرا اور وہ ایسا اجڑا تھا کہ اپنی چھتوں پر ڈھے کے گر پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ (بندہ) کہنے لگا۔ اللہ اب اس گاؤں کو (ایسی) ویرانی کے بعد کیونکر آباد کرے گا۔ اس پر خدا نے اس کو (مار ڈالا) اور سو برس تک مردہ رکھا۔ پھر اس کو جلا اٹھایا (تب) پوچھا تم کتنی دیر پڑے رہے۔ عرض کی ایک دن پڑا رہا یا ایک دن سے بھی کم۔ فرمایا نہیں تم (اسی حالت میں) سو برس پڑے رہے۔ اب ذرا اپنے کھانے پینے (کی چیزوں) کو دیکھو کہ بسی تک نہیں۔ اور ذرا اپنے گدھے (سواری) کو تو دیکھو کہ اس کی ہڈیاں ڈھیر پڑی ہیں اور سب اس واسطے کیا ہے، تاکہ لوگوں کے لئے تمہیں قدرت کا نمونہ بنائیں اور (اچھا اب اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف نظر کرو کہ ہم کیونکر ان کو جوڑ جاڑ ڈھانچہ بناتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں پس جب ان پر یہ ظاہر ہوا تو بے ساختہ بول اٹھے کہ (اب) میں یہ یقین کامل جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے (ترجمہ فرمان)

ان آیات کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت ارمیاؑ (اور بروایتے حضرت عزیرؑ) نے ان ہلاک شدگان کو دریا کے کنارے اس حالت میں دیکھا تھا کہ ان میں سے بعض کو دریائی جانور کھا رہے تھے۔ اور بعض کو صحرائی جانور کھا رہے تھے۔ جب انہوں نے اپنے اس استبعاد کا اظہار کیا کہ خدا ان کو کیونکر دوبارہ زندہ کرے گا تو خدائے قادر نے خود ان کو سو برس تک مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے واضح کر دیا کہ خدائے بزرگ و برتر کے لئے ان کو دوبارہ زندہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ انہ علی کل شیٔ قدیر۔ (تفسیر صافی وغیرہ)

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے جب دریا کے کنارہ پر ایک مردار کو دیکھا کہ اسے بحری و بری حیوانات کھا رہے تھے اور پھر وہ حیوانات ایک دوسرے پر حملہ کر کے ایک دوسرے کو ہضم کر رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ شبہ آکل و ماکول کا مکمل سماں بندھا ہوا تھا۔ آں جناب نے ازراہ تعجب بارگاہ ایزدی میں استدعا کی۔ رب ارنی کیف تحی الموتی۔ بار الہا! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟ اس پر ارشاد قدرت ہوا۔ اولم تؤمن۔ اے ابراہیمؑ کیا تمہارا اس بات پر ایمان نہیں ہے؟ عرض کیا۔ بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی۔ ایمان تو ضرور ہے لیکن اطمینان قلب چاہتا ہوں ارشاد ہوا فخذ اربعۃ من الطیر فصرھن الیک ثم اجعل علی کل جبل منھن جزءا ثم ادعھن یاتینک سعیا واعلم ان اللہ عزیز حکیم (سورہ بقرہ پ ۳ ع ۴) (اچھا اگر یہ چاہتے ہو تو چار پرندے لو اور ان کو اپنے پاس منگا لو (اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو) پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو۔ اس کے بعد ان کو بلاؤ (پھر دیکھو تو کیونکر) وہ سب کے سب تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آتے ہیں (ترجمہ فرمانؒ)

چنانچہ روایتوں میں وارد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے چار پرندے یعنی مرغ، کبوتر، مور اور کوے کو پکڑا اور ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کا قیمہ کیا پھر اسے باہم مخلوط کر دیا۔ پھر ان مخلوط شدہ اجزا کو دس پہاڑوں پر تقسیم کر کے رکھ دیا اور ان کے سروں کو اپنے ہاتھ میں تھام رکھا۔ بعد ازاں جب ان کے نام لے کر ان کو پکارا تو وہ اجزاء جدا جدا ہو کر اپنے اپنے

سر کے ساتھ آکر پیوست ہو گئے اور دوبارہ وہ پرندے زندہ ہو گئے۔ اور جب ان کو چھوڑا تو وہ اڑ گئے (تفسیر عیاشی و برہان وغیرہ) سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے اس آیت مبارکہ کا یہ شانِ نزول جو کہ حضرت صادق آل محمد علیہ السلام سے مروی ہے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔ یظهر من هذا الخبر وغیرہ ان ابراهیم علیه السلام اراد بهذا ان یظهر للناس جواب شبهة تمسك بها الملاحدة المنكرون للمعاد۔ یعنی اس حدیث اور دیگر احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس سوال سے مقصد صرف ان ملحد و بے دین لوگوں کے شبہ (آکل و ماکول) کا جواب دینا مقصود تھا جو اس شبہ کی بنا پر قیامت کا انکار کرتے ہیں (بحار الانوار ج ۳) پس جب اسی دنیا میں ایسا ہو چکا ہے۔ اور قادر و قہار پروردگار نے اپنی قدرتِ کاملہ کا مظاہرہ دکھا دیا ہے تو بعد ازاں بھی اس شبہ میں کچھ وزن باقی رہ جاتا ہے؟ اور کوئی عاقل و منصف انسان اس شبہ کی وجہ سے قیامت کا انکار کر سکتا ہے؟۔

تیسرا جواب باصواب

آج کل علوم جدیدہ اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ ان کی روشنی میں ایسے شبہات کی ہرگز کوئی وقعت ہی نہیں رہی، آج سائنسدان ڈاکٹر کیمیاوی تحلیل سے پانی وہوا کے اجزاء کی مقدار بتا سکتے ہیں کہ اس میں آکسیجن کس قدر ہے اور ہائیڈروجن کی کتنی مقدار ہے۔ جب مخلوق ایسا باریک تجزیہ کر سکتی ہے تو کیا خالق ایسا تجزیہ نہیں کر سکتا کہ آکل و ماکول کے اجزاء اصلیہ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر سکے؟ وما قدروا الله حق قدره۔ ڈاکٹروں اور عالموں پر ہی کیا منحصر ہے۔ ایک ان پڑھ دیہات کے رہنے والی عورت کو خدا نے اس قدر عقل و شعور دیا ہے کہ وہ دودھ کو جمانے کے بعد اسے بلو کر اس سے گھی علیحدہ کر دیتی ہے اور لسی علیحدہ تو جب ایک جاہل عورت اپنی حکمت عملی سے لسی اور دودھ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ تو کیا خالق اپنی مخلوق کے اجزا کو ایک دوسرے سے تمیز دے کر علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتا؟ ایک معمولی عقل و خرد اور انصاف و ایمان رکھنے والا انسان تو اس میں شک و شبہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس پر یہ حقیقت مخفی و مستور رہ سکتی ہے۔ الاعلی اکمہ لا یبصر القمرا۔ یا ایها الانسان ما غرك بربك الكريم۔

فنائے عالم کبیر کا عقلی امکان علوم جدیدہ کی روشنی میں

جب سابقہ اوراق میں قیامت کی ضرورت اور معادِ جسمانی و روحانی کی حقانیت ثابت ہو چکی اور اس سلسلہ میں منکرین کی طرف سے جو بعض شکوک و شبہات پیش کئے جاتے تھے ان کا ازالہ بھی ہو چکا ہے تو اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم کبیر کے فنا ہونے پر بھی کچھ تبصرہ کر دیا جائے کیونکہ کچھ لوگ فنائے عالم کے منکر ہیں سو مخفی نہ رہے کہ افراد کی موت و حیات کا سلسلہ تو بالوجدان جاری و ساری ہے۔ کوئی مر رہا ہے اور کوئی پیدا ہو رہا ہے۔ اسی طرح صفحۂ ہستی پر قومیں بھی بنتی ہیں اور بگڑتی رہتی ہیں، آج ایک قوم نگار خانہ کائنات پر ابھرتی ہے اور کل حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہے یہ سلسلہ قدیم الایام سے تاحال برابر جاری ہے۔ لیکن اس سے کائنات کے عمومی نظام اور اس کی رونق پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

ہزاروں اٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی

قابل غور و تامل یہ امر ہے کہ آیا کوئی وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہ نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا اور بساطِ ہستی الٹ دی جائے گی۔ نظام شمسی ختم ہو جائے گا۔ زمین و آسمان پاش پاش ہو جائیں گے؟ اور ان کی جگہ نیا آسمان۔ نئی زمین اور نیا نظام ہوگا۔ جسے عرفِ شرع میں قیامت کبریٰ۔ یوم آخر۔ یوم عظیم۔ یوم البعث۔ یوم التلاق۔ یوم التغابن۔ یوم الحساب یوم الدین۔ یوم الحشر۔ یوم الفصل اور یوم الخروج وغیرہ اسماء سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کے ناموں کی کثرت سے ہی اس کی حقیقت کی فی الجملہ گرہ کشائی ہو جاتی ہے۔

عقلاء و فضلاء روزگار نے ان سوالات کا جواب اثبات میں دیا ہے اس کا بیان یہ ہے کہ جس طرح یہاں افراد کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی طرح ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جب پوری دنیا موت کی لپیٹ میں آجائے گی۔ اہل فلسفہ کا بڑا گروہ اس کے امکان پر یقین رکھتا ہے سائنسدان بھی اسے محال نہیں سمجھتے۔ طبعیات اور ہیئت جدیدہ کے ماہرین تو امکان سے آگے قدم بڑھا کر اس کے وقوع پذیر ہونے کا اقرار کر رہے ہیں اور اس عمومی ہلاکت کے طبعی اسباب تلاش کرنے میں مشغول ہیں۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ پورے عالم کی گاڑی جس انجن کے زور پر چل رہی ہے وہ گرمی آفتاب ہے۔ جس کی گرمی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ انجن بالکل سرد پڑ جائے گا جس سے گاڑی کا چلنا موقوف ہو جائے گا بلکہ ساری دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ سارا نظام عالم باہمی جذب و کشش کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ فضائے ہستی کے تمام سیارے روز بروز برابر کھینچتے چلے آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ ان کا موجودہ توازن برقرار نہیں رہے گا۔ اس وقت تمام کرات ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو جائیں گے۔ اور باہم متصادم ہو کر پاش پاش ہو جائیں گے۔

بعض کا خیال ہے کہ اس فضائے محیط میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں اب تک ان میں سے بہت کم کا ہمیں علم ہو سکا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی وقت ہماری یہ زمین کسی نئے سیارے سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی تمام آبادی چشم زدن میں ملیامیٹ ہو جائے۔ (سیرۃ النبی)

بہر حال اس کے طبعی اسباب کچھ بھی ہوں ہمارا مقصد صرف یہ بتلانا ہے کہ سائنسدان بھی فنائے عالم کو ممکن تسلیم کرتے ہیں بلکہ بعض تو اس کے وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں۔ لہٰذا جب ایسا ہونا عقلاً ممکن ہے اور مخبرین صادقین نے اس کے واقع ہونے کی خبر دی ہے تو پھر اسے تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہو سکتا ہے؟

بعد از فنائے عالم کبیر قیامت کا سماں روزِ حشر و نشر کی کیفیت

جو کچھ احادیثِ معتبرہ سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم جب دنیا کو ختم

کر کے قیامت قائم کرنا چاہے گا تو اسرافیل کو حکم دے گا کہ زمین پر جا کر صور پھونکیں۔ صور کل دو مرتبہ پھونکا جائے گا وہ صور بہت بڑا اور نورانی ہے جس کا ایک سر اور دو شاخیں ہیں، چنانچہ جناب اسرافیل زمین پر بمقام بیت المقدس قبلہ رو ہو کر صور پھونکیں گے۔ پس جب اس سرے سے آواز برآمد ہوگی جو زمین کی طرف ہے تو اہل زمین کی ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ اور جب اس طرف سے آواز نکلے گی جو آسمان کی طرف ہے تو آسمان والوں پر موت واقع ہو جائے گی۔ اس کے بعد اسرافیل کو ارشاد قدرت ہوگا کہ تو بھی مر جا، چنانچہ وہ بھی مر جائے گا۔ اب نفخ صور کے وقت نظام زمین و آسمان کی برہمی، نظام شمس و قمر کی ابتری، تمام عالم کے فنا ہو جانے کی جو تصویر قرآن مجید نے کھینچی ہے۔ اس سے بہتر اس حقیقت کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس سلسلہ کی چند آیات مبارکہ یہاں پیش کرتے ہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵ اذا وقعت الواقعۃ ۵ لیس لوقعتھا کاذبۃ ۵ خافضۃ رافعۃ ۵ اذا رجت الارض رجا ۵ وبست الجبال بسا فکانت ھباء منبثا ۵ (سورۃ الواقعہ پ ۲۷ ع ۱۴)

جب کہ قیامت واقع ہو جائے جس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں (وہ) پست کرنے والی (بھی) ہے اور بلند کرنے والی (بھی) جس وقت زمین ایسی ہلائی جائے گی جیسا کہ ہلائے جانے کا حق ہے۔ اور پہاڑ ایسے اکھاڑ دیئے جائیں گے جیسا کہ اکھاڑ دیئے جانے کا حق ہے۔ (۲) اذا زلزلت الارض زلزالھا ۵ واخرجت الارض اثقالھا وقال الانسان مالھا یومئذ تحدث اخبارھا (سورۃ الزلزال پ ۳۰ ع ۲۲) جب زمین بڑے زور سے ہلائی جائے اور زمین اپنے دفینے نکال دے۔ اور انسان یہ کہنے لگے کہ اسے ہو کیا گیا ہے؟ اس دن زمین اپنی خبریں بیان کر دے گی (۳) یوم تبدل الارض غیر الارض والسموات وبرزوا للہ الواحد القھار ۵ (سورۃ ابراہیم پ ۱۳ ع ۱۹) جس دن زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔ اور آسمان (دوسرے آسمانوں سے) اور سب زبردست و یکتا خدا کے حضور میں کھڑے ہوں گے (۴) یوم ترجف الارض والجبال وکانت الجبال کثیبا مھیلا ۵ (سورۃ المزمل پ ۲۹ ع ۳) (اُس دن کے لئے) جس دن زمین اور پہاڑ لرزنے لگیں اور پہاڑ ریت کے ٹیلے ہو جائیں (۵) اذا السماء انفطرت واذا الکواکب انتثرت واذا البحار فجرت واذا القبور بعثرت علمت نفس ما قدمت واخرت (سورۃ الانفطار پ ۳۰ ع ۷) جب کہ آسمان پھٹ جائیں گے اور جب کہ تارے گر کر تتر بتر ہو جائیں گے اور جب کہ دریا بہہ کر مل جائیں گے اور جب کہ قبریں الٹ پلٹ کر دی جائیں گی (اس وقت) ہر نفس جان لے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے اور پیچھے کیا چھوڑا ہے۔ اذا الشمس کورت و اذا النجوم انکدرت واذا الجبال سیرت (سورۃ التکویر پ ۳۰ ع ۶) جب کہ سورج کی روشنی لپیٹ دی جائے گی اور جب کہ تاروں کی روشنی جاتی رہے گی اور جب کہ پہاڑ چلائے جائیں گے۔ فاذا برق البصر وخسف القمر وجمع الشمس

والقمر (سورۃ القیامۃ پ ۲۹ ع ۱۷) (جب آنکھیں چندھیا جائیں گی اور چاند کو گہن لگ جائے گا اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے۔ القارعۃ ما القارعۃ وما ادراک ما القارعۃ یوم یکون الناس کالفراش المبثوث وتکون الجبال کالعھن المنفوش (سورۃ القارعۃ پ ۳۰ ع ۲۶) کھڑکھڑانے والا (واقعہ) کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والا (واقعہ)؟ اور تم کیا سمجھے کہ وہ کھڑکھڑانے والا (واقعہ) ہے کیا؟ وہ دن ہے جس دن آدمی ایسے ہو جائیں گے۔ جیسے پھیلے ہوئے پتنگے۔ اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے۔ جیسے دھنکی ہوئی اُون۔ اور یہ قیامت بالکل ناگہانی طور پر اچانک واقع ہو گی۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ لاتاتیکم الا بغتۃ (سورۃ الاعراف پ ۹ ع ۱۳) یعنی قیامت اچانک آجائے گی۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت رسول خدا سے مروی ہے فرمایا قیامت اس طرح اچانک آجائے گی کہ کوئی شخص اپنے حوض کی اصلاح کر رہا ہو گا اور کوئی اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہا ہو گا۔ اور کوئی اپنی پونجی بازار میں درست کر رہا ہو گا اور کوئی ترازو کو اونچا نیچا کر رہا ہو گا (تفسیر صافی وغیرہ) اس وقت ارشاد قدرت ہو گا لمن الملک الیوم۔ آج کس کی بادشاہت ہے؟ کوئی جواب دینے والا نہ ہو گا خود ہی ارشاد فرمائے گا للہ الواحد القھار۔ آج قہار وجبار خدا کی سلطنت ہے (نہج البلاغہ) اب جب تک خداوند عالم چاہے گا یہی کیفیت رہے گی۔ اور ہر چیز نیستی کے عالم میں پڑی رہے گی۔ اور جب مشیت ایزدی دوبارہ زندہ کرنے کے متعلق ہو گی تو چالیس دن تک باران رحمت کا نزول ہو گا جس سے مردوں کے متفرق اجزاء جمع ہوں گے۔ اور اب قدرت کاملہ سے صور میں دوبارہ آواز پیدا ہو گی جب اس سرے سے آواز نکلے گی جو آسمان کی طرف ہے تو آسمان والی مخلوق زندہ ہو جائے گی۔ اور جب اس طرف سے آواز بلند ہو گی جو زمین کی طرف ہے تو زمین والی مخلوق زندہ ہو جائے گی۔ آیت مبارکہ وان الساعۃ اٰتیۃ لاریب فیھا وان اللہ یبعث من فی القبور کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب جبریل سے فرمایا کہ مجھے دکھاؤ خداوند عالم بروز قیامت بندوں کو کس طرح اٹھائے گا (مقصد دوسرے لوگوں کو یہ منظر دکھلانا تھا) جبریل مقبرۂ بنی ساعدہ میں گئے اور ایک قبر کے پاس پہنچ کر کہا خدا کے حکم سے اٹھو چنانچہ ایک شخص سر سے مٹی جھاڑتا ہوا نکلا۔ جو ہائے افسوس ہائے ہلاکت کہہ رہا تھا۔ جناب جبریل نے اسے کہا پھر قبر میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے بعد ایک اور قبر کے پاس پہنچے اور فرمایا خدا کے اذن سے نکلو اس سے ایک نوجوان سر سے مٹی جھاڑتا ہوا باہر نکلا۔ جو یہ کلمات پڑھ رہا تھا۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ واشھد ان الساعۃ اٰتیۃ لاریب فیھا وان اللہ یبعث من فی القبور۔ جبریل نے کہا قیامت کے دن اسی طرح لوگ اٹھائے جائیں گے (تفسیر صافی بحوالہ قرب الاسناد حمیری)۔

یخرجون من الاجداث کانھم جراد منتشر (سورۃ القمر پ ۲۷ ع ۸) لوگ قبروں سے مٹی جھاڑتے

ہو سے یوں نکل پڑیں گے جیسے ٹڈی دل لشکر پھیلا ہوا ہو۔ ان زلزلة الساعة شئی عظیم یوم ترونها تذهل کل مرضعة عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملها وتری الناس سکٰری وما هم بسکٰری ولکن عذاب الله شدید (سورۃ الحج پ ۱۷ ع ۸) بے شک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے۔ جس دن تم اس (قیامت) کو دیکھو گے، ہر دودھ پلانے والی اُس سے غافل ہو جائے گی۔ جسے وہ دودھ پلایا کرتی تھی۔ اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تم لوگوں کو نشہ کی سی حالت میں دیکھو گے۔ حالانکہ وہ متوالے نہ ہوں گے بلکہ خدا کا عذاب ہی سخت ہوگا۔ وجاءت کل نفس معها سائق وشهید (سورہ ق پ ۲۶ ع ۱۶) اور ہر نفس اس شان سے آئے گا کہ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ اس کے ساتھ ساتھ آئے گا (مقبول ترجمہ) تلك من انباء الغیب نوحیها الیك۔

تفاصیل قیامت پر اجمالی ایمان رکھنا چاہیے

باقی رہ گئیں قیامت کی تفاصیل کہ مردے کس حال میں محشور ہوں گے؟ کس شکل و صورت میں عرصۂ محشر میں آئیں گے وہاں کن کن مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کتنا طویل عرصہ وہاں ٹھہرنا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

علماء اعلام نے ان امور پر اجمالی ایمان و ایقان رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں اقول الاحوط والاولی التصدیق بما تواتر فی النصوص وعلم ضرورۃ من ثبوت الحشر الجسمانی وسائر ما ورد فیها من خصوصیاته وعدم الخوض فی امثال ذلك اذ لم نکلف بذلك وربما ادی التفکر فیها الی القول بشئی لم یطابق الواقع ولم نکن معذورین فی ذلك والله الموفق للحق والسداد فی المبدأ والمعاد (بحار ج ۳) میں کہتا ہوں۔ احوط و اولیٰ یہ ہے کہ یہ جو کچھ بالتواتر و بالضرورت، حشر جسمانی اور اس کی دیگر بعض خصوصیات ثابت ہیں ان پر ایمان لایا جائے اور دوسری عام باریکیوں میں زیادہ غور و خوض نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس امر کی ہمیں تکلیف ہی نہیں دی گئی اور بسا اوقات ان امور میں غور و خوض کرنا بعض ایسے نظریات تک پہنچا دیتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتے۔ اور ہم اس غلطی میں شرعاً معذور بھی نہ ہوں گے۔ خدا ہی آغاز و انجام میں حق و راستی کی توفیق دینے والا ہے۔

آخرت کی تفصیلات میں شبہ محض عقل و علم کی نارسائی کی وجہ سے ہوتا ہے

اس بحث کے اختتام پر اس امر کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ چونکہ عالم آخرت کی چیزیں نہ ہماری دیکھی بھالی ہوئی ہیں۔ اور نہ ہی تجربہ و مشاہدہ میں آئی ہیں اس لئے وہ ہمیں اچنبھے کی سی معلوم ہوتی ہیں اور بعض لوگوں کے لئے ان کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ کسی بچہ سے جو ابھی ماں کے پیٹ سے باہر نہ آیا ہو کسی آلہ کے ذریعہ یہ کہا جائے کہ اے بچے تو عنقریب ایک ایسی دنیا میں آنے والا ہے جہاں لاکھوں میل کی زمین ہے

باب الاعتقاد فی الحوض

بیسواں باب (حوض کوثر کے متعلق اعتقاد)

قال ابوجعفر اعتقادنا فی الحوض

حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ حوض کوثر کے

اور اس سے بھی بڑے بڑے سمندر ہیں۔ آسمان ہے، چاند، سورج اور لاکھوں ستارے ہیں اور وہاں ہوائی جہاز اڑتے ہیں۔ ریلیں دوڑتی ہیں۔ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ توپیں گرجتی ہیں۔ ایٹم بم چلتے ہیں وہ اگر بالفرض ان باتوں کو سن لے اور کچھ بھی لے تو اس کے لئے ان باتوں پر یقین کرنا بہت مشکل ہوگا۔ کیونکہ وہ اس وقت جس دنیا میں ہے جسے وہ دیکھتا اور جانتا ہے وہ تو اس کی ماں کی بالشت بھر پیٹ کی دنیا ہے۔ بالکل ایسا ہی معاملہ آخرت کے بارے میں اس دنیا کے رہنے والے انسانوں کا ہے۔ کیونکہ عالم آخرت اس دنیا کے مقابلہ میں اسی طرح بے حد وسیع و عریض اور بے انتہا ترقی یافتہ ہے۔ جس طرح ماں کے پیٹ کے مقابلہ میں ہماری یہ دنیا اور زمین و آسمان بے حد وسیع اور ترقی یافتہ ہیں اور جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آنے کے بعد وہ سب کچھ دیکھ کر تسلیم کر لیتا ہے جس کو ماں کے پیٹ کے زمانہ میں سمجھنا اس کے لئے مشکل تھا۔ اسی طرح عالم آخرت میں پہنچنے کے بعد انسان وہ سب کچھ دیکھ لیں گے جو ہادیان دین نے وہاں کے متعلق بتایا ہے۔ یہ بالکل عقلی و فطری بات ہے کہ جس چیز کو ہم نہیں جانتے اور جسے ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اس کے متعلق ان صادق القول بزرگواروں کے بیان پر اعتماد کرنا چاہیے۔ جن کی صداقت و پاکبازی دلائل و معجزات سے ثابت ہو چکی ہے اور ان کا یہ بیان وحی و الہام پر مبنی ہے۔ اسی لئے تو قیامت کا نام اصول دین میں سب کے آخر میں آتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب خدا کو خدا، رسول کو رسول اور امام کو امام تسلیم کر لیا جائے تو اس وقت ان کی فرمائشات کے سامنے سر تسلیم خم کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا۔

بیسواں باب (حوض کوثر کا بیان)

حوض کوثر پر ایمان و ایقان رکھنے کی اہمیت کا بیان

حوض کوثر کے متعلق احادیث کثیرہ و مستفیضہ وارد ہوئی ہیں۔ صاحب حق الیقین نے وسیلہ لوار الممہ، حوض کوثر اور شفاعت والی احادیث کو متواتر قرار دیا ہے۔ حوض پر ایمان و اعتقاد رکھنے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی حدیث کافی ہے جسے مصنف علام نے اپنی کتاب امالی اور عیون اخبار الرضا میں جناب رضا علیہ السلام سے اور انہوں نے اپنے آباء و اجداد طاہرین کے سلسلہ سند سے جناب رسول خدا سے روایت کیا ہے۔ فرمایا من لم یومن بحوضی فلا اوردہ اللہ حوضی ومن لم یومن بشفاعتی فلا انالہ اللہ شفاعتی۔ جو شخص میرے حوض پر ایمان نہ رکھے خدا اسے میرے حوض پر وارد نہ کرے

اور جو شخص میری شفاعت پر ایمان نہ رکھے خدا اُسے میری شفاعت نصیب نہ کرے ۔

سورۂ مبارکہ الکوثر میں جو لفظ کوثر وارد ہے انا اعطینٰک الکوثر ۔ اے رسول ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا ہے ۔ اس کی تفسیر میں متعدد ایسی روایتیں موجود ہیں جن میں کوثر کی تفسیر حوضِ کوثر سے کی گئی ہے ۔ ہاں بعض روایتوں میں اس کی تفسیر کثرتِ اولاد سے بھی کی گئی ہے چونکہ کفار آں حضرتؐ کو ابتر (نسل بریدہ) کہتے تھے ۔ خداوند عالم نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہم نے تمہیں اولادِ کثیر عطا کی ہے ۔ ابن عباس سے اس کی تفسیر خیر کثیر کے ساتھ کی گئی ہے اور بعض مفسرین نے نبوت اور بعض نے قرآن اور بعض نے شفاعت سے بھی اس کی تفسیر کی ہے ۔

فی الحقیقت ان تمام تفاسیر میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہے ۔ چنانچہ علامہ طبرسی نے اپنی تفسیر مجمع البیان ج ۲ بذیل تفسیر کوثر یہ سب مختلف تفسیریں لکھنے کے بعد لکھا ہے واللفظ محتمل للکل فیجب ان یحمل علی جمیع ما ذکر من الاقوال فقد اعطاہ اللہ سبحانہ الخیر الکثیر و وعدہ الخیر الکثیر فی الاخرۃ و جمیع ھذہ الاقوال تفصیل الجملۃ التی ھی الخیر الکثیر فی الدارین ۔ یعنی لفظ "کوثر" ان سب معانی کا متحمل ہے لہٰذا واجب ہے کہ اسے ان تمام معانی پر حمل کیا جائے ۔ چنانچہ خداوند عالم نے آں حضرتؐ کو دنیا میں خیر کثیر عطا فرمایا اور آخرت میں بھی خیر کثیر عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے اور درحقیقت یہ سب اقوال خیر کثیر فی الدارین والے جملہ کی تفصیل ہیں ۔

حوض کوثر کی کیفیت کا بیان

حوض کوثر کی کیفیت کیا ہے ؟ اس کے متعلق کتب فریقین میں بکثرت روایتیں موجود ہیں اور اس کی جو کیفیت مصنف علام علیہ الرحمۃ والرضوان نے بیان کی ہے یہ معمولی اختلاف الفاظ و عبارات کے ساتھ تفسیر قمی ، بشارۃ المصطفےٰ میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مصنف کی امالی میں ابن عباس سے ، مناقب شہر ابن آشوب میں بحوالہ حلیۃ الاولیاء حافظ ابو نعیم اصفہانی انس بن مالک سے اور کامل الزیارۃ میں بروایت مسمع جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے ۔ اسی سلسلہ میں کتاب مجالس شیخ مفید علیہ الرحمۃ اور بشارۃ المصطفےٰ میں ابن عباس سے روایت ہے کہ جب سورۂ انا اعطینک الکوثر نازل ہوئی ۔ تو جناب امیر المومنین علیہ السلام نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اس نہر کی کچھ وصف تو بیان فرمائیں ؟ آں جنابؐ نے فرمایا ۔ یا علیؑ ۔ کوثر ایک نہر ہے ، جو عرش اعظم کے نیچے جاری ہے ۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ، شہد سے زیادہ میٹھا اور گھی سے زیادہ نرم ہے ۔ ان کے کنکر زبرجد یاقوت اور مرجان ہیں ۔ اس کا گھاس زعفران اور مٹی مشک اذفر ہے ۔ یہ فرما کر آنجنابؐ نے اپنا دستِ مبارک جناب امیر المومنین علیہ السلام کے پہلو پر رکھا اور فرمایا یا علیؑ ! یہ نہر میرے اور تمہارے اور تمہارے محبوں کے لئے ہے ۔ جعلنا اللہ من محبیھم و شیعتھم و حشرنا فی زمرتھم بجاھھم صلوات اللہ علیھم ۔

ایلة وصنعا وھو للنبیؐ وان فیه
من الاباریق عدد نجوم السماءؔ
وان الساقی علیه یوم القیمة

ایلہ (جو کہ ینبوع اور مصر کے درمیان ایک شہر ہے) اور صنعا (جو کہ یمن کا ایک شہر ہے) کے درمیانی فاصلہ کے برابر ہے۔ یہ حوض خاص سرورکائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ اور

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ساقئ کوثر ہونے کا اثبات

جناب مصنف علام نے جو یہ فرمایا ہے کہ حوض کوثر سے پلانے والے جناب امیر المومنین علیہ السلام ہوں گے یہ امر کتب فریقین کی بکثرت روایات سے ثابت ہے۔ چنانچہ امالی شیخ صدوق علیہ الرحمۃ میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا یا علی انت اخی ووزیری وصاحب لوائی فی الدنیا والاخرة وانت صاحب حوضی ومن احبك احبنی ومن ابغضك ابغضنی۔ یا علیؑ! تم میرے بھائی۔ وزیر اور دنیا وآخرت میں میرے جھنڈے کے حامل ہو (دنیا میں آپ کا حامل علم جنگ ہونا تو واضح ہے اور آخرت میں حامل علم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کو آں حضرتؐ کا لواء الحمد جو اتنا بڑا وسیع ہے کہ بروز قیامت تمام انبیاء ومرسلین اور ان کے اوصیاء اور کامل مومنین اسی کے زیر سایہ ہوں گے اس کے علاوہ محشر میں اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ جناب امیر علیہ السلام کے ہاتھوں میں ہوگا۔ جناب امیرؑ کی یہ فضیلت بھی کتب فریقین میں ہے ملاحظہ ہو مناقب شہر بن آشوب۔ ینابیع المودۃ۔ ارجح المطالب وغیرہ) اور تم ہی میرے حوض کے ساقی ہو۔ نیز اسی کتاب میں آں حضرتؐ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے فرمایا۔ من اراد ان یتخلص من ھول القیامة فلیتول ولی ولیتبع وصی وخلیفتی من بعدی علی بن ابی طالب فانه صاحب حوضی یذود عنه اعدائه ویسقی اولیائه فمن لم یسق منه لم یزل عطشانا ولم یروابدًا ومن سقی منه شربة لم یشق ولم یظما ابداؔ۔ جو شخص قیامت کے ہولناک حالات سے نجات چاہتا ہے اسے چاہیے کہ میرے ولی سے دوستی رکھے اور میرے وصی وخلیفہ جناب علی بن ابی طالب کی اتباع وپیروی کرے کیونکہ یہی میرے حوض کے ساقی ہیں وہ اس سے اپنے دشمنوں کو دور ہٹائیں گے اور اپنے دوستوں کو اس سے سیراب کریں گے جو شخص اس سے نہیں پی سکے گا وہ ہمیشہ ہی پیاسا رہے گا اور کبھی سیراب نہیں ہوگا اور جو شخص اس سے ایک مرتبہ پی لے گا وہ نہ تکلیف اٹھائے گا اور نہ ہی پھر اسے پیاس لگے گی۔ کتاب خصال شیخ صدوق علیہ الرحمۃ میں جناب امیر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ انا مع رسول اللہ ومعی عترتی علی الحوض فمن ارادنا فلیاخذ بقولنا ولیعمل بعملنا فان لکل اهل بیت نجیب ولنا شفاعة ولاهل مودتنا شفاعة فتنافسوا فی لقائنا علی الحوض فانا نذود عنه اعدائنا ونسقی منه احبائنا واولیائنا ومن شرب منه شربة لم

"تمہارا دوست میرا دوست اور تمہارا دشمن میرا دشمن ہے"

امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ یسقی منہ اولیائہ ویذود عنہ اعدائہ ومن شرب عنہ شربۃً لم یظمأ بعدہا ابداً

اس پر آسمانی ستاروں کے برابر کوزے رکھے ہوئے ہیں بروز قیامت حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اس کے ساقی ہوں گے۔ آں جناب اپنے شیعوں اور دوستوں کو اس سے سیراب کریں گے اور اپنے دشمنوں کو اس سے دور ہٹائیں گے جو شخص اس کے پانی کا ایک گھونٹ بھی پی لے گا اسے کبھی پیاس نہ لگے گی

یظما بعدھا ابداً الحدیث۔ میں حوض کوثر پر رسولؐ خدا کے ساتھ ہوں گا اور میری عترت بھی وہاں میرے ساتھ ہو گی۔ پس جو شخص ہماری ملاقات کا خواہشمند ہے۔ اسے چاہیے کہ ہمارے قول و فعل پر عمل کرے کیونکہ ہر گھر سے کچھ نجیب و شریف ہوتے ہیں ار جو ہماری کامل اتباع کرے گا وہ نجیب متصور ہوگا، ہمارے لئے اور ہمارے محبوں کے لئے شفاعت ثابت ہے۔ پس حوض پر ہم سے ملاقات کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ ہم وہاں سے اپنے دشمنوں کو دور ہٹائیں گے اور اپنے محبوں کو سیراب کریں گے جو شخص اس کا ایک گھونٹ پی لے گا اسے کبھی پیاس نہ لگے گی۔

ایسی احادیث سے ہماری کتب حدیث مملو و مشحون ہیں۔ نیز برادران اسلامی کی کتب میں بھی بکثرت ایسی روایات موجود ہیں۔ جن سے جناب امیر علیہ السلام کا ساقی کوثر ہونا ثابت ہوتا ہے اس سلسلہ میں کتاب ارجح المطالب۔ ینابیع المودۃ مطالب السئول اور ارشاد القلوب دیلمی وغیرہ کتب قابل ملاحظہ ہیں۔ آں جناب کی یہ صفت اس قدر مسلّم ہے کہ آپ کا لقب ہی "ساقی کوثر" مشہور ہوگیا ہے اور شعراء نے بھی جا بجا آپ کے حق میں اس لقب کو استعمال کیا ہے۔ اگر خوفِ طوالت دامن گیر نہ ہوتا تو ہم یہاں مختلف شعراءِ کرام کا کچھ کلام بطورِ نمونہ پیش کرتے۔

حوض کوثر سے بعض اصحاب کے دور ہٹائے جانے کا بیان

مصنف علام نے اس مبحث کے آخر میں جو روایت نقل فرمائی ہے کہ بروز قیامت جناب شفیع امم علیہ وعلیٰ آلہ افضل السلام اپنے بعض صحابہ کو حوض کوثر سے دور ہٹائیں گے۔ اس قسم کی روایتیں کتب اہل سنت بالخصوص صحاح ستہ میں بھی بکثرت موجود ہیں، چنانچہ صحیح مسلم میں ج ۲ ص ۲۴۹ مطبوعہ دہلی نیز بخاری ج ۲ ص ۹۷۴ مطبوعہ مجتبائی دہلی کتاب الفتن میں بروایت ابی حازم مروی ہے وہ سہل بن سعد سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے سمعت النبی یقول انا فرطکم علی الحوض من ورد شرب منہ ومن شرب منہ لم یظمأ ابداً ولیردن علی اقوام اعرفھم ویعرفونی ثم یحال بینی وبینھم۔۔۔ اللھم منی یقال انک لا تدری ما بدلوا (احدثوا) بعدک فاقول سحقاً سحقاً لمن بدل بعدی۔ یعنی میں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا وہ فرما رہے

وقال النبی لیختلجن قوم من اصحابی دونی وانا علی الحوض فیوخذ بھم ذات الشمال فانادی یا ربی اصحابی اصحابی فیقال انک لا تدری ما احدثوا بعدک ۔

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں میرے صحابہ کی ایک جماعت کو میرے سامنے گرفتار کر کے بائیں طرف لے جایا جائے گا جبکہ میں حوض کوثر پر موجود ہونگا وہ شدت پیاس کی وجہ سے میرے پاس آنے کیلئے کوشاں ہوں گے اس وقت میں اپنے پروردگار کو آواز دوں گا خداوند! یہ تو میرے صحابی ہیں، مجھے جواب دیا جائے گا کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا احداث و بدعات پھیلائے تھے

تھے۔ میں تم سے پہلے حوض کوثر پر موجود ہوں گا۔ جو شخص وہاں پہنچے گا وہ اس سے پیئے گا۔ اور جو پیئے گا پھر وہ ہرگز پیاسا نہ ہوگا۔ اس اثنا میں حوض پر کچھ لوگ وارد ہوں گے جنہیں میں پہچانتا ہوں گا۔ اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے۔ پھر یکایک ان کے اور میرے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا (الی ان قال)، اس وقت میں کہوں گا کہ یہ تو میری جماعت سے تھے؟ جواب میں کہا جائے گا کہ تمہیں پتہ نہیں کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا عمل کئے؟ تب میں کہوں گا دوری اور ہلاکت ہو اس شخص کے لئے جس نے میرے بعد میرے دین میں تغیر و تبدل کیا؟ اس مضمون کی بخاری و مسلم میں کئی روایتیں موجود ہیں۔ بعض میں یہ الفاظ موجود ہیں جب انہیں دور ہٹایا جائے گا تو میں کہوں گا یا رب اصحابی اصحابی یا اللہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ فیقال لا تدری ما احدثوا بعدک ص ۹۷۵ بخاری ج ۲ مطبوعہ دہلی۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا احداث و بدعات پھیلائے"

اسی طرح مسلم مع شرح نووی ج ۲ ص ۲۴۹ و بخاری ج ۲ ص ۹۷۵ پر آں حضرت نے اس واقعہ کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا ہے۔ انی علی الحوض حتی انظر من یرد علی منکم و سیوخذ اناس من دونی فاقول یا رب منی ومن امتی فیقال اما شعرت ما عملوا بعدک واللہ ما برحوا بعدک یرجعون علی اعقابھم۔ یعنی میں حوض کوثر پر موجود ہوں گا تاکہ دیکھوں کہ تم میں سے کون لوگ میرے پاس پہنچتے ہیں اس اثنا میں میرے سامنے سے کچھ لوگوں کو پکڑ لیا جائے گا میں کہوں گا یا اللہ یہ تو میرے آدمی ہیں جواب میں کہا جائے گا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا عمل کئے؟ بخدا آپ کے بعد یہ اپنے پچھلے پاؤں پلٹ گئے تھے بخاری کے اسی صفحہ پر ایک حدیث کا تتمہ ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے انہم ارتدوا بعدک علی ادبارھم القھقری۔ کہ یہ لوگ تمہارے بعد بالکل مرتد ہو گئے تھے۔

نووی نے شرح مسلم ج ۲ ص ۲۴۹ طبع دہلی میں کہا ہے۔ قال القاضی عیاض احادیث الحوض صحیحۃ والایمان بہ فرض والتصدیق بہ من الدین وہو علی ظاہرہ عند اہل

السنۃ والجماعت بلا تاویل ولا یختلف فیہ وقال القاضی حدیثہ متواتر النقل رواہ خلائق من الصحابۃ۔ خلاصہ یہ کہ احادیث حوض صحیح اور متواتر ہیں۔ انہیں بہت سے صحابہ نے نقل کیا ہے۔ لہذا ان پر بلا تاویل ایمان لانا فرض ہے۔

لمحہ فکریہ :- ان احادیث سے برادران اسلامی کے بہت سے مزعومہ مسلمات کے قصر مسمار ہو کر رہ جاتے ہیں اور کئی ایک جعلی احادیث سے دجل و فریب اور صنع و جعل کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ جیسے اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ اور الصحابۃ کلھم عدول وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ بنصِ رسولؐ جب کئی صحابہ یقیناً جہنمی ہیں تو پھر یہ عمومی نظریہ کہ سب صحابہ عادل ہیں اور سب کی اتباع موجبِ دخولِ جنت اور باعثِ رشد و ہدایت ہے۔ کسی طرح بھی درست اور قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جو خود جہنمی اور راہ گم کردہ ہو۔ وہ دوسروں کو کس طرح راہِ راست کی ہدایت کر کے جنت میں پہنچا سکتا ہے۔ ع

آں خویشتن گم است کرا رہبری کند؟

ان اصحاب کی مزید نشاندہی

اگرچہ ان احادیث میں ان جہنمیوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ یہ وہی اصحاب ہوں گے۔ جنہوں نے آں حضرتؐ کے بعد دین اسلام میں اپنی رائے و قیاس سے تغیر و تبدل کئے ہوں گے۔ لہذا طالبانِ تحقیق حق آئینہ سیر و تواریخ میں بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ صحابۂ رسولؐ میں سے ایسے لوگ کون تھے۔ جنہوں نے اپنے اجتہادات سے دین میں بدعات و احداث پھیلائے؟ اس سلسلہ میں تاریخ الخلفاء سیوطی کے باب اولیات فلاں و فلاں اور الفاروق شبلی وغیرہ کتب سے کافی مدد مل سکتی ہے تاہم مزید وضاحت کے لئے ہم ایک دو روائتیں بھی ان کی تشخیص کے لئے پیش کئے دیتے ہیں۔ جن سے معلوم ہو گا کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے رسولؐ کے بعد ثقلین یعنی قرآن و عترت کے ساتھ برا سلوک کیا تھا اور ان کی حرمت و عزت کا کچھ بھی پاس و لحاظ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ حق الیقین علامہ شبرؒ میں بروایت حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ ایک طویل حدیث مذکور ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ آں حضرتؐ کی خدمت میں حوضِ کوثر پر مختلف لوگ وارد ہوں گے اور آپ ان سے برابر یہی سوال کریں گے کہ تم نے میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ مختلف حضرات جو مختلف جواب دیں گے وہ یہ ہوں گے۔ کذبنا الاکبر و مزقناہ واضطہدنا الاصغر وابتززناہ فقد کذبنا الاکبر و مزقناہ وقاتلنا الاصغر وقتلناہ۔ کذبنا الاکبر وعصیناہ و خذلنا الاصغر و خذلناہ۔ ہم نے ثقل اکبر کو جھٹلایا۔ اور اس کے ٹکڑے کئے اور اس کی نافرمانی کی اور ثقل اصغر کو کمزور کیا۔ اس کے حق کو غصب کیا۔ اس سے جنگ کی اور اسے قتل کیا۔ بحکمِ رسولؐ ہو گا۔ ان سب گروہوں کو جہنم میں جھونک دو۔ پھر شیعیانِ علیؑ کا ورود ہو گا۔ ان سے بھی سوال کیا جائے گا وہ جواب میں عرض کریں گے۔ اتبعنا الاکبر و صدقناہ ووازرنا

باب الاعتقاد فی الشفاعة

قال الشیخ ابو جعفر اعتقادنا فی الشفاعة انہ لمن ارتضی

اکیسواں باب (شفاعت کے بارے میں اعتقاد)

جناب شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ شفاعت کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ (وہ برحق ہے) اور ہوگی صرف ان لوگوں کی جن کے

الاصغر ونصرناہ وقتلنا معہ۔ ہم نے ثقل اکبر کی اتباع اور اس کی تصدیق کی اور ثقل اصغر کی نصرت و اعانت کی اور اس کی حمایت میں جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ ارشاد ہوگا۔ سیر ہو کر کوثر پیو۔ اس وقت ان کے امام (علی علیہ السلام) کا نور شمس طالعہ کی طرح لامع و ساطع ہوگا اور ان مومنین کے چہرے بدر منیر کی طرح روشن و درخشاں ہوں گے (کنز العمال جلد ۲ صفحہ باب الفتن حدیث نمبر ۱۰۹ میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن قرآن و عترت بارگاہ ایزدی میں امت کی بدسلوکی کا بایں الفاظ شکوہ کریں گے۔ قرآن کہے گا یا رب حرقونی و مزقونی یا اللہ لوگوں نے مجھے جلایا تھا۔ اور میرے ٹکڑے ٹکڑے کئے تھے۔ عترت رسولؐ یوں فریاد کرے گی۔ یا رب طردونا و قتلونا وشردونا یا اللہ ان لوگوں نے ہمیں جلاوطن کیا۔ ہمیں قتل کیا اور ہمیں متفرق کیا (رواہ احمد فی المسند والطبرانی فی الکبیر) ویقول الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا۔ بارالہا! ان لوگوں نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا (قرآن کریم)

طالبانِ تحقیق کے لئے ان لوگوں کا معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں جنہوں نے قرآن و عترت کے ساتھ یہ سلوک کیا اور نہ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے تھے یا کس مذہب کے پیشوا تھے۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

اکیسواں باب (شفاعت کا بیان)

سلسلۂ شفاعت میں چند امور قابلِ غور ہیں۔

اول۔ اثباتِ شفاعت **دوم** کون حضرات شفاعت کریں گے۔ **سوم**۔ کن لوگوں کی شفاعت کی جائے گی۔ **چہارم**۔ شفاعت پر بعض عائد کردہ شبہات کے جوابات۔

شفاعت کا شرعی مفہوم اور اس کا اثبات

شفاعت کا غلط یا صحیح تصور و تخیل ہر زمانہ میں، ہر مذہب و دین میں رہا ہے اور ہے۔ اس وقت اس امر کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ اسلام نے شفاعت کا جو تصور پیش کیا ہے۔ وہ ان تصورات سے جداگانہ ہے۔ اس سے خدا کا

دينه من اهل الكبائر والصغائر	دین و مذہب کو خداوند عالم پسند فرمائے گا اور انہوں نے صغیرہ یا کبیرہ
فاما التائبون من الذنوب فغير	گناہ کئے ہوں گے۔ باقی رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں سے
محتاجين الى الشفاعة قال النبيؐ	توبہ کرلی ہوگی تو وہ محتاج شفاعت نہیں ہوں گے جناب رسولِ خدا

مجبور و مقہور ہونا لازم نہیں آتا۔ اسلام نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ کچھ ذواتِ مقدسہ ایسے ہیں جو بروز قیامت بارگاہِ ایزدی میں صحیح العقیدہ گنہگاروں کی شفاعت و سفارش کرکے ان کو عذاب خداوندی سے نجات دلائیں گے۔ مگر یہ شفاعت خداوند عالم کے اذن سے ہوگی۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ و من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ۔ کون ہے جو خدا کے اذن کے بغیر سفارش کرے؟ ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔ و لا یشفعون الا لمن ارتضیٰ یہ بزرگوار اس شخص کی شفاعت کریں گے جس کے متعلق خدا چاہے گا۔ اسی بنا پر ہمارے علماء اعلام نے اس حقیقت کی تصریحات فرمائی ہیں کہ شفاعت اذن خدا سے ہوگی۔ چنانچہ محقق شیخ بہاء الدین عاملی اپنے رسالہ اعتقادات الامامیہ میں فرماتے ہیں شفاعۃ اصحاب الکبائر باذن اللّٰہ تعالیٰ۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والوں کی شفاعت باذن اللہ ہوگی جہاں تک شفاعت کے اثبات کا تعلق ہے یہ مسئلہ تمام مکاتیبِ فکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے درمیان متفق علیہ ہے۔ کسی فرقہ نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث متواترہ اس کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں، بلکہ یہ عقیدہ ضروریاتِ مذہب اہل بیتؑ بلکہ ضروریات دین اسلام میں سے ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے بخوبی ہو سکتا ہے جو کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں جناب امام رضا علیہ السلام سے بسلسلہ سند ان کے آباء و اجداد سے منقول ہے کہ آںحضرتؐ نے فرمایا۔ من لم یؤمن بشفاعتی فلا انالہ اللّٰہ شفاعتی جو شخص میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا خدا اسے میری شفاعت نصیب نہ کرے۔ اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا من انکر ثلاثۃ اشیاء فلیس من شیعتنا المعراج والمسائلۃ فی القبر والشفاعۃ۔ جو شخص تین چیزوں کا انکار کرے وہ ہمارے شیعوں میں سے نہیں ہے۔ معراج، قبر میں سوال و جواب اور شفاعت (حق الیقین۔ کتاب خصال وغیرہ) لہٰذا اصل شفاعت میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس پر ایمان رکھنا واجب و لازم ہے قال العلامۃ المجلسیؒ و یجب ان تومن بشفاعۃ النبیؐ والائمۃ (رسالہ اعتقادیہ) جناب رسول خدا اور آئمہ ہدیٰ کی شفاعت پر ایمان رکھنا واجب ہے۔

ہاں اگر اس سلسلہ میں کچھ اختلاف ہے تو وہ اس کی شرعی حقیقت میں ہے کہ آیا شفاعت نیکوکاروں کی زیادتی درجات اور گنہگاروں کے عفو سیئات ہر دو میں ہوگی؟ یا فقط زیادتی درجات کے متعلق ہوگی؟ چنانچہ بعض وہابیہ اور

من لم یومن بشفاعتی فلا اناله الله شفاعتی وقال لا شفیع انجح من التوبۃ والشفاعۃ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا خدا اُسے میری شفاعت نصیب نہ کرے نیز فرمایا حاجت براری اور کامیابی کے لئے توبہ سے بڑھ کر کوئی شفیع نہیں ہے

معتزلہ میں سے فرقہ وعیدیہ اور خوارج کا یہ خیال ہے کہ شفاعت فقط زیادتی درجات کے متعلق ہوگی۔ لیکن باقی جمہور مسلمین کا اس پر اتفاق ہے کہ شفاعت رفع درجات اور عفو سیئات ہر دو کے متعلق ہوگی اور یہی حق ہے چنانچہ جناب محقق طوسی علیہ الرحمۃ تجرید میں فرماتے ہیں والحق صدق الشفاعۃ فیھما۔ یعنی حق یہ ہے کہ شفاعت دونوں معنوں (زیادتی ثواب اور اسقاطِ عذاب) کے اعتبار سے برحق ہے اور ان دونوں معنوں پر شفاعت کا اطلاق صحیح ہے۔

طرافیہ جو حضرات شفاعت کو صرف بلندئ درجات کی سفارش کے معنی میں مراد لیتے ہیں ان کے شبہات کے جوابات تو اس بحث کے آخر میں ذکر کئے جائیں گے۔ یہاں صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ اگر فقط رفع درجات کی سفارش کو ہی شفاعت قرار دیا جائے تو اس سے مطلب برعکس ہو جائے گا۔ یعنی بجائے اس کے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے شفیع قرار پائیں الٹا ہم ان کے شفیع بن جائیں گے۔ کیونکہ ہم ہمیشہ ان کے درجات کی بلندی اور ان پر رحمات الٰہیہ کے نزول کی دعائیں کرتے رہتے ہیں جن کا ہمیں حکم بھی دیا گیا ہے۔ یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما (قرآن کریم) حالانکہ یہ امر بالبداہت غلط ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ شفاعت کا فقط معنی رفع درجات ہونا غلط ہے۔ وہو المقصود۔

شفاعتِ مطلقہ کے ثبوت پر بکثرت آیاتِ قرآنیہ و احادیثِ معصومیہ دلالت کرتی ہیں ان کا ایک شمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے۔ من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ۔ کون ایسا ہے جو بلا اس کی اجازت کے اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرے (پ ۳ بقرع ۱) ولا یشفعون الا لمن ارتضی۔ اس شخص کے سوا جس سے خدا راضی ہو کسی کی سفارش نہیں کرتے (پ ۱۷ س انبیاء ع ۲) نیز ارشاد فرماتا ہے۔ ما من شفیع الا من بعد اذنہ۔ اس کے سامنے کوئی کسی کا سفارشی نہیں ہو سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد (پ سورہ یونس ع ۶)

ان آیات مبارکہ سے روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہے کہ کچھ ذوات مقدسہ ضرور سفارش کریں گے مگر یہ سفارش خداوند عالم کے اذن کے بعد ہوگی اور یہی اہل حق کا عقیدہ ہے۔ اسی طرح خلاقِ عالم ارشاد فرماتا ہے۔ عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا (پ ۱۵ س بنی اسرائیل ع ۹) ولسوف یعطیک ربک فترضی (سورہ والضحٰی پ ۳۰ ع ۸) اے رسول! عنقریب تمہیں تمہارا پروردگار مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا اور اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔

اس آیت مبارکہ کے متعلق تقریباً تمام مفسرین عامہ و خاصہ کا اتفاق ہے کہ یہاں حضرتؐ کی شفاعت کے

للانبیآء والاوصیاء وفی المومنین من یشفع مثل ربیعۃ ومضر واقل المؤمنین من یشفع لثلثین الفا	شفاعت انبیاء اور ان کے اوصیا کریں گے اور خالص اہل ایمان میں سے کچھ ایسے مومن بھی ہوں گے جو ربیعہ ومضر ایسے (کثیر التعداد) قبیلوں کی تعداد کے برابر گنہگاروں کی شفاعت کرینگے کم سے کم شفاعت

بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور یہ کہ مقام محمود سے مقام شفاعت کبریٰ مراد ہے۔

مقام محمود کی توضیح

تفسیر فرات بن ابراہیم کوفی میں حضرت صادق علیہ السلام کے سلسلہ سند سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آں جناب نے فرمایا چونکہ خلاق عالم نے مجھ سے مقام محمود کا وعدہ فرمایا ہے وہ اسے ضرور پورا کرے گا۔ چنانچہ قیامت کے دن جب وہ تمام لوگوں کو جمع کرے گا تو میرے لئے ایک منبر نصب کیا جائے گا جس کے ایک ہزار درجہ ہوں گے۔ میں اس کے آخری درجہ پر چڑھ جاؤں گا۔ اس وقت جبرئیل میرے پاس آکر لواء الحمد میرے ہاتھ میں دے گا اور کہے گا یا محمدؐ! یہ وہ مقام محمود ہے جس کا پروردگار عالم نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ اس وقت میں جناب علیؑ سے کہوں گا۔ یا علیؑ! تم اوپر چڑھو چنانچہ وہ منبر پر چڑھیں گے اور مجھ سے ایک درجہ نیچے بیٹھ جائیں گے۔ تب میں لواء الحمد ان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ پھر میرے پاس رضوان جنت کی کنجیاں لے کر آئے گا اور میرے حوالہ کرکے کہے گا۔ یا محمدؐ! یہ وہ مقام محمود ہے جس کا پروردگار نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ میں یہ کنجیاں لے کر علیؑ کے حوالہ کردوں گا۔ اسی طرح مالک (داروغہ جہنم) جہنم کی کنجیاں میرے سامنے پیش کرے گا میں یہ کنجیاں بھی علیؑ کے حوالہ کردوں گا۔ پس اس وقت جنت وجہنم میری وعلیؑ کی اس سے زیادہ اطاعت گذار ہوں گی جتنی کوئی فرمانبردار دلہن اپنے شوہر کی اطاعت کرتی ہے اور یہ ہے مطلب ارشاد ایزدی القیا فی جھنم کل کفار عنید کا۔ یعنی (اے محمدؐ وعلیؑ) تم دونوں ہر کافر و سرکش کو جہنم میں جھونک دو۔ اس وقت میں اللہ کر خداوند عالم کی تعریف و توصیف بیان کروں گا۔

اسی طرح تفسیر قمی میں جناب سماعہ سے روایت ہے کہ کسی نے حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ قیامت کے دن جناب پیغمبر اسلام کی شفاعت کس طرح ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ جب لوگ پسینہ کی کثرت سے نہایت مضطرب و پریشان ہو جائیں گے تو تنگ ہو کر جناب آدم علیہ السلام کی خدمت میں بغرض شفاعت حاضر ہوں گے وہ اپنے ترک اولیٰ کا عذر پیش کرکے معذرت طلب کریں گے پھر ان کی ہدایت کے مطابق جناب نوح علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ وہ بھی اپنے ترک اولیٰ کی وجہ سے معذرت خواہی کریں گے۔ اسی طرح ہر سابق نبی ان کو اپنے مابعد والے نبی کی خدمت میں بھیجے گا۔ حتیٰ کہ جناب عیسیٰؑ کی خدمت میں پہنچیں گے وہ ان کو سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیں گے۔ چنانچہ جو لوگ ان کی خدمت میں سفارش کی درخواست

والشفاعة لایکون لاھل الشك والشرك ولا لاھل الکفر والجحوٗ بل یکون للمذنبین من اھل التوحید

کرنے والا مومن بھی تیس ہزار انسانوں کی شفاعت کرے گا۔ دین میں شک اور شرک و کفر اور انکار کرنے والوں کی شفاعت نہیں ہوگی بلکہ صرف گنہ گار اہل توحید کی ہوگی۔

پیش کریں گے تو آنجناب ان کے ہمراہ جنت کے دروازہ باب الرحمٰن تک تشریف لائیں گے اور وہاں بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ اس وقت ارشاد رب العزت ہوگا۔ ارفع راسك واشفع تشفع واسئل تعطی۔ اے حبیب! سر اٹھاؤ اور شفاعت کرو۔ تمہاری شفاعت مقبول ہے اور جو کچھ مانگنا ہے مانگو۔ تمہیں عطا کیا جائے گا۔"

امام علیہ السلام نے فرمایا یہ مطلب ہے قول خداوندی عسیٰ ان یبعثك ربك مقاما محمودًا کا۔ (کذا فی الشفا للقاضی عیاض ج ا ص ۱۳۴/۱۳۶ طبع مصر)

کون حضرات شفاعت کریں گے؟

سابقہ بیان حقیقت ترجمان سے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شفیع اُمت بلکہ شفیع امم ہونا تو واضح وعیاں ہو چکا لہٰذا اس منصب جلیل کے سب سے پہلے اور بڑے حق دار اور مختار تو آں حضرت ہی ہیں۔ ان کے بعد حضرات آئمہ طاہرین علیہم السلام اور ان کے بعد شہداء و علماء دین اور خالص مومنین کرام کا مرتبہ ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی متعدد آیات و روایات موجود ہیں ارشاد رب العباد ہے لایملکون الشفاعة الامن اتخذ عند الرحمٰن عھدًا (پ ۱۶ س مریم ۹۶) ان کو شفاعت کا کوئی اختیار نہ ہوگا سوائے اس شخص کے جس کا کوئی عہد خدائے رحمٰن کے پاس ہو۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ اس سے مراد سرکار محمد وآل محمد علیہم السلام ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر صافی و برہان وغیرہ)

ثالث بحار الانوار، کنز الفوائد کراجکی اور مرآۃ الانوار و مشکوٰۃ الاسرار (جو کہ مقدمہ تفسیر برہان کے نام سے مشہور ہے) وغیرہ کتب میں اس مضمون کی کثرت روایات حضرات آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہے کہ اذا کان یوم القیمة وجمع اللہ الاولین والاخرین ولا ناحساب شیعتنا فما کان بینھم و بین اللہ سئلنا اللہ ان یھب لنا فھو لھم وما کان للادمیین سئلنا اللہ ان یعوضھم بدلہ فھو لھم وما کان لنا فھو لھم۔ یعنی جب قیامت کا دن ہوگا اور خداوند عالم تمام اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا تو وہ ہمارے شیعوں کے حساب و کتاب کا ہمیں متولی بنائے گا۔ پس ہمارے شیعوں کے جو گناہ حقوق اللہ کے متعلق ہوں گے ان کے متعلق ہم خداوند کریم سے سوال کریں گے کہ ہمارے لئے وہ ان کو معاف فرما دے اور جو گناہ حقوق الناس کے متعلق ہوں گے۔ ان کے بارے میں ہم بارگاہ رب رحیم میں عرض کریں گے کہ لوگوں کو ان کا عوض عطا فرمائے اور جو گناہ ہمارے حقوق میں کوتاہی کے متعلق ہوں گے۔ ہم خود انہیں معاف کر دیں گے۔ یہ مطلب ہے آیت مبارکہ ان الینا ایابھم ثم

ان علینا حسابهم کا یعنی ہماری ہی طرف ان کی بازگشت ہے۔ اور ہم پر ہی ان کا حساب ہے" (ایسی احادیث کی مزید وضاحت اس بحث کے اخیر میں کی جائے گی) تفسیر قمی وغیرہ میں جناب امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا واللہ لنشفعن فی المذنبین من شیعتنا حتی تقول اعدائنا اذا را وا ذلک فما لنا من شافعین ولا صدیق حمیم فلو ان لنا کرۃ فنکون من المومنین۔ بخدا ہم اپنے گنہگار شیعوں کی اس قدر شفاعت کریں گے کہ ہمارے دشمن جب اس حالت کا مشاہدہ کریں گے تو کہہ اٹھیں گے ہائے ہمارا آج کوئی شفیع اور خیر خواہ دوست نہیں ہے۔ اے کاش اگر ہمیں ایک بار دنیا میں بھیج دیا جائے تو ہم بھی مومن بن جائیں۔ کتاب خصال شیخ صدوق رہ میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے منقول ہے فرمایا ثلاثۃ یشفعون الی اللہ عزوجل فیشفعون الانبیاء ثم العلماء ثم الشہداء تین گروہ بارگاہ الٰہی میں شفاعت کریں گے۔ اور ان کی شفاعت قبول ہوگی۔ انبیاء، علماء اور شہداء کتاب علل الشرائع میں جناب صادق آل محمد علیہ السلام سے مروی ہے اذا کان یوم القیامۃ بعث اللہ العالم والعابد فاذا وقفا بین یدی اللہ یقال للعابد امض الی الجنۃ ویقال للعالم قف واشفع للناس الذین ادبتہم باد بک الحسن۔ کہ بروز محشر جب عابد و عالم بارگاہِ ایزدی میں حاضر کئے جائیں گے تو عابد کو حکم ہوگا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ اور عالم کو ارشاد ہوگا کہ تم ان لوگوں کی شفاعت کرو جن کی اپنے علم و ادب سے تربیت کی تھی۔ اسی طرح خالص مومنین کی شفاعت کے متعلق بھی بعض روایتیں متن رسالہ میں درج ہیں۔ مزید برآں ثالث بحار الانوار میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا لا تستخفوا شیعۃ علی علیہ السلام فان الرجل منہم لیشفع بعدد ربیعۃ و مضر۔ شیعیان علی کو حقیر مت سمجھو کیونکہ ان میں سے ایک ایک شخص قبیلہ ربیعہ و مضر کی تعداد کے برابر گنہگاروں کی شفاعت کرے گا۔ اسی طرح ملائکہ کرام کا شفاعت کرنا بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ارشاد قدرت ہے وکم من ملک فی السموات لا تغنی شفاعتہم شیئا الا من بعد ان یاذن اللہ لمن یشاء و یرضی

ایضاً متن رسالہ میں جو مذکور ہے کہ کم از کم شفاعت کرنے والا مومن تیس ہزار لوگوں کی شفاعت کرے گا مجھ کو جہاں تک اس سلسلہ میں روایات نظر قاصر سے گذری ہیں ان میں صرف ثلاثین کی لفظ مذکور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سب اہل ایمان سے کم شفاعت کرنے والا بھی تیس آدمیوں کی شفاعت کرے گا۔ ثلاثین کے ساتھ "الف" (ہزار) کی لفظ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ امت اسلامیہ میں شفاعت کرنے والے جناب رسول خدا اور آئمہ ہدیٰ اور ان کے خالص اتباع یعنی شیعیان علی مرتضیٰ بالخصوص علماء و شہداء ہیں۔ چنانچہ علامہ طبرسی علیہ الرحمہ تفسیر مجمع البیان میں فرماتے

ہیں۔ وہی (الشفاعۃ) ثابتۃ عندنا للنبی ولاصحابہ المنتجبین والائمۃ من اہل بیتہ الطاہرین ولصالح المومنین وینجی اللہ تعالیٰ بشفاعتہم کثیرا من الخاطئین۔ یعنی ہمارے نزدیک شفاعت جناب رسول خدا۔ ان کے اصحاب باوفا اور آئمہ ہدیٰ اور مومنین باصفا کے لئے ثابت ہے اور خداوند عالم ان کی وجہ سے بہت سے گنہگاروں کو آتش جہنم سے نجات عطا فرمائے گا۔

مولانا السید عبداللہ شبر حق الیقین میں فرماتے ہیں ولا یشفع الا من اذن اللہ فی الشفاعۃ و ہم الانبیاء والاوصیاء والشہداء والعلماء والمومنون۔ سوائے ان بزرگواروں کے جن کو خدا اذن عطا فرمائے گا اور کوئی شفاعت نہیں کرے گا (اور وہ اذن یافتہ) یہ ہیں۔ انبیاء، اوصیاء، شہداء، علماء اور مؤمنین۔

رزقنا اللہ شفاعتہم فی الدنیا والاخرۃ۔

کن لوگوں کی شفاعت ہو گی اور کن کی نہ ہو گی؟

جو از قرآن کی آیات و آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات اور محققین علماء اعلام کی تحقیقات سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ شفاعت فقط ان لوگوں کی ہو گی جن کے عقائد تو بالکل صحیح ہوں گے لیکن عملی طور پر ان میں کچھ کمزوریاں ہوں گی لیکن یہ کمزوریاں اور غلطیاں جہالت یا سہو و نسیان یا کسی وقت نفس امارہ یا شیطان رجیم کے غلبہ و تسلط کی وجہ سے سرزد ہوئی ہوں گی۔ فان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی۔ نہ از روئے علم و عمد۔ نیز وہ بلا توبہ مرے ہوں گے۔ لہٰذا غلط عقائد والے اور علماً و عمداً شریعت اسلامیہ کا استہزاء و تمسخر اڑانے والے اور مخالفت احکام کرنے والے لوگ اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہیں گے باقی وہ لوگ جو صحیح العقیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ صالح الاعمال بھی ہوں گے یا جو اپنے اعمال ناشائستہ سے تائب ہو کر مریں گے۔ تو وہ شفاعت کے محتاج نہیں ہوں گے (الا لرفع الدرجات وھو شئی اخر) ان امور کا ثبوت ذیل میں بالاختصار پیش کیا جاتا ہے۔

پہلے امر کے متعلق ارشاد رب العزت ہے۔ ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ۔ شفاعت کرنے والے شفاعت نہیں کریں گے مگر اسی کی جسے خداوند عالم پسند کرے گا۔ اس کی تفسیر آئمہ اہل بیتؑ نے یہ فرمائی ہے کہ جس کے دین کو خدا پسند کرے گا۔ (تفسیر۔ برہان۔ صافی۔ قمی وغیرہ)

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔ یومئذ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمٰن ورضی لہ قولا (پ ۱۶ س طہٰ ع ۱۵) اس (قیامت والے) دن شفاعت فائدہ نہیں دے گی مگر اسی کو جس کے لئے خدا اذن دے گا اور اس کے لئے گفتگو کو پسند فرمائے گا۔

پس معلوم ہوا کہ شفاعت اسی کی ہو گی جس کا مذہب پسندیدۂ خدا ہو گا یعنی اس کے عقائد صحیح و درست ہوں گے۔ لہٰذا کفار و مشرکین اور خوارج و نصاب اور دیگر معاندین دین کی شفاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ان کا مذہب ہی پسندیدہ

اور دوسرے امر کے بارے میں وہ ارشاد نبوی کافی ہے جو کتاب بحار الانوار، خصال اور امالی شیخ صدوق وغیرہ کتب میں مذکور ہے فرمایا۔ ان شفاعتی لاھل الکبائر من امتی فاما المحسنون فما علیھم من سبیل۔ میری شفاعت میری اُمّت کے ان لوگوں کے لئے ہے جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے اور جو نیکوکار ہیں۔ وہ بے نیاز ہیں۔ اگرچہ لفظِ اُمّتی" میں بڑی وسعت ہے لیکن بموجب، الاحادیث یفسر بعضھا بعضاً، جب سابقہ امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ شفاعت فقط انہی کی ہوگی، جن کا مذہب پسندیدہ ہوگا تو مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ گنہ گار مومنین کی شفاعت ہوگی۔ وھو المقصود، اسی طرح کتاب فضائل الشیعہ شیخ صدوق علیہ الرحمۃ میں حضرت صادق علیہ السّلام سے مروی ہے۔ فرمایا اذا کان یوم القیامۃ نشفع فی المذنب من شیعتنا فاما المحسنون فقد نجاھم اللہ یعنی جب قیامت کا روز ہوگا تو ہم اپنے گنہگار شیعوں کی شفاعت کریں گے اور جو نیک ہوں گے انہیں تو خدا نے نجات دے ہی دی ہے۔"

بشارۃ المصطفےٰ میں جناب رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے مروی ہے۔ فرمایا اربعۃ انا لھم شفیع یوم القیامۃ المکرم لذریتی۔ القاضی لھم حوائجھم والساعی فی امورھم والمحب لھم بقلبہ و لسانہ میں چار شخصوں کی بروز قیامت ضرور شفاعت کروں گا۔ ایک وہ شخص جو میری ذرّیت کی عزت و توقیر کرے دوسرا وہ جو میری ذرّیت کی حاجات پوری کرے۔ تیسرا وہ جو اُن کی مطلب براری میں جدّوجہد کرے۔ چوتھا وہ جو دل و زبان سے ان کے ساتھ محبت کرے۔ (یہ حدیث صواعق محرقہ ابن حجر مکی صـ۲۳۱ طبع جدید میں بھی مذکور ہے) مخفی نہ رہے کہ علمائے اعلام نے ایسی عمومی احادیث کا مصداق تمام سادات کرام کو قرار دیا ہے۔ صرف آئمہ اہل بیتؑ کے ساتھ مختص نہیں کیا۔ لہٰذا جو مومنین کرام عام مستحق تکریم سادات عظام کے ساتھ یہ حسن سلوک کریں گے وہ ضرور شفاعت نبویہ کے مستحق قرار پائیں گے نیز بموجب وبضدھا تتبین الاشیاء۔ ان احادیث سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ جو لوگ ذرّیت رسُولؐ کو تکلیف و اذیت پہنچائیں گے، آں حضرتؐ ان کی ہرگز شفاعت نہیں فرمائیں گے۔ چنانچہ ثالث بحار الانوار میں جناب امام جعفر صادق علیہ السّلام سے بسلسلۂ سند ان کے آباؤ اجداد طاہرینؑ کے جناب رسالت مآبؐ کی یہ حدیث مروی ہے فرمایا۔ اذا قمت المقام تشفعت فی اھل الکبائر من امتی فیشفعنی اللہ فیھم واللہ لا تشفعت فیمن اذی ذریتی۔ یعنی جب میں مقام محمود میں کھڑا ہوں گا تو اُمّت کے اہل کبائر کے لئے شفاعت کروں گا۔ اور خدا میری شفاعت کو قبول بھی فرمائے گا مگر خدا کی قسم میں اُس شخص کی ہرگز شفاعت نہیں کروں گا۔ جس نے میری ذرّیت کو اذیت پہنچائی ہوگی۔" ولنعم ما قیل ؎

اترجوامۃ قتلت حسینا شفاعۃ جدہ یوم الحساب

یہ حقیقت بھی بالکل واضح ہے کہ دشمنان اہل بیتؑ کی ہرگز شفاعت نہیں ہوگی۔ چنانچہ حق الیقین شبر میں حضرت

صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ ان المومن یشفع لحمیمہ الا ان یکون ناصبیا وان ناصبیا لو شفع لہ کل نبی مرسل وملک مقرب ما شفعوا۔ یعنی مومن اپنے خالص دوستوں کی شفاعت کرے گا مگر یہ کہ وہ ناصبی ہوں اور اگر ناصبی کے لئے بالفرض تمام نبی مرسل اور ملک مقرب مل کر بھی شفاعت کریں تو جب بھی ان کی شفاعت قبول نہ ہوگی۔

ایک ضروری وضاحت

واضح رہے کہ احادیث میں جو یہ وارد ہے جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آئمہ اہل بیت اپنے شیعوں کی شفاعت کریں گے اور وہی بزرگوار شیعوں کے حساب کتاب کے متولی ہوں گے۔ اس سے فساق و فجار اور زبانی جمع خرچ کرنے والوں کو خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان سب احادیث میں لفظ "شیعہ" وارد ہے لہٰذا جو شیعہ ہوگا اسی کی شفاعت ہوگی۔ اب قابل غور امر یہ ہے کہ شیعہ کون اور کیسے ہوتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے معلوم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اصول کافی وغیرہ کتب معتبرہ میں بکثرت روایاتِ معتبرہ شیعیان اہل بیت کے اوصافِ حمیدہ و خصائل ستودہ کے بارے میں موجود ہیں۔ سب کا ذکر تو موجبِ طوالت ہے۔ اس لئے بنظرِ اختصار فقط دو تین حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔ شیخ صدوق علیہ الرحمۃ کتاب صفات الشیعہ میں بروایت ابن ابی بحران جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا شیعتنا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ ویحجون البیت الحرام ویصومون شہر رمضان ویوالون اھل البیت ویتبرؤن من اعدائھم۔ الخ۔۔۔۔ ہمارے شیعہ وہ ہیں جو نمازیں تمام کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ حج بیت اللہ کرتے ہیں۔ ماہ رمضان کے روزے رکھتے ہیں۔ اور ہم اہل بیت سے تولی کرتے ہیں اور ہمارے دشمنوں سے تبرا اختیار کرتے ہیں" احدیث بہت طویل ہے ہم نے بقدر ضرورت اس کا ایک مختصر حصہ نقل کیا ہے الیس معلوم ہوا کہ شیعیانِ اہل بیت میں کم از کم واجباتِ شرعیہ کی بجا آوری اور محرمات شرعیہ سے اجتناب کا ملکہ حالانکہ تو موجود ہونا چاہیے جو لوگ اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ آئمہ طاہرینؑ نے ان سے اپنی بیزاری ظاہر فرمائی ہے چنانچہ اُصولِ کافی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا من کان للہ مطیعًا فھو لنا ولی ومن کان للہ عاصیًا فنحن منہ براء۔ جو لوگ اللہ کے فرمانبردار ہیں وہ ہمارے دوست ہیں۔ اور جو لوگ کلام اللہ سبحانہٗ کے نافرمان ہیں ہم ان سے بیزار ہیں۔ نیز فرمایا لا تنال ولایتنا الا بالورع والعمل۔ ہماری ولایت حاصل ہو ہی نہیں سکتی مگر محرماتِ شرعیہ سے بچنے اور عمل صالح بجا لانے سے نیز جناب باقر العلومؑ فرماتے ہیں۔ انما شیعتنا من تابعنا ولم یخالفنا ومن اذا خفنا خاف واذا امنا امن فاولئک شیعتنا (محاسن برقی) ہمارے شیعہ بس وہی ہیں جو ہماری متابعت کرتے ہیں اور مخالفت نہیں کرتے اور جب ہم خوف زدہ ہوں تو وہ بھی خائف ہوتے ہیں اور جب ہم امن و اطمینان سے ہوں تو وہ بھی امن سے ہوتے ہیں۔ یہی ہیں ہمارے شیعہ۔

یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص عمداً احکام شرعیہ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتا ہے اور واجبات کی بجا آوری اور محرمات کے ارتکاب کی کوئی پروا نہیں کرتا ہے تو اس کا نام شیعیان علی علیہ السلام کی فہرست سے خارج ہو جاتا ہے اس لئے وہ ان کی شفاعت کبریٰ کی سعادت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا۔ لا تنال شفاعتنا من استخف بصلوٰتہ۔ جو شخص نماز کو خفیف و سبک سمجھے گا۔ اس کو ہماری شفاعت نصیب نہ ہوگی۔ ایسا ہی جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے۔ (وسائل الشیعہ وغیرہ)۔

لہٰذا اس مقام پر نہایت حزم واحتیاط سے کام لینا چاہیے۔ شفاعت یقیناً برحق ہے۔ وہ ہوگی اور ضرور ہوگی۔ لیکن بر حسب کلمۃ حق یراد بہا الباطل۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اب ہم آزاد اور مطلق العنان ہیں جو جی چاہے کرتے پھریں۔ خواہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھ لیں محض اس بل بوتے پر کہ ہماری شفاعت ہو جائے گی اور ہم داخل جنت ہو جائیں گے۔ کئی روایات میں وارد ہے کہ بعض گناہوں کے ارتکاب سے نعمت ایمان ہی سلب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اس معصیت کاری سے دولت ایمان ہی سلب ہو جائے اور (خدانخواستہ) خاتمہ بالخیر نہ ہو اور جو شفعا ہیں وہ خصما بن جائیں۔ بہرحال آدمی کو امید وخوف کے درمیان رہنا چاہیے۔

آئمہ اہل بیت شریعت مقدسہ کی حفاظت کرنے والے ہیں نہ کہ اس کی مخالفت کی اجازت دے کر اس کی تخریب کرنے والے (معاذ اللہ) پس ان حقائق سے معلوم ہو گیا کہ احادیث میں جو اہل کبائر کی شفاعت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ان سے وہی اہل ایمان مراد ہیں جو جہالت یا سہو ونسیان یا کسی وقت بتقاضائے بشریت غلبہ شیطان کی وجہ سے گناہان کبیرہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ بہرحال اہل ایمان کی یہ صفت ہے کہ ہمیشہ بیم وامید کے درمیان رہیں۔ ارشاد قدرت ہے۔ و یرجون رحمتہ ویخافون عذابہ۔ وہ خدا کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وارزقنا حسن العاقبۃ بحق النبیؐ وعترتہ الطاہرۃ۔

توبہ بھی باعث نجات ہے

آیات وروایات سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح شفاعت ایک ذریعہ بخشش ہے۔ اسی طرح توبہ بھی باعث نجات ہے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد موجود ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں (حق الیقین) ایز انہی کا ارشاد ہے لا کبیرۃ مع الاستغفار ولا صغیرۃ مع الاصرار توبہ کرنے سے کوئی گناہ کبیرہ کبیرہ نہیں رہتا (معاف ہو جاتا ہے) اور بار بار کرنے سے گناہ صغیرہ صغیرہ نہیں رہتا (بلکہ کبیرہ بن جاتا ہے) خداوند عالم نے جہاں توبہ کرنے کا حکم دیا ہے وتوبوا الی اللہ جمیعاً ایھا المومنون (نور) اے ایمان لانے والو! تم سب بارگاہ ایزدی میں توبہ کرو۔ وہاں توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف فرمانے کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وانی لغفار لمن تاب وامن وعمل صالحا ثم اھتدی۔ میں اس آدمی

کے گناہ معاف کر دیتا ہوں جو تائب ہو جائے۔ ایمان لائے اور عمل صالح کرے اور پھر طلب ہدایت کرے۔ نیز ارشاد فرماتا ہے۔ وھوالذی یقبل التوبۃ من عبادہ و یعفوا عن السیئات (سورۃ رعد پ ع) خدا وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور ان کے گناہوں سے درگذر کرتا ہے۔ نیز اسی غفار الذنوب وستار العیوب نے گنہ گاروں کو یہ مژدۂ جانفزا بھی سنایا ہے۔ یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسکم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا (سورۃ زمر پ ۲۴ ع ۳) اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر (گناہ کرکے) ظلم کیا ہے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، کیونکہ خداوند عالم تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اصول کافی میں بروایت جناب محمد بن مسلم حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا ذنوب المومن اذا تاب منہا مغفورۃ لہ فلیعمل المومن لما یستانف بعد التوبۃ والمغفرۃ۔ جب مومن توبہ کرتا ہے تو اس کے سب سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اب مومن کو چاہیے کہ مغفرت کے بعد آیندہ کے لئے عمل کرے۔ نیز جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا اگر شب تیرہ و تاریک میں کسی آدمی کی زاد و راہ والی سواری گم ہو جائے اور تلاش بسیار کے بعد وہ اسے دستیاب ہو جائے تو جس قدر وہ شخص اس وقت مسرور و شادکام ہوتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خلاق عالم اس وقت خوش ہوتا ہے جب کوئی گنہگار بندہ اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے (حق الیقین) انہی حقائق کی وجہ سے تمام اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ توبہ کے بعد انسان سے عقاب اخروی ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر جناب مصنف علام نے فرمایا ہے کہ تائب آدمی محتاج شفاعت نہیں ہے لیکن بایں ہمہ ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ کسی شخص کا خواہ وہ جس قدر بھی محسن و مومن اور تائب اور مستغفر کیوں نہ ہو، خداوند عالم کے تفضل و تکرم اور جناب سید المرسلین و آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین کی شفاعت کے بغیر اس کا جنت میں داخل ہونا مشکل ہے اور نہیں تو کم از کم اپنی بلندیٔ درجات کے لئے تو اسے ان کی شفاعت بہر حال درکار ہے۔ اس امر کی مزید وضاحت چوبیسویں باب میں کی جائے گی (ہماری توبہ و استغفار کیا ہے؟) ع

معصیت را خندہ می آید ز استغفار ما

حقیقت یہ ہے کہ عام لوگوں کی توبہ و استغفار خود محتاج توبہ ہے۔ واستغفر اللہ مما قلت وذقتنا بمنہ و کرمہ شفاعۃ النبی و عترتہ الطاھرۃ فی الدنیا والاخرۃ۔

شرائط قبولیت توبہ کا اجمالی بیان

بہرکیف توبہ اس وقت موجب بخشش گناہان اور باعث رضائے رحمن ہوتی ہے جب کہ اپنے مقررہ شرائط کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ یہاں تفصیل شرائط ذکر کرنے کی گنجائش نہیں البتہ بعض اہم شرائط کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ تمام شرائط قبولیت توبہ کا لب لباب تین چیزیں ہیں۔

(اول) یہ کہ تائب پر لازم ہے کہ وقت توبہ تک کئے ہوئے تمام گناہوں سے جو اس سے سرزد ہو چکے ہیں دل سے انتہائی ندامت و پشیمانی کا اظہار کرے

دوئم۔ یہ کہ آیندہ ان گناہوں کے نہ کرنے کا عزم بالجزم کرے۔

سوم۔ یہ کہ گذشتہ گناہوں کی تلافی بھی کرے۔ بایں طور کہ اگر وہ گناہ حقوقِ خداوندی کے متعلق ہیں جیسے ترکِ صوم وصلوٰۃ وغیرہ تو ان کی قضا کرے، اور اگر حقوق الناس سے متعلق ہیں جیسے چوری اور لوگوں پر ظلم وستم اور ان کی غیبت وعیب جوئی وغیرہ تو حقوق مالیہ کو ادا کرے یا ان سے بخشوائے اور دیگر حق تلفیوں کی ان سے معافی مانگے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ توبہ فی الحقیقت توبہ نہ ہوگی۔ **اللھم وفقنا للتوبۃ قبل الموت وللعمل قبل الفوت**۔

شفاعت کے بارے میں چند شکوک وشبہات اور ان کے جوابات

جو لوگ شفاعت کو صرف بلندئ درجات کی سفارش کے معنوں میں مراد لیتے ہیں اور گنہگاروں کے رفعِ عذاب وعقاب کے معنوں میں اسے درست نہیں سمجھتے وہ اپنے نظریہ پر چند شبہات پیش کیا کرتے ہیں ان کا ایک شبہ تو عقلی ہے اور باقی شبہات بعض آیاتِ قرآنیہ کے صحیح معنی ومفہوم کے نہ سمجھنے پر مبنی ہیں۔

پہلا عقلی شبہ

یہ ہے کہ جس طرح کسی عادل وصادق بادشاہ کے لئے وعدہ کی مخالفت قبیح ہے۔ اسی طرح وعید وتہدید کی خلاف ورزی بھی قبیح وشنیع ہے۔ مثلاً خداوند عالم نے عمل صالح کرنے والوں کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا ہے لہٰذا اگر وہ پورا نہ کرے تو یہ امر یقیناً قبیح اور اس کی شانِ خداوندی کے منافی ہے۔ اسی طرح چونکہ اس نے عمل بد کرنے والوں کو عذابِ جہنم کی وعید وتہدید فرمائی ہے لہٰذا اس کا پورا کرنا بھی اس پر لازم ہے لہٰذا عقاب کے معاف کرنے کی سفارش کرنا مذموم ہے جو کہ ایک نبی معصوم کی شانِ عصمت کے منافی ہے۔

اس شبہ کا جواب

یہ ہے کہ یہ شبہ تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے اور یہ وعدہ اور وعید میں فرق نہ کرنے اور ان کے درمیان جو نمایاں امتیاز ہے اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ورنہ عقلائے روزگار جانتے ہیں اور صاحبانِ اقتدار کا کردار شاہد عادل ہے کہ جس طرح وعدہ کی مخالفت قبیح ہوتی ہے اس کے برعکس وعید کی خلاف ورزی ممدوح ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی حاکم کسی ماتحت کو کسی بُرے کام کے کرنے پر یا کسی اچھے کام کے نہ کرنے پر تہدید ووعید کرے۔ اور جب وہ شخص اس حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے تو اگر حاکم خود بخود یا کسی کی سفارش کرنے سے اس کا جرم معاف کر دے اور سزا نہ دے تو اس کا یہ فعل یقیناً عقلائے روزگار کی نظر میں قابلِ مدح وستائش سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے اس کی رحم دلی اور بندہ نوازی پر محمول کیا جاتا ہے۔ مشاہدہ بھی شاہد ہے کہ جب حکامِ دنیا کسی شخص سے ناراض ہو جائیں تو جس طرح اس مجرم کی عاجزی وانکساری سے اسے معاف کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات مقربین بارگاہ کی سفارش سے بھی تقصیریں معاف ہو جاتی ہیں پس معلوم ہوا کہ شفاعت بایں معنی خداوند عالم کے عفو ودرگذر کرنے کا نام ہے جس کا خدا تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ **الا فاعفوا واصفحوا یغفر اللہ لکم**۔ مجرموں کو معاف کر دو، خدا تمہیں معاف کر دے گا۔ خدا تعالیٰ نے اپنے لوگوں کی مدح وثنا فرمائی ہے جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور مجرموں کو

معافی دے دیتے ہیں، چنانچہ فرماتا ہے۔ والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین خدا کے خالص بندے وہ ہوتے ہیں جو غصّہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اور خدا دوست رکھتا ہے ان لوگوں کو جو احسان کرنے والے ہوتے ہیں۔ اولیاء مقتول کو ہدایت کی جاتی ہے۔ وان تعفوا ھو اقرب للتقویٰ اگر تم قاتل کو معاف کر دو تو یہ امر تقویٰ و پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے۔ ع

در عفو لذتے است کہ در انتقام نیست

تو جو خلاق حکیم ہمیں عفو و درگذر کا حکم دیتا ہے اگر وہ خود اسی امر کا مظاہرہ فرمائے تو یہ امر قبیح کیوں جتنے لگا؟ اف ھذا الاختلاق۔

ہاں اگر کوئی حاکم کسی شخص کو کسی اچھے کام کرنے پر کسی انعام دینے کا وعدہ کرے اور پھر کام انجام دینے پر وہ مقررہ انعام نہ دے تو اس کا یہ فعل یقیناً عقلاء کی نظروں میں مذموم سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ بریں وعدہ وعید کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ وعدہ میں لوگوں کا حق خدا پر ہوتا ہے اور جس کی ادائیگی کو خدا ہرگز ترک نہیں کرتا مگر وعید و تہدید میں خدا کا حق بندوں پر ہوتا ہے جس کے متعلق اسے لینے یا معاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سے وعدہ و وعید کا باہمی فرق ہر کو در پر واضح و آشکار ہو جاتا ہے البتہ اگر یہ شفاعت حقوق الناس کے متعلق ہے تو قدرت اپنی بارگاہ سے ان کے حقوق کے عوض کی ادائیگی کا انتظام کر سکتی ہے۔ اس طرح کسی کے حقوق کے ضیاع کا بھی اندیشہ نہیں رہتا۔

دوسرے بعض شبہات

جو بعض آیاتِ قرآنیہ کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے پیدا ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) ارشادِ قدرت ہے۔ ماللظالمین من حمیم و لا شفیع یطاع۔ ظالموں کے لئے کوئی خیر خواہ اور ایسا شفیع جس کی اطاعت کی جائے نہ ہوگا۔ اور چونکہ ہر فاسق و فاجر ظالم ہے لہٰذا ان کی شفاعت نہ ہوگی (۲) وما للظالمین من انصار۔ ظالموں کا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔ جو شفاعت کرتا ہے وہ گویا نصرت و امداد کرتا ہے لیکن بنصِ قرآن حسب ظالموں کا کوئی ناصر نہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کا کوئی شفیع نہیں (۳) یوم لا تجزی نفس عن نفس شیئا۔ اس روز کوئی نفس کسی نفس کو فائدہ نہ پہنچائے گا۔ (۴) فلا تنفعھم شفاعۃ الشافعین۔ انہیں کسی شفیع کی شفاعت کوئی نفع نہ دے گی۔

پہلا جواب باصواب

ان سب آیات مبارکہ کے ساتھ تمسّک کرنے کا پہلا جواب باصواب تو یہ ہے کہ اگرچہ فاسق کو بھی ظالم کہا گیا ہے ومن یتعد حدود اللہ فاولٰئک ھم الظالمون۔ لیکن یہ امر ظاہر ہے کہ ظالم کی فردِ اکمل یعنی حقیقی اور واقعی ظالم کافر و مشرک لوگ ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے والکافرون ھم الظالمون (سورۃ بقرہ پ۳ ع۱) یعنی کافر ہی حقیقی ظالم ہیں وان الشرک لظلم عظیم شرک ایک ظلم عظیم ہے لہٰذا مشرک بڑے ظالم ہیں۔ اس لئے اس جگہ ظالمین سے مراد کافر و مشرک لوگ ہیں یا وہ نام نہاد مسلمان

جو محکوم بکفر ہیں جیسے نواصب وخوارج اور غالی وغیرہم اور یہی جمع بین الآیات کا تقاضا ہے۔ ورنہ سابقہ آیات (جو اثبات شفاعت پر دلالت کرتی ہیں) اور ان آیات میں تعارض واختلاف پیدا ہو جائے گا جو شانِ قرآن کے خلاف ہے ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔

دوسرا جواب باصواب

اگر گنہگاروں کو شفاعت سے کچھ فائدہ نہ ہوتا تو خلاق عالم کا پیغمبر اسلام کو یہ حکم دینا لغو بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ واستغفر لذنبک وللمومنین والمومنات۔ اے رسول اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی بخشش طلب کرو۔ اسی طرح عام لوگوں کو خلاق عالم نے ہدایت فرمائی ہے ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاؤک واستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما (پ ۵ ع ۶)

اس آیت مبارکہ سے بعبارۃ النص واضح وآشکار ہوتا ہے کہ آں حضرت گنہگاران امت کی بخشش طلب کرتے ہیں اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے۔ اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذکورہ بالا آیات سے کفار ومشرکین اور ان کے اشباہ وامثال ہی مراد ہیں نہ گنہگار مومنین۔ وہو المطلوب۔

تتمۂ بحث

برادران اسلامی کے مقتدر عالم علامہ نووی نے شرح صحیح مسلم ج ۱ صفحہ ۷۰ میں قاضی عیاض کی تحقیق نقل کی ہے جس سے ہمارے بیان کردہ مطلب کی تائید ہوتی ہے ہم اسے سرِ دلبراں در حدیث دیگراں سمجھتے ہوئے یہاں نقل کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں قال القاضی عیاض مذہب اھل السنۃ جواز الشفاعۃ عقلاً ووجوبھا سمعاً بصریح قولہ تعالیٰ یومئذ لا تنفع الشفاعۃ الا لمن اذن لہ الرحمٰن ورضی لہ قولا وقولہ تعالیٰ ولا یشفعون الا لمن ارتضی وامثالھا۔

وبخبر الصادق صلی اللہ علیہ وسلم وقد جاءت الآثار التی بلغت بمجموعھا التواتر بصحۃ الشفاعۃ فی الآخرۃ لمذنبی المومنین واجمع السلف الصالح ومن بعدھم من اھل السنۃ علیھا ومنعت الخوارج وبعض المعتزلۃ منھا وتعلقوا بمذاھبھم فی تخلید المذنبین فی النار واحتجوا بقولہ تعالیٰ فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین وبقولہ تعالیٰ ما للظلمین من حمیم ولا شفیع یطاع وھذہ الآیات فی الکفار واما تاویلھم احادیث الشفاعۃ بکونھا فی زیادۃ الدرجات فباطل والفاظ الاحادیث فی الکتاب وغیرہ صریحۃ فی بطلان مذھبھم واخراج من استوجب النار۔

خلاصۂ مطلب یہ کہ جناب قاضی عیاض نے کہا ہے کہ اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت عقلاً

باب الاعتقاد فی الوعد والوعید

قال الشیخ اعتقادنا فی الوعد والوعید ان من وعدہ اللہ علیٰ عمل ثوابا فھو منجزہ ومن وعدہ علی عمل عقابا فھو فیہ

بائیسواں باب خدا تعالیٰ کے وعدہ اور وعید کے متعلق اعتقاد کا بیان

جناب شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں خدا کے وعدہ اور اس کی وعید کے بارے میں ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ خداوند عالم نے جس شخص سے اس کے اعمال صالحہ کے عوض اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا

جائز اور صریح آیات اور مخبر صادق علیہ السلام کی خبر کے مطابق شرعاً واجب ہے۔ بروز قیامت گنہگار مومنین کی شفاعت کی صحت کے متعلق اس قدر بکثرت آثار و اخبار وارد ہوئے ہیں، جو مجموعی طور پر حد تواتر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اہل سنت کے سلف صالح اور ان کے بعد والے طبقات نے اس کی صحت پر اجماع کیا ہے۔ ہاں خوارج اور بعض معتزلہ وعیدیہ و تفضیلیہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور اپنے نظریہ پر گنہگاروں کے ہمیشہ جہنم میں معذب ہونے پر بعض آیات قرآنیہ جیسے یہ کہ ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ فائدہ نہ دے گی۔ سے تمسک کیا ہے جو کہ غلط ہے۔ کیونکہ یہ آیتیں کفار کے بارے میں ہیں۔ انہوں نے احادیث شفاعت کی جو یہ تاویل کی ہے کہ یہ زیادتی ثواب کے لئے ہے یہ تاویل باطل ہے کیونکہ کتاب مسلم وغیرہ میں وارد شدہ احادیث کے الفاظ ان کے نظریہ کو بالصراحت باطل کر رہے ہیں۔ نیز انہی احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ گنہگار مسلمان جو مستحق جہنم ہوں گے وہ بالآخر سزا بھگت کر جہنم سے باہر نکالے جائیں گے۔ انتہی کلامہ بالاختصار۔

بائیسواں باب وعدہ اور وعید خداوندی کے متعلق عقیدہ

ہم ابھی اوپر سابقہ بحث کے آخر میں ذیل جواب شبہ اولیٰ اس مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس کے بغور پڑھ لینے سے اس اعتقاد کی حقانیت وصداقت روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتی ہے جو حضرت مصنف علام نے بیان فرمایا ہے اور وعدہ و وعید کا باہمی فرق بھی روشن و نمایاں ہو جاتا ہے۔ ہم نے مذکورہ بالا مقام پر واضح کر دیا ہے کہ جن لوگوں نے وعدہ و وعید کے درمیان فرق نہ کرتے ہوئے وعدہ و وعید ہر دو کی خلاف ورزی کو قبیح قرار دیا ہے اور اسی غلط نظریہ کی بنا پر شفاعت ایسے اہم دینی عقیدہ سے انکار بھی کیا ہے۔ انہوں نے سخت غلطی کی ہے نیز انہوں نے سیرت سلاطین زمان اور قوانین خدائے رحمٰن نیز فطرت انسان کے سمجھنے میں بھی ٹھوکر کھائی ہے ورنہ ہر صحیح الفطرت انسان سمجھ سکتا ہے کہ کسی اچھے کام کے انجام دینے پر انعام و اکرام کے وعدہ کی مخالفت یقیناً قبیح ہوتی ہے لیکن کسی برے کام پر سزا دینے اور عذاب و عقاب کرنے کی دھمکی دے کر

بالخیار ان عذبہ فبعدلہ وان عفی عنہ فبفضلہ وما ربک بظلام للعبید وقال عزّوجل انّ اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشآء واللہ اعلم

ہے وہ یقیناً اپنا وعدہ پورا کرے گا اور جس کو اس کے بداعمال کے عوض عذاب وعقاب کی وعید و تہدید فرمائی ہے تو اس کے متعلق اس کو پورا پورا اختیار ہے اگر اُسے عذاب میں مبتلا کرے تو یہ اس کا عدل ہے اور اگر اُسے معاف کر دے تو یہ اس کا فضل و کرم ہے تمہارا پروردگار اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا ارشادِ قدرت ہے کہ خداوند عالم شرک کرنے والوں کو ہرگز معاف نہیں کریگا لیکن اس کے علاوہ دیگر گناہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا

بعد میں معاف کر دینے کو عقلاء روزگار کے نزدیک شفقت و رحم دلی اور لطف و کرم پر محمول کیا جاتا ہے۔ پس جب وعدہ کی ایفا اور وعید و تہدید سے درگذر کرنا عقلاً ایک اچھی صفت ہے تو خدائے حکیم اسے کیونکر ترک کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں جب خدا نے اپنی مخلوق کو عفو و درگذر کا حکیمانہ حکم دیا ہے کہ واعفوا واصفحوا ان اللہ یحب۔ عفو و درگذر کرو کہ خدا درگذر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ تو پھر خود کس طرح اس اپنے پسندیدہ اور مرغوب عمل کو نظر انداز کر سکتا ہے؟ دوسروں کو کسی بات کا حکم دینا اور خود نہ کرنا یہ تو بندوں کے لئے بھی معیوب ہے۔ چنانچہ خلاق عالم واعظان غیر متعظ کی سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ اتامرون النّاس بالبر وتنسون انفسکم۔ کیا تم دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر جاتے ہو؟ تو خود کس طرح اس امرِ شنیع کا ارتکاب کر سکتا ہے؟ مزید براں قرآن و حدیث میں اس اعتقاد کی صحت کی طرف جابجا اشارات بلکہ تصریحات موجود ہیں۔ چنانچہ ایفائے عہد کے متعلق اس کا ارشاد ہے۔ ان اللہ لا یخلف المیعاد (پ س ع) بتحقیق خداوند عالم ہرگز وعدہ خلافی نہیں کرتا

اور عفو و درگذر کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا۔ اے میرے وہ بندو جنہوں نے گناہ کر کے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو کیونکہ وہ تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ نیز فرماتا ہے۔ ویکفر عنھم سیئاتھم (فتح) خدا ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ نیز فرماتا ہے۔ عسیٰ ربکم ان یکفر عنکم سیئاتکم (التحریم) قریب ہے کہ خدا تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ والذین امنوا وعملوا الصالحات لنکفرن عنھم سیئاتھم ولنجزینھم احسن الذی کانوا یعملون۔ (عنکبوت)

ثالث بحار الانوار میں بحوالہ محاسن برقی جناب امام جعفر صادق علیہ السلام اور وہ اپنے آباؤ اجداد طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے جناب رسولِ خدا سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ من وعدہ اللہ علی عمل ثوابًا فھو منجزلہ ومن اوعدہ علی عمل عقابًا فھو فیہ بالخیار۔ (کذا فی تفسیر الوسیلۃ الاحمدی) جس شخص سے

باب الاعتقاد
فیما یکتب علی العبد

قال الشیخ رہ اعتقادنا فی ذلک
انہ ما من عبد الا ولہ ملکان
موکلان علیہ یکتبان علیہ

تیسواں باب
بندوں کی کتابت اعمال کے متعلق اعتقاد

حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہر بندے کے ساتھ دو فرشتے خدا تعالیٰ کی طرف سے موکل و مقرر ہیں جو اس کے سب اعمال کو تحریر کرتے رہتے ہیں۔

خداوند عالم نے کسی عمل خیر پر کسی اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے وہ اسے ضرور پورا کرے گا اور جسے اس نے کسی عمل بد پر عقاب کرنے کی تہدید فرمائی ہے اس میں اسے اختیار ہے چاہے تو عقاب کرے اور چاہے تو اسے معاف کر دے۔ نفی نہ ہے کہ حکیم کی آیت مبارکہ میں ﴿ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ﴾ شرک معاف نہیں کرتا اور اس کے علاوہ جسے چاہے اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بلا توبہ مرنے والوں کے متعلق ہے۔ ورنہ توبہ کرنے سے بالاتفاق تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں وہ گناہ خواہ کسی نوعیت کے ہوں۔ (شرح تجرید) ۱۰ اذا وعد السخی انجز وعدہ - وان اوعد السخی فالعفو مانع

تیسواں باب بندوں کے نامہائے اعمال کے لکھے جانے کے متعلق عقیدہ کا بیان

ملائکہ کے موجود ہونے اور ان کی عبادت کے اقسام کا بیان

جہاں تک ملائکہ کے وجود کے اثبات اور ان کی حقیقت و ماہیت بیان کرنے اور اس سلسلہ میں دہریین کے انکار اور فلاسفہ کی تاویلات علیلہ کے ابطال کا تعلق ہے۔

اس موضوع پر ہم آئندہ چوبیسویں باب میں مفصل گفتگو کریں گے۔ سردست اجمالاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ اس امر پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ فرشتے خداوند عالم کی ایک نوری مخلوق ہیں جو یقیناً موجود ہیں۔ اور وہ اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ ان کی صحیح تعداد کا علم سوائے علام الغیوب (الا من علمہ اللہ) کے اور کسی کو نہیں ہے۔ جن و انس کی طرح ان کی غرض خلقت بھی خداوند عالم کی عبادت کرنا ہے۔ لیکن ان کی عبادت کی نوعیت ہماری عبادت سے قدرے مختلف ہے۔ ان کے اشغال و اعمال بھی متفرق ہیں۔ کسی کا کام تحمید و تمجید اور کسی کا وظیفہ تہلیل و تکبیر، کسی کا عمل رکوع و سجود اور کسی کا فعل قیام و قعود۔ کسی کی عبادت بنی نوع انسان کی حفاظت و حراست کرنا ہے۔ کسی کی اطاعت قبر میں اموات سے سوال کرنا۔ کسی کا شعار مارنا و جلانا اور کسی کا دثار تدبیر عالم کرنا۔ اسی طرح ایک گروہ کا وظیفہ مکلفین کے نیک یا بد اعمال کا لکھنا ہے۔ فالمدبرات امرا و المقسمات امرا جس گروہ کا جو وظیفہ و کام خدا تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے۔ اسی کی بجا آوری اور انجام دہی اس کی عبادت قرار دے دی گئی ہے۔ عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون۔ یہ فرشتے

جمیع اعمالہ ومن ھم بحسنۃ کتب لہ حسنۃ وان عملھا کتب لہ عشر حسنات فان ھم بسیئۃ لم یکتب علیہ حتی یعملھا وان عملھا اجل سبع ساعات فان تاب قبلھا لم یکتب علیہ وان لم یتب کتب علیہ سیئۃ واحدۃ والملکان

اگر کوئی شخص نیکی کرنے کا صرف ارادہ ہی کرلے تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور جب وہ اس نیکی کو بجا بھی لائے تو اس کے لئے دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں مگر اس کے برعکس، جب کوئی شخص کسی بدکاری کا ارادہ کرتا ہے تو جب تک وہ اسے کر نہ لے نامۂ اعمال میں کچھ نہیں لکھا جاتا بلکہ ارتکاب جرم کے بعد بھی اسے سات گھنٹوں تک مہلت دی جاتی ہے۔ پس اگر اس مدت کے اندر اندر توبہ کرلے تو پھر بھی برائی درج نہیں کی جاتی ان اس شانیں (الخ تفسیر قمی)

خدا کے وہ مکرم بندے ہیں جو کسی قول وفعل میں اس سے سبقت نہیں کرتے بلکہ وہ ہمیشہ خدا کے حکم سے عمل کرتے ہیں۔ جس کے ذمہ جو کام لگا دیا گیا ہے وہ اس کی انجام دہی میں بموجب ارشاد قرآنی لایفترون سستی وکاہلی نہیں کرتا وھم بامرہ یعملون۔ اور برابر اس کے حکم کی تعمیل میں مشغول رہتے ہیں۔ خداوند عالم نے ان کے ذمہ جو کام لگائے ہیں یہ تو کوئی مسلمان کہہ نہیں سکتا کہ خداوند عالم خود ان کاموں کو انجام دینے سے معاذ اللہ قاصر اور ملائکہ کی امداد و اعانت کا محتاج ہے۔ جیسا کہ بعض جہال وضلال کا خیال ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ بعض مصالح وحکم کی بنا پر اس نے ان کی عبادت ان امور کی انجام دہی قرار دی ہے۔ بنابریں کوئی صحیح العقیدہ مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ خداوند عالم نے کتابت اعمال اس لئے فرشتوں کے ذمہ لگائی ہے کہ اس طرح اپنے بندوں کے اعمال پر اطلاع حاصل کرے کہ بغیر اس طریقہ کے اسے ان اعمال کی اطلاع نہیں ہو سکتی تھی (معاذ اللہ) کیونکہ جس ذات ذوالجلال کی شان میں وارد ہو۔ وھو بکل شی علیم

وھو علیم بذات الصدور

لا یخفی علی اللہ منھم خافیۃ

لا یعزب عن علمہ مثقال ذرۃ فی الارض ولا فی السماء

جس خدا کا یہ ارشاد واجب الاعتقاد ہو نحن اقرب الیہ من حبل الورید

ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ عالم الغیب والشھادۃ

اس کے متعلق کس طرح اس قسم کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے؟

کراماً کاتبین کے تقرر کا وقت اور ان کا کام

مذکورہ بالا بیان کے پیش نظر یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ خدائے حکیم نے اپنی صوابدید کے مطابق بعض

یکتبان علی العبد کلّ شیٔ حتی یکتبان النفخ فی الرماد وقال اللہ و انّ علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون ومرّ امیرالمومنینؑ برجل وھو یتکلم بفضول الکلام فقال لہ یا ھذا الرّجل انک تملی علی ملکیک کتاباً الی ربک فتکلم

تو بہ نہ کرے تب صرف ایک گناہ درج کیا جاتا ہے یہ دونوں فرشتے بندے کا ہر فعل ضبط تحریر میں لے آتے ہیں حتیٰ کہ اگر وہ راکھ میں پھونک ہی مارے تو وہ اسے بھی لکھ لیتے ہیں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے تحقیق تم پر کریم فرشتے بطور محافظ مقرر ہیں جو تمہارے اعمال کو لکھتے ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے بھی ہیں ایک دفعہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام ایک ایسے شخص کے پاس سے گذرے جو لغو اور فضول باتیں کر رہا تھا آنجنابؑ نے اس سے فرمایا اے شخص! تو اپنے

ملائکہ کی یہ عبادت قرار دی ہے کہ جب بھی کوئی مرد یا عورت سن بلوغ کو پہنچ جائے تو اس کے پاس دو فرشتے بھیج دیتا ہے اور وہ اس کے ہر ہر قول و فعل کو خواہ اچھا ہو یا برا ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں اور فرشتوں کے اس گروہ کو قرآنی اصطلاح میں "کراماً کاتبین" کہا گیا ہے۔ وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون (سورۃ انفطار پ ۳۰ ع ۷) حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ بزرگ (فرشتے سب باتوں کے) لکھنے والے (کراماً کاتبین) جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب جانتے ہیں۔ نیز ارشاد قدرت ہے بلی و رسلنا لدیھم یکتبون ہاں ہمارے فرستادہ فرشتے (ان کے پاس ان کے اعمال) لکھتے ہیں؛ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے واذ یتلقی المتلقیٰن عن الیمین و الشمال قعید ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید (سورہ ق پ ۲۶ ع ۱۶) جب (وہ کوئی کام کرتا ہے تو) دو لکھنے والے (کراماً کاتبین) جو اس کے داہنے بائیں بیٹھے ہیں لکھتے ہیں کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔" (ترجمہ فرمان ؒ) اسی بنا پر جناب امیرالمومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں۔ ما تم عقل امرء الا وقد قل کلامہ (نہج البلاغہ) جب کسی آدمی کی عقل کامل ہو جاتی ہے تو اس کا کلام کم ہو جاتا ہے (فضول یاوہ گوئی کر کے اپنے دفتر اعمال کو سیاہ نہیں کرتا)

شب و روز کے کاتب اعمال فرشتے علیحدہ علیحدہ ہیں

روایات آئمہ اہل بیتؑ سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے۔ جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے کہ دن اور رات کے اعمال لکھنے والے فرشتے علیحدہ علیحدہ ہیں بلکہ بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرشتے اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ جو ایک مرتبہ آ کر واپس جاتے ہیں انہیں دوبارہ اس شخص کے پاس قیامت تک آنے کا پھر اتفاق نہیں ہوتا (انوار نعمانیہ) محدث جزائری مرحوم فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ خدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ستار العیوب نہیں چاہتا کہ ملائکہ کرام حضرات انسان کے گناہوں پر بار بار مطلع ہوں (حبل المتین)

بما یعنیک ودع مالا یعنیک وقال علی الرّجل المسلم یکتب محسنًا مادام ساکتًا فاذا تکلّم کتب امامحسنًا اومسیئًا وموضع الملکین من ابن آدم الترقوان صاحب الیمین یکتب الحسنات وصاحب الشمال

محافظ فرشتوں سے ایک ایسا نامہ لکھوا رہا ہے جو تیرے پروردگار کے سامنے پیش ہونے والا ہے اس لئے تو ایسی باتیں کر جو تیرے لئے مفید مطلب ہیں اور جو بے فائدہ باتیں ہیں ان سے پرہیز کر پھر فرمایا ایک مسلمان اس وقت تک برابر نیک لکھا جاتا ہے جب تک کہ کلام نہیں کرتا ہاں جب وہ سلسلۂ کلام شروع کر دیتا ہے تو (اپنے کلام کے اعتبار سے) نیکوکار لکھا جاتا ہے یا بدکار۔ ان دونوں فرشتوں کے رہنے کی جگہ ہنسلی والی دونوں ہڈیاں ہیں دائیں طرف والا فرشتہ نیکیاں اور بائیں طرف والا فرشتہ برائیاں لکھتا ہے

کراماً کاتبین نامۂ اعمال کو جناب رسولؐ خدا اور آئمہ ہدیٰ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

بہر حال دن والے فرشتے

اس کے اعمال کو اسی کیفیت سے جو متن رسالہ میں مذکور ہے صبح سے لے کر شام تک لکھتے ہیں اور شام کے وقت دفتر اعمال کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اور بعد ازاں یکے بعد دیگرے تمام آئمہ طاہرین کی خدمت میں لے جاتے ہیں۔ اور سب کے آخر میں حضرت امام زمانؑ کے حضور میں حاضر کرتے ہیں۔ امام زمانؑ نیکی اور بدی کے دونوں دفتروں کو ملاحظہ فرماتے ہیں اور اپنے نام لیواؤں کے صحیفۂ گناہ کو دیکھ کر ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ اور جو خطائیں قابلِ اصلاح ہوں ان کی اصلاح فرماتے ہیں۔ انہی سرکار کا اپنے نام لیواؤں کے نام یہ فرمان ہے۔ اذا اتتنی صحیفۃ سیئاتکم فلتکن صحیفۃ قابلۃ للاصلاح۔ جب تمہارا صحیفۂ گناہ میرے پاس آئے تو چاہیے کہ وہ قابلِ اصلاح ہو۔ ایسا نہ ہو کہ مجموعۂ اغلاط ہونے کی وجہ سے ناقابلِ اصلاح ہو) اس کے بعد نامۂ اعمال کو لے کر بارگاہِ قدرت میں پیش کرنے کی غرض سے آسمان پر چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے مطلب آیت مبارکہ قل اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ والمؤمنون (پ ۲۶ سورہ ۲ توبہ) کا۔ یعنی تم ہر عمل کئے جاؤ، تمہارے اعمال کو خدا دیکھ رہا ہے اور اس کا رسولؐ بھی دیکھ رہا ہے اور کچھ خالص مؤمنین یعنی آئمہ طاہرین بھی دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد رات والے فرشتے آجاتے ہیں جو صبح صادق تک وہ اعمالِ شب لکھتے ہیں۔ اوّل صبح صادق کے وقت چاروں فرشتوں کا مبارک اجتماع ہوتا ہے۔ رات والے فرشتے جا رہے ہوتے ہیں اور دن والے آ رہے ہوتے ہیں جو بندۂ مومن نماز صبح کو اوّل وقت پر ادا کرتا ہے۔ اس کو شب و روز والے دونوں فرشتے لکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے۔ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشھودًا (سورۃ بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۹) سورج ڈھلنے سے

يكتب السيئات وملكا النهار يكتبان عمل العبد فى النهار و ملكا الليل يكتبان على العبد فى الليل۔	دن والے فرشتے بندہ کے دن والے اعمال اور رات کے فرشتے اعمال شب لکھتے ہیں۔

لے کر (ظہر عصر) رات کی تاریکی چھا جانے تک (مغرب وعشاء) نماز قائم کرو۔ نیز صبح کی نماز پڑھو۔ کیونکہ نماز صبح کے وقت ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔ اور یہ رات والے فرشتے بھی بدستور سابق نامہ ہائے اعمال کو آں حضرت کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ملا محمد صالح مازندرانی قدس سرہ شرح اُصول کافی میں عرض اعمال والی احادیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ظاهر احاديث هذا الباب ان اعمال كل احد تعرض على رسول الله صلى الله عليه و آله مفصلة فى كل يوم وهذا يحتمل وجهين احدهما ان تعرض عليه اعمال اليوم والليلة معا وقت الصبح ويشعر به هذا الخبر وثانيهما ان تعرض اعمال الليل فى الصباح واعمال النهار فى المساء لانهما وقتان لرفع الاعمال ويشعر به خبر عبد الله بن الزيات عن الرضا عليه السلام (شرح اصول كافی ج ۵ ص۳۰) یعنی اس باب کی احادیث مبارکہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شخص کے تمام اعمال آں حضرتؐ پہ ہر روز پیش ہوتے پیش ہوتے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ آیا شب و روز کے اعمال صرف ایک بار بوقت صبح پیش ہوتے ہیں، جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہے۔ یا دو بار پیش ہوتے ہیں۔ بایں طور پر کہ شام کے صبح کے وقت اور دن کے شام کے وقت جیسا کہ عبداللہ بن زیات کی روایت سے ظاہر ہے۔ کیونکہ یہی رفع اعمال کے دو وقت ہیں۔ یہ دونوں احتمال ہیں بہر کیف یہ سلسلہ مبارکہ انسان کے آخری لمحاتِ حیات تک برابر جاری و ساری رہتا ہے۔ ذلك تقدير العزيز الحكيم۔

تقرر کراماً کاتبین اور کتابت اعمال کے بعض اسرار و رموز کا بیان

اس کتابت اعمال کے حقیقی اسرار و رموز کا علم تو اسی خالق حکیم کو ہے جس نے یہ سلسلہ مبارکہ جاری کیا ہے۔ مگر جاری مذکورہ بالا احادیث مبارکہ سے بھی بعض اسرار کا سراغ مل جاتا ہے کہ اس سلسلہ کے اجراء کا ایک راز تو یہ ہے کہ نبی و امام کو اُمت کے اعمال سے آگاہ کیا جا سکے (اگرچہ وہ توجہ فرمائیں تو اس سلسلہ کے بغیر بھی براہ راست حالات معلوم کر سکتے ہیں) اس کا دوسرا راز جو بعض آیات و روایات سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بروز قیامت جو شخص بھی جنت یا جہنم کا مستحق قرار پائے گا۔ اس کا یہ استحقاق علی رؤس الاشہاد اس کے اس نامۂ اعمال کی روشنی میں جو معصوم فرشتوں کا لکھا ہوا ہے۔ واضح و آشکار کیا جائے گا تا کہ کوئی شخص خدائے تعالیٰ

یا کراماً کاتبین کے متعلق کسی قسم کی بے جا رعایت یا کسی پر ظلم و زیادتی کا خیال فاسد نہ کر سکے۔ ارشادِ قدرت ہوگا۔ اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم حسیباً۔ اے انسان اپنے نامۂ اعمال کو پڑھ آج تو خود اپنے حساب و کتاب کے لئے کافی ہے۔ اور جہاں تک ان فرشتوں کے تقرر کی مصلحت کا تعلق ہے اس سلسلہ میں حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام کی اس حدیث کا بیان کر دینا ہی کافی ہے جسے صاحب تفسیر صافی نے احتجاج طبرسی سے نقل کیا ہے۔ آنجناب سے یہی سوال کیا گیا تھا کہ جب خداوند عالم تمام ظاہری و باطنی اُمور کو خود جانتا ہے تو پھر اس نے یہ فرشتے کیوں مقرر فرمائے ہیں؟ آنجناب نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے ان فرشتوں سے یہ خدمت لی ہے اور ان کو اپنی مخلوق پر گواہ قرار دیا ہے تاکہ بندے یہ خیال کر کے کہ اللہ تعالیٰ کے ملازم ان کے ساتھ ہیں۔ اطاعتِ خدا پابندی سے بجا لائیں اور معصیت سے رکے رہیں۔ اور اکثر بندے ایسے ہیں کہ کسی بُرائی کا ارادہ کرتے ہیں تو فرشتوں کی موجودگی یاد کر کے رُک جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں دیکھتا ہے اور جو ہم پر گواہ مقرر ہیں وہ بھی ہمیں دیکھتے ہیں۔

چالیس برس کے بعد نگرانی کا شدید ہونا

کتابتِ اعمال کا یہ سلسلہ اگرچہ سنِ بلوغ کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے لیکن بعض احادیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ سنِ بلوغ سے لے کر چالیس سال تک حکم خداوندی کے تحت گرفت زیادہ شدید نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس عمر میں گناہ کرنے کے دواعی و محرکات بہت زیادہ ہوتے ہیں لیکن جب چالیس سال مکمل ہو جائیں اور رخشِ عمر اس سے آگے بڑھنے لگے تو فرشتوں کو وحی الٰہی ہوتی ہے کہ اب نگرانی کڑی اور گرفت شدید کر دو۔ اور ہرگز اس کی کوئی رعایت نہ کرو اور یہ سختی اس لئے ہے کہ اس عمر کے بعد شہوت اور گناہ کے محرکات طبعاً کم ہو جاتے ہیں لیکن جو شخص اس کے باوجود بھی اس وقت گناہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت ہی شقی و بدبخت اور دین کے معاملہ میں سہل انگیز ہے بعض روایات میں وارد ہے۔ کہ جب انسان کی داڑھی سفید ہو جائے اور اب بھی بدستور سابق گناہوں میں مشغول رہے تو شیطان اس کے سامنے آکر کہتا ہے۔ بابی وجھاً لا یفلح۔ میرا باپ قربان ہو ایسے چہرہ پر جو کبھی فلاح و رستگاری حاصل نہیں کرے گا اور کہتا ہے تو ہی تو میری اُمید اور آرزو ہے۔ معصوم فرماتے ہیں۔ انی لاعجب کل العجب من رجلین واللہ یبغضھما فقیر متکبر و شیخ زان۔ مجھے دو شخصوں سے سخت تعجب ہے جنہیں خداوند عالم دشمن سمجھتا ہے ایک وہ جو باوجود فقیر و نادار ہونے کے تکبر کرے اور دوسرا وہ جو باوجود بڑھاپے کے زنا کرے۔

حالتِ مرض میں بدستور اعمال صالحہ کا لکھا جانا اور گناہوں کا نہ لکھا جانا

خداوند عالم کے انعام و احسان کو کون شمار کر سکتا ہے (و ان تعدوا نعمۃ اللہ لاتحصوھا) متعدد احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب انسان بیمار پڑ جاتا ہے تو خداوند عالم نیکیاں لکھنے والے فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ جب تک یہ بندہ میری قید میں گرفتار ہے اس کے وہ تمام اعمالِ صالحہ بدستور

لکھتے رہو جو یہ صحت و سلامتی کے وقت بجالاتا تھا۔ اور جب تک یہ تندرست نہ ہو جائے اس کی کوئی برائی نہ لکھو اس مضمون کی بکثرت روایات اصول کافی بحار الانوار ج ۱۳ وغیرہ میں موجود ہیں۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا کہ جب ملائکہ بارگاہِ رب العزت میں جاتے ہیں۔ تو ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندہ کے متعلق کیا لکھ کر لائے ہو۔ فرشتے عرض کرتے ہیں۔ فقط اس کا شکوہ و شکایت ہی معرض تحریر میں لائے ہیں۔ اس وقت ارشادِ باری ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے بندے کو قید میں مبتلا کردوں اور پھر اسے شکوہ و شکایت سے بھی روک دوں تو اس طرح میں نے اپنے بندے کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اے فرشتو! جب تک وہ بیمار ہے اس کے اعمال صالح اسی طرح لکھتے رہو۔ جس طرح اس کی صحت کی حالت میں لکھتے تھے۔ اور جس وقت تک میں اسے قید سے رہا نہ کروں تم اس کی کوئی بدی درج نہ کرو۔

اسی طرح دوسری روایت میں جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا اذا مرض المومن اوحی اللہ عزّوجلّ الی صاحب الشمال لاتکتب علی عبدی مادام فی حبسی ووثاقی ذنبًا ویوحی الی صاحب الیمین ان اکتب لعبدی ماکنت تکتب لہ فی صحتہ من الحسنات" یعنی جب بندۂ مومن بیمار ہو جاتا ہے تو خداوند عالم بائیں طرف والے فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ جب تک میرا بندہ میری قید میں مبتلا ہے اس کا کوئی گناہ لکھ اور دائیں طرف والے فرشتے کو وحی فرماتا ہے کہ تو بدستور اس کی وہ نیکیاں لکھتا رہ۔ جو اس کی صحت کی حالت میں لکھتا تھا ع

اس مرحمت پہ کون نہ مرجائے اے خدا!

ایک نیکی کے عوض دس نیکیاں اور سات گھنٹے تک برائی کے نہ لکھے جانے کا بیان

یہ امر بھی متعدد روایات سے ثابت ہے جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے کہ خدا نے اپنے خصوصی مراحم والطاف سے کتابتِ اعمال کا سلسلہ کچھ اس طرح قائم کیا ہے کہ نیکی کرنے سے قبل فقط اس کا ارادہ کرنے سے ہی ایک نیکی نامۂ اعمال میں درج کرلی جاتی ہے۔ اور کرنے کے بعد ایک کی دس لکھی جاتی ہیں۔ اور برائی بجالانے کے بعد بھی سات گھنٹے تک نہیں لکھی جاتی۔ اگر اس اثناء میں گنہگار توبہ کرلے تو فبہا ورنہ ایک کی ایک کی ایک برائی درج کی جاتی ہے۔ (ثالث بحار الانوار ملاحظہ ہو) وغیرہ

یاایھا الانسان ماغرک بربک الکریم۔

باب الاعتقاد فی العدل

قال الشیخ ابو جعفرؒ ان اللہ تبارک تعالیٰ امرنا بالعدل و عاملنا بما ھو فوقہ و ھو التفضل و ذلک

چوبیسواں باب (عدل خداوندی کے متعلق اعتقاد کا بیان)

حضرت شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے ہمیں عدل و انصاف کرنے کا حکم دیا ہے اور وہ خود ہمارے ساتھ وہ عمدہ سلوک کرتا ہے جو عدل سے بھی بڑھ کر ہے۔ جس کا نام تفضل ہے

چوبیسواں باب، خداوند عالم کے عدل کے متعلق عقیدہ

عدل کے لغوی و اصطلاحی معنیٰ کی وضاحت

عدل کے لغوی معنیٰ ہیں وضع الشئی فی محلہ۔ یعنی ہر شے کو اس کے محل و مقام پر رکھنا۔ اور اس کے بالمقابل ظلم کے معنی ہیں، وضع الشئی فی غیر محلہ۔ کسی شے کو بے محل رکھنا۔ عرف عام میں عدل کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جو شخص اپنے عمل و کردار پر جس قدر جزا کا مستحق ہے۔ اسے اسی قدر جزا دینا اور ظلم یہ ہے کہ اُسے اس کے استحقاق سے کم دینا۔ لہٰذا خداوند عالم کے عادل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عقلاء کی نگاہ میں جو کام عقلاً واجب اور مستحسن ہیں ان کو ترک نہیں کرتا اور نہ ہی کسی فعل شنیع و قبیح کا ارتکاب کرتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ فرزند رسول! عدلِ خداوندی کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا ان لا تنسب الی بارئک ما لامک علیہ۔ یعنی اپنے خالق و مالک کی طرف کسی بھی ایسے قول یا فعل کی نسبت نہ دو جس پر اس نے تمہاری ملامت کی ہے (توحید شیخ صدوقؒ)

عقیدۂ عدل باری ضروریات مذہب شیعہ میں سے ہے

یہ اعتقاد رکھنا کہ خداوند عالم عادل ہے اور ظالم نہیں ہے۔ بایں معنی کہ نہ واجب کو ترک کرتا ہے اور نہ کسی عقلی فعل قبیح کا ارتکاب کرتا ہے۔ نہ اپنے احکام میں ظلم و جور کرتا ہے اور نہ اپنی قضا و قدر میں زیادتی، نہ کسی کو اس کی طاقتِ برداشت سے زیادہ تکلیف دیتا ہے اور نہ بالکل شتر بے مہار کی طرح ان کو مطلق العنان چھوڑتا ہے۔ فرمانبرداروں کو ضرور جزا و ثواب دیتا ہے۔ اور گنہگاروں کو اس نے عذاب جہنم کی وعید و تہدید فرمائی ہے اب اسے اختیار ہے چاہے تو ان کو سزا دے (یہ اس کا عین عدل و انصاف ہے) اور چاہے تو معاف کر دے۔ یہ اس کا لطف و کرم ہے۔ نیز وہ اپنے بندوں کو افعالِ خیر یا شر پر مجبور بھی نہیں کرتا۔ ان ضروریاتِ مذہب شیعہ اور عقائدِ صحیحہ میں سے ہے جن کا منکر دائرۂ مذہب سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اسی عقیدہ پر توحید کی تکمیل اور دیگر بہت عقائد مبنیہ

انہ عزوجل یقول من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا ومن جاء بالسیئۃ فلا یجزی الا مثلھا وھم لا یظلمون والعدل

اس امر کی دلیل یہ ہے کہ وہ خود فرماتا ہے جو شخص ایک نیکی بجا لائے گا اُسے دس گنا نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا اور جو ایک برائی کریگا اُسے صرف ایک ہی بدی کی سزا ملے گی اور ان پر ہرگز ظلم وستم نہیں کیا جائے گا۔ عدل تو یہ تھا کہ ایک نیکی کے عوض ایک نیکی کا ثواب

مثلاً نبوت وامامت اور قیامت کا اثبات موقوف ہے کیونکہ جب تک خالق عالم کو عادل تسلیم نہ کیا جائے اس وقت تک برابر یہ احتمال قائم رہے گا کہ ممکن ہے من جانب اللہ جس قدر انبیاءؑ و مرسلین آتے رہے ہیں وہ (معاذ اللہ) سب کے سب اپنے دعوے میں صادق نہ ہوں۔ اور خدا نے (خاک بدہن قائل) فعل قبیح کا ارتکاب کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر کر کے ان کی غلط تصدیق کر دی ہو۔ اس طرح ان کی نبوت مشکوک ہو کر رہ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب اس طرح نبوت انبیاء ثابت نہ ہو سکی تو اوصیاء کی وصایت وامامت کیونکر ثابت ہو سکے گی۔ اسی طرح پھر خدا کے وعدہائے جنت اور وعید ہائے جہنم سے بھی اعتماد اُٹھ جائے گا۔ اور یہی انجام عقیدۂ قیامت کا ہوگا۔ جب وہ عادل ہی نہیں تو پھر نیکوں کو جزا اور بُروں کو سزا دینا کیا ضروری ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس طرح تمام نظام شریعت ہی درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور انبیاء علیہم السلام کی غرض بعثت فوت ہو جائے گی۔ اور مقصدِ خلقت ضائع ہو جائے گا۔ لیکن بایں ہمہ حضرات مجبرہ اور اشاعرہ خداوند عالم کو عادل نہیں سمجھتے۔ اور نہ وہ کسی ایسے حسن وقبح کے قائل ہیں جن کے ترک یا ارتکاب پر خدا پر اعتراض وارد ہو۔ یہ حضرات مذکورہ بالا مفاسد اور خرابیوں سے ہرگز گلو خلاصی نہیں کرا سکتے اور نہ ہی ان اشکالات کا کوئی معقول جواب دے سکتے ہیں۔

بہر حال اگرچہ عدل باری کے اثبات میں بہت کچھ عقلی ونقلی ادلّہ قائم کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ اختصار مدِ نظر ہے اور سابقہ بحث توحید میں اس پر فی الجملہ تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ تفصیل کے لئے اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہاں اسی مقدار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

خداوند عالم کے افعال کا مبنی بر تفضل ہونا

متعدد آیات وروایات سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم اس قدر رؤف ورحیم ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ فقط عدل کا برتاؤ ہی نہیں بلکہ تفضل ولطف والا سلوک کرتا ہے کیونکہ عدل تو اس امر کا نام ہے کہ جو شخص جس قدر جزا یا سزا کا مستحق ہے۔ اسے اسی قدر جزا یا سزا دی جائے۔ اور تفضل یہ ہے کہ اجر وثواب تو استحقاق سے زائد عطا کیا جائے لیکن سزا استحقاق سے کم دی جائے۔ قرآن وحدیث پر نظر رکھنے والے حضرات پر یہ حقیقت واضح ہے کہ خداوند عالم کے افعال تفضل پر مبنی ہے۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام دعائے وداع ماہ رمضان میں فرماتے ہیں۔ انک بنیت افعالک علی التفضل واجریت قدرتک علی التجاوز (صحیفہ کاملہ) بار الہا! تو نے اپنے افعال کی بنا تفضل ومہربانی پر اور اپنی قدرت کی

هو ان یثیب بالحسنة الحسنة ویعاقب علی السیئة السیئة قال النبیؐ لا یدخل رجل الجنة بعملہٖ الا برحمة اللہ عزوجل

اور ایک بدی کے بدلے ایک بدی کا عقاب کرتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ کوئی بھی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ رحمتِ خداوندی اس کے شاملِ حال نہ ہو۔

بنا عفو و درگذر پر رکھی ہے۔ اور اس امر کے ثبوت میں قرآن مجید کی بیسیوں آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن میں سے ایک آیت تو وہی ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہے کہ جو شخص ایک نیکی کرتا ہے۔ اسے اس کا دس گنا اجر و ثواب ملتا ہے۔ اور جو ایک بُرائی کرتا ہے اُسے ایک ہی برائی کی سزا دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری آیت وہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ راہِ خدا میں کچھ مال صرف کرتے ہیں۔ انہیں اس کا سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اجر و ثواب ملتا ہے چنانچہ ارشادِ قدرت ہے۔ مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل اللہ کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة واللہ یضاعف لمن یشآء (سورۃ بقرہ پ۳ ع ۴) جو لوگ اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثل اس دانہ کی سی مثل ہے جس کی سات بالیاں نکلیں (اور) ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس کے لئے چاہتا ہے دوگنا کر دیتا ہے اور خدا بڑی گنجائش والا (اور ہر چیز سے) واقف ہے۔

تیسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ اضعافاً کثیرة (سورۃ بقرہ پ۲ ع ۱۶) ہے کوئی جو خدا کو قرض حسنہ دے تاکہ خدا اس کے مال کو اس کے لئے کئی گنا بڑھا دے۔

چوتھے مقام پر ارشاد ہوتا ہے للذین احسنوا الحسنیٰ و زیادة (سورۃ یونس پ۱۱ ع ۸) جن لوگوں نے بھلائی کی ان کے لئے بھلائی ہے اور کچھ بڑھ کر۔

اسی طرح کئی احادیث میں یہ مذکور ہے کہ جب آدمی کسی نیک کام کے انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسی ارادہ پر ایک نیکی اس کے نام لکھ دی جاتی ہے اور جب کر گذرتا ہے تو ایک کی دس لکھی جاتی ہیں اور جب برائی کی انجام دہی کا ارادہ کرے تو جب تک نہ کرلے اس کے نامۂ اعمال میں وہ برائی درج نہیں کی جاتی بلکہ ارتکابِ معصیت کے بعد بھی سات گھنٹے تک مہلت دی جاتی ہے۔ اگر اسی اثناء میں توبہ کرلے تو ہرگز وہ گناہ نہیں لکھا جاتا۔ اور اگر لکھ بھی لیا جائے تب بھی بعد ازاں توبہ و استغفار کرنے یا شفاعتِ کبریٰ کی وجہ سے اسے وہ جرم معاف کر دیا جاتا ہے (اس مضمون کی بکثرت روایات تفسیر برہان ج ۲ میں مذکور ہیں)

بہرکیف یہ حقیقت اسلامیات پر نگاہ رکھنے والے حضرات پر واضح و عیاں ہے۔ اس لئے اس پر زیادہ شواہد و دلائل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ؏ آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بیان است

تفضل الٰہی کے بغیر کوئی شخص نجات حاصل نہیں کر سکتا

ہم نے مبحث شفاعت میں اپنے اس نظریہ کا اظہار کیا تھا کہ کوئی بھی شخص خواہ جس قدر متقی و پرہیزگار ہو اس کا خداوند عالم کے تفضل و تکرم اور جناب رسول خدا اور آئمہ ہدیٰ کی شفاعتِ کبریٰ کے بغیر داخل جنت ہونا مشکل ہے۔ اس باب کے آخر میں نیز اٹھارہویں باب میں ایک مقام پر جناب مصنف علامؒ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے۔ اس لئے ہم یہاں اس پر کچھ مزید مختصر سا تبصرہ کرتے ہیں اس امر کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ کوئی شخص چاہے جتنا بھی عبادت گذار و شب زندہ دار ہو مگر جب اس کے حسنات کا خداوند عالم کے احسانات و انعامات کے ساتھ موازنہ کیا جاتا تو یقیناً خدائی نعمات کا پلہ بہت بھاری نظر آتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے۔ وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا۔ اگر تم خداوند عالم کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جب بنص آیت قرآنی کوئی شخص خداوند عالم کی نعمتوں کو شمار بھی نہیں کر سکتا تو ان کا شکریہ کس طرح ادا کر سکتا ہے؟ اور جب اس کی نعمتوں کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا تو جنت کا استحقاق کس طرح پیدا کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر اطاعت الٰہی بجا لاتا ہے تو یہ بھی خدائے کریم کی ایک نعمت ہے جس پر اس کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ چنانچہ بعض اخبار و آثار میں وارد ہے کہ جب حضرت ایوبؑ ضیاع مایہ و شماتت ہمسایہ سے دل تنگ ہو گئے تو بارگاہ ایزدی میں عرض کیا۔ یا اللہ ہر حالت میں ہی تو تیرا ایک عبد شاکر تھا اور تو نے مجھے اس قدر مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا ہے۔ ارشادِ قدرت ہوا اے ایوبؑ ذرا بتاؤ یہ شکر ادا کرنے کی تجھے توفیق کس نے دی تھی؟ عرض کیا بارالٰہا! تو نے۔ ارشاد ہوا پھر تم یہ احسان کیا جتا رہے ہو کہ میرا شکر ادا کرتے ہو۔ (خزینۃ الجواہر)

ارشادِ قدرت ہے یمنون علیك ان اسلموا قل لا تمنوا علی اسلامکم بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان۔ اے رسول یہ لوگ تیرے اوپر احسان دھرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ان سے کہہ دو کہ مجھ پر احسان نہ دھرو بلکہ یہ تو اللہ سبحانہٗ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی طرف راہبری کی ہے ع

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی   منت ازو شناس کہ بخدمت گذاشتت

اسی لئے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اپنی دعائے استقالہ ذنوب و طلب عفو از عیوب میں بطور تعلیم المتہ فرماتے ہیں۔ یا الٰھی لو بکیت الیك حتی تسقط اشفار عینی و انتحبت حتی ینقطع صوتی و قمت لك حتی تنتشر قدمای و رکعت لك حتی ینخلع صلبی و سجدت لك حتی تتفقا حدقتای و اکلت تراب الارض طول عمری و شربت ماء الرماد آخر دھری و ذکرتك فی خلال ذلك حتی یکل لسانی ثم لم ارفع طرفی الی آفاق السماء استحیاء منك ما استوجبت بذلك محو سیئة واحدة من سیاتی و ان کنت تغفرلی حین استوجب مغفرتك و تعفو عنی حین استحق عفوك فان ذالك غیر واجب لی باستحقاق و لا

انا اهل له باستیجاب اذ کان جزائی منک فی اوّل ما عصیتک النّار فان تعذّبنی فانت غیر ظالم لی الٰهی فاذ قد تغمّدتنی بسترک فلم تفضحنی وتانّیتنی بکرمک فلم تعاجلنی و حلمت عنّی بتفضّلک فلم تغیّر نعمتک علیّ ولم تکدّر معروفک عندی فارحم طول تضرّعی وشدّة مسکنتی وسوء موقفی (صحیفہ کاملہ ص ۱۶۳ ترجمہ جناب مفتی جعفر حسین صاحب)

بارالٰہا یہ میری گردن ہے۔ جسے گناہوں نے جکڑ رکھا ہے۔ تو رحمت نازل فرما محمدؐ اور ان کی آلؑ پر اپنے عفو و درگذر سے اسے آزاد کر دے۔ اور یہ میری پشت ہے جسے گناہوں نے بوجھل کر دیا ہے تو رحمت نازل فرما محمدؐ اور ان کی آلؑ پر اور اپنے لطف و انعام کے ذریعہ سے اسے ہلکا کر دے۔ بارالٰہا اگر میں تیرے سامنے اتنا روؤں کہ میری آنکھوں کی پلکیں جھڑ جائیں۔ اور اتنا چیخ چیخ کر گریہ کروں کہ آواز بند ہو جائے اور تیرے سامنے اتنی دیر کھڑا رہوں کہ دونوں پیروں پر ورم آجائے اور اتنے رکوع کروں کہ ریڑھ کی ہڈیاں اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں اور اس قدر سجدے کروں کہ آنکھیں اندر کو دھنس جائیں۔ اور عمر بھر خاک چاٹتا رہوں۔ اور زندگی بھر گدلا پانی پیتا رہوں اور اس اثنا میں تیرا ذکر اتنا کروں کہ زبان تھک کر جواب دے جائے پھر شرم و حیا کی وجہ سے آسمان کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤں تو اس کے باوجود میں اپنے گناہوں میں سے ایک گناہ کے بخشے جانے کا بھی سزاوار نہ ہوں گا۔ اور اگر تو مجھے بخش دے جب کہ میں تیری مغفرت کے لائق قرار پاؤں۔ اور مجھے معاف کر دے جب کہ میں تیری معافی کے قابل سمجھا جاؤں تو یہ میرے استحقاق کی بنا پر لازم نہیں ہوگا۔ اور نہ میں استحقاق کی بنا پر اس کا اہل ہوں۔ کیونکہ میں نے پہلے پہل تیری معصیت کی تو میری سزا جہنم طے تھی لہٰذا تو مجھ پر عذاب کرے۔ تو میرے حق میں ظالم نہیں ہوگا۔ اے میرے معبود! جب کہ تو نے میری پردہ پوشی کی۔ اور مجھے رسوا نہیں کیا۔ اور اپنے لطف و کرم سے نرمی برتی۔ اور عذاب میں جلدی نہیں کی اور اپنے فضل سے میرے بارے میں حلم سے کام لیا ہے اور اپنی نعمتوں میں تبدیلی نہیں کی۔ اور نہ اپنے احسان کو مکدر کیا ہے تو میری اس طویل تضرع و زاری اور سخت احتیاج اور موقف کی بدحالی پر رحم فرما۔ پس معلوم ہوا کہ اگر خداوند عالم لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے یا انہیں نیکیوں کی جزا دیتا ہے تو یہ محض اس کا تفضل و احسان ہے ورنہ کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے مستحق جنت نہیں قرار پا سکتا۔

اس سلسلہ میں بھی حضرت امام رابعؑ کی دعائے اعتراف ذنب و طلب توبہ ہماری راہبری کرتی ہے۔

فرماتے ہیں یا من وعدهم علی نفسه بتفضله حسن الجزاء۔ اے وہ خدا جس نے بندوں کو جزائے خیر دینے کا جو ذمہ لیا ہے وہ محض تفضل کی بنا پر ہے۔ اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ فرمائش جو متن رسالہ میں اسی باب کے آخر میں مذکور ہے۔ وہ بھی اس مسئلہ میں نص صریح اور دلیل فصیح ہے۔

وفیه کفایة لمن لہ ادنیٰ درایة۔

باب الاعتقاد فی الاعراف

قال الشیخ اعتقادنا فی الاعراف انه سور بین الجنة والنار

پچیسواں باب (اعراف کے متعلق اعتقاد)

حضرت شیخ ابن بابویہ فرماتے ہیں کہ اعراف کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک دیوار

پچیسواں باب، اعراف کے متعلق عقیدہ

فی الجملہ مقام اعراف کے موجود ہونے کا عقیدہ اتفاقی ہے۔ ہاں البتہ اس مقام پر تین اُمور کے متعلق علمائے اسلام کے درمیان قدرے اختلاف ہے (۱) حقیقتِ اعراف کیا ہے؟ (۲) اصحابِ اعراف کون حضرات ہیں؟ (۳) مقام اعراف میں کون لوگ رہیں گے؟ چنانچہ حضرت مصنف علام نے ان تینوں اُمور کی طرف اجمالاً اشارہ فرمایا ہے۔ ہم ذیل میں اسی موضوع پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

حقیقتِ اعراف کیا ہے؟

اعراف کی حقیقت کے بارے میں چند قول ہیں۔

اوّل۔ یہ کہ اس سے مراد وہ "سور" (دیوار) ہے جو جنت و جہنم کے درمیان ہوگی۔ یہی قول علماء میں مشہور ہے۔ اور اسی قول کو حضرت مصنف علام نے اختیار کیا ہے اور اس قول کی تائید آیات و روایات سے بھی ہوتی ہے۔ ارشادِ قدرت ہے۔ فضرب بینھم بسور له باب باطنه فیه الرحمة و ظاهره من قبله العذاب (سورۂ حدید پ ۲۷ ع ۱۸) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا (اور) اس کے اندر کی جانب تو رحمت ہے اور باہر کی طرف عذاب۔ (اس "سور" کی تفسیر اعراف سے کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ وبینھما حجاب (سورۂ اعراف پ ۸ ع ۱۲) یعنی اہل جنت اور اہل جہنم کے درمیان حجاب (پردہ) ہوگا۔ اس حجاب کی تفسیر بھی اعراف سے کی گئی ہے

دوئم۔ یہ کہ اعراف سے مراد اسی حصار و حجاب کے کنگرے ہیں۔

سوم۔ یہ کہ اس سے مراد وہ ٹیلے ہیں جو جنت و جہنم کے درمیان واقع ہیں۔

چہارم۔ یہ کہ اس سے مراد پل صراط ہی ہے۔

پنجم۔ یہ کہ اس سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہیں۔

سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے۔ "و اول اشہر و اظہر است" (حق الیقین) اگر بنظر غائر ان اقوال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ان میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے بلکہ سب کا مآل و مرجع ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔ فقط اندازِ بیان مختلف ہے۔ مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ جنت و

وعلیہ رجال یعرفو ن کلاً بسیماھم والرّجال ھم النبیؐ واوصیاۂ	ہے جس پر چند مقدس بزرگوار تشریف فرما ہوں گے جو ہر شخص کو اس کی نشانیوں سے پہچان لیں گے اور یہ حضرات جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان کے اوصیاء برحق ہوں گے

کے درمیان ایک ایسا مقام ہے۔ جس میں نہ تو لذائذ جنت موجود ہیں اور نہ ہی شدائد جہنم بلکہ وہ ایک بین بین مقام ہے جسے مختلف اسماء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ جنت وجہنم کے درمیان حائل ہے اسے "سور" و "حجاب" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ وہ ہماری دیواروں کی طرح باریک نہیں بلکہ کافی وسیع اور قابلِ رہائش ہے اس کو مکان سے تعبیر کر دیا گیا ہے اور اس وجہ سے کہ وہ بلند و بالا اور ٹیلہ نما ہے۔ اسے ٹیلہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور چونکہ اعراف جمع ہے عرف (بفتح العین) کی جس کے معنی لغتِ عرب میں یالِ اسپ اور تاج خروس کے ہیں۔ اس مناسبت سے سور و حصار کے بالائی حصہ (کنگروں) کو اعراف کہا گیا ہے۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ ان اقوال میں کوئی بنیادی اختلاف بلکہ ان سب نظریات کی بازگشت اسی طرف ہے کہ اعراف وہ مقام ہے جو نہ تو پوری طرح جنت کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے پوری طرح جہنم قرار دیا جا سکتا ہے۔ کما قیل ؎

حوران بہشتی را اعراف بود دوزخ   از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

باقی رہا ان اقوال چہارگانہ کا قول پنجم کے ساتھ اختلاف تو یہ فقط تفسیر ظاہری و باطنی والا اختلاف ہے یعنی پہلے چار قول اعراف کی ظاہری تفسیر ہیں اور پانچواں قول اس کی باطنی تفسیر ہے۔ چنانچہ مولانا سید عبداللہ شبر نے حق الیقین میں بعض ایسی روایات نقل کرنے کے بعد جن میں آلِ اہل بیت کو اعراف سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے۔ دلفھم من ھذا الخبر ونحوہ ان الاعراف یطلق علی معان عدیدۃ وبہ یجمع بین الاخبار واللہ اعلم۔ یعنی اس حدیث اور اس قسم کی دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراف کا اطلاق متعدد معانی پر ہوتا ہے۔ اور اس طرح مختلف احادیث میں جمع ہو جاتی ہے۔ واللہ العالم۔

اصحاب اعراف کون بزرگوار ہوں گے؟

اتنا تو مسلّم ہے کہ مقامِ اعراف پر کچھ حضرات بروز قیامت موجود ہوں گے جو تمام لوگوں کو علامات سے پہچانتے ہوں گے کہ ان میں جنتی کون ہیں اور جہنمی کون؟ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے وعلی الاعراف رجال یعرفون کلاً بسیماھم (سورہ اعراف پ ۸ ع ۱۲) یعنی مقامِ اعراف میں کچھ لوگ موجود ہوں گے جو ہر شخص کو اس کی علامات سے پہچان لیں گے کہ وہ جنتی ہے یا دوزخی ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں اگر کچھ اختلاف ہے تو یہ ہے کہ وہ بزرگوار کون ہوں گے؟ علماء امامیہ کثرہم اللہ فی البریہ میں زیادہ مشہور یہ قول ہے جیسا کہ متن رسالہ میں اس سلسلہ میں مذکور ہے کہ "ان رجال"

ولا یدخل الجنّة الّا من عرفھم وعرفوہ و ولا یدخل النار الا من

جنّت میں وہی شخص داخل ہوگا جس کو یہ بزرگوار پہچانتے ہوں گے اور وہ انہیں پہچانتا ہوگا۔ اور جہنّم میں وہی لوگ جائیں گے جو ان کی معرفت نہیں رکھتے ہوں گے اور نہ یہ بزرگوار ان سے واقف ہوں گے

سے مراد جناب سید المرسلین اور آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین ہیں جو وہاں حاکم ہوں گے اور اعراف کے بالائی حصّہ پر یاقوت احمر کے دریچہ میں تشریف فرما ہوں گے۔ (جیسا کہ بصائر الدرجات میں حضرت صادق علیہ السّلام سے مروی ہے) حقیقی اہل ایمان کو سب سے پہلے بہشت عنبر سرشت کی طرف روانہ فرمائیں گے۔ اور ان کو پل صراط سے بآسانی گذاریں گے اور کفار و مشرکین اور نواصب و خوارج کو سب سے پہلے جہنّم میں بھیجیں گے اور باقی گنہگار شیعہ اور عام مستضعفین وہاں رہیں گے۔ اور انجام کار جو قابلِ شفاعت ہوں گے وہ ان حضرات کی شفاعت سے داخل جنّت ہوں گے اور جو ناقابلِ شفاعت ہوں گے وہ ہمیشہ اعراف ہی میں رہیں گے۔ یہ مضمون متعدد روایاتِ معتبرہ میں وارد ہے۔ چنانچہ تفسیر مجمع البیان اور بصائر الدرجات میں جناب اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت امیر علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ابن کوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آیت مبارکہ وعلی الاعراف رجال کی تفسیر آپ سے دریافت کی۔ آپ نے فرمایا ویحك یا ابن الکوا نحن نوقف یوم القیامة بین الجنّة والنار فمن نصرنا عرفناہ بسیماہ فادخلناہ الجنة ومن ابغضنا عرفناہ بسیماہ فادخلناہ النار۔ افسوس ہے تیرے لئے اے ابن کوا! ہم (اہل بیتؑ) بروز قیامت جنّت و جہنّم کے درمیان (اعراف پر) کھڑے کئے جائیں گے۔ پس جس شخص نے ہماری نصرت اور ہم سے دوستی کی ہوگی ہم اس کو علامت سے (اُسے) پہچان لیں گے اور اُسے جنّت میں داخل کریں گے اور جس نے ہم سے بغض و عداوت کی ہوگی اس کو بھی علامت سے شناخت کرلیں گے اور اُسے داخل جہنّم کریں گے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان سے مراد رضوانِ جنّت اور خازنِ جہنّم ہیں جو مردوں کی شکل میں متشکل ہوکر وہاں کھڑے ہوں گے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ان سے مراد کراماً کاتبین ہیں اور چوتھا قول یہ ہے کہ ان سے مراد بعض فضلاء مومنین ہیں ان اقوال میں سے جو قول زیادہ مشہور اور احادیث معصومین سے مؤید و منصور ہے وہ پہلا قول ہی ہے دوسرے اقوال کی تائید چونکہ ارشاداتِ معصومین سے نہیں ہوتی اس لئے وہ ناقابلِ قبول ہیں۔ کلما لم یخرج عن ھذا البیت فھو زخرف۔

اصحاب اعراف کی معرفت باعث دخولِ جنّت اور عدم معرفت باعث دخول نار ہے

جب یہ امر ثابت ہوگیا کہ اصحاب اعراف

وآخرون مرجون لامر الله اما يعذبهم واما يتوب عليهم۔

مقام اعراف میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو امر الٰہی کے منتظر ہوں گے کہ آیا خدا انہیں عذاب میں گرفتار کرتا ہے (اور داخل دوزخ کرتا ہے) یا ان پر مہربانی فرماتا ہے (اور جنت میں داخل فرماتا ہے)۔

سے مراد جناب رسولِ خدا اور آئمہ ہدیٰ ہیں تو اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جنت یا جہنم میں جانے کا معیار و میزان ان بزرگوں کی معرفت یا عدم معرفت ہے جیسا کہ مصنف علام نے ذکر فرمایا ہے۔ اس مضمون کی متعدد احادیث شریفہ تفسیر برہان۔ بحار الانوار اور بصائر الدرجات وغیرہ کتب تفسیر و حدیث میں مذکور ہیں۔ رزقنا الله معرفتهم و ثبتنا عليها في الدنيا والاخرة۔

اعراف میں کون لوگ رہیں گے؟

اب رہی اس امر کی تحقیق کہ اعراف میں کون لوگ مقیم ہوں گے اس سلسلہ میں بھی چند قول ہیں۔ اوّل۔ یہ کہ وہ گنہگار شیعہ ہوں گے۔ دوم یہ کہ وہاں وہ لوگ ہوں گے جن کے حسنات و سیئات برابر ہوں گے لہٰذا وہ اپنے اعمال کی وجہ سے نہ مستحق جنت ہوں گے اور نہ مستوجب جہنم۔ لہٰذا وہ اس مقام پر رکھے جائیں گے جو نہ پوری طرح جنت ہے اور نہ جہنم بلکہ ان کے بین بین ہے۔ سوم یہ کہ وہاں وہ لوگ رکھے جائیں گے جو دار دنیا میں شرعاً مکلف ہی نہ تھے۔ جیسے اطفال (بچے) مجانین (دیوانے) وامثالہم چہارم یہ کہ وہاں مستضعفین رہیں گے۔ مستضعفین میں چند قسم کے لوگ داخل ہیں (۱) جو ضعیف العقل ہونے کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان کما حقہ امتیاز نہ کر سکتے ہوں۔ جیسے کمزور عقل والی عورتیں اور سادہ لوح عوام مرد (۲) وہ لوگ جو زمانۂ فترت (دو نبیوں کی بعثت کے درمیان والے زمانہ) میں گذرے ہوں (۳) جو لوگ کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں انہیں حجت خدا کے ظہور کی اطلاع ہی نہ ملی ہو (۴) وہ لوگ جنہیں اختلافِ مذاہب کا علم نہ ہو یا اگر ہو بھی تو وہ حق و باطل کے درمیان امتیاز نہ کر سکتے کی وجہ سے کسی غلط مذہب کی اتباع وہ سیدھے سادے کم علم و دانش رکھنے والے مسلمان جو نہ تو اہل بیت کی پوری معرفت اور ان کی حقیقی محبت رکھتے ہوں، اور نہ ہی ان کے مسلّم دشمنوں سے دوستی رکھتے ہوں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو آیت مبارکہ واخرون مرجون لامر الله اما يعذبهم واما يتوب عليهم والله عليم حكيم (پ ۱۱ س توبہ ع ۲) اور کچھ اور لوگ ہیں جو حکمِ خدا کے اُمیدوار کئے گئے ہیں (اس کو اختیار ہے) خواہ ان پر عذاب کرے یا ان پر مہربانی کرے اور خدا (تو) بڑا واقف کار حکمت والا ہے۔ کے مصداق ہیں۔ اہل اعراف کے متعلق یہ چار قول گو بظاہر باہم مختلف ہیں، لیکن درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ اخبار و آثار اور علمائے ابرار مثل محقق مؤید حضرت شیخ مفیدؒ و حضرت علامہ مجلسیؒ و مولانا سید عبداللہ شبر وغیرہم کی تحقیقات انیقہ سے جو کچھ واضح و آشکار ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام مذکورہ بالا طبقات بروز حشر پہلے مقام اعراف میں ٹھہرائے جائیں گے۔ پھر ان میں سے جو قابلِ شفاعت ہوں گے۔ وہ جناب

رسولِ خدا اور آئمہ ہدیٰ علیہ وعلیہم السلام کی شفاعتِ کبریٰ سے جنت میں داخل کئے جائیں گے اور جو ناقابلِ شفاعت ہوں گے۔ انہیں ہمیشہ ہمیشہ وہیں رکھا جائے گا۔

تفسیر قمی میں بسند معتبر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے جس کا ماحصل یہ ہے فرمایا آئمہ طاہرین مقامِ اعراف میں موجود ہوں گے۔ اور ان کے کامل شیعہ بلا حساب داخل جنت ہو رہے ہوں گے۔ اس وقت حضراتِ آئمہ اپنے گنہگار شیعوں سے فرمائیں گے۔ اپنے بھائیوں کو جنت میں دیکھو جو بلا حساب داخل ہو رہے ہیں۔ اس وقت گنہگار شیعہ ان کو خطاب کرکے کہیں گے۔ سلام علیکم لم یدخلوھا وھم یطمعون (قرآن کریم) تم پر سلامتی ہو۔ وہ داخلِ جنت نہیں ہوں گے لیکن یہ طمع رکھتے ہوں گے (کہ شفاعت نبیؐ و آئمہؑ کے ذریعہ سے داخلِ جنت ہونگے) پھر ارشادِ آئمہ ہوگا۔ ذرا جہنم میں اپنے مخالفین کو بھی دیکھو۔ چنانچہ وہ ان کو دیکھکر پکار اٹھیں گے ربنا لا تجعلنا مع القوم الظالمین (قرآن کریم) بارالہا! ہمیں ظالم قوم کے ساتھ جمع نہ کر۔ ونادیٰ اصحٰب الاعراف رجالاً یعرفونھم بسیماھم قالوا ما اغنیٰ عنکم جمعکم وما کنتم تستکبرون۔ ۱۳۔ اس وقت اصحاب اعراف (یعنی جناب رسولِ خدا اور آئمہ ہدیٰ) ان (جہنمی) لوگوں کو خطاب کرکے فرمائیں گے جن کو وہ مخصوص علامات سے پہچانتے ہوں گے کہ دیکھو تمہیں تمہاری جمعیت وکثرت (جس پر تم کو فخر و ناز تھا) اور تمہارے تکبر اور بڑائی نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ رزقنا اللہ تعالیٰ شفاعۃ النبی وآلہ الطاھرین صلوات اللہ علیہ وعلیھم اجمعین۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

اس مقام پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے اعمال صالحہ کی وجہ سے جنت میں داخل ہوتا ہے۔ اور ایک شفاعت نبیؐ و امامؑ کی وجہ سے داخلِ جنت ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کے اعمال صالحہ بقدر استحقاق نہیں تو اس طرح دونوں کی مساوات لازم آئے گی جو کہ عدلِ خداوندی کے منافی ہے۔ اس شبہ کا جواب بنا بر تسلیم اینکہ کوئی شخص بغیر فضل وکرم ایزدی محض اپنے اعمال سے مستحق جنت قرار پا سکتا ہے۔ یہ ہے کہ یہ شبہ اس وقت لازم آتا جب کہ ان ہر دو حضرات کا جنت میں ایک ہی درجہ و مقام ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ واضح ہے کہ جنت کے مختلف مراتب ومدارج ہیں۔ ہر شخص اپنے اعمالِ صالحہ کے تفاوت و اختلاف کے مطابق مختلف مراتب پر فائز ہوگا۔ اس طرح یہ مزعومہ مساوات لازم نہیں آتی یہی شبہ اصل شفاعت پر بھی عائد ہو سکتا ہے۔ اور اس کا تحقیقی جواب بھی یہی ہے جو صاحبانِ عقل و انصاف کی تسکینِ اضطراب اور اطمینانِ قلب کے لئے کافی وشافی ہے۔

العاقل یکفیہ الاشارۃ والبلید لا ینفعہ

الف عبارۃ

باب الاعتقاد فی الصراط

قال الشیخ ابو جعفر اعتقادنا فی الصراط حق وانه جسر جهنم وانه ممر جمیع الخلق قال اللہ عز وجل

چھبیسواں باب (صراط کے متعلق اعتقاد)

حضرت شیخ ابو جعفر فرماتے ہیں کہ صراط کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ حق ہے اور یہ کہ وہ جہنم کے اوپر اس کے عبور کرنے کے لئے ایک پل ہے جو تمام مخلوق خدا کی گذرگاہ ہے چنانچہ خداوند عالم اس سلسلے

چھبیسواں باب پل صراط کے متعلق عقیدہ

پل صراط کے مفہوم کی وضاحت

صراط کے لغوی معنی راستہ کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں صراط اس پل کا نام ہے جو بروز قیامت دوزخ کے اوپر قائم کی جائے گی جس کا ایک سرا میدان محشر میں اور دوسرا جنت کے ساتھ ملا ہوا ہوگا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگی ہر ایک مکلف کو خواہ نیک ہو یا بد، نبی ہو یا وصی غرضیکہ بروز قیامت تمام اولین و آخرین کو اسے عبور کرنا پڑے گا۔ یہی مطلب ہے آیت مبارکہ وان منکم الا واردھا کا کہ تم سب کو جہنم میں وارد ہونا ہے۔ پل صراط کے برحق ہونے کا عقیدہ ضروریات دین میں سے ہے۔ جس پر تمام فرقہائے اسلام کا باوجود اپنے اختلاف فکر و نظر کے اتفاق ہے اور اس پر آیات مبارکہ اور روایات متواترہ دلالت کرتی ہیں۔

پل صراط کے متعلق ایک تاویل علیل

بعض علماء نے پل صراط سے وہ دینی راستہ مراد لیا ہے جو مستقیم ہے۔ اور فردوس نگاہ وخوشنودئ خدا تک پہنچانے والا ہے۔ اس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط۔ اور اس راستہ سے مراد شریعت اسلامیہ محمدیہ ہے۔ جو توسط ائمہ ہدیٰ ہم تک پہنچی ہے۔ اسی پر مومنین موقنین کو چلنا اور اس کے مطابق عمل کرنا آسان ہے۔ مگر کفار و منافقین اور نواصب و خوارج و غلاۃ کو اس پر چلنا اور عمل درآمد کرنا اس طرح مشکل معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس راستہ پر چلنا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہو۔

جن حضرات نے اس استبعاد کہ جو پل بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگی۔ اسے لوگ کس طرح عبور کریں گے؟ سے گھبرا کر پل صراط کی یہ تاویل علیل کی ہے اور اس طرح درحقیقت پل صراط والے مسلم اسلامی عقیدہ کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے سخت غلطی کی ہے۔ اس استبعاد کا جواب تو ہم بعد میں دیں گے۔ سردست یہ کہنا ہے کہ ان حضرات نے جو یہ کہا ہے کہ صراط سے مراد وہ راستہ ہے جس میں افراط و تفریط نہ ہو۔ اور وہ سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کا راستہ ہے یہ درست ہے کہ اہل بیت رسول کا بتلایا ہوا طریقہ و راستہ ہی صراط مستقیم ہے گامزن ہونے کی دعا ہر ایک مسلمان نماز پنجگانہ وغیرہ میں مانگتا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم۔ لیکن آل رسول کے مسلک کو صراط مستقیم تسلیم کرنے کا یہ مطلب ہرگز

وان منکم الا واردھا کان علی ربک حتما مقضیا والصراط فی وجہ اخر اسم حجج اللہ فمن

میں فرماتا ہے تم سب کو جہنم پر ضرور وارد ہونا ہے اس امر کا پورا کرنا تمہارے پروردگار کے لئے لازمی اور حتمی ہے اور صراط ایک دوسرے معنی کے اعتبار سے حجت ہائے خداوندی کا نام ہے جس کا مطلب یہ ہے

نہیں کہ قیامت والے پل صراط کا انکار کر دیا جائے۔ بہرحال یہ نظریہ آئمہ دین بلکہ تمام مسلمین کے مسلّمہ عقیدہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے غلط اور ناقابل قبول ہے۔ ہاں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صراط دو ہیں۔ ایک صراط ظاہری جو کہ قیامت کو ہوگی۔ اور ایک صراط باطنی جو کہ معرفت آئمہ حق اور ان کی متابعت ہے۔ چنانچہ مولانا سید عبداللہ شبر حق الیقین میں فرماتے ہیں۔ و ھو صراطان ظاھری وھو ما ذکر و باطنی وھو النبی والائمۃ کما ورد عنھم نحن الصراط یعنی صراط دو ہیں۔ ایک ظاہری جو کہ اوپر مذکور ہوئی (کہ جہنم پر ایک مخصوص پل ہے) اور دوسری باطنی۔ اور اس سے مراد جناب رسول خدا و آئمہ ہدیٰ ہیں جیسا کہ ان کا ارشاد ہے ہم صراط ہیں۔ اس اُخروی صراط سے وہی سلامتی کے ساتھ گذر سکیں گے جنہوں نے دنیا میں امام برحق کو پہچان کر ان کی اطاعت ہوگی۔ اس امر کے ثبوت میں کہ صراط دو ہیں متعدد روایتیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن بنظر اختصار فقط ایک معتبر روایت درج کی جاتی ہے۔ چنانچہ کتاب معانی الاخبار شیخ صدوق علیہ الرحمۃ میں جناب مفضل بن عمر سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے صراط کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا۔ ھو الطریق الی معرفۃ اللہ عزوجل۔ یعنی صراط سے مراد معرفت خداوندی حاصل کرنے کا راستہ ہے۔ پھر فرمایا وھما صراطان صراط فی الدنیا و صراط فی الاخرۃ۔ فاما الصراط الذی فی الدنیا فھو الامام المفترض الطاعۃ من عرفہ فی الدنیا واقتدی بھداہ مر علی الصراط الذی ھو جسر جھنم فی الاخرۃ و من لم یعرفہ فی الدنیا زلت قدمہ عن الصراط فی الاخرۃ فتردی فی نار جھنم۔ صراط دو ہیں۔ ایک دنیا میں اور ایک آخرت میں جو صراط دنیا میں ہے۔ اس سے مراد امام مفترض الطاعت ہیں۔ پس جو شخص دنیا میں ان کی معرفت حاصل کرے گا۔ اور ان کے نقش قدم پہ چلے گا۔ وہ اس پل سے باسانی گذر جائے گا جو آخرت میں جہنم کے اوپر ہوگی۔ اور جو شخص دنیا میں امام برحق کی معرفت حاصل نہیں کرے گا تو اس کا قدم پل صراط سے پھسل جائے گا اور وہ آتش جہنم میں گر کر ہلاک ہو جائے گا۔ نیز کتاب معانی الاخبار میں حضرت امیرؑ سے مروی ہے۔ فرمایا۔ الصراط المستقیم صراطان صراط فی الدنیا و صراط فی الاخرۃ الصراط المستقیم فی الدنیا فھو ما قصر عن الغلو و ارتفع عن التقصیر و استقام فلم یعدل الی شئی من الباطل واما الصراط فی الاخرۃ فھو طریق المومنین الی الجنۃ الذی ھو مستقیم لا یعدلون عن الجنۃ۔ صراط مستقیم دو ہیں۔ ایک دنیا میں ہے اور دوسرا آخرت میں۔ جو صراط مستقیم دنیا میں ہے اس

عرفهم في الدنيا واطاعهم اعطاه الله جوازاً على الصراط الذی هو جسر جهنم یوم القیمۃ

جو شخص دنیا میں ان کی معرفت حاصل کرے گا اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے گا خداوند عالم قیامت اور حسرت و ندامت کے روز اس شخص کو اس صراط سے جو جہنم کا پل ہے گذرنے کا پروانہ راہداری

سے مراد وہ راستہ ہے جو غلو سے کم اور تقصیر سے بلند، بالکل سیدھا ہو۔ اور باطل کی طرف بالکل جھکا ہوا نہ ہو۔ اور جو صراط آخرت میں ہے اس سے مراد اہل ایمان کا وہ راستہ ہے جو سیدھا جنت کو جاتا ہے جس پر چل کر وہ جنت سے نہیں بھٹکیں گے

پل صراط سے گذرنے کی وجہ

پل صراط سے اس طرح تمام مکلفین کو گذارنے کے حقیقی اسرار و رموز کا علم تو اسی ذات ذوالجلال کو ہے جس نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے لیکن اس کی وجہ جو کچھ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح جو لوگ مستوجب دوزخ ہوں گے وہ تو کٹ کر اس میں گر جائیں گے اور جو مستحق جنت ہوں گے وہ جب ان ہولناک منازل اور اندوہ ناک مناظر سے گذر کر جنت ایسے آرام دہ اور آسائش رساں مقام پر تو ان کی نگاہ میں جنت کی قدر و منزلت اور بڑھ جائے اور ان کو حد سے زیادہ فرحت و انبساط حاصل ہو گا کیونکہ یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ اس نعمت کی قدر و قیمت جو محنت و مشقت اٹھانے کے بعد حاصل کی جائے یقیناً اس نعمت سے زیادہ ہوتی ہے جو بغیر تعب و تکلیف کے حاصل ہو جائے اس طرح ان کو خداوند عالم کے مراحم و الطاف کا بھی صحیح اندازہ ہو جائے نیز اس طرح بعض لوگوں کے باقی ماندہ گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے گا جو شدائد برزخ کے بعد بھی بچ گئے ہوں گے۔ و ان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا واللہ العالم باسرار افعالہ۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک مشہور شبہ وارد کیا جاتا ہے کہ جب پل صراط کی حقیقت وہ ہے۔ جو اوپر بیان ہوئی کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے تو پھر اس سے عبور کرنا ناممکن ہو جائے گا اور بنا بر تسلیم امکان جب اس سے انبیاءؑ و اوصیاء۔ اور کامل مومنین گزریں گے تو ان کو آتش جہنم سے اذیت و تکلیف ہو گی۔ حالانکہ ان بزرگواروں کے متعلق عذاب و عقاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ شبہ ہے جس سے متاثر ہو کر بعض اہل علم نے صراط کی کئی مختلف تاویلیں کی ہیں لیکن علماء محققین کے نزدیک یہ طریقہ بالکل غلط اور ناپسندیدہ ہے اگر اس قسم کے شبہات و استبعادات سے متاثر ہو کر حقائق و ظواہر شریعت کی تاویل سازی شروع کر دی جائے تو شریعت اسلام کا مقدس چہرہ مسخ ہو کر رہ جائے گا۔ بہرحال بلا ضرورت شدیدہ یہ تاویل سازی جائز نہیں ہے جیسا کہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے اسی مقام پر بحار الانوار ج ۳ میں فرمایا ہے وتاویل الظواھر الکثیرۃ بلا ضرورۃ غیر جائز ظواہر شرعیہ کی تاویل بلا ضرورت جائز نہیں ہے۔ اسی طرح انہی سرکار نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرمایا ہے لا بد

يوم الحسرة والندامة وقال النبیؐ لعلی یاعلی واذا کان یوم القیمة اقعد انا وانت

رحمت فرمائے گا۔ حضرت رسولؐ خدا نے جناب امیر علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا اے علیؑ قیامت کے روز میں، تم اور

ان تومن بکل ما ورد علی لسان الشرع من الصراط والمیزان وجمیع احوال القیمة واھوالھا ولا تووله بشیٔ الابما ورد تاویله عن صاحب الشرع فان اول الکفر والالحاد التصرف فی النصوص الشرعیة بالعقول الضعیفة وبالاھواء الردیئة۔ لازم ہے کہ تمام حقائق پر اسی طرح ایمان رکھا جائے جس طرح وہ زبانِ شریعت میں وارد ہوئے ہیں جیسے صراط، میزان اور قیامت کے دیگر تمام حالات اور شدائد اور ان کی تاویل کرنا سوائے اس کے جس کی تاویل خود صاحبِ شریعت سے وارد ہو جائز نہیں ہے کیونکہ پہلا کفر والحاد یہی ہے کہ اپنے عقولِ ناقصہ اور آراء فاسدہ کی بنا پر نصوصِ شریعت میں تصرف بے جا کرکے ان کی تاویل کی جائے۔

بہرکیف اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک انبیاء و اوصیاء کے عبور کرنے کا تعلق ہے تو جو شخص ان ذواتِ قدسی صفات کے احوال و خصائص سے واقف ہے وہ ہرگز ایسا شبہ پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جب وہ ہواہیں اڑ سکتے ہیں اور پانی پر چل سکتے ہیں تو پل صراط سے گذرنے میں انہیں کیا مشکل درپیش آسکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ خرق عادت ہی ہے جو کہ ان کا ہمیشہ کا معمول ہے۔ اور جہاں تک دوسرے اہلِ ایمان کے گذرنے کا تعلق ہے اُن کے لئے بھی قدرت اس مشکل مرحلہ کو یوں آسان کر دے گی کہ مومنین کرام اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کی مقدار کے مطابق کچھ بجلی کی طرح، کچھ ہوا کی طرح، کچھ تیز رو گھوڑے کی طرح، اور بعض افتاں وخیزاں وہاں سے گذر جائیں گے۔ یہ تفصیل کوئی اپنی عقلی اختراع نہیں بلکہ احادیثِ معصومینؑ سے مستفاد ہے۔ چنانچہ امالی شیخ صدوق علیہ الرحمۃ وغیرہ کتب میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا الناس یمرون علی الصراط طبقات والصراط ادق من الشعرة واحد من حد السیف فمنھم من یمر مثل البرق ومنھم من یمر مثل عدو الفرس ومنھم من یمر حبوا ومنھم من یمر مشیا ومنھم من یمر متعلقا قد تاخذ النار منه شیئا وتترک شیئا۔ یعنی پل صراط بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ اور جو لوگ اس سے گذریں گے وہ مختلف قسم کے ہوں گے۔ کچھ تو بجلی کے کوندنے کی طرح تیزی کے ساتھ گذر جائیں گے اور کچھ اسپ رفتاری سے عبور کر جائیں گے۔ اور کچھ لوگ گھٹنے ٹیک کر اور کچھ آہستہ آہستہ چل کر پار ہوں گے۔ اور بعض لوگ اس طرح اس کے ساتھ چمٹ کر گذریں گے کہ آتش جہنم ان کو جھلس لے گی (جو ان کے باقیماندہ گناہوں کا کفارہ ہو جائیگا) پس معلوم ہوا کہ یہ شبہ قدرتِ خدا سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جو خدا علی کل شیٔ قدیر ہے اس کے لئے ایسا کرنا اور لوگوں کو گذرنے کی قدرت عطا کرنا ہرگز کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

وجبرئیل علی الصّراط فلایجوز علی الصّراط الامن کانت معه براۃ بولایتك۔

اور جبرئیل پل صراط پر بیٹھیں گے۔ پس وہاں سے وہی شخص گذر سکے گا جس کے پاس تمہاری ولایت و محبت کی سند ہوگی۔

ایک اور شبہ اور اُس کا جواب

جنت آسمان اور جہنم زمین پر ہے تو یہ پل صراط کس طرح رکھی جائے گی اور عبور کی کیا صورت ہوگی؟ اس شبہ کے جواب میں سرکار علامہ مجلسی کی تحقیق انیق کا پیش کر دینا ہی کافی ہے جو انہوں نے اخبار آلِ رسولؐ کے بحار میں غواصی کرکے پیش فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ الذی یظهرلی من الایات والاخبار هو انّ الله تعالیٰ بعدخرق السّموات وطیّها ینزل الجنّة والعرش قریبًا من الارض فیکون سقف الجنّة العرش لایبعد ان یکون هذا هوالمراد بقوله تعالیٰ وازلفت الجنّة للمتقین وتتحول البحار نیرانًا فیوضع الصراط من الارض الی الجنّة والاعراف درجات ومنازل بین الجنّة والنار وبهذا ینرفع کثیرمن الاوهام والاستبعادات التی یخطر فی اذهان اقوام۔ آیات واخبار سے جو کچھ مجھ پر ظاہر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم آسمانوں کو فنا کرنے کے بعد جنت اور عرش کو زمین کے قریب اتار دے گا۔ یہاں تک کہ جنت کی چھت عرش ہوگا اور بعید نہیں کہ اس قولِ خداوندی کہ جنت متقیوں کے لئے آراستہ پیراستہ کی جائے گی، سے یہی مقصود ہو۔ اور اس وقت سمندر آگ بن جائیں گے، تب زمین سے جنت کی طرف پل صراط رکھی جائے گی، اور اعراف جنت و دوزخ کے درمیان بعض منازل کا نام ہے۔ اس تحقیق سے بہت سے وہ شبہات واستبعادات جو اس سلسلہ میں کئی لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں دُور ہو جائیں گے۔ وهو جید۔ ولا ینبئك مثل خبیر۔

حضرت امیرالمومنینؑ کے پروانہ کے بغیر کوئی شخص پل صراط عبور نہیں کر سکے گا

کتب فریقین میں آیت مبارکہ وقفوهم انهم مسئولون (سورہ الصافات پ ۲۳ ع ۶) کی تفسیر میں جناب رسول خداؐ سے منقول ہے کہ جب لوگ پل صراط سے گذرنے لگیں گے تو اچانک یہ ندا آئے گی کہ وقفوهم انهم مسئولون ای عن ولایت علی بن ابی طالب اے فرشتو! ان لوگوں کو روکو، ابھی ان سے حضرت علی بن ابی طالبؑ کی ولایت و امامت کے متعلق سوال کرنا ہے (ملاحظہ ہو ثالث بحار الانوار و صواعق محرقہ ابن حجر مکی ص۱۴۷ طبع مصر جدید) اسی طرح یہ مضمون بھی فریقین کی بعض روایات میں موجود ہے کہ لایجوز احد الصراط الامن کتب له علی الجواز۔ سوائے اس کے جس کے لئے جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام پروانہ راہداری لکھ دیں گے (صواعق محرقہ ص۱۲۴ طبع جدید) بہرحال روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب رسول خدا جناب علی مرتضیٰ

باب الاعتقاد فی العقبات التی علی طریق المحشر

قال الشیخ ابو جعفرؒ اعتقادنا فی ذلک ان لھذہ العقبات اسم علیحدة فرض اوامر او نھی فمتی انتھی الانسان الی عقبة اسمھا الفرض وکان قدقصر فی ذلک الفرض حبس عندھا وطولب بحق اللہ فیھا فان اخرج منہ بعمل صالح قدمہ اوبرحمة تدارکہ نجی منھا الی عقبة اخری فلایزال یدفع من عقبة ویحبس عند کل عقبة فیسئل عما تصرفیہ من معنی اسمھا فان سلم من جمیعھا انتھی الی دار البقاء فیحیی حیوة لایموت فیھا ابدًا ویسعد سعادة لاشقاوة معھا دسکن

ستائیسواں باب (عقبات محشر یعنی قیامت کی گھاٹیوں کے متعلق اعتقاد)

سرکار شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ان گھاٹیوں کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ کسی کو فرض کہتے ہیں۔ کسی کو امر اور کسی کو نہی کہا جاتا ہے جب آدمی فرض کی گھاٹی کے پاس پہنچے گا تو اگر اس نے اس فرض کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی کی ہوگی تو اسے وہاں روک کر اس سے خدا کے حق کا سوال کیا جائے گا۔ پس اگر کسی نیک عمل یا رحمت الہٰی کی وجہ سے اس مشکل مرحلہ سے نکل گیا۔ اور وہاں سے نجات حاصل کرلی تو پھر دوسرے عقبہ کے پاس پہنچ جائے گا۔ اسی طرح وہ شخص برابر ہر ایک گھاٹی کے پاس روکا جائے گا۔ اور جس جس امر یا نہی کے متعلق وہ گھاٹی ہوگی اس کے بارے میں کوتاہی اور غفلت کا سوال کیا جاتا رہے گا۔ اس طرح اگر وہ ان تمام عقبات سے صحت وسلامتی کے ساتھ گذر گیا۔ تو پھر وہ ایسے مقام پر پہنچ جائیگا جہاں اسے ایسی حیات جاودانی نصیب ہوگی جہاں کبھی نہیں مرے گا اور اسے ایسی سعادت ابدی حاصل ہوگی کہ اس میں شقاوت و بدبختی کی

بہرحال روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب رسول خدا جناب علی مرتضیٰ اور دیگر آئمہ ہدیٰ علیہم السلام اس کٹھن منزل میں صراط کے پاس تشریف فرما ہوں گے اور اپنے محبّوں کو ان شدائد و مصائب سے نجات دلائیں گے

ع جعفری باش گر خدا خواہی ۔ ورنہ در ہر طریق گمراہی ۔ وما علینا الا البلاغ

ستائیسواں باب: عقبات محشر کے متعلق عقیدہ

عقباتِ آخرت کا ثبوت

ان دشوار گذار عقبات کا تذکرہ مختلف طرق و اسانید سے متعدد احادیث میں موجود ہیں حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ تجھزوا رحمکم اللہ فقد نودی علیکم

فی جوار الله مع انبیآئه وحججه
والصدیقین والشهداء والصالحین
من عباده وان حبس علی عقبة
فطولب بحق قصر فیه فلم ینجه
عمل صالح قدمه ولا ادرکته
من الله تعالیٰ رحمة زلّت به
قدمه عن العقبة فهوی فی نار جهنم
نعوذ بالله منها وهذه العقبات
کلها علی الصراط اسم عقبة
منها الولایة یوقف جمیع الخلائق
عندها فیسئلون عن ولایة امیر
المومنینؑ والائمة علیهم السلام

خدا کے جوار رحمت میں، نبیوں، وصیتوں، صدیقوں، شہیدوں
اور نیک بندوں کے ہمراہ قیام پذیر ہوگا۔ اور اگر اسے کسی
ایسے عقبہ کے پاس روکا گیا جس میں اس نے کوتاہی کی ہوگی
اور اس سے اس حق کا مطالبہ کیا گیا اور عمل صالح اسے
نجات نہ دے سکا۔ اور نہ ہی رحمتِ خداوندی
اس کے شاملِ حال ہوئی تو اس کا قدم اس گھاٹی سے
پھسل جائے گا اور آتشِ جہنم میں گر پڑے گا۔ ہم
جہنم سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور یہ عقبات تمام کے تمام
پل صراط کے اوپر ہیں انہی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی کا
نام ولایت ہے اس کے پاس تمام مخلوقات کو ٹھہرایا
جائے گا اور ان سے حضرت امیر المومنینؑ اور دیگر
آئمہ طاہرینؑ کی ولایت کی بابت سوال کیا جائے گا

بالرحیل فان بین یدیکم عقبة کئوداً مخوفة مھولة لابد من الورود علیها والوقوف
عندها (نہج البلاغہ) کوچ کی تیاری کرو۔ خدا تم پر رحم کرے کیونکہ کوچ کی ندا دی جا رہی ہے تمہارے سامنے بہت سی
دشوار گذار گھاٹیاں اور خوفناک و ہولناک منزلیں ہیں جن پر تمہیں ضرور وارد ہونا ہے۔ اور ان کے پاس ٹھہرنا بھی ہے۔
انہی عقبات کئودہ ومنازل مخوفہ کی تشریح و توضیح کے لئے مع دیگر بعض کے عمدۃ المحدثین جناب شیخ عباس
قمی علیہ الرحمۃ نے ایک مکمل رسالہ بنام "منازل الآخرت" تالیف فرمایا ہے جو قابلِ دید ہے اور اس کی طرز پر ایک رسالہ
عربی میں بنام مرآۃ الآخرۃ فی منازل الآخرۃ بھی حال ہی نجف اشرف سے شائع ہوا ہے۔ اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادق
علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ الا تحاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا فان فی القیامة خمسین موقفا کل
موقف مثل الف سنة مما تعدون۔ یعنی اپنے نفسوں کا خود محاسبہ کرو۔ قبل اس کے کہ تمہارا احساب لیا جائے
کیونکہ قیامت میں پچاس مقامات ایسے ہیں جہاں ہر ایک مقام پر تمہارے دنیوی حساب سے ایک ہزار سال تک رکنا
پڑے گا پھر امام عالی مقام نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی۔ فی یوم کان مقداره خمسین الف سنة۔ یعنی
قیامت کا روز پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ ان عقبات کی تفصیل متن رسالہ میں مذکور ہے کہ بعض عقبے فرائض و واجبات کے
ہوں گے اور بعض محرمات کے۔ لہٰذا اس کی زیادہ توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں۔

من بعده فمن اتى بها نجى و جاز ومن لم يات بها بقى فهوى وذالك قول الله عزوجل وقفوهم انهم مسئولون واسم عقبة منها المرصاد وهو قول الله عزوجل ان ربك لبالمرصاد ويقول الله عزوجل بعزتى وجلالى لا يجوزنى ظلم ظالم واسم عقبة منها الرحم واسم عقبة منها الامانة واسم عقبة منها الصلوٰة وباسم كل فرض او امر او نهى عقبة يحبس عندها العبد فيسئل عن كل واحد

جس شخص نے درست جواب دے دیا وہ اس گھاٹی سے صحیح و سالم گذر جائے گا اور جو صحیح جواب نہ دے سکے گا وہ وہیں رہ جائے گا اور آتش جہنم میں گر جائے گا اس بات کا ثبوت خدا کا یہ ارشاد ہے۔ ان کو روک لو کیونکہ ان سے سوال کیا جانا ہے۔ ان عقبات میں سے ایک عقبہ کا نام مرصاد ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔ تمہارا رب کمینگاہ میں ہے۔ خداوند عالم (حدیث قدسی میں) ارشاد فرماتا ہے مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم۔ کسی ظالم کا ظلم مجھ سے چھوٹ نہ سکے گا۔ اور ان عقبوں میں سے ایک کا نام رحم، ایک کا نام امانت اور ایک کا نام نماز ہے۔ ہر ایک فرض، ہر ایک امر اور ہر ایک نہی کے لئے علیحدہ علیحدہ عقبہ ہے۔ جن کے پاس ہر ایک آدمی کو لاکر روکا جائے گا اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔

یہ عقبات جسمانی ہوں گے یا غیر جسمانی؟

یہاں ایک امر کی طرف اشارہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ عقبہ کے لغوی معنی ہیں: "دشوار گذار گھاٹی" لہٰذا اس لفظ سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ عقبے فی الحقیقت کوئی مجسم دشوار گذار گھاٹیاں ہوں جیسا کہ اکثر علماء محدثین نے سمجھا ہے۔ لیکن حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ نے اس کی یہ تاویل فرمائی ہے کہ اس سے مراد واجبات و محرمات ہیں۔ چونکہ واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب بہت مشکل ہے اور ان کا حساب و کتاب بھی اسی طرح سخت ہوگا اور اس سے گلو خلاصی کرانا اسی طرح مشکل ہوگا جس طرح دشوار گذار گھاٹی پر چڑھنا اس لئے بطور کنایہ ان امور کو دشوار گھاٹیوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نہ یہ کہ وہاں سچ مچ کوئی پہاڑیاں ہوں گی جن پر چڑھنا پڑے گا اور ان کو عبور کرنا پڑے گا۔ بظاہر تو شیخ مرحوم کی یہ تاویل جمیل اور قرین عقل بھی معلوم ہوتی ہے لیکن حضرت محقق مجلسی علیہ الرحمہ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں تاويل ظواهر الاخبار بمحض الاستبعاد بعيد عن الرشاد والله الخيرة فى معاقبة العارفين باى وجه اراد۔ (ثالث بحار الانوار) یعنی محض استبعادِ عقلی کی وجہ سے ظواہر اخبار کی تاویل کرنا راہ رشد و صواب سے دور ہے خداوند عالم

باب الاعتقاد فی الحساب والموازین

قال الشیخ اعتقادنا فی الحساب انه حق منه ما یتولاه اللہ عزوجل ومنه ما یتولاہ حججہ فحساب الانبیاء والائمة یتولاہ عزوجل ویتولی کل نبی حساب اوصیائه ویتولی الاوصیاء حساب الامم واللہ تبارک وتعالے

اٹھائیسواں باب (حساب ومیزان کے بارہ میں اعتقاد)

حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بروز محشر حساب کتاب ہونا برحق ہے بعض لوگوں کا حساب براہ راست خداوند عالم لے گا۔ اور بعض کا حساب حجہائے خدا لیں گے (اس کی تفصیل اس طرح ہے) کہ انبیاء اور ائمہ کے حساب کا متولی تو خدا تعالیٰ ہوگا۔ ہر نبی اپنے اپنے اوصیاء کا حساب لے گا اور امتوں کا حساب انبیاء کے اوصیاء لیں گے۔ خداوند عالم اپنے انبیاء و

کو کلی اختیار ہے کہ اپنے گناہ گار بندوں کو جس طرح سے چاہے عذاب وعقاب کرے۔ ان دشوار گذار گھاٹیوں سے گذار کر یا کسی اور طریقہ کو اختیار فرما کر۔ لہٰذا بظاہر ان امور کو ظاہری معنوں پر باقی رکھنا ہی اولیٰ وانسب ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ان امور پر اجمالی ایمان رکھا جائے جیساکہ قبل ازیں کئی بار اس مطلب کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ واللہ الہادی الی سواء السبیل۔

اٹھائیسواں باب۔ حساب ومیزان کے متعلق عقیدہ

اس باب میں کتنے امور قابل بحث ہیں؟ حضرت مصنف علام علیہ الرحمۃ نے چند مسائل مہمہ کو اسی ایک ہی باب میں گڈمڈ کر دیا ہے۔ اس باب میں چند مسائل قابلِ تفکر وتامل ہیں۔ (۱) حساب کا مفہوم کیا ہے (۲) حساب کون لے گا؟ (۳) کن لوگوں سے حساب لیا جائے گا؟ (۴) کن کن چیزوں کا حساب ہوگا؟ (۵) میزان اعمال سے کیا مراد ہے؟ (۶) انبیاء واوصیاء کی گواہی کی کیفیت کیا ہوگی؟ (۷) انسانی اعضاء وجوارح کس طرح شہادت دیں گے؟ ان مسائل پر اگر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے۔ تو غیر معمولی طوالت ہو جائے گی۔ جس کے لئے کتاب کے اوراق متحمل نہیں۔ لہٰذا اختصار کے ساتھ ان امور پر کچھ تبصرہ کیا جاتا ہے۔

حساب کا مفہوم کیا ہے؟ حساب ومحاسبہ کا مفہوم اگرچہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ تاہم افادہ عوام

هو الشهيد على الانبياء والرسل وهم الشهداء على الاوصياء والائمة شهداء على الناس وذلك قوله تعالیٰ فكيف اذا جئنا من كل امة بشهيد وجئنا بك على هؤلاء شهيداً وقال الله تعالیٰ افمن كان على بينة من ربه ويتلوه شاهد منه

رسل پر گواہ ہوگا۔ انبیاء و رسل اپنے وصیوں کے گواہ ہوں گے۔ اور آئمہ اطہار باقی تمام لوگوں پر گواہ ہوں گے۔ اسی سلسلہ میں خداوند عالم قرآن میں فرماتا ہے۔ اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے۔ اور اے رسول تمہیں ان گواہوں پر گواہ بنا کر لایا جائے گا۔ نیز خداوند عالم ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔ کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے کھلی دلیل پر ہو اور اس کے پیچھے پیچھے ایک گواہ آتا ہو۔ جو اسی کا جزو ہو۔

کے لئے صرف بیان کیا جاتا ہے کہ حساب اس حقیقت کا نام ہے کہ کسی شخص کے اعمال صالحہ و طالحہ کا جائزہ لینا اور پھر اچھے اعمال پر اس کی مدح و ثنا اور بُرے اعمال پر زجر و توبیخ کرنا۔ فارسی میں اس مطلب کو اس طرح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے " آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک است "

حساب لینے کا متولی کون ہوگا؟

اگرچہ قرآن و حدیث کے عمومات سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔ کہ ہر شخص کا حساب خود خداوند عالم لے گا۔ وھو اسرع الحاسبین۔ لیکن بعض روایات سے یہ مترشح ہوتا ہے۔ کہ ملائکہ کرام اس کام کو انجام دیں گے اور بعض اخبار و آثار سے وہی مطلب ثابت ہوتا ہے جو متن رسالہ میں درج ہے کہ انبیاء کا حساب خود خداوند عالم لے گا اور انبیاء اپنے اوصیاء کا حساب لیں گے اور اوصیاء اپنے اپنے نبی کی امت کا حساب لیں گے۔ یوم ندعو کل اناس باما مھم (بروز قیامت ہم تمام لوگوں کو ان کے امام زمانہ کے ساتھ پکاریں گے) بہت سی روایات میں وارد ہے کہ ہر امام اور اس کے ہم عہد لوگوں کو لایا جائے گا۔ جس جس آدمی کے ایمان کی وہ گواہی دیں گے وہ نجات پائے گا اور جس جس کے عدم ایمان کی شہادت دیں گے وہ ہلاک و برباد ہو جائے گا۔ چنانچہ اصول کافی میں آیت مبارکہ فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علی ھؤلاء شہیداً (سورۃ نساء پ ۵ ع ۲) کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا فی کل قرن منھم امام منا شاھد علیھم و محمد شاھد علینا یعنی امت محمدیہ میں ہر زمانہ کے اندر ہم میں سے ایک امام شاہد ہے اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہم پر شاہد ہیں۔ اسی طرح تفسیر عیاشی میں جناب امام زین العابدین علیہ السلام اپنے والد ماجدؑ کے سلسلہ سند سے جناب امیرالمومنین علیہ السلام سے روایت فرماتے ہیں کہ آنجناب نے فرمایا یشھد کل امام

والشاھد امیر المومنینؑ وقولہ تعؑ ۔ اس آیت میں شاہد (گواہ) سے مراد حضرت امیر المومنینؑ ہیں۔
ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم وسئل الصادقؑ عن قول اللہ تع ونضع الموازین القسط ۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔ بندوں کی بازگشت ہماری طرف ہوگی۔ اور ان کا حساب و کتاب بھی ہمارے ذمہ ہے۔ خداوند عالم کے اس ارشاد روزِ قیامت ہم عدل و انصاف

علی اھل عالما فانہ قد قام فیھم بامر اللہ عزوجل و دعاھم الی سبیل اللہ یعنی ہر زمانہ کا امام اس زمانے والے لوگوں پر گواہی دے گا۔ کیونکہ اس نے اس کے درمیان رہ کر اپنے وظیفہ الٰہیہ کو انجام دیا تھا اور انہیں راہِ خدا کی طرف دعوت دی تھی۔ (اس لئے مطیع و نافرمان انسانوں کے متعلق ان کی شہادت بہت وقیع اور معتبر ہوگی) مجالس برقی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ انہ لیس من قوم ائتموا باماھم فی الدنیا الا جاء یوم القیامۃ یلعنھم ویلعنونہ الا انتم ومن علی مثل حالکم۔ اے مالک جہنمی (سوائے تمہارے شیعوں کے) اور جس قوم نے بھی دارِ دنیا میں کسی امام کی اقتداء کی ہوگی وہ اس حال میں بروزِ قیامت آئے گی کہ ان کا امام ان پر لعنت کرتا ہوگا اور وہ امام پر لعنت کرتی ہوگی۔ امالی شیخ مفیدؒ میں ایک طویل حدیث شریف حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے اس کا آخری حصہ یہ ہے۔ ثم ینادی ثانیۃ این خلیفۃ اللہ فی ارضہ فیقوم امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام فیاتی النداء من قبل اللہ عزوجل یا معشر الخلائق ھذا علی ابن ابی طالب خلیفۃ اللہ فی ارضہ حجۃ علی عبادہ فمن تعلق بحبلہ فی الدنیا فلیتعلق بحبلہ فی ھذا الیوم لیستضیئ بنورہ ولیتبعہ فی الدرجات العلی من الجنان قال فیقوم الناس الذین تعلقوا بحبلہ فی الدنیا فیتبعونہ الی الجنۃ۔ ثم یاتی النداء من عند اللہ جل جلالہ الا من ائتم بامام فی دار الدنیا فلیتبعہ الی حیث یذھب بہ الذین اتبعو من الذین اتبعو وراوا العذاب وتقطعت بھم الاسباب ○ وقال الذین اتبعوا لو ان لنا کرۃ فنتبرا منھم کما تبرؤا منا کذالک یریھم اللہ اعمالھم حسرات علیھم وما ھم بخارجین من النار ○ اسی طرح حضرات آئمہ طاہرین علیہم السلام کا اپنے شیعوں کے حساب و کتاب کے متولی ہونے کی بعض نصوص معتبرہ مسئلہ شفاعت میں گذر چکی ہیں۔ ان کا یہاں دوبارہ ذکر کرنا موجب طوالت ہے۔ اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔ اسی طرح آیت مبارکہ ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم کی تفسیر میں ایسی بکثرت روایات مروی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حساب لینے کے متولی آئمہ اطہارؑ ہوں گے۔ چنانچہ تفسیر فرات کوفی میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے مروی ہے فرمایا۔ الینا ایاب ھذا الخلق وعلینا حسابھم۔ ان لوگوں کا حساب و کتاب

ليوم القيمة فلا تظلم نفس شيئاً قال الموازين الانبياء والاوصياء ومن الخلق من يدخل الجنة بغير حساب واما السؤال فهو

کے میزان قائم کریں گے۔ اور کسی نفس پر ظلم نہیں کیا جائے گا" کے متعلق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ اس جگہ میزانوں سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا میزانوں سے مراد انبیاء و اوصیاء ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو بغیر کسی حساب و کتاب کے داخلِ جنت ہوں گے۔ البتہ (دین کے بارے میں) سوال ہر شخص سے کیا جائے گا۔

ہمارے ذمہ ہے۔ اس کتاب میں حضرت صادق ؑ سے مروی ہے کہ آپ نے یہ بات پڑھنے کے بعد فرمایا رد فینا۔ یعنی یہ آیت ہمارے حق میں نازل ہوئی ہے اس قسم کی روایات کا اچھا خاصہ وخیرہ کتاب مستطاب مرأۃ الانوار ومشکوٰۃ الاسرار معروف بمقدمہ تفسیر برہان مؤلفہ حضرت مرزا ابوالحسن الشریف میں جمع کر دیا گیا ہے۔ واللہ العالم بحقائق امورہ او حججہ فی بلادہ و عبادہ۔

کن لوگوں کا حساب لیا جائے گا؟

گذشتہ مسئلہ کی طرح اس مسئلہ میں بھی اگرچہ قرآن کی متعدد آیات وروایات کے عمومات سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ کہ ہر شخص کا محاسبہ ہوگا۔ اور ہر شخص سے سوال وجواب ہوگا۔ لیکن بموجب قاعدہ ما من عام الا وقد خص بعض آیات وروایات معتبرہ سے یہ مستفاد ہوتا ہے۔ کہ بعض کامل مومنین اور خالص کفار ومشرکین کا حساب نہیں لیا جائے گا۔ اول الذکر بلا حساب داخلِ جنت ہوں گے۔ اور ثانی الذکر بلا حساب جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ ان دو گروہوں کے علاوہ باقی سب لوگوں کا محاسبہ ہوگا۔ چنانچہ آیۃ مبارکہ یومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان (سورہ رحمٰن پ۲۷ ع) یعنی بروز قیامت کسی جن وانس سے اس کے گناہوں کا سوال نہ کیا جائے گا" کی تفسیر میں متعدد روایات میں آئمہ طاہرین ؑ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ یہ شرف جن وانس میں سے خالص شیعوں کو حاصل ہے۔ (تفسیر مجمع البیان وصافی اور برہان وغیرہ) اگر اس آیت کو اپنے عموم پر باقی رکھا جائے اور اس کے یہ معنی کئے جائیں کہ بروز حشر کسی جن وانس سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا تو پھر اس آیت کا مفہوم ان بیسیوں دوسری آیات وروایات کے مفہوم سے متصادم ہوگا جن میں ہر چھوٹے بڑے قول وفعل پر محاسبہ ہونے اور ذرہ ذرہ پر جزا وسزا ملنے کا تذکرہ موجود ہے۔ نیز اس صورت میں حشر ونشر کا بے کار محض ہونا لازم آتا ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔

واقع علی جمیع الخلق لقول اللہ تعالیٰ فلنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین یعنی عن الدین واما الذنب فلا یسئل عنہ

جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کی رسول بھیجے گئے اور رسولوں سے بھی ضرور سوال کریں گے یعنی دین کے متعلق۔ لیکن گناہوں کا سوال صرف انہی لوگوں سے کیا جائے گا جن کا حساب لیا جائے گا۔

مروی ہے۔ اور وہ جناب اپنے آباؤ اجداد طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں، کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ ان اللہ عزّوجلّ یحاسب کل الخلق الامن اشرک باللہ عزّوجلّ فانہ لا یحاسب ویؤمر بہ الی النار۔ یعنی خداوند عالم تمام مخلوق کا حساب لے گا سوائے مشرکین کے۔ کیونکہ ان کا حساب نہ ہوگا۔ بلکہ ان کو بے حساب جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اسی طرح اصول کافی میں جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا۔ اعلموا عباد اللہ ان اھل الشرک لا تنصب لھم الموازین ولا تنشر لھم الدواوین وانما یحشرون الی جھنم زمرًا وانما تنصب الموازین وتنشر الدواوین لاہل الاسلام۔ اے اللہ کے بندو۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ (بروز قیامت) مشرکین کے لئے نہ کوئی میزان نصب کیا جائے گا۔ اور نہ ہی ان کا دفتر اعمال کھولا جائے گا۔ بلکہ بلا حساب انہیں گروہ گروہ کر کے داخل جہنم کیا جائے گا۔ ہاں اہل اسلام کے لئے میزان نصب کیا جائے گا، دفتر اعمال کھولا جائے گا اور ان کا حساب و کتاب بھی ہوگا۔

کن کن چیزوں کا حساب ہوگا؟

اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ لیکن اس قدر یقینی ہے کہ حقوق الناس اور بعض حقوق اللہ کی پرسش ضرور ہوگی۔

اصول کافی وغیرہ کتب معتبرہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا اوّل ما یحاسب بہ العبد الصلوٰۃ فان قبلت قبل ما سواھا وان ردت رد ما سواھا۔ سب سے پہلے بندہ سے نماز کے متعلق محاسبہ ہوگا۔ پس اگر نماز قبول ہوگئی۔ تو باقی تمام اعمال قبول ہو جائیں گے۔ اور اگر یہ رد کر دی گئی۔ تو دوسرے سب اعمال بھی رد کر دیئے جائیں گے ؎

روز محشر کہ جاں گداز بود　　　اوّلیں پرسشِ نماز بود

کتاب انوار نعمانیہ میں انہی حضرت سے مروی ہے۔ فرمایا اوّل ما یسئل عن العبد اذا وقف بین یدی اللہ عزّوجلّ عن الصلوات المفروضات وعن الزکوٰۃ المفروضۃ وعن الصیام المفروض وعن الحج المفروض وعن ولایتنا اھل البیت فان اقر بولایتنا ثم مات علیھا قبلت منہ

الامن یحاسب قال اللہ تعالیٰ فیومئذٍ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان یعنی من شیعۃ النبی والائمۃ خاصۃ دون غیرھم کما ورد فی التفسیر۔

چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ اس دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہوں سے متعلق سوال نہیں ہوگا۔" مطلب یہ ہے کہ جو رسولؐ اور آئمہؑ ہدیٰ کے خالص شیعہ ہیں۔ ان سے کسی گناہ کا سوال نہ ہوگا۔ لیکن ان کے سوا دوسرے لوگوں کی یہ کیفیت نہ ہوگی۔ جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں وارد ہے۔

صلوٰتہ وصومہ وزکوٰتہ وحجہ وان لم یقربولایتنا بین یدی اللہ عزوجل لم یقبل اللہ عزوجل شیئاً من اعمالہ یعنی جب بندہ بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوگا۔ تو سب سے پہلے اس سے واجبی نماز، واجبی زکوٰۃ، واجبی روزہ، واجبی حج اور ہم اہل بیتؑ کی ولایت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ (توحید و رسالت کے متعلق سوال نہ کرنے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ حساب و کتاب ہو ہی مسلمانوں کا رہا ہے۔ اور مسلمان وہی ہوگا جو توحید و نبوت و معاد کا قائل ہو۔ شارح) پس اگر وہ ہماری ولایت کا مقر و معترف تھا۔ اور اسی عقیدہ پر اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ تو پھر اس کی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ سب اعمال قبول ہو جائیں گے۔ لیکن اگر بارگاہ ایزدی میں اس کا اس طرح اقرار و ولایت ثابت نہ ہوا۔ تو خداوند عالم اس کا کوئی عمل بھی قبول نہ فرمائے گا۔ (ونعم ما قیل ع من لم یوال فی البریۃ حیدرا۔ سیان عند اللہ صلی او زنی) بعض روایات میں یوں وارد ہے اوّل ما یسئل بہ العبد حبنا اہل البیت۔ (عیون اخبار الرضا) کہ سب سے پہلے ہم اہل بیتؑ کی محبت کے متعلق سوال ہوگا۔

صحیفۃ المؤمن ولایۃ علیؑ ابن ابی طالبؑ۔ مومن کے صحیفۂ اعمال کا عنوان ہی ولایت علیؑ ہوگا۔ (مودۃ القربیٰ ہمدانی وغیرہ)

ازالۂ اشتباہ

یہاں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ پہلی روایت میں قبولیت اعمال کا دار و مدار نماز پر رکھا گیا ہے۔ اور دوسری روایت میں قبولیت اعمال کا معیار ولایت اہل بیتؑ کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں کس طرح درست ہو سکتی ہیں۔ اس شبہ کا جواب ظاہر ہے کہ ولایت اہل بیت علیہم السلام تمام اعمال (جن میں خود نماز بھی داخل ہے) کی قبولیت کی شرطِ اعظم ہے۔ لیکن نماز فقط دوسرے اعمال کی شرط۔ لہٰذا جب ان دونوں کا مقام و مورد علیحدہ علیحدہ ہے۔ یعنی ولایت کا دائرہ عام اور نماز کا خاص ہے۔ لہٰذا ان دونوں روایتوں میں کسی قسم کا کوئی تضاد و اختلاف نہیں ہے۔

خصال شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں بسلسلۂ سند آئمہ طاہرین علیہم السلام جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وکل محاسب معذب ولو بطول الوقوف ولا ینجو من النار ولا یدخل الجنۃ احد الا برحمۃ اللہ تعالیٰ وان اللہ تبارک وتعالیٰ یخاطب عبادہ من الاولین والآخرین بمجمل

اور ہر اس شخص کو جس کا کہ حساب ہوگا۔ عذاب کیا جاوے گا۔ اگرچہ یہ عذاب عرصۂ محشر میں زیادہ دیر ٹھہرنے کے ذریعہ ہی ہو کوئی شخص اپنے اعمال کی بنا پر عذابِ دوزخ سے نجات حاصل کر سکے گا۔ اور نہ ہی جنت میں داخل ہو سکے گا۔ جب تک کہ رحمتِ خداوندی اس کے شاملِ حال نہ ہوگی۔ خداوند عالم اپنے تمام اولین و آخرین بندوں سے ان

سے مروی ہے فرمایا لا تزول قدما عبد یوم القیامۃ حتی یسئل عن اربع عن عمرہ فیما افناہ وعن شبابہ فیما ابلاہ وعن مالہ من این کسبہ وفیما انفقہ وعن حبنا اہل البیت۔ بروز قیامت کسی آدمی کے اس وقت تک دونوں قدم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کریں گے۔ جب تک اس سے چار چیزوں کے متعلق سوال نہیں کر لیا جائے گا۔ عمر کے متعلق کہ اسے کن باتوں میں صرف کیا تھا۔ جوانی کے متعلق کہ اسے کن امور میں کہنہ کیا تھا۔ مال کے متعلق کہ اسے کہاں سے حاصل کیا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا۔ اور ہم اہل بیتؑ کی محبت کے متعلق سبحان اللہ آنحضرتؐ نے اپنے ان مختصر مگر جوامع الکلم میں جو حیب "ور دریا بحباب اندر" تمام انسانی اعمال و افعال کے متعلق باز پرس ہونے کا تذکرہ کس عمدہ طریقہ سے بیان کیا ہے۔ زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے۔ جو ان حدود اربعہ سے خارج ہو؟ اسی طرح آیات و روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آنکھ، کان اور دل کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔ ارشاد قدرت ہے لا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے متعلق کچھ نہ کہو۔ کیونکہ کان، آنکھ اور دل ان سب کے متعلق سوال ہوگا۔ تفسیر عیاشی وغیرہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا یسئل السمع عما سمع۔ والبصر عما یطرف والفؤاد عما عقد علیہ یعنی کان کے متعلق سوال ہوگا۔ کہ اس نے کیا سنا تھا۔ اور آنکھ کے متعلق یہ پوچھا جائے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ اور دل کے متعلق یہ دریافت کیا جائے گا کہ اس نے کیا نظریات قائم کئے تھے؟

حقوق الناس کی شدت کا بیان

انوار نعمانیہ میں مرقوم ہے کہ بعض روایات میں وارد ہے کہ آدمی کو عرصۂ محشر میں بر ملا لا کر کھڑا کیا جائے گا۔ اور ایک منادی ندا کرے گا۔ کہ اے لوگو جس جس نے اس شخص سے کوئی حق لینا ہو۔ وہ آئے اور آکر لے جائے! اس وقت اہل محشر کے لئے اپنے پہچاننے والوں کو دیکھنے سے زیادہ سخت کوئی چیز نہ ہوگی کہ مبادا اس سے کوئی

حساب علیہم مخاطبۃ واحدۃ یسمع منھا کل واحد قضیتہ دون غیرھا ویظن انہ المخاطب دون غیرہ ولا تشغلہ تعالی مخاطبۃ عن مخاطبۃ ویفرغ من حساب الاولین والآخرین فی مقدار نصف ساعۃ

کے اعمال کے بارے میں ایک ہی خطاب کے ذریعہ ان کا اجمالی طور پر حساب لے لیگا۔ اس خطاب سے ہر شخص اپنا ذاتی معاملہ اچھی طرح سمجھ لے گا۔ کہ (مجھ سے فلاں عمل کے بارے میں پوچھا گیا ہے) اور اسے یہی گمان ہو گا کہ یہ خطاب کسی اور سے نہیں ہے بلکہ مجھ سے ہی ہے۔ خداوند کریم کو ایک شخص سے خطاب کرنا دوسرے کے ساتھ خطاب کرنے سے مانع نہیں ہوتا۔ خلاق عالم اپنی اولین و آخرین سب مخلوق کے حساب سے دنیوی ساعات کے اعتبار سے آدھ گھنٹہ میں فارغ ہو جائے گا۔

مطالبہ کریں۔ وارد ہے کہ ارباب خمس اس کے دامن کو پکڑلیں گے اور بارگاہ ایزدی میں عرض کریں گے ربنا ان ھذا الرجل قد اکل خمنا وتصرف فیہ ولم یدفعہ الینا۔ کہ اس نے ہمارا خمس کھایا اور ہمیں ہمارا حق نہ دیا۔ وکذلک اھل الزکاۃ۔ اسی طرح مستحقین زکوٰۃ اس کے دامن کو پکڑ کر اپنی حق تلفی کی فریاد کریں گے فیدفع اللہ الیوم عوضہ من حسنات ھذا الرجل۔ خداوند عالم ان حقوق مالیہ کے عوض ان کو اس شخص کی نیکیاں دے گا۔ اسی طرح اگر اس نے کسی اور شخص کی کوئی حق تلفی کی ہوگی تو وہ اٹھ کر اپنے حقوق کا مطالبہ کرے گا۔ اور معاملہ اس قدر سخت ہوگا کہ محدث جزائری انوار میں فرماتے ہیں۔ وفی الاخبار انہ یؤخذ بدانق فضۃ سبعمأۃ صلوۃ مقبولۃ فیعطاھا الخصم۔ یعنی اگر کسی شخص نے کسی کا بقدر چاندی کے ایک دانق کے (درہم کے چھٹے حصے کا ایک سکہ مصباح اللغات) نقصان کیا ہوگا تو اس کے معاوضہ میں صاحب حق کو اس شخص کی سات سو مقبول شدہ نمازیں دے دی جائیں گی۔ اللہ اللہ یہ تو ایک دانق کے برابر نقصان کرنے اور مخلوق خدا کو گزند پہنچانے والوں کی سزا ہے لیکن جن بدبختوں کی تمام عمر گذر اوقات ہی حقوق الناس پر ڈاکہ ڈالنے پر رہی ہو۔ ان کا انجام کیا ہوگا؟ خصوصاً جب کہ نیکیوں کا پلہ بھی ہلکا ہو۔

ع۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے   اللّٰھم عفوک عفوک

علل الشرائع وغیرہ میں اس قسم کی بعض احادیث وارد ہیں کہ جب بروز قیامت قرض خواہ اپنے مقروض سے تقاضا کرے گا۔ تو اگر مقروض کے پاس نیکیاں ہوئیں تو ان سے بمقدار قرضہ قرض خواہ کو دے دی جائیں گی۔ اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں۔ تو قرض خواہ کے گناہ کم کر کے مقروض کے پلے میں ڈال دیئے جائیں گے۔ ایسا ہی ایک طویل حدیث کے ضمن میں مرقوم ہے جو بحوالہ اصول کافی حق الیقین علامہ مجلسی میں مرقوم۔ اور امام زین العابدین علیہ السلام

من ساعات الدنیا یخرج اللہ تعالیٰ لکل انسان کتابا یلقٰہ منشورا ینطق علیہ بجمیع اعمالہ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصیٰھا فیجعلہ اللہ حسیب نفسہ والحاکم علیہ بان یقال لہ اقرا کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک

اور اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کا اعمالنامہ اس کے سامنے پیش کر دے گا۔ جس کو وہ کھلی ہوئی کتاب کی شکل میں اپنے سامنے دیکھ لے گا۔ وہ کتاب ہر انسان کو اس کی کارروائیوں سے آگاہ کر دے گی۔ اور وہ کتاب اس کے تمام چھوٹے اور بڑے اعمال کو احاطہ کئے ہوئے ہوگی۔ اس طرح خداوند عالم ہر شخص کو خود اپنا محاسب اور حکم قرار دے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ تو اپنے اعمال نامے کو پڑھ۔ آج کے دن تو اپنا حساب لینے کے لئے خود ہی کافی ہے۔

سے منقول ہے۔ آپ نے ایک سائل کے اس سوال کے جواب میں فرمایا۔ جو کہ فرزند رسولؐ اگر کسی مسلمان نے کسی کافر کے کوئی حق لینا ہو۔ تو اس کی تلافی کیونکر ہوگی۔ کیونکہ کافر تو جہنمی ہے۔ اس کے پاس حسنات تو ہیں نہیں؟ آپ نے فرمایا اس حق کی مقدار کے مطابق اس کافر کے عذاب وعقاب میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ سائل نے عرض کیا اگر کسی نے کسی پر ظلم کیا ہو تو ظلم کا انصاف کیونکر کیا جائے گا۔ فرمایا ظالم کی نیکیاں بقدر ظلم مظلوم کو دیدی جائیں گی۔ سائل نے پھر عرض کیا۔ اگر اس ظالم کے پاس نیکیاں نہ ہوں تو پھر کیا کیا جائے گا؟ فرمایا مظلوم کے گناہوں کا بوجھ ظالم پر ڈال دیا جائے گا۔" جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ ان الذنوب ثلٰثۃ فذنب مغفور وذنب غیر مغفور وذنب مرجو لصاحبہ ونخاف علیہ اما الذنب المغفور فعبد عاقبہ اللہ تعالیٰ علی ذنبہ فی الدنیا فاللہ احکم واکرم ان یعاقب عبدہ مرتین واما الذی لا یغفر فظلم العباد بعضھم لبعض فان اللہ تعالیٰ اقسم قسما علی نفسہ فقال وعزتی وجلالی لا یجوزنی ظلم ظالم ولو کف بکف واما الذنب الثالث فذنب سترہ اللہ علی عبدہ ورزقہ التوبۃ فاصبح خاشعا من ذنبہ راجیا لربہ (نہج البلاغۃ) گناہ تین قسم کے ہیں۔ ایک گناہ وہ ہے جو معاف کر دیا جائے گا۔ دوسرا وہ ہے جو ہرگز معاف نہ ہوگا تیسرا وہ گناہ ہے جس کی بخشش کی امید تو ہے مگر اس کا اندیشہ ضرور ہے۔ پہلی قسم سے مراد وہ گناہ ہے جس کی سزا خدا دار دنیا میں دیدے۔ خدا کی ذات اس سے اجل وارفع ہے کہ دو بار اپنے بندے کو سزا دے۔ دوسری قسم سے مراد بعض بندوں کا بندوں پر ظلم وجور ہے۔ خداوند عالم نے اپنی عزت وجلالت کی قسم کھائی ہے کہ ظالم کا ظلم مجھ سے تجاوز نہیں کرے گا۔ اگرچہ صرف ہاتھ پر ہاتھ مارا گیا ہو۔ تیسری قسم سے مراد وہ گناہ ہے جسے خدا نے پوشیدہ رکھا ہو۔ اور پھر گنہگار کو توفیق توبہ بھی نصیب ہو گئی ہو۔ یہ وہ گناہ ہے جس کا مرتکب اپنے گناہ سے خائف اور رحمت پروردگار کا امیدوار ہے۔

حسیباً و یختم تبارک و تعالیٰ علی قوم علی افواههم و تشهد ایدیهم و ارجلهم و جمیع جوارحهم بما کانوا یکتمون و قالوا لجلودهم شهدتم علینا قالوا انطقنا الله الذی انطق کل شیءٍ وهو خلقکم اول مرة والیه ترجعون وما کنتم

خداوند عالم ایک گروہ کے مونہوں پر مہر لگا دے گا۔ ان کے ہاتھ پاؤں بلکہ تمام اعضاء ان کے اعمال پر جنہیں وہ لوگ چھپا کر کیا کرتے تھے۔ گواہی دیں گے۔ وہ لوگ اپنے اعضاء سے کہیں گے "تم نے کیوں ہمارے خلاف شہادت دی ہے؟" اعضاء کہیں گے ہم کو اسی خدا نے بولنے کی طاقت دی ہے۔ جس نے ہر چیز کو قوتِ گویائی بخشی ہے۔ اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا۔ اور اسی کی طرف تمہاری بازگشت ہو گی۔

کس قدر مفلس و بے کس اور بے بس ہو گا۔ وہ انسان جس کے حسنات بروزِ قیامت دوسروں کی طرف چلے جائیں گے۔ یا دوسروں کے سیئات اس کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ اسی لئے روایت میں وارد ہے کہ ایک دفعہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس و نادار کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں وہ مفلس کہلاتا ہے۔ جس کے پاس درہم و دینار اور مال و متاع نہ ہو۔ آپ نے فرمایا۔ المفلس من امتی من اتی یوم القیامة بصلوٰة وصیام وزکوٰة وحج ویاتی قد شتم هذا واکل مال هذا وسفك دم هذا وضرب هذا فیعطی هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه اخذ من خطایاه فطرحت علیه ثم یطرح فی النار (انوار نعمانیہ)

درحقیقت میری امت میں مفلس و نادار وہ ہے جو بروزِ قیامت نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ کے ساتھ آئے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے کسی کو گالیاں دی ہوں گی۔ کسی کا مال کھایا اور دبایا ہو گا۔ کسی کو قتل کیا ہو گا۔ کسی کو مارا پیٹا ہو گا۔ لہٰذا ان مظلوموں میں سے ہر ایک کو اس کی نیکیوں میں سے دی جائیں گی۔ اور اگر ادائیگی حقوق سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں تو ان کے گناہ اس کے پلہ میں ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اسے آتشِ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

ادائیگی حقوق کی ترغیب چونکہ حقوق الناس کا معاملہ بہت سخت ہے۔ اس لئے حکماء ربانیین یعنی پیغمبر اسلامؐ و آئمہ طاہرین علیہم السلام نے دارِ دنیا میں حقداروں سے حق بخشوانے یا ان کے حقوق ادا کرنے کی بہت تاکید فرمائی ہے اور اس امر کی بہت ترغیب دی ہے۔ چنانچہ انوارِ نعمانیہ میں آنحضرتؐ کی یہ حدیث موجود ہے۔ فرمایا درهم یرده العبد الی الخصماء خیر له من عبادة الف سنة وخیر له من عتق الف نسمة وخیر له من الف حجة وعمرة۔ یعنی کوئی انسان ایک درہم

تسئلون ان تشھد علیکم سمعکم ولا ابصارکم ولا جلودکم ولکن ظننتم ان اللہ لا یعلم کثیرا مما تعملون وساجرد کیفیۃ وقوع الحساب فی کتاب حقیقۃ المعاد انشاء اللہ تعالیٰ۔

تم اپنے اعمال کو چھپا کر اس وجہ سے نہ کرتے تھے کہ تمہارے خلاف تمہارے کان، آنکھیں اور تمہاری کھالیں گواہی دیں گی۔ بلکہ تمہارا تو گمان یہ تھا کہ جو کچھ تم کرتے ہو، خدا کو ان میں سے اکثر کی خبر نہیں ہوتی۔ میں انشاء اللہ عنقریب "حقیقۃ المعاد" کے نام سے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس میں حساب و کتاب کی کیفیت علیحدہ لکھوں گا۔

اپنے طلب گاروں کو واپس کر دے تو یہ ہزار برس کی عبادت، ہزار غلام آزاد کرنے، ہزار حج و عمرہ بجالانے سے بہتر ہے۔ نیز جزائری مرحوم نے آئمہ علیہم السلام سے مرسلاً نقل کیا ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا۔ من ارضی الخصماء من نفسہ وجبت لہ الجنۃ بغیر الحساب ویکون فی الجنۃ رفیق اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام۔ یعنی جو اپنے طلب گاروں کو راضی کرے۔ اس کے لیے بلا حساب جنت واجب ہو جاتی ہے۔ اور جنت میں اُسے اسماعیلؑ کی رفاقت نصیب ہو گی۔ الی غیر ذلک من الاخبار والآثار۔

تذنیب عجیب ضروریاتِ زندگی پر حساب و کتاب کے ہونے یا نہ ہونے کے بارہ میں اخبار و آثار بظاہر مختلف ہیں۔ اس سلسلہ میں درج ذیل تحقیق قابلِ دید ہے سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ ثالث بحار الانوار میں مباحث حساب و کتاب لکھنے کے بعد بعنوان "تذنیب" رقمطراز ہیں اعلم ان الحساب حق نطقت بہ الآیات المتکاثرۃ والاخبار المتواترۃ فیجب الاعتقاد بہ واما ما یحاسب العبد بہ ویسئل عنہ فقد اختلف فیہ الاخبار فمنہا ما یدل علی عدم السؤال عما تصرف فیہ من الحلال وفی بعضہا لحلالہا حساب ولحرامہا عقاب و[illegible] یمکن الجمع بحمل الاولی علی المومنین والاخریٰ علی غیرھم او الاولی علی الامور الضروریۃ کالماکل والملبس والمسکن والمنکح والاخریٰ علی ما زاد علی الضرورۃ کجمع الاموال زائداً علی ما یحتاج الیہ وصرفہا فیما لا تدعوہ الیہ ضرورۃ ولا یستحسن شرعاً ویؤیدہ بعض الاخبار۔ یعنی جاننا چاہیئے کہ اصل حساب حق ہے۔ اس کے متعلق آیات متکاثرہ اور اخبار متواترہ وارد ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس کا اعتقاد رکھنا تو واجب ہے باقی رہا یہ امر کہ آدمی سے کن کن چیزوں کا محاسبہ کیا جائے گا؟ اس سلسلہ میں اخبار مختلف ہیں۔ بعض روایات میں وارد ہے کہ کھانے۔ پینے۔ پہننے کے متعلق جن حلال چیزوں میں بندہ نے تصرف کیا ہو گا۔ اس کے متعلق اس سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ لیکن بعض روایات میں وارد ہے کہ حلال دنیا میں حساب اور حرام میں عقاب

ہوگا۔ ان دونوں قسم کی روایات میں دو طرح پر جمع ہو سکتی ہے۔ اوّل۔ اس طرح کہ پہلی قسم کی روایتوں کو مومنین پر محمول کیا جائے۔ اور دوسری قسم کو غیر مومنین پر یعنی کامل الایمان لوگوں سے ان اشیاء کا حساب نہیں لیا جائے گا۔ اور دوسروں سے ان کا محاسبہ ہوگا۔ دوئم۔ اس طرح کہ پہلی قسم کی روایات کو امور ضروریہ مثل کھانے پینے پہننے اور نکاح کرنے پر حمل کیا جائے (کہ ان کا حساب نہیں ہوگا) اور دوسری قسم کی روایات کو زائد از ضرورت صرف کرنے یا بلاضرورت شرعیہ کسی جگہ (بطور اسراف و تبذیر) خرچ کرنے (اور بلاضرورت ان کی جمع آوری میں وقت عزیز ضائع کرنے) پر محمول کیا جائے اور بعض اخبار اس جمع بین الاخبار کی تائید کرتی ہیں۔ سرکار علامہ کی یہ فرمائش بہت متین بلکہ ورثمین ہے۔ وبالقبول قمین۔

بروز قیامت خداوند عالم کے احتجاج کا بیان

امالی شیخ مفید علیہ الرحمۃ میں روایت ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے آیت مبارکہ قل فللہ الحجۃ البالغۃ (کہدو۔ اللہ کے لئے حجت بالغہ ہے) کا مطلب دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا۔ ان اللہ یقول للعبد یوم القیامۃ عبدی کنت عالماً فان قال نعم قال لہ افلا عملت بما علمت وان قال کنت جاہلاً قال افلا تعلمت حتی تعمل فیخصم فتلک الحجۃ البالغۃ للہ عزوجل علی خلقہ۔ یعنی جب قیامت کا دن ہوگا۔ تو خداوند عالم اپنے بندے سے پوچھے گا اے میرے بندے کیا تو عالم تھا؟ اگر اس نے اثبات میں جواب دیا تو ارشاد ہوگا تو نے اپنے علم پر عمل کیوں نہ کیا۔ اور اگر اس نے یہ کہا کہ میں تو جاہل تھا تو اس سے فرمائے گا تو نے کیوں علم حاصل نہیں کیا تھا تاکہ عمل کر سکتا؟ اس طرح وہ مغلوب ہو جائے گا۔ یہ مطلب ہے اللہ کی حجت بالغہ کا۔ اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ یوتی بالمرأۃ الحسناء یوم القیامۃ التی قد افتتنت فی حسنہا فتقول یارب حسنت خلقی حتی لقیت ما لقیت فیجاء بمریم علیہا السلام فیقال انت احسن ام ہذہ حسناہا فلم نفتتن ویجاء بالرجل الحسن الذی افتتن فی حسنہ فیقول یارب حسنت خلقی حتی لقیت من النساء ما لقیت فیجاء بیوسف علیہ السلام فیقال انت احسن او ھذہ قد حسناہ فلم یفتتن ویجاء بصاحب البلاء الذی قد اصابۃ الفتنۃ فی بلاہ فیقول یارب شددت علی البلاء حتی افتتنت فیجاء بایوب علیہ السلام فیقال ابلیتک اشد ام بلیۃ ھذا فقد ابتلی فلم یفتتن۔ یعنی بروز قیامت ایسی خوبصورت عورت کو بلایا جائے گا جو اپنے حسن و جمال کی وجہ سے بعض گناہوں میں مبتلا ہو چکی ہوگی۔ وہ عرض کرے گی یا اللہ تو نے مجھے حسن و جمال دیا تھا اس لئے میں گناہوں میں مبتلا ہو گئی اس وقت حضرت مریم علیہا السلام کو پیش کرکے اس عورت سے پوچھا جائے گا تو زیادہ خوبصورت تھی یا یہ جسے ہم نے حسن و جمال بھی دیا تھا مگر اس کے باوجود اس نے گناہ نہیں کیا۔ پھر اس خوبصورت مرد کو لایا جائے گا

میں لایا جائے گا۔ جس نے بوجہ اپنے حسن و جمال گناہ کئے ہوں گے سوعن کرے گا۔ بارالہا تو نے مجھے حسن دیا تھا جس کی وجہ سے مبتلائے گناہ ہوگیا۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کو پیش کرکے خدا ارشاد فرمائے گا۔ تو زیادہ خوبصورت ہے یا یہ؟ جسے ہم نے حسن و جمال دیا تھا۔ مگر اس نے گناہ نہیں کیا۔ اس طرح پھر اس مبتلائے مصیبت کو لایا جائے گا جس نے بوجہ تکلیف گناہ کئے ہوں گے۔ وہ سوعن کرے گا میرے اللہ تو نے میری تکلیف سخت کی تھی اس لئے مجھ سے گناہ ہوگیا۔ اس وقت جناب ایوبؑ کو پیش کرکے کہا جائے گا۔ آیا تیری تکلیف زیادہ سخت یا ان کی؟ دیکھئے ان کو کس قدر سخت بلا و مصیبت میں گرفتار کیا گیا۔ مگر پھر بھی انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اسی طرح خدائے حکیم نے تمام شعبہ ہائے زندگی میں اپنی کچھ حجتیں مقرر کر رکھی ہیں جن کے ذریعہ وہ اتمام حجت کرتا ہے۔ جیسے امراء و سلاطین کی بیویوں کے لئے جناب آسیہ، وزراء کے لئے جناب حزقیل وعلی ھذا القیاس۔

نامہائے اعمال کا ہاتھوں میں دیا جانا

بکثرت آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ تو ان کے ہاتھوں میں ان کے نامہائے اعمال دے دیے جائیں گے۔ سعداء کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور اشقیاء کا بائیں ہاتھ میں۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے ونخرج له یوم القیمة کتابا یلقاه منشورا (سورہ بنی اسرائیل پ۱۵ ع ۲) ہم بروزِ قیامت ہر بندے کے لئے ایک کتاب (نامۂ اعمال) نکالیں گے۔ جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حسابا یسیرا واما من اوتی بشماله فسوف یدعو ثبورا۔ (سورہ الانشقاق پ۳۰ ع ۹) یہ نامہ جس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اس کا حساب بہت آسان ہوگا۔ اور جس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا۔ وہ ہلاکت کو طلب کرے گا۔ اس وقت ارشاد ہوگا۔ اقرأ کتابك كفى بنفسك الیوم علیك حسیبا۔ اے بندہ اپنے نامۂ اعمال کو پڑھ۔ آج اپنے حساب کے لئے تو ہی کافی ہے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہر انسان میں پڑھنے کی طاقت آجائے گی۔ اور حافظہ اس قدر تیز ہو جائے گا کہ فوراً پوری زندگی کے تمام حرکات و سکنات اس کے سامنے آجائیں گے۔ گویا کہ اس نے ابھی ابھی یہ سب کچھ کیا ہے۔ (تفسیر عیاشی) چنانچہ ارشادِ قدرت ہے علمت نفس ما قدمت واخرت۔ ہر نفس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے آگے کیا (عمل) بھیجا تھا۔ اور اپنے پیچھے کیا (آثار) چھوڑے تھے۔ اس وقت بندے بے ساختہ پکار اٹھیں گے۔ ما لھذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاھا (سورۃ کہف پارہ ۱۵ ع) اس نامۂ اعمال کو کیا ہوگیا ہے۔ اس نے تو تمام چھوٹے اور بڑے گناہوں کو یہیں شمار کرکے رکھ دیا ہے۔

طریقہ بعض آیات وروایات سے مستفاد ہوتا ہے۔ کہ اس وقت کچھ ایسے بے حیا لوگ بھی ہوں گے کہ ایسے وقت میں صاف صاف انکار کر دیں گے۔ کہ بار الٰہا یہ اعمال وافعال جو اس نامہ میں درج ہیں یہ ہمارے نہیں ہیں۔ تفسیر قمی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ اس وقت خداوند عالم کاتبانِ اعمال فرشتوں کو بطور گواہ ان کے خلاف پیش کرے گا۔ تو وہ بے حیا اس وقت کہیں گے کہ بار الٰہا یہ تیرے فرشتے ہیں۔ اس لئے تیرے ہی حق میں گواہی دے رہے ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے ہرگز یہ گناہ نہیں کئے۔ اور وہ اپنے اس دعوے پر قسمیں بھی کھائیں گے۔ چنانچہ خداوند عالم ان کی اس کیفیت کی یوں خبر دیتا ہے۔ یوم یبعثھم اللّٰہ جمیعاً فیحلفون لہ کما یحلفون لکم (سورۃ مجادلہ پ ۲۸ ع ۳) (اعمال بد نہ کرنے پر جھوٹی) قسمیں کھائیں گے۔ جس طرح تمہارے لئے کھاتے ہیں۔ مرزا غالب نے اس مخصوص گروہ کی نمائندگی اپنے مخصوص رنگ میں اس طرح کی ہے ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

جب ان لوگوں کی ڈھٹائی اور بے حیائی اس حد تک پہنچ جائے گی۔ اس وقت خدائے قادر وقہار ان کے مونہوں پر مہریں لگا دے گا۔ اور ان کے اعضاء وجوارح پکار پکار کر ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ ارشادِ قدرت ہے۔ الیوم نختم علٰی افواھھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون۔ ہم ان کے مونہوں پر مہریں لگا دیں گے۔ اور ان کے ہاتھ ہم سے ہم کلام ہوں گے۔ اور جو کچھ وہ کرتے تھے اس کی ان کے پاؤں گواہی دیں گے۔ (سورۃ یٰس پ ۲۳ ع ۴) ایک دوسرے مقام پر خلاق عالم نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ یوم یحشر اعداء اللّٰہ الی النار فھم یوزعون حتیٰ اذا ما جاؤھا شھد علیھم سمعھم وابصارھم وجلودھم بما کانوا یعملون (سورۃ حم سجدہ پ ۲۴ ع ۱۷) جس دن اللہ کے دشمن جہنم کے پاس جمع کئے جائیں گے۔ پھر وہ (جو پہلے پہنچے اوروں کے انتظار میں) روکے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ (سب) جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں جو جو بدعمل وہ کیا کرتے تھے۔ اس کی بابت ان کے برخلاف شہادت دیں گی۔ ۔ مقبول ترجمہ تفسیر قمی وغیرہ میں منقول ہے کہ اس وقت خداوند عالم ان کی زبانوں کو گویا کرے گا۔ اور وہ اپنے ان اعضاء سے کہیں گے وقالوا لجلودھم لم شھدتم علینا۔ تم ہم پر کیوں گواہی دے رہے ہو؟ قالوا انطقنا اللّٰہ الذی انطق کل شیٔ ہمیں اُسی خدائے قادر وقیوم نے گویا کیا ہے۔ جو ہر شئے کو گویا کرتا ہے۔ اس وقت وہ لاجواب ہو جائیں گے۔ قل فللّٰہ الحجۃ البالغۃ ان کا یہ انکار اور پھر اس پہ اصرار ان کی انتہائی حماقت وجہالت کی دلیل ہے۔ ورنہ اگر وہ بجائے انکار کے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیتے تو بعید نہ تھا کہ خدائے رحیم وکریم

کی رحمتِ واسعہ ان کے شاملِ حال ہو جاتی۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ جب اعمال تولے جائیں گے اور آدمی کی برائیاں زیادہ ہوں گی تو ملائکہ کو حکم دیا جائے گا کہ اسے جہنم میں ڈال دو۔ جب اسے ملائکہ لے کر چلیں گے تو وہ پیچھے مڑ کر دیکھے گا۔ ارشادِ قدرت ہوگا۔ پیچھے مڑ کر کیوں دیکھتا ہے؟ وہ عرض کرے گا۔ یارب ما کان حسن ظنی بک ان تدخلنی النار۔ پالنے والے مجھے تیری ذات کے متعلق یہ حسنِ ظن نہ تھا کہ تو مجھے آتشِ جہنم میں جھونک دے گا۔ ارشادِ قدرت ہوگا اے میرے ملائکہ مجھے اپنی عزت و جلالت کی قسم گو اس نے ایک دن بھی میرے متعلق یہ حسنِ ظن قائم نہیں کیا تھا لیکن چونکہ اس نے دعوے کیا ہے لہٰذا اسے جنت میں داخل کر دو (انوار نعمانیہ) اسی لئے تو ایک زیرک شاعر نے کہا ہے ؎ مالی اذا وضع الحساب وسیلۃ بہا نجو بہا من حر نار موقد :: الا اعترافی بالذنوب وانّنی متمسک بولاء آل محمد۔ جب حساب و کتاب شروع ہوگا تو میرے پاس سوائے اپنے گناہوں کے اقرار اور آلِ رسولؐ کی ولایت کے اظہار کے اور کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے آتشِ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے نجات حاصل کر سکوں۔

حقیقتِ میزان کا بیان

میزان کے اجمالی عقیدہ پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے بلکہ اس کا اعتقاد رکھنا ضروریاتِ اسلام میں سے ہے۔ اس کے متعلق آیاتِ متکاثرہ و روایاتِ متواترہ موجود ہیں۔ ہاں البتہ اس کی حقیقت میں قدرے اختلاف ہے۔ اوّل جو کہ اکثر علماءِ اسلام نے اختیار کیا ہے کہ بروزِ قیامت دو پلڑے والا ایک جسمانی ترازو قائم کیا جائے گا۔ جس میں مکلفین کے اعمال تولے جائیں گے۔ دوم یہ کہ میزان سے مراد عدلِ خداوندی ہے کہ اعمال کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی۔ سوم یہ کہ اس سے مراد انبیاء و اوصیاء علیہم السلام ہیں۔ چونکہ لغت میں میزان کے معنی ما یعرف بہ مقادیر الاشیاء وہ چیز جس کے ذریعہ کسی چیز کی مقدار معلوم کی جا سکے اسی وجہ سے مختلف چیزوں کی مقدار معلوم کرنے کے میزان علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ عام مادی اشیاء کا وزن معلوم کرنے کے لئے مادی ترازو ہوتا ہے اور غیر مادی چیزوں کے غیر مادی جیسے اشعار کے لئے عروض فلکیات کے لئے اسطرلاب میزان مقرر ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ بنا بریں اگرچہ خدا تعالیٰ کے مظاہر عدل انبیاء و اوصیاء کو بھی جن کی اتباع باعثِ دخولِ جنت اور مخالفت موجب دخولِ نار ہے میزان کہا جاتا ہے لیکن ظواہر قرآن و حدیث اور اکثر علمائے اسلام کے اقوال سے بھی جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ میزان جس کا اعتقاد ضروری ہے وہ بمعنیٰ اوّل ہی ہے ارشاد قدرت ہے والوزن یومئذ الحق فمن ثقلت موازینہ فاولئک ہم المفلحون ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسہم بما کانوا بایاتنا یظلمون (سورہ اعراف پ ۸ ع ۸) اور اس دن کی تول برحق ہے پس جس کی نیکیاں بھاری ہو گئیں وہی تو کامیاب ہیں اور جس کی نیکیاں ہلکی ہو گئیں وہ وہی ہیں جنہوں نے

ہماری نشانیوں پر ظلم کرنے کے سبب اپنے آپ کو نقصان پہنچایا (مقبول ترجمہ) اس آیت مبارکہ میں وزن اور اس کے اوصاف ثقل و خفت کا تذکرہ اس ظاہری میزان پر دلالت کرتا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئاً وان کان مثقال حبۃ من خردل اتینا بھا وکفی بنا حاسبین (انبیاء پ ۱۷ ع ۴) اور قیامت کے دن انصاف کی میزانیں قائم کریں گے پس کسی نفس پر ذرا سا بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی (کوئی عمل) ہوگا تو ہم اسے لا حاضر کریں گے اور حساب لینے کو ہم ہی کافی ہیں (مقبول ترجمہ) اس آیت میں بھی میزان نصب کرنے اور اس میں چھوٹے یا بڑے عمل کو وزن کرنے کا بالصراحت ذکر موجود ہے۔ اس مضمون کی اخبار جن میں میزان کے نصب کرنے اور اس میں اعمال کے تولے جانے کا تذکرہ موجود ہے اس قدر زیادہ ہیں کہ یہاں ان کا عدد و احصاء مشکل ہے۔ شائقین تفصیل سیوم بحار الانوار وغیرہ کتب مفصلہ کی طرف رجوع کریں۔

دو شبہات اور ان کے جوابات

اول یہ کہ آیا خداوند عالم کو اس میزان کے بغیر یہ علم نہیں کہ کس انسان کے حسنات کس قدر ہیں۔ اور سیئات کس قدر تاکہ ترازو قائم کرنے کی ضرورت لاحق ہو۔ دوئم۔ یہ کہ اعمال کس طرح تولے جائیں گے۔ تولی تو وہ چیز جاتی ہے جو جسم دار ہو جو ہر ہو اعمال تو عرض اور قائم بالغیر ہیں۔ نہ جوہر تو پھر انہیں کس طرح تولا جائے گا۔؟؟

پہلے شبہ کا پہلا جواب

پہلے شبہ کے سلسلہ میں پہلا جواب تو یہ ہے کہ ممکن ہے مختلف لوگوں کے اعتبار سے میزان مختلف ہوں۔ جیسا کہ علامہ جزائری نے اسی نظریہ کو اختیار کیا ہے۔ نیز صاحب سبیل النجاۃ نے بھی اسے پسند فرمایا ہے۔ یعنی کامل اہل ایمان کے لئے تو میزان سے مراد عدل خداوندی اور انبیاء و اوصیاء علیہم السلام ہوں۔ مگر فساق و فجار اور منافقین و اشرار کے لئے ترازو قائم کیا جائے تاکہ ان کا انجام محسوس و مشاہد ہو جائے۔ اور ان کی کارکردگی ان کے سامنے آجائے۔ اور دیگر اہل محشر بھی مشاہدہ کر لیں۔ تاکہ ان کو یقین کامل ہو جائے کہ ان کی سزا انہی کے عقائد و اعمال و اعمال ناشائستہ کا نتیجہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں خدائے رحمٰن کو مورد الزام قرار نہ دیں۔ وما یظلم ربک احداً۔

دوسرا جواب

اس شبہ کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ تمام لوگوں کے لئے یہی ظاہری جسمانی طور پر ترازو قائم کیا جائے۔ اور اس کی وجہ یہ ہو کہ اہل ایمان کو امتحان میں کامیابی و کامرانی کا مشاہدہ کر کے بے حساب فرحت و انبساط اور اہل جہنم کو دخول جہنم سے پہلے انتہائی ذلت و رسوائی اور حسرت و ندامت کا سامنا ہو۔ اس امر کی معقولیت میں کوئی معقول انسان کلام نہیں کر سکتا۔

دوسرے شبہ کا تحقیقی جواب

دوسرے شبہ کے جواب میں واضح ہونا چاہیئے کہ ظاہری میزان کے قائلین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ میزان میں کیا تولا جائے گا۔ چنانچہ ایک قول تو یہ ہے کہ صحائف اعمال تولے جائیں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اعمال حسنہ کو ایک خوبصورت شکل میں تشکل کرکے اور اعمالِ سیئہ کو ایک بدصورت ہیئت میں تبدیل کرکے لایا جائے گا اور ان صورتوں کو تولا جائے گا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ خود اعمال حسنہ وسیئہ اس عالم میں مجسم ہو جائیں گے۔ اگرچہ دار دنیا میں عرض کا جوہر اور جوہر کا عرض ہو جانا محال ہے۔ لیکن عالم کے بدل جانے سے یہ انقلاب ممکن ہے۔ چنانچہ محقق جلیل علامہ شیخ بہائی علیہ الرحمۃ اپنی کتاب اربعین میں بذیل شرح حدیث ہم فرماتے ہیں۔ الحق ان الموزون فی النشاۃ الاخریٰ ھو نفس الاعمال لا صحائفھا۔ یعنی حق یہ ہے کہ بروزِ قیامت خود اعمال تولے جائیں گے۔ نہ کہ صحیفہ ہائے اعمال۔ اس کے بعد نشاۃ اخرویہ میں انقلاب ماہیت کے جواز پر دلائل ذکر فرمائے ہیں۔ من شاء فلیرجع الی الکتاب المذکور۔

اسی طرح محدث سید نعمت اللہ جزائری انوار نعمانیہ میں فرماتے ہیں۔ ان الصواب ھو القول لتصریح الاخبار المستفیضۃ بل المتواترۃ الدالۃ علی تجسم الاعمال و انھا ھی التی توزن فی موازین العدل یوم القیمۃ۔ یعنی اخبار مستفیضہ بلکہ متواترہ سے جو امر صراحتہً ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اعمال مجسم ہو جائیں گے اور خود یہی اعمال بروز قیامت میزانِ عدل میں تولے جائیں گے۔

قیامت میں تجسمِ اعمال کے بعض دلائل

اس تجسم اعمال پر مختلف دلائل قائم کئے گئے ہیں بعض کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے (۱) ارشادِ قدرت ہے یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من سوء۔ بروزِ قیامت ہر شخص اپنے اعمالِ خیر و بد کو حاضر پائے گا۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے ووجدوا ما عملوا حاضرا۔ لوگ اپنے اعمال کو وہاں حاضر پائیں گے۔ ان آیات سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ کہ خود ان کے اعمال وہاں موجود ہوں گے اور وہی تولے جائیں گے۔

(۲) جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ فرمایا انما ھی اعمالکم ترد الیکم یہی تمہارے اعمال بروز قیامت تمہیں واپس لوٹا دیئے جائیں گے۔

(۳) آنحضرتؐ کی حدیث ذیل سے بھی یہی مطلب ثابت ہوتا ہے۔ جناب نے قیس بن عاصم سے فرمایا۔ وانہ لا بد لک یا قیس من قرین یدفن معک وھو حیّ وتدفن معہ وانت میت فان کان کریما اکرمک وان کان لئیما اسلمک ثم لا یحشر الا معک ولا تسئل الا عنہ

فلا تجعله الا صالحاً فانه ان صلح آنست به وان فسد لا تستوحش الا منه وهو فعلك ۔ اے قیس! تیرا ایک یقیناً ہمنشین ہے۔ جو تیرے ساتھ قبر میں زندہ دفن ہوگا۔ اور تو اس کے ساتھ مردہ دفن ہوگا۔ اگر وہ ہمنشین شریف وکریم ہوا تو تیرا اکرام واحترام کرے گا۔ اور اگر بُرا ہوا تو تمہیں اپنے حال پہ چھوڑ جائے گا۔ اور پھر اس کا حشر تیرے ساتھ اور تیرا اس کے ساتھ ہوگا۔ اور تجھ سے اُسی کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پس اگر وہ صالح ہوا تو تو اس کے ساتھ مانوس ہوگا۔ اور اگر فاسد ہوا تو تجھے اُس سے وحشت وگھبراہٹ ہوگی۔ تیرا یہ ہمنشین تیرا عمل ہی ہے (اربعین شیخ بہائی۔ سبیل النجاۃ وغیرہ۔

(۵) اسی طرح کئی احادیث میں بعض اعمال کے متعلق وارد ہے کہ وہ مجسم ہو کر انسان کا برزخ اور عرصۂ محشر میں غم غلط کریں گے۔ اس قسم کی بعض احادیث حالاتِ قبر و برزخ میں گذر چکی ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ اولّہ تجسم اعمال پر نصِ صریح نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں دوسرے قول یعنی اعمال حسنہ کا صور جمیلہ میں اور اعمال قبیحہ کا صور قبیحہ میں متمثل ہو جانے کا احتمال برابر قائم رہتا ہے۔ اسی لئے سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ بحار الانوار میں فرماتے ہیں۔ جمیع الاحوال والافعال فی الدنیا تتجسم وتتمثل فی النشاۃ الاخریٰ اما بخلق الامثلۃ الشبیھۃ مبھا بازائھا او بتحول الاعراض ھناک جواھر والدول ادفق بحکم العقل ولا نیا فیہ صحیح ما ورد فی النقل "یعنی عالم آخرت میں تمام احوال وافعال متجسم ومتمثل ہو جائیں گے۔ یا تو اس طرح کہ خداوند عالم اعمال کی نوعیت وکیفیت کے مطابق اچھی یا بُری صورتیں خلق فرمائے گا۔ یا اس طرح کہ وہاں عرض جوہر کے ساتھ تبدیل ہو جائیں گے۔ اور خود اعمال مجسم ہو جائیں گے۔ اگرچہ پہلا قول زیادہ قرینِ عقل ہے اور نقل بھی اس کے بالصراحت منافی ومخالف نہیں ہے"۔

پس ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ میزان کو اپنے حقیقی معنی پر ہی محمول کرنا اولیٰ وانسب ہے۔ باقی رہیں میزان کی دیگر تفاصیل کہ آیا قیامت کو ایک ہی میزان نصب ہوگا۔ یا ہر ہر شخص کے لئے الگ الگ میزان نصب کئے جائیں گے۔ اور بصورت تعدد اصولِ دین اور فروعِ دین کے لئے ایک ہی میزان ہوگا۔ یا مختلف ہوں گے۔ ان تفاصیل کا علم حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اجمالی ایمان رکھنا کافی ہے۔ ان ہی حقائق سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو قول متن میں اختیار کیا گیا ہے (کہ میزان سے مراد اوصیاء ہیں) یا جو قول اس کی شرح میں حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اختیار فرمایا ہے۔ کہ اس سے مراد صرف عدلِ خداوندی ہے۔ اور اپنے اس نظریہ کی بنیاد محض ظاہری میزان کے استبعاد پر رکھی ہے۔ اور اس طرح تمام ظواہر قرآن وحدیث کی تاویل فرمائی ہے۔ وہ محلِ نظر واشکال ہے۔ واللہ العالم بحقیقۃ الحال۔

اسی لئے علماء متاخرین نے ان کی فرمائش کو نقد وتبصرہ کی میزان پر جانچتے ہوئے فرمایا ہے

لا یمکن الخروج عن ظواهر الایات والروایات بهذه الوجوه العقلیة والاعتبارات الوهمیة التی هی اوهن من بیت العنکبوت وانه لاوهن البیوت۔ یعنی ان عقلی وجوہ اور وہمی اعتبارات کی وجہ سے جو تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ آیات و روایات کے ظاہری معانی سے دستبرداری اختیار نہیں کی جا سکتی۔ (حق الیقین مولانا سید عبداللہ شبر ؒ) اسی طرح سرکار مجلسی علیہ الرحمۃ نے حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ کی تاویل نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے "کہ بایں وجوہ عقلیہ و استبعادات وہمیہ دست از ظواہر آیات برداشتن مشکل است" یعنی ان عقلی وجوہ اور وہمی استبعادات کی بنا پر ظواہر آیات سے دست بردار ہونا مشکل ہے۔"

ہاں اگر حضرت شیخ مرحوم اپنی اس تاویل کی بنیاد بجائے عقلی وجوہات پر قائم کرنے کے بعض ان احادیث پر رکھتے جو ان کی تائید میں وارد ہوئے ہیں۔ تو کسی حد تک یہ امر درست بھی تھا۔ کیونکہ بعض روایات میں میزان کی تاویل عدل باری۔ اور انبیاء و اوصیاء علیہم السلام کے ساتھ کی گئی ہے۔ چنانچہ احتجاج طبرسی میں جناب ہشام بن الحکم سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک زندیق نے جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا۔ کیا اعمال تولے جائیں گے؟ امام نے فرمایا۔ نہیں۔ کیونکہ اعمال کوئی جسم نہیں رکھتے نیز تولنے کا محتاج وہ شخص ہوتا ہے۔ جو چیزوں کی تعداد و مقدار سے ناواقف ہو۔ اور ان کے ثقیل یا خفیف ہونے سے آگاہ نہ ہو۔ حالانکہ خدا تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ سائل نے کہا پھر میزان کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا اس کے معنی ہیں خدا کا عدل۔ زندیق نے کہا۔ پھر آیت فمن ثقلت موازینه کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا جس کا عمل خیر زیادہ ہو گا وہ نجات پائے گا۔

اسی طرح کافی اور معانی الاخبار میں آیت مبارکہ ونضع الموازین القسط لیوم القیمة فلا تظلم نفس شیئاً کی جو تفسیر بروایت جناب ہشام بن سالم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آنجناب نے فرمایا کہ میزان سے مراد انبیاء و اوصیاء علیہم السلام ہیں۔

بنا بریں یہ مسئلہ فی الجملہ قالب اشکال میں آجاتا ہے۔ اور محتاط علماء کی روش بہت عمدہ ہے کہ میزان کی اجمالی حقانیت پر ایمان رکھا جائے۔ اور اس کی تفصیل و حقیقت کا علم خالق میزان یا اس کے حقیقی نمائندگان علیہم السلام کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ غواص بحار الانوار سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ حق الیقین میں میزان کے متعلق مباحث طویلہ کے بعد فرماتے ہیں۔ "چوں روایات دریں باب متعارض است باید باصل میزان اعتقاد کرد و معنی آں رابعلم ایشاں گذاشت وجزم باحد طرفین مشکل است" یعنی چونکہ اس

معاون وحی وتنزیل کے سپرد کرنا چاہئے۔ ان اقوال میں سے کسی ایک کے متعلق جزم ویقین حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔"

اسی طرح حضرت مولانا سید عبداللہ شبر فرماتے ہیں۔ والاحوط الاولیٰ الایمان بالمیزان ورد العلم بحقیقتھا الی اللہ و انبیاءہ وخلفاءہ ولا نتکلف علم مالم یوضح لنا بصریح البیان واللہ العالم بالحال۔ احوط واولیٰ یہ ہے کہ میزان پر اجمالی ایمان رکھا جائے۔ اور اس کی حقیقت کا علم خداوند عالم اور اس کے انبیاء و خلفاء کے سپرد کیا جائے۔ اور جس چیز کی حقیقت واضح طور پر ہمارے لئے بیان نہیں کی گئی اس کے معلوم کرنے کے لئے تکلف نہ کیا جائے۔ واللہ العالم بالحال۔ فنحن نؤمن بالمیزان ونرد علمہ الی حملۃ القرآن ولا نتکلف علم مالم یوضح لنا بصریح البیان واللہ الموفق وعلیہ التکلان (بحار ۳)

اعضاء وجوارح کی شہادت کے متعلق ایک اشکال کا جواب

ابھی اوپر بروز قیامت اعضاء وجوارح کا بندوں کے افعال واعمال کے بارے میں شہادت دینے کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ممکن ہے موجودہ تہذیب وتمدن کے فرزند اس امر پر زبانِ اعتراض دراز کریں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہاتھ پیر وغیرہ اعضاء بول کر اعمال کی گواہی دیں جبکہ ان میں قوتِ گویائی نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ یہ محض ایک استبعاد ہے جس کی بناء پر قرآن و سنت سے ثابت شدہ حقائق کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کی قدرتِ کاملہ پر ایمان رکھنے والوں کے لئے تو اس مقام پر اطمینان قلب حاصل کرنے کے لئے وہی جواب کافی ہے۔ جو اسی آیت میں مذکور ہے جس کے اندر اعضاء کے شہادت دینے کا تذکرہ ہے۔ انطقنا اللہ الذی انطق کل شیء (سورہ حم سجدہ) ہمیں اسی خدائے قادر نے گویا کیا ہے جس نے اپنی قدرت کاملہ سے ہر چیز کو گویا کیا ہے۔ جو قادرِ مطلق ایک نطفۂ گندیدہ میں سے حضرت انسان ایسی کامل مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے۔ نیز ایسے ایسے مشکل کام انجام دے سکتا ہے جو تصور انسانی سے بھی باہر ہیں۔ اس کے لئے اعضاء وجوارح کو حیات اور قوتِ نطق عطا فرما کر گویا کر دینا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ ہر چیز کا تسبیح خدا ادا کرنا قرآن کی آیاتِ مبارکہ سے شجر وحجر کا نبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ورسالت کی شہادت دینا روایاتِ معتبرہ سے ثابت ہے۔ لہٰذا اعضاء جوارح کا بولنا اور شہادت دینا کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے۔ البتہ اس سائنسی دور میں ایسے حقائق کا محض تعصب یا جہالت کی بنا پر انکار کرنا تعجب خیز اور مستبعد ہے۔ جب انسان خدا کی دی ہوئی طاقت وقدرت سے ایسے آلات ایجاد کر سکتا ہے۔ جو صوت اور حرف اور طریق ادائے مطلب تک کو اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔ جیسے ڈگراف۔ ٹیپ ریکارڈ وغیرہ۔ اس میں بند شدہ الفاظ ومطالب کو جب چاہیں لبعینہٖ سماعت کر سکتے ہیں۔

تو اگر خدائے قادر و قیوم یہ خبر دے کہ یہ تمہارے اعضاء و جوارح بھی تمہارے افعال و اعمال کے محافظ و نگران ہیں۔ اور یہ روزِ قیامت باذن اللہ تمام حالات و کوائف کو بیان کر دیں گے۔ تو اہل عقل و انصاف بتائیں کہ اس میں کون سی تعجب و استبعاد کی بات ہے؟ ان فی ذلک لآیات لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شہید۔

احباط و تکفیر اور موازنہ

اگر چہ مصنف علام نے اس موضوع کا تذکرہ نہیں کیا۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اختصار کے ساتھ اس موضوع پر کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔

علم کلام کی اصطلاح میں احباط کا یہ مفہوم ہے کہ بعد والے گناہ کی وجہ سے پہلی نیکی ضائع و اکارت ہو جائے۔ اور تکفیر سے مراد یہ ہے کہ بعد والی نیکی سے پہلی برائی دور ہو جائے اور موازنہ کا مقصد یہ ہے کہ نیکیوں اور برائیوں کا مقابلہ کیا جائے۔ جو چیز (نیکی یا بدی) غالب آجائے اس سے دوسری چیز نیست و نابود ہو جائے۔ اور اگر دونوں مساوی ہوں تو دونوں کالعدم قرار دے دی جائیں۔ حضرات معتزلہ ان امور کے قائل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض گناہوں جیسے کفر و شرک سے سابقہ حسنات ضائع ہو جاتے ہیں۔ اولئک الذین کفروا بآیات ربھم ولقائہ فحبطت اعمالھم فلا نقیم لھم یوم القیمۃ وزنا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آیات الٰہی اور لقاء پروردگار کا انکار کیا۔ اس لئے ان کے عمل حبط ہو گئے۔ اب بروزِ قیامت ہم ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔ اسی طرح بعض طاعات سے سابقہ سیئات محو ہو جاتے ہیں جیسے ایمان بعد الکفر و توبہ بعد العصیان یذھبن السیئات نیکیاں، برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم الخ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (نام جو چاہو رکھ لو) کہ فی الجملہ معنوی طور پر احباط و تکفیر ثابت ہے۔ مگر غور طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ کلیہ درست ہے کہ ہر گناہ کبیرہ موجب حبطِ اعمال ہوتا ہے۔ اور ہر حسنہ باعث تکفیر سیئات۔ مشہور عند الامامیہ والاشاعرہ یہ ہے کہ یہ باطل ہے بوجہ لزوم ظلم و جور و تاثیر عرض در عرض وھو محال اور موازنہ کا بطلان تو اظہر من الشمس ہے۔ علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ اقول الحق انہ لا یمکن انکار سقوط ثواب الایمان بالکفر اللاحق الذی یموت علیہ وکذا سقوط عقاب الکفر بالایمان اللاحق الذی یموت علیہ وقد دلت الاخبار الکثیرۃ علی ان کثیراً من الحسنات یذھبن السیئات وان کثیراً من الطاعات کفارۃ لکثیر من السیئات والاخبار فی ذلک متواترۃ وقد دلت الآیات علی ان الحسنات یذھبن السیئات ولم یقم دلیل تام علی بطلان ذلک واما ان ذلک عام فی جمیع الطاعات والمعاصی فغیر معلوم۔

"میں کہتا ہوں حق یہ ہے کہ بعد والے کفر سے ایمانِ سابق کے ثواب کے اکارت ہونے اسی طرح ایمان لاحق

کیوجہ سے کفرِ سابق کے عقاب کے ساقط ہو جانے کا انکار ممکن نہیں ہے۔ اخبارِ کثیرہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں اور بہت سی طاعات بہت سی سئیات کا کفارہ بن جاتی ہیں۔ علاوہ اخبارِ متواترہ کے آیاتِ کثیرہ بھی اسی مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اس بات کے بطلان پر کوئی مکمل دلیل موجود نہیں ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ آیا یہ بات تمام طاعات و سئیات میں جاری ہے یہ معلوم نہیں ہے۔ ایسا ہی افادہ جناب علامہ موصوف کے تلمیذِ رشید جناب محدث جزائری نے انوار نعمانیہ میں فرمایا ہے۔

انتیسواں باب جنّت اور دوزخ کا بیان

عقیدۂ جنّت و جہنم کے ضروریاتِ دین سے ہونے کا بیان

مخفی نہ رہے کہ جنّت سے مراد وہ دارِ جزا و ثواب ہے جو اہلِ ایمان و اطاعت کو ان کے حال کے مطابق آخرت میں دیا جائے گا۔ جس میں مختلف قسم کے لذائذ و نعمات ہوں گے۔ اور جہنم سے مراد وہ دارِ عقاب و عذاب ہے جو کفار و اشرار اور فساق و فجار کو اُن کے حسبِ حال دیا جائے گا۔ جس میں مختلف انواع و اقسام کے عذاب و عقاب ہوں گے۔ نیز یہ بہشت و دوزخ جسمانی ہیں اور اس وقت مخلوق و موجود ہیں۔ جو خوش قسمت لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہ ہمیشہ ابدالآباد تک اس میں رہیں گے۔ اور جو بدبخت دوزخ میں داخل ہوں گے ان میں سے بعض تو مخلد فی النار ہوں گے اور کچھ اپنے گناہ و عصیان کے مطابق سزا بھگتنے کے بعد یا حصولِ شفاعت کی وجہ سے بالآخر اس سے نجات حاصل کریں گے اور بہشت عنبر سرشت میں داخل ہوں گے۔ اس جسمانی جنت و جہنم کا اعتقاد ضروریاتِ دین مبین میں سے ہے۔ جس کا انکار کرنے والا یا خلافِ شریعت تاویل کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ مسلمانوں میں سے کوئی فرقہ بھی ان کا منکر نہیں ہے۔ ہاں البتہ ملاحدہ، دہریہ ان کے منکر ہیں۔ اور فلاسفۂ یونان اس بہشت و دوزخ کو عالم مثال یا [illegible]

لاموت فیہا ولاھرم ولاسقم ولا مرض ولا آفۃ ولا زوال ولا زمانۃ ولاھم ولا غم ولا حاجۃ ولا فقر وانہا دار الغنی ودار السعادۃ ودار المقامۃ ودار الکرامۃ لایمس

اور نہ کسی قسم کی بیماری لاحق ہو گی۔ اور نہ کوئی آفت ہو گی۔ نہ زوال نعمت ہو گا۔ نہ کوئی اپاہج ہو گا نہ وہاں کسی طرح کا رنج و غم ہو گا اور نہ وہاں مفلسی اور محتاجی ہو گی۔ بلکہ وہ تو غنا و تونگری، سعادت و نیک بختی اور دائمی قیام و کرامت کا محل و مکان ہے۔ اس میں رہنے والوں کو نہ کسی قسم کی کوئی تکلیف

کے اثبات کے سلسلہ میں آیات متکاثرہ اور روایات متواترہ وارد ہوئے ہیں۔ اس مبحث میں چند امور قابل غور ہیں (۱) یہ کہ جنت و جہنم جسمانی ہیں۔ (۲) جنت و جہنم پیدا ہو چکی ہیں اور اس وقت موجود ہیں (۳) ان کی کیفیت اور ان کے بعض لذائذ یا شدائد کا بیان (۴) ثواب جنت اور عذاب جہنم کا خلود و دوام (۵) حضرت آدمؑ والی جنت کی تحقیق! (۶) مومن و کافر کا مرنے سے پہلے جنت و جہنم میں اپنے اپنے مقام کو دیکھنا (۷) بعض شکوک و شبہات کا ازالہ۔ ذیل میں ہم ان امور پر اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبصرہ کرتے ہیں۔

جسمانی جنت و جہنم کا اثبات اور دیگر آراء فاسدہ کا ابطال

بھی اوپر لکھا جا چکا ہے کہ جسمانی جنت و جہنم کا اعتقاد ضروریات دین میں سے ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ ثالث بحار الانوار میں فرماتے ہیں اعلم ان الایمان بالجنۃ والنار علی ما وردتا فی الایات والاخبار من غیر تاویل من ضروریات الدین و منکرھما او مؤولھما بما اولت بہ الفلاسفۃ خارج من الدین۔ یعنی جاننا چاہیئے کہ جنت و جہنم پر اس طرح ایمان لانا جس طرح ان کی تفصیل آیات و اخبار میں وارد ہے۔ ضروریات دین میں سے ہے اور ان کا منکر یا فلاسفہ کی طرح تاویل کرنے والا دین اسلام سے خارج ہے۔" اسی طرح علامہ تفتازانی نے شرح مقاصد میں تحریر فرمایا ہے۔

فلاسفۂ یونان کا خیال ہے کہ جنت و جہنم فقط روحانی ہیں۔ اور بعض متصوفہ مثل غزالی وغیرہ جسمانی و روحانی ہر دو کے قائل ہیں۔ اور بعض فقط ان کے خیالی و عقلی وجود کے قائل ہیں۔ وہ اسی دوسرے جنم کو ہی جنت یا جہنم قرار دیتے ہیں۔ چونکہ فلاسفۂ یونان کے دو بڑے گروہ ہیں۔ اشراقیین اور مشائین۔ اشراقیین جن کا رئیس افلاطون ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عالم مثال ہی میں جزا یا سزا دی جاتی ہے۔ اور یہ عالم نہ محض جسمانی ہے اور نہ محض مجرد۔ بلکہ وہ ان ہر دو عالموں کے بین بین ہے۔ جیسے عالم رؤیا کی اشیاء یا جیسے آئینہ میں صورت۔ بنا بریں ثواب مثل اچھے خواب کے ہے۔ اور عقاب برے خواب کی مانند ہے۔ ظاہر ہے

اهلها نصب ولا یمسنا فیها لغوب لهم فیها ما تشتهی الانفس وتلذ الاعین وهم فیها خالدون	ہوگی اور نہ ہی ان کو کوئی تھکاوٹ لاحق ہوگی۔ اس میں اہل جنت کے لئے وہ سب کچھ مہیا ہوگا جس کی ان کے نفس خواہش کریں گے۔ اور جس سے آنکھیں لذت اندوز ہوں گی۔ اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

کہ یہ قول علاوہ اس کے کہ اس سے معاد جسمانی (جسے سابقاً ثابت کیا جا چکا ہے) کا انکار لازم آتا ہے۔ قرآن و حدیث کی تصریحات کے مخالف اور انبیاء و مرسلین کے تعلیمات کے منافی ہے۔ لہذا کوئی شخص جو اسلام کو صحیح مذہب سمجھتا ہے۔ وہ اس قول ضعیف کا قائل نہیں ہو سکتا۔ اور فلاسفہ مشائین جن کا رئیس ارسطو ہے وہ جنت و جہنم اور ان کے ثواب و عقاب کو لذات و آلام عقلیہ کی قسم سے شمار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ تو اس کا بدن تو خراب ہو جاتا ہے لیکن اس کی روح باقی رہتی ہے۔ پس اگر دار دنیا میں اس کے عقائد و اعمال اچھے تھے۔ تو وہ اپنے ان اعمال و کمالات کی وجہ سے فرحاں و شاداں رہتی ہے۔ یہی اس کی جنت ہے۔ اور اگر اس کے عقائد و اعمال برے تھے۔ اور اس نے دار دنیا میں کسب کمال نہیں کیا تھا۔ تو مرنے کے بعد اسے اس کا رنج و الم ہوتا ہے۔ یہی اس کی جہنم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تاویل بھی فلاسفہ اشراقئین کی تاویل کی طرح اسلامی عقائد کے ساتھ ہرگز موافق اور سازگار نہیں ہو سکتی تعجب ہے ان بعض مسلمان فلاسفروں پر جو باوجودیکہ کلمہ اسلام پڑھتے ہیں۔ اور اس کی صداقت و حقانیت کے قائل بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فلاسفہ یونان کی ان تاویلات رکیکہ کو تسلیم کرتے ہوئے ظواہر شریعت سے دست بردار ہو جانے میں کچھ جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اور بعض نام نہاد مسلمان ان کے فلسفیانہ نظریات سے مرعوب ہو کر شریعت اور فلسفہ کے نظریات کے درمیان جمع و توفیق کرنے کی غرض سے جسمانی و روحانی جنت و جہنم کے قائل ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی یہ دوغلی پالیسی ہرگز قابل عفو نہیں ہے۔ ان کو چاہیئے کہ یا تو کھلم کھلا طور پر اسلام کا جوا گردن سے اتار دیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ ع یاران دیگراں رامی پرستند۔ یا اگر دین اسلام کو برحق سمجھتے ہیں، تو پھر بلا چون و چرا اس کے تمام مسلمہ عقاید و نظریات کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ اسی بنا پر سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے۔ ولا یخفی علی من راجع کلامهم وتتبع اصولهم ان جلها لا یطابق ما ورد فی شرائع الانبیاء وانما یمضغون ببعض اصول الشرائع وضروریات الملل علی السنتهم فی کل زمان حذراً من القتل والتکفیر من مومنی زمانهم فهم یؤمنون بافواههم وتابی قلوبهم واکثرهم الکافرون (بحار ج ۳) جو شخص ان فلاسفہ کے کلام کو بغور دیکھے گا اور ان کے اصول و قواعد کا تحقیقی جائزہ لے گا۔ اس پر مخفی نہیں رہے گا۔ کہ

وانها دار اهلها جیران اللّٰہ تعٰ و اولیآئہ واحبآئہ واھل کرامتہ وھم انواع علٰی مراتب منھم المتنعمون بتقدیس اللّٰہ وتسبیحہ وتکبیرہ فی جملۃ ملئکتہ ومنھم المتنعمون بانواع المآکل والمشارب والفواکہ

بہشت ایسا مقام ہے۔ جس میں رہنے والے خدا کے جوار رحمت میں ہوں گے اس کے دوست اور کرامتوں کے مالک ہوں گے اور مراتب کے لحاظ سے بھی وہ جنتی مختلف ہوں گے۔ ان میں سے بعض تو فرشتوں کی طرح خدا کی تقدیس و تسبیح اور تکبیر وغیرہ میں ان کے ہمراہ متنعم ہوں گے۔ اور بعض مختلف کھانے پینے کی چیزوں اور رنگ برنگ میوؤں

ان کے اکثر قواعد شریعت انبیاء کے مطابق نہیں ہیں۔ ہاں وہ ہر دور میں بعض عقائد شرعیہ کا اور ضروریات دینیہ کا زبانی طور پر محض اپنے زمانہ کے اہل ایمان کے ہاتھوں قتل ہونے اور ان کے فتوئ کفر سے بچنے کیلئے اقرار کرتے رہتے ہیں۔ پس وہ زبان سے ایمان لاتے ہیں۔ لیکن ان کے دل انکار کرتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر کافر ہوتے ہیں" اس کے بعد سرکار علامہ نے ان کے بعض اصول کا تذکرہ کر کے ان کا مخالف شریعت مقدسہ ہونا ثابت کیا ہے۔

چونکہ یہ مسئلہ خالص عقلی تو ہے نہیں۔ تاکہ اس کے متعلق ان فرقہائے باطلہ کے بانیوں کے ساتھ صرف عقلی طور پر گفتگو کی جائے بلکہ اس کے اثبات کا زیادہ بلکہ تمام تر تعلق نقل صحیح کے ساتھ ہے۔ اس لئے ان منکرین یا مؤولین حضرات کو پہلے دلائل و براہین کے ساتھ اسلام کی حقانیت و صداقت کو تسلیم کرنا چاہیئے اس کے بعد یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اسلام کو صحیح دین تسلیم کرنے کے بعد ان پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی۔ کہ اسلام نے جنت و جہنم کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اس میں ان کی ان تاویلات رکیکہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی وہ بفضلہ تعالیٰ مخالف عقل ہے۔ لہذا جب مخبرین صادقین اس کے وجود کی خبر دے رہے ہیں۔ اور یہ امر عقلاً محال و ناممکن بھی نہیں ہے تو پھر اس کا انکار یا اس میں بے جا تاویل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں عقیدۂ قیامت اور اس کے متعلقات کو آخری مرتبہ پر رکھا گیا ہے۔ تاکہ پہلے توحید و عدالت اور رسالت و امامت یا کم از کم توحید و رسالت کا دلائل و براہین کے ساتھ اقرار و اعتراف کر لیا جائے۔ اس کے بعد ان کے ارشادات پر ایمان لانا آسان ہو جائے گا۔ اور حشر و نشر اور جنت و نار ایسے ابعد الطبع ان دیکھے حقائق کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کی الجھن محسوس نہ ہو گی۔

جنت و جہنم کے مخلوق و موجود ہونے کا اثبات

اسلام کے مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے تمام مسلمانوں کا سوائے بعض

والاوائك والحور العين واستخدام الولدان المخلدين والجلوس على النمارق والزرابي ولباس السندس كل منهم انما يتلذذ بما يشتهي	عمدہ اور سیاہ اور کشادہ چشم والی عورتوں، ہمیشہ جوان رہنے والے خدمت گذار لڑکوں، تکیوں اور کرسیوں پر بیٹھنے اور ریشم و دیبا کے کپڑے زیب تن کرنے سے لطف اندوز اور بہرہ مند ہونگے۔ ان میں سے ہر شخص کو اسکی خواہش کے مطابق

معتزلہ کے اس امر پر اتفاق ہے۔ کہ جنّت و جہنّم پیدا ہو چکی ہیں۔ اور اس وقت موجود ہیں۔ اس عقیدہ کی صحت پر آیاتِ متکاثرہ و روایات متواترہ دلالت کرتی ہیں، چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ واما کونہما مخلوقتان الان فقد ذھب جمھور المسلمین الا شر ذمۃ من المعتزلۃ فانھم یقولون سیخلقان فی القیمۃ والایات والاخبار المتواترۃ دافعۃ لقولھم ومزیفۃ لمذھبھم۔ یعنی جنّت و جہنّم کا بالفعل موجود و مخلوق ہونا سوائے بعض معتزلہ کے باقی تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ ہاں بعض معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بروز قیامت پیدا ہوں گی۔ لیکن آیات اور متواتر روایات ان کے نظریہ کو باطل کرتی ہیں۔ اسی طرح برادرانِ اسلامی کے علامۂ تفتازانی شرح مقاصد ج ۲ ص ۲۱۸ میں فرماتے ہیں جمھور المسلمین علی ان الجنۃ والنار مخلوقتان الان خلافاً لابی ھاشم والقاضی عبد الجبار ومن یجری مجراھما من المعتزلۃ حیث زعموا انھما تخلقان یوم الجزاء اس عبارت کا مطلب بھی وہی ہے جو سرکار علامہ مجلسیؒ کی عبارت کا ہے۔ اس کے بعد فاضل شارح نے اس قولِ ضعیف کا بطلان قرآن اور حدیث پیمبر اسلام سے واضح کیا ہے۔ من شاء فلیرجع الیہ۔

اس مطلب پر پہلی دلیل

اب ہم ذیل میں اس عقیدہ کی صحت پر بعض دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلی دلیل قصۂ آدمؑ و حوّا اور ان کا جنّت میں سکونت پذیر ہونا ہے۔ جس کا تذکرہ قرآن میں متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ واذ قلنا یا ادم اسکن انت وزوجک الجنۃ وکلا منھا۔ ہم نے آدمؑ سے کہا۔ اے آدمؑ تم اور تمہاری زوجہ جنّت میں رہو۔ اور اس سے کھاؤ۔ ظاہر ہے کہ اگر جنّت و جہنّم مخلوق و موجود نہ ہوتیں۔ تو جناب آدمؑ و حوّا کو ان میں داخل کرنا اور اس کے پھل کھانے کا حکم دینا بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ حضرات آئمہ طاہرینؑ نے اس مطلب کے اثبات میں زیادہ تر اسی واقعہ سے تمسک فرمایا ہے۔ چنانچہ رجال کشی میں مرقوم ہے کہ جناب امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ کہ فلاں شخص گمان کرتا ہے۔ کہ ابھی جنّت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا۔ کذب فاین جنۃ ادم وہ جھوٹ کہتا ہے۔ اگر جنّت ہنوز پیدا نہیں ہوئی تو پھر آدمؑ والی

ویزید علی حسب ما تعلقت همته ویعطی من عند اللہ من اجله وقال الصادقؑ ان الناس یعبدون اللہ علی ثلثه اصناف

مطابق خدا کے حضور سے ہر ایک چیز عطا کی جائے گی۔ حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ خدا کی عبادت کرنے والے تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو جنت کے شوق اور

جنت کہاں گئی؟ اسی طرح ابن سنان روایت کرتے ہیں۔ کہ میں نے جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ یونس کہتا ہے۔ ابھی تک جنت و جہنم پیدا نہیں ہوئیں۔ یہ سن کر آپؑ نے فرمایا مالہ لعنہ اللہ فاین جنۃ آدم خدا اس پر لعنت کرے۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ جناب آدمؑ کی جنت کہاں گئی؟ کتاب صفات الشیعہ مولفہ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ میں (علی ما نقل عنہ) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا۔ لیس من شیعتنا من انکر اربعۃ اشیاء المعراج والمسائلۃ فی القبر وخلق الجنۃ والنار والشفاعۃ۔ جو شخص چار چیزوں کا انکار کرے وہ ہمارے شیعوں میں سے نہیں ہے۔ معراج جسمانی، قبر میں سوال وجواب کا ہونا، جنت وجہنم کا مخلوق ہونا، اور شفاعت۔ اسی دلیل جمیل سے حضرت مصنف علام کے بیان کردہ نظریہ کی کمزوری بھی واضح وعیاں ہو جاتی ہے۔ کہ جنت آدمؑ ایک دنیوی باغ تھا۔ اس امر کی مزید وضاحت بعد میں آرہی ہے!

دوسری دلیل ارشاد قدرت ہے ولقد راٰہ نزلۃ اخری عند سدرۃ المنتھی عندھا جنۃ الماوی آنحضرتؐ نے (شب معراج) دوسری بار اس (جبرئیل) کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا جس کے نزدیک جنت الماویٰ ہے۔ تفسیر قمی میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ جو لوگ جنت وجہنم کے مخلوق ہونے کے منکر ہیں۔ ان کا آیت مبارکہ عندھا جنۃ الماویٰ میں رد موجود ہے (کہ اگر جنت موجود نہ ہوتی تو خدائے عزوجل کیوں فرماتا کہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جنت الماویٰ موجود ہے) امام علیہ السلام نے فرمایا سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے اور اس کے پاس (اس کے اوپر) جنت الماویٰ موجود ہے۔

تیسری دلیل خداوند عالم جنت کے متعلق ارشاد فرماتا ہے۔ اعدت للمتقین۔ جنت متقیوں کے لئے مہیا کی گئی ہے۔ اعدت للذین امنوا جنت اہل ایمان کے لئے مہیا کی گئی ہے۔ ازلفت الجنۃ للمتقین۔ جنت اہل تقویٰ کے لئے قریب ...... کی گئی ہے۔ اسی طرح جہنم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ اعدت للکافرین۔ جہنم کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہے۔ ان آیات سے مستفاد

فصنف منهم يعبدونه شوقاً الى جنته ورجاء ثوابه فتلك عبادة الخدام وصنف منهم يعبدونه خوفاً من ناره فتلك عبادة العبيد	اس کے ثواب کی امید میں خدا کی عبادت کرتا ہے. اس گروہ کی عبادت خادموں اور نوکروں کی سی ہے. دوسرا گروہ آتش دوزخ اور عذاب الہٰی کے خوف سے خدا کی بندگی کرتا ہے. یہ عبادت غلاموں کی سی ہے.

ہوتا ہے. کہ جنت وجہنم پیدا ہو چکی ہیں. اگر یہ اس وقت موجود نہ ہوتیں. تو ان کا قرآن مجید میں صیغۂ ماضی کے ساتھ ذکر نہ کیا جاتا.

چوتھی دلیل کتب فریقین میں بکثرت ایسی روایات موجود ہیں. جن میں مروی ہے کہ جناب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وعلی آلہ السلام نے شب معراج جنت کی سیر فرمائی. اس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جنت موجود و مخلوق ہے. ورنہ اس کی سیر کرنا چہ معنی دارد؟ اسی طرح آنجناب کا جہنم کو ملاحظہ کرنا بھی ثابت ہے. پس اس مستند واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنت وجہنم خلق ہو چکی ہیں. اس امر کا انکار کرنا پیغمبر اسلام کی تکذیب کے مترادف ہے یہی استدلال کتاب عیون الاخبار الرضا میں جناب امام رضا علیہ السلام سے اس سلسلہ میں منقول ہے. اس کے آخر میں یوں مروی ہے. فرمایا جو لوگ جنت وجہنم کے مخلوق ہونے کا انکار کرتے ہیں. ما اولئك منا ولا نحن منهم من انكر خلق الجنة والنار فقد كذب النبي صلى الله عليه وآله وكذبنا وليس من ولايتنا على شيء وخلد في نار جهنم. وہ ہم سے نہیں ہیں. اور نہ ہم ان سے ہیں. جو شخص جنت و نار کے خلق ہونے کا انکار کرتا ہے. وہ جناب رسول خدا اور ہم کو جھٹلاتا ہے. اور ہماری ولایت کا منکر ہے. اس لئے آتش جہنم میں رہے گا. پس ان حقائق کی روشنی میں ثابت ہو گیا ہے. کہ جنت وجہنم پیدا ہو چکی ہیں. اور اس وقت موجود ہیں.

ازالۂ اوہام اس سلسلہ میں چند شبہات پیش کئے جاتے ہیں. یہاں ان کا ذکر مع ان کے جوابات کے فائدہ سے خالی نہیں ہے.

پہلا شبہ:۔ یہ ہے کہ حضرت آدم کو جس جنت میں ٹھہرایا گیا تھا. وہ جنت الخلد نہ تھی. بلکہ دنیوی باغات میں سے ایک باغ تھا. جس میں شمس و قمر طلوع کرتے تھے. جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس مضمون کی ایک روایت بھی مروی ہے. نیز یہ کہ اگر وہ جنت الخلد ہوتی تو جناب آدم ہرگز اس سے نہ نکلتے. کیونکہ اس جنت کے ساکنین کے متعلق ارشاد قدرت ہے. هم فيها خالدون. جنتی ہمیشہ جنت میں رہیں گے.

وصنف منهم يعبدونه حباً له فتلك عبادة الكرام وهم الامناء ذلك قوله عزوجل وهم من فزع يومئذ امنون واعتقادنا فی النار

تیسرا گروہ ہے جو محبت الٰہی سے سرشار ہو کر اس کی عبادت کرتا ہے۔ یہ کریم لوگوں والی عبادت ہے اور یہی گروہ امن وامان پانے والا ہے۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے یہ لوگ اس روز خوف وخطر سے محفوظ رہیں گے۔ دوزخ کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ ذلت ورسوائی

اس شبہ کے متعلق جواباً عرض ہے کہ اگرچہ متکلمین ومفسرین کے درمیان قدرے اختلاف ہے کہ آیا جنت آدمؑ کوئی دنیوی باغ تھا۔ یا جنت الخلد تھی۔ بعض مفسرین کا یہی خیال ہے۔ جو اس شبہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور حضرت مصنف علام نے بھی اس رسالہ میں اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔ لیکن اکثر مفسرین ومتکلمین نے اس سے جنت الخلد مراد لی ہے۔ چنانچہ اوپر دلیل اول کے ضمن میں متعدد روایات اس کے ثبوت میں پیش کی جا چکی ہیں۔ وہ حدیث جو اس سلسلہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ وہ سند وعدد کے اعتبار سے ان روایات کے مقابلہ ومعارضہ سے قاصر ہے۔ لہٰذا انہی روایات کو ترجیح دی جائے گی۔ جو تعداد کے اعتبار سے اکثر اور سند کے لحاظ سے اصح ہیں۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر وہ جنت الخلد ہوتی تو آدمؑ اس سے ہرگز نہ نکالے جاتے۔ معترض کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جنتی جو ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ یہ اس وقت کے متعلق ہے۔ جب وہ بطور جزاء وثواب اس میں داخل ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جناب آدمؑ کو بطور جزاء وثواب اس میں نہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ ورنہ اگر علی الاطلاق کسی صورت میں بھی کوئی شخص ایک مرتبہ جنت الخلد میں داخل ہونے کے بعد پھر اس سے باہر نہ آسکتا۔ تو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شب معراج کو اس میں داخل ہو کر ہرگز باہر تشریف نہ لاتے۔ اسی طرح جناب جبرئیل امین بھی اس کے باہر کبھی قدم نہ رکھتے۔ لیکن ایسا ہوتا رہتا ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ یہ کلیہ غلط ہے کہ جنت الخلد میں کسی طرح بھی داخل ہونے کے بعد پھر اس سے کوئی شخص باہر نہیں آسکتا۔

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ جنت آدمؑ جنت الخلد ہی تھی۔ اسی لئے شارح مقاصد نے لکھا ہے وحملها علی بستان من بساتین الدنیا یجری مجری التلاعب بالدین والمراغمة لاجماع المسلمین یعنی جنت آدمؑ کو دنیوی باغ پر محمول کرنا دین کے ساتھ کھیلنے اور مسلمانوں کے اجماع کو ٹھکرانے کے مترادف ہے (ج ۲ ص۲۱۹ طبع اسلامبول)

انها دار الهوان و دار الانتقام من اهل الکفر و العصیان و لا یخلد فیها الا اهل الکفر و الشرک فاما المذنبون من اهل التوحید

اور کافر و گنہگاروں سے بدلہ و انتقام لینے کا مقام ہے اس میں ہمیشہ ہمیشہ صرف وہی لوگ رہیں گے جو کافر و مشرک ہوں گے لیکن اہل توحید میں سے گنہگار بندے خدا کی رحمت اور دینی مومنوں کی شفاعت کے ذریعہ جو انہیں نصیب ہوگی جہنم سے نکالے جائیں گے۔

دوسرا شبہ اور اس کا جواب جب کہ جنت و جہنم کی ضرورت قیامت کے بعد در پیش آئے گی، تو اس وقت ان کا خلق کرنا عبث و بے فائدہ ہے۔ اور خدا عبث کام نہیں کرتا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس سے ہرگز کوئی عبث کاری لازم نہیں آتی بلکہ اس میں چند اسرار و رموز مضمر ہیں۔ ایک مصلحت تو یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں جنت کے حاصل کرنے کا اشتیاق اور جہنم سے بچنے کا جذبۂ صادق پیدا ہو اور اپنے اس جذبۂ شوق و خوف کے تحت طاعت الٰہی میں مشغول ہوں۔ اور معصیت الٰہی سے اجتناب کریں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جنت و جہنم کا وجود مقرب الی الطاعۃ اور مبعد عن المعصیۃ ہے۔ اور ایسی چیز کو اصطلاح متکلمین میں ردلطف" کہتے ہیں۔ جسے خداوند عالم ہرگز ترک نہیں کرتا۔ علاوہ بریں اس میں دوسری مصلحت یہ ہے کہ گو ہم نے جنت و جہنم کو نہیں دیکھا۔ اور فقط صادقین سے سن کر ان پر ایمان بالغیب لائے ہیں۔ لیکن عقل حاکم ہے۔ کہ جن بزرگواروں کو خداوند عالم کائنات عالم کا ہادی و راہبر بنا کر بھیجے کم از کم انہیں تو ان چیزوں کا مشاہدہ کر لینا چاہیئے۔ تاکہ وہ لوگوں کو اپنے مشاہدہ کے مطابق خبر دے سکیں۔ اور ان کی تسکین کرا سکیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو لوگ ان کے اخبار پر اعتماد نہیں کریں گے۔ اور جنت و نار کے متعلق ان کے اخبار کو سنی سنائی بات کہہ کر ٹال دیں گے۔ اور اس طرح ان کی بعثت کا جو مقصد ہے وہ فوت ہو کر رہ جائے گا۔ اور خدائے حکیم ہرگز کوئی کام نہیں کرتا جس کی وجہ سے اس کے انبیاء و مرسلینؑ کی بعثت عبث و بے کار ہو کر رہ جائے۔ علاوہ بریں یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ اس وقت جنت و جہنم بالکل خالی اور بے کار پڑی ہوئی ہے۔ بلکہ ان میں نیکو کار یا بدکار لوگوں کی روحیں موجود ہیں۔ چنانچہ کتاب توحید شیخ صدوقؒ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا واللہ ما خلت الجنۃ من ارواح المومنین منذ خلقھا ولا خلت النار من ارواح الکفار والعصاۃ منذ خلقھا۔ خدا کی قسم جب سے خدا نے جنت کو خلق فرمایا ہے۔ وہ مومنین کی روحوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔ اور جب سے جہنم کو پیدا کیا ہے وہ کبھی کافروں اور گنہگاروں کی روحوں سے خالی نہیں رہی۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب جنت کے بارے میں قرآن میں وارد ہے عرضھا کعرض

فیخرجون منها بالرحمة التی تدرکهم والشفاعة التی تنالهم وروی انه لایصیب احداً من اهل التوحید الم فی النار

مروی ہے کہ اہلِ توحید میں سے جو لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے انہیں وہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

السماء والارض کہ فقط اس کا عرض زمین و آسمان کے برابر ہے۔ اس سے طول کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے اسی طرح جہنم کی جسامت کے متعلق متعدد آثار و اخبار موجود ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ اس وقت خلق ہو چکی ہیں، تو وہ کہاں موجود ہیں؟ اور ان کی گنجائش زمین و آسمان میں کس طرح ممکن ہے؟ جواباً واضح ہو کہ اگرچہ جنت و جہنم کے محل و مقام میں قدرے اختلاف ہے۔ اور اس سلسلہ میں کوئی قطعی و حتمی بات کہنا ذرا مشکل ہے۔ چنانچہ علامہ سید عبداللہ شبّر مرحوم حق الیقین میں فرماتے ہیں۔ والالیق الایمان الاجمالی بذلک ولاحاجة فی الخوض عما سکت اللّٰہ عنہ ونہی عن الخوض فیہ والتفحص عن مکان الجنة والنار۔ یعنی اولیٰ و انسب یہ ہے کہ ان حقائق پر اجمالی ایمان رکھا جائے۔ اور جن چیزوں کے متعلق خود خداوند عالم نے سکوت اختیار فرمایا ہے۔ ان میں زیادہ غور و خوض نہ کیا جائے۔ لہٰذا جنت و جہنم کے محل وقوع کے متعلق زیادہ تتبع و تفحص نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی طرح شارح مقاصد نے لکھا ہے لم یرد نص صریح فی تعیین مکان الجنة والنار۔ والحق تفویض ذلک الی الخبیر۔ جنت و جہنم کے مکان کے تعین کے متعلق کوئی نصِ صریح وارد نہیں ہوئی۔ اس لئے حق یہ ہے کہ اس امر کی حقیقت کا علم خدائے لطیف و خبیر کے سپرد کیا جائے۔ لیکن جو کچھ بعض آیات و روایات اور اکثر مسلمانوں کے اقوال و آراء سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جنت ساتویں آسمان کے اوپر اور جہنم ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ جن روایات میں لفظ "فی السماء" وارد ہے اس سے مراد "علی السماء" ہے۔ چنانچہ تفسیر قمی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ والدلیل علی ان الجنان فی السماء قولہ تعالےٰ لا تفتح لہم ابواب السماء ولا یدخلون الجنة" یعنی اس بات کی دلیل کہ جنت آسمانوں پر ہے۔ خداوند عالم کا یہ ارشاد ہے۔ کہ ان (کفار) کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اور نہ وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے۔ نیز سابقہ آیت مبارکہ وعندھا جنت الماویٰ کے ساتھ بھی استدلال کیا جا چکا ہے۔ کہ جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ کتاب خصال شیخ صدوق میں ابن عباس سے مروی ہے کہ دو یہودی جناب امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور جنت و جہنم کے مقام کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا۔ اما الجنة ففی السماء واما النار ففی الارض۔

اذا دخلوها وانما یصیبهم الآلام عند الخروج منها فتکون تلک الآلام جزاء بما کسبت ایدیهم وما اللہ بظلام للعبید

ہاں البتہ اس سے نکلتے وقت انہیں اذیت و تکلیف ہوگی۔ یہ تکلیفیں ان کے خود کردہ اعمال بد کا بدلہ ہو جائیں گی۔ خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

یعنی جنت آسمانوں پر اور جہنم زمینوں کے نیچے ہے۔ بنا بریں جب جنت آسمانوں کے اوپر ہے۔ تو وہ شبہ خود بخود ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کہ جب جنت کا عرض زمین و آسمان کے برابر ہے۔ تو وہ ان میں کس طرح سما سکتی ہے۔ تفسیر کبیر فخرالدین رازی میں انس بن مالک سے جو روایت منقول ہے وہ اس مطلب پر نص صریح ہے۔ اور اس سے ہمارے بیان کردہ نظریہ کی تائید مزید ہوتی ہے۔ اس روایت میں وارد ہے کہ ان سے پوچھا گیا۔ کہ جنت آسمان میں ہے۔ یا زمین میں۔ انہوں نے جواب میں کہا۔ ای ارض وسماء تسع الجنۃ۔ کس زمین و آسمان میں جنت کی گنجائش ہے؟ سائل نے کہا تو پھر وہ کہاں ہے۔ کہا فوق السموات السبع تحت العرش عرش کے نیچے اور ساتوں آسمانوں کے اوپر۔ اس سلسلہ میں سرکار علامہ مجلسیؒ کی وہ تحقیق انیق جو مبحث صراط میں نقل ہو چکی ہے۔ بہت مفید ہے۔ اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔

بہشت اور اس کے بعض لذائذ کا بیان قرآن کی روشنی میں

جنت کی کما حقہٗ تعریف و توصیف تو ممکن نہیں۔ ایک فارسی ضرب المثل ہے۔ "حلوائے نان تا نخوری نہ دانی"۔ نعمات بہشت کی بھی یہی کیفیت ہے۔ رزقنا اللہ وجمیع المؤمنین حورها وقصورها وسرورها۔ پس اجمالاً اس قدر واضح رہے کہ آیات و اخبار سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جنت ایک ایسا مقام ہے۔ کہ جس میں جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے۔ نہ بڑھاپا ہوگا۔ نہ موت۔ نہ اس میں رنج و الم ہوگا۔ نہ مرض و سقم۔ نہ وہاں فقر و فاقہ ہوگا۔ نہ کوئی آفت و مصیبت۔ نہ وہاں بغض و حسد ہوگا۔ نہ باہمی دشمنی و عداوت نہ وہاں تنازع و جدال ہوگا۔ نہ قتل و قتال۔ بلکہ وہ سراسر سعادت و کرامت اور ابدی راحت و آرام کا گھر ہے۔ لهم فیها ما تشتهی الانفس وتلذ الاعین وهم فیها خالدون (قرآن مجید) اہل جنت کے لئے وہاں از قسم خوراک و پوشاک وغیرہ ہر وہ چیز موجود ہوگی۔ جسے ان کے نفوس چاہیں گے۔ اور جس سے ان کی آنکھیں لذت اندوز ہوں گی۔ اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بہر کیف جنت وہ ارفع و اعلیٰ مقام ہے کہ جس کے متعلق جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ شبر من الجنۃ خیر من الدنیا وما فیها۔ جنت کی ایک بالشت

واهل النار هم المساکین حقا لا یقضی علیھم فیموتوا ولا یخفف عنھم من عذابھا ولا یذوقون فیھا بردا ولا شرابا الا حمیما وغساقا

درحقیقت اہل جہنم ہی محتاج و مسکین ہیں۔ نہ تو ان کی قضا آئے گی کہ وہ مر ہی جائیں اور نہ ہی ان کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی۔ اور نہ وہ دوزخ میں عمدہ پانی اور ٹھنڈک کا ذائقہ چکھیں گے۔ بلکہ اس کے عوض انہیں کھولتا ہوا پانی اور بہتی ہوئی پیپ ان کے اعمال بد کے بدلہ میں دی جائے گی۔

جگہ تمام دنیا و مافیہا سے بہتر و برتر ہے (بحار الانوار ج ۲) وہاں نہ گرمی ہوگی اور نہ سردی بلکہ ہمیشہ نہایت خوشگوار موسم رہے گا۔ ارشادِ قدرت ہے لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا (نہ وہاں آفتاب کی دھوپ دیکھیں گے اور نہ شدت کی سردی)۔ ان امور کے اثبات کے سلسلہ میں نہایت اختصار کے ساتھ ذیل میں چند آیاتِ قرآنیہ و روایاتِ معصومیہ پیش کی جاتی ہیں۔ ارشادِ قدرت ہوتا ہے۔ للذین اتقوا عند ربھم جنت تجری من تحتھا الانھر خلدین فیھا وازواج مطھرۃ ورضوان من اللہ (سورۃ آل عمران پ ۳ ع ۱۰) جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی۔ ان کے لئے ان کے پروردگار کے ہاں (بہشت کے) وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (اور وہ) ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اور اس کے علاوہ ان کے لیے صاف ستھری بیبیاں ہیں۔ اور (سب سے بڑھ کر) خدا کی خوشنودی ہے۔ ان المتقین فی جنت وعیون ۰ ادخلوھا بسلم امنین ۰ ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علی سرر متقبلین ۰ لا یمسھم فیھا نصب وما ھم منھا بمخرجین ۰ (سورۃ حجر پ ۱۴ ع ۴) اور پرہیزگار تو (بہشت کے) باغوں اور چشموں میں یقیناً ہوں گے۔ (داخلہ کے وقت فرشتے کہیں گے کہ) ان میں سلامتی اور اطمینان سے چلے چلو اور (دنیا کی تکلیفوں سے) جو کچھ ان کے دل میں رنج تھا۔ اس کو بھی ہم نکال دیں گے۔ اور یہ باہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تختوں پر اس طرح بیٹھے ہوں گے۔ جیسے بھائی بھائی ان کو بہشت میں تکلیف چھوئے گی بھی تو نہیں۔ اور نہ کبھی اس میں سے نکالے جائیں گے۔ وانھر من عسل مصفی ولھم فیھا من کل الثمرات اور کچھ ندیاں صاف کئے ہوئے شہد کی ہوں گی۔ اور ان لوگوں کے لئے اُس (جنت) میں ہر قسم کے میوے ہوں گے۔ یلبسون ثیابا خضرا من سندس واستبرق (پ ۱۵ سورۃ کہف ع ۱۶) الا عباد اللہ المخلصین ۰ اولئک لھم رزق معلوم ۰ فواکہ وھم مکرمون ۰ فی جنت النعیم ۰ علی سرر متقبلین ۰ یطاف علیھم بکاس من معین ۰ بیضاء لذۃ للشربین ۰ لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون ۰ وعندھم قصرت الطرف عین ۰ کانھن بیض مکنون ۰ (سورہ الصافات پ ۲۳ ع ۶)

جزآء وفاقاً فان استطعموا الطعموا من الزقوم وان استغاثوا يغاثوا بماءٍ کالمھل یشوی الوجوہ بئس الشراب وساءت مرتفقا ینادون

اور اگر وہ کھانا طلب کریں گے تو زقوم (تھوہر) انہیں کھانے کے لئے دیا جائے گا۔ اور اگر انہوں نے داد وفریاد کی تو ان کی فریاد رسی اس طرح کی جائے گی۔ کہ انہیں ایسا پانی پلایا جائے گا۔ جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا۔ جو ان کے چہروں کو جلا کر بھون دے گا۔ وہ کیسا برا پانی اور جہنم کیسا برا ٹھکانا ہے۔

مگر خدا کے برگزیدہ بندے اُن کے واسطے (بہشت میں) مقرر رزق ہوگا۔ اور بھی ایسی ویسی نہیں۔ ہر قسم کے میوے اور وہ لوگ بڑی عزت سے نعمت کے (لدے ہوئے) باغوں میں تختوں پر (چین سے) آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان میں صاف سفید براق شراب کے جام کا دور چل رہا ہوگا۔ جو پینے والوں کو بڑا مزہ دے گی۔ (اور پھر) نہ اُس شراب میں (خمار کی وجہ سے دردِ سر ہوگا۔ اور نہ وہ اس (کے پینے) سے متوالے ہوں گے اور اُن کے پہلو میں (شرم سے) نیچی نگاہ کرنے والی بڑی بڑی آنکھوں والی (پریاں) ہوں گی۔ (اُن کی گوری گوری رنگتوں میں ہلکی سی سرخی ایسی جھلکتی ہوگی) گویا وہ انڈے ہیں۔ جو چھپائے ہوئے رکھے ہیں۔ لکن الذین اتقوا ربھم لھم غرف من فوقھا غرف مبنیۃ تجری من تحتھا الانھٰر وعد اللہ لا یخلف اللہ المیعاد (سورۃ الزمر پ ۲۳ ع ۱۷) مگر جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے ان کے اونچے اونچے محل ہیں۔ (اور) بالاخانوں پر بالاخانے بنے ہوئے ہیں۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (یہ) خدا کا وعدہ ہے (اور) خدا وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ الذین اٰمنوا باٰیٰتنا وکانوا مسلمین ۵ ادخلوا الجنۃ انتم وازواجکم تحبرون ۵ یطاف علیھم بصحاف من ذھبٍ واکوابٍ وفیھا ما تشتھیہ الانفس وتلذ الاعین وانتم فیھا خٰلدون (سورۃ زخرف پ ۲۵ ع ۱۳) (یہ) وہ لوگ ہیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور (ہمارے) فرمانبردار تھے۔ تو تم اپنی بیبیوں سمیت اعزاز واکرام سے بہشت میں داخل ہو جاؤ۔ ان پر سونے کی رکابیوں اور پیالوں کا دور چلے گا۔ اور وہاں جس چیز کو جی چاہے اور جس سے آنکھیں لذت اٹھائیں (سب موجود ہے) اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔ مثل الجنۃ التی وعد المتقون ط فیھا انھٰر من ماءٍ غیر اٰسنٍ وانھٰر من لبن لم یتغیر طعمہ وانھٰر من خمر لذۃ للشٰربین وانھٰر من عسل مصفی ولھم فیھا من کل الثمرٰت ومغفرۃ من ربھم۔ (سورۃ محمد پ ۲۶ ع ۶) جس بہشت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں پانی کی نہریں جن میں ذرا بو نہیں اور دودھ کی

من مکان بعید ویقولون ربنا اخرجنا منہا فان عدنا فانا ظالمون فیمسک الجواب عنہم حینا ثم قیل لہم اخسئوا فیہا

اہل جہنم دور سے پکاریں گے۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں یہاں سے نکال، اگر ہم دوبارہ وہی اعمال کریں تو بے شک ہم ظالم و ستمگار ہوں گے۔ کافی مدت تک انہیں کوئی جواب نہیں دیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا کہ تم اسی آگ میں ذلیل و رسوا ہو کر رہو۔ اور مجھ سے کلام نہ کرو۔

نہریں ہیں جن کا مزا تک نہیں بدلا۔ اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لئے (سراسر) لذت ہے۔ اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں۔ اور وہاں ان کے لئے ہر قسم کے میوے ہیں۔ اور ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے۔ علی سرر موضونۃ ۝ متکئین علیہا متقبلین ۝ یطوف علیہم ولدان مخلدون ۝ باکواب واباریق وکاس من معین ۝ لا یصدعون عنہا ولا ینزفون ۝ وفاکہۃ مما یتخیرون ۝ ولحم طیر مما یشتہون ۝ وحور عین ۝ کامثال اللؤلؤ المکنون ۝ جزاء بما کانوا یعملون ۝ لا یسمعون فیہا لغوا ولا تاثیما ۝ الا قیلا سلاما سلاما ۝ (سورۃ الواقعہ پ ۲۷ ع ۱۴) موتی اور یاقوت سے جڑے ہوئے سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے تکئے لگائے (بیٹھے) ہوں گے نوجوان لڑکے جو (بہشت میں) ہمیشہ لڑکے ہی بنے رہیں گے۔ (شربت وغیرہ کے) ساغر اور چمکدار ٹونٹی دار کنٹر اور شفاف شراب کے جام لئے ہوئے ان کے پاس چکر لگاتے ہوں گے۔ جن کے (پینے) سے نہ تو ان کو (خمار سے) دردِ سر ہوگا۔ اور نہ وہ بدحواس مدہوش ہوں گے۔ اور جس قسم کے میوے پسند کریں گے اور جس قسم کے پرند کا گوشت ان کا جی چاہے۔ (سب موجود ہے) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں جیسے احتیاط سے رکھے ہوئے موتی یہ بدلا ہے۔ ان کے (نیک) اعمال کا وہاں نہ تو بیہودہ باتیں سنیں گے اور نہ گناہ کی بات (فحش) بس ان کا کلام سلام ہی سلام ہوگا۔

ان الابرار یشربون من کاس کان مزاجہا کافورا ۝ عینا یشرب بہا عباد اللہ یفجرونہا تفجیرا ۝ وجزاہم بما صبروا جنۃ وحریرا ۝ متکئین فیہا علی الارائک لا یرون فیہا شمسا ولا زمہریرا ۝ ودانیۃ علیہم ظلالہا وذللت قطوفہا تذلیلا ۝ ویطوف علیہم ولدان مخلدون اذا رایتہم حسبتہم لؤلؤا منثورا ۝ وسقہم ربہم شرابا طہورا ۝ (سورۃ الدہر پ ۲۹ ع ۱۹) بے شک نیکوکار شراب کے وہ ساغر پئیں گے۔ جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس میں خدا کے خاص (بندے) پئیں گے اور جہاں چاہیں گے بہا لے جائیں گے۔ اور ان کے صبر کے بدلے (بہشت کے) باغ اور ریشم کی (پوشاک) عطا فرمائے گا۔ وہاں وہ تختوں پر تکیے لگائے (بیٹھے)

ولا تکلمون ونادوا یا مالك لیقض علینا ربك قال انکم ماکثون وروی بالاسانید الصحیحۃ انہٗ یامر اللہ تعالیٰ برجال الی النار

پھر وہ باآوازِ بلند کہیں گے۔ اے مالک! (داروغہ جہنم) تمہارے پروردگار کو چاہیئے کہ وہ ہمیں موت ہی دیدے تاکہ ہم مرجائیں۔ مالک انہیں جواب دے گا تم یہاں ہی اسی حالت میں رہو گے اسانید صحیحہ سے منقول ہے کہ خداوندِ عالم بعض لوگوں کو جہنم میں داخل کرنے کا حکم

ہوں گے۔ نہ وہاں (آفتاب کی) دھوپ دیکھیں گے۔ اور نہ شدت کی سردی اور گھنے درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے۔ اور میووں کے گچھے ان کے بہت قریب ہر طرح ان کے اختیار میں ہوں گے اور ان کے سامنے ہمیشہ ایک حالت پر رہنے والے نوجوان لڑکے چکر لگاتے ہوں گے۔ کہ جب تم ان کو دیکھو تو سمجھو کہ بکھرے ہوئے موتی ہیں اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔ لایذوقون فیھا الموت الا الموتۃ الاولیٰ (دخان ۳۰) جنت میں جنتی سوائے پہلی موت کے پھر موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔ لایمسھم فیھا نصب وما ھم منھا بمخرجین (حجر ۴) وہاں ان کو کوئی ہم وغم نہیں چھوئے گا اور نہ ہی ان کو وہاں سے نکالا جائے گا۔ لایسمعون فیھا لغواً الا سلاماً ولھم رزقھم فیھا بکرۃ وعشیاً (مریم ۴) جنتی وہاں کوئی لغو اور بیکار بات نہ سنیں گے۔ سوائے سلام کے اور ان کو اس میں صبح و شام روزی ملے گی۔ وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا السموات والارض اعدت للمتقین (سورۃ آلِ عمران پ ۴ع ۵) اور اپنے پروردگار کے (سبب) بخشش اور جنت کی طرف دوڑ پڑو۔ جس کی وسعت سارے آسمان اور زمین کے برابر ہے۔ اور پرہیزگاروں کے لئے مہیا کی گئی ہے۔ والذین صبروا ابتغاء وجہ ربھم واقاموا الصلوٰۃ وانفقوا مما رزقنٰھم سراً وعلانیۃ ویدرؤن بالحسنۃ السیئۃ اولٰئک لھم عقبی الدار جنٰت عدن یدخلونھا ومن صلح من اٰبآئھم وازواجھم وذریٰتھم والملٰئکۃ یدخلون علیھم من کل باب سلٰم علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار (سورہ رعد پ ۱۳ ع ۹) اور وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے (جو مصیبت ان پر پڑی) جھیل گئے اور پابندی سے نماز ادا کی۔ اور جو کچھ ہم نے انہیں روزی دی تھی۔ اس میں سے چھپا کر اور دکھلا کر (خدا کی راہ میں) خرچ کیا اور یہ لوگ برائی کو بھی بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کی خوبی مخصوص ہے (یعنی) ہمیشہ رہنے کے باغ جن میں وہ آپ جائیں گے۔ اور ان کے باپ دادا ؤں اور ان کی بی بیوں اور ان کی اولاد میں سے جو نیکوکار ہیں۔ (وہ سب بھی) اور فرشتے (بہشت کے ہر) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔ اور السلام علیکم (کے بعد کہیں گے) کہ (دنیا میں)

فیقول لمالک قل للنار لا تحرقی لهم اقدامًا فقد کانوا یمشون الی المساجد ولا تحرقی لهم ایدیًا فقد کانوا یرفعونها الی بالدعاء ولا تحرقی لهم السنة

دینے کے بعد دارو غہ جہنم سے فرمائے گا۔ جہنم سے کہو کہ وہ ان کے قدموں کو نہ جلائے کیونکہ وہ مسجد میں ان سے چل کر جاتے تھے ان کے ہاتھوں کو نہ جلائے۔ کہ وہ ان کو دعا کے لئے میری بارگاہ میں بلند کیا کرتے تھے۔ ان کی زبانوں کو بھی نہ جلائے۔

تم نے صبر کیا (یہ اسی کا صلہ ہے دیکھو) تو آخرت کا گھر کیسا اچھا ہے۔ قل اذلك خیر ام جنة الخلد التی وعد المتقون ط کانت لهم جزآء ومصیرا ○ لهم فیها ما یشآءون خلدین ط کان علی ربك وعدا مسئولا ○ (سورہ فرقان پ ۱۸ ع ۲) (اے رسول) تم پوچھو تو کہ یہ جہنم بہتر ہے یا ہمیشہ رہنے کا باغ (بہشت) جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ کہ وہ ان (کے اعمال) کا صلہ ہو گا۔ اور آخری ٹھکانا جس چیز کی وہ خواہش کریں گے۔ ان کے اس موجود ہوگی (اور) وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے۔ یہ تمہارے پروردگار پر (ایک لازمی اور) مانگا ہوا وعدہ ہے۔ ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل علیهم الملئکة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون نحن اولیؤکم فی الحیوة الدنیا وفی الاخرة ولکم فیها ما تشتهی انفسکم ولکم فیها ما تدعون ○ نزلا من غفور رحیم ○ (سورۃ حم سجدہ پ ۲۴ ع ۱۸) اور جن لوگوں نے (سچے دل سے) کہا کہ ہمارا پروردگار تو (بس) خدا ہے۔ پھر وہ اسی پر قائم بھی رہے۔ ان پر موت کے وقت (رحمت کے) فرشتے نازل ہوں گے۔ اور کہیں گے کہ کچھ خوف نہ کرو اور نہ غم کھاؤ اور جس بہشت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس کی خوشیاں مناؤ۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے۔ اور آخرت میں بھی (رفیق) ہیں۔ اور جس چیز کو تمہارا جی چاہے۔ بہشت میں تمہارے واسطے موجود ہے۔ اور جو چیز طلب کرو گے۔ وہاں تمہارے لئے (حاضر ہوگی) (یہ) بخشنے والے مہربان (خدا) کی طرف سے (تمہاری) مہمانی ہے۔ فیهن قصرت الطرف لم یطمثهن انس قبلهم ولا جان ○ فبای الآء ربکما تکذبن ○ کانهن الیاقوت والمرجان ○ فیهن خیرت حسان ○ فبای الآء ربکما تکذبن ○ حور مقصورت فی الخیام ○ فبای الآء ربکما تکذبن ○ لم یطمثهن انس قبلهم ولا جان ○ (سورۃ الرحمٰن پ ۲۷ ع ۱۳) اس میں پاکدامن، غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے والی عورتیں ہوں گی جن کو ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہو گا اور نہ جن نے۔ تو تم دونوں (جن وانس) اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ وہ حوریں ہیں جو خیموں میں چھپی بیٹھی ہیں۔ پھر تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت سے انکار کرو گے۔ ان سے پہلے ان کو کسی انسان نے چھوا تک نہیں۔ اور نہ جن نے

فقد کانوا یکثرون تلاوۃ القرآن ولا تحرق لہم وجوھا فقد کانوا یسبغون الوضوء فیقول المالک یا اشقیاء فما کان حالکم

کہ وہ ان کے ذریعے بکثرت تلاوتِ قرآن کیا کرتے تھے۔ اور ان کے چہروں کو بھی نہ جلائے۔ کیونکہ یہ مکمل طور پر وضو کیا کرتے تھے۔ دارو غہ جہنم ان سے کہے گا۔ اے بدبختو تمہاری کیا کیفیت تھی؟

ان المتقین فی ظلل وعیون o وفواکہ مما یشتھون o کلوا واشربوا ھنیئا بما کنتم تعملون o انا کذالک نجزی المحسنین o (سورۃ مرسلات پ ۲۹ ع ۲۲) بے شک پرہیز گار لوگ (درختوں کی) گھنی چھاؤں میں ہوں گے اور چشموں اور میوؤں میں جو انہیں مرغوب ہوں (دنیا میں) جو عمل کرتے تھے اس کے بدلے میں مزے سے کھاؤ پیو مبارک۔ ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ان الابرار لفی نعیم o علی الارائک ینظرون o تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم o یسقون من رحیق مختوم o ختمہ مسک وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون o (سورۃ التطفیف پ ۳۰ ع ۸) بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔ تختوں پر بیٹھے نظارے کریں گے۔ تم ان کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے۔ ان کو سربمہر خالص شراب پلائی جائے گی، جس کی مہر مشک کی ہو گی۔ اور اس کی طرف البتہ شائقین کو رغبت کرنی چاہیئے۔ فی جنۃ عالیۃ o لا تسمع فیھا لاغیۃ o فیھا عین جاریۃ o فیھا سرر مرفوعۃ o واکواب موضوعۃ o ونمارق مصفوفۃ o وزرابی مبثوثۃ o (سورۃ الغاشیہ پ ۳۰ ع ۱۳) ایک عالی شان باغ میں۔ وہاں کوئی لغویات سنیں گے ہی نہیں۔ اس میں چشمے جاری ہوں گے۔ اس میں اونچے اونچے تخت (بچھے) ہوں گے اور (ان کے کنارے) گلاس رکھے ہوں گے۔ اور گاؤ تکیے قطار کی قطار لگے ہوئے۔ اور نفیس مسندیں بچھی ہوں گی۔ الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت فلھم اجر غیر ممنون o (سورۃ التین پ ۳۰ ع ۲۰) مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے (اچھے) کام کرتے رہے ان کے لئے تو بے انتہا اجر و ثواب ہے۔ اولئک ھم الوارثون o الذین یرثون الفردوس ھم فیھا خلدون o (سورۃ المومنون پ ۱۸ ع ۱) یہی لوگ سچے اور وارث ہیں۔ جو بہشت بریں کا حصہ لیں گے (اور) یہی لوگ اس میں ہمیشہ (زندہ) رہیں گے۔ طولِ کلام میں فائدہ نہیں۔ قرآن مجید نے نعمات ولذائذ جنت کے بارہ میں یہ کہہ کر خاموشی اختیار کی ہے کہ فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون o (سورۃ السجدہ پ ۲۱ ع ۱۵) ان لوگوں کی کارگزاریوں کے بدلے میں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے ڈھکی چھپی رکھی ہے۔ اس کو تو کوئی شخص جانتا ہی نہیں۔ (ترجمہ حضرت مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

فیقولون کنا نعمل لغیراللّٰہ فقیل خذوا ثوابکم ممن عملتم لہ و اعتقادنا فی الجنّۃ والنار انہما مخلوقتان وان النبیؐ قد

ہم یہ سب اعمال غیر خدا کی خوشنودی کے لئے بجالاتے تھے۔ پس ان سے کہا جائے گا کہ جس کے لئے تم یہ اعمال بجالایا کرتے تھے، اب ان کا بدلہ اور ثواب بھی اسی سے حاصل کرو۔ نیز جنت اور دوزخ کے بارے میں ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ یہ پیدا ہو چکی ہیں۔ شبِ معراج کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بہشت کے بعض اوصاف کا بیان احادیث کی روشنی میں

ان آیاتِ مبارکہ میں بہشت عنبر سرشت کے جو اوصافِ جمیلہ بیان کئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس سے زیادہ بیان کرنے کی چنداں حاجت وضرورت تو نہیں ہے لیکن تاہم مؤمنین کی جلاء ایمانی کی خاطر یہاں اس سلسلہ میں چند احادیث شریفہ بھی پیش کی جاتی ہیں۔

متعدد روایات میں وارد ہے کہ مکاناتِ جنت کی ساخت اس طرح عمل میں لائی گئی ہے کہ اس کی ایک اینٹ سونے کی ہے۔ ایک چاندی کی۔ اور ایک یاقوت کی۔ گارا مسک اذفر کا ہے۔ مٹی زعفران کی اور کنگر ڈوڑے کنگرے یاقوتِ سرخ کے اور چھت زبرجد کی ہے (انوار نعمانیہ وغیرہ)، ثالث بحار میں بروایت ابی بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اور وہ جناب اپنے آباء واجداد طاہرینؑ کے سلسلۂ سند سے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ ان فی الجنۃ غرفاً یریٰ ظاہرھا من باطنھا وباطنھا من ظاہرھا یسکنہا من امتی من اطاب الکلام واطعم الطعام وافشی السلام وصلی باللیل والناس نیام۔ جنت میں ایسے کمرے ہیں جن کا ظاہر باطن سے اور باطن ظاہر سے دکھائی دیتا ہے ان میں میری امت کے وہی لوگ سکونت اختیار کریں گے جو پاکیزہ کلام کرتے ہیں، مستحقین کو طعام کھلاتے ہیں ہر ملنے والے پر سلام کرتے ہیں اور رات کو اس وقت نمازِ خدا پڑھتے ہیں جب لوگ خوابِ غفلت میں سوئے ہوں۔ کتاب مذکور میں جناب پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے فرمایا جب میں شبِ معراج جنت میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ملائکہ کی ایک جماعت جنت میں کچھ مکانات تعمیر کر رہی ہے۔ ایک اینٹ سونے کی ہے اور ایک چاندی کی۔ وہ بناتے بناتے بعض اوقات رک جاتے ہیں۔ میں نے ان سے رکنے کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم مسالہ کا انتظار کرتے ہیں۔ تمہارا مسالہ کیا ہے؟ ملائکہ نے کہا۔ مؤمن کا دارِ دنیا میں تسبیحاتِ اربعہ کو پڑھنا۔ سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔ جب مؤمن پڑھتا ہے تو ہم کام شروع کر دیتے ہیں اور جب وہ رک جاتا

دخل الجنۃ ورأی النار حین عرج بہ واعتقادنا انہ لا یخرج احد من الدنیا حتی یری مکانہ من الجنۃ او من النار وان المؤمن

نے جنت کی سیر فرمائی تھی اور دوزخ کا بھی ملاحظہ فرمایا تھا ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کوئی شخص دنیا سے اس وقت تک نہیں جاتا جب تک جنت یا دوزخ میں اپنا مکان دیکھ نہیں لیتا۔ مومن اس وقت تک دنیا سے نہیں جاتا جب تک پہلے دنیا اسکے سامنے اس

ہے تو ہم بھی رک جاتے ہیں۔ جنت کے مختلف درجات و طبقات ہیں۔ جن میں اپنے اپنے اعمال و مدارج کے مطابق انبیاء، مرسلین، ان کے اوصیاء، آئمہ طاہرینؑ اور مومنین قیام پذیر ہوں گے۔ اور ہر درجہ والا آدمی اپنے درجہ پر یوں قانع و رضامند ہوگا۔ کہ وہ یہ بھی تصور کرے گا۔ کہ اس سے بڑھ کر کسی کا درجہ ہے ہی نہیں۔ خصائل شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں حضرت امیر المومنینؑ سے مروی ہے فرمایا: ان للجنۃ ثمانیۃ ابواب باب یدخل منہ النبیون والصدیقون وباب یدخل منہ الشہداء والصالحون وخمسۃ ابواب یدخل منہا شیعتنا ومحبونا فلا ازال واقفاً علی الصراط ادعوا قول رب سلم شیعتی ومحبی وانصاری ومن تولانی فی دار الدنیا۔ جنت کے ان دروازوں میں ایک دروازہ سے انبیاء و صدیقین داخل ہوں گے اور ایک سے شہداء و صالحین اور پانچ دروازوں سے ہمارے شیعہ جنت میں داخل ہوں گے۔ (جنہیں گذشتہ امتوں کے مومن بھی شامل ہیں۔ اس امر کی تفصیل کے لئے تفسیر صافی کا مقدمہ ملاحظہ ہو) میں برابر پل صراط پر ٹھہرا رہوں گا اور برابر یہ کہتا رہوں گا۔ بار الہا میرے شیعوں، محبوں، مددگاروں کو اور ان کو جنہوں نے دنیا میں مجھ سے محبت کی ہے۔ سلامت رکھ۔ اور ان کو آتش جہنم سے بچا لے۔ بعض روایات میں حضرت امام زین العابدینؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے فرمایا درجات کی تعداد قرآنی آیات کی تعداد کے برابر ہے۔ قاری قرآن کو حکم ہوگا۔ اقرأ وارق قرآن پڑھتا جا۔ اور اوپر چڑھتا جا اس طرح جنت میں سوائے انبیاء و صدیقین کے قاری و عامل قرآن سے کسی کا درجہ زیادہ بلند نہ ہوگا (بحار ج ۳) حضرت امیر علیہ السلام درجات جنت کے بارہ میں فرماتے ہیں۔ درجات متفاضلات ومنازل متفاوتات لا ینقطع نعیمہا ولا یظعن مقیمہا ولا یہرم خالدہا ولا ییأس ساکنہا۔ ترجمہ:۔ جنت کے درجے

حضرت صادق آل محمد علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ جنت کی خوشبو ہزار سال کے راستہ سے آجاتی ہے۔ کم سے کم درجہ والے مومن کو بھی اس قدر نعمات دی جائیں گی۔ کہ اگر تمام جن وانس مل کر اس کے مہمان ہو جائیں۔ تو بآسانی سب کی مہمان نوازی کر سکے گا۔ اور اس کے نعمات میں کچھ کمی بھی واقع نہ ہوگی۔ (حق الیقین شبر) لیکن کئی روایات میں وارد ہے کہ بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ جن کو جنت کی خوشبو بھی نصیب نہ ہوگی۔ ان میں ایک والدین کا عاق

لایخرج من الدنیا حتی یرفع له الدنیا کاحسن ما راٰھا ویری مکانه فی الاخرة ثم تخیر بین الدنیا والاخرة وھو یختار الاخرة	کی بہترین دلکش ہوئی صورت میں پیش نہیں کی جاتی اور اسی حالت میں جنت میں اپنا مکان دیکھتا ہے پھر اسے دنیا و آخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے۔ کہ وہ جسے چاہے اختیار کرے۔ چنانچہ مومن آخرت کو ہی اختیار کرتا ہے۔

دوسرا بوڑھا زناکار، تیسرا دشمن اہل بیتؑ ہے۔ چوتھا از روئے تکبر چادر کو زمین پر گھسیٹ کر چلنے والا (بحار ج ۳) اسی طرح کئی روایات میں وارد ہے کہ جب خلاق عالم نے جنت کو خلق فرمایا تو اپنی عزت و جلال کی قسم یاد فرمائی کہ اس میں چند قسم کے لوگ ہرگز داخل نہیں ہوں گے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں (۱) ہمیشہ شراب خواری کرنے والا (۲) سکیر۔ دیگر مسکرات کو ہمیشہ استعمال کرنے والا۔ (۳) نمام (چغلخور) (۴) دیوث و بے غیرت (۵) نباش۔ نبش قبر کر کے کفن چرانے والا (۶) عشار (چنگی والا) (۷) قاطع الرحم (۸) قدری جبر کا قائل خیر و شر کا فاعل خدا کو سمجھنے والا۔ (۹) کذاب (۱۰) ہمیشہ سود کھانے والا۔

بہرحال جنت وہ عظیم الشان مقام ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اس کی ایک بالشت تمام دنیا وما فیہا سے بہتر و برتر ہے (بحار ج ۳) امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے صادوا علی طول ادم علیه السلام ستین ذراعا و علی ملا عیسیٰ ثلاثا وثلثین سنتو علی لسان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعلی صورة یوسفؑ فی الحسن ثم یعلو علی وجوھھم النور وعلی قلب ایوب فی السلامة من الغل۔ اس وقت حضرت آدمؑ کے قد و قامت یعنی ساٹھ ہاتھ (لمبائی پر) جناب عیسیٰؑ کی عمر یعنی تینتیس ۳۳ سال کی عمر میں جناب محمد مصطفےٰ کی زبان (عربی) اور جناب یوسفؑ کے حسن و جمال پر ہو جائیں گے۔ پھر فرمایا ان کے چہروں پر نور ساطع ہوگا اور جناب ایوبؑ کے قلب اقدس کی طرح حقد و کینہ سے سالم ہوں گے (بحار ج ۳)

امالی شیخ صدوق علیہ الرحمۃ میں اور تفسیر عیاشی میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے اور وہ اپنے آباؤ اجداد طاہرینؑ کے سلسلہ سے جناب امیر علیہ السلام سے روایت فرماتے ہیں۔ کہ طوبیٰ الشجرة فی الجنة اصلھا فی دار النبیؐ ولیس من مومن الا وفی دارہ غصن منھا لا تخطر علی قلبه شھوة الا اتاہ به ذلك الغصن ولو ان راکباً مجداً سار فی ظلھا مأة عام ماخرج منھا ولو طار من غراب من اسفلھا ما بلغ اعلاھا حتی یسقط ھرما الا ففی ھذا فارغبوا۔ جنت میں طوبیٰ ایک درخت ہے جس کی اصل جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں ہے (بعض روایات میں

ثم يقبض روحه وفي العادة يقول الناس فلان يجود بنفسه ولا يجود الانسان بشئ الاعن طيبة نفس غير مقهور ولا مجبور ولا مكره

اس وقت اس کی روح قبض کر لی جاتی ہے۔ عربی زبان کا عام محاورہ ہے کہ جب کوئی شخص مر رہا ہوتا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں فلان یجود بنفسہ (کہ یہ اپنی جان کی سخاوت کر رہا ہے) مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی خوشی سے موت قبول کر رہا ہے۔ کیونکہ کوئی انسان جب کسی چیز کی سخاوت کرتا ہے تو جبراً یا قہراً ناپسندگی کی صورت میں نہیں کرتا بلکہ

اس کی اصل جناب امیر علیہ السلام کے گھر میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن ان میں کوئی منافات نہیں ہے کما لا یخفیٰ۔ اور کوئی ایسا مومن نہ ہوگا جس کے گھر میں اس کی ایک شاخ نہ ہو۔ مومن جس چیز کا ارادہ کرے گا۔ وہ شاخ فوراً اسے حاضر کر دے گی۔ اور وہ درخت اس قدر بڑا ہے۔ کہ اگر کوئی تیز رو سوار اس کے سایہ میں سو برس تک چلتا رہے تو اسے عبور نہ کر سکے گا۔ اور اگر کوا اس کے نچلے حصہ سے اوپر کی طرف پرواز کرے۔ تو اس کے بالائی حصہ تک پہنچنے سے پیشتر وہ بہت بوڑھا ہو جانے کی وجہ سے گر پڑے گا۔ ایسی گرانقدر چیز کے حاصل کرنے میں ضرور رغبت کرو۔ بعض روایات میں وارد ہے کہ مومن اس سے جب پھل توڑیں گے۔ تو اس کی جگہ پھر بدستور وہاں وہ پھل لگ جائے گا۔ اور وہاں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ جناب امام محمد باقرؑ سے دریافت کیا گیا کہ اس کی دنیا میں بھی کوئی نظیر موجود ہے۔ فرمایا۔ ہاں اگر ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ روشن کر لئے جائیں تو پہلے چراغ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ (احتجاج طبرسی)۔ مومنین کرام کو کس قدر حور و قصور ملیں گے؟ اس کی تعداد کے سلسلہ میں اخبار و آثار میں اختلاف ہے جو اہل ایمان کے درجاتِ ایمانی کے اختلاف پر محمول ہے۔ علامہ جزائریؒ انوار نعمانیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ وورد فی الروایات ان اللہ تعالیٰ ادنیٰ ما یعطی المومن سبعین الف حور و لو طلعت واحدۃ منھن الی الدنیا لاشرقت لھا و لمات الناس شوقاً الیھا۔ یعنی روایات میں وارد ہے کہ خداوند عالم مومن کو کم از کم ستر ہزار ایسی خوبصورت حور العین عطا فرمائے گا۔ کہ اگر ان میں سے ایک دنیا کی طرف جھانک لے تو تمام دنیا اس کے انوار سے جگمگا اٹھے۔ اور دنیا والے اس کے شوقِ وصل میں مر جائیں۔ ایک اور روایت میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے۔ و لو ان حوراء من حور الجنۃ برزت علی اہل الدنیا و ابدت ذوابۃ من ذوائبھا لاماتت اہل الدنیا۔ اگر جنت کی حوروں میں سے ایک حور اہل دنیا کے لئے ظاہر ہو جائے یا اپنی مینڈھی کھول دے تو تمام اہل دنیا کو شدتِ شوقِ وصل میں مار ڈالے (بحار ج ۳) یہ حوریں فخریہ انداز میں اپنے متعلق بڑے عشوہ و ناز کے ساتھ کہتی ہیں۔ نحن الناعمات فلا نبوس ابداً نحن الطاعمات فلا نجوع ابداً۔ ونحن الکاسیات فلا نعری ابداً ونحن الخالدات فلا نموت ابداً ونحن الراضیات فلا نسخط

واما جنة آدم فهي جنة من جنان الدنيا تطلع الشمس فيها وتغيب وليس بجنة الخلد ولو كانت جنة الخلد ما خرج منها ابداً واعتقادنا

جس جنت میں حضرت آدمؑ رہائش پذیر ہوئے تھے وہ دنیا کے باغوں میں سے ایک باغ تھا۔ (جنت کے لغوی معنیٰ باغ کے ہیں) جس میں سورج کرتا تھا۔ اور غروب بھی وہ جنت الخلد یعنی بقائے دوام والی جنت نہ تھی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت آدمؑ اس سے ہرگز نہ نکلتے۔ ہمارا یہی اعتقاد ہے۔

ابداً ونحن المقيمات. فلا نظعن ابداً فطوبیٰ لمن كنا له وكان لنا نحن خيرات حسان ازواجنا اقوام كرام (حدیث نبویؐ، ثالث بحار) یعنی ہم وہ نرم و نازک ہیں جو کبھی بوسیدہ نہ ہوں گی۔ ہم وہ سیر ہیں جو کبھی گرسنہ نہ ہوں گی۔ ہم وہ صاحبِ پوشاک ہیں جو کبھی عریاں نہ ہوں گی۔ ہم وہ ہمیشہ رہنے والی ہیں جو کبھی نہ مریں گی۔ ہم وہ خوش و خرم ہیں جو کبھی ناراض نہ ہوں گی۔ ہم وہ قیام پذیر ہیں جو کبھی یہاں سے کوچ نہ کریں گی۔ بہت ہی خوش قسمت ہیں وہ جس کے لئے ہم ہیں اور وہ ہمارے لئے ہیں۔ ہم ہی بہترین خوبصورت بیبیاں ہیں ہمارے شوہر بہترین شریف لوگ ہوں گے۔ اللهم ذوجنا من الحور العين بجاه النبي وآله الطاهرين۔ ان مومنات کی جو داخلِ جنت ہوں گی، مؤمنین کے ساتھ تزویج کی جائے گی۔ روایات میں وارد ہے۔ کہ اگر کسی مومنہ کے دارِ دنیا میں مختلف اوقات میں دو یا دو سے زیادہ شوہر تھے۔ اور حسنِ اتفاق سے سب کے سب جنت میں پہنچ گئے۔ تو اس کی تزویج اس کے اس شوہر کے ساتھ کی جائے گی۔ جو دنیا میں اس کے ساتھ زیادہ حسنِ خلق سے پیش آتا تھا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ جو اس سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ (دونوں کا مطلب ایک ہی ہے) بحار الانوار ج ۳ و علل الشرائع)

جنت کے کھانوں کے متعلق وارد ہے کہ ایک ایک کھانے میں ہزار ہزار ذائقہ ہوگا۔ اور یہی کیفیت جنت کے پھلوں کی مروی ہے۔ جو کچھ کھائیں گے اس سے بول و براز کی حاجت لاحق نہ ہوگی۔ بلکہ خوشبودار پسینے کی صورت میں تحلیل ہو جائے گا جنابِ امام محمد باقرؑ سے پوچھا گیا۔ کہ آیا اس کی دنیا میں کوئی مثال موجود ہے؟ فرمایا ہاں بچہ ماں کے پیٹ میں کھاتا ہے۔ لیکن بول و براز نہیں کرتا۔ اسی طرح وہاں احباب و اصحاب کی ملاقات و صحبت کا لطف بھی حاصل ہوگا۔ حضرت صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا۔ اگر کسی مؤمن کے بعض احباب یا اقرباء جہنم میں ہوئے تو ان کا صدمہ اُسے لاحق ہوگا؟ اس طرح اس کی راحت میں لازماً فرق آجائے گا امام نے فرمایا ان الله ينسيهم حتى لا يفتقدوهم ولفواقهم خداوند عالم اہل جنت کے ذہنوں سے ایسے لوگوں کو بھلا دے گا۔ تاکہ ان کی مفارقت کی وجہ سے غمناک نہ ہوں۔ اور یہ بات کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔ کیونکہ ان الله على كل شئ قدير۔ غرضیکہ جنت میں ہر قسم

ان بالثواب يخلد اهل الجنة فی الجنة وبالعقاب يخلد اهل النار فی النار وما من احد يدخل الجنة حتی يعوض عليه مكانه من النار

کہ بہشت والے ثواب پانے کی غرض سے ہمیشہ بہشت میں رہیں گے۔ اور اہل دوزخ بوجہ عذاب ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ جو شخص بھی جنت میں داخل ہوگا۔ پہلے اس کا دوزخ والا مکان اس کے سامنے پیش کرکے

کی لذت وآسائش کے سامان مہیا ہوں گے۔ ورضوان من اللہ اکبر۔ حتیٰ کہ وہاں غنا وسرود بھی ہوگا۔ چنانچہ انوار نعمانیہ وغیرہ کتب میں وارد ہے۔ کہ ایک اعرابی نے جناب رسولؐ خدا سے سوال کیا۔ کہ جب جنت میں سب نعمات ہوں گی۔ تو آیا غنا بھی ہوگا۔ فرمایا ہاں جنت کے درختوں کے ساتھ کچھ جرس ٹنگے ہوئے ہوں گے۔ جب انہیں ضرب لگائی جائے گی۔ تو ان سے ایسی مختلف قسم کی عمدہ آوازیں آئیں گی کہ اگر دنیا والے سن لیں۔ تو شدتِ طرب وسرور سے مر جائیں۔ بعض روایات میں وارد ہے کہ اس غنا وسرود سے وہی مؤمن لطف اندوز ہوں گے۔ جن کے کان دنیا میں راگ سننے سے ملوث نہیں ہوئے ہوں گے۔ (ثالث بحار) حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے آباؤ اجداد طاہرین کے سلسلہ سند سے آنحضرتؐ سے روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ ان فی الفردوس لعيناً احلی من الشهد والين من الزبد وابرد من الثلج واطيب من المسک جنت میں ایک ایسا چشمہ ہے جو شہد سے زیادہ شیریں، جھاگ سے زیادہ نرم برف سے زیادہ ٹھنڈا اور مشک عنبر سے زیادہ خوشبودار ہے۔ آیات وروایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ جنت میں متعدد نہریں ہیں۔ جنت تجری من تحتها الانهار۔ جن میں سے کچھ نہریں صاف پانی کی۔ بعض شہد کی اور بعض دودھ کی ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے یہ نام ذکر کئے گئے ہیں (۱) کافور۔ ان الابرار يشربون من كاس كان مزاجها كافوراً عيناً يشرب بها عباد الله (۲) سلسبیل۔ عيناً فيها تسمی سلسبيلاً (۳) تسنیم۔ ومزاجه من تسنيم عيناً يشرب بها المقربون (۴) زنجبیل يسقون فيها كاساً كان مزاجها زنجبيلاً (۵) رحیق۔ يسقون من رحيق مختوم ختامه مسک (۶) کوثر۔ انا اعطيناک الكوثر (حق الیقین) کہاں تک جنت کے حالات واوصاف کا تذکرہ کیا جائے جب کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا کہ رب جلیل ارشاد فرماتا ہے۔ اعددت لعبادی الصالحين مالا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے جنت میں وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے۔ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا ہے (حق الیقین) اللهم ارزقنا الجنة بحق امام الانس والجنة۔

فیقال لہ ھذا مکانک الذی لو
عصیت اللہ لکنت فیہ وما من
احد یدخل النار حتی یعرض علیہ
مکانہ من الجنۃ فیقال لہ ھذا

اس سے کہا جائے گا۔ اگر تو خدا کی نافرمانی کرتا تو اس مکان میں تیری رہائش ہوتی۔ اور جسے جہنم میں داخل کیا جائے گا اسے پہلے جنت والا مکان دکھایا جائے گا۔ اور کہا جائے گا۔ کہ اگر تو خدا کی اطاعت کرتا تو تجھے یہ مکان نصیب ہوتا۔

مصنف رسالہ کے بیان کردہ مسلک لذت روحانی کی تضعیف

حضرت مصنف علام نے جو یہ فرمایا ہے۔ کہ بعض اہل جنت ایسے ہوں گے کہ ان کی لذتیں فقط تسبیح و تقدیس الٰہی میں ہوں گی۔ نہ اکل و شرب یا دیگر جسمانی لذائذ اور بعض جسمانی لذائذ سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس پر حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ نے بڑی عمدہ تنقید فرمائی ہے اور جس روایت میں یہ امر وارد ہے اسے جعلی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ قرآن اس کی تکذیب کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے بار بار اکل و شرب اور نکاح وغیرہ لذاتِ جسمانیہ کا تذکرہ کر کے اہل ایمان کو ان کے حاصل کرنے کی ترغیب و تشویق دلائی ہے۔ اور پھر ان آیات میں سے بعض نقل فرمائی ہیں جو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ بنا بریں یہ کس طرح متصور ہو سکتا ہے۔ کہ جنت میں ایک گروہ ایسا بھی ہوگا جو ملائکہ کی طرح نہ کھائے گا نہ پیئے گا۔ اور نہ نکاح کرے گا۔ یہ امر ظاہر قرآن کریم اور اتفاق مسلمین کے خلاف ہے۔ سرکار علامہ مجلسیؒ نے سرکار شیخ کی یہ تنقید نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے۔ وھو فی غایۃ المتانۃ یعنی جناب شیخ کی تنقید نہایت متین ہے۔ وھو فی محلہ والانصاف ان الحق فی ھذہ المسئلۃ مع الشیخ۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جنتی لوگ لذائذ و نعمات جنت سے جب لطف اندوز ہوں گے۔ تو خوش ہو کر از خود خدائے عزوجل کی حمد و ثنا بھی کریں گے۔ جیسا کہ قرآن میں وارد ہے۔ دعواھم فیہا سبحانک اللّٰھم وتحیتھم فیہا سلٰم و اٰخر دعوٰھم ان الحمد للہ رب العٰلمین ۝ (سورۂ یونس پ ۱۱ ع ۹) یعنی ان باغوں میں ان لوگوں کا بس یہ قول ہوگا۔ اے خدا تو پاک و پاکیزہ ہے۔ اور ان میں ان کی باہمی خیر صلاحی سلام سے ہوگی۔ اور ان کا آخری قول یہ ہوگا کہ سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے وقال لھم خزنتھا سلٰم علیکم طبتم فادخلوھا خٰلدین ۝ وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء (سورۂ زمر پ ۲۴ ع ۵) اور اس کے نگہبان اس سے کہیں گے سلام علیکم تم اچھے رہے تم بہشت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔ اور یہ لوگ کہیں گے خدا کا شکر ہے جس نے اپنا وعدہ ہم سے سچا کر دکھایا۔ اور ہمیں دہشت (بہشت) کی اس زمین کا مالک بنایا۔ کہ ہم بہشت میں جہاں چاہیں رہیں (ترجمہ فرمان)

مکانہ الذی لو اطعت اللہ مکنت فیہ فیورث ھؤلاء مکان ھؤلاء وذلک قول اللہ عزوجل اولئک ھم الوارثون الذین

الغرض خدا کے نیک اور اطاعت گذار بندوں کو ان نافرمانوں کے جنتی مکانوں کا وارث بنا دیا جائے گا۔ جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ یہ لوگ وارث ہیں۔ جو جنت کے وارث ہوں گے۔

ارشادِ صادق کی توضیح

جناب مصنف علیہ الرحمہ نے حضرت صادق علیہ السلام کی جو حدیث نقل فرمائی ہے۔ جس میں عبادت گذاروں کی مختلف قسمیں بیان کی گئی ہیں یہ روایت اگرچہ معتبر اور قابلِ وثوق ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سوائے ایک قسم کے باقی دونوں قسم کے عبادت گذاروں کی عبادت باطل ہو۔ فقہاء عظام میں سے اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ صحیح ہو کہ شوق جنت یا خوف جہنم کے جذبہ کے تحت عبادت باطل ہوتی ہے تو اس کی ذمہ داری معاذ اللہ خود خدا اور رسولؐ پر عائد ہوگی۔ کیونکہ انہوں ہی نے یہ ترغیب و ترہیب دلائی ہے۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عبادت جو جنت کی طمع یا جہنم کے خوف سے بالاتر ہو کر محض معبودِ حقیقی کو لائق عبادت سمجھ کر کی جائے۔ وہ یقیناً افضل و اعلیٰ ہوگی جیسا کہ جنابِ امیر علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں۔ الٰہی ما عبدتک طمعاً فی جنتک ولا خوفاً من نارک بل وجدتک اھلا للعبادۃ فعبدتک۔ بارالہا میں نے تیری عبادت تیری جنت کی طمع اور تیری جہنم کے خوف سے متاثر ہو کر نہیں کی۔ بلکہ میں نے تجھے لائق عبادت سمجھ کر تیری پرستش کی ہے (نہج البلاغہ)

شدائد دوزخ کی اجمالی کیفیت

جس طرح جنت کے نعمات کی تعریف و توصیف ہمارے حیطہ بیان سے باہر ہے۔ اسی طرح آتشِ جہنم اعاذنا اللہ وجمیع المومنین من نارھا و شدائدھا بجاہ النبی وآلہ الطاہرین کی حقیقی کیفیت بیان کرنا بھی ہمارے حیطۂ اختیار میں نہیں ہے۔ آیات و روایات کی روشنی میں جہنم کا جو نقشہ سامنے آتا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ جہنم وہ دارِ سزا ہے کہ جس میں ہر قسم کی اذیت و تکلیف۔ رنج و الم و کرب و اضطراب کے اسباب مہیا ہوں گے۔ کھانے پینے کے لئے کھولتا ہوا پانی اور پیپ اور زقوم ملے گا۔ جس سے ان کی آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے جب ایک چمڑا گل سڑ جائے گا۔ تو اسے پھر نئے چمڑے کے ساتھ تبدیل کر دیا جائے گا۔ نہ ہی موت آئے گی کہ ان کی اس عذاب و عقاب سے گلو خلاصی ہو۔ اور نہ رستگاری ہوگی۔ داد و فریاد کریں گے مگر کوئی شنوائی نہ ہوگی اسی طرح انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ ابد الآباد تک اس میں معذب و معاقب رہیں گے۔ نیز دوزخ کے مختلف درکات و طبقات ہوں گے۔ جس میں کفار و مشرکین اور منافقین و عاصیین اپنے اپنے کردار کے مطابق سزا

یرثون الفردوس ھم   یہی لوگ ہیں جو جنّت کے وارث ہوں گے
فیہا خالدون۔   اور ہمیشہ اس میں رہیں گے

— — — — — —

— — — — — —

پائیں گے۔ اس سلسلہ میں نہایت اختصار کے ساتھ چند آیات وروایات پیش کی جاتی ہیں۔ ارشادِ قدرت ہے۔ فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین (سورۃ البقرپ ۱ ع ۳) تم اس آگ سے ڈرو، جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ اور کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ انا اعتدنا للظلمین نارا احاط بھم سرادقھا وان یستغیثوا یغاثوا بماء کالمھل یشوی الوجوہ ط بئس الشراب ط وساءت مرتفقا ۰ (سورہ کہف پ ۱۵ ع ۱۶) ہم نے ظالموں کے لئے وہ آگ (دہکا کے) تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں انہیں گھیر لیں گی۔ اور اگر وہ لوگ دہائی دیں گے تو اُن کی فریاد رسی کھولتے ہوئے پانی سے کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کے جیسا ہوگا۔ (اور) وہ منہ کو بھون ڈالے گا۔ کیا بُرا پانی ہے اور جہنم بھی کیا بُری جگہ ہے۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ۰ یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکویٰ بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ط ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون ۰ (سورہ توبہ پ ۱۰ ع ۱۱) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے جاتے ہیں۔ اور اس کو راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے۔ تو (اے رسول) ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں گرم (اور لال) کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔ (اور ان سے کہا جائے گا) یہ وہ ہے جسے تم نے اپنے لئے (دنیا میں) جمع کر کے رکھا تھا۔ تو (اب) اپنے جمع کئے کا مزہ چکھو۔ یریدون ان یخرجوا من النار وما ھم بخارجین منھا ولھم عذاب مقیم ۰ (سورہ مائدہ پ ۶ ع ۱۰) وہ لوگ تو چاہیں گے کہ کسی طرح جہنم کی آگ سے نکل بھاگیں۔ مگر وہاں سے تو وہ نکل ہی نہیں سکتے اور اُن کے لئے تو دائمی عذاب ہے۔ فالذین کفروا قطعت لھم ثیاب من نار ط یصب من فوق رؤسھم الحمیم ۰ یصھر بہ ما فی بطونھم والجلود ۰ ولھم مقامع من حدید ۰ کلما ارادوا ان یخرجوا منھا من غم اعیدوا فیھا و ذوقوا عذاب الحریق ۰ (سورۃ الحج پ ۱۷ ع ۹) غرض جو لوگ کافر ہو بیٹھے ان کے لئے تو آگ کے کپڑے قطع کئے گئے ہیں۔ (اور انہیں پہنائے جائیں گے اور) اُن کے سروں پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا۔ جس (کی گرمی) سے جو کچھ اُن کے پیٹ میں ہے (آنتیں

واقل المومنین منزلة فی الجنة من له مثل تلك الدنیا عشر مرات

اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ سب سے کم درجہ کا مومن جنت میں وہ شخص ہوگا۔ جس کے لئے وہاں اس دنیا کی نعمتوں سے دس گنا زیادہ نعمتیں میسر ہوں گی

دغیرہ) اور کھالیں سب گل جائیں گی۔ اور ان کے مارنے کے لئے لوہے کے گرز ہوں گے۔ کہ جب صدمے سے بچنے کے لئے چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں۔ تو گرز مار کے پھر اسی کے اندر دھکیل دیئے جائیں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ جلانے والے عذاب کے مزے چکھو۔ کلما نضجت جلودھم بدلنٰھم جلوداً غیرھا لیذوقوا العذاب ط (سورۃ النساء پ ۵ ع ۵) اور جب ان کی کھالیں (جل کر) گل جائیں گی۔ تو ہم اُن کے لئے دوسری کھالیں بدل کر پیدا کر دیں گے تاکہ وہ اچھی طرح عذاب کا مزا چکھیں۔

ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار (سورۃ النساء پ ۴ ع ۱۸) اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے۔ ان الذین کفروا لن تغنی عنھم اموالھم ولا اولادھم من اللہ شیئاً و اولٰئك اصحٰب النار ھم فیھا خلدون ۰ (سورۃ آل عمران پ ۴ ع ۳) بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا۔ خدا کے عذاب سے بچانے میں ہرگز نہ ان کے مال ہی کچھ کام آئیں گے نہ اُن کی اولاد۔ اور یہی لوگ جہنمی ہیں۔ اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ ان اللہ الذین یاکلون اموال الیتٰمٰی ظلماً انما یاکلون فی بطونھم ناراً ط وسیصلون سعیراً (سورۃ النساء پ ۴ ع ۱۲) جو لوگ یتیموں کے مال ناحق چٹ کر جایا کرتے ہیں۔ وہ اپنے پیٹ میں بس انگارے بھرتے ہیں۔ اور عنقریب جہنم واصل ہوں گے۔ ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ ناراً خالداً فیھا ولہ عذاب مھین۔ (سورۃ نساء پ ۴ ع ۱۳) اور جس شخص نے خدا و رسول کی نافرمانی کی۔ اور اس کی حدوں سے گذر گیا۔ تو بس خدا اس کو جہنم میں داخل کرے گا۔ اور وہ اس میں ہمیشہ (اپنا کیا بھگتتا) رہے گا۔ اور اس کے لئے بڑی رسوائی کا عذاب ہے۔ ومن یقتل مؤمناً متعمداً فجزآؤہ جھنم خالداً فیھا وغضب اللہ علیه ولعنه واعد له عذاباً عظیماً (سورۃ نساء پ ۵ ع ۱۰) اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر مار ڈالے (تو غلام کی آزادی وغیرہ اس کا کفارہ نہیں بلکہ) اس کی سزا دوزخ ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔ اس پر خدا نے اپنا غضب ڈھایا ہے۔ اور اس پر لعنت کی ہے۔ اور اس کے لئے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ الم یعلموا انه من یحادد اللہ ورسوله فان له نار جھنم خالداً فیھا ذٰلك الخزی العظیم ۰ (سورۃ توبہ پ ۱۰ ع ۱۴) کیا ان لوگوں کو یہ بھی نہیں جانتے کہ جس شخص نے خدا اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی۔ تو اس میں شک ہی نہیں کہ

اس کے لئے جہنم کی آگ تیار کر رکھی ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ (جلتا بھنتا) رہے گا یہی تو بڑی رسوائی ہے
ثم قیل للذین ظلموا ذوقوا عذاب الخلد ھل تجزون الا بما کنتم تکسبون ٥ (سورہ یونس
پ۱۱ ع۱۰۲) پھر (قیامت کے دن) ظالم لوگوں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کے مزے چکھو۔ (دنیا میں)
جیسی تمہاری کرتوتیں تھیں۔ (آخرت میں) ویسا ہی بدلا دیا جائے گا۔ فادخلوا ابواب جہنم خالدین فیھا
فلبئس مثوی المتکبرین ٥ (سورۃ نحل پارہ ۱۴ ع۱۰۲) (اچھا تو) جہنم کے دروازوں میں جا داخل ہو۔ اور اس
میں ہمیشہ رہو گے۔ غرض تکبر کرنے والوں کا بھی کیا برا ٹھکانہ ہے۔ وان جہنم لموعدھم اجمعین لھا سبعۃ
ابواب لکل باب منھم جزء مقسوم (پ۱۴ س حجر ع۳) اور یقیناً جہنم ان سب کی وعدہ گاہ ہے۔ جس کے سات
دروازے ہیں۔ ان میں سے ہر دروازہ کے لئے بٹا ہوا حصہ مقرر ہے۔ ان لدینا انکالاً وجحیماً وطعاماً ذا
غصۃ وعذاباً الیماً۔ بیشک ہمارے پاس بھاری بھاری بیڑیاں بھی ہیں اور جلانے والی آگ بھی اور گلے
میں پھنسنے والا کھانا بھی اور دردناک عذاب بھی۔ ان شجرت الزقوم طعام الاثیم۔ کالمھل یغلی
فی البطون (پ۲۵ س دخان ع۶) یقیناً تھوہر کا درخت گنہگاروں کی خوراک ہوگا (جو) پگھلے ہوئے تانبے کی مانند
ہے معدوں میں ایسی کھلبلی مچا دے گا جیسے گرم پانی کا اوٹنا۔ وخاب کل جبار عنید۔ من ورائہ
جہنم ویسقیٰ من ماء صدید۔ یتجرعہ ولا یکاد یسیغہ ویاتیہ الموت من کل
مکان وما ھو بمیت (پ۱۳ س ابراہیم ع۱۵) اور وہ (پیغمبر) طالب فتح ہوئے اور ہر کینہ جو ظالم
ناامید ہوا آگے اس کے جہنم ہے اور پیپ کے پانی میں سے اس کو پلایا جائے گا۔ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے
اس کو پیئے گا اور پھر بھی حلق سے نہ اتار سکے گا اور موت اس کو ہر طرف سے آئے گی حالانکہ وہ مرنے
والا نہ ہوگا۔ فی جنت یتساءلون عن المجرمین ما سلککم فی سقر۔ قالوا لم نک من المصلین
ولم نک نطعم المسکین۔ وکنا نخوض مع الخائضین۔ وکنا نکذب بیوم الدین ٥
(پ۲۹ س مدثر ع۱۶) جو جنتوں میں گنہگاروں سے یہ دریافت کرتے ہوں گے کہ تم کو بھڑکتی آگ میں کس چیز نے پہنچا
دیا؟ وہ کہیں گے ہم نہ تو نمازیوں میں سے تھے اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ اور ہم باطل میں گھس پڑنے
والوں کے ساتھ گھس پڑا کرتے تھے اور ہم فیصلے کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے۔ (مقبول ترجمہ)
واعتدنا لمن کذب بالساعۃ سعیراً ٥ اذا راتھم من مکان بعید سمعوا لھا تغیظاً
وزفیراً ٥ واذا القوا منھا مکاناً ضیقاً مقرنین دعوا ھنالک ثبوراً ٥ لا تدعوا الیوم
ثبوراً واحداً وادعوا ثبوراً کثیراً (سورۃ فرقان پ۱۸ ع۱) اور جس شخص نے قیامت کو جھوٹ
سمجھا اس کے لئے ہم نے جہنم (کو دہکا کے) تیار کر رکھا ہے۔ کہ جب جہنم ان لوگوں کو دور سے دیکھے گی تو

(جوش کھائے گی اور) یہ لوگ اس کے جوش وخروش کی آواز سنیں گے اور جب یہ لوگ زنجیروں سے جکڑ کر
اس کی کسی تنگ جگہ میں جھونک دیئے جائیں گے۔ تو اس وقت موت کو پکاریں گے۔ (اس وقت ان سے کہا جائے
گا) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو، بلکہ بہتیری موتوں کو پکارو۔ (مگر اس سے کچھ ہونے والا نہیں) واما الذین
فسقوا فماوٰھم النار کلما ارادوا ان یخرجوا منھا اعیدوا فیھا وقیل لھم ذوقوا عذاب
النار الذی کنتم بہ تکذبون ۰ (سورۃ السجدہ پ ۲۱ ع ۱۵) اور جن لوگوں نے بدکاری کی ان کا ٹھکانہ تو بس جہنم
ہے۔ وہ جب اس میں سے نکل جانے کا ارادہ کریں گے تو اسی میں پھر دھکیل دیئے جائیں گے۔ اور ان سے
کہا جائے گا کہ دوزخ کے جس عذاب کو تم جھٹلاتے تھے۔ اب اس (کے مزے) کو چکھو۔ جہنمی عرض کریں گے
رب ارجعون ۰ لعلی اعمل صالحا فیما ترکت (سورہ المومنون پ ۱۸ ع ۴) پروردگارا! تو مجھے (ایک بار)
اس مقام (دنیا) میں جسے میں چھوڑ آیا ہوں پھر واپس کر دے تاکہ میں (اب کی دفعہ) اچھے اچھے کام کروں
جواب ملے گا۔ اولم نعمرکم ما یتذکر فیہ من تذکر وجاءکم النذیر۔ فذوقوا فما للظلمین
من نصیر۔ کیا ہم نے تم کو اس قدر عمر عطا نہیں کی تھی؟ کہ جو شخص اس میں نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو کر سکتا
تھا۔ اور کیا تمہارے پاس ہمارے ڈرانے والے نہیں آئے تھے۔ آج عذاب کا مزہ چکھو۔ ظالموں کا کوئی
مددگار نہیں ہے۔ ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جہنم داخرین ۰ (سورۃ المومن
پ ۲۴ ع ۱۱) جو لوگ ہماری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ہی ذلیل وخوار ہو کر یقینی جہنم واصل ہوں گے۔
ان المجرمین فی عذاب جہنم خلدون ۰ لا یفتر عنھم وھم فیہ مبلسون ۰ وما ظلمنٰھم
ولکن کانوا ھم الظلمین ۰ ونادوا یٰملک لیقض علینا ربک قال انکم ماکثون ۰ لقد جئنکم
بالحق ولکن اکثرکم للحق کرھون ۰ (سورہ زخرف پ ۲۵ ع ۱۳) گنہگار (کفار) تو یقیناً جہنم کے عذاب
میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو ان سے کبھی ناغہ نہ کیا جائے گا۔ اور وہ اسی عذاب میں ناامید ہو کر رہیں گے۔ اور ہم نے
ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ بلکہ وہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ اور (جہنمی) پکاریں گے۔ کہ اے مالک
(داروغہ جہنم کوئی ترکیب کرو) تمہارا پروردگار ہمیں موت ہی دیدے۔ وہ جواب دے گا کہ تم کو اسی
حال میں رہنا ہے (اے کفار مکہ) ہم تو تمہارے پاس حق لے کر آئے ہیں۔ مگر تم میں سے بہتیرے حق
(بات) سے چڑتے ہیں۔ وسقوا ماء حمیما فقطع امعاءھم (سورۃ محمد پ ۲۶ ع ۶) اور ان کو کھولتا
ہوا پانی پلایا جائے گا۔ تو وہ آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ یا یھا الذین امنوا قوا انفسکم
واھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ علیھا ملئکۃ غلاظ شداد لا یعصون اللہ ما امرھم
ویفعلون ما یؤمرون ۰ یا یھا الذین کفروا لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون ۰

(سورۃ تحریم پارہ ۲۸ ع ۱۹) اے ایماندارو اپنے آپ کو اپنے لڑکے بالوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ اور ان پر وہ تند خو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں۔ کہ خدا جس بات کا حکم دیتا ہے۔ اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اور جو حکم انہیں ملتا ہے۔ اسے بجا لاتے ہیں (جب کفار دوزخ کے سامنے آئیں گے تو کہا جائے گا) کافرو آج بہانے نہ ڈھونڈو۔ جو کچھ تم کرتے تھے تمہیں انہیں کی سزا دی جائے گی۔ فاما من طغی ۔ واثر الحیوۃ الدنیا ۔ فان الجحیم ھی الماوٰی ۔ (سورۃ النزعت پ ۳۰) تو جس نے (دنیا میں) سر اٹھایا تھا اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دی تھی۔ اس کا ٹھکانہ تو یقیناً دوزخ ہے۔ انھا ترمی بشرر کالقصر ۔ کانہ جملت صفر ۔ ویل یومئذ للمکذبین ۔ (سورۃ مرسلات پ ۲۹ ع ۲۱) اس سے اتنے بڑے بڑے انگار برستے ہوں گے۔ جیسے محل گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔ اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے۔ (ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

عذاب جہنم کا مختصر بیان بزبان حضرات ائمہ علیہم السلام

جناب رسول خدا اور آئمہ ہدیٰ علیہ وعلیہم السلام کی سینکڑوں احادیث میں جہنم کے شدائد و مصائب و آلام کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ اس مختصر میں ان کے ذکر کرنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ہی بظاہر مذکورہ بالا آیات کے بعد اس کی ضرورت ہے۔ اس لئے فقط صرف دو چار احادیث پیش کی جاتی ہیں۔ حضرت امیرالمومنینؑ ایک خطبہ میں فرماتے ہیں۔ واعلموا انہ لیس لھذا الجلد الرقیق صبر علی النار فارحموا نفوسکم فانکم جربتموھا فی مصائب الدنیا افرأیتم جزع احدکم من الشوکۃ تصیبہ والعثرۃ تدمیہ والرمضاء تحرقہ فکیف اذا کان بین طابقین من نار ضجیع حجر وقرین شیطان اعلمتم ان مالکاً اذا غضب علی النار حطم بعضہا بعضاً لغضبہ واذا زجرھا توثبت بین ابوابہا جزعاً من زجرتہ ایتہا الیفن الکبیر الذی قد لھزہ القتیر کیف انت اذا التحمت اطواق النار بعظام الاعناق ونشبت الجوامع حتی اکلت لحوم السواعد۔ (نہج البلاغۃ) تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارا یہ نرم و نازک چمڑا آتش جہنم برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے نفوس پر رحم کرو۔ کیونکہ تم اپنے نفوس کو مصائب و آلام دنیا میں آزما چکے ہو۔ تم نے کسی کو دیکھا ہوگا۔ کہ اگر کسی وقت اسے کانٹا چبھ جائے۔ تو وہ کس طرح جزع و فزع کرتا ہے۔ اسے تھوڑا سا ٹھوکر کھانا خون آلودہ کر دیتا ہے گرم ریت اسے جلا دیتی ہے۔ اس کی اس وقت کیا کیفیت ہوگی۔ جب آتش جہنم کے دو پاٹوں کا ہم خواب اور شیطان کا ہم نشین ہوگا۔ کیا تمہیں علم ہے کہ جب داروغہ دوزخ (مالک) آتش دوزخ پر غضب ناک ہوتا ہے تو اس کے قہر و غضب کی وجہ سے جہنم کے بعض حصے دوسرے بعض حصوں کو توڑ دیتے ہیں۔ اور جب

وہ فرشتہ آتش کو زجر و توبیخ کرتا ہے۔ تو اس کے شعلے دوزخ کے دروازوں پر لپک کر پناہ لیتے ہیں۔ اے بوڑھے انسان جس کے ساتھ بڑھاپا ممزوج و مخلوط ہو گیا ہے۔ اس وقت تیری کیا حالت ہو گی جب آتشِ دوزخ کے طوق تیری گردن کی ہڈیوں میں گوشت کی طرح پیوست ہو جائیں گے۔ اور زنجیر و ہتکڑیاں تیرے ہاتھوں میں گڑ جائیں گی۔ یہاں تک کہ بازوؤں کا گوشت کھا جائیں گی اعاذنا اللہ منہ۔ کتاب امالی میں بروایت عمرو بن ثابت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا ان اہل النار یتعاوون کما یتعاوی الکلاب والذئاب مما یلقون من الیم العذاب فما ظنک یا عمرو بقوم لا یقضی علیہم فیموتوا ولا یخفف علیہم من عذابہا عطاش فیہا جیاع کلیلۃ ابصارھم صم بکم عمی مسودۃ وجوھہم خاسئین فیہا نادمین مغضوب علیہم فلا یرحمون ولا یخفف عنہم وفی النار یسجرون ومن الحمیم یشربون ومن الزقوم یاکلون و بکلالیب النار یحطمون وبالمقامع یضربون والملائکۃ الغلاظ لا یرحمون فہم فی النار یسحبون علی وجوھہم مع الشیاطین یقرنون وفی الانکال والاغلال یصفدون ان دعوا لم یستجب لہم وان سئلوا حاجۃ لم تقض لہم ھذہ حال من دخل النار۔ یعنی اہل دوزخ شدتِ عذاب و عقاب کی وجہ سے کتوں اور بھیڑیوں کی طرح آوازیں نکالیں گے۔ اے عمرو تمہارا اس گروہ کے متعلق کیا خیال ہے جن کو نہ تو ان کی قضا آئے گی کہ مر ہی جائیں اور نہ ہی ان کے عذاب و عقاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی۔ وہ پیاسے ہوں گے اور بھوکے بھی۔ ان کی آنکھیں درماندہ ہوں گی بلکہ وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہوں گے ذلیل ہوں گے۔ پشیمان ہوں گے۔ اور مورد قہر و غضب۔ نہ ان پر رحم کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی۔ اور انہیں آتشِ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ وہ پئیں گے تو گرم پانی اور کھائیں گے تو زقوم (تھوہر) کا درخت۔ انہیں آتشِ دوزخ کے ہتھوڑوں کے ساتھ توڑا جائے گا۔ اور گرزوں کے ساتھ مارا جائے گا۔ اور سخت درشت قسم کے فرشتے ان کے حالِ زار پر رحم نہیں کریں گے۔ پس وہ آتشِ دوزخ میں منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے اور شیاطین کے ساتھ قید کئے جائیں گے اور بیڑیوں میں جکڑے جائیں گے اگر دعا و پکار کریں گے تو ان کی دعا مستجاب نہیں ہوگی۔ اور اگر کسی حاجت کا سوال کریں گے تو ان کی — حاجت براری نہیں کی جائے گی۔ یہ حالت و کیفیت اس شخص کی ہے جو داخل جہنم ہوگا۔ ثالث بحار میں بحوالہ تفسیر فرات کوفی آیت مبارکہ ولیس لہم طعام الا من ضریع کہ سوائے ضریع کے ان کی اور کوئی غذا نہ ہوگی۔ "ضریع" کی تفسیر عرق اہل النار وما یخرج من فروج الزوانی (دوزخیوں کا پسینہ اور زانیوں کی فرج کا بہاؤ کی غلاظت) کے ساتھ کی گئی ہے۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوزخ غسلین۔ جو کہ جہنمیوں کو بطور غذا دی جائے گی فرماتے ہیں کہ اگر ان کا ایک ایک قطرہ دنیا کے پہاڑوں پر ڈالا جائے تو وہ تحت الثریٰ تک پگھل جائیں۔ اسی

طرح وہ گرز جس سے اہل دوزخ کو مارا جائے گا۔ پہاڑوں پر مارا جائے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں (ثالث بحار)
خصائل شیخ صدوقؒ میں حضرت امیر المومنینؑ سے مروی ہے فرمایا

جہنم میں ایک چکی ہے جو پانچ قسم کے لوگوں کو پیسے گی۔ کیا تم مجھ سے سوال نہیں کرتے کہ وہ کن کو پیسے گی؟
پس عرض کیا گیا یا امیر المومنینؑ وہ کن لوگوں کو پیسے گی؟ فرمایا وہ پانچ قسم کے لوگ یہ ہیں۔ فاجر علماء دین، فاسق قاری قرآن کریم، ظالم حاکم، خائن وزیر اور جھوٹے عارف لوگ۔ جناب امیر المومنینؑ عذاب جہنم کے بارہ میں فرماتے ہیں۔ احذروا نارا قعرھا بعید وحرھا شدید وعذابھا جدید دار لیس فیھا رحمۃ ولا تسمع فیھا دعوۃ ولا تفرج فیھا کربۃ۔ (نہج البلاغۃ) اس آتش جہنم سے ڈرو جس کی گہرائی دور، حرارت سخت اور عذاب تازہ ہے۔ جہنم وہ گھر ہے جس میں نہ رحمت ہے اور نہ اس میں کوئی دعاء پکار سنی جاتی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی رنج والم دور کیا جاتا ہے۔ آخر بیان میں حضرت امام زین العابدینؑ کے کلام حقیقت ترجمان کا ایک اقتباس پیش کرکے اس سلسلہ کلام کو ختم کیا جاتا ہے۔ آنجنابؑ نماز کے بعد جو دعا پڑھتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ نَارٍ تَغَلَّظۡتَ بِھَا عَلٰی مَنۡ عَصَاکَ وَتَوَعَّدۡتَ بِھَا مَنۡ صَدَفَ عَنۡ رِضَاکَ وَمِنۡ نَارٍ نُوۡرُھَا ظُلۡمَۃٌ وَھَیِّنُھَا اَلِیۡمٌ وَبَعِیۡدُھَا قَرِیۡبٌ وَمِنۡ نَارٍ یَاۡکُلُ بَعۡضُھَا بَعۡضًا وَیَصُوۡلُ بَعۡضُھَا عَلٰی بَعۡضٍ وَمِنۡ نَارٍ تَذَرُ الۡعِظَامَ رَمِیۡمًا وَتَسۡقِیۡ اَھۡلَھَا حَمِیۡمًا وَمِنۡ نَارٍ لَا تُبۡقِیۡ عَلٰی مَنۡ تَضَرَّعَ اِلَیۡھَا وَلَا تَرۡحَمُ مَنِ اسۡتَعۡطَفَھَا وَلَا تَقۡدِرُ عَلَی التَّخۡفِیۡفِ عَمَّنۡ خَشَعَ لَھَا وَاسۡتَسۡلَمَ اِلَیۡھَا تَلۡقٰی سُکَّانَھَا بِاَحَرِّ مَا لَدَیۡھَا مِنۡ اَلِیۡمِ النَّکَالِ وَشَدِیۡدِ الۡوَبَالِ وَاَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ عَقَارِبِھَا الۡفَاغِرَۃِ اَفۡوَاھُھَا وَحَیَّاتِھَا الصَّالِقَۃِ بِاَنۡیَابِھَا وَشَرَابِھَا الَّذِیۡ یُقَطِّعُ اَمۡعَاءَ وَاَفۡئِدَۃَ سُکَّانِھَا وَیَنۡزِعُ قُلُوۡبَھُمۡ وَاَسۡتَھۡدِیۡکَ لِمَا بَاعَدَ مِنۡھَا وَاَخَّرَ عَنۡھَا۔

بار الہا! میں اس آگ سے پناہ مانگتا ہوں جس کے ذریعہ تو نے اپنے نافرمانوں کی سخت گرفت کی ہے اور جس سے تو نے ان لوگوں کو جنہوں نے تیری رضا و خوشنودی سے رخ موڑ لیا ڈرایا دھمکایا ہے اور اس آتش جہنم سے پناہ مانگتا ہوں جس میں روشنی کے بجائے اندھیرا جس کا خفیف لپکا بھی انتہائی تکلیف دہ اور جو کوسوں دور ہونے کے باوجود (گرمی و تپش کے لحاظ سے) قریب ہے اور اس آگ سے پناہ مانگتا ہوں جو آپس میں ایک دوسرے کو کھا لیتی ہے اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی ہے اور اس آگ سے پناہ مانگتا ہوں۔ جو ہڈیوں کو خاکستر کر دے گی اور دوزخیوں کو کھولتا ہوا پانی پلائے گی۔

اور اس آگ سے کہ جو اس کے آگے گڑگڑائے گا۔ اس پر ترس نہیں کھائے گی اور جو اس سے رحم کی التجا کرے گا اس پر رحم نہیں کرے گی اور جو اس کے سامنے فروتنی کرے گا اور خود کو اس کے حوالے کر دے گا۔ اس پر کسی طرح کی تخفیف کا اسے اختیار نہیں ہوگا۔ وہ دردناک عذاب اور شدید عقاب کی شعلہ سامانیوں کے ساتھ اپنے رہنے والوں کا سامنے کرے گی (بار الہا!) میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں جہنم کے بچھوؤں سے جن کے منہ کھلے ہوئے ہوں گے اور ان سانپوں سے جو دانتوں کو پیس پیس کر پھنکار رہے ہوں گے اور اس کے کھولتے ہوئے پانی سے جو انتڑیوں اور دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور (سینوں کو چیر کر) دلوں کو نکال لے گا۔ خدایا! میں تجھ سے توفیق مانگتا ہوں ان باتوں کی جو اس آگ سے دور کریں۔ اور اس سے پیچھے ہٹا دیں۔ (صحیفہ کاملہ ترجمہ مفتی جعفر حسین صاحب)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ جناب جبرئیل جناب رسولِ خدا کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ افسردگی کے آثار چہرہ بشرہ سے آشکار تھے۔ آنحضرتؐ نے پریشانی کا سبب دریافت فرمایا۔ جبرئیل نے عرض کیا۔ کہ خدائے قہار کے حکم سے آتشِ جہنم کو ایک ہزار سال تک دھکایا گیا۔ یہاں تک کہ سفید ہو گئی۔ پھر ایک ہزار سال تک اسے روشن کیا گیا یہاں تک کہ سیاہ و تاریک ہو گئی۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ اگر اس کے آب گرم و بدبودار کا ایک قطرہ دنیوی پانیوں میں ملا دیں تو اہلِ دنیا اس کی حرارت سے ہلاک ہو جائیں اور اگر اس کے ستر ہاتھ لمبے زنجیروں کی صرف ایک کڑی پہاڑوں پر رکھ دی جائے تو سب پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ اور اگر جہنمی کپڑوں میں سے کوئی کپڑا زمین و آسمان کے درمیان آویزاں کر دیا جائے تو دنیا والے اس کی بدبو سے جاں سپاری ہو جائیں۔ اس کے بعد جناب رسولؐ خدا اور جبرئیل ہر دو رونے لگے رب جلیل نے ایک فرشتہ کے ذریعہ تحفہ درود وسلام کے بعد کہلا بھیجا۔ کہ میں نے تم دونوں کو اس سے محفوظ رکھا ہے کہ کوئی ایسا گناہ کرو جو باعثِ دخولِ جہنم ہو۔ بایں ہمہ امام عالی مقام فرماتے ہیں۔ کہ اس کے بعد جناب رسولِ خدا اور جبرئیل امینؑ کو مسکراتے ہوئے نہ دیکھا گیا۔ پھر امام نے فرمایا۔ کہ جہنم اس قدر گہری ہے کہ جب جہنمی اس میں داخل ہوں گے تو ستر برس کی مسافت تک برابر نیچے چلے جائیں گے۔ جب اوپر آئیں گے تو آہنی ہتھوڑوں سے مار مار کر پھر ان کو نیچے دھکیل دیا جائے گا۔ برابر ان کی یہی کیفیت رہے گی۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کلما ارادوا ان یخرجوا منھا من غم اعیدوا فیھا وذوقوا عذاب الحریق۔ جب ان کے چمڑے گل سڑ جائیں گے تو ان کو تبدیل کر دیا جائے گا۔ (ثالث بحار)

جنت و دوزخ کا خلود و دوام

جنت اور اس کے ثواب کے خلود و دوام کے بارے میں تو تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ کہ جو صالح و سعید اور نیک بخت بندے

اس میں داخل ہوں گے۔ وہ ابد الآباد تک اس میں رہیں گے۔ اسی لیے اس کا نام ہی جنت الخلد ہے (بقائے دوام کا باغ) جنت الخلد وعد المتقون۔ اس سلسلہ میں آیات متظافرہ اور روایات متواترہ موجود ہیں۔ ارشاد قدرت ہے طبتم فادخلوھا خلدین (سورۃ زمر پ ۲۴ ع ۵) جب جنتی لوگ جنت کے قریب پہنچیں گے تو آواز آئے گی، تم پاک و پاکیزہ ہو۔ اب ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ان الذین امنوا وعملوا الصالحات اولئک ھم خیر البریۃ جزاؤھم عند ربھم جنت عدن تجری من تحتھا الانھٰر خلدین فیھا ابداً۔ (سورۃ بینہ پ ۳۰ ع ۲۳) جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کئے۔ وہ تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔ ان کے پروردگار کے نزدیک ان کی جزا یہ ہے۔ کہ رہائش کے لیے باغات ہیں۔ جن میں نہریں جاری ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمۃ اللہ ھم فیھا خلدون (آل عمران پ ۴ ع ۳) جن کے چہرے سفید ہوں گے۔ وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے۔ اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ کہاں تک و ایسی آیات کو شمار کیا جائے۔ جن میں جنتیوں کا جنت میں ہمیشہ قیام پذیر رہنا مذکور ہے بعض آیات میں عطاءً غیر مجذوذ (سورۃ ہود) وارد ہے جس کے معنی ہیں نہ قطع ہونے والی عطا و بخشش۔

حقیقت یہ ہے کہ نعمات جنت میں سے جو نعمت سب سے گراں قدر ہے وہ بقائے دوام کی دولت ہے۔ اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں وہ بقائے دوام ہے۔ یہاں کی ہر لذت عارضی، اور ہر مسرت آنی ہے، یہاں خوشی کا کوئی ایسا نغمہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا کوئی نالہ نہ ہو یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے۔ ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا ہے اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے۔ مگر ابھی اس سے سیر حاصل ہونے کی نوبت بھی نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شئی آنی جانی ہے۔ اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔ لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے۔ جہاں کی لذتیں جاودانی۔ اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے۔ مگر موت نہیں۔ راحت ہے مگر تکلیف نہیں لذت ہے۔ مگر الم نہیں۔ مسرت ہے۔ مگر غم نہیں۔ جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں۔ اور وہ شادمانی ہے۔ جس کے بعد حزن و اندوہ نہیں۔ پھر اس جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک کا استحقاق ان (آدمؑ) اور ان کی نسل کے اعمال صالحہ کا صلہ قرار پایا۔ چنانچہ فرمایا۔ ام جنۃ الخلد التی وعد المتقون کانت لھم جزاءً و مصیراً (فرقان ۲) یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے۔ جہاں کا آرام دائم۔ اور جہاں کی سلامتی ابدی۔ جہاں کی لذت بے انتہا۔ جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاودان ہے۔ دنیا میں شخصی راحت و آرام

کا بلند سے بلند تخیل ایک لفظ "بادشاہی" کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے۔ اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے بر آنے کی خوشخبری کے دینے کے لئے کوئی لفظ ہو سکتا ہے۔ تو یہی ہے۔ گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے۔ سامانِ راحت اور اسبابِ شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو۔ اونچے اونچے محل ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب۔ زر و جواہر کے برتن۔ کمر بستہ غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب اور بلوریں پیالے، حسین و مہ جبین بیگمات۔ غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔ جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدمؑ کے دشمن نے آدمؑ کے سامنے کی تھی۔ وملک لا یبلیٰ (طہٰ - ۷) اور غیر فانی بادشاہی (سیرۃ النبی ج ۴) یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے۔ اخروی لذائذ و نعمات دنیوی نعمتوں کے ساتھ سوائے رسمی اشتراک و تشابہ کے اور کوئی مشابہت نہیں رکھتیں۔ آں زمیں را آسمانے دیگر است۔ ارشاد قدرت ہے۔ کلما رزقوا منہا من ثمرۃ رزق قالوا ھذا الذی رزقنا من قبل واتوا بہ متشابہاً۔ (بقرہ - ۳)

اسی طرح کفار و مشرکین و منافقین اور بعض نام نہاد مسلمین مثل غالی و ناصبی اور خارجی کے دائمی طور پر عذابِ جہنم میں معذب و معاقب ہونے پر سوائے بعض متصوفہ مثل ابن عربی وغیرہ کے اتفاق ہے۔ ہاں وہ صحیح العقیدہ مگر گنہگار مسلمان جو دنیا اور برزخ کے شدائد میں مکمل طور پر لوثِ گناہ سے پاک نہیں ہو سکے۔ کچھ عرصہ عذابِ دوزخ میں مبتلا رہنے کے بعد رحمتِ الٰہیہ کے شاملِ حال ہونے یا شفاعتِ نبیؐ و امامؑ کے نصیب ہونے کی بنا پر اس سے نکل کر داخلِ جنت کئے جائیں گے۔ دوام و خلودِ جہنم کے سلسلہ میں بھی آیات متکاثرہ اور روایات متواترہ موجود ہیں۔ بطور نمونہ مشتے از خروارے دو چار آیات پیش کی جاتی ہیں۔ ارشادِ قدرت ہے ان اللہ لعن الکافرین واعد لھم سعیراً خلدین فیہا ابداً (سورہ الاحزاب پ ۲۲ ع ۵) خدا تعالیٰ نے کافروں پر لعنت کی ہے۔ اور ان کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جہنم خلدین فیہا ابداً (سورۃ جن پ ۲۹ ع ۱۲) جو شخص خدا و رسولؐ کے حقیقی نافرمان ہیں۔ وہ آتشِ جہنم میں ہمیشہ ابد الآباد تک رہیں گے۔

ان آیات میں عذابِ دوزخ کے دوام کی جس طرح صراحت و وضاحت موجود ہے۔ وہ اربابِ بصیرت پر مخفی و مستور نہیں ہے۔ اولاً۔ تو لفظ "خلود" کے حقیقی معنی ہی دوام کے ہیں۔ اگرچہ اس میں قیام طویل والے معنی کا بھی احتمال ہے۔ مگر ثانیاً اس کے ساتھ "ابداً" کی قید موجود ہے۔ اس نے معنی دوام کی اور بھی تاکید مزید کر دی ہے۔ ثالثاً۔ اس مطلب کو قرآن مجید میں مختلف عناوین سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد

ہوتا ہے۔ وما ھم بخارجین من النار (سورۃ بقرہ پ ۲ ع ۴) وہ اس سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔ ایک اور مقام پر وارد ہے۔ ان الظالمین فی عذاب مقیم ۵ (سورہ شوریٰ پ ۲۵ ع ۵) ظالم (کافر و مشرک) ہمیشہ قائم رہنے والے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ ایک جگہ ہے۔ انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ ومأوٰہ النار (سورۃ مائدہ پ ۶) جو شخص اللہ سبحانہ کے ساتھ شرک کرے گا۔ خدا نے اس پر جنت حرام کردی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔ ان الذین کذبوا بآیاتنا واستکبروا عنھا لا تفتح لھم ابواب السماء ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط (سورۃ اعراف پ ۸ ع ۱۲) اور نہ وہ بہشت ہی میں داخل ہونے پائیں گے۔ یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں ہو کر نکل جائے۔ یعنی جس طرح یہ محال ہے اسی طرح ان کا بہشت میں داخل ہونا بھی محال ہے۔ لہذا بعد ازیں بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ عذاب جہنم غیر دائمی ہے۔ اور منقطع ہونے والا ہے اور یہ کہتا ہے۔ کہ ایک وقت آئے گا۔ کہ جہنم ختم کر دی جائے گی (ابن قیم در شفاء العلیل، حادی الارواح) یا ایک وقت آئے گا۔ کہ جہنم میں ڈھونڈنے سے کوئی نہیں ملے گا۔ بلکہ اس میں گھاس اُگ آئے گی۔ یا دوزخی اس سے مانوس ہو جائیں گے۔ کہ ان کو کوئی اذیت نہ ہوگی (ابن عربی در فتوحات مکیہ) تو اہل انصاف بتائیں۔ کہ ایسے شخص کا نظریہ اسلامی عقائد و مسلمات کے ساتھ کہاں تک مطابق ہو سکتا ہے؟ جہاں بعض آیات میں الا ما شآء اللہ کا استثنا موجود ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ بعض گنہگار صحیح العقیدہ مسلمانوں کو سزا بھگتنے اور گناہوں کی آلائش و آلودگی سے پاک ہو جانے یا رحمت ایزدی کے شامل ہونے یا شفاعت کبریٰ کے نصیب ہو جانے کے بعد دوزخ سے نکال لیا جائے گا اور انہیں داخل جنت کر دیا جائے گا۔ یا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کی مشیت کے سوا ان کو جنت سے کوئی الگ نہیں کر سکے گا۔ لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لئے یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہو وہ فنا کیونکر ہو سکتی ہے۔

سبب خلود اہل جنت و جہنم

باقی رہی اس بات کی تحقیق۔ اہل جنت کے اعمال صالح کم اور جزائے دائمی زیادہ اور اہل نار کے اعمال طالح کم اور سزائے دائمی زیادہ ہے۔ تو اس کی وجہ جو کچھ اخبار اہل بیتؑ وحی سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ "نیت" ہے۔ کہ اہل جنت کی نیت ہمیشہ اطاعت خدا اور اہل جہنم کی نیت ہمیشہ معصیت خدا کرنے کی تھی جس کی بدولت وہ ثواب ابدی پر فائز ہوئے اور یہ دائمی عذاب میں گرفتار۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا۔ انما خلد اہل الجنۃ فی الجنۃ لان نیاتھم کانت فی الدنیا لو بقوا ان یطیعوا اللہ ابداً ما بقوا وانما خلد اہل النار فی النار لان نیاتھم کانت فی الدنیا لو خلدوا فیھا ان یعصوا اللہ ابداً ما بقیات

مطلب کا

خلاصہ وہی ہے جو اوپر بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے وارد ہے نیّۃ المؤمن خیر من عملہ و نیّۃ الکافر شر من عملہ۔ و انما الاعمال بالنیات۔

انذار ضروری الاظہار

حضرت مصنف علام نے جو یہ فرمایا ہے۔ کہ جو گنہگار مسلمان دوزخ میں داخل ہوں گے۔ ان کو اس میں کوئی تکلیف و اذیت نہ ہوگی۔ ہاں نکلتے وقت کچھ تکلیف محسوس ہوگی۔ متعدد آثار و اخبار اس کے خلاف موجود ہیں۔ منجملہ ان کے ایک تو وہی حدیث ہے جو سابقاً اسی رسالہ اعتقادیہ میں گذر چکی ہے۔ کہ کچھ گنہگار ایسے بھی ہوں گے جنہیں تین تین لاکھ تک آتش دوزخ میں مبتلائے عذاب رہنے کے بعد شفاعت آئمہ اہل بیتؑ نصیب ہوگی۔ دوسری وہ روایت جو کتب فریقین میں موجود ہے کہ جب گنہگاروں کو میعاد عذاب ختم ہونے یا شفاعت وغیرہ اسباب مغفرت کی وجہ سے آتش دوزخ سے نکالا جائے گا۔ تو وہ جل کر کوئلہ کی مانند ہو چکے ہوں گے (حق الیقین مجلسیؒ۔ بخاری کتاب الایمان وغیرہ) علاوہ بریں جہنم کے جو عذاب و عقاب کتاب و سنت میں مذکور ہیں۔ ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہوگا ضرور ان عذابوں میں گرفتار ہوگا (نعوذ باللہ منہا) بنا بریں جناب مصنف نے ایک خبر واحد کا جو مضمون بیان کیا ہے۔ اس پر اذعان و یقین نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ العالم۔

بعض اہم شکوک و اوہام کا ازالہ

جسمانی جنّت و دوزخ کی جو کیفیت ہم نے بالاجمال ذکر کی ہے اس پر قریباً تمام فرقہائے اسلام کا اتفاق و اجماع ہے مگر ملاحدہ و منکرین کی طرف سے اس پر خصوصاً عذاب دوزخ کے متعلق بڑی شد و مد کے ساتھ بعض اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ جن کا ذکر مع ان کے جوابات کے فائدے سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے باوجود اس مبحث کے غیر معمولی طور پر طویل ہو جانے کے ہم ان ایرادات کو مع جوابات یہاں ذکر کرتے ہیں۔

پہلا اعتراض

اس سلسلہ میں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سزا یا انتقام وہ شخص لیتا ہے۔ جسے کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچا ہو۔ یا اس کے پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ مگر خدا کی ذات تو اس سے اجل و ارفع ہے اگر تمام دنیا فسق و فجور پر ایکا کرے۔ تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لہٰذا انتقام لینا عبث ہے۔ نیز خدا بہت رحیم و کریم ہے اور یہ دوزخ کا عذاب و عقاب جو بہت شدید ہے اس کی شان رحیمیت و رؤفیت کے منافی ہے!!

اس اعتراض کا پہلا جواب

اس اعتراض کا کئی طرح سے جواب دیا جا سکتا ہے۔ پہلا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ کہ خداوند عالم یقیناً رحمٰن و رحیم اور رؤف و کریم ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ فقط کافروں و مشرکوں، زانیوں اور قاتلوں اور چوروں و ظالموں

کے لئے ہی رؤف و رحیم ہے۔ یا مظلوموں و مقتولوں اور بے کسوں اور بے بسوں کے لئے بھی رحیم و کریم ہے؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر اہلِ عقل و انصاف بتائیں کہ آیا اسے مظلوموں کا بدلہ ظالموں سے لینا چاہیئے۔ یا نہیں؟ عدل و انصاف کا تقاضا کیا ہے؟ آیا دار الجزاء میں ظالم و مظلوم۔ قاتل و مقتول میں فرق ہونا چاہیئے۔ یا دونوں کی حالت یکساں ہو؟ مختلف ادوار و اعصار میں بعض انسان نما درندہ صفت لوگوں نے جو قیامت خیز مظالم اپنے ہی بنی نوع انسان پر ڈھائے ہیں۔ اور ڈھا رہے ہیں۔ جن کے تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اور جبینِ انسانیت عرقِ انفعال سے شرابور ہو جاتی ہے۔ کیا ان مظالم کی باز پرس نہ ہوگی؟ کیا مظلوم کی داد رسی نہ کی جائے گی؟ کیا ظالم کو اس کے ظلم و جور کی سزا نہ دی جائے گی؟ معترضین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جہاں خداوند عالم رحمٰن و رحیم ہے وہاں وہ جبار و قہار بھی ہے۔ اس کی گرفت بڑی سخت ہے۔ ان بطش ربک لشدید اور اس نے بتلا دیا کہ اس کی صفت غفاریت کن لوگوں سے متعلق ہوتی ہے۔ اور صفتِ قہاریت کا کہاں ظہور ہوتا ہے؟ صاحب فلسفۂ اسلام نے اس مقام پر ایک بہت اچھا جملہ لکھا ہے "یہ تعجب نہیں کہ جہنم کیوں پیدا کیا گیا۔ بلکہ تعجب تو یہ ہے کہ ان ظالموں کو قیامت تک کی مہلت کیوں دی گئی۔"

اسی طرح حقوق اللہ کا معاملہ ہے۔ اگر یہ جزاء و سزا کا سلسلہ نہ ہو۔ تو پھر محسن و مسئی، صالح و طالح، سعید و شقی مطیع و عاصی، مصلح و مفسد، بر و فاجر کا مساوی ہونا لازم آئے گا۔ جو عند العقلاء قبیح و شنیع ہے اور شانِ حکمت و ربوبیت کے خلاف ہے۔ اسی بناء پر اس کا ارشاد ہے۔ افنجعل المسلمین کالمجرمین (سورۂ ن پ ۲۹) کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی مانند بنا دیں گے۔ ام نجعل المتقین کالفجار۔ کیا ہم متقیوں کو فاسقوں اور فاجروں کی طرح قرار دیں گے؟ قانونِ شریعت کی تشریع عبث و بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس پر وہی شخص اعتراض کر سکتا ہے جس کی فطرت میں فتور ہو اور نعمتِ عقل و دانش سے محروم۔

دوسرا جواب

بعض علماء نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے وہ کہ جس طرح عالمِ جسمانیات میں اسباب و مسببات علل و معلولات اثر اور مؤثر کا سلسلہ ہے۔ مثلاً سنکھیا قاتل ہے۔ گلاب محرک نزلہ ہے املتاس مسہل ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ روحانیات میں بھی قائم ہے۔ نیک و بد جس قدر افعال ہیں۔ ان کا نیک یا بد اثر روح پر مترتب ہوتا ہے۔ یہ عذاب و ثواب ان افعال کا لازمی اثر ہے۔ جو ان سے جدا نہیں ہوتا۔ یہ کوئی انتقام نہیں ہے۔ امام غزالی نے اپنے رسالہ مضنون بہ علی غیر اہلہ میں لکھا ہے۔ جس کا حاصل مطلب یہ ہے۔ کہ امر و نہی کی خلاف ورزی پر جو عذاب ہوگا اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کو غصہ آئے گا۔ اور وہ انتقام لے گا۔ بلکہ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ جو شخص عورت کے پاس نہیں جائے گا اس کے ہاں اولاد نہ ہوگی۔ طاعت یا معصیت کی وجہ سے قیامت میں جو ثواب یا عذاب ہوگا۔ اس کی بالکل یہی مثال ہے۔

لہٰذا یہ سوال کرنا کہ گناہ سے عذاب کیوں ہوتا ہے۔ گویا یہ سوال کرنا ہے۔ کہ زہر کھانے سے جاندار کیوں مرجاتا ہے؟ خدا نے جن باتوں کا حکم دیا ہے۔ جن باتوں سے روکا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ جس طرح ایک طبیب کسی بیمار کو دوا کھانے اور مضر چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مریض اس کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا۔ تو اس کو ضرر ہوتا ہے یہ ضرر صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس نے بدپرہیزی کی۔ لیکن عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ مریض نے چونکہ حکیم کی نافرمانی کی ہے۔ اس لئے اسے ضرر ہوا۔ حالانکہ ضرر کی علت بدپرہیزی ہے۔ بالفرض اگر طبیب بدپرہیزی سے منع نہ بھی کرتا۔ تو بھی بدپرہیزی کرنے سے ضرر ہوتا۔ یہی حال گناہوں کے ارتکاب کرنے کا ہے۔ اگر خدا ان سے نہ بھی روکتا۔ تو بھی روح کو ان کے ارتکاب سے صدمہ پہنچتا ہے (الکلام شبلی) الغرض اشخاص کی نیکوکاری وبدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں۔ وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں۔ جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے۔ اسی طرح ان روحانی اسباب وعلل و آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے۔ انبیاء کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیئے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص و آثار کا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل و ردّ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے۔ اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ عقاب کا لفظ "عقب" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آتا ہے۔ اور ثواب کا لفظ "ثوب" سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی لوٹنے کے ہیں۔ اس لئے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔ (سیرۃ النبیؐ) اس طرح بھی اس اعتراض کا قلع قمع ہوجاتا ہے۔ بعض آیات قرآنیہ سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ الیوم تجزون ما کنتم تعملون (جاثیہ) آج تمہیں اسی کا بدلہ ملے گا جو کچھ تم کرتے تھے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ لتجزیٰ کل نفس بما تسعیٰ (سورہ طٰہٰ پ۱۶ ۴-۱) تاکہ ہر نفس کو اس کی کوشش کی جزا دی جائے۔ ایک اور جگہ وارد ہے۔ فاصابھم سیّات ما عملوا وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءُون (سورہ نحل پ۱۴ ۴-۱)

پس انہوں نے جو عمل کئے تھے ان کو ان کی سزائیں ملیں گی اور جس عذاب کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اس نے ان کو گھیر لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جزاو سزا ہمارے ہی اعمال کے ردِّ عمل کا نام ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں وارد ہے کہ قیامت کے دن خدا فرمائے گا۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل رہے ہیں۔

تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔ سچ ہے کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ۔۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

دوسرا اعتراض اور اس کا پہلا جواب

گناہ کی مدت بلکہ خود انسانی دنیاوی زندگی کی مدت بہت مختصر اور عذاب و عقاب کی مدت بہت طویل ہے۔ یہ بات شانِ خداوندی کے مناسب نہیں ہے۔ کہ مختصر مدت میں کئے گئے گناہ کا عذاب اس قدر طویل ہو۔ اس اعتراض کا بھی کئی طرح جواب دیا جا سکتا ہے۔ ایک جواب یہ ہے۔ کہ یہ امر ظاہر ہے۔ کہ سزا کی کمیت مقدار جرم کی کمیت کے برابر نہیں ہوا کرتی۔ دنیوی قوانین میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اور کوئی عقلمندان پر اعتراض نہیں کرتا۔ مثلاً ایک قاتل چند منٹ بلکہ چند سیکنڈ میں کسی کو قتل کر دیتا ہے۔ مگر اس کی سزا اسے حبس دوام کی صورت میں دی جاتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے۔ کہ چونکہ جرم کا ارتکاب چند منٹ یا چند سیکنڈ میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا سزا بھی چند منٹ یا چند سیکنڈ ہونی چاہیئے تو کیا عقلائے روزگار ایسے شخص کی حماقت و جہالت میں شک کر سکتے ہیں؟ اسی حبسِ دوام کا نام خلود فی النار ہے۔ والذین کفروا وکذبوا بایاتنا اولٰئک اصحٰب النار ھم فیھا خٰلدون ۵

اسی طرح کھانے پینے میں تھوڑی سی بد پرہیزی یا دیگر اصول حفظانِ صحت میں ذرہ بھی غلط کاری کے نتیجہ میں کئی کئی ماہ بلکہ کئی کئی سال کی بیماری کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو زندگی بھر کے کسی ایسے مرض میں مبتلا ہوتا ہے کہ باوجود علاج معالجہ بالآخر جان عزیز سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلطی کے مقابلہ میں اصلاح و تلافی کی مدت کئی گناہ زیادہ ہوتی ہے۔

دوسرا جواب

یہ درست ہے کہ انسانی زندگی کی مدتِ ثواب و عقاب کی مدت کے مقابلہ میں بہت ہی قلیل ہے۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہیئے۔ کہ انسان اکثر اوقات اسی مختصر سی زندگی میں بعض ایسے گناہوں کا ارتکاب کر جاتا ہے۔ کہ صدیوں تک ان کے بُرے آثار و نتائج موجود رہتے ہیں۔ اور بعد میں آنے والی نسلوں تک کو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جیسے کفر و شرک یا دیگر بُرے امور کی تاسیس و بنیاد یا قتل نفس وغیرہ اسی لئے خداوند عالم فرماتا ہے۔ من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً۔ جس شخص نے ایک شخص کو ناحق قتل کر دیا یا زمین پر فتنہ و فساد پھیلایا۔ وہ ایسا ہے گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ اور جس شخص نے ایک نیک آدمی کو بچا لیا۔ تو گویا اس نے تمام لوگوں کو بچا لیا۔ اندریں حالات اگر سزا کی مدت طویل ہو۔ تو اس میں کون سی قباحت لازم آتی ہے؟ فما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون (فلسفۂ اسلام)

تیسرا جواب

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ نیۃ المؤمن خیر من عملہ

باب الاعتقاد فی کیفیۃ نزول الوحی من عند اللہ تعالیٰ

بالکتب فی الامر والنهی قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی ذلک ان بین عینی اسرافیل لوحاً اذا اراد اللہ ان یتکلم بالوحی ضرب اللوح جبین اسرافیل فینظر فیہ فیقرأ ما فیہ فیلقیہ الی میکائیل ویلقیہ میکائیل الی جبرئیل فیلقیہ جبرئیل الی الانبیاء

تیسواں باب (نزولِ وحی کی کیفیت کے متعلق اعتقاد)

جناب شیخ ابوجعفرؒ فرماتے ہیں۔ کہ ہمارا اعتقاد اس سلسلہ میں یہ ہے کہ جناب اسرافیلؑ کی دونوں آنکھوں کے سامنے ایک تختی ہے۔ خداوند عالم جب کسی امر کے متعلق وحی کے ذریعہ سے کلام کرنا چاہتا ہے تو وہ تختی اسرافیلؑ کی پیشانی پر لگتی ہے وہ جناب اس میں نگاہ کرتے ہیں اور جو کچھ اس میں لکھا ہوتا ہے اسے پڑھ کر جناب میکائیلؑ تک پہنچاتے ہیں میکائیلؑ اس کی اطلاع حضرت جبرئیلؑ کو دے دیتے ہیں اور جبرئیل امین علیہ السلام اس وحی خداوندی کو انبیاء علیہم السلام تک پہنچا دیتے ہیں۔

دیقتہ الکافر شر من عملہ کہ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر اور کافر کی نیت اس کے عمل سے بدتر ہے۔ بنابریں اگرچہ ان کے اعمال قلیل ہیں۔ مگر ان کی جزا یا سزا کی مدت کا طویل ہونا۔ ان کی نیات کا ثمرہ و نتیجہ ہے۔ مومن کا یہ ارادہ تھا۔ کہ اگر خدا اسے ابدالآباد تک زندہ رکھے گا۔ تو وہ اس کی عبادت و اطاعت ہی کرتا رہے گا۔ اور کافر کا عزم ہمیشہ معصیت و نافرمانی کا تھا۔ اس لئے ان کی نیتوں کے مطابق ان کے ثواب یا عقاب کی مدت طویل ہوگی۔ یہ جواب باصواب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے کلام حق ترجمان سے ماخوذ ہے (علل الشرائع ج ۲)

تیسرا اعتراض اور اس کا جواب

یہ چیز سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ ایک انسان آگ میں رہے۔ گرم پانی سر پر پڑے۔ لہو اور پیپ پئے اور پھر زندہ رہے؟ اس اعتراض کا مختصر جواب یہ ہے۔ ابھی انسانی عقل ناقص ہے۔ ہزاروں اشیاء کی حقیقت تاحال مجہول ہے۔ کیا معترض نے باقی سب کچھ سمجھ لیا ہے اور صرف یہی ایک بات باقی رہ گئی ہے؟ جہاں اور اشیاء ان کی موجود ہیں وہاں ایک یہ بھی سہی اگر۔ ان اللہ علی کل شئی قدیر۔ پر ایمان کامل ہو تو ایسے شبہات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ حالانکہ ایسی مثالیں دنیا کے اندر بھی موجود ہیں۔ پتھر شگافتہ کرنے سے ان کے اندر بعض کیڑے مکوڑے نکلتے ہیں۔ جہاں کسی قسم کا کوئی آب و دانہ موجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح سنا گیا ہے۔ کہ ایک خاص قسم کا کیڑا ہے جو آگ میں نہیں مرتا تو جو خدا اس بات پر قادر ہے۔ اس پر بھی قادر ہے جو سوال میں پیش کی گئی ہے۔

وما الغشوة التى كانت تاخذ النبیؐ فانها كانت تكون عند مخاطبة الله ایاه حتى ینتقل و یعرق فاما جبرئیل فانه كان لا یدخل علیه حتى یستاذنه اكراما له و كان یقعد بین یدیه قعدة العبید

وحی کے وقت آنحضرتؐ پر غشی کی جو کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ تو یہ خداوند عالم کے آنحضرتؐ سے خطاب فرمانے (نہ کہ جناب جبرئیلؑ کی آمد) کی وجہ سے عارض ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ آنحضرتؐ کا جسم مبارک بھاری ہو جاتا۔ اور آپ پسینہ سے شرابور ہو جاتے تھے۔ جناب جبرئیلؑ تو آنحضرتؐ کا اس حد تک احترام کرتے تھے۔ کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں بغیر اجازت حاضر نہ ہوتے تھے۔ اور آنحضرتؐ کی خدمت اقدس میں غلاموں کی طرح بیٹھا کرتے تھے۔

تیسواں باب کیفیت نزول وحی کا بیان

وحی کے معانی اور اس کے موارد استعمال کا بیان

لغت عرب میں لفظ "وحی" متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ منجملہ ان کے چند معنی یہ ہیں۔ اشارہ کتابت رسالت (پیغام) الہام اور کلام مخفی۔ نیز راز و نیاز ملاحظہ ہوں (لسان العرب، قاموس، اقرب الموارد وغیرہ) آیات قرآنیہ میں انہی لغوی معنوں کے اعتبار سے یہ لفظ استعمال ہوا ہے: چنانچہ آیۂ مبارکہ واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه (ہم نے مادر موسیٰؑ کو وحی کی۔ کہ موسیٰؑ کو دودھ پلا) یہاں وحی بمعنی الہام والقاء فی القلب ہے۔ اور آیت مبارکہ واوحینا الی النحل۔ (ہم نے شہد کی مکھی کو وحی کی) میں وحی بمعنی تسخیر ہے (کہ ہم نے اسے مسخر کر دیا) یا بقول بعض یہاں بھی بمعنی القاء در قلب ہے۔ اور آیت مبارکہ فخرج علی قومه فاوحیٰ الیهم (جناب یحییٰؑ اپنی قوم پر برآمد ہوئے اور ان کی طرف اشارہ کیا) میں وحی بمعنی اشارۂ خفیہ ہے۔ آیت مبارکہ یوحی بعضهم الی بعض زخرف القول غرورا (ان میں سے بعض دوسرے بعض کی طرف بطور راز جھوٹے قول نقل کرتا ہے) میں وحی بمعنی راز و نیاز استعمال ہوتی ہے۔ الغرض لغوی اعتبار سے وحی کی جامع تعریف ہے القاء الشئی الی الغیر علی وجه الستر۔ لیکن اصطلاح شریعت میں جیسا کہ مجمع البحرین وغیرہ کتب میں مذکور ہے۔ غلب استعمال الوحی فیما یلقی الی الانبیاء من عندالله عزوجل۔ اس لفظ کا غلبۂ استعمال اس کلام پر ہو گیا ہے۔ جو خداوند عالم کی طرف سے اس کے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا ہے۔ اس لئے جب اسلامی

کتب میں یہ لفظ بولا جائے۔ تو بلا قرینہ اس سے یہی معنی متبادر ہوتے ہیں

وحی کی فلسفی و شرعی حیثیت

چونکہ وحی ہی نبی وغیر نبی نیز نبوت کے سچے اور جھوٹے مدعی کے درمیان فارق ہے۔ جیسا کہ آیت مبارکہ قل انما انا بشر مثلکم الا انہ یوحی الی (پ س ع) "وغیرہ سے مستفاد ہوتا ہے۔

لہٰذا اس کی اہمیت کے پیش نظر اس پر قدرے مزید تبصرہ کیا جاتا ہے۔ سو مخفی نہ رہے کہ حکماء اسلام نے وحی کو "ملکۂ نبوت" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس کی تشریح وہ اس طرح پیش کرتے ہیں۔ کہ انبیاء و مرسلین میں علم و عقل کی ایسی قوت موجود ہوتی ہے۔ جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی۔ حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں۔ دماغی قوی اس سے بلند ذہنیات و عقلیات کو مگر ملکۂ نبوت اس سے بھی بلند تر ہے۔ وہ عقلیات سے بھی بلند تر حقائق کا درک کرتا ہے۔ اور یہ ادراک حقائق اس قدر مکمل اور صحیح ہوتا ہے کہ نہ اس میں غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ منطقی ترتیب مقدمات کی حاجت ہوتی ہے بلکہ حقائق اس طرح پیش نظر ہوتے ہیں جس طرح وجدانیات بدیہیات اور محسوسات! چونکہ یہ معلومات عام انسانی ذرائع و وسائط علم کے بغیر خود علام الغیب عطا کرتا ہے اس نے شرعی زبان میں اسے وحی و الہام کا نام دیا جاتا ہے۔ حکماء کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کسی خارجی حقیقت (براہ راست و تنا فوقتاً تعلیم ربانی) کا نام نہیں بلکہ پیغمبر کے مافوق ذہنی قوی اور وہبی علم و فہم کا نتیجہ [illegible] ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائے آفرینش سے انبیاء کو فطرۃً مخصوص قوی و کمالات سے نوازا جاتا ہے اور منشائے قدرت کو سمجھنے کی استعداد ان میں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے جس سے غیر انبیاء محروم ہوتے ہیں۔ تاہم اسی استعداد کو وحی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس جبلی استعداد کو ملکۂ نبوت یا مابہ النبوۃ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن وحی بہر حال اس خارجی حقیقت کا نام ہے جس کے ذریعہ خلاق عالم اپنے انبیاء و مرسلین کو گاہ بگاہ اپنے احکام و مرائم بتلانے کے لئے براہ راست الہام و القایا بذریعہ فرشتوں کے آگاہ کرتا رہتا ہے۔

قرآن و حدیث قدسی اور عام حدیث کا باہمی فرق

بنا بریں یہ بات محتاج بیان نہیں رہتی کہ انبیاء کے معلومات، تعلیمات و ارشادات سب وحی الٰہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہوتا ہے۔ کہ اگر الفاظ و معانی ہر دو منجانب اللہ اور وہ بھی معجزانہ شان لئے ہوئے ہوں تو اس کے مجموعہ کو صحیفہ یزدان یا قرآن یا زبور و توراۃ و انجیل کہا جاتا ہے۔ اور اگر الفاظ و معانی ہر دو ہوں تو منجانب اللہ۔ مگر معجزانہ حیثیت کے حامل نہ ہوں تو اسے "حدیث قدسی" کا نام دیا

جاتا ہے اور اگر معانی منجانب اللہ ہوں۔ اور الفاظ نبی کے ہوں تو اسے اصطلاح میں عام «حدیث» یا سنت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔

وحیٔ متلو و غیر متلو

اسی لئے بعض علمائے اصول نے کتاب اللہ کو وحی متلو (یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور سنت کو وحیٔ غیر متلو (وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی) قرار دیا ہے پیچ ہے

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ∴ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

وحی شیطانی کا تذکرہ

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ تو وحی ربانی کے متعلق تھا۔ اس کے بالمقابل ایک «وحی شیطانی» یعنی وسوسۂ ابلیسی بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے۔ ان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم۔ شیطان اپنے دوستوں کی طرف وحی کرتے ہیں۔ یعنی ان کو وسوسہ میں مبتلا کرتے ہیں (یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس) لہٰذا اگر کوئی ہیسٹیریا و دماغی خشکی کا مریض یا کوئی چلتر ز نیم پاگل یا غیر شرعی ریاضت کرنے والا یا مالیخولیا میں مبتلا شخص کبھی شیطانی القاآت یا ذاتی پریشان خیالات و خرعبلات کو وحی الٰہی سمجھتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات بر بنائے فاسد اپنی نبوت کا دعاء بھی کرنے لگتا ہے۔ تو اہل اسلام و ایمان کو چاہیئے کہ ان کو نبی ماننے کی بجائے کسی دماغی امراض کے ماہر کے پاس لیجائیں۔ اور اس کا شافی علاج کرائیں۔ اس میں اس کے علاوہ اور بہتوں کی بھلائی ہے۔ ایسا کرنے والوں کو خدا جزائے خیر دے گا۔ فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

شرعی وحی کے اقسام سہ گانہ کا بیان

انبیاؑ کی یہ وحی کئی طرح پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہوتا ہے۔ وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً اومن وراء حجاب او یرسل رسولاً فیوحی باذنہ ما یشاء انہ علی حکیم۔

مصنف کے بیان کردہ مسلک کی تائید مزید

جناب مصنف علام علیہ الرحمۃ نے طریقۂ وحی کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے۔ یہ مضمون چند احادیث میں وارد ہوا ہے۔ اور عقلاً بھی یہ امر ممکن ہے۔ لہٰذا محض استبعاد کی بنا پر اس کا انکار یا اس میں تردد کا اظہار کرنا جیسا کہ حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے ھذا اخذہ ابوجعفرؒ من شواذ الحدیث «لکھ کر اس کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ بظاہر درست نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اس مقام پر تو حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ اس مطلب کو شواذ احادیث ماخوذ قرار دیتے ہوئے مسترد فرما رہے ہیں لیکن بحث لوح و قلم میں جہاں مصنف علام نے یہ فرمایا ہے کہ لوح و قلم دو فرشتے ہیں۔ وہاں مصنف کے کلام کی رد کرتے ہوئے جناب شیخ علیہ الرحمۃ وحی کے اسی طریقہ کو متعدد اخبار و آثار کا حامل قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ فاذا اراد اللہ ان یطلع الملائکۃ

باب الاعتقاد فی نزول القرآن فی لیلۃ القدر قال الشیخ

اعتقادنا فی ذلک ان القرآن نزل فی شھر رمضان فی لیلۃ القدر جملۃ واحدۃ الی البیت المعمور

اکتیسواں باب نزول قرآن کے لیلۃ القدر میں نازل ہونے سے متعلق اعتقاد۔ حضرت شیخ ابوجعفر

فرماتے ہیں کہ اس بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ماہِ رمضان المبارک کی لیلۃ القدر میں پورا قرآنِ مجید بیت المعمور میں یکدفعہ نازل ہوا۔

علی غیب اللہ ادیرسلھم الی الانبیاء بذلک امرھم بالاطلاع فی اللوح المحفوظ فحفظوا منہ ما یؤدونہ الی من ارسلوا وعرفوا منہ ما یعملون۔ وقد جاءت بذلک آثار عن النبیؐ و عن الائمۃ۔ یعنی جب خداوند بزرگ یہ ارادہ فرمائے کہ فرشتوں کو کسی غیب پر مطلع فرمائے یا کسی غیبی بات کے بتانے کے لئے ان کو انبیاء کے پاس بھیجے تو ان (فرشتوں) کو حکم دیتا ہے کہ وہ لوحِ محفوظ میں نگاہ کریں چنانچہ فرشتے لوحِ محفوظ دیکھ کر وہ کچھ یاد کر لیتے ہیں جو انہوں نے رسولوں تک پہنچانا ہوتا ہے اور وہ کچھ سمجھ لیتے ہیں جس پر انہوں نے عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس امر کے متعلق پیغمبر اسلام اور حضرات آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے کئی آثار و اخبار وارد ہوتے ہیں:

اسی قسم کے امور کے متعلق حضرت علامہ مجلسی الرحمۃ بحار جلد ۱۴ میں فرماتے ہیں۔ ما ورد فی الکتاب والسنۃ من امثال ذلک لا یجوز تاویلہ والتصرف فیہ بمحض استبعاد الوھم بلا برھان وحجۃ ونص معارض یدعوا الی ذلک" یعنی قرآن و حدیث میں اس قسم کے جو امور وارد ہوئے ہیں۔ بلا دلیل و برہان اور بغیر کسی معارض نص کے محض استبعاد ذہن کی بنا پر ان کی تاویل کرنا جائز نہیں ہے۔ وھو الحق الحقیق بالاتباع۔ والحق احق ان یتبع۔

اکتیسواں باب لیلۃ القدر میں نزولِ قرآن کا بیان

نزولِ قرآن کے سلسلہ میں جو کچھ مصنف علامؒ نے ذکر فرمایا ہے۔ یہ متعدد آیات و احادیث سے مستفاد ہے چنانچہ خداوند عالم ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے۔ شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ہ ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآنِ مجید نازل کیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ سے اجمالاً اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید بارہ مہینوں میں سے ماہِ رمضان میں نازل ہوا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوا۔ انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ (دخان)

ثم نزل من بیت المعمور فی مدة عشرین سنة وان اللہ عز وجل اعطی نبیہ العلم جملة ثم قال لہ ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضیٰ الیک وحیہ وقل

پھر برابر بیس سال کی مدت دراز میں (تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ خداوند عالم نے اپنے نبی کو قرآن کا پورا علم اجمالی عطا فرما دیا تھا۔ اس لئے فرمایا اے میرے حبیبؐ جب تک میری وحی پوری نہ ہو جائے تم قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو۔ اور یہ دعا مانگا کرو۔

ہم نے اس قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نزول قرآن ماہ مبارک کی کسی خاص رات میں ہوا ہے۔ تیسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ انا انزلنٰہ فی لیلة القدر ہم نے قرآن کو لیلة القدر میں نازل کیا ہے۔ اس سے نزول قرآن کی مکمل تاریخ کا علم ہو گیا۔ کہ پورا قرآن شب قدر میں لوح محفوظ سے بیت المعمور پر اترا تھا۔ اس کے بعد موقع محل کے لحاظ سے جیسی جیسی ضرورت پیش آتی رہی۔ جبرئیل امینؑ ویسی آیت یا سورة آنحضرتؐ کی خدمت میں لے کر آتے رہے۔ اور عرصہ بیس سال تک یہ سلسلہ برابر جاری وساری رہا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین۔

اسی طرح یہ تفصیل متعدد احادیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ تفسیر قمی میں بذیل آیۂ مبارکہ انا انزلنٰہُ فی لیلة مبارکة حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے۔ فرمایا انزل اللہ سبحانہ القرآن فیھا الی البیت المعمور ثم نزل علی رسول اللہؐ فی طول عشرین سنة یعنی خداوند عالم نے لیلة القدر میں قرآن کو (لوح محفوظ سے) بیت المعمور کی طرف نازل فرمایا۔ اور اس سے بیس سال کی مدت میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارا۔ اصول کافی میں حفص بن غیاث سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ باوجودیکہ قرآن مجید بیس سال کے عرصہ میں اترا ہے۔ پھر اس قرآنی آیات کا کیا مفہوم ہے۔ شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن (ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اترا) فرمایا نزل القرآن جملة واحدة۔ فی شھر رمضان الی البیت المعمور ثم نزل فی طول عشرین سنة۔ یعنی ایک بار تمام قرآن (شب قدر کو) ماہ رمضان میں بیت معمور کی طرف نازل ہوا۔ اور پھر وہاں سے بیس سال کی مدت میں نازل ہوا۔ اس قسم کی متعدد روایات اصول کافی، من لا یحضرہ الفقیہ اور تفسیر صافی کے مقدمہ تاسعہ میں مذکور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکثر علمائے مفسرین و محدثین اور متکلمین نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اور یہی قول مشہور ہے۔ صاحب تفسیر لوامع التنزیل مقدمۂ دوازدہم میں لکھتے ہیں "و ہم چنیں مشہور است کہ در ماہِ رمضان در لیلة القدر نازل شد" صاحب حدیقۂ سلطانیہ رقمطراز ہیں:

رب زدنی علما۔ وقال لاتحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه وقرآنه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه ثم ان علينا بيانه

اے میرے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔ اور ارشاد فرمایا (اے نبی تم) اپنی زبان کو اس لئے حرکت نہ دو کہ تم اسے جلدی جلدی یاد کر لو۔ کیونکہ اس کا جمع کرنا اور پڑھانا تو ہمارے ذمہ ہے۔ اس لئے جب ہم پڑھائیں تو تم اسے پڑھتے رہو۔ پھر اس کے بعد اس کی توضیح و تشریح کرنا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

"از روایات درین مفہوم می شود کہ مجموع قرآن بیک مرتبہ از لوح محفوظ در ماہ رمضان بہ بیت المعمور در شب قدر فرود آمدہ و از آنجا بتدریج در مدت بیست و سہ سال بر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ فرود آمدہ۔ بعض متعدد روایات سے مستفاد ہوتا ہے۔ کہ تمام قرآن یکبارگی ماہ رمضان کی شب قدر میں لوح محفوظ سے بیت المعمور کی طرف نازل ہوا، اور پھر وہاں سے تدریجاً تیئس ۲۳ سال کی مدت میں آنحضرتؐ پر نازل ہوتا رہا۔"

دو شبہوں کا ازالہ

بایں ہمہ یہ امر کس قدر تعجب خیز ہے۔ کہ بعض علماء نے بعض بے بنیاد شکوک و شبہات کی بنا پر اس حقیقت کا انکار کر دیا ہے۔ ان شبہات میں سے پہلا شبہ یہ ہے کہ نزول کے اسباب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن مختلف اسباب حوادث اور حالات حاضرہ کے مطابق تدریجاً نازل ہوتا تھا۔ مثلاً خداوند عالم نے کفار کا یہ قول نقل کیا ہے وقولھم قلوبنا غلف وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں۔ یا جیسے خلاق عالم نے مشرکین کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ انہوں نے شرک ترک کرکے اسلام قبول کرنے کی دعوت کے جواب میں کہا تھا۔ وقالوا لو شاء الرحمٰن ما عبدناھم اگر اللہ چاہتا تو ہم بتوں کی پرستش نہ کرتے۔ اسی طرح قصۂ ظہار میں ارشاد قدرت ہے۔ قد سمع اللّٰہ قول التی تجادلك فی زوجھا۔ خداوند عالم نے اس عورت کا قول سنا۔ جو اپنے شوہر کے بارہ میں تجھ سے مجادلہ کرتی تھی۔ لہٰذا یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ کسی وقت قرآن بتمامہ سب یکجا موجود تھا؟

پہلے شبہ کا جواب

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بظاہر قرآن کریم کا نزول انہی اسباب جدیدہ اور حالات حاضرہ کے مطابق ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ تیئس ۲۳ سال میں جا کر مکمل و مختتم ہوا۔ آخر میں الیوم اکملت لکم دینکم کی سند ملی۔ لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے۔ کہ خداوند عالم کو ان واقعات و حادثات کے ظہور سے پہلے ان کا علم نہ تھا۔ کیا کوئی مسلمان اس کا قائل ہو سکتا تھا؟ سب اہل اسلام کا متفقہ عقیدہ ہے کہ علمہ بالاشیاء قبل خلقھا کعلمه بھا بعد خلقھا۔ خلقت اشیاء سے قبل خداوند عالم کو ان کا اسی طرح علم ہوتا ہے۔ جس طرح ان کی خلقت کے بعد ہوتا ہے (اصول کافی وغیرہ) ہاں بعض فلاسفۂ یونان کا یہ

نظریۂ فاسدہ ہے۔ کہ خلقتِ اشیاء سے قبل خدا کو ان کا اصلاً علم نہیں ہوتا۔ یا کم از کم تفصیلی علم نہیں ہوتا۔ (معاذ اللہ) متکلمین اسلام نے اپنے مقام پر دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے اس نظریہ فاسدہ کو باطل کر دیا ہے پس جب یہ امر ثابت ہے کہ خداوند عالم کو ان واقعات کا ان کے ظہور و بروز سے پہلے علم تھا، تو پھر ظاہری نزول سے پہلے قرآن کے موجود ہوتے ہیں کیا اشکال لازم آتا ہے؟ اور اس میں کون سا استبعاد ہے؟

دوسرا شبہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن مجید اس ظاہری نزول سے قبل موجود تھا۔ تو اس سے مخالفین کا "کلام نفسی" والا قول برحق ثابت ہو جائے گا۔ حالانکہ اہل حق کے نزدیک وہ باطل ہے۔ لہذا ظاہری نزول سے پہلے قرآن کے موجود ہونے والا قول درست نہیں ہے۔

اس شبہ کا جواب قطع نظر اس امر سے کہ "کلام نفسی" کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ جسے نہ اس کے قائل خود کما حقہٗ آج تک سمجھ سکے ہیں۔ اور نہ ہی سمجھا سکے ہیں۔ ارباب عقل و ہوش کے لئے ان کا یہ عقیدہ ایک لاینحل معمہ بنا ہوا ہے۔ بہر کیف جو لوگ اس کلام نفسی کے قائل ہیں، وہ اسے خداوند عالم کی طرح قدیم تسلیم کرتے ہیں۔ اور چونکہ ہمارے نزدیک سوائے خداوند عالم کے اور کوئی چیز قدیم نہیں ہے اس لئے یہ نظریہ ہمارے نزدیک باطل ہے کیونکہ اس سے تعددِ قدماء (ایک سے زائد قدیم کا وجود) لازم آتا ہے لیکن اگر ظاہری نزول سے پیشتر قرآن کو لوح محفوظ یا بیت المعمور میں موجود مان لیا جائے۔ تو اس سے ہرگز قرآن کا قدیم ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ حقیقی قدیم تو اسے کہتے ہیں جس کی کوئی ابتداء نہ ہو۔ لیکن جس امر کی کوئی ابتداء موجود ہو تو اسے اگرچہ ظاہری نزول سے ہزار سال نہیں بلکہ لاکھ سال بلکہ کروڑ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ پہلے موجود فرض کر لیا جائے۔ پھر بھی جب تک اس کی کوئی ابتداء ہے تو اسے کسی طرح بھی قدیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بھلا جب خود لوح محفوظ اور بیت المعمور ہی حادث ہیں نہ قدیم۔ تو جو چیز ان میں موجود ہو گی۔ وہ کیونکر قدیم ہو سکتی ہے؟ اسی لئے حضرت مصنف علامؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ خداوند عالم قرآن کا ایجاد کرنے والا اور اس کا محافظ و نگران اور اس کے ساتھ کلام کرنے والا ہے۔ ان حقائق سے معلوم ہوا کہ ایسے شبہات کی بناء پر قرآن و حدیث سے ایک ثابت شدہ حقیقت کا انکار کرنا۔ ایک مسلمان خصوصاً مدعئ ایمان کے لئے کسی صورت بھی روا نہیں ہے۔

تنبیہ مخفی نہ رہے کہ آیت مبارکہ لا تعجل بالقرآن الآیۃ کی جو تفسیر مصنف علامؒ نے بیان فرمائی ہے وہی صحیح اور شانِ رسالت کے مطابق ہے۔ اسے بعض احادیث کی تائید بھی حاصل ہے اس کے علاوہ اس آیت کی جو تفسیریں بیان کی گئی ہیں وہ شانِ رسالت کے منافی ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قبول ہیں۔ اس لئے ہم بوجہ خوفِ طوالت انہیں یہاں ذکر کر کے ان پر کچھ مزید نقد و تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔

باب الاعتقاد فی القرآن

قال الشیخ اعتقادنا فی القرآن انہ کلام اللہ ووحیہ وتنزیلہ وقولہ وکتابہ وانہ لایأتیہ الباطل من بین یدیہ ولامن خلفہ تنزیل

بتیسواں باب (قرآن کریم کے متعلق اعتقاد)

جناب شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ اس کی وحی اسی کی طرف سے نازل شدہ۔ اسی کا قول اور اسی کی (وہ سچی) کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے ہی بھٹک سکتا ہے۔ نہ اس کے پیچھے سے راہ پا سکتا ہے (یعنی اس کے گذشتہ و آئندہ سب واقعات درست ہیں)۔

ایضاح وافصاح

اوپر نزولِ قرآن کے متعلق جو بعض آثار و اخبار نقل کئے گئے ہیں ان میں بظاہر ایک اختلاف دکھائی دیتا ہے کہ بعض روایات میں مدتِ نزول بیس سال مذکور ہے اور بعض میں تیئس سال لیکن اگر حقیقتِ حال کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی درحقیقت تعارض و تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ جناب رسول خدا کے ظاہری نبوت کے ابتدائی تین سال کا دور سرّی و مخفی تھا۔ نہ جہری، اور نزولِ قرآن بھی اس دوران میں بالکل برائے نام تھا۔ لیکن نزول کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ہاں نزول کی کثرت تین سال کے بعد شروع ہوئی لہٰذا اگر دقت سے کام لیا جائے تو نزول کی مدت تیئس ۲۳ سال ثابت ہوتی ہے اور اگر ظاہری طور پر حالات کا جائزہ لیا جائے تو بیس ۲۰ سال ظاہر ہوتی ہے۔ واللہ العالم۔

بتیسواں باب اعتقاد بقرآن کا بیان

قرآن حضرت رسولؐ خدا کا معجزہ خالدہ ہے

اس سلسلہ میں اختصار کے ساتھ جو کچھ حضرت مصنف علام نے افادہ فرمایا ہے۔ وہی مذہب شیعہ بلکہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ خداوند عالم ہمیشہ اپنے انبیاء و مرسلینؑ کو ان کے زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق مختلف معجزات عطا کرتا رہا ہے کسی کے لئے آتشِ نمرود کو گلزار بنایا۔ کسی کو ید بیضا عطا فرمایا۔ کسی کو مادر زاد اندھوں کو آنکھ دینے اور مبروص و مجذوم کو شفا دینے کا اعجاز مرحمت فرمایا۔ کسی کے ہاتھوں میں لوہے کو موم بنایا۔ کسی کے لئے درند و پرند اور ہوا کو مسخر کیا۔ وھکذا۔ مگر یہ تمام معجزات ایسے تھے کہ جب معجزنما دارِ فانی سے دارِ جاودانی کی طرف منتقل ہوئے تو یہ معجزات بھی ختم ہو گئے۔ اسی طرح خلاقِ عالم نے اپنی سنتِ جاریہ کے مطابق حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی متعدد معجزات

من حکیم علیم وان القصص الحق وان القول فصل وما ھو بالھزل وان اللہ تبارک وتعالیٰ محدثہ ومنزلہ وربہ وحافظہ والمتکلم بہ۔

اور صاحب حکمت وعلم (خدا) کی بارگاہ سے نازل ہوا ہے۔ اس کے تمام قصّے برحق ہیں۔ یہ قول فیصل ہے۔ بیکار افسانہ نہیں ہے۔ خدا ہی اس کا نازل کرنے والا، ایجاد کرنے والا، نگرانی کرنے والا، حفاظت کرنے والا ہے۔ اور وہی اس کے ساتھ کلام کرنے والا ہے۔

عطا فرمائے۔ جن کی تعداد کتب مناقب وسیر میں چار ہزار تک مذکور ہے۔ یہ معجزات بھی اکثر وبیشتر ایسے ہی تھے کہ جن کا تعلق آپ کی حیاتِ طیبہ کے ساتھ تھا۔ آپ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ان کا سلسلہ ختم ہوگیا اب سوائے اوراقِ کتب کے اور کہیں ان کا وجود نہیں ہے۔ چونکہ سرکار خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت مطہرہ قیامِ قیامت تک قائم ودائم رہنے والی تھی۔ نیز ان کی نبوت ورسالت کی حدود تمام عالمین کو محیط تھیں۔ اور وہ ہر سفید و سیاہ کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ ان کا کوئی معجزہ بھی قیامت تک باقی رہنے والا ہو۔ اسی لئے خدائے حکیم نے ان کو ایک ایسا معجزہ بھی مرحمت فرمایا جو قیام قیامت تک قائم ودائم رہنے والا ہے یہ معجزۂ خالدہ "قرآن" ہے۔

قرآن کی معجزانہ حیثیت کیا ہے؟

اس امر میں اہل علم وفضل کے درمیان قدرے اختلاف ہے کہ اس کی وجہ اعجاز کیا ہے؟ آیا اس کی وہ فصاحت مفرطہ ہے۔ جو طاقت بشری سے مافوق ہے؟ یا اس کا انوکھا اسلوب بیان اور اچھوتا طرز ادا ہے؟ یا اس کا اعجاز "صرفہ" کا رہین منت ہے؟ چنانچہ جمہور علمائے اسلام کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی فصاحت وبلاغت اور نظم وترتیب کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ اور بعض حضرات اخبار عن الغیب کی وجہ سے اسے معجزہ سمجھتے ہیں۔ اور بعض اہل علم اس کی بے مثل تاثیر اور ہدایت کی بنا پر اسے معجزہ قرار دیتے ہیں۔ اور بعض علماء "صرفہ" کے سبب سے اسے معجزہ تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی خدا نے کفار ومشرکین کی ہمتوں کو پست کر دیا کہ وہ قرآن کا معارضہ ومقابلہ کریں۔ خلاصہ یہ کہ اس نظریہ کی بنا پر اعجاز صرف ہمت کی وجہ سے ہے نہ کہ اس کی فصاحت وبلاغت کے سبب سے۔ لیکن محققین کی رائے یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے الفاظ ومعانی ہر دو کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ یہاں اس امر کی زیادہ تفصیل وتحقیق کی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن کی معجزانہ فصاحت وبلاغت اور اس کی مافوق العادت رشد وہدایت اور اس کی محیر العقول تعلیمات وہدایات پر تبصرہ کیا جائے اور ثابت کیا جائے کہ کس طرح اس نے اپنی معجزانہ شان سے فصحاء وبلغاء عرب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور

کس طرح وہ اس کے مقابلہ و معارضہ سے عاجز و قاصر ہو گئے اور کس طرح اس نے مشکل سے مشکل مسائل و عقائد جیسے توحید و صفاتِ باری حشر و نشر اور جنت و دوزخ وغیرہ کو کس احسن و عمدہ طریقہ سے سمجھایا۔ اور کس عمدہ انداز میں اخلاقی نصیحتیں پیش کیں اور عبادات و معاملات کے متعلق کس طرح فطرتِ انسانی کے مطابق قانون پیش کیا۔ اور کس طرح اس کی معجزانہ علمی شان کی بدولت مختصر عرصہ میں عرب کا جاہل خطہ علم و عرفان اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گیا ؎ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

بہر حال وجہ اعجاز میں اس جزوی اختلاف کے باوجود اس امر پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔ کہ قرآن جناب پیغمبر اسلام علیہ و آلہ السلام کا معجزۂ خالدہ ہے۔ جس طرح اس نے آج سے تقریباً چودہ سو سال پیشتر کفار عرب کو یہ تحدی اور چیلنج دیا تھا۔ کہ ان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ (سورۃ البقرہ پ ۲۳) کہ اگر تمہیں اس قرآن کی صداقت و حقانیت میں کچھ شک و شبہ ہے تو ذرا اس کے مثل ایک سورۃ ہی بنا کر لا دو۔ اور خدا کے سوا اپنے تمام حمائتیوں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔

اسی طرح آج بھی منکرین کو چیلنج دے رہا ہے۔ اور ان کے جذبات کو مہمیز کرنے کے لئے یہ تازیانہ بھی لگا رہا ہے۔ کہ قل لئن اجتمعت الجن والانس علیٰ ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیراً (سورۃ بنی اسرائیل پ ۱۰۴) اے میرے حبیبؐ۔ کہہ دو کہ اگر تمام جن و انسان جمع ہو کر اس قرآن کا مثل بنا کر لانا چاہیں۔ تو نہیں لا سکتے۔ اگرچہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔ باوجود فصحاء و بلغاء اور ادباء و فضلاء کی کثرت کے اس طویل مدت میں کسی شخص کا قرآن کے اس چیلنج کو قبول نہ کرنا اور اسے نہ توڑ سکنا اس کے اعجاز کی بیّن دلیل ہے۔ اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت و رسالت کی صداقت کا زندہ ثبوت ہے و ان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ۔ ان تمام حقائق سے واضح ہو گیا کہ جس طرح قرآن مجید آج سے قریباً چودہ سو سال قبل کا معجزہ تھا اسی طرح آج بھی دنیا کے لئے معجزہ ہے ہم آج بڑے فخر کے ساتھ اسے ہاتھ میں لے کر کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ پیغمبر اسلامؐ کی نبوت قیامت تک ہے جسے اس میں شک ہے وہ اس میں غور و فکر کر کے اطمینانِ قلب حاصل کر سکتا ہے اور اس کی صداقت و حقانیت کو آنکھوں سے مشاہدہ کر سکتا ہے۔ ع

کلام پاک یزداں کا نہیں ثانی کوئی ہرگز — اگر لؤلوئے عماں ہے دگر لعل بدخشاں ہے
خدا کے قول سے قول بشر کیونکر برابر ہو — وہاں قدرت یہاں درماندگی فرق نمایاں ہے

باب الاعتقاد فی مبلغ القرآن

قال الشیخ اعتقادنا ان القرآن الذی انزل اللہ تعالیٰ علی نبیہ محمدؐ ھومابین الدفتین وھومافی

تینتیسواں باب (قرآن کی مقدار کے متعلق اعتقاد)

حضرت شیخ ابن بابویہؒ فرماتے ہیں کہ مقدارِ قرآن کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے۔ کہ وہ قرآن جو خداوند عالم نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا وہ یہی ہے جو دو دفتیوں کے درمیان

فضائل قرآن اور اس کے ساتھ تمسک کرنے کی وصیت

مقدمہ تفسیر صافی میں بحوالہ اصول کافی و تفسیر عیاشی جناب

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے۔ فرمایا۔ فاذا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن فانہ شافع مشفع وماحل مصدق ومن جعلہ امامہ قادہ الی الجنۃ ومن جعلہ خلفہ ساقہ الی النار وھوالدلیل یدل علی خیر سبیل وھو کتاب فیہ تفصیل وبیان وتحصیل وھوالفصل ولیس بالھزل ولہ ظھر وبطن فظاھرہ حکم وباطنہ علم ظاھرہ انیق وباطنہ عمیق لہ تخوم وعلی التخوم لاتحصی عجائبہ ولاتبلی غرائبہ فیہ مصابیح الھدی ومنار الحکمۃ ودلیل علی المعرفۃ لمن عرف الصفۃ۔ جب تمہارے اوپر فتنے و فساد تاریک رات کی طرح چھا جائیں۔ تو تم دامنِ قرآن کو مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ وہ شفاعت کرنے والا اور مقبول الشفاعہ ہے۔ اور (اپنے اوپر عمل کرنے والوں کے حق) وہ جھگڑا کرنے والا ہے۔ کہ جو کچھ وہ کہے گا۔ اس کی تصدیق کی جائے گی۔ جو شخص اسے اپنے آگے لگائے گا (اسے قائد بنائیگا) وہ اسے کھینچ کر جنت کی طرف لے جائے گا اور جو اسے پس پشت ڈالے گا۔ یہ اسے دوزخ کی طرف ہانک کر لے جائے گا۔ یہ وہ ہادی و راہبر ہے جو بہترین راستہ (اسلام) کی طرف ہدایت کرتا ہے یہ وہ کتاب ہے جس میں ہر شے کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ یہ سراسر حق و حقیقت ہے اس میں تمسخر و استہزاء کا نام و نشان نہیں۔ اس کا ظاہر ہے اور باطن بھی۔ اس کا ظاہر حکم اور باطن علم ہے۔ اس کا ظاہر خوش آئند اور باطن بہت گہرا ہے۔ اس کی انتہا ہے اور اس انتہا کے اوپر انتہا ہے۔ اس کے عجائب کا احصاء و شمار نہیں ہو سکتا اور اس کے غرائب کبھی کہنہ نہیں ہوتے۔ اس میں رشد و ہدایت کی کنجیاں اور علم و حکمت کے منارے ہیں۔ جو شخص معرفت حاصل کرنے کے طریقہ کار سے واقف ہو۔ اس کے لئے یہ معرفت کا راہبر ہے۔ حدیث ثقلین بھی اسی سلسلہ جلیلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ نیز تفسیر صافی میں بحوالہ اصول کافی جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا۔ اور انبیاء و مرسلین، ملائکہ مقربین اور تمام اوّلین و آخرین موجود ہوں گے۔ تو قرآن مجید ایک دلکش و خوبصورت شکل میں آئے گا۔ اور

ایدی الناس لیس باکثر من ذلک وصلبغ سورہ عند الناس مائۃ و اربع عشرۃ سورۃ وعندنا ان الضحی والم نشرح سورۃ واحدۃ و لایلاف والم ترکیف سورۃ واحدۃ ومن

لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت موجود ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہے۔ عامہ کے نزدیک اس کی ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک چونکہ سورۃ والضحیٰ اور الم نشرح ایک سورۃ ہے۔ اسی طرح سورۃ لایلاف اور الم ترکیف بھی ایک ہی سورۃ ہے۔ (اس طرح مجموعہ ایک سو بارہ سورتیں ہوں گی) جو شخص

مسلمانوں کے پاس سے گذرے گا۔ وہ خیال کریں گے کہ شاید یہ ہم میں سے کوئی مسلمان ہے۔ مگر قرآن ان کی صفوں سے آگے نکل کر صفوفِ انبیاء سے گذرے گا۔ وہ یہ کہیں گے۔ کہ یہ ہم میں سے ہے۔ مگر وہ ان میں سے بھی آگے گذر کر ملائکہ مقربین کے پاس پہنچے گا۔ وہ خیال کریں گے۔ کہ یہ ہم سے ہے۔ مگر وہ ان کی صفوں کو چیرتا ہوا بارگاہِ قدس تک پہنچے گا۔ اور عرض کرے گا۔ بار الہا۔ فلاں فلاں آدمی دنیا میں رہ کر دن کو روزہ رکھتے اور رات کو میری تلاوت کرتے تھے۔ ارشادِ رب العزت ہو گا۔ اے قرآن! آج ان سب لوگوں کو جنت میں اپنے اپنے منازل پر پہنچا۔ چنانچہ قرآن ان لوگوں سے کہے گا۔ پڑھتے جاؤ۔ اور مدارج عالیہ پر چڑھتے جاؤ۔ یہاں تک کہ ان سب لوگوں کو منازل و مراتب پر پہنچا دے گا۔

تلاوتِ قرآن کا ثواب

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ نوّروا بیوتکم بتلاوۃ القرآن۔ اپنے گھروں کو تلاوتِ قرآن سے منوّر و درخشاں کرو (صافی)

کئی روایات میں وارد ہے۔ کہ جو شخص کسی سے قرآن کا ایک حرف سنے یا خود بغیر پڑھے ایک حرف پر نگاہ کرے۔ اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی درج کر لی جاتی ہے۔ اور اس کا ایک گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ اور جو اس کا ایک حرف سیکھے اسے دس حسنے ملتے ہیں اور دس گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور دس درجے بلند ہوتے ہیں اور جو شخص بیٹھ کر نماز میں اس کی تلاوت کرے۔ اس کے لئے پچاس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور پچاس گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اور پچاس درجے بلند ہو جاتے ہیں۔ اور اگر نماز میں کھڑے ہو کر اس کی تلاوت کرے۔ تو ہر ہر حرف کے عوض سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور سو گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور سو درجے بلند ہو جاتے ہیں۔ (تفسیر صافی مقدمہ اولیٰ)

قرآن حادث ہے نہ قدیم

حضرت مصنف علّام نے اس باب کے آخر میں ایک معرکۃ الآراء اختلافی مسئلہ میں ما ہو الحق عند الامامیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور مسئلہ حدوث و قدم قرآن ہے۔ تمام امامیہ اور اہل سنت میں سے فرقۂ معتزلہ

نسب الینا اناّ نقول انّه اکثر من	ہماری طرف یہ امر منسوب کرے۔ کہ ہم موجودہ قرآن سے
ذلك فهو کاذب وما روی من	زائد قرآن کے قائل ہیں۔ تو وہ جھوٹا ہے۔ ہماری وہ روایات
ثواب قرائة کل سورة من القرآن	جو قرآن کی ایک سورۃ پڑھنے اور پورے قرآن کے ختم کرنے
وثواب من ختم القرآن کلّه وجواز	کے ثواب (نماز نافلہ) کی ایک رکعت میں دو سورتوں کے پڑھنے
قرائة سورتین فی رکعة والنّهی	کے جواز۔ اور نمازِ فریضہ کی ایک رکعت میں دو سورتوں کی تلاوت

قرآن کے حادث ہونے کے قائل ہیں مگر اشعری العقیدہ اہل سنت اسے قدیم جانتے ہیں اور "کلام نفسی" کے قائل ہیں۔ یہاں اختصار کے پیشِ نظر اہل حق کے نظریہ کی صداقت وحقانیت پر چند دلائل وبراہین اجمالاً بیان کئے جاتے ہیں۔

دلیل اوّل:۔ کلام حروف سے مرکب ہے اور حروف مقدم ومؤخر اور محذوف الذکر ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ علاماتِ حدوث ہیں لہذا قرآن جو کلام اللہ ہے حادث ہی ہوگا۔

دلیل دوم:۔ تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ الحمد سے لے کر والناس تک جو قرآن مجید موجود ہے۔ یہ خدا کا کلام ہے اور یہ حروف والفاظ سے مرکب ہے۔ اور یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ جو چیز مرکب ہو وہ حادث ہوتی ہے نہ قدیم لہذا قرآن کو حادث کہنا پڑے گا۔

دلیل سوئم:۔ تمام فضلاء بلکہ جہلاء بھی یہ جانتے ہیں کہ الٰہی حروف والفاظ کے مجموعہ کا نام قرآن ہے جو مرکب ومتلو اور موجود ہیں اور حادث ہیں اور وہ ایک معنی قدیم موسوم بکلام نفسانی، کا نام نہیں ہے۔ لہذا ان حروف محسوسہ ومعلومہ کو کلام نفسانی قرار دینا سراسر دھوکہ اور فریب کاری ہے۔ سید معین الدین شافعی نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں لکھا ہے (علی ما نقلہ فی معارف الملة) ما تلفظ بالکلام النفسی احد الاقی المائة الثالثة ولم یکن قبل ذلك فی لسان احد۔ یعنی کلام نفسانی والے مسئلہ کو اشاعرہ نے تیسری صدی ہجری میں ایجاد کیا ہے۔ اس سے قبل اس کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

دلیل چہارم:۔ خود قرآن مجید اپنے حادث ہونے پر بالصراحت دلالت کرتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے۔ ما یاتیهم من ذکر من ربهم محدث الا استمعوہ وهم یلعبون (پ ۱۷ س انبیاء ۲) کوئی نئی نصیحت ان کے پاس ا—— ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اسے کان لگا کر سنتے تو ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہاں ذکر سے مراد بالاتفاق قرآن ہے جسے خداوند عالم نے حادث قرار دیا ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال واللہ الهادی۔

عن القرآن بين سورتين في ركعة فريضة تصديق لما قلناه في امر القرآن وان مبلغه ما في ايدي الناس كذالك ما روي من النهي عن قراءة القرآن كله في ليلة واحدة وانه لايجوز ان يختم القرآن في اقل من ثلثة ايام تصديق لما قلناه ايضا بل نقول انه قد نزل من الوحي الذي ليس من القرآن ما لو

کے ممنوع ہونے کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔ ان سے ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہم قرآن کی اتنی ہی مقدار کے قائل ہیں۔ جتنی کہ لوگوں کے پاس موجود ہے۔ اسی طرح یہ جو بعض روایات میں وارد ہے۔ کہ ایک رات میں قرآن کو ختم نہ کیا جائے۔ اور یہ کہ تین دن سے کم عرصہ میں قرآن مجید کا ختم کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سے بھی ہمارے نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہاں ہم البتہ اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کے علاوہ اس قدر وحی نازل ہوئی ہے

قرآنی عظمت کا اقرار بزبان اغیار

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کرام کے ایمان کی خاطر بعض غیر مسلم محققین کے وہ زریں اقوال پیش کر دیئے جائیں جو انہوں نے قرآن کی عظمت وجلالت اور اس کے مطالب ومفاہیم کی بلندی اور حدِ اعجاز تک پہنچی ہوئی فصاحت وبلاغت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ریورینڈ جی۔ ایم راڈویل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں قرآنی تعلیمات کی تاثیر کی نسبت لکھتے ہیں "عرب کے سیدھے سادے خانہ بدوش بدو ایسے بدل گئے جیسے کسی نے سحر کر دیا ہے۔ یہودی حقانی باتیں عرصہ سے اہل مدینہ کے گوش گذار ہو چکی تھیں مگر وہ بھی اس وقت تک خواب گردش سے نہ چونکے جب تک کہ روح کو کپکپا دینے والا کلام نبی عربی کا نہیں سنا تب البتہ دفعۃً ایک نئی اور سرگرم زندگانی میں دم بھرنے لگے۔"

گبن یہ کہتا ہے۔ کہ قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے۔ مکہ کے پیغمبر نے بتوں کی، انسانوں کی، ثوابت اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا کہ جو شیئ طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے۔ اور جو حادث ہے وہ فانی ہے۔ اور جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے۔ اس نے اس معقول سرگرمی سے کائنات کے بانی کو ایک ایسا وجود تسلیم کیا جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے نہ کسی شکل میں محدود نہ کسی مکان میں اور نہ کوئی اس کا ثانی موجود ہے۔ جس سے اس کو تشبیہ دے سکیں وہ

جمع الی القرآن لکان مبلغہ مقدار سبع عشرة الف آیة وذلک مثل قول جبرئیل للنبیؐ ان اللہ یقول لک یا محمد دار خلقی مثل ما اداری ومثل قولہ اتق شحنآ الناس وعداوتھم ومثل قولہ عش ما شئت فانک میت واحبب ما شئت فانک مفارقہ واعمل ما شئت فانک ملاقیہ وشرف المؤمن صلوتہ باللیل وعزہ کف الاذی من الناس ومثل قول النبیؐ

کہ اگر اس کو بھی قرآن کے ساتھ جمع کر لیا جائے۔ تو اس مجموعہ کی تعداد سترہ ہزار آیتوں تک پہنچ جائے گی جیسا کہ حضرت جبرئیل کا پیغمبر اسلام سے یہ کہنا کہ خداوند عالم آپ کو فرماتا ہے۔ اے محمدؐ! تم میری مخلوق سے اسی طرح لطف و مدارات سے پیش آؤ۔ جس طرح کہ میں ان سے مدارات کرتا ہوں۔ یا (جیسے جبرئیل کے توسط سے) فرمایا۔ کہ تم لوگوں کی عداوت اور ان کے حقد و کینہ سے ڈرتے رہو۔ یا یہ فرمایا کہ جب تک چاہو زندہ رہو۔ آخر مرنا ضرور ہے اور جس چیز کو چاہو پسند کرو۔ آخر اس سے جدا ہونا ہے اور جو عمل چاہو کرو۔ اس کا نتیجہ (وثمرہ) پاؤگے۔ یا جیسے یہ ارشاد نمازِ شب پڑھنا مومن کے لئے باعث مجد و شرف ہے اور لوگوں کو تکلیف نہ پہنچانا اس کی عزت و عظمت کا سبب ہے یا جیسے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد کہ

ہمارے نہایت خفیہ ارادوں پر بھی آگاہ رہتا ہے۔ لغیر کسی اسباب کے موجود ہے۔ اخلاق اور عقل کا جو کمال اس کو حاصل ہے۔ وہ اس کو اپنی ہی ذات سے حاصل ہے۔ ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبرؐ نے مشہور کیا اور اس کے پیروؤں نے ان کو نہایت مستحکم طور پر قبول کیا۔ اور قرآن کے مفسروں نے معقولات کے ذریعے سے تشریح و تصریح کی ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمانوں کے مذکورہ بالا اعتقاد کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ جب ہم نے اس لا معلوم (یعنی خدا) کو زمان اور مکان اور حرکت اور مادہ اور حس اور تفکر کے اوصاف سے مبرا کر دیا تو پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لئے کیا چیز باقی رہی۔ وہ اصل اول (یعنی توحید ذات وصفات باری تعالیٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر ہے۔ محمدؐ کی شہادت سے استحکام کو پہنچی۔ چنانچہ اس کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکش تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں۔ تصویروں کے ممنوع کر دینے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا۔ دیکھو تاریخ زوال سلطنت روم جلد پنجم باب پچاسواں صفحہ ۴۹۴، ۴۷۰۔

جارج سیل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ بات علی العموم مسلم ہے کہ قرآن

ما زال جبرئيل يوصيني بالسواك حتى خفت ان احفى او ادرد وما زال يوصيني بالجار حتى ظننت انه سيورثه وما زال يوصيني بالمرأة حتى ظننت انه لا ينبغي طلاقها وما زال يوصيني بالمملوك حتى ظننت انه سيضرب له اجلا يعتق فيه ومثل قول جبرئيل حين فرغ من غزوة الخندق يا محمدؐ ان الله تبارك وتعالى يامرك ان لا تصلي

جبرئیلؑ ہمیشہ مجھ کو مسواک کرنے کی وصیت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مجھے یہ خوف دامنگیر ہو گیا کہ کہیں میرے دانت گر نہ جائیں اسی طرح جبرئیلؑ برابر مجھے پڑوسیوں کے بارے میں وصیت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید ان کو شریک وراثت ہی نہ قرار دے دیں۔ جبرئیلؑ ہمیشہ عورت کے متعلق مجھے اس قدر وصیت کرتے رہے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ عورت کو طلاق نہیں دینی چاہیئے۔ اسی طرح ہمیشہ غلام کے متعلق مجھے وصیت کرتے رہے۔ یہاں تک مجھے خیال ہوا کہ شاید اس کے آزاد ہونے کی مدت مقرر ہو جائے گی۔ جس کے بعد وہ خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ یا جیسے یہ کہ جب آنحضرتؐ غزوۂ خندق سے فارغ ہو چکے تو اس وقت جبرئیلؑ نے آنجنابؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ خدائے تبارک و تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ ——

قریش کی زبان میں جو جملہ اقوام عرب میں شریف ترین و مہذب ترین قوم ہے۔ انتہا کی لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اور زبانوں کی بھی کس قدر آمیزش ہے۔ بہت ہی قلیل ہے۔ وہ کلام عربی زبان کا نمونہ ہے اور زیادہ پکے عقیدہ کے لوگوں کا یہ قول ہے۔ اور نیز اس کتاب سے بھی ثابت ہے۔ کہ کوئی انسان اس کا مثل نہیں لکھ سکتا (گو بعض فرقوں کی مختلف رائے ہے) اور اسی واسطے اسے لاثانی معجزہ قرار دیا گیا ہے۔ جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے۔ اور تمام دنیا کو اپنے ربانی الاصل ہونے کا ثبوت دینے کے لئے اکیلا کافی ہے۔ اور خود محمدؐ نے بھی اپنی رسالت کے ثبوت کے لئے اسی معجزہ کی طرف رجوع کیا تھا اور بڑے بڑے فصحائے عرب کو (جہاں کے اس زمانہ میں اس قسم کے ہزارہا آدمی موجود تھے جن کا محض یہ شغل اور حوصلہ تھا کہ طرزِ تحریر اور عبارت کی لطافت میں لائق و فائق ہو جائیں) علانیہ کھلا بھیجا تھا کہ اس کے مقابلہ کی ایک سورۃ ہی بنا دو۔ اس بات کے اظہار کے واسطے کہ اس کتاب کی خوبی تحریر کی ان ذی لیاقت لوگوں نے فی الواقع تعریف و توصیف کی تھی جزو کا اس کام میں مبتصر ہونا مسلّم ہے۔ منجملہ بے شمار مثالوں کے ایک مثال کو بیان کرتا ہے لبید ابن ربیعہ عامری جو محمدؐ کے زمانہ میں سب سے بڑے زبان آوروں میں سے تھا اس کا ایک قصیدہ خانۂ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا (یہ رتبہ نہایت اعلیٰ تصنیف کے لئے مرعی تھا) اور کسی شاعر کو

العصر الا ببنی قریظة ومثل قولهٗ
امرنی ربی بمداراة الناس کما امرنی
باداء الفرائض ومثل قوله انا معاشر
الانبیاء امرنا ان لا نکلم الناس
الا بقدر عقولهم ومثل قولهٗ انّ
جبرئیل اتانی من قبل ربی بامر
قرّت بہ عینی وفرح بہ صدری و
قلبی قال ان اللہ عزّ وجلّ یقول
انّ علیاً امیر المؤمنین وقائد الغرّ
المحجلین ومثل قولهٗ نزل علی

کہ آپ عصر کی نماز قبیلہ بنی قریظہ میں پڑھیں اسی طرح
آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ خدا نے
مجھے انسانوں کے ساتھ لطف و مدارا کرنے کا اسی طرح حکم دیا
ہے۔ جس طرح فرائض کی ادائیگی کا۔ یا جیسے آپؐ کا یہ فرمان ہے
کہ ہم گروہ انبیاء کو یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ لوگوں کے ساتھ ان
کی عقل اور فہم کے مطابق کلام کیا کریں۔ یا جیسے آپ کا یہ ارشاد
کہ ایک دفعہ جبرئیلؑ خدا کی طرف سے ایسی وحی لے کر میرے پاس
آئے۔ کہ جس سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ اور دل خوش و
خرم ہوگیا۔ (وہ وحی یہ تھی کہ) حضرت علی ابن ابی طالب مومنوں کے
امیر اور سفید حصّہ و عضو والوں کے قائد و رہبر ہیں۔ یا جیسے آپؐ کا یہ فرمان کہ میرے پاس

اس کے مقابل میں کسی اپنی تصنیف کے پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ لیکن جب کہ تھوڑے ہی عرصہ کے
بعد قرآن کی دوسری سورہ بقرہ کی آیتیں اس کے مقابلہ میں لگائی گئیں تو خود لبید (جو اس زمانے میں مشرکین میں
سے تھا) شروع ہی کی ایک آیت پڑھ کر بحرِ تحیر میں غوطہ زن ہوا اور فی الفور مذہب اسلام قبول کر لیا۔
اور بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے بر آمد ہو سکتے ہیں۔ اور وہ متصلاً لکھتے ہیں کہ قرآن کا طرز تحریر
عموماً خوشنما اور رواں ہے بالخصوص اس جگہ کہ جہاں وہ پیغمبرانہ وضع اور توریتی جملوں کو نقل کرتا ہے۔ وہ مختصر
اور بعض مقامات میں مبہم ہے اور ایشیائی ڈھنگ کے موافق پر حیرت صنعتوں سے مرصّع اور روشن اور پُر معنی
جملوں سے مزیّن ہے اور اوصاف کا بیان ہے وہ نہایت عالی مرتبہ اور رفیع الشان ہے"

مسٹر جان ڈیون پورٹ جو یہ بھی ایک بڑے عالم اور غیر متعصب شخص ہیں۔ فرماتے ہیں کہ منجملہ ان بہت
سی اعلیٰ درجہ کی خوبیوں کے جو قرآن کے لئے واجب طور پر باعثِ فخر و ناز ہو سکتی ہیں۔ دو خوبیاں نہایت
ہیں یعنی اوّل تو اس کا وہ مؤدبانہ اور ہیبت و رعب سے بھرا ہوا طرز بیان جو ہر ایک مقام پہ جہاں
خدا تعالیٰ کا ذکر یا اس کی ذات کی طرف اشارہ ہے۔ اختیار کیا گیا ہے۔ اور جس میں خداوند عالم کو ان جذبوں اور
اخلاقی نقصوں سے منسوب نہیں کیا جو انسان میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرے اس کا تمام تمام خیالات و الفاظ اور
قصوں سے مبرا ہونا جو فحش اور خلاف اخلاق اور نا مہذب ہوں حالانکہ نہایت افسوس کی بات ہے
کہ یہ عیوب توریت وغیرہ کتب مقدسہ یہود میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت قرآن ان سخت

جبرئیل فقال یا محمدؐ ان اللہ تبارک وتعالیٰ زوج فاطمۃؑ علیاً من فوق عرشہ واشھد علی ذلک خیار ملائکتہ فزوجھا منہ فی الارض واشھد علی ذلک خیار امتک ومثل ھذا الکثیر کلہ وحی لیس بقرآن ولو کان قرآناً	جبرئیلؑ میرے پاس آئے اور کہا اے محمدؐ! خداوند عالم نے عرش کے اوپر جناب فاطمہؑ کی تزویج حضرت علیؑ سے کردی ہے۔ اور اس پر اپنے بہترین ملائکہ کو گواہ مقرر کیا ہے۔ لہٰذا آپ بھی زمین پر ان کا نکاح کردیں۔ اور امت کے بہترین لوگوں کو گواہ بنائیں۔ اس قسم کی اور بہت سی احادیث ہیں جو تمام کی تمام وحی خداوندی ہیں، لیکن انہیں قرآن نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اگر وہ قرآن کا حصہ ہوتیں

عیوب سے مبرا ہے کہ اس میں خفیف سی خفیف ترمیم کی بھی ضرورت نہیں اور اول سے آخر تک پڑھ جاؤ تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پاؤ گے جو پڑھنے والے کے چہرہ پر شرم وحیا کے آثار پیدا کرے (دیکھو کتاب ہیروز اینڈ ہیروز شپ لکچر دوم)

اصول شرع اسلام میں سے ہر ایک اصل کو دیکھئے تو فی نفسہ الی عمدہ اور موثر ہے کہ شارع اسلام کے شرف وفضیلت کو قیامت تک کافی ہے اور ان سب اصول کے مجموعہ سے ایک ایسا انتظام سیاست قائم ہوگیا ہے۔ جس کی قوت ومتانت کے سامنے اور سب انتظامات سیاست ہیچ ہیں۔ ایک شخص کی حین حیات اور وہ بھی ایسا شخص جو جاہل وحشی، تنگ مایہ وکم ظرف قوم کے قابو میں تھا وہ شرع ان ممالک میں شائع ہوگئی جو سلطنت قاہرہ روم کبیر سے کہیں عظیم ووسیع تھیں حبت تک اس شرع میں اس کی اصل کیفیت باقی رہی اس وقت تک کوئی چیز اس کا مقابلہ نہ کرسکی۔ (بحوالہ اعجاز التنزیل)

تیتیسواں باب مقدار قرآن کے متعلق اعتقاد:

مسئلہ تحریف قرآن کو اختلاف امت کی آماجگاہ بنانے کی وجہ

اسلام میں ایسے مسائل کی کمی نہیں ہے۔ جن پر لوگوں نے نیک نیتی سے کماحقہٗ غور وفکر نہ کرنے یا تجاہل عارفانہ سے کام لینے نے اختلاف کی آماجگاہ اور معرکۃ الآرا دیا ہے۔ اور بعض ناعاقبت اندیش مسلمان دیگر بعض اسلامی بھائیوں کو بے جا بدنام کرنے کے لئے انہیں لے اڑے ہیں۔ اور متعصب ملاؤں نے جن کا محبوب مشغلہ ہی فی سبیل اللہ فساد بپا کرنا ہے۔ ان

لكان مقرونا به وموصولا اليه غير مفصول عنه كما قال امير المومنينؑ لما جمعه فلما جاء به فقال لهم هذا كتاب الله ربكم كما انزل على نبيكم لم يزد فيه حرف ولم ينقص عنه حرف فقالوا لا حاجة لنا فيه عندنا مثل الذی عندك

تو اس سے علیحدہ نہ ہوتیں۔ چنانچہ جب حضرت امیر المومنینؑ علیہ السلام قرآن جمع کر چکے تو اسے لوگوں کے پاس لا کر فرمایا اے لوگو! یہ تمہارے پروردگار کی کتاب ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ تمہارے پیغمبرؐ پر نازل ہوئی تھی۔ اس میں نہ کوئی حرف زیادہ ہوا ہے، اور نہ کسی حرف میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے جواب دیا اے علیؑ! ہمیں اس قرآن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس ایسا ہی قرآن موجود ہے۔ جیسا کہ آپ کے پاس ہے۔

مسائل کو کچھ اس طرح الجھا دیا ہے۔ اور عوام میں ان کو کچھ اس غلط انداز سے پیش کیا ہے۔ کہ حقیقت حال بالکل مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اب کوئی شخص نیک نیتی سے حقیقت حال معلوم کرنا چاہے۔ تو اسے گوناگوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ خداوند عالم کا وعدہ ہے کہ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (سورۃ عنکبوت پ ۲۱) جو حق کو ڈھونڈنے کے لئے کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اپنے راستے دکھا دیتے ہیں۔ لیکن ایسے طالبان حقیقت، حق جو اور حق پسند افراد ہر زمانہ میں کبریت احمر سے بھی کمیاب ہوتے ہیں۔ (وقلیل ما ھم) انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ "تحریف قرآن" بھی ہے۔ جو کہ قدیم الایام سے محل نقض و ابرام بنا ہوا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بلا وجہ سب سے زیادہ یورش مذہب شیعہ خیر البریہ پر کی جاتی ہے اور ہمیشہ اہل حق کو بلا سبب طعن و تشنیع کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ اور ہر چند وہ اس سلسلہ میں اپنی پوزیشن واضح کرتے رہتے ہیں، اور ہزاروں مرتبہ اس نسبت قبیحہ سے اپنی برأت ظاہر کر چکے ہیں، مگر برادران یوسفؑ کی بارگاہ میں نہ کوئی شنوائی ہوتی ہے۔ اور نہ کسی عذر کی پذیرائی، شریعت مقدسہ میں عذر قبول نہ کرنے کے متعلق جس قدر تہدید و وعید وارد ہوئی ہے اسے بالائے طاق رکھ کر ہر بنا بر موجب "آنچہ استاذ ازل گفت بگو می گویم" کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہی رٹ لگاتا ہوا نظر آتا ہے۔ کہ شیعوں کا قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ اور ان حضرات کے ترکش اعتراض میں جو آخری تیر ہوتا ہے۔ وہ بھی ثقلین کے ساتھ تمسک رکھنے والوں پر بے تحاشا چھوڑا جاتا ہے۔ والی اللہ المشتکی۔ ہم بالاختصار کوشش کریں گے کہ کذب و افترا کے جو تیر بے سے اس مسئلہ پر ڈالے گئے ہیں، ان کو ادلہ قطعیہ کے تیز حربوں سے چاک کر کے اصل حقیقت کو اپنے ناظرین کرام کے سامنے پیش کریں۔ وباللہ التوفیق۔

تحریف کے حقیقی مطلب و مفہوم کی تعیین

قبل اس کے کہ اصل مطلب پر دلائل پیش کئے جائیں، پہلے "تحریف" کا مطلب واضح کر دینا ضروری ہے

فانصرف وهو یقول فنبذوه وراء ظهورهم واشتروا به ثمنا قلیلا فبئس ما یشترون وقال الصادق القرآن واحد نزل من عند واحد علی نبی واحد وانما الاختلاف من جہۃ الرواۃ وکلما کان فی القرآن مثل قولہ لئن اشرکت

حضرت یہ فرماتے ہوئے واپس تشریف لے گئے کہ ان لوگوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کے بدلے بہت ہی کم قیمت کو خرید لیا ہے۔ اور کیسی ہی بری چیز ہے وہ جو انہوں نے خریدی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن ایک ہے ایک خدا کی طرف سے ایک ہی نبی پر نازل ہوا ہے۔ لیکن راویوں کے اختلاف کی وجہ سے اس میں اختلاف (قرأت) رونما ہو گیا ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں اس مضمون کی آیات موجود ہیں۔ جیسے (اے نبیؐ) اگر تم نے شرک کیا۔

سو مخفی نہ رہے کہ "تحریف" باب تفعیل کا مصدر ہے جس کا مادہ "حرف" بمعنی طرف و کنارہ ہے۔ لہٰذا تحریف کے لغوی معنی ہوں گے۔ الاخذ بالطرف کسی چیز کو ایک طرف اور کنارہ سے پکڑنا اور اسے پوری طرح حاصل نہ کرنا اور اصطلاح میں تحریف کا مطلب یہ ہے۔ کہ کسی کلام کو متغیر و متبدل کر دینا خواہ یہ تغیر و تبدل کلام کے اجزاء کو مقدم و مؤخر کرنے کی وجہ سے ہو یا زیادتی اور کمی کے سبب سے۔ نیز اس میں یہ بھی کوئی قید نہیں کہ یہ تحریف و تغیر فقط لفظوں میں واقع ہو۔ یا صرف معانی و مطالب میں یا الفاظ و معانی ہر دو میں تحریف کی ان مختلف اقسام و انواع میں سے بعض اقسام کے وقوع اور بعض کے عدم وقوع پر سب کا اتفاق ہے اور بعض کے متعلق شدید اختلاف۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تحریف بمعنی اول یعنی تقدیم و تاخیر کے وقوع پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔ کیونکہ مشاہد شاہد ہے۔ کہ موجودہ ترتیب قرآن میں مکی سورے مؤخر اور مدنی مقدم ہیں۔ اور یہ تقدیم و تاخیر فقط سورتوں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ آیات قرآنیہ میں بھی واقع ہے کہ بعض سورتوں کی آیات دوسرے بعض سورتوں میں شامل ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطی وغیرہم نے بھی اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر در منثور جلد ۴ طبع مصر ص ۴۲ راجع بسورۂ رعد۔ تفسیر کبیر ج ۵ ص ۲۵۸ راجع بسورہ رعد۔ تفسیر در منثور ج ۴ ص ۶۹ راجع بسورۂ ابراہیم۔ تفسیر در منثور چہارم ص ۳۴۲ راجع سورہ حج۔ کذا فی التفسیر الکبیر جلد ۶ ص ۳۰۶ تفسیر در منثور جلد ۵ ص ۸۲ راجع بسورہ شعراء تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۲۹۔ راجع بسورہ لقمان وغیرہ۔ حاشیہ قرآن مجید مترجم مولوی عبد الماجد صاحب دریا آبادی حصہ اولیٰ ص ۲ مطبوعہ تاج کمپنی لاہور پر مکی و مدنی سورتوں کی وجہ تسمیہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے

"لیکن یہ تقسیم صرف عمومی حیثیت سے ہے ورنہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مدنی سورۃ

لیحبطن عملك ولتكونن من الخاسرین
ومثل قولہ تعالیٰ لیغفرلك الله ما تقدم
من ذنبك وما تاخر ومثل قولہ
ولولا ان ثبتناك لقد كدت
تركن الیھم شیئاً قلیلاً اذاً لاذقناك
ضعف الحیٰوۃ وضعف الممات
وما اشبہ ذلك فاعتقادنا فیہ انہ

تو تمہارے عمل ضائع ہو جائیں گے اور تم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ (۲) خدا نے تمہارے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں (۳) اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ضرور مشرکوں کی جانب کچھ جھک جاتے، اور اس وقت ہم تمہیں دنیوی عذاب اور موت کے بعد والے عذاب کا مزہ چکھاتے یا اس قسم کے مضامین پر مشتمل جو اور آیات ہیں ان سب کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ "ایاك اعنی واسمعی یا جارۃ" کے

کے اندر مکی آئتیں رکھا دی ہیں یا اس کے برعکس۔ ربط مضمون و مناسبت مقام کا صحیح تر و لطیف تر احساس رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر اور کس کو ہو سکتا تھا؟ اس لئے کسی متعین آیت کے باب میں اس کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ جزم کے ساتھ کرنا دشوار ہے روایتیں جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں کوئی درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی نہیں ہیں۔ محض مفید ظن ہیں۔ مفید یقین نہیں ہیں اس وقت ہمیں اس امر کے متعلق بحث کرنا مقصود نہیں کہ آیتوں کا یہ باہمی اختلاط و امتزاج جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے عمل میں لایا گیا۔ یا خلیفۂ سوم کے ایما سے ایسا کیا گیا (وان کان الحق ھو الثانی) بلکہ یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ مکی سوروں کے آیات کا مدنی سوروں کے آیات میں اور اس کے برعکس مدنی سوروں کے آیات کا مکی سوروں کے آیات میں داخل ہونا عند الکل مسلّم ہے۔

اسی طرح دوسری قسم یعنی تحریف بمعنی زیادتی کے عدم وقوع پر سب کا اتفاق ہے۔ چنانچہ مقدمہ تفسیر مجمع البیان اور مقدمۂ تفسیر تبیان پر علامہ طبرسیؒ اور علامہ طوسیؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ اما الزیادۃ فیہ فمجمع علی بطلانھا یعنی قرآن مجید میں زیادتی کے بطلان پر تمام اہل اسلام کا اجماع و اتفاق ہے۔ ہاں اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ تحریف بمعنی سوم میں ہے۔ یعنی کمی کے واقع ہونے یا واقع نہ ہونے میں۔ برادرانِ اسلامی شیعیانِ حیدرؑ کرار کو ہمیشہ مطعون کرتے رہتے ہیں کہ وہ موجودہ قرآن میں کمی کے قائل ہیں۔ لہٰذا ان کا اس قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ اور اس قسم کے بہت سے بے جا الزامات و اتہامات کا انہیں مورد قرار دے کر اپنی آتشِ غیظ و غضب کو بجھاتے ہیں ؎

ملحد و کافر و زندیق ہمیں کہتے ہیں۔ نام کیا کیا حبِّ حیدرؑ میں رکھایا ہم نے

تنزل علی ایاك اعنی واسمعی یاجارۃ وکلما کان فی القران اوفصاحبه فیه بالخیار وکلما کان فی القران یا ایها الذین اٰمنوا فهو فی التوریته یا ایها المساکین وما من اٰیة اولها یا ایها الذین اٰمنوا الا وعلیؑ بن ابی طالبؑ قائدها وامیرها

طریق پر نازل ہوئی ہیں۔ کہتا تو تجھ سے ہوں مگر اے پڑوسن تو سن لے۔ یعنی ان آیات میں خطاب تو بظاہر پیغمبرؐ سے ہے مگر مقصد امت کے افراد کو (تنبیہ و تہدید کرنا ہے) قرآن کی جن آیات میں لفظ "او" (یا) آیا ہے وہاں مکلف کو اختیار ہے کہ وہ جس شق کو چاہے اختیار کرے (جیسے قسم توڑنے کے کفارہ کے سلسلہ میں وارد ہے وکفارته اطعام عشرة مساکین من اوسط ما تطعمون اهلیکم او کسوتهم او تحریر رقبة) اور قرآن میں جہاں یا ایہا الذین اٰمنو آیا ہے توراۃ میں اس کی بجائے یا ایہا المساکین وارد ہوا ہے۔ اسی طرح جن جن آیات کا سرنامہ یا ایہا الذین اٰمنو ہے وہاں اس گروہ مومنین کے قائد سید امیر ہیں۔

اور اسی کی تفسیریں لکھتے ہیں۔ اور اسی کے اکرام و احترام کو واجب و لازم اور اس کی ہتک حرمت کو ناجائز و حرام سمجھتے ہیں۔ آئمہ ہدیٰؑ نے صحیح اور غلط حدیث معلوم کرنے کا معیار اسی قرآن کی مطابقت یا عدم مطابقت کو قرار دیا ہے۔ حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کل شئی مردود الی الکتاب والسنة وکل حدیث لا یوافق کتاب الله فهو زخرف (اصول کافی) ہر چیز کو کتاب و سنت کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اور ہر وہ حدیث جو قرآن کے مطابق نہ ہو وہ باطل ہے۔ نیز انہی حضرت سے مروی ہے۔ فرمایا ما لم یوافق من الحدیث القرآن فهو زخرف۔ جو حدیث قرآن کے موافق نہ ہو وہ باطل ہے (اصول کافی) اور اسی قرآن کی تلاوت کے ثواب بیان فرماتے ہیں۔ جن کا ایک شمہ سابقہ باب میں بیان ہو چکا ہے۔

موجودہ قرآن کی توثیق از آئمہ اہل بیت علیہم السلام

حضرات آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے بھی اسی قرآن کی تصدیق و توثیق فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔ ما بین الدفتین کتاب الله۔ جو کچھ دو دفتیوں کے درمیان موجود ہے۔ یہ اللہ کی کتاب ہے (نہج البلاغۃ) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں اقرؤا کما یقرء الناس اسی طرح قرآن پڑھو۔ جس طرح دوسرے مسلمان پڑھتے ہیں۔ (مقدمہ تفسیر صافی) جناب امام علی نقی علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اجمعت الامة قاطبة علی ان القران حق لاریب فیه والقران حق لا اختلاف بینهم فی تنزیله وتصدیقه فاذا شهد القران بتصدیق خبر وتحقیقه فانکر الخبر طائفة من الامة لزمهم الاقرار بہ ضرورة الحدیث (احتجاج طبرسی)

وتحریفها وا و لها وما من آیة تسوق الی الجنة الا وهی فی النبی والائمة صلوات الله علیهم اجمعین وفی اتباعهم	شریف ۔ اور سابق الایمان جناب امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب ہیں۔

یعنی تمام امت اسلامیہ کا اس امر پر اتفاق ہے۔ کہ قرآن مجید وہ برحق کتاب ہے کہ جس میں ہرگز کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ قرآن برحق ہے۔ مسلمانوں کے اندر اس کی تنزیل و تصدیق میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پس جب قرآن کریم کسی حدیث کی صحت کی شہادت دے اور باقی ہمہ امت کا کوئی گروہ اس حدیث کا انکار کرے تو اس کے لئے یہ روا نہیں ہے۔ بلکہ اسے اس کی صحت کا اعتراف کرنا لازم ہے آئمہ معصومینؑ نے اس قرآن کے ساتھ تمسک کرنے کی اس قدر تاکید اکید فرمائی ہے کہ اس کی مخالفت کو کفر قرار دیا ہے چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ من خالف کتاب الله وسنة محمد فقد کفر جو شخص کتاب اللہ اور سنت رسولؐ اللہ کی مخالفت کرے وہ کافر ہے (اصول کافی) اگرچہ آئمہ طاہرین علیہم السلام کی ان فرمائشات کے بعد اس سلسلہ میں علماء اعلام کی تصریحات کی ضرورت تو نہیں رہتی۔ مگر منکرین کے اطمینان قلب کے لئے بعض اعلام کی تصدیقات بھی پیش کی جاتی ہیں اس سلسلہ میں سب سے پیش پیش حضرت مصنف علام کا توضیحی بیان ہے جو انہوں نے اسی رسالہ اعتقادیہ میں دیا ہے۔ جس میں سرکار موصوف نے بڑے پر زور طریقہ پر موجودہ قرآن کو کامل و مکمل اور منزل من اللہ بتایا ہے اور عقیدہ تحریف کی شدت کے ساتھ رد فرمائی ہے۔

دیگر شیعہ علمائے اعلام کی تصدیق

شیخ الفرقة المحقة جناب شیخ مفید علیہ الرحمۃ اپنے رسالہ اوائل المقالات میں رقمطراز ہیں۔ وقد قال جماعة من اهل الامامة انه لم ینقص من کلمة ولا من اٰیة ولا من سورة ولکن حذف ما کان مثبتاً فی مصحف امیر المومنینؑ من تاویله وتفسیر معانیه علی حقیقة تنزیله ...... وعندی ان هذا القول اشبه من مقال من ادعی نقصان کلم من نفس القراٰن علی الحقیقة دون التاویل والیه امیل ...... واما الزیادة فیه فمقطوع علی فسادها۔ یعنی فرقہ امامیہ کی ایک جماعت کہتی ہے۔ کہ قرآن میں کسی سورہ اور آیت بلکہ ایک حرف کی بھی کمی نہیں ہوئی۔ مصحف امیر المومنینؑ میں اس قرآن کی جو تفسیر و تاویل مذکور تھی۔ اسے حذف کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قول اس قول سے بہتر ہے جس میں اصل قرآن سے بعض کلمات کا کم ہونا بیان کیا گیا ہے اور میرا میلان اسی کی طرف ہے۔ قرآن میں

واشیاعھم وما من آیۃ تسوق الی النار الا وھی فی اعدائھم والمخالفین لھم وان کان

جو آیات بہشت کی طرف لے جاتی ہیں، وان میں جنت کی خوش خبری دی گئی ہے، وہ جناب رسولؐ خدا اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام اور ان کے خالص شیعوں و پیروؤں کے بارے میں ہیں اور جو آیتیں دوزخ کی طرف لے جاتی ہیں وہ دشمنانِ رسولؐ و آلِ رسولؐ اور ان کے مخالفین کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔

کسی قسم کی زیادتی کے باطل ہونے کا تو قطعی یقین حاصل ہے۔ حضرت سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ کی اصل کتاب ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ مگر ان کے تلمیذ رشید حضرت شیخ الطائفہ طوسی نیز مفسر جلیل علامہ طبرسی علیہ الرحمۃ نے ان کے نظریہ کی تفسیر تبیان اور مجمع البیان میں تصریح فرمائی ہے (وکفی بھما شاھدین عادلین) کہ انہوں نے بھی بڑی وضاحت کے ساتھ قرآن میں کمی بیشی والے نظریہ کو باطل فرمایا ہے۔ اسی ضمن میں فرمایا ہے کہ ان العلم لصحۃ نقل القرآن کالعلم بالبلدان والحوادث الکبار والوقائع العظام والکتب المشھورۃ واشعار العرب المسطورۃ۔ موجودہ قرآن کی نقل کی صحت کا اسی طرح علم و یقین حاصل ہے۔ جس طرح بعض دور دراز شہروں اور بڑے بڑے گذشتہ واقعات اور مشہور کتب اور عربوں کے لکھے ہوئے اشعار کا علم و یقین حاصل ہے۔ حضرت شیخ الطائفہؒ اپنی تفسیر تبیان کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ اما الکلام فی زیادۃ القرآن و نقصانہ فمما لا یلیق بہ لان الزیادۃ فیہ مجمع علی بطلانھا والنقصان منہ فالظاھر ایضاً من مذھب المسلمین خلافہ و ھو الالیق بالصحیح من مذھبنا و ھو الذی نصرہ المرتضیٰؒ و روایاتنا متناصرۃ بالحث علی قرائتہ والتمسک بہ و ردّ ما یرد من اختلاف الاخبار الیہ قرآن میں کمی بیشی کے متعلق کلام کرنا ہماری کتاب کے موضوع سے خارج ہے (کیونکہ یہ فقط قرآن کی تفسیر ہے) اس لئے کہ قرآن میں زیادتی کے باطل ہونے پر تو تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ باقی رہی کمی۔ بظاہر مسلمانوں کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ اور یہی ہمارا صحیح مذہب ہے اور حضرت سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے بھی اسی نظریہ کی نصرت کی ہے سرکار علامہ طبرسیؒ اپنی تفسیر مجمع البیان کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ اما الزیادۃ فمجمع علی بطلانہ واما النقصان منہ فقد روی جماعۃ من اصحابنا و قوم من حشویۃ العامۃ ان فی القرآن تغییراً و نقصاناً والصحیح من مذھب اصحابنا خلافہ و ھو الذی نصرہ المرتضیٰ قدس سرہ واستوفی الکلام فیہ غایۃ الاستیفاء فی جواب المسائل الطرابلسیات۔ اس عبارت کا مطلب

الآیات فی ذکر الاولین فما کان فیہا من خیر فہو جار فی اہل الخیر وما کان فیہا من شر فہو جار

جن آیات میں پہلی امتوں کے جن لوگوں کی جس نیکی اور خوبی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس امت کے صالحین کی شان میں بھی سمجھی جائیں گی۔ اور اسی طرح جن آیات میں اگلے لوگوں کی جس برائی کا ذکر ہوا ہے وہ اس امت کے بُروں کے بارے میں بھی سمجھی جائیں گی۔

وہی ہے جو حضرت شیخ طوسیؒ کی عبارت کا ہے۔ اسی طرح دیگر بہت سے علمائے اعلام مثل علامہ بلاغیؒ (در الاء الرحمٰن) (۷) علامہ السید ابوالقاسم خوئی نجفی مدظلہ (در مقدمہ تفسیر البیان) (۸) علامہ سید ابوالقاسم الرضوی القمیؒ (۹) علامہ السید علی الحائریؒ (در تفسیر لوامع التنزیل) (۱۰) علامہ السید علی نقی النقوی مدظلہ (در مقدمہ تفسیر قرآن) وغیرہم نے اس سلسلہ میں اپنی تحقیقات رائقہ سے اس مطلب کو محقق و مبرہن فرمایا ہے شکر اللہ سعیہم۔
بہر حال شیعہ خیر البریہ تو ہمیشہ سے ببانگ دہل یہ کہتے آئے ہیں کہ

جمال و نورِ قرآں نورِ جانِ ہر مسلماں ہے — قمر ہے چاند تاروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

ایک اشکال کا ابطال

مخالفین کی عیاری و مکاری بھی قابلِ دید ہے جب انہیں ان اساطینِ مذہب کی تصریحات دکھائی جاتی ہیں۔ تو بجائے اس کے کہ اسلامی اصول کے مطابق اپنی افترا پردازی سے دست بردار ہو جائیں اور اپنی غلط بیانی کا اقرار کر کے بارگاہِ الٰہی میں تائب ہوں۔ الٹا وہ یہ راگ الاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہ علمائے شیعہ کے بیانات تقیہ پر مبنی ہیں۔ ورنہ درحقیقت وہ تحریف کے قائل ہیں سبحان اللہ ھذا بہتان عظیم۔ یہ بیان عقل و دانش اور عدل و انصاف سے کس قدر دور ہے؟ اس امر کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جن کی نظریں ہمارے علمائے اعلام کی ان کتب پر ہیں۔ جن میں انہوں نے یہ تصریحات فرمائی ہیں۔ بھلا وہ علماء جو انہیں کتب میں اصحاب ثلاثہ کی خلافت کے ابطال پر دلائل و براہین کا انبار لگا رہے ہیں۔ جنہوں نے مذہب شیعہ کی تائید اور دیگر مذاہب کی رد میں متعدد کتب لکھی ہیں۔ وہ اور تو کسی مسئلہ میں تقیہ سے کام نہیں لیتے۔ پس اگر انہیں تقیہ یاد آتا ہے تو صرف مسئلہ تحریف قرآن میں کہ اس میں اپنے حقیقی نظریات سے دست بردار ہو کر جمہور اہل سنت کی ہمنوائی اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر تقیہ کرتے، تو مسئلہ خلافت میں کرتے۔ اور ثلاثہ کی خلافت کا اقرار کر لیتے۔ تاکہ باہمی چپقلش ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔ یہ کیا الٹی منطق ہے کہ سب سے بڑے مہم اور نازک مسئلہ پر تو تقیہ کرتے نہیں۔ اور اگر تقیہ کرتے ہیں تو بعض خفیف اور غیر اہم مسائل میں؟ یہی وہ وجوہ تھیں جن

فی اهل الشر ولیس فی الانبیاء خیر من النبی محمدؐ ولا فی الاوصیاء افضل من اوصیائه ولا فی الامم افضل من هذه الامة هم شیعة اهل بیته فی الحقیقة دون غیرهم ولا فی الاشرار شر

یعنی تمام انبیاء و مرسلین میں کوئی نبی و رسول جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے افضل و برتر نہیں ہے۔ نہ سلسلۂ اوصیاء میں کوئی وصی آنحضرتؐ کے اوصیاء سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اور نہ ہی پہلی امتوں میں سے کوئی امت آنحضرتؐ کی امت سے بہتر ہے۔ اور حضرت کی امت سے مراد حقیقت میں وہی لوگ ہیں جو اہل بیتؑ رسول کے صحیح پیرو ہیں۔ نہ دوسرے لوگ۔ اہل بیتؑ کے دشمنوں سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں۔ اور نہ ہی تمام آدمیوں میں ان حضرات کے مخالفین سے بدتر کوئی آدمی ہے۔

کی بنا پر بعض منصف مزاج علمائے اہل سنت یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوگئے کہ شیعہ علماء محققین تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان علماء اعلام کا کلام حقیقت ترجمان تقیہ پر مبنی ہے۔

بعض منصف مزاج علمائے اہل سنت کی زبانی ہمارے مومن بالقرآن ہونے کی تصدیق

چنانچہ حافظ محمد اسلم صاحب جے پوری اپنی کتاب تاریخ القرآن صفحہ ۶۲ تا ۶۳ ذیل "شیعہ اور قرآن" شیعہ اکابر و اساطین کے قرآن نقل کرنے کے بعد ان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ یہ ان علمائے شیعہ کے اقوال ہیں۔ جو اہل تشیع میں مقبول و مستند ہیں۔ اور ان اقوال میں نہ تاویل کی گنجائش ہے۔ اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے تقیہ سے کہا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں۔ جنہوں نے علمائے اہل سنت کی تردید میں رسائل لکھے ہیں۔ ان کی نسبت تقیہ کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ اور ابو جعفر قمی کی کتاب الاعتقاد اور ملا محسن کی تفسیر صافی یہ دونوں کتابیں شیعہ کے نصاب درس میں داخل ہیں۔ اس سے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے عقیدہ کے خلاف اپنے فرقہ کو تعلیم دیتے ہیں۔

اسی طرح فاضل جلیل شیخ رحمت اللہ ہندی اپنی مشہور تصنیف اظہار الحق ج ۲ صفحہ ۹۰ طبع بمبئی میں بعض اعلام شیعہ کا کلام حق ترجمان نقل کرکے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔ "فظهر ان المذهب المحقق عند علماء الفرقة الامامية الاثنا عشرية ان القرآن الذي انزله الله على نبيه هو ما بين الدفتين وهو ما في ايدي الناس ليس باكثر من ذلك وانه كان مجموعاً مؤلفاً في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وحفظه ونقله الوف من الصحابة (الى ان قال) ولبعض الاخبار الضعيفة التي رويت في مذهبهم لا يرجع بمثلها عن المعلوم المقطوع على صحته يعني رو ان

حقائق کے پیشِ نظر ثابت ہوگیا۔ کہ فرقہ شیعہ اثنا عشریہ کے علماء اعلام کے نزدیک جو نظریہ مسلم ہے۔ وہ یہی ہے کہ وہ قرآن جو خداوند عالم نے اپنے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم پر نازل فرمایا تھا۔ وہ یہی ہے جو لوگوں کے ہاتھوں میں کتابی شکل میں موجود ہے۔ اور یہ کہ عہد رسالتمآبؐ میں قرآن جمع ہوچکا تھا جسے ہزاروں صحابہ نے حفظ و نقل کیا اور بعض ضعیف روایات جو ان (شیعہ) کے مذہب میں (تحریف کے سلسلہ میں) مروی ہیں۔ ان کی وجہ سے ایک ثابت شدہ حقیقت سے دست برداری اختیار نہیں کی جاسکتی۔ ع

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں ∴ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

والفضل ما شھدت بہ الاعداء لیکن بایں ہمہ متعصب ملاعوام کالانعام میں ہمیشہ شب و روز یہی ڈھنڈورا پیٹا کرتے ہیں۔ کہ شیعوں کا موجودہ قرآن پر ایمان نہیں ہے اور نہ ہی ہوسکتا ہے؟ بلکہ وہ تحریف کے قائل ہیں آہ ع

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو ∴ کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

ہمیں معلوم ہے کہ ان کے اس اتہام و افتراء کے باطنی علل و اسباب تو کچھ اور ہیں۔ لیکن اس کا ظاہری سبب وہ بعض روایات ہیں۔ جو ہماری بعض کتب حدیث و تفسیر میں موجود ہیں۔ اور بظاہر موہم تحریف ہیں۔

شیعہ روایاتِ تحریف کا الزامی جواب

اگرچہ اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اور خود ہم اپنے بعض علمی مضامین میں اس کے متعلق بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر ہماری ان روایات کی وجہ سے ہمیں قائل تحریف اور منکر قرآن قرار دینا صحیح ہے؟ تو پھر کسی طرح بھی خود برادران اسلامی اس الزام سے اپنی گلوخلاصی نہیں کراسکتے۔ اور نہ ہرگز مومن بالقرآن کہلا سکتے ہیں؟ کیونکہ اس قسم کی بکثرت روایات اُن کے ہاں بھی موجود ہیں۔ ہم ذیل میں بطور نمونہ مشتے از خروارے۔ ان کی بعض روایات کا اجمالاً تذکرہ کرتے ہیں۔ تاکہ تصویر کے دونوں رُخ سامنے آجانے کے بعد باانصاف ناظرین کرام کو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرتے میں کوئی دقت و زحمت نہ ہو۔ اور یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ ع

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

روایاتِ اہل سنت سے قرآنی سوروں میں تحریف

تفسیر اتقان مؤلفہ علامہ جلال الدین سیوطی ج ۲ صفحہ ۲۵ مطبع ازہر مصر میں ام المومنین عائشہ سے مروی ہے۔ قالت کانت سورۃ الاحزاب تقرأ فی زمن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم مائتی ایۃ فلما کتب عثمان المصاحف لم نقدر منھا الا علی ما ھو الآن (کذا فی التفسیر الدر المنثور ج ۵ صفحہ ۱۸۰ طبع مصر) یعنی سورہ احزاب کی عہد نبوی میں دو سو ۲۰۰ آیتیں پڑھی جاتی تھیں۔ مگر

جب عثمان نے قرآن لکھے تو ہمیں صرف اسی قدر آیتیں دستیاب ——— ہوئیں۔ جواب موجود ہیں۔ جو کل تہتر ہیں۔ باقی ایک سو ستائیس آیات غائب۔ اسی طرح تفسیر اتقان کے اسی ص۲۵ ج ۲ پر زربن حبیش سے منقول ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ابی بن کعب نے مجھ سے دریافت کیا کاین تعد سورۃ الاحزاب آج کل موجودہ قرآن میں سورہ احزاب کی کس قدر آیات شمار ہوتی ہیں؟ میں نے کہا اثنتین و سبعین اٰیۃ او ثلاثۃ و سبعین اٰیۃ بہتر یا تہتر آیتیں ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا ان کانت لتعدل سورۃ البقرۃ۔ کہ (عہد نبوی میں) یہ سورۃ بقرہ کے برابر ہوتی تھی۔ وان کنا لنقرأ فیہا اٰیۃ الرجم اور ہم اس میں آیت رجم بھی پڑھتے تھے۔ قلت وما آیۃ الرجم؟ میں نے کہا وہ آیت رجم کیا تھی؟ کہا وہ یہ ہے اذا زنا الشیخ والشیخۃ فارجموھما البتۃ نکالاً من اللہ واللہ عزیزٌ حکیم۔ تفسیر درمنثور ج ۳ ص۲۰۸ طبع مصر میں بحوالہ کتب معتبرہ جناب حذیفہ سے نقل کیا ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا قال التی تسمون سورۃ التوبۃ ھی سورۃ العذاب واللہ ما ترکت احداً الا نالت منہ ولا تقرؤن منہا مما کنا نقرؤ الا ربعہا فرمایا وہ سورۃ جسے تم سورۂ توبہ کہتے ہو۔ یہ تو سورۂ عذاب ہے۔ بخدا اس نے ہم میں سے کسی کو بھی سلامت نہیں چھوڑا۔ اس میں ہر شخص کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور نازل ہوا۔ جس قدر ہم اس کی مقدار پڑھتے تھے ... تم اس کا صرف چوتھا حصہ پڑھتے ہو۔

روایاتِ سنیہ سے قرآنی آیات میں تحریف

برادرانِ اسلامی کی کتب تفسیر و حدیث میں بکثرت ایسی روایات موجود ہیں جن سے آیاتِ قرآنیہ میں تحریف و تغییر ثابت ہوتی ہے۔ بطور نمونہ چند آیات پیش کی جاتی ہیں (۱) موجودہ قرآن میں یہ آیت اس طرح ہے حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للہ قانتین (پ۲ سورۃ بقرہ ع ۱۵) مگر حضرات کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں تحریف واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ درمنثور ج ۱ ص۳۰۲ میں کتب متعددہ کے حوالہ سے علامہ سیوطی نے عمرو بن رافع سے روایت کی ہے۔ کہ انہوں نے بیان کیا۔ کنت اکتب مصحفاً لحفصۃ زوج النبیؐ فقالت اذا بلغت ھذہ الایۃ فاذنی حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ فلما بلغتہا اذنتہا فاملت علیّ حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ وا: صلوٰۃ العصر وقوموا للہ قانتین وقالت اشھد انی سمعتہا من رسول اللہ۔ کہ میں جناب حفصہ زوجہ رسولؐ کے قرآن کی کتابت کرتا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ جب تم آیت حافظوا علی الصلوٰۃ پہ پہنچو تو مجھے اطلاع دینا چنانچہ جب میں اس آیت پہ پہنچا تو میں نے ان کو اطلاع دی۔ انہوں نے اس آیت کو اس طرح لکھوایا۔ حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ وصلوٰۃ العصر اور کہا میں گواہی دیتی ہوں۔ کہ میں نے آنحضرتؐ

سے اس آیت کو اسی طرح سنا ہے: لیکن موجودہ قرآن میں وصلوٰۃ العصر کی لفظ موجود نہیں ہے۔ کتاب مذکور کے مذکورہ بالا صفحہ پر جناب عائشہ کے کاتب قرآن ابی یونس سے بھی بعینہٖ یہی روایت منقول ہے۔

(۲) موجودہ قرآن میں یہ آیت اس طرح ہے۔ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک فان لم تفعل فما بلغت رسالتہٗ واللہ یعصمک من الناس (سورۃ مائدہ پ ۶ ع ۱۴) مگر ان حضرات کی کتب تفسیر سے مستفاد ہوتا ہے۔ کہ اس میں تحریف واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ تفسیر درمنثور ج ۲ ص۲۹۸ طبع مصر پر علامہ سیوطی نے جناب ابن مسعود سے روایت کی ہے۔ فرمایا کنا نقرء علی عہد رسول اللہ صلعم یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیا مولی المومنین وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔ لیکن آجکل جملہ ان علیاً مولیٰ المومنین، ندارد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ساقط کر دیا گیا ہے۔ (۳) تفسیر اتقان جلد ۲ ص۲۵ طبع مصر اور تفسیر درمنثور ج ۵ ص۱۸۰ پر متعدد روایات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآن مجید سے آیۃ رجم خارج کر دی گئی۔ ابی بن کعب کہتے ہیں۔ کنا نقرء فیہا آیۃ الرجم قلت وما آیۃ الرجم قال اذا زنا الشیخ والشیخۃ فارجموہما البتۃ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم۔ یعنی ہم اس سورہ (احزاب) میں آیت رجم بھی پڑھتے تھے۔ میں (زر بن حبیش) نے کہا آیت رجم کون سی آیت ہے؟ کہا اذا زنی جس وقت بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت زنا کرے۔ تو انہیں سنگسار کر دو۔ یہ خدائے عزیز وحکیم کی طرف سے ان کے اس جرم کی پاداش ہے: لیکن موجودہ قرآن مجید میں آیت رجم کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ (۴) موجودہ قرآن مجید میں یہ آیت مبارکہ اس طرح ہے۔ ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی یا ایہا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ لیکن روایات اہل سنت سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ اس آیت میں بھی تحریف ہوئی ہے۔ چنانچہ تفسیر اتقان ج ۲ ص۲۵ اور تفسیر درمنثور ج ۵ ص۲۲۰ پر کئی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب عائشہ وحفصہ کے مصاحف میں اس آیت کا تتمہ قبل ان یغیر عثمان المصاحف قبل اس سے کہ جناب عثمان مصاحف کو متغیر کریں۔ یوں تھا۔ والذین یصلون الصفوف الاول مگر آج یہ تتمہ ندارد ہے (۵) موجودہ قرآن میں یہ آیت اس طرح ہے۔ کفی اللہ المومنین القتال۔ لیکن حضرات کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ آیت اصل میں یوں تھی کفی اللہ المومنین القتال بعلی ابن ابی طالب (تفسیر درمنثور ج ۵ ص۱۹۲) مگر موجودہ قرآن میں اس آیت کے اندر حضرت امیر علیہ السلام کا اسم گرامی موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے عمداً حذف کر دیا گیا ہے۔ یہاں اسی مختصر مقدار پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ؎

اندکے غم دل با تو گفتم وبدل ترسیدم — کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ان حقائق کی روشنی میں یہ امر روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتا ہے۔ کہ برادران اسلامی کے نزدیک قرآن مجید محرف و مبدل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب عبداللہ بن عمر کہا کرتے تھے۔ لا یقولن احد قد اخذ القرآن کلہ وما یدریہ ما کلہ قد ذہب منہ قرآن کثیر (تفسیر اتقان ج ۲ ص۲۵) ہرگز کوئی شخص یہ نہ کہے۔ کہ میں نے پورا قرآن حاصل کر لیا ہے۔ اسے کیا خبر کہ پورا قرآن کس قدر تھا؟ قرآن کا اکثر حصہ تو تلف ہو گیا۔ لیکن بایں ہمہ ان حضرات کے شرم و حیا کی داد دینی چاہیئے کہ کہتے یہی ہیں کہ شیعوں کا قرآن ناقص ہے اور ان کا اس پر ایمان نہیں ہے ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

دو ٹوک فیصلہ

یہ حضرات ہماری چند روایات دیکھ کر ہمیں تحریف قرآن کا الزام دیتے ہیں۔ اب ہم ان کی ان روایات کی روشنی میں ان کی خدمت میں گذارش کریں گے۔ کہ جو جواب تم اپنی ان روایات کا دو گے۔ وہی جواب ہماری طرف سے ہماری روایات کا سمجھو۔ اگر اپنی روایات پر ضعیف الاسناد ہونے کا فتویٰ صادر کر کے انہیں ناقابل اعتماد قرار دو تو ہماری روایات کو بھی ایسا ہی سمجھو۔ اور اگر ان اضافوں کو جو ان روایات میں مروی ہیں تفسیری و توضیحی بیانات پر محمول کرو تو ہماری روایات کا بھی یہی مفہوم سمجھو۔ جیسا کہ مصنف علام نے متن رسالہ میں ان روایات کا یہی مفہوم بیان کیا ہے

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا!

ایک تاویل علیل کا ابطال

متعصب ملاؤں کا یہ پرانا وطیرہ ہے کہ جب ان کے بے بنیاد اعتراض کے جواب میں الزامی طور پر ان کی مذکورہ بالا یا ان جیسی دیگر روایات پیش کر کے ان کا ناطقہ بند کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان سے ان روایات کا کوئی معقول جواب نہیں بن پڑتا۔ تو وہ فوراً نسخ کا سہارا لیتے ہوئے اپنی گلو خلاصی کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ آیات منسوخ ہو چکی ہیں۔ اور یہ روائتیں نسخ پر محمول ہیں۔ ان کی یہ تاویل بچند وجہ ناقابل قبول اور علیل ہے۔

اولاً اس لئے کہ خود ان روایات میں ایسی ایسی تصریحات موجود ہیں۔ جو نسخ والی تاویل کا قلع قمع کرتی ہیں۔ کیونکہ "نسخ" فقط عہد نبوی میں نزول قرآن کے وقت ہی متصور ہو سکتی ہے۔ کما لا یخفیٰ۔ چنانچہ تفسیر اتقان ج ۲ ص۲۶ طبع مصر پر لکھا ہے۔ "ولا یجوز نسخ شیئ من القرآن بعد وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی آنحضرتؐ کی وفات کے بعد نسخ قرآن جائز نہیں ہے" مگر ان روایات میں تصریح موجود ہے۔ کہ جناب عائشہ و حفصہ فلاں آیت کو اس طرح پڑھتی تھیں۔ اور اسی طرح اپنے مصاحف میں لکھواتی تھیں۔ اور شہادت دیتی تھیں۔ کہ عہد رسالت میں اسی طرح یہ آیات پڑھی جاتی تھیں۔ اسی طرح بعض صحابہ کرام کی یہ تصریحات موجود ہیں۔ کہ فلاں آیت جناب عثمان کے تغیر و تبدل

سے پہلے اس طرح پڑھی جاتی تھی۔ اہل انصاف بتائیں۔ کہ ان تصریحات کے ہوتے ہوئے مدعیانِ "نسخ" والا سہارا کس طرح مفید مطلب ہو سکتا ہے۔ مگر سچ ہے۔ الغریق یتشبث بکل حشیش یعنی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

ثانیاً۔ اس لیے کہ "نسخ" کے چند قواعد و ضوابط ہیں۔ جب تک وہ نہ پائے جائیں۔ کسی آیت کے ہوتے کا نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دھاندلی کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ کہ جس آیت کے متعلق چاہا "نسخ" کا فتویٰ صادر کر دیا۔ علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب تفسیر اتقان ج ۲ ص ۲۴ طبع مصر میں نسخ کے متعلق رقمطراز ہیں۔ انما یرجع فی النسخ الی نقل صریح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او عن صحابی یقول انہ کذا نسخت کذا یعنی نسخ کے سلسلہ میں فقط جناب رسول خدا کی کسی صریح حدیث یا کسی صحابی کے ایسے قول پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ کہ جس میں اس نے وضاحت کی ہو۔ کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کیا ہے پھر فرماتے ہیں۔ ولا یعتمد فی النسخ قول عوام المفسرین بل ولا اجتہاد المجتہدین من غیر نقل صحیح ولا معارضۃ بینۃ لان النسخ یتضمن رفع حکم و اثبات حکم تقرر فی عہدہ صلی اللہ علیہ وسلم والمعتمد فیہ النقل والتاریخ دون الرائے والاجتہاد۔ یعنی نسخ کے سلسلہ میں عام مفسرین کے قول بلکہ مجتہدین کے اجتہاد کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جب تک اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث یا اس آیت کے معارض کوئی بینہ موجود نہ ہو۔ کیونکہ نسخ ایک حکم کے اٹھنے اور عہد نبوی میں اس کی جگہ دوسرے حکم کے مقرر ہونے کا نام ہے۔ لہذا اس سلسلہ میں فقط نقل صریح اور تاریخ صحیح پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ نہ رائے واجتہاد پر۔

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہو گیا۔ کہ جب تک کسی آیت کے منسوخ ہونے پر آنحضرتؐ کی صحیح السند حدیث پیش نہ کی جائے۔ اس وقت تک فقط بعض مفسرین و مناظرین بلکہ مجتہدین کے اقوال پر بھی ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا اگر ہماری پیش کردہ ان الزامی روایات کے متعلق یہ حضرات مدعی ہیں کہ وہ منسوخ ہیں تو وہ اس سلسلہ میں کوئی صریح و صحیح حدیث نبوی پیش کریں۔

ثالثاً۔ ارشاد قدرت ہے۔ ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا (پ ۱ س ۴) جب بھی ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لاتے ہیں۔ اس آیت مبارکہ سے بعبارۃ النص ظاہر ہے کہ جس قدر آیتیں منسوخ ہوں اتنی ہی ناسخ موجود ہوتی ہیں۔ لہذا نسخ کے دعویداروں پر لازم ہے کہ اگر وہ دعوائے نسخ میں سچے ہیں تو ناسخ آیات پیش کریں۔ ہمیں گو ہمیں میدان لیکن اگر وہ یہ ثابت نہ کر سکیں اور نہ ہی کر سکتے ہیں۔ تو پھر انہیں اپنے دعویٰ بلا دلیل سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

بعض علماء کے قائل تحریف ہونے سے مذہب کا قائل ہونا لازم نہیں آتا

ہاں یہ درست ہے کہ ہمارے بعض علماء کرام تحریف کے قائل ہیں۔ لیکن یہ امر محتاج بیان نہیں۔ کہ کسی اختلافی مسئلہ میں کسی مذہب کے بعض علماء کا نظریہ خصوصاً جبکہ وہ اکابر علماء مذہب کے نظریہ سے متصادم ہو۔ اُسے پورے مذہب کا نظریہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جو علماء کرام اس نظریہ کے قائل ہیں وہ بھی اپنے اس نظریہ کی صحت پر دلائل رکھتے ہیں ذیل میں ان کے چند ادلہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

قائلین تحریف کی پہلی دلیل

اس سلسلہ میں ان کی پہلی اور محکم دلیل وہ روایات ہیں جو اس مسئلہ کے متعلق کتب فریقین میں موجود ہیں۔ جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ جمع قرآن کے وقت اس میں فی الجملہ ضرور کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ روایات اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ ان سب کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ مجلسیؒ نے مراۃ العقول میں ان کے تواتر کا ادعا فرمایا ہے اور اس قدر صریح الدلالہ ہیں کہ ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری دلیل

جمع قرآن کی وہ کیفیت ہے۔ جو کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہے۔ پہلے پہل مسلمانوں کے پہلے خلیفہ کے حکم سے یہ اہم کام زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا۔ اور اسے حکم دیا گیا۔ کہ مسجد نبوی کے دروازہ پر بیٹھا کریں۔ اور لوگوں میں اعلان کرایا گیا۔ کہ جس شخص کے پاس قرآن کا کوئی حصہ ہو۔ وہ زید کے پاس لائے۔ اور شرط یہ مقرر کی گئی۔ کہ جو شخص دو گواہ پیش کرے۔ اس کے لائے ہوئے اجزاء کو قرآن میں درج کرلئے جائیں۔ چنانچہ اسی التزام کے مطابق قرآن کریم جمع کیا گیا۔ اور کچھ اجزاء جو ہڈیوں۔ کھجور کی شاخوں، گتوں اور کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے۔ وہ جمع کرلئے گئے۔ (تفسیر اتقان ج ۱ صـ۶) اسی طرح خلیفہ سوم کے عہد میں اس جمع کردہ قرآن میں معمولی تقدیم و تاخیر اور قرأت میں حک و اصلاح کے بعد اسے دوبارہ مرتب کیا گیا۔ جو غیر جانبدار شخص بھی جمع و ترتیب کی یہ کیفیت ملاحظہ کرے گا۔ اسے ظن غالب بلکہ یقین کامل حاصل ہوجائے گا۔ کہ اس طرح کچھ نہ کچھ حصہ ضرور جمع ہونے سے رہ گیا ہوگا۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ کسی کے پاس جمع شدہ کچھ مقدار ہو۔ مگر اس نے اپنا جمع کردہ حصہ ان حضرات کے حوالہ کرنا مناسب نہ سمجھا ہو جس طرح جناب عبداللہ بن مسعود وغیرہ کا اپنا قرآن دینے سے ابا و انکار کرنا ثابت ہے اسی طرح ام المومنین عائشہ و حفصہ نے بھی اپنے اپنے مصحف نہیں دیئے تھے۔ نیز ممکن ہے۔ کسی کے پاس کچھ اجزاء قرآن مجید ہوں۔ مگر اس کی قرآنیت پر دو گواہ موجود نہ ہوں لہذا ان کا لایا ہوا جزء قبول نہ کیا گیا ہو۔ اسی طرح تفحص و تلاش کا جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا۔ قرین عقل

ہے کہ اس سے قرآن کے بعض اجزاء باوجود تلاش و تتبع کے دستیاب نہ ہوئے ہوں۔ جیسا کہ مشاہدہ شاہد ہے۔ کہ ایسے مواقع پر ایسا ہوتا ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ شخص جو اس جمع و ترتیب کا متصدی ہے غیر معصوم ہو۔

تیسری دلیل کسی شخص کی جمع کردہ چیز پر اسی وقت یہ وثوق ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہوا جب کہ اس کے جامع کا ایمان و ایقان ایسا مسلّم ہو کہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو اور اس شخص کی اس جمع و ترتیب سے سوائے دین اسلام کی خدمت کے اور کوئی غرض و غایت وابستہ نہ ہو۔ لہٰذا جن لوگوں کو ان جامعین قرآن کے ایمان میں ہی کلام ہے اور ان کے مساعی و جہود کو کسی جذبۂ دینی پر محمول کرنے کے لئے بھی تیار نہیں بلکہ وہ ان کی جمع و ترتیب کو ان کے دنیوی اغراض و مقاصد پر محمول کرتے ہیں۔ اگر وہ اس میں کچھ کمی کے قائل ہوں بھی تو وہ معذور ہیں۔ اور ان کے پاس ان امور کے متعلق دلائل و براہین کا انبار موجود ہے۔ جن کے ذکر کرنے کا یہ مقام نہیں ہے۔ باقی رہا یہ خیال کہ اس طرح موجودہ قرآن سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ یہ خیال غلط ہے کیونکہ یہ اعتماد اس لئے ختم نہیں ہو تا کہ حقیقی محافظانِ اسلام و قرآن یعنی آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس کے قرآن ہونے کی تصدیق کر دی ہے۔ اور جہاں جہاں جامعین نے تحریف کی تھی۔ ان مقامات کی نشاندہی بھی فرما دی ہے۔ لہٰذا اس نظریہ کے قائل بھی موجودہ قرآن پر دوسرے مسلمانوں کی طرح ایمان رکھتے ہیں۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ چونکہ پہلی امتوں میں آسمانی کتب میں تحریف ہو چکی ہے۔ اور پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے کہ جو کچھ بھی پہلی امتوں میں واقع ہوا ہے۔ بعینہٖ وہ میری امت میں بھی واقع ہو گا۔ (کنز العمال ج ۱ ص ۳۳ درمنثور ج ۵ ص ۴۲ نہایہ ابن اثیر ج ۱ ص ۲۲۲ مشکوٰۃ ص ۴۵ وغیرہ) لہٰذا اس عمومی مشابہت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اس امت میں بھی آسمانی کتاب میں کچھ تحریف واقع ہو۔

پانچویں دلیل یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کے خلیفہ اوّل و دوم اور بالخصوص حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن مجید موجود تھا۔ تو اس کی موجودگی میں جناب خلیفۂ ثالث کو از سر نو اس کے جمع کرنے کی کیا ضرورت در پیش آئی تھی؟ اور اپنے جمع کردہ مصحف کو کو رائج کرنے میں اس قدر مبالغہ سے کام کیوں لیا تھا۔ کہ باقی تمام جمع کردہ نسخے (سوائے حضرت امیر علیہ السلام کے نسخے کے) نذرِ آتش کرا دیئے تھے (بخاری شریف جلد ۲ ص ۷۴۶ طبع دہلی تفسیر اتقان ج ۱ ص ۶۱) اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جامع قرآن کی کوئی خاص غرض پوشیدہ تھی جس کے تحت اس قدر اہتمام کیا گیا تھا اور وہ غرض قانونِ شریعت کی کتاب میں تحریف و تغییر کر کے دین اسلام کو متغیر و متبدل کرنا ہی ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی دلیلیں یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یہاں ان دلائل کی صحت

وشمنی سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ان کے یہاں ذکر کرنے سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ جو حضرات اس نظریہ کے قائل ہیں وہ بھی کچھ دلائل رکھتے ہیں اور ان کا یہ نظریہ محض بے دلیل نہیں ہے اور یہ کہ ان کے اس نظریہ سے کسی اسلامی مسلّم عقیدہ کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی۔ کما لا یخفی۔

نظریۂ تحریف کے ابطال پر دو آیتوں کے ساتھ غلط استدلال

نظریۂ تحریف کے ابطال پر دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی آیت یہ ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (سورہ حجر پ ۱۴ ع ۱) ہم نے "ذکر" کو نازل کیا ہے۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ جب خداوند عالم قرآن کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے۔ تو کون شخص اس میں کچھ تحریف اور تغییر کر سکتا ہے؟ تحریف کے ابطال پر قطع نظر تحریف والے نظریہ کے غلط صحیح ہونے کے بات یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ کے ساتھ تمسک کرنا بچند وجہ صحیح نہیں ہے۔

اولاً قرآنی اصطلاح میں "ذکر" کا اطلاق جس طرح قرآن پر ہوا ہے۔ (ان ھو الا ذکر للعالمین) اسی طرح اس کا اطلاق جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والاصفات پر بھی ہوا ہے (انا انزلنا الیکم ذکراً رسولا) لہذا یہ ممکن ہے کہ یہاں اس ذکر سے مراد پیغمبر اسلام کی ذات والاصفات ہو کہ خداوند عالم شر اعداء سے ان کی حفاظت و حراست کا وعدہ فرما رہا ہے (واللہ یعصمک من الناس) اسی بنا پر آیت مبارکہ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون میں وارد شدہ لفظ "اھل الذکر" سے مراد اہل رسول لیے جاتے ہیں۔ بنا بریں اس آیت کو ہمارے متعلقہ مسئلہ کے ساتھ کوئی ربط ہی نہیں رہتا۔ اور وہ اس موضوع سے بالکل اجنبی قرار پاتی ہے۔ تفسیر کبیر ج ۵ ص ۲۵۷ طبع مصر) میں مذکور ہے کہ بعض علمائے اہل سنت مثل فراء اور ابن انباری نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

ثانیاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہاں "ذکر" سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ تو غور طلب امر یہ ہے کہ آیا اس سے مراد قرآن مجید کے تمام افراد ہیں؟ یا اس سے مراد مطلق قرآن ہے؟ (جو کہ ایک فرد کے ضمن میں بھی متحقق ہو سکتا ہے۔) پہلی شق تو یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ جناب عثمان کا قرآنوں کو جلانا (بخاری شریف وغیرہ) اور ولید کا قرآنوں کو تیروں کا نشانہ بنانا (از ادب الدین والدنیا وغیرہ) مسلمات میں سے ہے۔ اسی طرح طباعت و اشاعت میں اغلاط کا رہ جانا بھی بالمشاہدہ ثابت ہے۔ نیز کئی دفعہ قرآن اتفاقاً جل بھی جاتے ہیں۔ کسی اور طریقہ سے تلف بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر قدرت کاملہ نے ہر ہر فرد کا وعدہ کیا ہوتا کوئی شخص کسی قرآن کے ساتھ بے ادبی نہ کر سکتی اور نہ خود بخود ایسا ہوتا۔ پس ماننا پڑے گا کہ اس امر سے مراد مطلق قرآن (قرآن کلی) ہے۔ لہذا اگر قرآن کا ایک فرد بھی اس تحریف سے محفوظ ہے تو وعدہ

خداوندی پورا ہے۔ اور قائل تحریف کہہ سکتا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کا جمع کردہ قرآن اس وعدۂ الٰہیہ کی عملی تصویر ہے جو موجود ہے اور ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے۔ ہاں البتہ جو تحریف کے قائل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام کے جمع کردہ قرآن مجید اور موجودہ قرآن کریم میں صرف اس قدر فرق تھا کہ آنجنابؑ کا جمع کردہ کلام پاک ترتیب نزول کے مطابق تھا۔ جب کہ موجودہ کلام پاک اس کے مطابق جمع نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ اس قرآن میں تنزیل کے ساتھ ساتھ اس کی تاویل بھی مذکور تھی جو کہ موجودہ قرآن میں نہیں ہے۔ اسی بنا ابن سیرین کہا کرتا تھا اگر جناب امیرؑ کا جمع کردہ قرآن مجید دستیاب ہو جاتا تو علم کا ایک ذخیرہ مل جاتا (تاریخ الخلفاء ص۱۲۳ طبع مصر) واللہ العالم۔

ثالثاً: یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس حفاظتِ خداوندی سے مراد کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مراد ہو کہ کوئی شخص دلائل و شبہات سے قرآن کی حقانیت و صداقت کو نہیں جھٹلا سکے گا۔ کیونکہ الحق یعلو ولا یعلی علیہ اور بفضلہ تعالیٰ یہ امر حیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔ صدیاں گذر گئیں۔ اور باوجود قرآن کے چیلنج کے آج تک کوئی شخص بھی اس کی ایک آیت کا مثل نہیں لا سکا۔ پس بموجب اذا قام الاحتمال بطل الاستدلال اس آیت کے ساتھ تحریف قرآن کے ابطال پہ استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ بعض علمائے اہل سنت نے بھی اس کا اعتراف کر لیا ہے۔ چنانچہ علامہ فخر الدین رازی نے قاضی (باقلانی) کے اس آیت کے ساتھ نفی تحریف پر کئے ہوئے استدلال کو بایں الفاظ "احتج القاضی بقولہ انا نحن علی فساد قول بعض الامامیۃ" ذکر کر کے اس استدلال کی کاکت و کمزوری پر ان الفاظ کے ساتھ تنبیہ کی ہے "وھذا الاستدلال ضعیف لانہ یجری مجری اثبات الشئی بنفسہ" (تفسیر کبیر ج ۵ ص۲۵۸ طبع مصر) یہ استدلال ضعیف ہے۔ کیوں کہ یہ مصادرہ علی المطلوب دعویٰ کو دلیل قرار دینے کو مستلزم ہے جو کہ باطل ہے بعد ازیں اس استدلال میں کیا وزن باقی رہ جاتا ہے؟؟ دوسری آیت یہ ہے وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (سورۂ حم سجدہ پ۲۴ ع ۱۹) اور یہ قرآن تو یقینی ایک عالی رتبہ کتاب ہے۔ کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے ہی ٹھٹک سکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے اور خوبیوں والے دانا خدا کی بارگاہ سے نازل ہوئی ہے (ترجمہ فرمانؒ) اس سلسلہ میں اس آیت مبارکہ سے بھی تمسک کرنا صحیح نہیں ہے۔

اولاً۔ اس لئے کہ اس پر بھی وہی ایراد وارد ہوتا ہے جو پہلی آیت پہ دوسرے نمبر پر وارد کیا گیا ہے۔ کہ اس سے مراد قرآن کے تمام افراد ہیں یا بعض تمام افراد تو مراد لئے نہیں جا سکتے لہذا بعض مراد لینے پڑیں گے۔ تو وہ ایک قرآن کے صحیح موجود ہونے کی صورت میں صادق ہے۔

ثانیاً۔ اس باطل سے مراد کیا ہے جو اس قرآن میں رہ نہیں پا سکتا؟ اگرچہ تحریف بھی امر باطل ہے۔ لیکن عین ممکن ہے کہ قرآن کے آگے پیچھے سے باطل کے نہ آنے کا یہ مطلب ہو کہ اس کی گذشتہ یا آنے والی اخبار میں کوئی اختلاف نہیں جو قرآن کے لئے موجب بطلان ہو۔ (مجمع البیان وکذافی تفسیر البیضاوی جلد ۴ ص ۲۸۶ طبع ایران) اور ممکن ہے کہ مطلب یہ ہو کہ نہ پہلی آسمانی کتب اس کتاب کی تکذیب کرتی ہیں اور نہ بعد میں کوئی ایسی کتاب و شریعت آئے گی جو اسے جھٹلائے۔ اور اس کے احکام کو منسوخ قرار دے۔ جیسا کہ تفسیر قمی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ لایاتیہ الباطل من قبل التوراۃ ولا من قبل الانجیل والزبور ولا من خلفہ ای لایاتیہ من بعدہ کتاب یبطلہ۔ لہٰذا ان وجوہ سے معلوم ہو گیا کہ یہ آیت مبارکہ بھی تحریف کی نفی پر قطعی دلالت نہیں کرتی (ایسا ہی تفسیر کبیر رازی ج ۷ ص ۳۶۳ طبع مصر پر مذکور ہے)

ایک وہم کا ازالہ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس طرح تحریف کا قول اختیار کرنے سے قرآن سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اور تمام قرآن مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وہم کا اوپر بھی اجمالاً ازالہ کیا جا چکا ہے۔ پھر واضح کیا جاتا ہے کہ اگر تحریف کا اس طرح اعتقاد رکھا جائے جس میں مقاماتِ تحریف کی تعیین و نشاندہی نہ کی گئی ہو تو بے شک اس طرح یہ اعتقاد پوری کتاب کو مشکوک اور غیر معتبر بنانے کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ نظریہ اس طرح قائم کیا جائے۔ کہ مواردِ تحریف اور تحریف کی نوعیت کا کسی طرح علم ہو جائے تو اس سے باقی ماندہ حصص و اجزاء کے اعتبار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو علماء تحریف کے قائل ہیں ان کے نظریہ کی یہی کیفیت ہے۔ روایاتِ تحریف دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ کہ قرآن میں تحریف واقع ہوئی ہے۔ اور دوسری قسم میں یہ تصریح کی گئی ہے۔ کہ کن سورتوں اور آیتوں میں کس قسم کی تحریف کی گئی ہے مثلاً یہ کہ فلاں جگہ سے فلاں نام ساقط کیا گیا۔ اور فلاں جگہ سے فلاں جملہ حذف کیا گیا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اس طرح باقی ماندہ حصہ پر اعتماد بحال رہتا ہے۔ خصوصاً جب کہ موجودہ قرآن کی تصدیق و توثیق آئمہ طاہرینؑ نے بھی کر دی ہو۔ جیسا کہ اس مبحث کی ابتداء میں ان کی توثیق و تصدیق پیش کی جا چکی ہے! ان ھذہ تذکرۃ فمن شاء ذکرہ۔

سبعۂ احرف کی توضیح و تشریح

سرکار مصنف علّام نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو یہ حدیث نقل فرمائی ہے۔ کہ قرآن ایک ہے اور ایک خدا کی طرف سے ایک ہی رسول پر نازل ہوا ہے۔ اس حدیث شریف میں اس مشہور نظریہ کی رد مقصود ہے جسے مخالفین کے ہاں بہت شہرت ہے اور ہماری بعض روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ

باب الاعتقاد فی الانبیاء والرسل والحجج والملئکۃ قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی الانبیاء والرسل والحجج

چونتیسواں باب (انبیاء و رسل ملائکہ اور حجج ہائے خداوندی کے متعلق عقیدہ۔ حضرت شیخ ابوجعفر فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء و مرسلین اور حجج ہائے رب العالمین

کی طرف منسوب ہے کہ آپ نے فرمایا۔ ان القرآن نزل علی سبعۃ احرف کلہا کاف وشاف "یعنی قرآن مجید سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کافی وشافی ہے،، پھر ان احادیث کا صحیح مفہوم متعین کرتے ہیں علماء کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ سیوطی نے رسالہ تحبیر میں پندرہ قول نقل کیے ہیں اور بقول صاحب حدیقۂ سلطانیہ بعض علمائے اہل سنت نے اس کے متعلق چالیس قول نقل کیے ہیں۔ لیکن ان اقوال میں زیادہ مشہور دو قول ہیں۔ اول۔ یہ کہ سبعۂ احرف سے مراد قراء سبعہ کا اختلاف قرأت ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد اختلاف لغات ہے یعنی قرآن مجید عرب کے مختلف لغات پر نازل ہوا ہے کچھ قریش کی لغت پر، کچھ ہذیل کچھ ہوازن اور کچھ یمن وغیرہ کی لغت پر۔ بنابر صحت حدیث ہماری بعض احادیث میں اس کے ایک اور معنی بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے فرمایا قرآن مجید سات اقسام پر نازل ہوا ہے۔ وہ سات اقسام یہ ہیں۔ امر۔ زجر۔ ترغیب ترھیب۔ امثال۔ جدل۔ قصص (حدیقۂ سلطانیہ) اس معنی کی تائید بعض احادیث عامہ سے بھی ہوتی ہے چنانچہ بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا۔ کانت الکتب الاول تنزل من باب واحد ونزل القرآن علی سبعۃ احرف زجر و امر وحلال وحرام ومحکم ومتشابہ و امثال۔ یعنی سابقہ آسمانی کتب ایک ہی قسم پر نازل ہوتی تھیں۔ مگر قرآن سات اقسام پر نازل ہوا ہے۔ زجر۔ امر حلال۔ حرام۔ محکم۔ متشابہ۔ امثال۔ بعض روایات منقولہ از آئمہ علیہم السلام میں سبعۂ احرف کی تفسیر سبعۂ ابطن کے ساتھ بھی کی گئی ہے۔ یعنی قرآن کے سات بطون ہیں ایک ظاہری معنی ہیں۔ اور دوسرے باطنی اور پھر باطن کا باطن۔ وعلی ہذا القیاس اس کے سات بطن ہیں۔

اس نظریہ کا ابطال

مگر ہماری روایات معتبرہ میں اس نظریہ کا رد کیا گیا ہے اور بہ تصریح کی گئی ہے کہ قرآن ایک ہی حرف پر نازل ہوا ہے۔ چنانچہ صحیحہ فضیل بن یسار میں وارد ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا۔ دشمنانِ خدا جھوٹ کہتے ہیں۔ بلکہ قرآن ایک ہی حرف پر اترا ہے۔ اور بروایت جناب زرارہ بن اعین حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

انّهم افضل من الملٰئكة وقول الملٰئكة لله عزّوجلّ لما قال لهم انّي جاعل في الارض خليفة

(یعنی آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین فرشتوں سے افضل و اشرف ہیں۔ اس لئے کہ جب خداوند عالم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ "میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ (توجراً)

سے مروی ہے۔ فرمایا ان القرآن واحد نزل من عند واحد ولکن الاختلاف یجیئ من قبل الرواة۔ قرآن ایک ہے اور ایک ہی ذات کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ لیکن اس میں جو اختلاف (الفاظ) پایا جاتا ہے۔ یہ راویوں اور قاریوں کی طرف سے ہے۔ اور یہی نظریہ ہمارے علمائے اعلام میں مشہور و معروف ہے۔ شیخ الطائفہ شیخ طوسیؒ قدس سرہ القدوسی مقدمہ تبیان میں فرماتے ہیں۔ واعلموا ان المعروف من مذهب اصحابنا والشائع من اخبارهم ورواياتهم ان القرآن نزل بحرف واحد على نبي واحد۔ جاننا چاہیئے کہ ہمارے علماء کا مشہور نظریہ جس پر ان کی مشہور روایات دلالت کرتی ہیں۔ یہ ہے کہ قرآن یک حرف پر اور ایک ہی نبیؐ پر نازل ہوا ہے۔ ویسے قرآن کے اقسام کا ہفتگانہ یا اس سے کم و بیش ہونا یا اس کے سات یا اس سے بھی زائد بطون کا ہونا دوسری روایات سے ثابت ہے اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کی روایات مقدمہ تفسیر موسوم مرآة الانوار و مراٰة اور تفسیر برہان میں موجود ہیں واللہ العالم بحقائق الامور۔

"مسئلہ تحریف قرآن،، کی اہمیت کے پیش نظر عنان بیان کو قدرے دراز کرنا پڑ گیا۔ جس کی وجہ سے یہ باب غیر معمولی طور پر طویل ہو گیا۔ اب دوسرے متعلقہ مباحث پر تفصیل کے ساتھ گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ صرف چند اشارات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

حضرت علیؑ امیر المومنین ہیں

جہاں تک ابوالائمہ حضرت علیؑ کو بحکم ایزدی جناب رسولؐ خدا کے دور امیر المومنینؑ، قائد الغر المحجلین، جیسے جلیل القدر لقب عطا کرنے کا تعلق ہے۔ اس باب میں کتب فریقین میں بکثرت احادیث موجود ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ (مناقب ابن مردویہ، ینابیع المودة وغیرہ)

بحکم الٰہی جناب امیرؑ کا ازدواج

اس طرح رب جلیل کا جناب رسولؐ خدا کو حکم دینا کہ میں نے آسمانوں پر حضرت علیؑ کا نکاح جناب سیدۂ عالمؑ سے کر دیا ہے تم زمین پر اس کو عملی جامہ پہنا دو۔ اس کے متعلق بھی کتب فریقین میں بکثرت اخبار و آثار موجود ہیں۔ (ملاحظہ ہوں۔ ینابیع المودة، ارجح المطالب وغیرہ)

[illegible]

قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدمآء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک قال انی اعلم مالا تعلمون ھو التمنی والمتمنی فیھا

فرشتوں نے کہا اے پروردگار! تو ایسے شخص کو زمین میں خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے گا، حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالےٰ نے فرمایا۔ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے فرشتوں کی اس گفتگو سے ظاہر ہے کہ وہ ایک تمنا رکھتے ہیں اور وہ تمنا

کیجائے تو اس کے لیئے تو کئی مجلدات درکار ہیں لیکن اگر اجمال و اختصار سے کام لیا جائے تو حقیقت دین کو صرف دو جملوں میں بیان کیا جا سکتا ہے "التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ" "حکم خدا کی تعظیم اور مخلوق خدا پر شفقت و رأفت" (جیسا کہ جناب امیر علیہ السلام کی طرف منسوب ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کے دو اہم شعبے ہیں۔ علم الاخلاق کی اصطلاح کے مطابق ایک کا نام "حقوق اللہ" اور دوسرے کا نام "حقوق الناس" ہے۔ اور یہ دوسرا شعبہ پہلے سے زیادہ اہم ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں مبحث حساب میں بھی اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ سرکار محمد و آل محمد علیہ وعلیہم السلام نے لوگوں کے ساتھ خوشگوار مراسم استوار کرنے اور ان کے حقوق کو ادا کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ جناب رسول خدا فرماتے ہیں۔ احب لاخیک ما تحب لنفسک اپنے برادر (دینی) کے لیئے وہ کچھ پسند کرو جو اپنے لیئے پسند کرتے ہیں۔ واکرہ لاخیک ما تکرہ لنفسک۔ اور اپنے بھائی کے لیئے وہ کچھ ناپسند کرو۔ جو کچھ خود ناپسند کرتے ہو (خصائل شیخ صدوق)۔ جناب امیر المومنین فرماتے ہیں۔ عاشروا الناس عشرۃ اذا غبتم حنوا الیکم واذا متم بکوا علیکم (نہج البلاغہ) لوگوں کے ساتھ اس طرح زندگی بسر کرو کہ اگر کبھی چند روز کے لیئے چلے جاؤ تو ان کے دل تمہاری طرف کھچتے ہوئے نظر آئیں اور جب مر جاؤ تو اشک غم بہاتے ہوئے دکھائی دیں۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ لا یعرف المرأ بکثرۃ الصوم والصلوٰۃ بل یعرف بالمعاملات۔ انسان کی انسانیت کا جوہر نماز و روزہ کی کثرت سے نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے سے ظاہر ہوتا ہے (ثالث الاخبار) خلاصۂ کلام اینکہ

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است ؛ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

آیات متشابہات کی تاویل لازم ہے

کتاب کے ابتدائی مباحث میں آیات متشابہات کی مناسب تاویل کے لزوم پر تبصرہ کیا

منزلة آدم و لم يتمنوا الامنزلة فوق منزلتهم والعلم يوجب الفضيلة قال الله تعالىٰ وعلم آدم الاسماء كلها ثم عرضهم

حضرت آدمؑ کی منزلت ان کے مرتبہ کا حاصل کرنا ظاہر ہے کہ فرشتوں نے اسی مرتبہ کی تمنا ظاہر کی تھی۔ جو ان کے اپنے مرتبہ و مقام سے بلند تر تھا۔

جا چکا ہے۔ کہ جب کوئی آیت بظاہر مسلمات عقل و شرع سے متصادم معلوم ہوتی ہو تو اس کی ایسی تاویل کرنا کہ وہ تصادم و تعارض ختم ہو جائے واجب و لازم ہے۔ اسی قاعدہ کلیہ کی ایک فرد کی طرف جناب مصنف علامؒ نے اشارہ کیا ہے۔ چونکہ جناب پیغمبر اسلامؐ کی عصمت و طہارت دلائل عقلیہ و نقلیہ سے ثابت ہے۔ اس لئے اگر کوئی متشابہ آیت یا روایت بظاہر منافی عصمت معلوم ہو جیسا کہ بعض آیات کی متن رسالہ میں نشاندہی کی گئی ہے۔ تو اس کی تاویل واجب ہو گی۔ اور وہ تاویل جو جناب مصنف نے بیان کی ہے۔ (ایاک اعنی واسمعی یا جارۃ) یہ کئی روایات میں حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت امام رضاؑ سے مروی ہے کہ بظاہر خطاب جناب رسول خداؐ کو ہے مگر سمجھانا امت کو مقصود ہے کہ شرک وہ گناہ عظیم ہے کہ اگر بفرض محال رسول خداؐ (جو بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کے مصداق ہیں) بھی اس کا ارتکاب کریں تو ان کے اعمال اکارت ہو جائیں گے۔ تم کس باغ کی مولی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرز بیان سے شرک کی شناعت و قباحت ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہی منشائے قدرت ہے

افضلیت خاتم الانبیاءؐ مصنف علامؒ نے اس باب میں یہ بھی بیان کیا ہے۔ کہ آنحضرتؐ سب انبیاء سے افضل اور ان کی حقیقی امت (یعنی شیعیان اہل بیتؑ) تمام امتوں سے افضل ہے۔ اس موضوع پر پینتیسواں[۳۵] باب میں مکمل تبصرہ کیا جائے گا انشاء۔ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

چونتیسواں باب انبیاء و اوصیاء کی ملائکہ پر افضلیت کا بیان

دیگر اکثر اسلامی مسائل کی طرح مسئلہ افضلیت انبیاء و اوصیاء بر ملائکہ میں بھی اہل اسلام کے درمیان قدرے اختلاف ہے۔ چنانچہ اہل سنت کا فرقہ معتزلہ ملائکہ کو انبیاء سے افضل سمجھتا ہے اور بعض مسلمان (ابو عبداللہ حلیمی و قاضی ابوبکر باقلانی) تفصیل کے قائل ہیں۔ بایں طور کہ ملائکہ سماوی انبیاء سے افضل ہیں۔

علی الملٰئکۃ فقال انبئونی باسمآء ھؤلاء ان کنتم صٰدقین قالوا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

اے فرشتو! اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ذرا ان کے نام تو بتا دو۔ فرشتوں نے عرض کیا۔ اے مالک! پاک ہے تیری ذات۔ ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے۔ بتحقیق تو بڑے علم و حکمت والا ہے۔

اور ملائکہ ارضی سے انبیاء افضل ہیں۔ اور بعض لوگ اس مسئلہ میں متوقف ہیں۔ یعنی کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دیتے لیکن تمام حضرات شیعہ خیر البریہ اور جمہور اہل سنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاء و مرسلین تمام ملائکہ کروبین و روحانیین ارضی و سماوی سے افضل و اشرف ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ مفیدؒ کتاب اوائل المقالات میں رقمطراز ہیں۔ اتفقت الامامیۃ علی ان انبیاء اللہ تعالیٰ عزوجل ورسلہ من البشر افضل من الملٰئکۃ واتفقھم علی ذلک اصحاب الحدیث (یعنی فرقہ اثنا عشریہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاء و مرسلین ملائکہ سے افضل ہیں۔ اور اہل سنت میں سے اہل حدیث شیعہ کے ساتھ اس عقیدہ میں متفق ہیں)۔ اس عقیدہ کی صحت و صداقت پر ان دلائل کے علاوہ جو مصنف علام نے پیش کئے ہیں۔ اور بھی بکثرت دلائل و براہین موجود ہیں بنظر اختصار یہاں بعض ادلہ قاطعہ کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے۔

دلیل اول:- اس امر پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ خلاق عالم نے ملائکہ میں قوت شہویہ اور قوت غضبیہ غرضیکہ گناہ کرنے کی کوئی قوت پیدا نہیں فرمائی۔ لہٰذا ان کی عصمت اضطراری اور غیر اختیاری ہے مگر انبیاء علیہم السلام میں یہ سب قویٰ موجود ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ عصیاں و گناہ نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کی عصمت اختیاری ہوتی ہے۔ وہ اپنے اختیار سے قوت شہویہ و غضبیہ کو قوت عقلیہ ملکیہ کے ماتحت کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی اطاعت گذاری و عبادت شعاری میں محنت و مشقت زیادہ ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ افضل الاعمال احمزھا۔ تمام اعمال سے افضل وہ عمل ہوتا ہے جس میں مشقت زیادہ ہو۔ لہٰذا [illegible]بادت واطاعت زیادہ دشوار ہوگی۔ وہ یقیناً افضل و اشرف ہوں گے۔ اسی بنا پر ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں۔ کہ انبیاءؑ و آئمہؑ کی شان تو بہت اجل و ارفع ہے۔ عام افراد امت میں سے جو لوگ مؤمن کامل ہیں یعنی صحت عقائد کے ساتھ ساتھ خداوند عالم کی عبادت و اطاعت کرتے ہیں اور اس کی معصیت و نافرمانی سے اجتناب کرتے ہیں وہ بھی ملائکہ سے ہیں۔ اسی لئے آئمہ طاہرینؑ کا ارشاد ہے۔ ان الملائکۃ لخدامنا وخدام محبینا (بحار الانوار) فرشتے ہمارے بلکہ ہمارے خالص محبوں کے

قال یا ادم انبئھم باسمآئھم فلما انبئھم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض واعلم ما تبدون وما کنتم

پھر حضرت آدمؑ کو فرمایا۔ تم انہیں ان کے ناموں سے آگاہ کرو۔ چنانچہ جب حضرت آدمؑ نے ان کے نام بتا دیئے تو خدا تعالٰے نے فرمایا۔ اے فرشتو! کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کے مخفی امور کو جانتا ہوں۔ اور ان باتوں کو بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو۔"

بھی خدمت گذار ہیں۔

دلیل دوم:۔ یہ امر اپنے مقام پر مبرہن ہو چکا ہے کہ ملائکہ کے کمالات و مقامات محدود اور ان کے لئے مزید ترقی کے امکانات غیر موجود ہیں۔ جو سجدہ میں ہیں۔ وہ ہمیشہ سربسجود ہیں۔ جو رکوع میں ہیں وہ ہمیشہ رکوع میں ہیں۔ وعلی ہذا القیاس۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اس کیفیت کی انہی کی زبانی یوں تصویر کشی کی ہے وما منا الا لہ مقام معلوم وانا لنحن الصافون وانا لنحن المسبحون (پ ۲۳ س صافات ۹۶) اور ہم میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے لئے ایک معین ٹھکانا نہ ہو۔ اور یقیناً ہم صف باندھنے والے ہیں۔ اور بیشک ہم تسبیح کرنے والے ہیں۔" (ترجمہ مقبول) ان میں سے ہر ایک کا ایک مقام معلوم ہے اور ایک عبادت مخصوصہ اور مرتبہ معہودہ ہے۔ جس سے آگے تجاوز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جناب امیرالمومنینؑ اسی امر کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔ منھم سجود لا یرکعون و رکوع لا ینتصبون وصافون لا یتزایلون و مسبحون لا یسأمون الخ (نہج البلاغۃ) بعض سربسجدہ ہیں جو کبھی رکوع نہیں کرتے۔ اور بعض اس طرح رکوع میں ہیں۔ کہ کبھی سربلند نہیں کرتے۔ اور بعض یوں صف بستہ ہیں۔ کہ کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے۔ اور بعض یوں تسبیح کناں ہیں۔ کہ انہیں نیند تسبیح و تقدیس سے باز نہیں رکھتی لیکن انبیاء و مرسلین کی ترقی درجات اور تحصیل کمالات کے امکانات غیر محدود ہیں۔ وہ ترقی کرتے کرتے خالق کے مرتبہ کو تو نہیں پہنچ سکتے۔ (ابن التراب ورب الارباب) لیکن جناب جبرئیل کو کہنا پڑتا ہے۔ لو دنوت انملۃ لاحترقت۔ اے رسولؐ آپ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ اگر میں اپنی جگہ سے ایک پور کے برابر بھی آگے بڑھوں تو میرے پر جل جائیں۔ ؎ اگر یک سرموئے برتر پرم ؛ فروغ تجلی بسوزد پرم

ارباب عقل و دانش جانتے ہیں کہ جن کی ترقی کے امکانات غیر محدود ہوں۔ وہ یقیناً ان سے افضل و اشرف ہوں گے۔ جن کی ترقی کے وسائل و حدود محصور و محدود ہوں گے۔

دلیل سوم:۔ پیغمبر اسلامؐ کی تصریحات موجود ہیں۔ کہ انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں۔ چنانچہ علامہ جزائری علیہ الرحمۃ

تکتمون فھذا کلہ یوجب تفضیل ادم علی الملائکۃ وھو نبی لھم لقول اللہ عزوجل انبئھم

تم فرشتوں کو ان (بزرگوں) کے نام بتاؤ۔

ان سب باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ فرشتوں سے افضل ہیں، علاوہ بریں وہ فرشتوں کے نبی تھے جیسا کہ خدا تعالیٰ کے اس ارشاد سے ثابت ہے کہ اے آدمؑ

انوار نعمانیہ میں جناب امام رضا علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ جناب امیر المومنینؑ نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے دریافت کیا۔ انت افضل او جبرئیل، یا رسول اللہ آپ افضل ہیں یا جبرئیل؟ آپ نے فرمایا یا علی ان اللہ فضل انبیاءہ المرسلین علی ملائکتہ المقربین و فضلنی علی جمیع النبیین والمرسلین والفضل بعدی لک یا علی وللائمۃ من بعدک وان الملائکۃ لخدامنا و خدام محبینا یا علی الذین یحملون العرش ومن حولہ یسبحون بحمد ربھم و یستغفرون للذین امنوا بولایتنا یا علی لولا نحن ماخلق اللہ آدم ولا حوا ولا الجنۃ ولا النار ولا السماء ولا الارض فکیف لا نکون افضل من الملائکۃ۔ (کذا فی عیون اخبار الرضا)

یا علیؑ خداوند عالم نے اپنے تمام انبیاء و مرسلین کو ملائکہ مقربین سے افضل قرار دیا ہے اور مجھے تمام انبیاء و مرسلین پر بھی افضلیت عطا فرمائی ہے۔ (لہٰذا میں تو بطریق اولیٰ ملائکہ سے افضل ہوں گا) یا علیؑ میرے بعد یہ افضلیت تجھے اور تیرے بعد آنے والے دوسرے آئمہ طاہرینؑ کو حاصل ہے۔ بتحقیق ملائکہ ہمارے اور ہمارے محبت داروں کے خادم ہیں، یا علیؑ جو ملائکہ حاملِ عرش ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں وہ خداعزوجل کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں، اور ان لوگوں کے لئے طلبِ مغفرت کرتے ہیں جو ہماری ولایت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یا علیؑ اگر ہم نہ ہوتے تو خداعزوجل آدمؑ و حوا۔ جنت و دوزخ اور آسمان و زمین میں سے کسی شے کو پیدا نہ کرتا، وریں حالات ہم کس طرح ملائکہ سے افضل نہ ہوں گے!

لہٰذا بعد ازیں بھی یہ کہنا کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں، یہ تکذیب رسولؐ نہیں تو اور کیا ہے۔ وربک لایؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

دلیل چہارم ۔ خلاق عالم سورۂ انعام میں حضرت نوحؑ۔ لوطؑ۔ ابراہیمؑ۔ یعقوبؑ۔ اسحاقؑ۔ داؤدؑ۔ سلیمانؑ۔ موسیٰؑ۔ ہارونؑ۔ ذکریاؑ۔ یحییٰؑ اور عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر کر کے ارشاد فرماتا ہے۔ وکلا فضلنا علی العالمین۔ یعنی ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔ ظاہر ہے کہ عالمین میں فرشتے بھی داخل ہیں تو واضح ہے کہ جو تمام عالمین سے افضل ہوگا وہ یقیناً ملائکہ سے بھی افضل ہوگا۔ لہٰذا معلوم

باسمائهم ومما یثبت تفضیل ادم علی الملئکة امر اللہ الملئکة بالسجود لادم لقولہ تعٰ فسجد الملئکة

منجملہ ان چیزوں کے جو جناب آدمؑ کی افضلیت ثابت کرتی ہیں ایک یہ ہے کہ خدا نے فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔

ہوا کہ انبیاء کرام ملائکہ عظام سے افضل ہیں۔ وھو المقصود

دلیل پنجم:۔ ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ افضلیت کا معیار و میزان علم وعمل کی کثرت اور زیادتی ہے جیسا کہ قرآن میں قصۂ طالوتؑ سے بھی ظاہر و ہویدا ہے کہ جب قوم نے ان کی قیادت و امارت پر اعتراض کیا تو خدائے حکیم نے یہ فرما کر ان کا ناطقہ بند کیا کہ ان اللہ اصطفاہ علیکم وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم۔ کہ خدا نے ان کو اس لئے منتخب کیا ہے کہ ان کا علم اور جسمانی طاقت زیادہ ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کا بھی یہی مفاد ہے۔ اگر اس معیار و میزان پر انبیاء کا موازنہ کیا جائے تو یقیناً انبیاء اور اوصیاء کا پلہ بھاری نظر آئے گا۔ ان کے عمل کی برتری سطور بالا میں واضح کی جا چکی ہے۔ اور ان کے علم کی برتری قصہ حضرت آدمؑ سے واضح ہے جو کہ متن رسالہ میں مذکور ہے۔

ازالہ شبہ افضلیت انبیاء کے منکرین عموماً دو شبہے پیش کیا کرتے ہیں۔ ایک تو وہی ہے جس کا مصنف علام نے ذکر کر کے جواب بھی دے دیا ہے۔ اور دوسرا شبہ یہ ہے کہ ملائکہ کی خلقت نور سے ہے اور انبیاء کی طین (مٹی) سے اور چونکہ نور طین سے افضل ہے۔ لہٰذا ملائکہ انبیاء سے افضل ہوں گے۔ اس شبہ کا کئی طرح جواب دیا جا سکتا ہے۔

یہ شبہ اسلامی حقائق سے بے بہرہ ہونے کی پیداوار معلوم ہوتا ہے ورنہ اسلامی حقائق پر وسیع اور عمیق نظر رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اسلام میں افضلیت کا معیار و میزان کسی چیز کی ماہیت اور ذات نہیں بلکہ اس کی صفات یعنی علم وعمل ہیں (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) ——————

خداوند عالم نے تو اس امر کا فیصلہ ابتدائے آفرینش میں نوری مخلوق کی گردنیں طینی مخلوق کے سامنے خم کرا کے کر دیا تھا کہ معیار فضیلت ماہیت اور مادۂ خلقت نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ اگر معیار وہی ہوتا جس کا اظہار اس شبہ میں کیا گیا ہے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ یعنی پھر تو حضرت آدمؑ کی گردن فرشتوں کے سامنے خم ہوتی ہاں البتہ اس معیار کا اظہار اس روز شیطان نے ضرور کیا تھا۔ جس کی پاداش میں راندہ بارگاہ قرار پایا اور ابدی لعنت کا طوق گردن میں ڈلوایا۔ البتہ وہ ایک ایسی غلط بنیاد قائم کرنے میں کامیاب ضرور ہو گیا۔

كلهم اجمعون ولم يأمر الله عزّ وجلّ بالسجود الا لمن هو افضل منهم وكان سجودهم لله۔

ظاہر ہے کہ خداوند عالم نے اسی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تھا۔ جو ان سے افضل تھا۔ فرشتوں کا یہ سجدہ خدا کے لئے بندگی و اطاعت

کہ آج تک برابر اکثر لوگ ربانی معیار کو نظر انداز کر کے اسی شیطانی معیار کا راگ الاپتے ہیں۔

دوسرا جواب بنا بر تسلیم اینکہ تمام ملائکہ کی خلقت محض نور سے ہوئی ہے۔ یہ کہنا بہرحال خلاف حقیقت ہے کہ انبیاء و اوصیاء کی خلقت محض طینت سے ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ بات اپنے مقام پر عقل ونقل کی روشنی میں ثابت کی جا چکی ہے کہ انبیاء رہوں یا ان کے اوصیاء۔ یہ چونکہ خالق و مخلوق کے درمیان وسیلہ ہیں اور وسیلہ کے لئے ذوجنبتین ہونا ضروری ہے۔ ان کا ایک جنبہ نورانی ہوتا ہے اور دوسرا جسمانی یعنی ان کی روح مقدس نورانی ہوتی ہے اور قالب جسمانی۔ اور ان کے یہ دونوں جنبے اس قدر مجلّی ومصفّی ہوتے ہیں کہ جنبۂ نورانی کے اعتبار سے سید الملائکہ نظر آتے ہیں اور جنبۂ جسمانی کے لحاظ سے خیر البشر (من ابیٰ فقد کفر) بنا بریں یہ مقابلہ ومفاضلہ صرف نورانی اور جسمانی تک میں نہیں۔ بلکہ ایک طرف فقط نورانیت ہے اور دوسری طرف نورانیت وجسمانیت دونوں ہیں اور ظاہر ہے۔ کہ اگر ایک طرف فقط نور اور دوسری طرف نور اور جسم دونوں ہوں۔ اور جسمانیت روحانیت کے محکوم اور تابع ہو۔ تو اس صورت میں عقل سلیم محض نورانی کے مقابلہ میں اسی شئی کو ترجیح دے گی۔ جو نورانیت وجسمانیت دونوں کی جامع ہو۔ ان حقائق سے معلوم ہوا۔ کہ انبیاء علیہم السلام بشریت وملکیت دونوں کے جامع ہوتے ہیں اور ان کی قوتِ نورانیہ روحانیہ ملائکہ کی نورانیت وروحانیت سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ فرشتوں سے افضل ہوں گے۔

تیسرا جواب بنا بر تنزل ہم کہتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انبیاءؑ و اوصیاءؑ کی خلقت صرف طین سے ہی ہوئی ہے۔ اور اس میں کوئی عنصر نور شامل نہیں ہوتا۔ تو تاہم معترض کو بھی ماننا پڑے گا۔ کہ ان کے ساتھ روح نبوتی وامامتی موجود ہوتی ہے۔ جو نصِ قرآنی نورانی ہے ولکن جعلناه نوراً نهدی به من نشاء (سورہ شوریٰ پ ۲۵ ع ۶) ہم نے اس کو ایک نور قرار دیا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت کر دیں (ترجمہ مقبولؒ) لہٰذا وہ اسی نور نبوتی کی وجہ سے ملائکہ سے افضل واشرف قرار پاتے ہیں۔ حضرت صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ شیطان نے اپنی نارےت کا جناب آدمؑ کی طینت کے ساتھ قیاس کیا تھا۔ اگر وہ اپنی نارےت کا آدمؑ کی

عزّوجلّ عبودیۃ وطاعۃ ولآدم اکراماً لما اودع اللّٰہ فی صلبہ من النبیؐ والائمۃؑ وقال النبیؐ انا افضل من جبرئیل ومیکائیل واسرافیل

اور آدمؑ کے لئے باعثِ تکریم تھا کیونکہ ان کی صلب میں جنابِ رسولِ خدا اور آئمہ ہدیٰؑ کے انوار ودیعت کئے گئے تھے۔ جنابِ رسولِ خدا فرماتے ہیں۔ میں جبرئیل ومیکائیل واسرافیل،

نورانیت کے ساتھ تقابل کرتا تو اس پر آدمؑ کی افضلیت اجاگر ہو جاتی (اصول کافی) یہی کیفیت افضلیت انبیاء بر ملائکہ کے منکرین کی ہے۔ ان پر شاعر کا یہ شعر پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔

وقل للذی یدعی فی العلم فلسفۃ　　　حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء

تصویر کے دونوں رُخ دیکھ کر جو فیصلہ کیا جائے وہ صحیح اور مکمل ہوتا ہے۔ ورنہ ناقص اور ادھورا۔ واللّٰہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

سجدۂ تعظیمی کا ناجائز ہونا

چونکہ رسالہ اعتقادیہ میں غیر خدا کے لئے سجدۂ تعظیمی کا ضمناً ذکر آگیا ہے اور یہ ایک عامۃ البلوی مسئلہ ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر یہاں کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔ سو مخفی نہ رہے کہ سجدۂ تعبیدی (عبادتی) کے غیر خدا کے لئے ناجائز ہونے پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ حضرت علامہ فخر الدین رازی وغیرہ علماء فریقین نے اس کا ادعا کیا ہے۔ ہاں غیر اللہ کے لئے جب کہ وہ غیر اللہ دینی یا دنیوی بالخصوص پہلے اعتبار سے عظیم المرتبت ہو تو اس کے لئے سجدہ تعظیمی کرنے کے جواز یا عدم جواز میں قدرے اختلاف ہے۔ بعض لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ مگر تمام شیعہ علمائے محققین اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم، احادیث سید المرسلینؐ ارشادات آئمہ طاہرینؑ اور عقل سلیم سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

سجدۂ تعظیمی کا عدم جواز ازروئے قرآن کریم

قرآن مجید سے اس سجدہ کے عدم جواز کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ قرآن میں علی الاطلاق جہاں بھی سجدہ کا حکم ہے۔ وہاں خدا کے لئے ہے (الا فی موضعین سیأتی توضیحہا) جیسے فاسجدوا للّٰہ۔ اللہ کے لئے سجدہ کرو۔ اور ولیسجد للّٰہ من فی السمٰوات ومن فی الارض۔ آسمان وزمین کی مخلوق خدا کے لئے سجدہ کرتی ہے۔ فاسجدوا للّٰہ واعبدوہ۔ خدا کے لئے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔ لہٰذا ازروئے قرآن ہر قسم کا سجدہ خواہ وہ تعبیدی ہو اور خواہ تعظیمی ذاتِ ذوالجلال کے ساتھ مختص ہے۔ نیز مندرجہ ذیل آیت مبارکہ ہر قسم کے سجدہ کے ذات احدیت کے ساتھ مختص ہونے پر بطور نص صریح

ومن جميع الملٰئكة المقربين وانا خير البرية وسيد ولد آدم واما قول الله عزّوجلّ لن يستنكف المسيح يكون عبدًا لله والملٰئكة المقربون فليس ذالك بموجب لتفضيلهم على عيسىٰ وانما قال الله ذلك لان الناس منهم من كان يعتقد ان الربوبية لعيسىٰ و يتعبد له وهم صنف من النصارى ومنهم من عبد الملٰئكة وهم الصابئون وغيرهم وقال الله

بلکہ تمام ملائکہ مقربین سے افضل و برتر ہوں۔ نیز فرمایا میں تمام کائنات سے افضل اور تمام اولادِ آدمؑ کا سید و سردار ہوں۔ خدا کے اس قول لن یستنکف المسیح۔ یعنی عیسیٰ بن مریم خدا کا بندہ ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ اور نہ ہی ملائکہ مقربین اس کا انکار کرتے۔ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فرشتے حضرت عیسیٰؑ سے افضل تھے۔ یہ تو خدا نے اس وجہ سے فرمایا کہ نصاریٰ میں سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰؑ ان کے پروردگار ہیں۔ اور وہ ان کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ صابئین وغیرہم ایسے بھی تھے جو فرشتوں کی پوجا کرتے تھے (لہٰذا ان دونوں فرقوں کے عقائد کی رد کرنا مقصود تھی) خدا نے اپنے اس قول سے جتلا دیا۔

دلالت کرتی ہے۔ ارشاد قدرت ہے۔ وان المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللّٰہ احدا۔ (پ ۲۹ س جن ۲-۱) یقیناً سجدہ گاہیں اللہ کے لئے ہیں۔ پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔ تفسیر صافی ص ۵۱۱ میں بحوالہ من لا یحضرہ الفقیہ حضرت امیر المومنینؑ سے منقول ہے فرمایا المساجد سے مراد اعضائے سجدہ ہیں یعنی پیشانی۔ دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور پاؤں کے دونوں انگوٹھے۔ اسی مضمون کی روایات اصول کافی میں جناب امام جعفر صادقؑ سے اور تفسیر عیاشی میں امام محمد تقی علیہ السلام سے مروی ہے۔ نیز تفسیر قمی میں بھی یہی مضمون موجود ہے۔ محقق شیخ بہائی علیہ الرحمۃ اربعین میں بذیل شرح حدیث ہفتم لکھتے ہیں۔ معتصم عباسی نے حضرت امام رضاؑ سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔ ومعنی فلا تدعوا مع اللّٰہ احدا فلا تشرکوا معہ غیرہ فی سجودکم علیہا۔ یعنی فلا تدعوا مع اللّٰہ احدا کا مطلب یہ ہے کہ ان اعضا پر سجدہ کرنے میں خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

سجدہ تعظیمی کا عدم جواز از روئے احادیث سید المرسلین

جو امر قرآن کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے احادیث نبویہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے وہ اس طرح کہ بکثرت روایات میں اس تعظیمی سجدہ کی خصوصی

عزّ وجلّ لن یستنکف المسیح ان یکون عبد اللہ ای لا یستنکف المسیح والمعبودون دونی ان یکون اعباداً لی والملئکۃ روحانیون معصومون لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون لا یأکلون ولا یشربون ولا یألمون ولا یسقمون ولا یشیبون ولا یھرمون طعامھم وشرابھم التسبیح والتقدیس وعیشھم

کہ مسیح اور وہ لوگ جو میرے سوا معبود خیال کئے جاتے ہیں۔ وہ تمام اپنے آپ کو میرا بندہ ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ اور نہ اس میں اپنے لئے کوئی عار محسوس کرتے ہیں۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تمام فرشتے روحانی اور معصوم مخلوق ہیں۔ خدا نے جن باتوں کا انہیں حکم دیا ہے۔ ان میں وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ بلکہ وہ وہی کرتے ہیں جس بات کا انہیں حکم دیا گیا ہے۔ وہ نہ تو کچھ کھاتے ہیں اور نہ کچھ پیتے ہیں۔ نہ انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ اور نہ بیمار ہوتے ہیں۔ اور نہ انہیں بڑھاپا آتا ہے۔ ان کا کھانا پینا خدا کی تسبیح و تقدیس ہے ان کی زندگی کا دارومدار

ممانعت وارد ہوئی ہے۔ بنا بر اختصار دو تین واقعات و روایات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے (۱) اصول کافی میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک اعرابی سوسمار کو بغل میں دبائے ہوئے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا اے محمدؐ! اگر میری یہ سوسمار بول کر آپ کی نبوت کی شہادت دے دے۔ تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ چنانچہ اسی وقت سوسمار باعجاز نبوت گویا ہو گئی۔ اور فصیح عربی میں کہا۔ اشھد انک رسول اللہ و خاتم النبیین۔ اعرابی نے کلمۂ شہادت پڑھا اور عربوں کے دستور کے مطابق چاہا کہ آنحضرتؐ کو سجدہ کرے۔ مگر آنحضرتؐ نے یہ فرما کر کہ اگر غیر خدا کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں۔ اسے سجدہ کرنے سے روک دیا۔ پس جب آنحضرتؐ ایسی بزرگ و برتر ہستی کو جو "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کی مصداق ہے۔ بحین حیات میں سجدہ تعظیمی جائز نہیں۔ تو پھر کسی اور بزرگ کو اور وہ بھی بعد از مرگ کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ یہ خیال بھی نہ کیا جائے۔ کہ شاید وہ اعرابی آپ کو سجدۂ عبادتی کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ خلاف ظاہر ہے۔ وہ ابھی ابھی کلمۂ توحید پڑھ چکا تھا۔ لہٰذا واضح ہے کہ وہ آنحضرتؐ کو معبود نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ نبی و رسول ہی سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس کا یہ اقدام یقیناً سجدہ تعظیمی پر ہی محمول ہوگا۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپؐ کو سجدہ کرنے کی خواہش کی۔ آپ نے اس کو ممانعت کرتے ہوئے فرمایا۔ فلا تسجد لی واسجد للحی الذی لا یموت۔ تم مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ کو اسی ذات کے لئے مخصوص رکھو جو ہمیشہ زندہ

من نسیم العرش وتلذذھم بانواع العلوم خلقھم اللّٰہ تعالیٰ بقدرتہ انواراً وارواحاً کما شاء واراد ولکل صنف منھم تحفظ نوعاً مما خلق وقلنا بتفضیل من فضلنا۔

عرش کی ہوا پر منحصر ہے۔ اور ان کی لذت و فرحت انواع و اقسام کے علوم میں ہے۔ خدا نے جیسا چاہا۔ اپنی قدرت سے انہیں نور و روح بنا کر پیدا کیا۔ اور ان میں سے ہر ایک گروہ دیگر مخلوقات کی علیحدہ علیحدہ ہر ہر نوع کی حفاظت کرتا ہے۔ ہم نے جن بزرگواروں (انبیاءؑ و آئمہؑ) کو ملائکہ پر فضیلت دی ہے۔

رہنے والی ہے اور جس کے لئے کبھی فنا اور موت نہیں ہے (دیلمی۔ کنز العمال) (۳) اسی بنا پر آپ دعا میں فرمایا کرتے تھے۔ اللھم لا تجعل قبری وثناً یعبد۔ اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا جس کی پوجا کی جائے۔ (موطائے مالک و ج ششم بحار)

سجدۂ تعظیمی کا عدم جواز از روئے ارشادات معصومینؑ

اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ کئی مرتبہ بعض لوگوں نے آئمہ طاہرینؑ کو سجدہ تعظیمی کرنا چاہا مگر معصومینؑ نے بڑی شدت اور سختی کے ساتھ ان کو اس کی ممانعت فرمائی چنانچہ جناب شیخ عباس قمی علیہ الرحمہ نے مفاتیح الجنان میں بذیل زیارت ہفتم جناب امیرؑ بحوالہ کتاب فرحۃ الغری مؤلفہ سید اجل عبدالکریم بن طاؤسؒ ایک طویل روایت درج فرمائی ہے۔ جس میں جناب ابوحمزہ ثمالی کا مسجد کوفہ میں امام ہمام زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں شرفیاب ہونا مذکور ہے۔ ابوحمزہ بیان کرتے ہیں پس خود را انداختم روئے قدمہائے آنحضرتؑ بوسیدم آنرا کہ آنجناب نگذاشت و بادست خود سرم را بلند کرد و فرمود ممکن سجود نشاید مگر برائے خداوند عالم عزوجل: میں آپ کے پاؤں پر گر گیا۔ (جس سے سجدہ کی شکل بن گئی) اور چاہا کہ آپؑ کے قدم مبارک کو بوسہ دوں مگر آنجنابؑ نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔ اور میرے سر کو اپنے دست حق پرست سے بلند کر کے فرمایا۔ ایسا نہ کرو۔ سجدہ سوائے خداوند عالم کے اور کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جناب ابوحمزہ مؤمن و موحد تھا وہ یہ اقدام امام کو معبود سمجھ کر تو نہیں کر رہا تھا بلکہ بغرض تعظیم و تکریم ہی ایسا کرنا چاہتا تھا۔ مگر امام عالی مقام نے اس کی بھی ممانعت کر کے اس کے عدم جواز پر نص قائم کر دی۔ پس جب خود ذات امام عالی مقام کو سجدہ تعظیمی روا نہیں ہے۔ تو ان کے قبور مقدسہ کو کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ بعض روایات میں وارد ہے کہ ایک جاثلیق (پادری) نے حضرت امیر المومنینؑ کی شخصیت سے متاثر ہو کر آپ کو سجدہ کرنا چاہا جناب نے اسے منع کرتے ہوئے فرمایا اسجد للّٰہ تعالیٰ ولا تسجد لی۔

الحالة التی تصیرون الیہا من انواع ما خلق اللہ اعظم وافضل من حال الملئکۃ واللہ اعلم

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو ملائکہ اور دیگر مخلوقاتِ خداوندی سے بڑھ کر فضائل و کمالات حاصل ہیں۔ واللہ اعلم۔

خداوندِ عالم کو سجدہ کر اور مجھے سجدہ نہ کر (عماد الاسلام ج ۱ ص۳۲۵) بعض دعاؤں میں ہر قسم کے سجدہ کو خداوندِ عالم کی ذات کے ساتھ مختص قرار دے کر غیر اللہ کے لئے اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ دعا جو سرکار سید الشہداء علیہ السلام کی دو رکعت نمازِ زیارت کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ اس میں وارد ہے۔ اللھم انی لک صلیت ولک رکعت ولک سجدت وحدک لا شریک لک فانہ لا تجوز الصلوٰۃ والرکوع والسجود الا لک لانک انت اللہ الذی لا الہ الا انت۔ (مفاتیح الجنان وغیرہ) بارالہا! میں نے یہ نماز تیرے ہی لئے پڑھی ہے۔ اور یہ رکوع اور سجود تیرے ہی لئے کئے ہیں۔ کیونکہ سوائے تیرے اور کسی کے لئے نماز، رکوع اور سجود جائز نہیں ہے۔" چونکہ امام عالی مقام کے مشہدِ مقدس میں نماز پڑھنے سے یہ شبہ ہوتا تھا۔ کہ شاید یہ رکوع و سجود امام کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اس لئے معصومینؑ نے حکم دیا۔ کہ اس شبہ کا یہ دعا پڑھ کر ازالہ کرو۔ پس اگر سجدہ تعظیمی غیر خدا کے لئے جائز ہوتا تو دعا میں علی الاطلاق ہر قسم کے رکوع و سجود کو ذاتِ خداوندی میں منحصر نہ کیا جاتا جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کے لئے کسی قسم کا سجدہ جائز نہیں ہے۔ وھو المقصود وقد حصل بعون اللہ الودود۔

سجدۂ تعظیمی کا عدم جواز از روئے عقل سلیم

عقل سلیم کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ کسی بھی قسم کا سجدہ غیر خدا کے لئے جائز نہیں ہونا چاہیئے

کیونکہ سجدہ سے بندے کی انتہائی عاجزی اور تذلل و انکساری ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسی عاجزی و فروتنی کا اظہار سوائے خالقِ جبار کے اور کسی بزرگ کے لئے جائز نہیں ہونا چاہیئے۔ جب کسی قسم کی عبادت غیر خدا کے لئے جائز نہیں تو سجدہ جو راس العبادۃ ہے وہ کیونکر روا ہو سکتا ہے؟ اگرچہ آیات و روایات پیش کرنے کے بعد علمائے اعلام کا کلام نقل کرنے کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں رہتی۔ مگر مزید اطمینانِ قلب کے لئے یہاں بعض اعلام کا کلام بھی پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ عالمِ ربانی شیخ محمد علی اصفہانی تحفۂ امامیہ جلد ۱ ص۶۳ میں رقمطراز ہیں۔ واما سجود از برائے غیر خدا مطلقاً بہر قصد باشد و قصد عبادت ہم نکند ایں سجود شرک فعلی است و سجود مخلوق بغیر ذات الٰہی جائز نیست و شرک است

امام حجۃ المناظرین علی العامہ علامہ السید دلدار علی معروف بسرکار غفران مآبؒ اپنی تصنیف لطیف عماد الاسلام ج ۱ ص ۳۰ طبع لکھنؤ پر رقمطراز ہیں۔ ان السجدۃ لا تجوز لغیر اللہ تعالیٰ اصلاً وان کانت بنیۃ التعظیم للانبیاء مثلاً لانعقاد الاجماع علی حرمتہا مطلقاً۔ سجدہ کسی صورت میں بھی غیر خدا کو جائز نہیں ہے اگرچہ بقصد تعظیم ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس کی حرمتِ مطلقہ پر اجماع قائم ہے۔ حضرت غفران مآبؒ کے کلام حق ترجمان سے واضح وعیاں ہوتا ہے کہ غیر خدا کے لئے سجدہ کی حرمت میں تمام علماء کا اتفاق ہے بعد ازیں بھی اگر کوئی نیم ملا اس کے جواز کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے تو وہ اپنی جہالت وضلالت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اس کے عدم جواز پر اس کی کٹ حجتیوں سے کچھ اثر نہیں پڑتا۔ والحق احق ان یتبع۔

ایک عظیم شبہ کا ازالہ

جو لوگ سجدۂ تعظیمی کو غیر خدا کے لئے جائز سمجھتے ہیں، وہ بموجب والذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ عموماً حضرت آدمؑ کو ملائکہ کے سجدہ کرنے۔ نیز حضرت یوسفؑ کو ان کے والدین اور ان کے بھائیوں کے سجدہ کرنے سے تمسک کیا کرتے رہتے ہیں۔ یہ استدلال بچند وجہ غلط ہے۔

اولاً۔ یہ آیتیں مجمل ہیں۔ ان سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ سجدہ تعبدی تھا یا تعظیمی۔ یا ان حضرات کو قبلہ سمجھ کر خدا تعالیٰ کا سجدہ کیا گیا تھا۔ یا ان کی تقلید و تاسی میں کیا گیا تھا۔ بایں طور کہ حضرت آدمؑ اور حضرت یوسفؑ نے پہلے بطور شکر نعمتِ الٰہی سجدہ کیا۔ پھر ملائکہ اور والدین و برادرانِ یوسفؑ کو بھی ان کی تاسی کا حکم دے دیا گیا۔ یا یہ سجود مطلق انحناء (جھکنے) کے معنی میں ہے جیسا کہ عجمیوں میں تا حال رواج ہے کہ وہ بزرگوں کی جھک کر تعظیم کرتے ہیں۔ تو جن آیات میں اس قدر احتمالاتِ کثیرہ موجود ہوں۔ ان سے کسی مقصد کے اثبات پر استدلال کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ اذا قام الاحتمال بطل الاستدلال۔

ثانیاً۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سجدہ خداوند عالم کی ذات کے لئے تھا۔ مگر جنابِ آدمؑ و یوسفؑ کو محض قبلہ قرار دیا گیا تھا۔ بنابریں اسجدوا لآدم اور خروا لہ سجدا میں "لام" بمعنی "الی" ہے اور عربی زبان میں "لام" بمعنی "الی" استعمال ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ حسان بن ثابت صحابیؓ کے ان اشعار میں جو حضرت امیرؑ کی مدح میں ہیں "لام" بمعنی "الی" ہے۔ ع

ما کنت احسب ان الامر منصرف — عن ہاشم ثم منہا عن ابی حسن

الیس اول من صلی لقبلتکم — واعرف الناس بالقرآن والسنن

یہاں "لقبلتکم" میں جو لام ہے وہ بمعنی "الی" ہے یعنی الی قبلتکم۔ بعض احادیث اہل بیتؑ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حیات القلوب ج ۱ ص ۴۲ پر ایک طویل حدیث کے ضمن میں حضرت امام حسن عسکریؑ

سے مردی ہے۔ فرمایا: نبود سجدۂ ایشاں از برائے آدم بلکہ قبلۂ ایشاں بود از برائے خدا سجدہ می کردند وامر نمود حق تعالیٰ کہ بجانب اُو رُو آورند یعنی ملائکہ کا یہ سجدہ حضرت آدم کے لیے نہ تھا بلکہ سجدہ تو خدا کے لئے تھا البتہ حکمِ خدا سے آدمؑ کو قبلہ بنایا گیا تھا۔ بہت سے علمائے اعلام نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔

ثالثاً۔ اگر اس سجدہ کو تعظیمی بھی قرار دیا جائے۔ جیسا کہ بعض احادیث سے مترشح ہوتا ہے تاہم اس سے ہمارے مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جن شریعتوں میں یہ جائز تھا اب وہ شرائع منسوخ ہو چکے ہیں لہٰذا منسوخ شدہ شریعت کے کسی عمل سے اس شریعت کے کسی مسئلہ پر استدلال نہیں کیا جا سکتا جو تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔ چنانچہ تفسیر معالم التنزیل بغوی اور اسباب النزول سیوطی اور ہماری تفسیر بے نظیر لوامع التنزیل ج اول صـ۸۹ میں تصریح موجود ہے۔ کہ سابقہ شرائع میں تعظیمی سجدہ جائز تھا مگر اسلام میں اسے منسوخ کر دیا گیا اور اس کی جگہ سلام مقرر ہوا۔ ارشادِ قدرت ہے واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا۔ صاحب لوامع التنزیل فرماتے ہیں: "ایں سجدہ تعظیمی در امم سلف جاری وساری الی نزول واذا حییتم بتحیۃ۔ بود۔ پس بسبب آں بجائے آں سلام مقرر شد"۔ یعنی آیتِ مبارکہ واذا حییتم کے نزول تک سابقہ امتوں میں سجدہ تعظیمی کا رواج تھا۔ مگر اس آیت کے بعد وہ منسوخ ہو گیا اور اس کی جگہ سلام مقرر ہوا۔ اسی طرح علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بھی افادہ فرمایا ہے حیات القلوب ج ا صـ۴۶ طبع نولکشور پر مباحث طویلہ کے بعد لکھتے ہیں: "پس ظاہر شد کہ سجدۂ از برائے غیر خدا بقصدِ عبادت کفر است وبقصدِ تعظیم بدون امر خدا فسق است۔ بلکہ محتمل است کہ سجدۂ تحیت در ... سابقہ مجوز بودہ باشد ودریں امت حرام شدہ باشد واحادیث بسیار بر نہی از سجدہ از برائے غیر خدا وارد شدہ۔ یعنی غیر خدا کو بقصدِ عبادت سجدہ کرنا کفر ہے اور اگر بقصدِ تعظیم ہو تو بھی بغیر امرِ خدا موجب فسق ہے احتمال ہے کہ بعض سابقہ امتوں میں یہ سجدہ جائز ہو مگر اس امت میں اسے حرام قرار دے دیا گیا ہو۔ غیر خدا کو سجدہ کرنے کی ممانعت کے متعلق بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں" ولا ینبئک مثل خبیر۔

ملائکہ کے وجود پر ایمان رکھنا ضروری ہے

ملائکہ کے وجود پر ایمان رکھنا ایک مسلمان کے لئے ضروری ولازمی ہے۔ قرآن مجید کی آیات متکاثرہ اور پیغمبر اسلام اور ان کی اولاد اطہارؑ کی روایات متواترہ ان کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ بلکہ کتب سیر وتواریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دنیا کے ہر قدیم وجدید مذہب میں ملائکہ کے وجود پر کسی نہ کسی صورت میں ضرور اعتقاد رہا ہے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ شیطانی وساوس نے دیگر عقائد کی طرح اس عقیدہ میں کچھ تغیرات پیدا کر دیئے اور بعض لوگ ملائکہ کو خالقیت ورازقیت وغیرہ صفات میں خدا کا شریک

سمجھنے لگے۔ بعض نے ان کو بنات اللہ قرار دے دیا اور بعض لوگوں نے ان کو ایسا "جند اللہ" (خدا کا لشکر) قرار دیا کہ خدا بغیر ان کی مدد کے نہ شیاطین کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اور نہ ان کو شکست دے سکتا ہے۔ لیکن اسلام نے ان تمام نظریاتِ فاسدہ کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمایا بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون (قرآن) یہ ملائکہ اللہ تعالےٰ کے مکرم و محترم اور عبادت گذار بندے ہیں۔ جو کسی قول و فعل میں اللہ کے حکم سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون۔ بہرحال ملائکہ کے وجود پر تمام امامیہ بلکہ تمام امتِ اسلامیہ کا اتفاق ہے۔ سوائے بعض متفلسفہ کے چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ بحار ج ۱۴ میں رقمطراز ہیں۔

اعلم انہ اجتمعت الامامیۃ بل جمیع المسلمین الا من شذ منھم من المتفلسفین الذین ادخلوا انفسھم بین المسلمین لتخریب اصولھم وتضییع عقائدھم علی وجود الملائکۃ وانھم اجسام لطیفۃ نورانیۃ اولی اجنحۃ مثنیٰ وثلاث ورباع واکثر قادرون علی التشکل بالاشکال المختلفۃ وانہ سبحانہ یورد علیھم بقدرتہ ما یشاء من الاشکال والصور علی حسب الحکم والمصالح ولھم حرکات صعوداً وھبوطاً وکانوا یراھم الانبیاء والاوصیاء والقول بتجردھم وتاویلھم بالعقول والنفوس الفلکیۃ والقوی والطبائع وتاویل الآیات المتظافرۃ والاخبار المتواترۃ تعویلاً علی شبھات واھیۃ واستبعادات وھمیۃ زیغ عن سبیل الھدیٰ واتباع لاھل الغی والعمی و(یعنی) تمام شیعہ امامیہ بلکہ تمام امتِ اسلامیہ کا سوائے ان بعض فلاسفہ کے جنہوں نے مسلمانوں کے اصولِ مذہب کو خراب کرنے اور ان کے عقائد کو ضائع کرنے کے لئے اپنے آپ کو مسلمانوں کے اندر داخل کر رکھا ہے۔ ملائکہ کے وجود اور اس امر پر اتفاق ہے کہ ملائکہ اجسام نورانیہ رکھتے ہیں۔ بعض کے دو اور بعض کے تین اور بعض کے چار اور بعض کے اس سے بھی زیادہ پر ہوتے ہیں۔ اور وہ مختلف شکلیں اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ خداوند عالم حسبِ مصلحت ان پر مختلف شکلوں اور صورتوں کو وارد کرتا رہتا ہے۔ اور وہ صعودی و نزولی حرکات بھی کرتے ہیں۔ ان کو انبیاء و اوصیاء ظاہری آنکھوں سے دیکھتے بھی تھے۔ یہ کہنا کہ یہ جسم و جسمانیات سے بالکل مجرد ہیں۔ یا عقول یا نفوسِ فلکیہ یا قویٰ اور طبائع کے ساتھ ان کی تاویل کرنا اور بعض بودے شبہات اور وہمی استبعادات کی بنا پر آیاتِ متظافرہ اور اخبار متواترہ کی تاویل علیل کرنا راہِ رشد و ہدایت سے کجروی اختیار کرنا اور گمراہوں کی اتباع کرنا ہے۔" اعاذنا اللہ منہ۔ محقق دوانی نے بھی شرح عقائد میں ان کی حقیقت کے متعلق ایسا ہی افادہ فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں الملائکۃ اجسام لطیفۃ قادرۃ علی التشکلات المختلفۃ۔ شارح مقاصد علامہ تفتازانی کے بیان سے بھی اس امر کی تائید مزید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ظاهر الکتاب والسنۃ وھو قول اکثر الامۃ ان الملائکۃ اجسام لطیفۃ نورانیۃ قادرۃ علی التشکلات المختلفۃ کاملۃ فی العلم والقدرۃ علی الافعال الشاقۃ شانہا الطاعۃ ج ۲ ص ۵
"یعنی جو کچھ ظاہر کتاب وسنت سے مستفاد ہوتا ہے اور جو اکثر امت کا قول بھی ہے وہ یہ ہے کہ ملائکہ اجسام لطیفہ نورانیہ ہیں جو مختلف شکلیں اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ جو علم اور اعمال شاقہ پر قدرت رکھنے میں کامل ہوتے ہیں اور ان کا کام طاعت الٰہی ہے"

ملائکہ کی خوراک

ملائکہ کی غذا و خوراک جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے۔ تسبیح و تقدیس اور عبادت الٰہی ہے۔ یہ امر بکثرت احادیث سے مستفاد ہوتا ہے۔ کہ ملائکہ مادی آب و دانہ سے بے نیاز ہیں۔ بلکہ ان روحانیین کی غذا بھی روحانی ہے۔ اور وہ ہے معرفت کردگار و تسبیح پروردگار یہ بھی واضح رہے کہ وہ ذکوریت و انوثیت۔ توالد و تناسل۔ بول و براز۔ ضعف و کمزوری اور رنج و بیماری وغیرہ کے ساتھ متصف نہیں ہوتے (حق معارف الملۃ الناجیہ والناریہ) محدث جزائری انوار نعمانیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ فاعلم ان الاخبار قد تظافرت بان الملائکۃ طعامہم التحمید و شرابہم التقدیس ولیس لہم شھوۃ الحیوان ولا میل الی اللذات الدنیویۃ۔ جاننا چاہیئے کہ اخبار متظافرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کی غذا حمد باری اور سبحانی تقدیس الٰہی ہے اور ان میں حیوانی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی ان میں دنیوی لذات کی طرف میلان ہے "

ملائکہ کی کثرت تعداد

خلاق عالم کی مخلوق میں ملائکہ اس قدر کثیر التعداد ہیں۔ کہ سوائے خلاق عالم کے اور کوئی ان کی تعداد نہیں جانتا۔ اس سلسلہ میں بکثرت روایات وارد ہیں۔ جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ وما فی السماء موضع اھاب الا وفیہا ملک "آسمان میں قدم رکھنے کی کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ موجود نہ ہو"

انوار نعمانیہ وغیرہ کتب میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپؑ سے دریافت کیا گیا تھا کہ آیا ملائکہ کی تعداد زیادہ ہے یا بنی آدمؑ کی؟ فرمایا والذی نفسی بیدہ لملائکۃ اللہ فی السموات اکثر من عدد التراب فی الارض وما فی السماء موضع قدم الا وفیہا ملک یسبحہ ویقدسہ ولا فی الارض شجر ولا مدر الا وفیہا ملک موکل یاتی اللہ کل یوم بعملہا وما منہم احد الا ویتقرب کل یوم بولایتنا اھل البیت ویستغفر لمحبینا ویلعن اعدائنا ویسئل اللہ ان یرسل علیہم العذاب "فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ جس قدر زمین میں مٹی کے ذرے ہیں۔ آسمان میں اس سے زیادہ فرشتے موجود ہیں۔ آسمانوں میں کوئی قدم رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ مگر یہ کہ

وہاں فرشتے موجود ہیں۔ جو اس کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ اور زمین میں کوئی شجر و مدر نہیں مگر یہ کہ اس کے پاس فرشتے موجود ہیں۔ جو ہر روز اپنے کام کی رپورٹ بارگاہِ قدرت میں پیش کرتے ہیں اور وہ ہر روز ہماری ولایت کا اقرار کرتے ہیں اور ہمارے دشمنوں پر لعنت کرتے ہیں۔ اور ان پر عذاب کے نازل ہونے کی درخواست کرتے ہیں۔ بعض روایات سے یہاں تک مستفاد ہوتا ہے کہ نباتات کے ہر ہر پتے کے ساتھ اور بارش کے ہر ایک قطرہ کے ساتھ ایک ملک مؤکل ہوتا ہے۔ اس کا یہ ارشاد بجا ہے کہ ——— ویخلق مالا تعلمون (وہ اس قدر مخلوق خلق کرتا ہے کہ تم جانتے ہی نہیں ہو۔)

ملائکہ کے انواع و اقسام کا اجمالی بیان

آیات و اخبار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ اعمال و ظائف اور کاروبار کے لحاظ سے ملائکہ کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) ملائکہ حاملین عرش والذین یحملون العرش ومن حولہ یسبحونہ ویستغفرون للذین امنوا (۲) ملائکہ وحی والہام اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا (۳) ملائکہ جنت والملائکۃ یدخلون علیہم من کل باب (۴) ملائکہ دوزخ وما جعلنا اصحاب النار الا ملائکۃ علیہا تسعۃ عشر۔ (۵) کراماً کاتبین جن کی صفت ہے کہ یعلمون ما تفعلون ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید (۶) ملائکہ محافظین ویرسل علیکم حفظۃ۔ لہ معقبات من بین یدیہ ومن خلفہ یحفظونہ من امر اللہ (۷) ملائکہ مشیعین جو کہ حجاج و زوار کی مشایعت کرتے ہیں۔ جیسا کہ روایات میں وارد ہے (۸) ملائکہ بحار و قفار و امطار جو دریا بہاتے اور بارش برساتے ہیں (۹) ملائکہ موت و حیات قل یتوفاکم ملک الموت الذی وکل بکم توفتہم الملائکۃ۔ (۱۰) ملائکہ حساب و کتاب جن کو منکر و نکیر کہا جاتا ہے۔ ان تمام اقسام کے ملائکہ کو مدبرات الامر کہا جاتا ہے ارشادِ قدرت ہے والمدبرات امرا۔ والمقسمات امرا۔ اگر ان تمام انواع و اقسام کی کماحقہ توضیح و تشریح کی جائے تو اس قدر طوالت ہو جائے گی جس کے لئے اوراقِ کتاب متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اسی اجمالی بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بعض شکوک و شبہات کا ازالہ

مذکورہ بالا حقائق پر چند رکیک شکوک و شبہات عائد کئے جاتے ہیں۔ ان کا بیان مع ازالہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

شبۂ اولیٰ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز موجود ہو اور پھر دکھائی نہ دے۔

اس شبہ کا بچند وجہ جواب

وجہ اوّل۔ یہ امر اپنے مقام پر محقق و مبرہن ہو چکا ہے کہ کسی چیز کا حاسۂ بصر کے ساتھ دکھائی نہ دینا اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں بن سکتا۔ جیسے حُب و بغض، بھوک و پیاس وغیرہ اشیاء موجود ہیں مگر آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتیں۔

وجہ دوئم۔ بہت سی چیزیں اسی عالم میں موجود ہیں جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتیں۔ جیسے روح اور ایتھر جس کے متعلق ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے تمام عالم بھرا پڑا ہے۔ یا جیسے ہوا۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ملائکہ کا مادہ مادۂ ایتھر یا مادۂ ہوا کی طرح ہو۔

وجہ سوئم۔ ممکن ہے کہ ان کی شفافیت و لطافت کی وجہ سے ہم میں ان کو دیکھنے کی طاقت نہ ہو مگر جن کی قوت بصارت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ مثل انبیاء و اوصیاء وہ ان ظاہری آنکھوں سے ہی ان کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جن کی صداقت، دلائل و معجزات سے ثابت ہے۔ ان کے دیگر اخبار کی طرح وجود ملائکہ اور ان کی رؤیت کے بارہ میں بھی عقلاً ان کی تصدیق کرنا واجب ہے۔

دوسرا شبہ

جب ملائکہ اجسام لطیفہ نورانیہ ہیں تو وہ افعال شاقہ کی انجام دہی پر کس طرح قدرت رکھتے ہیں۔ جن کی انجام دہی سے انسانی قوتیں عاجز ہیں؟

اس شبہ کا جواب

یہ شبہ بھی حقائق سے جہالت یا تجاہل پر مبنی ہے۔ ورنہ کون نہیں جانتا۔ کہ ہوا با وجود جسم لطیف ہونے کے کس طرح بڑے بڑے درختوں کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیتی ہے اور کس طرح سر بفلک محکم اور مضبوط عمارتوں کو چشم زدن میں نیست و نابود کر دیتی ہے۔ نیز قوت برقی کو دیکھئے کہ کس طرح بڑی بڑی گرانبار اشیاء کو جنہیں ہزاروں آدمی مل کر حرکت بھی نہیں دے سکتے۔ کس طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور معمولی سی کہربائی تار سے بڑے بڑے وزنی جہاز وغیرہ اٹھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر خدا تعالیٰ ملائکہ میں اپنی قدرت کاملہ سے مافوق العادت طاقت ودیعت کر دے تو اس میں کیا تعجب ہے؟ لہٰذا اسلامی کتب میں جناب لوط کی بستیوں کو جناب جبرئیل کا اپنے ایک پر پر اٹھانا اور بلند کرنا کہ اہل آسمان ان کے مرغوں کی آواز کو سننے لگے اور پھر وہاں سے الٹ دینا۔ جو مذکور ہے۔ اس میں ہرگز کوئی قابل تعجب بات نہیں ہے۔ خود انسان کے اندر اس کی نظیر موجود ہے۔ آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا۔ کہ وہ اپنے ہاتھ کی قوت سے لوہے تک کو توڑ ڈالتے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ہاتھوں کی قوت محض ان کے پٹھوں کا عمل ہے۔ جن کی انتہا ایک نہایت نازک اور چپکنے گودے (مبدأ اعصاب جو دماغ کا ایک حصہ ہے) تک ہوتی ہے۔ جو کہ مبدأ حرکت ہے۔ وہ اس قدر نازک ہے کہ خارجی جسم کے معمولی سے صدمہ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس مقدار سے جو اس کے لئے ضروری ہے۔ خون کا ایک زائد قطرہ بھی اس کے نیست و نابود کرنے کے لئے کافی ہے۔ جس کے بعد انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اندازہ لگایئے کہ جو خدائے قادر و قیوم ایسی لطیف و نازک شئی کو ایسی قوت عطا فرما سکتا ہے۔ جو کثیف اور سخت اشیاء کو بھی حاصل نہیں۔ تو کیا وہ خدا اپنے ملائکہ کو فوق طاقت بشری قوت عطا کرنے پر قادر نہیں ہے؟ ما لکم

کیف تحکمون۔

تیسرا شبہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شئی چشم زدن میں زمین و آسمانی والی مسافت اور دیگر مسافات بعیدہ کو قلیل مدت میں طے کر سکے؟ جیسا کہ ملائکہ کے بارہ میں بیان کیا جاتا ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ شبہ بھی کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اس سرعت سیر کی قلیر یں موجود ہیں ہوائی کو سے لیجئے کہ اس کی تیزی و سرعت ایسی مسلم ہے۔ کہ محتاج بیان نہیں ہے۔ جدید حکماء و سائنسداروں کی تحقیق ہے۔ کہ بجلی ایک منٹ میں پانچ سو دفعہ زمین کے گرد گھوم سکتی ہے۔ اور بعض ستارے ایک ساعت میں آٹھ لاکھ اسی ہزار میل حرکت کر لیتے ہیں۔ ستارہ مشتری کو ہی دیکھئے جس کے متعلق علم ہیئت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ہماری زمین سے ایک ہزار چار سو گیارہ گنا زیادہ ہے۔ باوجود اس جسامت کے ایک گھنٹہ میں تیس ہزار میل اس کی رفتار ہے۔ یعنی توپ کے گولہ سے اسی درجہ تیز۔ چنانچہ جتنی دیر میں انسان سانس لیتا ہے۔ اتنے عرصہ میں وہ نو میل چل جاتا ہے۔ (ازدو قرآن :: اسلام اور سائنس) آج کل انسانوں نے ایسے راکٹ ایجاد کر لئے ہیں جو کئی ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے ہیں۔ تو کیا خدائے قدیر اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ملائکہ کو یہ طاقت عطا کرے۔ کہ وہ چشم زدن میں مسافت بعیدہ کو طے کر سکیں۔ لہٰذا اسلامی کتابوں میں جو یہ مرقوم ہے کہ جب برادران یوسفؑ نے جناب یوسفؑ کو چاہ میں ڈالا تھا۔ تو آپ ابھی ساتویں اینٹ تک نہیں پہنچنے پائے تھے۔ کہ جبرئیل امینؑ نے آکر نیچے اپنے پَر بچھا دیئے تھے۔ تو اس میں کوئی قابل انکار بات نہیں ہے۔ اس تقریر دلپذیر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جناب آصف بن برخیا کا ایک لحہ میں اقصائے یمن سے اقصائے شام میں تخت بلقیس کا حاضر کرنا۔ حضرت امیرؑ کا چشم زدن میں مدینہ سے مدائن پہنچنا اور جناب سلمانؓ کی تجہیز و تکفین کر کے واپس تشریف لانا اور حضرت عیسیٰؑ کا جسم عنصری کے ساتھ چرخ چہارم پر چڑھ جانا اور جناب ختمی مرتبتؐ کا شب معراج سات آسمانوں سے بھی آگے بڑھ جانا اور پھر جلدی ہی واپس تشریف لے آنا کوئی خلاف عقل بات نہیں ہے ہاں البتہ خارق عادت ضرور ہے۔ اور اسی خارق عادت امر کو ہی معجزہ کہا جاتا ہے۔ کمالا یخفیٰ علی اولی الالباب ۱۲۔

چوتھا شبہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی جسم مختلف شکلیں تبدیل کر سکے؟

اس شبہ کا جواب یہ شبہ بھی محض وہم کی ایجاد ہے۔ ورنہ عقلمند انسان یہ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ جب انسان ضعیف البنیان کیمیاوی عمل سے لطیف کو کثیف اور کثیف کو لطیف بنانے پر قدرت رکھتا ہے تو کیا قادر قیوم ذات ذوالجلال اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اپنی ایک عظیم المرتبت مخلوق کو مختلف شکلیں اختیار کرنے کی طاقت مرحمت فرمائے؟ لہٰذا اگر قرآن

باب الاعتقاد فی عدد الانبیاء والاوصیاء قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی عدد الانبیاء انھم

پینتیسواں باب انبیاء اور ان کے اوصیا کی تعداد

جناب شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ انبیاء اور ان کے اوصیاء کی تعداد کے بارے میں ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ نبی

میں یہ مذکور ہے کہ جناب مریمؑ کے پاس جب جناب جبرئیل آئے تھے تو جامۂ بشریت زیب تن کر کے آئے تھے۔ فتمثل لھا بشراً سویا۔ تو اس میں ذرہ بھر کوئی جائے تحیر و تعجب نہیں ہے۔ واللہ الھادی۔

انتباہ ہمارے ان بیانات سے جنات کے وجود پر جو ایرادات عائد ہوتے ہیں۔ ان کے جوابات بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جنات بھی ملائکہ کے ساتھ مذکورہ بالا خواص و آثار میں سے اکثر خواص میں شریک ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ان کی خلقت ناری ہے اور ملائکہ کی نوری فتدبر و تشکر فانہ مفید۔

پینتیسواں باب عدد انبیاء و اوصیاء کے متعلق اعتقاد

اس باب کے مطالب کا اجمالی بیان اس باب میں سرکار مصنف علامؒ نے چند امور کا ذکر کیا ہے (۱) انبیاء کی تعداد (۲) جناب رسول خدا کی افضلیت بر تمام انبیاءؑ (۳) آئمہ ہدیٰؑ کی دیگر تمام مخلوقِ خدا پر افضلیت (۴) امامت آئمہ اہل بیتؑ کا اثبات (۵) حضرت امام زمانہؑ کے وجود کا اثبات ہم ذیل میں ان امور پر بقدر ضرورت و گنجائش تبصرہ کرتے ہیں۔ لیکن ان مباحث میں داخل ہونے سے قبل اس نبوت اور اس کے شرائط و خواص اور معرفت انبیاء کے معیار پر کچھ تبصرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت نبوت کا اجمالی بیان نبوت کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے شرائط و لوازم کیا ہیں؟ کسی نبی کے پہچاننے کا معیار و میزان کیا ہے؟ ان مسائل پر تفصیلی گفتگو کرنے کے لئے نہ وقت ہے اور نہ کتاب میں گنجائش ہے۔ نبوت ایک عطیہ الہیہ اور موہبت ربانیہ ہے۔ جو کسب و اکتساب اور تفحص و تلاش سے دستیاب نہیں ہوتی اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ (سورۃ انعام پ ۸ ع ۲) خدا بہتر جانتا ہے کہ منصب رسالت کہاں قرار دیتا ہے؟ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔ یہ خدا کا فضل ہے۔ جسے چاہے عطا کرے۔ وہ

مائة الف واربعة وعشرون الف نبيّ ومائة الف وصيّ واربعة وعشرون الف وصيّ لكلّ نبيّ وصيّ اوصى اليه بامر الله تعٰ و نعتقد

ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں اور اتنے ہی ان کے وصی ہیں۔ ہر ایک نبی کے لئے ایک وصی ہوتا تھا۔ جسے نبی بحکم الٰہی اپنا وصی قرار دیتا تھا۔ ہم ان کے بارے میں یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔

فضل عظیم کا مالک ہے۔ ینزّل الملٰئکة بالروح من امره علیٰ من یشاء من عباده ان انذروا انه لا الٰه انا فاتقون۔ نبوت وہ درجۂ خاصہ ہے کہ تنفتح فیه عین یدرک بها مدرکات خاصة والعقل معزول عنها کعزل السمع عن ادراک الالوان۔ جس میں وہ آنکھ کھل جاتی ہے۔ جس سے وہ چیزیں معلوم ہوتی ہیں جن کے ادراک سے عقل اس طرح محروم ہے جس طرح قوتِ سامعہ رنگ کے ادراک سے قاصر ہے۔ (منقذ من الضلال) ذلک فضل الله یؤتیه من یشاء۔

شرائط وخصائص نبوت کا بیان

خداوند عالم جسے یہ منصب عطا فرماتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حسب ونسب، عقل ودانش، اخلاق و آداب عادات وخصائل اور فضائل وشمائل، غرضیکہ تمام صفات جمیلہ سے متصف ہوتے اور تمام صفاتِ رذیلہ مثل حرص و حسد اور بخل وجبن وغیرہ سے منزہ ومبرا ہونے میں یگانۂ روزگار اور تمام افرادِ ملت سے افضل و اعلیٰ ہو۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھو کہ اس کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک "عصمت" دوسرے "معجزہ" اور یہ سب نتیجہ ہے اس بات کا کہ نبی نفسِ قدسیہ کا مالک ہوتا ہے۔ حضراتِ انبیاء کرام کو اپنے انہی نفوس قدسیہ کی وجہ سے تمام انسانوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ ان کی عقل وفہم عام انسانی عقول وافہام سے بالاتر اور ان کی نزاہت وطہارت تمام لوگوں سے بیشتر ہوتی ہے۔ ان کو منجانب اللہ یہ خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ کہ وہ گناہوں کی آلائش سے ملوث نہیں ہوتے۔ وہ لوگوں کو عقائدِ صحیحہ واعمالِ حسنہ اور اخلاق جمیلہ کی تعلیم وتلقین کرکے ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ جس طرح انسانوں کے بعض افعال حیوانوں کو عجیب وغریب معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے بعض افعال انسانوں کو معجزہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ نبی بشریت وانسانیت میں دوسرے انسانوں کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ مگر وہ عقل وفہم اور عصمت وطہارت۔ اعجاز نمائی اور تلقی وحیٔ خدائی میں ان سے جدا ہوتا ہے۔ انما انا بشر مثلکم یوحی الیّ (سورہ پ ۱۶ ع ۳) میں بھی بشر ہوں۔ مگر میری طرف وحی ہوتی ہے۔ اسی وحی نے ان کو دوسرے لوگوں سے ممتاز ومشخص کر دیا ہے۔ مسائل نبوت کے سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حسنِ صورت۔ اعتدالِ مزاج

فیهم انہم جاؤا بالحق من عند الحق وان قولهم قول الله و امرهم امر الله وطاعتهم طاعة الله ومعصیتهم معصیة الله

کہ تمام انبیاء حق کے ساتھ خدائے برحق کی جانب سے تشریف لائے ان کا قول خدا کا قول اور ان کا حکم خدا کا حکم ہے ان کی اطاعت خدا کی اطاعت اور ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

نشو ونمائی پاکی، حسن تربیت، طہارت نسب، کرم اخلاق، حسن اخلاق، نیک طینت، متانت و سنجیدگی، امانت دار دوستان خدا کے ساتھ تواضع اور دشمنانِ خدا کے ساتھ شدت، راست گفتار، غرضیکہ اوصاف جمیلہ کا مجموعہ ہو۔ اور تمام صفاتِ رذیلہ سے اس کا دامن پاک و صاف ہو۔

بشریت انبیاء علیہم السلام

دیگر اکثر مسائل کی طرح نبی آخر الزمانؐ کی بعثت سے قبل اس مسئلہ کی حقیقت بھی افراط و تفریط کے دھندلکے میں گم تھی۔ یہودیوں کی طرح اور بھی بعض اہل مذہب نبیوں کو ایک پیشین گوئی کرنے والے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ بلکہ ان کو عام معمولی اور گنہگار آدمی سمجھتے تھے۔ یہ تفریط کی انتہا تھی۔ ان کے بالمقابل عیسائی تھے۔ جو اپنے مسیح کو انسان سے مافوق مخلوق، خدا، خدا کا جزء یا ناسوت ولاہوت کا مقدس مجموعہ سمجھتے تھے۔ اس طرح ہندو بھی اپنے ہادیوں کو دیوتا اور اوتار یعنی خدائے مجسم۔ یا انسان کے لباس میں خدا قرار دیتے تھے اور ان کو خدائی طاقتوں کا حامل سمجھتے تھے۔ یہ افراط کی انتہا تھی۔ اسلام نے ان دونوں نظریوں کے بین بین ایک معتدل نظریہ عادلانہ پیش کیا۔ جو افراط و تفریط کی کجرویوں سے پاک ہے۔ وہ ایک طرف انبیاء و مرسلینؑ کو مخلوق، انسان بندۂ خدا اور حکمِ خدا کے سامنے درماندہ و سرنگوں تسلیم کرتا ہے تو دوسری طرف ان کو بہترین خلائق، عصمت و طہارت کا پیکر، سعادت و ہدایت کا مرکز، علم و فضل کا محور اور صاحبِ اعجاز قرار دیتا ہے۔ عام اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح سمجھتے تھے کہ انسان کی ہدایت کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق کوئی ہستی ہونی چاہیئے۔ اور ان کے خیال میں وہ ہستی فرشتوں کی تھی۔ قرآن مجید نے بار بار ان لوگوں کے اس غلط نظریہ کو پیش کر کے اس کی تکذیب کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو البتہ ان کی طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ مطلب یہ کہ چونکہ زمین میں انسان بستے ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان کی طرف کسی انسان کو ہی منصب نبوت پر فائز کر کے بھیجا جاتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

انبیاء و اوصیاء دو جنبے رکھتے ہیں

اگر بنظرِ غائر حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و اوصیاء کے دو جنبے ہوتے ہیں۔ ایک جنبہ خالص

وانہم لم ینطقوا الا عن اللہ وعن وحیہ وان سادات الانبیاء خمسۃ الذین دارت علیہم الوحی وہم اصحاب الشرائع وہم اولو العزم نوحؑ وابراہیمؑ وموسیٰؑ وعیسیٰؑ ومحمدؐ علیہم السلام وان محمدؐ ا

ان تمام انبیاء نے سوائے خدا کی وحی اور اس کے حکم کے کبھی کوئی حکم اپنی طرف سے نہیں دیا۔ اس تمام گروہ انبیاء میں سے پانچ ایسے نبی ہیں، جو سب انبیاء کے سردار (اور وہ قطب آسیائے نبوت ہیں) جن پر وحی کا دار و مدار ہے۔ اور وہ اولو العزم پیغمبر اور صاحب شریعت رسولؐ ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور سرکار ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفےٰ علیہ وعلیہم السلام۔ پھر ان تمام میں سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

بشریت کا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح کھاتے پیتے، چلتے، پھرتے، سوتے، جاگتے، شادی وغمی میں مبتلا ہوتے، صحت و مرض کا شکار ہوتے۔ پیدا ہوتے اور موت کا ذائقہ چکھتے ہیں۔ دوسرا جنبہ ہے روحانیت و نورانیت والا۔ وہ اپنی روحانیت، پاکدامنی، عصمت و طہارت، علم و فضل، رشد و ہدایت، عظمت و جلالت اور اختصاص نبوت میں عام انسانوں سے بلند تر ہیں۔ یہودیوں کی طرح جن لوگوں کی نظر صرف ان کے جنبہ بشری پر پڑی، انہوں نے ان کو معمولی انسان کہنا شروع کر دیا۔ اور عیسائیوں کی طرح جن کی نگاہ ان کے صرف روحانی جنبہ پر پڑی، انہوں نے ان کو مافوق انسان مخلوق قرار دے کر ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگے۔ حالانکہ یہ دونوں نظریے جادۂ اعتدلال سے ہٹے ہوئے ہیں۔ حق ان کے وسط میں ہے۔ وہ بشری حالات کے لحاظ سے بلاشک انسان ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مخصوص روحانی کمالات کی بنا پر عامۃ الناس کے سید و سردار بھی ہوتے ہیں۔ مولانا سید محمد سبطین صاحب مرحوم اسی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ نبی بشر ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم خاک ہیں تو وہ اکسیر، ہم پتھر ہیں تو وہ گوہر، ہم سنگ خارا وہ پارس، ہم ذرہ وہ آفتاب، ہم جاہل وہ عالم، ہم ناقص وہ کامل، ہم قالب ہیں وہ جان عالم۔ وہ بشر ہے مگر روح مجسم۔ وہ جسم ہے مگر جسم مروح۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ جنسیت یا نوعیت میں شریک ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جملہ کمالات و صفات میں مساوی ہوں" (کشف الاسرار ص ۲۹)

کفار کے منشائے اشتباہ کی نشاندہی

جب انبیاء منجانب اللہ اپنے مبعوث نبوت کا اعلان کرتے تو کفار ان کے جنبہ بشری کی مذکورہ بالا خصوصیات کو دیکھ کر کہتے تم تو ہماری طرح آدمی ہو تم نبی کس طرح ہو سکتے ہو۔ ابعث اللہ بشراً رسولاً (اسرائیل ۱۱)

سیدھم وافضلھم وانہ جآء بالحق وصدق المرسلین وان الذین کذبوہ لذائقون العذاب الالیم وان الذین امنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون

افضل واشرف اور ان سب کے سردار ہیں۔ یہ جناب حق کے ساتھ تشریف لائے۔ اور گذشتہ انبیاء کی تصدیق و تائید فرمائی۔ جن لوگوں نے آنجناب کی تکذیب کی وہ دردناک عذاب کا ذائقہ چکھیں گے اور جو لوگ آنجناب پر ایمان لائے۔ ان کا احترام اور ان کی نصرت کی۔ اور ساتھ ساتھ اس نور مقدس کی اتباع بھی کی۔ جو آنحضرت کے ساتھ نازل ہوا تھا۔ تو بس یہی انسان کامیاب ہونے والے اور رستگاری پانے والے ہیں۔

کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ انسان راہنمائی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا ابشر یھدوننا (تغابن - ۱) کیا بشر ہمیں ہدایت کریں گے؟ اسی شبہ کا شکار ہو کر عیسائی حضرت عیسیٰ کی انسانیت کا انکار کر بیٹھے۔ غرضیکہ ہمیشہ کفار نے یہ کہا کہ ان انتم الا بشر مثلنا (ابراہیم - ۲) تم نہیں ہو مگر ہماری طرح بشر۔

تصویر کے دونوں رخ

انبیاء علیہم السلام نے ان کے جواب میں ہمیشہ اپنی بشریت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اپنے دوسرے جنبہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ ہم ہیں تو بشر و انسان مگر خدائے رحمٰن کے خاص لطف و کرم اور فضل و احسان یعنی نبوت اور اس کی خصوصیات سے سرفراز ہیں۔ قالت لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم ولکن اللہ یمن علی من یشاء من عبادہ (ابراہیم - ۲) ان کے رسولوں نے جواب میں کہا ہم ہیں تو تمہاری طرح بشر۔ لیکن خدا اپنے بندوں میں جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔" اس طرح انبیاء نے تصویر کا دوسرا رخ پیش کر کے ان کو دعوتِ فکر دی۔ دیگر پیغمبروں کی طرح جناب خاتم الانبیاء نے بھی بحکم پروردگار بار بار یہ اعلان فرمایا۔ انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الٰھکم الٰہ واحد (کہف - ۱۲) میں تمہاری طرح بشر ہوں (مگر) مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ کہ تمہارا معبود ایک ہے۔ ایک مقام پر کفار کے چند غلط اور ناجائز مطالبات کے جواب میں تعلیم ایزدی فرماتے ہیں۔ سبحان ربی ھل کنت الا بشراً رسولا۔ (اسراء - ۱۱) سبحان اللہ! تو میں تو ایک بشر اور رسول ہوں۔ اس فرمان واجب الاذعان سے جہاں اس گروہ کے نظریات فاسدہ کی رد مقصود ہے جو نبیوں کو صفات الوہیت کا حامل مانتے تھے۔ وہاں ان لوگوں کے خیال باطل کا ابطال بھی مدنظر ہے۔ جو پیغمبروں کو

الفائزون ویجب ان یعتقد ان اللہ عزّوجلّ لم یخلق خلقاً افضل من محمدؐ والائمۃ علیھم السلام وانھم احب الخلق الی اللہ واکرمھم واولھم اقراراً بہ لما اخذ اللہ میثاق النبیین واشھدھم علی انفسھم الست بربکم

یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے۔ کہ خدائے عزوجل نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی۔ جو جناب سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام سے افضل ہو۔ یہ حضرات خداوند عالم کو اپنی تمام کائنات سے زیادہ محبوب اور زیادہ محترم ہیں۔ یہی وہ پاک و پاکیزہ ہستیاں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے (عہد الست میں) خداوند عالم کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا جب کہ خدا نے تمام نبیوںؑ سے عہد و پیمان لیا۔ اور ان کو اپنے نفوس پر گواہ بنا کر فرمایا تھا۔ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟

عام انسانوں جیسا ایک انسان سمجھتے تھے۔ ان آیات میں جہاں اعلانِ بشریت ہے وہاں اس کے ساتھ رسالت اور وحی نبوت کا بھی اعلان ہے۔ بنابرایں یہاں ان بیسیوں خصائص و لوازم کا بھی اعلان ہے جو حامل وحی نبوت ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ ایک افراط پسند گروہ ایسا ہے جو نبوت کے ڈانڈے توحید سے ملا دیتا ہے۔ اور دوسرا وہ تفریط پسند گروہ ہے جو برملا یہ کہتا ہے کہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کسی قسم کی کوئی بلندی و برتری حاصل نہیں سوائے اس کے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں۔ حالانکہ صاحبانِ عقل و خرد سمجھتے ہیں کہ وحی کے فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی الطافِ ربانی (وحی) سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا نقائص و عیوب میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے۔ یہ کہنا تو ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے! تو اس کے یہ معنی نہیں کہ علم و جہل کے علاوہ علم و جہل کے متضاد اوصاف میں دونوں برابر ہیں۔ اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب و شرافت، حکمت و دانائی میں کوئی فرق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں علم و جہل کا فرق بیان کر کے ان دونوں کے درمیان علم و جہل کے سینکڑوں لوازم و خصائص کا فرق تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح نبی اور غیر نبی میں "وحی" کا فرق بیان کر کے صاحب وحی اور غیر صاحب وحی انسانوں کے درمیان ان سینکڑوں لوازم و خصائص اور اوصاف و کمالات کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا۔

ایک مشہور غلط فہمی کا ازالہ

جو لوگ انبیاء و رسل کو مافوق انسان کسی اور وہمی نوع کے افراد سمجھتے ہیں۔ وہ درحقیقت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کو انسان تسلیم کر لیا تو پھر تمام انسانی اوصاف و کمالات اور نقائص و عیوب میں ان کو عام انسانوں جیسا تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ

قالوا بلی وان اللہ بعث نبیہ محمدؐ للانبیاء فی الذر وان اللہ عز و جل اعطی ما اعطی کل نبی علی قدر معرفتہ ومعرفتہ نبینا محمدؐ الا کانت اکبر واعظم وسبقہ الی الاقرار بہ ونعتقد ان اللہ تبارک وتعالی خلق جمیع الخلق لہ ولاھل بیتہؑ وانہ لولاھم

تو سب سے پہلے جناب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیتؑ نے اقرار کیا تھا۔ روز میثاق خداوند کریم نے تمام انبیاءؑ پر آنجنابؐ کو مبعوث فرمایا۔ اور خدا نے انہیں وہ سب فضائل وکمالات (مع شئی زائد) عنایت فرمائے جو دیگر انبیاء کو ان کی معرفت کے مطابق مرحمت فرمائے تھے۔ کیونکہ ہمارے رسولؐ کی معرفت سب سے بڑھی ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ آپ نے سب سے پہلے رب العالمین کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا۔

ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ خداوند عالم نے تمام کائنات اور موجودات کو محمد و آل محمد علیہم السلام کی خاطر پیدا فرمایا ہے۔ اگر یہ بزرگوار نہ ہوتے تو درجات کا تفاوت موجود ہے۔ اور ہر ہر نوع کے افراد میں فاضل و مفضول پائے جاتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایرانی ہیرو رستم و سہراب انسان نہ تھے؟ یا یونانی عقل و علم کے مجسمے ارسطو و افلاطون انسانیت کے مافوق کوئی مخلوق تھے؟ یا باقل و ابن ہبنقہ جو حماقت و بلادت میں ضرب المثل ہیں۔ وہ انسان نہ تھے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ اول الذکر حضرات بشریت و انسانیت میں اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں اپنے کمالات کی بنا پر عام انسانوں سے بلند تر تھے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی عام لوگوں کے ساتھ بشریت و انسانیت میں اشتراک کے باوجود وحی اور اس کے خصائص و لوازم میں عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند و بالا ہیں اور اخلاقی، روحانی، علمی، عملی اور قلبی و دماغی حیثیت سے عام انسانوں سے اجل و ارفع ہیں۔

بلکہ اگر دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ پیغمبر بعض جسمانی خصائص میں بھی دوسرے لوگوں سے ممتاز و منفرد ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ پیغمبر کے قلب و دماغ پر نیند کا اثر نہیں ہوتا۔ ان کا ارشاد ہے۔ میری آنکھ سوتی ہے۔ مگر دل نہیں سوتا۔ ظاہر ہے کہ عام انسانوں کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ جناب رسولؐ خدا فرمایا کرتے تھے۔ کہ صفوں کو سیدھا کیا کرو۔ کیونکہ میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے کیا عام لوگوں کی قوتِ بصارت ایسی ہوتی ہے؟

جب پیغمبر سے معمولی ـــــــ کی وجہ سے ان کی ازواج تعلق کی کے بعد عام عورتوں جیسی نہیں رہتیں جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے۔ یا نساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن (احزاب - ۳۲) اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسی ہر عورت۔ اگر خدا کا ڈر رکھو۔ تو خود پیغمبرؐ کس طرح "کاحد من الرجال" ہو سکتا ہے؟ الغرض نبی اور غیر نبی میں وحی نبوت کا جو فرق ہے۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور اوصاف میں فرق و امتیاز ہے۔ لہٰذا کسی انسان کامل کو صاحب وحی ماننے کے

لما خلق اللہ سبحانہ السماء والارض ولا الجنۃ ولا النار ولا آدم ولا حوا ولا الملٰئکۃ ولا شیئا مما خلق صلوات اللہ علیھم اجمعین واعتقادنا ان حجج اللہ علی خلقہ بعد نبیہ محمد الائمۃ الاثنی عشر

خدائے عزوجل نہ زمین و آسمان کو پیدا کرتا نہ جنت و دوزخ کو نہ آدم و حوا پیدا ہوتے۔ اور نہ فرشتے عالم وجود میں آتے اور نہ کائنات عالم کی کوئی چیز پیدا ہوتی۔ ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد تمام مخلوق پر حجت ہائے خداوندی بارہ امام ہیں

ساتھ ان تمام خصائص و لوازم کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا جن کا ایک نبی یا رسول میں پایا جانا ضروری ہے۔ (سیرۃ النبی)

بعثت انبیاء کی ضرورت اور غرض و غایت

بعثت انبیاء کی ضرورت اور اس کی غرض و غایت کے سلسلہ میں متعدد وجوہ بیان کئے گئے ہیں یہاں صرف بعض اہم امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ (۱) خلاقِ عالم نے انسان میں دو قسم کی قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ ایک قوتِ ملکیہ روحانیہ، دوسری قوتِ بہیمیہ جسمانیہ۔ اس خالقِ حکیم نے یہ انتظام فرمایا ہے۔ کہ قوتِ بہیمیہ کے امراض و اسقام کے ازالہ کے لئے ڈاکٹر و حکیم پیدا فرمائے ہیں۔ ضرورت تھی کہ خدائے حکیم قوتِ ملکیہ کی نشو و نما اور اس کے روحانی امراض کے علاج معالجہ کے لئے بھی کچھ ایسے حضرات قدسی صفات مقرر فرمائے۔ جو صورت میں تو انسان ہی ہوں۔ مگر قوتِ ملکیہ کے کامل اور دیگر کمالات کے اتم و اکمل ہونے کی وجہ سے ملائکہ سے بھی افضل ہوں۔ انہی کو اصطلاحِ شریعت میں "انبیاء و مرسلین" کہا جاتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے۔ یا ایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم وشفاء لما فی الصدور وھدی ورحمۃ للمومنین (سورہ یونس پ ۱۱ ع ۶) (۲) جب ایک عقل مند انسان دلائل عقلیہ فطریہ سے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ اس کا ایک خالق و مالک ہے۔ تو وہ یہ سوچتا ہے کہ اس کی غرضِ خلقت کیا ہے؟ نہ تو یہ بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہو سکتا ہے اور خداوند عالم اس سے اجل و ارفع ہے۔ کہ اس کی بزم میں آئے۔ تو اس امر کے معلوم کرنے کے لئے کہ اس کی خلقت سے خدائے عزوجل کی غرض و غایت کیا ہے؟ کن باتوں سے انہیں قربِ ایزدی حاصل ہوگا؟ اور کن امور کی وجہ سے وہ بارگاہِ قدس سے دور ہو جائے گا؟ خالق کی رضامندی کن باتوں میں پوشیدہ ہے؟ اور اس کی ناراضی کن چیزوں میں مضمر ہے؟ ان حقائق کو سمجھنے کے لئے ضرورت تھی کہ کچھ وسائط درمیان میں موجود ہوں۔ جو دو جنبے رکھتے ہیں۔ ایک جنبہ وہ ہو۔ جو جمال و کمال احدیت کا پرتو ہو۔ جس کی

اولهم امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ ثم الحسنؑ ثم الحسینؑ ثم علی بن الحسینؑ ثم محمد بن علیؑ ثم جعفر بن محمدؑ ثم موسیٰ بن جعفرؑ ثم علی بن موسیٰ الرضاؑ ثم محمد بن علیؑ ثم علی بن محمدؑ ثم حسن بن علیؑ ثم محمد بن الحسن الحجۃ القائمؑ

جن سے پہلے امام حضرت امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام دوسرے امام حسنؑ۔ تیسرے امام حسینؑ چوتھے حضرت امام زین العابدینؑ پانچویں حضرت امام محمد باقرؑ چھٹے جناب امام جعفر صادقؑ۔ ساتویں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ آٹھویں حضرت امام علی رضاؑ۔ نویں جناب امام محمد تقیؑ۔ دسویں حضرت امام علی نقیؑ۔ گیارہویں حضرت امام حسن عسکریؑ اور بارہویں جناب مہدیؑ۔

وجہ سے خالقِ عالم سے احکام و تعلیمات حاصل کر سکیں۔ اور دوسرا جنبہ وہ ہو۔ جس میں وہ عام انسانوں کی طرح معلوم ہوں۔ تاکہ لوگوں کو وہ احکام پہنچا سکیں۔ اور ان کی زندگی اور ان کی سیرت و کردار عام لوگوں کے لئے مشعلِ راہ بن سکے ؎

ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل   خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا

ایسے ہی وسائط اور وسائل کو اصطلاحِ شریعت میں نبی و رسولؐ کہا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت خالق و مخلوق کے درمیان وسائل اور روابط کی مانند ہوتی ہے۔ جس طرح بلا تشبیہ بادشاہ اور رعیّت کے درمیان وزراء واسطہ ہوتے ہیں جو بادشاہ کے احکام سے رعایا کو آگاہ کرتے ہیں۔ اسی طرح خداوندِ عالم اور اس کے بندوں کے درمیان انبیاء وسیلہ اور سفیر ہوتے ہیں۔ جو لوگوں کو خالق کی مرضی و منشاء کی اطلاع دیتے ہیں۔ تاکہ لوگ اپنے مقصودِ تخلیق کی تکمیل کر کے فلاح و نجاح دارین حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ تنہا عقلِ انسانی ان حقائق کو سمجھنے سے عاجز و قاصر ہے

(۳) یہ امر محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ تنہا اپنی تمام ضروریات پورا نہیں کر سکتا۔ بلکہ اپنے بنی نوع انسان کے تعاون اور ان کے ساتھ اجتماع کا محتاج ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس اجتماع میں ذاتی جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کی وجہ سے جنگ و جدال اور قتل و قتال کا صرف ظنِ غالب ہی نہیں بلکہ یقینِ کامل ہے۔ اس لئے ایک بہترین قانون اور قانون دان حاکم عادل کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی دماغ کا ساختہ برداختہ قانون اور عام خطاکار حاکم اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس لئے ضرورت ہے قانونِ الٰہی اور کامل انسان کی جو اسے بلا رد و رعایت نافذ کر کے اصلاحِ معاشرہ کر سکے۔ اسی قانون کو دین اور

بامر اللہ صاحب الزمان وخلیفۃ الرحمٰن فی ارضہ الحاضر فی الامصار الغائب عن الابصار صلوات اللہ علیہم اجمعین واعتقادنا فیھم انھم اولوالامر الذین امر اللہ بطاعتھم وانھم شھداء علی الناس وانھم ابواب اللہ

صاحب العصر والزمان اور خلیفہ رحمٰن ہیں۔ جو حجت خدا اور قائم بامر اللہ ہیں آنکھوں سے غائب مگر شہروں میں حاضر ہیں۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ ان بزرگواروں کے متعلق ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ یہ وہی اولی الامر ہیں جن کی اطاعت و فرمانبرداری کا خدائے تعالےٰ نے حکم دیا ہے۔ یہ تمام لوگوں کے گواہ خدا کے (علوم کے) دروازے

حاکم کو نبی و رسول کہا جاتا ہے۔

انبیاء کی شناخت کا معیار

مذکورہ بالا بیانات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مدعی نبوت و رسالت کے پہچاننے کا حقیقی معیار یہ ہے کہ جب کوئی شخص دعوائے نبوت و رسالت کرے اور تمام گناہان صغیرہ وکبیرہ سے اس کا دامن عصمت پاک و صاف ہو۔ اور عقائد صحیحہ۔ اعمال صالحہ۔ اخلاق حسنہ کا مالک ہو۔ اور وہ کوئی نہ کوئی معجزہ بھی رکھتا ہو۔ جو عقلاً ممکن ہونے کے ساتھ ساتھ محال عادی اور خارق عادت ہو۔ جس کا مثل ونظیر لانے سے تمام دنیا والے عاجز و قاصر ہوں۔ تو اس سے یقین ہو جائے گا۔ کہ وہ شخص منجانب اللہ بھیجا ہوا ہے۔ اور اپنے دعویٰ میں صادق اور راست باز ہے۔ فمن ذلک الطریق فاطلب الیقین بالنبوۃ۔

اسی طرح صداقت انبیاء معلوم کرنے کے بعض اور طریقے بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حقیقی انبیاء کی پیشانیوں پر خوف وخشیہ اور تقوی الٰہی کے انوار مثل آفتاب کی طرح واضح و آشکار ہوتے ہیں۔ رشد و ہدایت اور صلاح و فلاح کے آثار ان کے اعضاء و جوارح سے ہویدا ہوتے ہیں۔ اور وہ ارباب دول اور امراء و سلاطین سے بے تعلق تمام شہوات اور لذائذ دنیا سے متنفر ہوتے ہیں۔ اہل اللہ کے دل خود بخود ان کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ بخلاف ارباب مکر و تزویر کے کہ ان کے حالات و کوائف ان کے برعکس ہوتے ہیں۔ وہ امراء و سلاطین کی طرف مائل۔ لذائذ و شہوات میں منہمک اور حب دنیا میں مستغرق ہوتے ہیں۔ بہر حال صادقین و کاذبین کے صفات و سمات۔ اقوال و افعال، صورت و سیرت، ظاہر و باطن میں وہی فرق ہوتا ہے جو نور و ظلمت اور لیل و نہار میں ہے۔ کوئی کاذب و مفتری اور متنبی اپنے اصلی عادات و خصائل اور رذائل کو چھپانے کی ہزار کوشش کرے مگر حقیقت ظاہر ہو کر ہی رہتی ہے گے۔

والسّبیل الیہ والادلاء علیہ و انہم عیبۃ علمہ وتراجمۃ وحیہ وارکان توحیدہ وانہم معصومون من الخطاء والزلل وانہم الّذین اذہب اللہ عنہم الرّجس وطہّرہم تطہیرا وان لہم المعجزات والدّلائل وانہم

اس تک پہنچنے کا راستہ و ذریعہ ہیں۔ اور اس کی معرفت کے راہبر ہیں۔ اس کے علم کے خزانہ۔ اس کی وحی کے ترجمان اور اس کی توحید کے ارکان ہیں۔ یہ سب بزرگوار خطا سے منزہ۔ لغزش سے محفوظ اور گناہ سے معصوم ہیں۔ یہی وہ حضرات ہیں۔ جن سے خدا نے ہر قسم کی نجاست کو دور رکھا ہے۔ اور ان کو ایسا پاک رکھا ہے۔ جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے یہ حضرات صاحب معجزات و دلائل تھے نیز یہ بزرگوار

ومہما تکن عند امرأ من خلیقۃ - وان خالہا تخفیٰ علی الناس تعلم

اسی طرح انبیاء کی پہچان کا ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ جب وہ گذشتہ واقعات اور آئندہ آنے والے حوادث و حالات کی خبر دیں تو وہ بات بلا کم وکاست درست ثابت ہو۔ پیشگوئیوں کی صداقت پیشگوئی کرنے والے شخص کی صداقت کی بین دلیل ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کا علم وہبی و لدنی ہوتا ہے نہ کسبی اکتسابی اسی طرح سچے مدعی نبوت کی شناخت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی شریعت کے احکام و مسائل اور عقائد و تعلیمات کو عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے میزان پر جانچا جائے۔ اگر اس کی تعلیمات عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے مطابق ہوں تو اس کی تعلیمات کا مطابق عقل و فطرت ہونا بھی اس کے منجانب اللہ مبعوث ہونے کی دلیل متصور ہوگی۔ اسی طرح سابق مسلم النبوت نبی کا کسی آنے والے بزرگ کی نبوت کا اعلان کر کے اس کے نام و نشان کی معرفی کرانا بھی پہچان کا ایک قطعی طریقہ ہے۔ بہر کیف کسی شخص کے دعوائے نبوت کی صداقت معلوم کرنے کا بہترین معیار عصمت اور معجزہ کا وجود ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس معیار کو عوام و خواص سب لوگ سمجھ سکتے ہیں لہٰذا جس دعویدار نبوت کا دامن ان دو نعمتوں سے تہی ہو۔ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ متنبی اور مفتری ہے۔ کائنا من کان کما لا یخفیٰ علی اولی الاذہان۔

معجزہ کی تعریف

لغوی طور پر معجزہ کے معنی ہیں عاجز کنندہ۔ اور اصطلاح متکلمین میں معجزہ خداوند عالم کے اس خارق عادت فعل کا نام ہے جسے وہ اپنے کسی نبی یا اس کے وصی کی صداقت و حقانیت ثابت کرنے کے لئے ان کے ہاتھوں پر ظاہر کرتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا ظہور مقرون بالتحدی ہو اور دعوائے نبوت و امامت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا اگر ایسا کوئی فعل نبی و امام سے اعلان نبوت و امامت سے

معجزہ اور سحر میں فرق

عام طور پر یہ شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ جو کام ایک نبی بمقام اعجاز میں انجام

امان لاهل الارض کما ان النجوم امان لاهل السماء ومثلهم فی هذہ الامۃ کسفینۃ نوح من رکبھا نجیٰ وکباب حطۃ وانھم عباد اللہ المکرمون الذین لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون نعتقد فیھم

تمام اہل زمین کے لئے اسی طرح باعث امن و امان ہیں، جس طرح آسمان والوں کے لئے ستارے باعث امان ہیں۔ ان مقدس حضرات کی مثال اس امت میں کشتی نوح کی سی ہے۔ جو اس پر سوار ہو گیا۔ وہ نجات پا گیا نیز ان کی مثال بنی اسرائیل کے باب حطہ کی مانند ہے (جو اس سے داخل ہوا اس کے سابقہ گناہ معاف ہو گئے) یہ سب کے سب خداوند عالم کے ایسے مکرم و معظم بندے ہیں۔ جو کسی بات میں بھی اس کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ اور اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ہم ان حضرات کے بارے میں یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔

دیتا ہے۔ وہی کام ایک شعبدہ باز۔ جادوگر اور مسمریزم جاننے والا شخص بھی انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا معجزہ کیسے دلیل نبوت بن سکتا ہے؟ اس لئے ضروری ہے کہ معجزہ اور جادو کا باہمی فرق یہاں بیان کر دیا جائے سو مخفی نہ رہے۔ کہ معجزہ اور جادو میں متعدد فرق ہیں۔ یہاں بعض فرق پیش کئے جاتے ہیں۔

فرق اول معجزہ اور جادو میں فرق یہ ہے کہ جادو ایک فن و علم ہے۔ جو پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن معجزہ تعلیم و تعلم اور کسب و اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

فرق دوم جادو کا معارضہ و مقابلہ ممکن ہوتا ہے۔ ایک جادوگر دوسرے ساحر کے سحر کو باطل کر سکتا ہے۔ مگر معجزہ کا کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور کوئی شخص اسے باطل نہیں کر سکتا۔ معجزہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ سب کو عاجز کر دینے والا ہو۔

فرق سوم جادو مخصوص مادی اسباب و آلات خفیہ نیز اوقات مخصوصہ اور شرائط و قواعد معینہ کا محتاج ہوتا ہے۔ مگر معجزہ میں کسی سبب یا آلہ یا کسی زمان و مکان کی کوئی قید نہیں ہوتی جب ضرورت ہر وقت اور ہر جگہ اعجاز نمائی کی جا سکتی ہے۔ وہ صرف امر الٰہی سے صادر ہوتا ہے۔ وبس۔

فرق چہارم معجزہ میں حقیقت و واقعیت ہوتی ہے۔ مگر جادو اور شعبدہ وغیرہ میں فقط نظر بندی ہوتی ہے۔ کسی شئی کی حقیقت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن معجزے میں جو انقلاب و تغیر ظاہر ہوتا ہے وہ فی الحقیقت اصل شئے میں رونما بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی نبی و رسولؑ یا امامؑ کسی سنگریزے کو انگور بنا دے۔ تو اس سے پتھر والے خواص سلب ہو جائیں گے۔ اور وہ سنگریزہ فی الحقیقت انگور بن

ان حبہم ایمان و بغضہم کفر و ان امرھم امر اللہ و نہیہم نہی اللہ و طاعتہم طاعۃ اللہ و معصیتہم معصیۃ اللہ و ولیہم ولی اللہ و عدوھم عدو اللہ و نعتقد ان الارض لاتخلو من حجۃ للہ علی خلقہ اما ظاھر او خائفا

کہ ان کی محبت عین ایمان اور ان سے عداوت کھلم کھلا کفر ہے ان کا حکم خدا کا حکم۔ ان کی نہی۔ خدا کی نہی ہے ان کی اطاعت خدا کی اطاعت اور ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ ان کا دوست خدا کا دوست اور ان کا دشمن خدا کا دشمن ہے۔ ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ زمین کبھی ایسے شخص سے خالی نہیں رہ سکتی۔ جو مخلوق پر حجت خدا ہو۔ خواہ وہ ظاہر و مشہور ہو۔ یا مخفی و مستور۔

جائے گا۔ کھانے والا اسے انگور ہی محسوس کرے گا۔ مگر جادوگر کنکری کو انگور بنا کر دکھا تو سکتا ہے مگر وہ اسے کھلا نہیں سکتا۔ وہ کنکری کنکری ہی رہے گی۔ حضرت موسیٰؑ نے جب پتھر سے پانی جاری کیا تھا تو حقیقتاً تمام قوم نے سیر ہو کر پانی پیا تھا۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوتِ ذوالعشیرہ میں تھوڑے سے کھانے کو بطورِ اعجاز جب مدعوین کے سامنے پیش کیا تھا۔ تو سب نے سیر ہو کر کھایا تھا مگر جادو میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جادو کا اثر فقط نگاہ پر ہوتا ہے۔ اصل حقیقت شی پر نہیں ہوتا۔

فرق پنجم معجزہ ہمیشہ اخیار وابرار لوگوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ بھی مقرون با لدعویٰ مگر جادو کا اثر فساق و فجار اور اشرار کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ وبینہما بون بعید۔

نبیؑ و رسولؐ میں کیا فرق ہے؟ نبی و رسولؐ کے لغوی معانی میں تو کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مگر ان کے اصطلاحی معنوں میں فی الجملہ فرق ہے۔ اب وہ فرق کیا ہے؟ اس سلسلہ میں متعدد فرق بیان کئے گئے ہیں۔ عام طور پر کتب کلامیہ میں مشہور یہ ہے کہ نبی اس برگزیدۂ خدا بندے کو کہا جاتا ہے۔ جو منجانب اللہ ارشاد و تبلیغ کے عہدہ پر مامور ہو اگرچہ کوئی نئی شریعت و کتاب نہ رکھتا ہو۔ بلکہ کسی اور صاحبِ شریعت کی شریعت کا مبلغ ہو۔ اور رسول اور اس برگزیدہ خدا بندے کو کہا جاتا ہے۔ جو منجانب اللہ عہدۂ پیامبری پر فائز ہو اور مستقل شریعت و کتاب بھی رکھتا ہو۔ اس طرح ان کے درمیان باصطلاح اہلِ منطق عام خاص مطلق کی نسبت ہے کہ ہر رسول نبی ضرور ہوتا ہے مگر ہر نبی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ وہ رسول بھی ہو۔ (اوائل المقالات وغیرہ) مگر جو کچھ احادیث اہل بیت نبوی سے مستفاد ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی وہ ہے جو خواب میں فرشتہ کو دیکھتا ہے اور آواز کو سنتا ہے مگر عالم بیداری میں بحالت وحی اس کو نہیں دیکھتا۔ اور رسول وہ ہے جو خواب میں فرشتہ کو دیکھتا ہے آواز

مغمور، و نعتقد ان حجة الله في ارضه و خليفته في عباده في زماننا هذا هو القائم المنتظر محمد ابن الحسنؑ بن عليؑ بن محمدؑ بن عليؑ بن موسىؑ بن جعفرؑ بن محمدؑ بن عليؑ بن حسينؑ بن عليؑ بن ابي طالب عليهم السلام وانه

ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ اس وقت زمین میں حجتِ خدا اور اس زمانہ میں بندوں پر خلیفہ ہی حضرت قائم منتظر محمدؑ بن حسنؑ بن علیؑ بن محمدؑ بن علیؑ بن موسیٰؑ بن جعفرؑ بن محمدؑ بن علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب علیہم السلام ہیں۔ یہی وہ بزرگوار ہیں۔

متعدد احادیث اصول کافی وغیرہ کتب معتمدہ میں مذکور ہیں۔

انبیاء کی تعداد کتنی ہے؟

انبیاء کی تعداد کے سلسلہ میں اخبار و آثار میں قدرے اختلاف ہے اس لئے اس سلسلہ میں اگرچہ حتمی و یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ہاں مشہور بین الفریقین یہی ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ جس طرح متن رسالہ میں مذکور ہے۔ ان میں ایک سو تیرہ حضرات رسول ہیں۔ اور پانچ اولی العزم اور باقی صرف نبی ہیں۔ قرآن مجید میں بالصراحت یعنی نام بنام تو فقط چھبیس نفوس قدسیہ کا تذکرہ موجود ہے۔ جن کی نبوت مسلم ہے۔ باقی کے متعلق قرآن اجمالاً اتنا بیان کرکے خاموش ہو جاتا ہے کہ منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك (سورہ مومن پ ۲۴ ع ۱۲) یعنی بعض انبیاء کا تذکرہ ہم نے کیا ہے۔ اور بعض کا نہیں کیا۔ اسی طرح قرآن مجید میں کئی مقامات پر وارد ہے۔ کہ خدا کی رشد و ہدایت اور سلسلۂ انبیاء کا اجراء کسی خاص قوم و ملک کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ تمام اقوام اور ممالک اس سرچشمۂ فیض سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ولكل امة رسول (سورۃ یونس پ ۱۱ ع ۱۰) ہر ایک قوم کے لئے رسول ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے ولقد بعثنا في كل امة رسولاً (سورۃ نحل پ ۱۴ ع ۱۱) ہم نے ہر قوم کی طرف رسول بھیجا۔ ایک اور جگہ وارد ہے وان من امة الا خلا فيها نذير (سورۃ فاطر پ ۲۲ ع ۱۵) کوئی ایسی قوم نہیں جس پر ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ ایک اور مقام پر یوں مرقوم ہے وكم ارسلنا من نبي في الاولين (سورہ زخرف پ ۲۵ ع ۷) ہم نے پہلی قوموں میں کتنے ہی پیغمبر بھیجے ایک اور جگہ فرمایا ولكل قوم هاد (سورہ پ ۱۳ ع ۷) ہر قوم کے لئے ہادی آیا۔ ان آیاتِ مبارکہ سے اس منصب جلیل کے عہدہ داروں کی کثرت کا اجمالی علم تو ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرتؐ سے پہلے تمام بڑے بڑے ممالک و اقوام میں نبی مبعوث ہو چکے تھے۔ اسی بنا پر

ھو الذی اخبر بہ النبیؐ عن اللہ عزوجل باسمہ ونسبہ وانہ ھو الذی یملأ الارض قسطاً وعدلاً کما ملئت ظلماً وجوراً وانہ ھو الذی یظہر بہ دینہ لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون وانہ ھو الذی یفتح اللہ علی یدیہ

جن کے نام ونسب کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی تھی۔ آپ ہی دنیا کو عدل وانصاف سے اس طرح بھر دیں گے۔ جس طرح کہ وہ اس سے پہلے ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔ آپ ہی وہ مقدس ہستی ہیں۔ جس کے ذریعے سے خداوند عالم اپنے دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب فرمائے گا۔ اگرچہ مشرک اسے ناپسند ہی کریں۔ خداوند عالم آنجنابؑ کے ہاتھ پر مشرق ومغرب تک تمام روئے زمین کو فتح کر دے گا۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ ہندوستان کے کرشن اور چین بلکہ ایران کے زرتشت بلکہ بعض نے بدھ تک پیغمبر کہا ہے اگرچہ امکان میں کلام نہیں۔ لیکن یقین کے ساتھ تعیین نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ایسے امور میں یقین کا ذریعہ وحی ہے اور وہ اس تشخیص وتعیین سے خاموش ہے (سیرۃ النبی) اور تفصیل میں اگرچہ فی الجملہ اختلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ مگر مشہور ومنصور وہی نظریہ ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہے۔ کہ ان کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جن میں پانچ بزرگوار اولوالعزم ہیں۔ تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض۔ (سورۃ بقرہ پ ۳ ع ۱۶)

اولوالعزم کا مطلب کیا ہے؟

اس امر کے بارے میں جو کچھ احادیثِ معصومین علیہم السلام سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اولوالعزم سے مراد وہ بزرگوار ہیں جو شریعت مستقلہ کے حامل تھے۔ نیز ان میں سے ہر لاحق کی شریعت سابق کی شریعت کی ناسخ تھی۔ اور وہ اپنی دعوت میں صاحب عزیمت واستقامت اور اس سلسلہ میں مصائب وشدائد برداشت کرنے میں بہت زیادہ متحمل مزاج اور بلند حوصلہ تھے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور سرکار خاتم الانبیاء علیہ وعلی آلہ افضل التحیۃ والثناء فشریعۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ لا تنسخ الی یوم القیامۃ ولا نبی بعدہ الی یوم القیامۃ فمن ادعی النبوۃ بعد نبینا او اتی بعد القرآن بکتاب فدمہ مباح لکل من سمع ذلک منہ (علل الشرائع ج ۱ ص ۱۱)

افضلیت رسول خدا بر جمیع انبیاء

جناب سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام انبیاء ومرسلین بلکہ تمام کائنات عالم پر افضلیت واشرفیت امت اسلامیہ کا مسلمہ مسئلہ ہے۔ مسلمان اس عقیدہ کے اثبات کے سلسلہ میں دیگر ارباب ملل ومذاہب

مشارق الارض ومغاربہا حتی
لا یبقی فی الارض مکان الا
نودی فیہ بالاذان یکون الدین کلہ للہ
وانہ ھو المھدی اخبر بہ النبی
وانہ اذا نزل عیسیٰ ابن مریم
فصلی خلفہ ویکون المصلی اذ صلی
خلفہ کمن کان مصلیا خلف رسول اللہ

یہاں تک کہ روئے زمین پر کوئی ایسی جگہ باقی نہ رہے گی۔
جہاں سے اذان کی آواز نہ آئے گی۔ ساری دنیا میں بس خدا
کے دین کا ہی ڈنکا بجے گا۔ یہ وہی مہدی موعود ہیں۔ جن کی
بطور پیشین گوئی حضرت رسول خدا صلعم نے خبر دی تھی جب
آپ ظہور فرمائیں گے۔ اس وقت حضرت عیسیٰ بن مریم
علیہما السلام بھی (آسمان سے) اتریں گے۔ اور ان کے پیچھے
نماز پڑھیں گے۔ آنجنابؑ کے پیچھے نماز پڑھنے والا
جناب رسولؐ خدا کے پیچھے نماز پڑھنے والے کی مانند ہوگا۔

سے بہت مناظرے کر چکے ہیں۔ اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے۔ اور دلائل قاطعہ سے اسے
محقق و مبرہن کیا جا چکا ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کی تو گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے اختصار کے ساتھ
بعض اجمالی دلائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

دلیل اوّل:۔ یہ امر اپنے مقام پر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ جناب رسالتمآب اور ان کی
عترتِ اطیابؑ باعثِ خلقتِ کائنات ہیں جیسا کہ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ نے اپنے اسی
رسالہ اعتقادیہ میں فرمایا ہے۔ ان اللہ خلق الخلق لہ (النبیؐ) ولاھلبیتہ ولولاھم لما خلق اللہ
ادم ولا حوا ولا الجنۃ ولا النار ولا الارض ولا السماء ولا شیئاً مما خلق صلوات اللہ علیھم اجمعین۔
ایسا ہی حضرت علامہ مجلسیؒ نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں افادہ فرمایا ہے کہ فھم المقصودون فی ایجاد
عالم الوجود۔ اور یہی مشہور حدیث قدسی لولاک لما خلقت الافلاک کا مفاد ہے پس معلوم ہوا کہ ازجبروت
تا ملکوت اور از عرش تا فرش اور از سماک تا سمک تمام حیوانات و جمادات اور نباتات بلکہ حضرت انسان
بلکہ افتخارِ انسانیت انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا وجود بھی سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کے وجود ذی جود
کے طفیل ہے۔ اور ان بزرگواروں کا وجود بالذات مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصود بالذات کو مقصود بالتبع
پر افضلیت حاصل ہوتی ہے۔

دلیل دوئم:۔ یہ امر بھی روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہے۔ کہ خلاق عالم نے جس قدر فضائل و
محامد اور مناقب و معاجز تمام انبیاء و مرسلین کو فرداً فرداً مرحمت فرمائے تھے۔ وہ تمام کمالات و معجزات
مع شے زائد جناب سرور کائنات کی ذات مجمع کمالات میں سمیٹ کر ودیعت فرمائے۔ اگر خوفِ طوالت

لانہ خلیفۃ ونعتقد انہ لایجوز ان یکون القائم غیرہ بقی فی غیبۃ مابقی ولو بقی غیبۃ عمر الدنیا لم یکن القائم غیرہ لان النبیؐ والائمۃ دلوا علیہ باسمہ ونسبہ وبہ نصّوا وبہ بشروا صلوات اللہ علیہم اجمعین

کیونکہ وہ جناب رسولؐ خدا کے خلیفہ اور انؐ کے وصی ہیں۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے (کہ آنجناب کے سوا کوئی اور شخص قائم (آلِ محمدؐ) نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ مدتِ دراز تک ہی کیوں نہ غائب رہیں۔ بلکہ اگر ان کی غیبت کا سلسلہ زندگانیٔ دنیا تک بھی دراز ہو جائے۔ تب بھی ان کے علاوہ کوئی اور شخص قائم (آلِ محمدؐ) نہیں ہو سکتا کیونکہ جناب رسولؐ خدا اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے ان ہی کا نام ونسب بتایا ہے۔ اور انہی (کی خلافت) پر نص فرمائی ہے۔ اور انہی (کے ظہور) کی بشارت دی ہے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

دامنگیر نہ ہوتا تو یہاں بعض انبیاء کے ساتھ جناب کا تقابل کر کے اس امر کو مبرہن کیا جاتا۔ مگر آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بیاں است۔ تفصیل کے شائقین کتب مفصلہ مثل بحار الانوار جلد ششم اور کتاب انوار المواہب حصہ اول وغیرہ کی طرف رجوع کر کے تسکین قلب حاصل کر سکتے ہیں۔ ولنعم ما قیل:

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری ۔۔۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس امر کا بیان فائدہ سے خالی نہیں ہے کہ خداوند عالم نے انبیاء کو جس قدر معجزات عطا فرمائے وہ سب انبیاء کے دارِ دنیا سے تشریف لے جانے کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔ آج نہ ید بیضا ہے نہ دمِ عیسٰیؑ نہ تسخیر سلیمانی ہے نہ تکلم موسوی۔ خدائے تعالیٰ نے جہاں ایسے ہزاروں معجزات آنحضرتؐ کو مرحمت فرمائے وہاں ان کو ایک ایسا معجزہ بھی عطا کیا کہ آپ کو دنیا سے تشریف لے گئے تقریباً چودہ سو سال ہو رہے ہیں۔ مگر وہ معجزہ بدستور سابق اب بھی موجود ومشہود ہے۔ اور قیام قیامت تک برقرار رہے گا۔ الغرض وہ ہے قرآن مجید جو اس فصاحت وبلاغت اور مطالب ومعانی کی عظمت وبلندی کی وجہ سے معجزہ ہے۔ اور روزِ نزول سے اہل عالم کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ بلکہ وہ منکرین رسالت کو یہاں تک تحدی وچیلنج کرتا ہے۔ اور ان کے جذبات کو ابھارتا ہے کہ قل لئن اجتمعت الجن والانس علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔ اس کی تفصیل بعض سابقہ ابواب میں گذر چکی ہے۔

دلیل سوم:۔ جناب رسولؐ خدا تمام عالمین کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں۔ (تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا) اور سلسلۂ انبیاء کو آپ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیا گیا ہے۔

وقد اخرجت هذا الفصل من كتاب الهداية — میں نے اس فصل کو اپنی کتاب ہدایہ سے اخذ کیا ہے۔

اور ان کی شریعت مقدسہ تمام شرائع و ادیان سے افضل و اکمل ہے اور قیامت تک کے لئے ہے۔ بخلاف باقی انبیاء و مرسلین کے کہ ان کی نبوتیں و رسالتیں محدود ہوا کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جس کی نبوت و رسالت کے حدود زیادہ وسیع ہوں گے۔ اور جس کی شریعت زیادہ مکمل ہو گی۔ وہ یقیناً دوسرے حضرات سے افضل و برتر ہو گا۔ کما لا یخفیٰ۔

شریعت اسلامیہ کی بعض خصوصیات

یہاں نہایت اختصار کے ساتھ آپ کی شریعت مقدسہ کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے (۱) شریعت مقدسہ اسلامیہ کی پہلی اور بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس کے متعلق اس کے اندر تفصیلی احکام موجود نہ ہوں۔ اسلام کے علاوہ موجودہ ادیان عالم میں سے کوئی بھی ایسا دین و مذہب نہیں ہے جسے مکمل ضابطہ حیات و نظام زندگی کہا جا سکے۔ یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ تمام بنی نوع انسان وغیرہ کے لئے ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے۔ جو اس کے تمام فطری و عقلی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

(۲) دوسری خصوصیت دین اسلام کی یہ ہے کہ اس میں فقط روحانی ترقی پر ہی زور نہیں دیا گیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مادی ترقی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ تاکہ دین و دنیا کا صحیح امتزاج ہو اور انسانی زندگی میں اعتدال پیدا ہو۔ تاکہ نہ تو انسان محض مادیات میں مبتلا ہو کر حیوانات کے زمرہ میں داخل ہو کر انہیں میں سے بلکہ ان سے بھی بدتر ہو جائے۔ اور نہ ہی فقط روحانی بن کر ترک دنیا کر کے خانہ نشین ہو کر بیٹھ جائے (لارھبانیۃ فی الاسلام) مگر باقی ادیان میں بالعموم یہ نقص ہے۔ کہ وہ فقط مادی یا روحانی ایک ہی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ کما لا یخفیٰ۔

(۳) شریعت اسلامیہ کے احکام و مسائل میں اتنی لوچ اور لچک ہے کہ وہ ہر ملک و قوم کے لئے قابل عمل اور قابل قبول ہیں۔ یہ عالمی اور بین الاقوامی شریعت ہے۔

(۴) شریعت اسلامیہ اتنی سہل و آسان ہے کہ ہر امیر و غریب۔ صحیح و بیمار، حاضر و مسافر بآسانی ان پر عمل کر کے راہ نجات تلاش کر سکتا ہے۔ اس میں ہرگز کوئی عسر و حرج نہیں ہے۔

(۵) اس کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ شریعت مقدسہ اسلامیہ کے تمام احکام فطرت صحیحہ کے

عین مطابق ہیں۔ کسی جگہ بھی احکامِ شریعت اور احکامِ فطرت کے درمیان تصادم واقع نہیں ہوتا۔

دلیل چہارم:۔ فریقین کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کو جناب ختمی مرتبتؐ کی نبوت و رسالت کا اقرار و اعتراف کرنے کے بعد نبوت ملی تھی۔ جیسا کہ آیت مبارکہ واسئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا کی تفسیر میں وارد ہے (سابع بحار۔ بصائر، اور ینابیع وغیرہا) لہٰذا جب باقی انبیاء کی نبوتیں ہی آنحضرت کی اقرارِ نبوت کی ممنون احسان و مرہون منت ہیں۔ تو یقیناً آپ ان سے اشرف و افضل ہوں گے۔

دلیل پنجم:۔ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ انبیاء و مرسلین نے اپنی مشکلات کے وقت آنحضرتؐ کی ذات والا صفات کے ساتھ توسل کرکے بارگاہِ رب العزت سے اپنے مصائب و آلام کو دور کرایا ہے۔ اس قسم کی بکثرت روایات سابع بحار الانوار و بصائر الدرجات وغیرہ میں موجود ہیں۔ لہٰذا خود انبیاء کا آپ کی ذات کے ساتھ توسل کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہے، کہ وہ حضرات جانتے تھے کہ آنحضرتؐ ان سے افضل ہیں وھو المطلوب۔ (ختم نبوت قرآن کریم کی روشنی میں دیکھو ص۹۸)

ختم نبوت عقل سلیم کی روشنی میں

اگر ہر قسم کے تعصب و عناد کی پٹی آنکھوں سے اتار کر خداداد عقل سلیم کی روشنی میں سوچا جائے تو عقل سلیم بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اب ہرگز نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ عقل و شرع کی رو سے چار صورتوں میں نبی کے تقرر کی ضرورت درپیش آتی ہے۔ اوّل یہ کہ کسی ایسی خاص قوم میں نبی بھیجا جائے جس میں پہلے کوئی نبی نہ آیا ہو۔ اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اس تک نہ پہنچا ہو۔

دوم۔ سابقہ نبی کی دی ہوئی تعلیم بالکل بھلا دی گئی ہو۔ یا اس میں اس طرح تحریف کر دی گئی ہو کہ اس کی اتباع ممکن نہ رہی ہو۔ سوم۔ سابقہ نبی کے ذریعہ لوگوں کو مکمل تعلیم و ہدایت نہ ملی ہو۔ چہارم۔ ایک نبی کی امداد و اعانت کے لئے ایک اور نبی کی ضرورت ہو۔ بنظرِ غائر حالات کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان ضرورتوں میں سے کوئی ضرورت بھی سرکار ختمی مرتبتؐ کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔ قرآن شاہد ہے کہ حضور کو تمام عالمین کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا گیا ہے۔ اور تمدن عالم کی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپ کی بعثت کے وقت ہی آپ کی دعوت تمام قوموں تک پہنچ گئی تھی اور اب تک مسلسل پہنچ رہی ہے۔ لہٰذا ہر ہر قوم میں الگ الگ نبی بھیجنے کی حاجت باقی نہیں ہے۔ نیز قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی صورت میں آنحضرتؐ کی مقدس تعلیمات اپنی صحیح صورت میں موجود ہیں۔ ان میں کسی قسم کی کوئی تغییر و تحریف نہیں ہوئی۔ پھر کسی نبی کی ضرورت کیا ہے۔ نیز یہ بات بھی قرآنی تعلیم کی روشنی میں روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہے کہ آنحضور کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ بنابریں اب تکمیل کیلئے

بھی کسی نبی کی احتیاج باقی نہیں ہے۔ باقی رہی چوتھی صورت تو ظاہر ہے کہ اگر اس کے لئے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضور کے زمانے میں آپ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ جب اس وقت نہیں ایسا کیا گیا۔ تو اب اس کی کیا ضرورت ہے؟ جب بعثت انبیار کی یہ چاروں عقلی صورتیں مفقود ہیں تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ بعثت نبی کی پانچویں کونسی صورت ہے؟

باقی قوموں کے اخلاق و اطوار کا بگاڑ اور اس کی اصلاح۔ تو صرف اصلاح احوال کے لئے نبی کی ضرورت نہیں بلکہ مخلص مصلحین کی ضرورت ہے۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ امتِ مسلمہ میں ایسے متعدد افراد موجود ہیں جو تقریر و تحریر اور وعظ و ارشاد کے ذریعے یہ فریضہ بطریق احسن انجام دے رہے ہیں۔

بنابریں حقائق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اب کسی نبی کی بعثت امت کے لئے باعث رحمت نہیں بلکہ باعثِ لعنت ہے۔ کیونکہ جب کسی قوم میں نبی آتا ہے۔ تو فوراً کفر و ایمان کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ ماننے والے ایک امت اور نہ ماننے والے دوسری امت قرار پائیں گے۔ اور یہ اختلاف صرف فروعی نہیں بلکہ اصولی ہو گا۔ لہٰذا اس طرح اتحاد و اتفاق کی بجائے تفرقہ و اختلاف پیدا ہو گا۔ اور پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس ضلالت و گمراہی کی ذمہ داری خدا اور رسولؐ پر عائد ہو گی کہ اگر آنحضرتؐ کے بعد کسی نبی نے آنا تھا۔ اور اس پر ایمان لانا بھی ضروری تھا۔ تو خدا و رسولؐ نے اس کے متعلق کیوں خاموشی اختیار فرمائی۔ یہ بات خدا کی حکمت بالغہ اور رحمتِ کاملہ سے بالکل بعید ہے۔ کہ وہ اپنے بندوں کو خواہ مخواہ کفر و ایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے (از رسالہ ختم نبوت) لہٰذا جب خدا و رسولؐ نے کسی آنے والے نبی کے متعلق کوئی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ آنحضرتؐ پر عہدۂ نبوت و رسالت کے اختتام کا اعلان واجب الاذعان فرمایا ہے تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ سلسلۂ جلیلہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ وھو المطلوب۔

ختم نبوت اجماع مسلمین کی روشنی میں

جہاں تک اس مسئلہ پر تمام مکاتیب فکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے اتفاق و اجماع کا تعلق ہے وہ عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔ بوجہ شدتِ اختصار اسلامی دنیا کے اکابر علماء کے بیانات شافیہ یہاں پیش نہیں کئے جا سکتے۔

چند شکوک و شبہات کا ازالہ۔ پہلا شبہ اور اس کا جواب

کہا جاتا ہے کہ لا نبی بعدی میں "لا" نفی کمال کے لئے ہے جیسے لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد۔ مسجد کے پڑوسی کی نماز نہیں ہوتی مگر مسجد میں یعنی کامل نہیں ہوتی۔

بنا بریں لا نبی بعدی کا مطلب یہ ہوگا کہ میرے بعد کوئی کامل نبی نہیں آئے گا۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ لائے نفی جنس کیلئے ہے اس کا حقیقی مفہوم جنس کی نفی ہے۔ اگر کسی جگہ کسی داخلی یا خارجی قرینہ کی وجہ سے نفی کمال میں استعمال ہو تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ہر جگہ یہی مجازی معنی مراد لیے جائیں۔ ؟ ورنہ اسی بنیاد پر کوئی تثلیث یا صنم پرست یہ کہہ دے کہ لا الہ الا اللہ۔ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کامل معبود نہیں ہے تو معترض کے پاس اس کا کیا جواب ہے ؟ اس طرح اگر کوئی منکر قرآن یہ کہہ دے کہ ذلک الکتاب لا ریب فیہ میں لا نفی کمال کے لئے ہے کہ قرآن میں ریب و شک کامل نہیں ہے یعنی کچھ ناقص اور کمزور قسم کا ریب موجود ہے تو معترض اس کا کیا جواب دے گا۔ ؟ جس دلیل کی بنا پر لا الہ الا اللہ میں لا کو نفی کمال کے لئے قرار دینا ممنوع ہے۔ اسی دلیل سے لا نبی بعدی میں بھی ممنوع ہے۔

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

خاتم۔ بمعنی مہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب جو نبی آئے گا وہ آپ کے زیر نگیں ہوگا۔ اور آپ کی مہر تصدیق سے اسے نبوت ملے گی اس شبہ کی رکاکت محتاج بیان نہیں ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ یہ مجسٹریٹ کی مہر ہے یا یہ جج کی مہر ہے۔ تو کوئی صحیح الدماغ آدمی اس کا یہ مطلب لیتا ہے کہ اس مہر کے لگانے سے مجسٹریٹ یا جج بنتے جاتے ہیں !؟ تو یہاں کس طرح یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔ ان معنی کے اعتبار سے جو صحیح مطلب نکلتا ہے۔ اس کو اوپر آیت پر خاتم النبیین کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

جب کسی شخص کو خاتم الشعراء یا خاتم الفقہاء کہا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس شخص کے بعد کوئی شاعر یا فقیہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فن کے کمالات اس شخص پر ختم ہیں۔ اس شبہ کا جواب بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی جگہ بطور مبالغہ انسانی یہ لفظ کامل یا افضل کے معنی میں استعمال ہو۔ تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ لغت کے اعتبار سے لفظ خاتم کے معنی ہی کامل یا افضل کے ہو جائیں۔ اور اس کے حقیقی معنی (آخری) غلط ہو جائیں ؟ مالکم کیف تحکمون

بجز ختمی مرتبت دیگر انبیاء پر آئمہ ہدیٰ کی افضلیت

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی افضلیت پر بھی اوپر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اب یہاں آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی افضلیت پر کچھ تبصرہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے متقدمین کے درمیان افضلیت آئمہ بر انبیائے سلف کے بارہ میں تین قول تھے۔ پہلا قول یہ کہ یہ حضرات سوائے جناب ختمی مرتبت کے دیگر تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں۔ دوسرا یہ کہ انبیاء کرام آئمہ علیہم السلام سے افضل ہیں۔

تیسرا قول یہ تھا کہ انبیائے اولی العزم ان سے افضل ہیں۔ لیکن دیگر انبیاء سے یہ بزرگوار افضل ہیں۔ مگر متاخرین علماء اعلام کا پہلے قول پر قریباً اتفاق ہو چکا ہے۔ کہ آئمہ اطہار سوائے جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیگر تمام انبیاء اولی العزم وغیرہم سے افضل واشرف ہیں۔ اور اس عقیدہ کی صحت پر بکثرت دلائل موجود ہیں۔ ہم بنظر اختصار ذیل میں چند دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دلیل اوّل۔ یہ امر اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے کہ آئمہ اہل بیت علوم قرآن نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم وفضل کے صحیح وارث ومالک ہیں۔ بمطابق آیت مبارکہ ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا (ینابیع المودۃ۔ فرائد السمطین وغیرہ) اور ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کا علم تمام انبیاء ومرسلین کے علم وفضل سے زیادہ اور علوم قرآنیہ تمام کتب سماویہ کے علوم سے افزوں ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ معیار فضیلت کثرت علم مع العمل ہے ہل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ بنابریں حضرات ائمہ طاہرینؑ کو انبیاءؑ و مرسلینؑ سابقین سے افضل واشرف تسلیم کرنا پڑے گا۔

دلیل دوئم:۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے۔ کہ آپ نے فرمایا لولا ان خلق اللہ علیاً لم یکن لابنتی فاطمۃ کفو آدم فمن دونہ (عیون اخبار الرضا۔ ینابیع المودۃ وغیرہ) اگر خداوند عالم علیؑ کو پیدا نہ کرتا۔ تو میری بیٹی فاطمہ کا کوئی کفو وہمسر نہ تھا۔ خواہ آدمؑ ہوں۔ یا دیگر انبیاء۔ ظاہر ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے رشتہ ابوت و نبوت سے قطع نظر کر کے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ اس سے روز روشن کی طرح واضح ہوتا ہے۔ کہ جناب امیر المومنینؑ ان انبیائے سلف سے افضل ہیں۔ اسی سے دیگر آئمہ اطہارؑ کی افضلیت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ لانہم فی الفضل سواء۔ حضرت صادق علیہ السلام نے ابوصباح کنانی سے فرمایا۔ یا ابا الصباح انہ لا یجد احد حقیقۃ الایمان حتی یعلم ان لآخرنا ما لاولنا (بحار الانوار) اے ابوصباح! اس وقت تک کوئی شخص حقیقت ایمان کو پا ہی نہیں سکتا جب تک وہ یہ یقین حاصل نہ کرے۔ کہ ہمارے آخری کے لئے وہی فضل وکمال ثابت ہے جو ہمارے پہلے کے لئے ثابت ہے۔

دلیل سوئم:۔ یہ دلیل دراصل دلیل دوئم کی ہی فرع ہے۔ کہ آئمہ اہل بیتؑ کے علوم وکمالات انبیاء کے علوم وکمالات سے اتم واکمل ہیں۔ بکثرت احادیث میں وارد ہے۔ کہ اسم اعظم کے کل تہتر حرف ہیں۔ جناب آدمؑ کو پچیس حرف عطا ہوئے تھے۔ اور جناب نوحؑ کو پندرہ۔ جناب موسیٰؑ کو پانچ حرف اور جناب ابراہیمؑ کو آٹھ حرف اور جناب عیسیٰؑ کو صرف دو حرف۔ اسی طرح کسی نبی کو ایک حرف اور کسی کو دو وعلی ہذا القیاس اور انہی کے ذریعہ سے ان کے کمالات بھی وقوع پذیر ہوتے تھے۔ لیکن جناب سرور کائناتؐ کو بہتر حروف مرحمت ہوئے۔ فقط ایک حرف خلاق عالم نے اپنے علم مخزون میں رکھا۔ اور یہ جو اسماء آنحضرتؐ کو عطا

ہوئے۔ وہ حضرات آئمہ معصومین علیہم السلام کی طرف منتقل ہوئے۔ (اصول کافی۔ بحار۔ بصائر الدرجات وغیرہ) اسی وجہ سے ان کے معجزات و کمالات زیادہ ہیں۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ ان کا مقام انبیائے سلف سے بلند تر ہے۔

دلیل چہارم:۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث فریقین کی کتب میں موجود ہے کہ آپ نے فرمایا۔ من اراد ان ینظر الی آدم فی علمہ والی نوح فی زہدہ والی ابراھیم فی خلتہ والی موسیٰ فی ھیبتہ والی عیسیٰ فی تقواہ فلینظر الی علی بن ابی طالبؑ (سنن بیہقی۔ ینابیع المودۃ وغیرہ) جو شخص چاہتا ہے کہ آدمؑ کا علم وفضل، نوحؑ کا حلم، ابراہیمؑ کی خلت ومحبت۔ موسیٰ کی ہیبت وجلالت اور حضرت عیسیٰؑ کا تقویٰ وطہارت دیکھے وہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کو دیکھ لے۔ جس سے افضلیت علیؑ واضح وعیاں ہے۔ کیونکہ جو بزرگوار مختلف حضرات کے انفرادی کمالات کا جامع ہوگا۔ وہ یقیناً ہر ایک سے افضل واعلیٰ ہوگا۔ اور ابھی اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ سب آئمہ اہل بیتؑ فضل وکمال میں برابر ہیں (وان کان لعلی مقامہ)

دلیل پنجم:۔ بصائر الدرجات سابع بحار الانوار وغیرہ کتب معتبرہ میں اس قسم کی متعدد احادیث موجود ہیں۔ کہ تمام انبیاء کو اس وقت تک نبوت عطا نہیں ہوئی۔ جب تک کہ انہوں نے خدا کی توحید اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے ساتھ ساتھ آئمہ طاہرینؑ کی امامت کا اقرار نہیں کیا۔ اسی طرح نام بردہ کتب میں انبیاء کرام کا مشکلات ومصائب میں ان حضرات قدسی صفات کو بارگاہ قدرت میں شفیع ووسیلہ بنانا بھی ثابت ہے۔ اس سے بھی ان کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ ہم اس موضوع پر ایک مفصل ومدلل مضمون محمد یہ جنتری سرگودھا ۱۹۶۵ء میں لکھ چکے ہیں۔ شائقین تفصیل اس کی طرف رجوع کریں۔

ازالہ شبہ

افضلیت آئمہ بر انبیائے ماسلف کے متعلق ایک شبہ پیش کیا جاتا ہے۔ کہ انبیاء کے برابر کسی اور کا ثواب نہیں ہو سکتا لہذا کوئی غیر نبی کسی نبی سے افضل بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ شبہ بچند وجہ باطل ہے۔

اولاً۔ یہ مسلم ہی نہیں کہ معیار افضلیت کثرت ثواب ہے۔ کیونکہ قرآن سے تو معیار افضلیت کثرت علم وطاقت معلوم ہوتا ہے۔ ان اللہ اصطفاہ علیکم وزادہ بسطۃً فی العلم والجسم۔ لہذا یہ شبہ بناء فاسد بر فاسد کا مصداق ہے۔

ثانیاً یہ نظریہ کہ کبھی غیر نبی کا ثواب نبی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ خود معترضین کی روایات کے خلاف ہے۔ ان کی بکثرت روایات سے غیر انبیاء کے ثواب انبیاء سے زیادہ مرقوم ہیں۔ چنانچہ احیاء العلوم میں مرقوم ہے روی عن ابن مسعود من طلب العلم لیحدث الناس ابتغاء وجہ اللہ اتاہ اللہ اجر سبعین نبیاً۔ جو شخص اس غرض سے علم حاصل کرے کہ خدا کی خوشنودی کے لئے لوگوں کو حدیثیں سنائے تو خدا اسے ستر نبی کا اجر وثواب عطا کرے گا۔ شیخ عبد القادر جیلانی اپنی کتاب غنیۃ الطالبین میں لکھتے ہیں۔ من تعلم باباً من العلم لیعلم الناس

اعطی ثواب سبعین نبیاً وصدیقاً۔ جو شخص علم کا کوئی باب اس مقصد کے تحت حاصل کرے کہ لوگوں کو علم پڑھائے گا تو خداوند عالم اسے ستر نبی و صدیق کا ثواب عطا کرے گا۔ پس جب بنا بر روایات اہل سنت بعض عام افراد امت کا اجر و ثواب ستر ستر انبیاء کے برابر ہو سکتا ہے۔ تو آئمہ اہل بیتؑ کی افضلیت پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جو صرف سادات امت ہی نہیں بلکہ خیر البریہ ہیں۔

ثالثاً۔ بنا بر تسلیم آنکہ غیر نبی کا ثواب نبی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ یہ حکم نبیؐ اور اس کی امت کے لوگوں کے ساتھ مختص ہے۔ مطلب یہ کہ نبی جن لوگوں کا نبی ہے وہ ان سب سے ضرور افضل ہوگا۔ اس حکم میں عمومیت نہیں ہے۔ لہذا چونکہ حضرات آئمہ معصومینؑ ان انبیائے ماسلف کی امت میں داخل نہیں ہیں۔ لہذا ان کا اجر و ثواب گذشتہ انبیاء سے زائد ہو۔ اور اس قاعدہ کی رُو سے بھی وہ ان سے افضل ہوں۔ تو اس میں کوئی جائے تعجب نہیں ہے۔

آئمہ اہل بیتؑ کی امامت و خلافت کا اثبات

آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی خلافت و امامت کی نصوص اس قدر کثیر التعداد ہیں۔ کہ ان سب کے لئے ایک ضخیم جلد بھی ناکافی ہے۔ علماء اعلام نے اس سلسلہ میں عربی۔ فارسی اور اردو وغیرہ میں بہت سی کتب لکھی ہیں۔ ہم نے بھی اس موضوع پر دو کتابیں بنام (۱) تحقیقات الفریقین فی حدیث الثقلین (۲) اثبات امامۃ الائمۃ الاطہار فی ضوء العقل والآیات والاخبار لکھی ہیں۔ جن میں ان نصوص مبارکہ کا کافی ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے اور عقلی و نقلی ادلہ قاطعہ و براہین ساطعہ سے مخالفین اہل بیتؑ کی خلافت کو باطل کر کے آئمہ اہل بیتؑ کی خلافت و وصایت کو ثابت کیا گیا ہے۔ یہاں اس موضوع پر کچھ تفصیلی تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے اس مطلب کی تحقیق کو ہم اپنی نام بردہ کتب کے حوالہ کرتے ہیں۔ اب جب کہ احسن الفوائد طبع ثانی کے لئے پریس میں بھیجی جا رہی ہے۔ اثبات الامامت طبع ہو کر اہل ایمان کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے والحمد للہ ہاں محض اس خیال سے کہ یہ کتاب مستطاب بھی نصوص امامت آئمہؑ سے بالکل خالی نہ رہ جائے بطور تبرک و تیمناً دو آیات اور دو روایات لکھ کر مختصر طور پر ان کی تقریب استدلال پیش کی جاتی ہے۔

پہلی آیت مبارکہ

ارشاد قدرت ہے۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (سورۃ نساء پ ۵ ع ۴) اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان ذوات کی جو تم میں سے صاحبان امر ہیں۔ یہ امر اپنے مقام پر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے۔ کہ صیغۂ امر وجوب میں حقیقت ہے۔ جب تک استحباب کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ اسے وجوب پر ہی محمول کیا جاتا ہے۔ بنا بریں یہاں اسے وجوب پر حمل کرنے کے لئے اگرچہ استحباب کے قرینہ کا نہ ہونا ہی کافی تھا۔

چہ جائیکہ یہاں تو خود وجوب پر قطعی قرینہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا و رسول کی اطاعت بالاتفاق واجب ہے اور چونکہ اطاعتِ اولی الامر بھی اطاعت خدا و رسول کے ساتھ مقرون ہے لہذا وہ بھی واجب و لازم ہی ہوگی۔ نیز یہ حقیقت ظاہر ہے کہ اطاعتِ خدا و رسول کسی خاص زمان و مکان کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ ہر زمان و ہر مکان اور ہر حال میں ہر مکلف پر واجب ہے۔ اسی طرح اطاعت اولی الامر بھی ہر زمان و ہر مکان اور ہر حال میں ہر شخص پر لازم ہوگی۔ یہ امر بھی محتاج دلیل نہیں ہے کہ جس بزرگوار کی اس طرح اطاعت مطلقہ واجب ہو اس کے لئے معصوم ہونا ضروری ہے۔ اس حقیقت کا فخر الدین رازی جیسے امام المشککین نے بھی اقرار کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر کبیر ج ۳ ص۳۵۷ طبع اسلامبول پر رقمطراز ہیں۔ ان اللہ تعالیٰ امر بطاعة اولی الامر علی سبیل الجزم فی هذه الآیة ومن امر الله بطاعته علی سبیل الجزم والقطع لابد وان یکون معصوماً عن الخطاء یعنی خداوند عالم نے اس آیت مبارکہ میں وجوبی طور پر اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور جس کی اطاعت وجوبیہ کا خداوند عالم حکم دے۔ اس کے لئے معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ اولی الامر کو مثل رسول عصمت و طہارت کے درجہ رفیعہ پر فائز ہونا چاہیئے اور یہ امر روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہے کہ امت محمدیہ میں سوائے آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے اور کوئی بھی شخص معصوم و مطہر نہیں ہے۔ ہاں ان ذواتِ مقدسہ کی عصمت و طہارت قرآن کریم احادیث سید المرسلین اور عقل سلیم کی روشنی میں محقق و مسلّم ہے۔ قطع نظر دیگر آیاتِ قرآنیہ کے صرف آیتِ تطہیر ہی اس مقصد کے اثبات کے لئے کافی ہے۔ (ملاحظہ ہوں صحیح مسلم ج ۲ ص۲۵۹ الشرف المؤبد ص۶۷ درمنثور ج ۵ ص۱۹۸ صواعق محرقہ ص۸۵ ینابیع المودة ص۲۲۵ طبع بمبئی وغیرہ) اور جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ بھی بکثرت ہیں صرف بطور نمونہ ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ ابن عباس بیان کرتے ہیں۔ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انا و علی والحسن والحسین وتسعة من ولد الحسینؑ مطهرون معصومون" میں نے آنحضرتؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں اور علی اور حسن حسین اور حسینؑ کے نو فرزند سب کے سب مطہر اور معصوم ہیں (فرائد السمطین ج ۲ باب ۳۱ ینابیع المودة باب ۷۷ ص۵۳۴)۔ لہذا وہ بزرگوار اولوالامر کے مصداق ہوں گے۔ ان مقدمات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اس آیت وافی ہدایہ کی آئمہ اہل بیتؑ کی خلافت و امامت پر دلالت محتاج بیان نہیں رہتی۔ معمولی عقل و دانش رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ کہ جس بزرگ کی اطاعت مطلقہ واجب و لازم ہو۔ وہ یا نبی ہو سکتا ہے۔ یا اس کا وصی۔ لیکن چونکہ اولوالامر نبی تو ہیں نہیں۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ وہ اوصیاء نبی ہیں۔ وهو المقصود۔

دوسری آیت مبارکہ ارشاد رب العزت ہے۔ یا ایها الذین امنوا اتقوا اللہ

دکونوا مع الصادقین (سورہ مائدہ پ ۱۱ ۴ م) اے ایمان والو. خدا سے ڈرو اور صادقین کی معیت اختیار کرو.
امامتِ اہل بیتؑ پر اس آیت مبارکہ کی دلالت کو واضح کرنے کے لئے چند امور کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے. اول یہ کہ ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے. کہ صیغہ امر وجوب میں حقیقت ہے. بنا بریں جس طرح تقویٰ الہیٰ اختیار کرنا واجب ہے. اسی طرح صادقین کی معیت اختیار کرنا بھی لازم ہوگی. دوم یہ کہ چونکہ شریعت مقدسہ اسلامیہ کسی خاص ملک وملت اور کسی خاص مکان وزمان کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ یوم قیامت تک تمام بنی نوع انس وجن کی صلاح وفلاح کی کفیل ہے. لہذا اس کے اوامر ونواہی بھی قیامت تک کے لئے تمام جن وانس کو شامل ہوں گے. اور صادقین کی معیت اختیار کرنے کے حکم کے دائرہ میں تمام لوگ داخل ہوں گے. سوم یہ کہ عقل سلیم یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہے. کہ جن افراد کو یہ حکم دیا جا رہا ہے وہ اور ہیں. اور جن کی معیت اختیار کرنے کا ارشاد ہو رہا ہے. وہ صادقین اور ہیں. ورنہ تابع ومتبوع کا اتحاد لازم آئے گا جو بداہۃً باطل ہے. چہارم یہ کہ ارباب دانش پر یہ امر مخفی ومستور نہیں ہے کہ اس معیت سے مراد معیت مکانیہ نہیں ہے کہ تمام اطراف واکناف سے تمام مسلمان اپنے آپ کو صادقین تک پہنچائیں. اور ہر وقت ان کے ہمراہ رہیں. جو کہ تکلیف مالایطاق ہونے کی وجہ سے محض غلط ہے. لہذا ماننا پڑے گا کہ اس معیت سے مراد معیت روحانیہ یعنی معیت فی القول والعمل ہے. یعنی تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ اعتقاد وعمل میں صادقین کی اتباع کریں. پنجم یہ کہ اس سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ قیام قیامت تک ہر دور وہر زمانہ میں صادقین میں سے کسی نہ کسی فرد فرید کا وجود ضروری ہے. تاکہ اہل ایمان اس کی معیت اختیار کر کے نجاتِ دارین حاصل کر سکیں. جیسا کہ مشہور حدیث نبویؐ من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ جاھلیۃ بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہے. ششم یہ کہ جب معیت سے مراد اعتقاد وعمل میں اتباع وپیروی کرنا مراد ہے تو ماننا پڑے گا کہ صادقین کو ہر صغیرہ وکبیرہ گناہ سے مطہر ومعصوم ہونا چاہیئے. جیسا کہ آیت بالا کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے. ہفتم یہ کہ قطع نظر دیگر ادلہ وبراہین کے اسی آیت کے الفاظ بتلاتے ہیں. کہ حقیقی صادقین وہی ہوں گے. جو معصوم ہوں گے. کیونکہ علی الاطلاق صادق وہی کہلا سکتا ہے. جو اول عمر سے لے کر آخر عمر تک عمداً وسہواً ہر قولی وفعلی کذب سے محفوظ ومصئون رہا ہو. اور ایسا شخص معصوم ہی ہو سکتا ہے. ہشتم یہ کہ امتِ محمدیہ میں سوائے آئمہ اہل بیتؑ کے اور کوئی شخص درجہ عصمت پر فائز نہیں ہے. اور نہ ہی کسی نے اس امر کا ادعا کیا ہے. لہذا ماننا پڑے گا کہ صادقین کے مصداق آئمہ اہل بیت علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں.
نہم یہ کہ اگر اب تک بھی تسلی نہ ہوئی ہو تو بعض تصریحات ملاحظہ ہوں.
تفسیر درمنثور ج ۳ ص ۲۹۱ پر جناب ابن عباس سے کونوا مع الصادقین کی تفسیر کونوا مع علی بن ابی طالب

مروی ہے۔ ینابیع المودۃ ج ۱ باب ۳۹ ص ۱۱۵ میں اس کی تفسیر میں لکھا ہے۔ الصادقون فی ھذہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم واھل بیتہ۔ مناقب خوارزمی میں (علی ما نقل عنہ) اس کی تفسیر یوں مروی ہے الصادقون ھم الائمۃ من اھل البیتؑ۔ اور کتاب فرائد السمطین حموینی مخطوط ج ۲ باب ۶۹ میں کونوا مع الصادقین کی تفسیر اس طرح لکھی ہے۔ کونوا مع آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ۔ ان حقائق کی روشنی میں کا الشمس فی رابعۃ النہار واضح و آشکار ہو گیا کہ صادقین سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہی ہیں۔ دوم یہ کہ ان کی اطاعت مطلقہ کا حکم دیا گیا ہے اور یہ حقیقت محتاج بیان نہیں ہے کہ جس کی اس طرح اتباع واجب و لازم ہو وہ نبی یا امام ہی ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ یہ بزرگوار نبی تو ہیں نہیں۔ لہٰذا ان کو لا محالہ امام خلق و خلیفۂ مطلق تسلیم کرنا پڑے گا۔

پہلی روایت

حسب الوعدہ ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان بے شمار احادیث میں سے جو امامت آئمہ اطہار پر دلالت کرتی ہیں۔ بنظر اختصار یہاں صرف دو حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی حدیث وہ ہے جو متفق علیہ بین الفریقین ہے۔ اور حدیث ثقلین کے نام سے مشہور ہے کہ جناب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بار اور بالخصوص اپنے آخری لمحات حیات میں مجمع اصحاب کو خطاب کر کے فرمایا۔ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھلبیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی وانھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض (حدیث نبوی متواتر) اے مسلمانو! میں تمہاری رشد و ہدایت کے لئے دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب دوسری اپنی عترت اہلبیتؑ جب تک تم ان دونوں کے دامن کے ساتھ متمسک رہو گے۔ ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہو گے اور یہ دونوں بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں۔ اس حدیث کی مکمل تشریح و توضیح اس کے تواتر کے اثبات، مصداق عترت اہل بیتؑ کی تعیین اور آئمہ اہل بیتؑ کی خلافت بلافصل پر اس کی وجہ دلالت کی تبیین کے لئے تو ایک دفتر درکار ہے۔ اس کے لئے ہماری کتاب تحقیق الفریقین فی حدیث الثقلین قابل دید ہے۔ یہاں فقط دو چار جملوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ہر صاحب دانش و بینش جانتا ہے کہ کسی بھی ملکی نظام کو بطریق احسن چلانے اور باقی رکھنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک یہ کہ اس کا ایک جامع دستور العمل اور قانون موجود ہو۔ دوم یہ کہ اس کے نافذ کرنے اور اس کی تشریح و توضیح کرنے والے مخصوص کامل العلم والعمل افراد موجود ہوں۔ اسی طرح جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے بعد نظام دینی کو برقرار رکھنے کے لئے دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ قرآن دین کا دستور العمل اور قانون ہے اور آئمہ اہل بیت اس کے شارح اور نافذ کرنے والے ہیں۔ اور یہی بات اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ یہی حضرات

مسندِ رسولؐ کے وارث ہیں اور انؐ کے منصب پر ان کے قائم مقام ہیں جنہیں اصطلاحِ شریعت میں خلیفہ وامام کہا جاتا ہے۔ وھو اوضح من ان یخفیٰ۔

دوسری روایت شریفہ کتاب کفایۃ الاثر۔ ینابیع المودۃ وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ جب آیت مبارکہ اولی الامر نازل ہوئی تو میں نے بارگاہِ نبوی میں عرض کی۔ یارسول اللہ عرفنا اللہ و رسولہ فمن اولوالامر الذین قرن اللہ طاعتھم بطاعتک؟ یارسولؐ اللہ ہم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کو تو پہچان لیا ہے۔ مگر یہ اولوالامر کون ہیں، جن کی اطاعت کو خداوند عالم نے اپنی اطاعت کے ساتھ مقرون کیا ہے؟ فقال رسول اللہ ھم خلفائی یا جابر و ائمۃ المسلمین بعدی اولھم علیؑ بن ابی طالب ثم الحسنؑ ثم الحسینؑ ثم علی بن الحسینؑ ثم محمد بن علیؑ المعروف فی التوراۃ بالباقرؑ (ستدرکہ یا جابر فاذا لقیتہ فاقراہ منی السلام) ثم الصادق جعفرؑ بن محمد ثم موسیٰؑ بن جعفرؑ ثم علیؑ بن موسیٰ ثم محمدؑ بن علیؑ ثم علیؑ بن محمدؑ ثم حسنؑ بن علیؑ ثم سمی و کنیی حجۃ اللہ فی ارضہ و بقیتہ فی عبادہ ابن الحسنؑ بن علیؑ ذلک الذی یفتح اللہ علی یدیہ مشارق الارض و مغاربھا۔ اس حدیث کا مطلب اس قدر واضح و آشکار ہے کہ ترجمہ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پس جب سرکار ختمی مرتبتؐ نے اپنے حقیقی خلفاء و اوصیاء کی نام بنام معرفی کرادی ہے تو اب بھی ان کی خلافت و امامت کا اقرار و اعتراف نہ کرنا فماذا بعد الحق الا الضلال کا مصداق ہی ہو سکتا ہے!

عقیدہ مہدیؑ کا اتفاقی ہونا جہاں تک تاریخ مذاہب و ادیانِ عالم کے مطالعہ کا تعلق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب یہود ہو یا نصاریٰ۔ ہنود ہو یا زرتشت وغیرہ غرضیکہ تمام مذاہب و ادیان میں کسی نہ کسی رنگ میں ایک مصلح اعظم کے آنے کا تخیل موجود ہے۔ بالخصوص اہل اسلام کا تو حضرت مہدیؑ کے ظہور پر اتفاق ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کی بعض خصوصیات میں قدرے اختلاف ہے۔ عقلِ سلیم بھی یہی فیصلہ کرتی ہے کہ جس مذہب کی بنیاد ہی خدا کی قدرت اور عدالت پر ہے۔ بایں ہمہ دنیا میں ظلم و جور۔ باطل پرستی اور ناحق کوشی کا دور دورہ ہے۔ اس لئے اسی دنیا میں ایک ایسا دور ضرور آنا چاہیئے جس میں صفحۂ عالم سے ظلم و جور حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ یہ مقصد آنجنابؑ کے ظہور کے وقت ہی کما حقہ پورا ہو سکتا ہے جیسا کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ لو لم یبق من الدنیا الا یوم واحد لطول اللہ ذلک الیوم حتی یبعث رجل من اھلبیتی اسمہ اسمی یملأ الارض قسطاً و عدلاً کما ملئت ظلماً و جوراً (ترمذی

مشکوٰۃ المصابیح۔ ابو داؤد۔ ینابیع المودۃ وغیرہ) اگر عمر دنیا کا فقط ایک ہی دن باقی رہ جائے۔ تو خداوند عالم اسے اس قدر دراز کر دے گا کہ میرے اہل بیتؑ میں سے ایک شخص مبعوث ہو جو میرا ہمنام ہو گا جو زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ پہلے ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔

دنیا کو ہے اس مہدیؑ برحق کی ضرورت ٭ ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

چونکہ جناب رسالتمآبؐ علم نبوت سے جانتے تھے کہ دنیا میں کئی جھوٹے مدعیان مہدویت پیدا ہوں گے۔ لہٰذا ان کا فرض منصبی تھا کہ حضرت مہدیؑ دوراں کی معرفی کرانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں ورنہ جھوٹے مدعیوں کے دام تزویر میں پھنسنے والوں کی ضلالت و گمراہی کی ذمہ داری خود آنحضرتؐ پر عائد ہوتی (معاذ اللہ) اس لئے انہوں نے جناب مہدیؑ کی ذات و صفات اور شکل و شمائل وغیرہ تمام متعلقہ امور تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے تاکہ اتمام حجت میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ لیہلک من ھلک عن بینۃ ویحیی من حی عن بینۃ۔

حضرت مہدیؑ اہل بیت رسولؐ سے ہونگے

آنجنابؑ کس خاندان سے ہوں گے؟ اس سلسلہ میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں۔ المھدی من عترتی من ولد فاطمۃ (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۰۸۲ مع ترجمہ اردو۔ ہکذا فی سنن ابن ماجہ ج ۳ ص ۳۴۶) مہدی میری عترت طاہرہ اولادِ فاطمہؑ زہرا میں سے ہو گا۔ المھدی منا اھل البیتؑ (صواعق محرقہ ص ۱۴۱) مہدی ہم اہل بیتؑ میں سے ہو گا۔ جناب سلمان فارسیؓ (محمدی) روایت کرتے ہیں کہ جناب رسولؐ خدا نے فرمایا۔ المھدی من اھلبیتی۔ مہدی میری اہل بیت سے ہو گا۔ اس وقت شہزادہ ہائے کونین جناب امام حسنؑ و حسینؑ بھی موجود تھے۔ میں نے عرض کی۔ ای ولدیک ھذین۔ یا رسولؐ اللہ! آپ کے ان دونوں صاحبزادوں میں سے کس کی نسل سے ہو گا؟ آنجنابؐ نے امام حسینؑ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ من ولدی ھذا۔ میرے اس بیٹے کی اولاد میں سے (ینابیع المودۃ ج ۲ باب ۹۴ ص ۲۱۶ طبع ایران) اسی حدیث شریف سے متنبی قادیان کے اس دعویٰ کا بطلان بھی واضح و عیاں ہو جاتا ہے۔ جو انہوں نے اولادِ سلمانؓ سے ہونے کے ادعا پر اپنے مہدی موعود ہونے کے متعلق کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے اس دعویٰ میں کہاں تک صداقت ہے کہ وہ نسل جناب سلمانؓ سے ہیں۔ جو کہ بظاہر بالکل بلا دلیل دعویٰ ہے۔ کجا مغل مرزا اور کجا خاندانِ سلمانؓ فارسی۔ بہر حال اگر بالفرض اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس سے ان کی مہدویت ہرگز ثابت نہیں ہوتی کیونکہ جب حضرت سلمانؓ خود راوی ہیں کہ سرکار ختمی مرتبتؐ نے فرمایا۔ کہ مہدی میری ذریت اور اولادِ حسینؑ سے ہو گا۔ تو اس کے بعد اولادِ سلمانؓ کو مہدی ہونے سے کیا رابطہ و تعلق باقی رہ جاتا ہے!!

حضرت مہدیؑ کے شکل و شمائل

آنجنابؑ کے خصائل و شمائل کیا ہوں گے؟ اور شکل و صورت کیسی ہوگی؟ اس سلسلہ میں آنجنابؐ فرماتے ہیں کہ المھدی رجل من ولدی لونہ لون عربی و جسمہ جسم اسرائیلی علی خدہ خال کانہ کوکب دری یملأ الارض عدلاً کما ملئت ظلماً یرضیٰ فی خلافتہ اھل الارض و اھل السماء و الطیر فی الھواء (بحارالانوار ج ۱۳ ص ۲۲ ینابیع ج ۲ ص ۱۷۹) مہدی میری اولاد میں سے ہوگا۔ اس کا رنگ عربی اور جسم اسرائیلی ہے۔ اس کے داہنے رخسار پر ایک خال ہے۔ جو درخشندہ ستارہ کی طرح چمکتا ہے۔ وہ زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دے گا۔ جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔ ان کی خلافت میں زمین والے زمین پر اور آسمان والے آسمان پر حتیٰ کہ پرندے ہوا میں خوش ہوں گے۔ علاوہ دیگر ادلہ و براہین کے یہی امور جھوٹے مدعیانِ مہدویت جیسے مرزا علی باب و بہاء اور مرزائے قادیان وغیرہم کے دعووں کے باطل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ کیونکہ نہ تو ان کی شکل و صورت آنجنابؑ سے ملتی ہے اور نہ ان کے عہد میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہوا ہے بلکہ روز بروز ظلم و ستم میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ کما لا یخفیٰ۔ بایں ہمہ ان حضرات کو مہدی موعود قرار دینا سوائے برعکس نہند نام زنگی کافور۔ کا مصداق نہیں تو اور کیا ہے؟؟

حضرت مہدیؑ کی ولادت باسعادت

اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ گو عقیدۂ ظہور مہدیؑ پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ مگر بعض جزئی اختلافات موجود ہیں منجملہ ان اختلافات کے ایک یہ بھی ہے کہ آیا آنجنابؑ کی ولادت باسعادت ہو چکی ہے۔ یا آخری زمانہ میں ظہور کے قریب آنجناب متولد ہوں گے؟ چنانچہ تمام شیعہ خیر البریہ اور بعض علماء اعلام اہل سنت اس امر کے قائل ہیں۔ کہ آپ کی ولادت باسعادت نیمۂ شعبان المعظم ۲۵۵ھ میں بمقام سر من رائے (سامراء) میں واقع ہوئی۔ مگر جمہور اہل سنت کا خیال یہ ہے کہ ان کی ولادت آخری زمانہ میں واقع ہوگی۔ ہم یہاں ان بعض علماء اہل سنت کے نام مع ان کی کتب کے ذکر کرتے ہیں۔ جنہوں نے آنجناب کی ولادت ۲۵۵ھ میں تسلیم کی ہے۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ا ص ۹۳ ج ۲ ص ۴۹۰ اسعاف الراغبین مطبوعہ مصر برحاشیہ نورالابصار ص ۱۰۴/۱۱۹۔ شواہد النبوۃ جامی ص ۲۱۲۔ فصول مہمہ ابن صباغ مالکی۔ ینابیع المودۃ ج ا ص ۱۸۲ وغیرہ۔ بلکہ بعض منصف مزاج علمائے اہل سنت نے تو آنجناب کے حالات پر مستقل کتب تالیف کی ہیں جیسے کتاب البیان تالیف حافظ محمد بن یوسف گنجی (۲) کشف المخفی فی مناقب المہدی (۳) التوضیح فی تواتر ما جاء فی المنتظر المہدی للشوکانی (۴) العرف الوردی فی اخبار المہدی حافظ جلال الدین السیوطی۔ چونکہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت سنہ ۲۶۰ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اس طرح پانچ سال کی عمر میں یہ فخر عیسیٰؑ و یحییٰؑ ظاہری درجۂ رفیعہ

امامتِ کبریٰ پر فائز ہوئے۔ عجل اللہ فرجہ وسہل مخرجہ وجعلنا من اعوانہ وانصارہ بجاہ النبیؐ وآلہ۔

ہر زمانہ میں حجتِ خدا کا وجود ضروری ہے

اس مطلب پر یہاں تفصیلی تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اجمالاً اس قدر واضح رہے کہ اربابِ علم و بصیرت جانتے ہیں کہ خلاقِ عالم نے موجودہ عالم کو ایسے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے۔ کہ اس کی ہر ہر چیز علل و اسباب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ صحت و مرض۔ موت و حیات۔ توالد و تناسل فقر و غنا غرضیکہ کائناتِ عالم کی ہر شئی میں یہی قانونِ قدرت جاری و ساری ہے۔ کہ ہر چیز اپنے مخصوص علل و اسباب کے تحت وجود میں آتی ہے۔ اور خاص اسباب کے پیشِ نظر پردۂ عدم میں روپوش ہو جاتی ہے۔ اگر کبھی اس کے خلاف ہو جائے تو اسی کا نام "معجزہ" ہے۔ جو خرقِ عادت کا دوسرا نام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سلسلۂ علل و اسباب تمام مادیات پر مشتمل ہو۔ یا اس کی بعض کڑیاں مادی اور بعض غیر مادی ہوں۔ بہر کیف اسی قانون کے تحت خدائے حکیم نے اس عالم کی بقاء کو اپنی حجت (نبیؐ و امامؑ) کے وجود کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اگر ایک لمحہ کے لئے حجتِ خدا زمین سے اٹھ جائے تو تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اور دنیا و مافیہا ہلاکت سے ہمکنار ہو جائے۔ متعدد روایات میں صادقین علیہم السلام سے مروی ہے فرمایا۔ لولا الامام لساخت الارض باھلھا اگر حجتِ خدا کا وجود نہ ہو تو دنیا اپنے اہل سمیت نیچے دھنس جائے۔ (اصول کافی)

اسی بنا پر پیغمبرِ اسلام نے فرمایا تھا۔ اھلبیتی امان لاھل الارض کما ان النجوم امان لاھل السماء (صواعق محرقہ ص۲۵۳ طبع جدید) میرے اہل بیت زمین والوں کو ہلاکت سے بچانے کا سبب ہیں جس طرح ستارے اہل آسمان کے لئے باعثِ امان ہیں: حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ لولم یبق علی الارض الا اثنان لکان احدھما الحجۃ۔ اگر بالفرض تمام روئے زمین پر صرف دو ہی شخص رہ جائیں۔ تو ان میں ضرور ایک حجت خدا ہوگا۔ (اصول کافی) کیونکہ حجتِ خدا کے بغیر کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا۔ الحجۃ قبل الخلق ومع الخلق وبعد الخلق حجت خدا کا وجود مخلوق سے قبل مخلوق کے ساتھ اور مخلوق کے بعد ہونا ضروری ہے (بحار الانوار)

بنا بریں ضروری ہے۔ کہ اس وقت کسی حجت خدا کا موجود ہونا ضروری ہے جس کے طفیل یہ عالم قائم و دائم ہے۔ اور وہ بالاتفاق سوائے حضرت مہدیؑ دوران۔ صاحب العصر والزمان حضرت حجت بن الحسنؑ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کے اور کوئی نہیں ہے۔ فبیمنہ رزق الوریٰ وبوجودہ ثبتت الارض والسماء ؎

قدم سے مہدیؑ دیں کے زمین قائم ہے پانی پر ٭ قرارِ کشتیٔ دنیا کے لنگر ایسے ہوتے ہیں

اگر وہ تمام دنیا کو دکھائی نہیں دیتے۔ تو اس کا تقاضا یہ تو نہیں کہ ان کے وجودِ ذی جود کا انکار کر دیا جائے خدائے عزوجل نے اہل ایمان کا یہ وصف بیان فرمایا ہے۔ کہ یؤمنون بالغیب۔ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔

جنت و دوزخ حشر و نشر۔ برزخ و صراط اور ملائکہ حتیٰ کہ خود خدائے قدوس کی ذاتِ بابرکات وغیرہ بیسیوں امور ایسے ہیں۔ جو غائب ہیں۔ مگر ان پر ایمان ضروری ہے۔ تو اگر امام زمانہ غائب ہیں۔ اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے تو اس میں کون سی تعجب والی بات ہے؟

حضرت امام زمانہ کے وجودِ مسعود کے متعلق بعض شبہات کے جوابات

اگرچہ مذکورہ بالا حقائق کی بنا پر حضرت امام زمانہؑ کا اس وقت موجود ہونا ایک ایسی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ جس میں ہرگز کوئی عاقل و متدین انسان شک شبہ نہیں کر سکتا۔ مگر بموجب

اذا لم تکن ظلم الیعین صحیحۃ ؛ فلا غرو ان یرتاب والصبح مسفر

اکثر کور باطن اور کوتاہ اندیش مخالفین و معاندین ہمیشہ امام زمانہ کے موجود ہونے پر بعض رکیک شبہات عائد کرتے رہتے ہیں۔ جن کے بیسیوں مرتبہ مکمل و مدلل جوابات دیئے جا چکے ہیں۔ خود ہم بھی اپنے بعض مضامین میں ان کا تفصیلی رد لکھ چکے ہیں۔ یہاں بعض شبہات اور ان کے اجمالی جوابات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب

جناب امام العصرؑ کی طول حیات کے متعلق ہے کہ ان کی ولادت ۲۵۵ھ سے لے کر ۱۳۸۴ھ تک ۱۱۲۹ سال ہوتے ہیں۔ اس قدر طویل عرصہ تک کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس شبہ کا مختصر جواب یہ ہے کہ ایسا اعتراض وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو قدرتِ خدا کا منکر ہو۔ ورنہ جو شخص خدا کو علی کل شئی قدیر جانتا ہے۔ اور یہ بھی اعتقاد رکھتا ہے کہ اس قادر و قیوم نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اب تک بعض انبیاء جیسے حضرت خضر و ادریس و الیاس و عیسیٰ علیہم السلام کو زندہ رکھا ہوا ہے جن کی عمریں امام صاحب العصرؑ سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ تو کیا وہی خدائے قادرِ مطلق اپنی آخری حجت کو اس قدر عرصہ تک زندہ نہیں رکھ سکتا۔ شیخ محمد بن یوسف الکنجی الشافعی نے اپنی کتاب البیان میں امام زمان کے اس وقت زندہ و موجود ہونے پر دلائل لکھتے ہوئے لکھا ہے وانہ لا امتناع فی بقائہ کبقاء عیسیٰ بن مریم والخضر والالیاس من اولیاء اللہ وبقاء الاعور الدجال اللعین من اعداء اللہ تعالیٰ وھؤلاء قد ثبت بقاءھم بالکتاب والسنۃ یعنی امام زمانؑ کا اس قدر طویل عرصہ تک زندہ رہنا ممتنع نہیں ہے۔ جیسا کہ دوستانِ خدا میں سے حضرت عیسیٰؑ و خضرؑ و الیاسؑ اور دشمنانِ خدا میں سے اعور دجال اور ابلیس لعین اب تک زندہ ہیں۔ جن کا وجود قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ (ارجح المطالب)

کتب سیر و تواریخ بلکہ قرآن سے مستفاد ہوتا ہے کہ جس قدر امام زمانہ کی عمر ہے۔ اتنی یا اس سے زیادہ طویل العمر لوگ اسی دنیا میں گذر چکے ہیں۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کی عمر کتب سیر میں نو سو تیس برس اور جناب شیثؑ کی

باب الاعتقاد فی العصمة

قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی الانبیاء والرسل والائمة والملائکة انھم

چھتیسواں باب (انبیاؑ، ائمہؑ اور ملائکہؑ کی عصمت کے متعلق اعتقاد)

جناب شیخ ابوجعفرؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء اور ان کے اوصیاء اور فرشتوں کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے۔

نوسو بارہ برس لکھی ہے۔ اور حضرت نوحؑ کے متعلق تو خود قرآن میں موجود ہے۔ کہ ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو دعوتِ رشد و ہدایت دی (نبث فیھم الف سنۃ الا خمسین عاماً آپ سورہ عنکبوت ۴۲ ۱۴) اس سے قبل کتنا عرصہ گذرا اور ہلاکتِ قوم کے بعد کتنی مدت تک زندہ رہے؟ اس کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ مجموعی طور پر اڑھائی ہزار سال کے اقوال ملتے ہیں۔ بنابر قاعدہ مسلمہ (ادل دلیل علی امکان الشیئ وقوع الشیئ) کسی چیز کے ممکن ہونے کی بڑی دلیل اس کا وقوع پذیر ہونا ہے۔ حضرت حجۃ بن الحسنؑ کی طویل العمری پر اعتراض کرنا بالکل ہی لغو و عبث ہے۔ جب کہ ان سے پہلے اسی عالم میں بہت سے طویل العمر لوگ گذر چکے ہیں۔ موجودہ سائنسی دور میں تو بعض ڈاکٹروں نے تحقیق کی ہے۔ کہ ایک انسان اگر اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی کرے۔ تو وہ ہزار ہا سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ بنابریں حقائق اس شبہ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

ایسے امام غائب کے وجود کا کیا فائدہ ہے۔ جسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان سے مسائل دریافت کر سکتے ہیں۔ اس شبہ کا اجمالی جواب یہ ہے کہ وجودِ امامؑ کے فائدہ کو فقط مسائل بیان کرنے میں منحصر قرار دینا کوتاہ اندیشی کی دلیل ہے۔ ورنہ اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ ان کے وجودِ مسعود کا فائدہ فقط مسائلِ دینیہ بیان کرنے میں منحصر نہیں ہے۔ ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ زمین و زمان کا قیام و دوام وجودِ حجت وامام سے وابستہ ہے۔ لہٰذا یہی کیا کم فائدہ ہے کہ ان کے طفیل سب کائنات موجود ہے۔ اسی بناء پر محقق طوسیؒ نے تجرید میں لکھا ہے۔ وجود الامام لطف وتصرفہ لطف آخر وعدمہ منا امام کا وجود لطفِ خداوندی ہے۔ اور ان کا ظاہری تصرف یہ خدا کا دوسرا لطف ہے اور اس تصرف کا نہ ہونا ہماری وجہ سے ہے۔ "خود کردہ را علاجے نیست" علاوہ بریں اربابِ دانش و بینش جانتے ہیں۔ کہ ہدایت یا گمراہی کے لئے ہادی یا مضل کا آنکھوں کے سامنے موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ خداوند عالم غائب رہ کر ہدایت کرتا ہے اور شیطان مخفی رہ کر گمراہ کرتا ہے۔ تو امام زمانؑ مخفی و مستور رہ کر فریضۂ ہدایت کیوں انجام نہیں دے سکتا۔ خود امام العصرؑ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کی غیبت کے زمانہ میں آپ کے وجودِ مسعود سے لوگ کس طرح استفادہ حاصل کریں گے؟ امامِ عالی مقام نے فرمایا۔ کالشمس اذا غیبتھا السحاب جس طرح لوگ آفتاب

معصومون مطھرون من کل دنس وانھم لایذنبون ذنباً لاصغیراً ولاکبیراً ولایعصون اللہ ما امرھم

کہ وہ سب کے سب معصوم من الخطا اور ہر قسم کی نجاست (گناہ وعصیان) سے مبرا ہیں۔ وہ نہ تو کوئی گناہ کبیرہ کرتے ہیں اور نہ صغیرہ۔ یہ بزرگوار امرِ خداوندی کی نافرمانی نہیں کرتے۔

سے فائدہ حاصل کرتے ہیں جب کہ وہ بادل کے نیچے چلا جائے (احتجاج طبرسی۔ بحار جلد ۱۳ ینابیع المودۃ ج ۲ صفحہ ۱۶۹) فقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباءً منثوراً۔

چھتیسواں باب عصمتِ انبیاءؑ و آئمہؑ اور ملائکہ کا بیان

عصمتِ انبیاءؑ میں مسلمانوں کے اختلافات کا اجمالی بیان

اگرچہ بعض سابقہ مباحث میں اجمالاً اس مطلب پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مگر چونکہ حضرت مصنفِ علام نے اس مطلب کے اثبات کے لئے مستقل عنوان قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہم بھی اس سلسلہ میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ سو واضح ہو کہ عصمت انبیاء کے متعلق مسلمانوں کے درمیان کئی ایک اختلافات موجود ہیں۔ برادرانِ اسلامی میں سے بعض حضرات تو سرے سے انبیاء کو معصوم ہی نہیں سمجھتے بلکہ ان کے لئے خطاء و اجتہاد کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور بعض کفر و عصیان میں فرق کرتے ہیں کہ انبیاء کے لئے کفر تو جائز نہیں مگر دیگر گناہ کر سکتے ہیں۔ اور بعض گناہِ کبیرہ و صغیرہ میں فرق بتلاتے ہیں کہ ان کے لئے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ناجائز اور صغیرہ کا صدور جائز ہے اور بعض عمد و سہو کا فرق بیان کرتے ہیں کہ ان کے لئے عمداً ارتکاب معصیت ناجائز مگر سہواً جائز ہے اور بعض قبل و بعد نبوت کا فرق ظاہر کرتے ہیں کہ قبل اظہار نبوت انبیاء سے معاذ اللہ ہر گناہ حتیٰ کہ کفر بھی صادر ہو سکتا ہے مگر بعد از دعوائے نبوت ارتکاب گناہ نہیں کرتے الیٰ غیر ذالک من الھذیانات۔ بہر کیف عصمت انبیاء و آئمہ کے بارے میں صحیح اسلامی عقیدہ وہی ہے جو حضرات شیعہ خیر البریہ کا ہے کہ انبیاء کرام کا دامن اول عمر سے لے کر آخر عمر تک تمام گناہان کبیرہ و صغیرہ کی آلائش سے منزہ و مبرا ہوتا ہے وہ نہ عمداً ارتکاب گناہ کرتے ہیں اور نہ سہواً۔ نہ علماً اور نہ جہلاً۔ نہ خطاءً و تاویلاً نہ قولاً و فعلاً۔ نہ قبل اعلانِ نبوت اور نہ اس کے بعد۔ حضرات شیعہ کا یہی عقیدہ ملائکہ کرام اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کے بارے میں بھی ہے۔ اور اس عقیدہ کی صحت و صداقت پر بیسیوں عقلی و نقلی ادلہ ساطعہ و براہین قاطعہ

ویفعلون مایؤمرون و من نفی عنهم العصمۃ فی شئ من احوالھم فقد جھلھم و من جھلھم فھو کافر و اعتقادنا فیھم انھم معصومون

(بلکہ) جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ جس شخص نے ان حضرات کی عصمت کا جس حیثیت سے بھی انکار کیا وہ ان کے مرتبہ اور شان سے جاہل ہے اور جو ان سے جاہل ہے (ان کی معرفت نہیں رکھتا) وہ کافر ہے۔ ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ تمام بزرگوار ابتداء سے انتہا تک معصوم

قائم کئے جا چکے ہیں۔ ہم نے بھی اپنی کتاب اثبات امامۃ الائمۃ الاطہار میں کافی شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی ہے اور اس مطلب کے اثبات پر ادلہ قاطعہ ذکر کئے ہیں۔ شائقین تفصیل اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔

عصمت کی اصلاحی تعریف

قبل اس کے کہ عصمت انبیاء و آئمہ پر دلائل پیش کئے جائیں پہلے عصمت کے صحیح مفہوم کا بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے عصمت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں لیکن اس کی سب سے جامع و مکمل تعریف یہ ہے کہ العصمۃ ھی لطف اللہ یفعل اللہ بمن یشاء من عبادہ بحیث لایکون لہ مع ذالک داع الی ترک الطاعۃ و ارتکاب المعصیۃ، یعنی عصمت ایک لطف و عنایت خداوندی ہے کہ جب خدا اپنے مخصوص بندوں میں سے کسی کے ساتھ یہ لطف فرماتا ہے تو اس کے سبب سے وہ نہ کوئی اطاعت ترک کرتا ہے اور نہ کسی چھوٹی یا بڑی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس تعریف سے معلوم ہوا کہ انبیاء و آئمہ کی عصمت و طہارت اختیاری ہوتی ہے یعنی باوجودیکہ وہ ترک طاعت اور ارتکاب معصیت پر قدرت رکھتے ہیں۔ مگر اسے اپنے ارادہ و اختیار سے عمل میں نہیں لاتے۔ وھم بامرہ یعملون۔ وہ اسی (خدا) کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور اسی بناء پر لائق مدح و ستائش ہیں۔

عصمت انبیاء کی پہلی دلیل

اب ہم ذیل میں اس موضوع پر چند ادلہ بیان کرتے ہیں پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر انبیاء معصوم و مطہر نہ ہوں تو ان کی بعثت کی غرض و غایت ضائع ہو جائے گی۔ نہ ان کی بات مسموع ہو گی۔ نہ لوگ اس کے مطیع و منقاد ہوں گے۔ بلکہ ان خویشتن گم است کرا رہبری کند والا معاملہ ہو جائے گا اور ان پر خداوند عالم کی یہ تہدید و وعید منطبق ہو گی۔ اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم۔ کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر رہے ہو؟ لوگ یہ کہہ

موصوفون بالکمال والتمام والعلم من اوائل امورهم واواخرها لا یوصفون فی شئی من احوالهم بنقص ولا عصیان ولا جهل

اور صفاتِ کمال و تمام و علم و فضل سے متصف ہیں۔ اور اپنے تمام احوال و کوائف میں سے کسی حالت میں بھی نقص جہالت اور معصیت وغیرہ نقائص سے متصف نہیں ہوتے۔

کرتے ہو۔ ان کے احکام کو ٹھکرا دیں گے اور انبیاء کو مجبوراً خاموش ہونا پڑے گا۔ اور کوئی حکیم ایسا کام نہیں کرتا جس سے اس کا مقصد فوت ہو جائے اور نقضِ غرض لازم آئے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ انبیاء کو معصوم ہونا چاہیئے۔ وھو المطلوب۔

دوسری دلیل اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہو تو وہ معاذ اللہ فاسق قرار پائیں گے۔ کیونکہ خدا کی حکم عدولی کرنے والے فاسق ہوتے ہیں۔

اور بنص قرآنی فاسق کی شہادت معمولی دنیوی امور میں بھی قابل قبول نہیں کما قال عزّ من قائل ان جاءکم فاسق بنبأٍ فتبینوا۔ چہ جائیکہ دین و شریعت کے معاملہ میں اس کی بات پر اعتماد کیا جائے؟ اور اسے دین و دنیا کا حاکم علی الاطلاق تسلیم کیا جائے ان ھذا الا اختلاق کوئی حکیم اور فہیم انسان ہرگز ایسا کام نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حکیم مطلق و خالق عقل ایسے امر قبیح کا ارتکاب کرے تعالیٰ عما یقول الظالمون علواً کبیراً۔

تیسری دلیل اگر انبیاء سے صدور گناہ جائز تسلیم کیا جائے تو چونکہ منجملہ گناہوں کے ایک گناہِ عظیم جھوٹ بولنا بھی ہے۔ لہٰذا اس کا ارتکاب بھی ان کے لئے جائز ہوگا اور جب ان کے لئے ارتکاب کذب جائز ہوا تو پھر ان کے وعدہ ہائے جنت اور وعید ہائے دوزخ اور ان کے اوامر و نواہی اور بیان ثواب ہائے غیر تناہی پر ہرگز کوئی وثوق و اعتماد نہیں رہ جائے گا کیونکہ اس صورت میں ان سب امور کے متعلق یہ برابر احتمال باقی رہے گا کہ شائد (معاذ اللہ) غلط بیانی کر رہے ہوں اور حقیقت کچھ بھی نہ ہو۔ لہٰذا کوئی عقلمند شخص ان کی فرمانبرداری اور متابعت کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ اس طرح ان کی بعثت کا مقصد بالکل اکارت ہو کر رہ جائے گا۔ ایسا کرنا خدائے حکیم کی شانِ حکمت کے خلاف ہے۔

چوتھی دلیل اگر انبیاء سے صدور معصیت جائز ہو تو اس صورت میں اجتماع ضدین لازم آئے گا۔ اور ایک وقت میں ان کی اطاعت و نافرمانی واجب ہوگی جو عقلاً ناممکن ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ چونکہ وہ نبی ہیں لہٰذا بحیثیت نبی ہونے کے ان کی اتباع بموجب آیت ان کنتم تحبون اللہ

فاتبعونی یحببکم اللّٰہ و ما ارسلنا من نبی الا لیطاع باذن اللّٰہ (ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ سبحانہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔) ہر حال میں واجب و لازم ہوگی اور پھر چونکہ ان کے لئے ارتکاب معصیت جائز ہے اور ہر گناہگار بموجب نص قرآن ظالم ہے ومن یتعد حدود اللّٰہ فاولٰئک ھم الظالمون اور حکم خدا ہے کہ لا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ (ظالموں کی طرف میلان نہ کرو ورنہ تمہیں آتش جہنم مس کرے گی) نیز اس کا ارشاد ہے۔ ان اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان وینھی عن الفحشاء والمنکر (خداوند تعالیٰ عدل و احسان کرنے کا حکم دیتا ہے اور برے کاموں سے روکتا ہے) لہٰذا اس طرح ان آیات کی روشنی میں انبیاء کی نافرمانی لازم ہوگی اور ظاہر ہے کہ متابعت اور معصیت آپس میں ضدیں ہیں۔ والضدان لا یجتمعان۔ اجتماع ضدین محال و ناممکن ہے اور یہ محال عصمت انبیاء نہ ماننے سے لازم آرہا ہے۔ وما یستلزم المحال فھو محال قاعدہ ہے کہ جو چیز مستلزم محال ہو وہ خود محال اور باطل ہوا کرتی ہے۔ اس طرح عدم عصمت والا نظریہ غلط ٹھہرے گا۔ اسی لئے انبیاء کو معصوم و مطہر تسلیم کرنا پڑے گا۔

پانچویں دلیل

اگر انبیاء معصیت الٰہی کے مرتکب ہوں تو جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وہ ظالم قرار پائیں گے اور ارشاد قدرت ہے کہ لاینال عھدی الظالمین میرا عہدۂ نبوت و امامت ظالموں کو نہیں پہنچ سکتا۔ وہ درجۂ نبوت پر فائز ہی نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا اگر ان کو نبی ماننا ہے تو انہیں معصوم و مطہر ماننا پڑے گا بنظر اختصار یہاں انہیں پانچ دلائل پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اگر درخانہ کس است یک حرف بس است۔

عصمت آئمہ علیہم السلام کا اجمالی بیان

اوپر جو دلائل و براہین عصمت انبیاء کے متعلق بیان ہوئے ہیں۔ بعینہٖ حرف بحرف یہی دلائل آئمہ معصومینؑ کی عصمت کے متعلق بھی جاری و ساری ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کی عصمت کے بارے میں ہمیں علیحدہ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے ہماری کتاب اثبات الامامت کی طرف رجوع کیا جائے اور ملائکہ کی عصمت پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اس لئے اس سلسلہ میں ہمیں دلائل پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاروت و ماروت کا قصہ جس طرح بعض غیر معتبر اسلامی کتب میں مرقوم ہے۔ وہ کتب یہود سے ماخوذ ہے اور دلائل قاطعہ عقلیہ و نقلیہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات و اعتبار ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں واضح و لائح ہو گیا کہ انبیاء و آئمہ اور ملائکہ کی عصمت کا اعتقاد ضروری و لازمی ہے اور جس طرح نبی و امام کے لئے عصمت ضروری ہے۔ اسی طرح ان کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ علم و فضل۔ زہد و تقویٰ۔ عقل و دانش، فہم و فراست شجاعت و شہامت۔ جود و سخاوت۔ قوت و طاقت۔ غیرت و حمیت۔ رأفت و رحمت غرضیکہ تمام صفات

باب الاعتقاد فی نفی الغلو والتفویض

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی الغلاة والمفوضة انهم کفار باللّٰہ جل اسمہ وانھم شر من الیھود والنصاریٰ والمجوس والقدریة والحروریة ومن جمیع البدع والاھواء المضلة وانہ ما صغر اللّٰہ جل جلالہ تصغیرھم لشیٔ کما قال اللّٰہ تعالیٰ ما کان لبشر

سینتیسواں باب غلو اور تفویض کی نفی کے بارے میں اعتقاد

حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ غالیوں اور مفوضہ کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ لوگ (فی الحقیقت) خداوند عالم کی ذات کے منکر ہیں اور یہ لوگ یہود، نصاریٰ، مجوس، قدریۃ اور خوارج بلکہ تمام اہل بدعت اور گمراہ کن نظریات رکھنے والے فرقوں سے بدتر ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے برابر کسی فرقہ نے بھی خدا کی تحقیر و تصغیر نہیں کی۔ خداوند عالم فرماتا ہے۔ کسی ایسے بشر کو

کمالیہ و نفوسِ جمالیہ میں سرآمد روزگار ہوں اور تمام افرادِ امت سے افضل و اشرف ہوں۔ نیز منفر جمیع تمام نقائص و عیوب خِلقی و خُلقی سے منزہ و مبرا ہوں ورنہ ترجیح مرجوح بر راجح اور تقدیم مفضول بر فاضل لازم آئے گی۔ یعنی اگر امت میں کوئی ایسا شخص موجود ہو جو ان فضائل و کمالات میں اس نبی یا امام پر فوقیت رکھتا ہے تو اس افضل کو نظر انداز کر کے غیر افضل کو درجہ نبوت و امامت پر فائز کرنے کی صورت میں خداوند عالم پر ترجیح مرجوح بر راجح اور تقدیم مفضول بر فاضل کا الزام عائد ہوگا جو اس کی شان عدالت و حکمت کے ساتھ منافی ہونے کی وجہ سے عقلاً و نقلاً باطل ہے۔ ارشاد قدرت ہے افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یھدی الا ان یھدی ما لکم کیف تحکمون (سورہ یونس پ ۱۱ ع ۴) اور اس طرح اگر افرادِ امت میں کوئی ایسا فرد موجود ہو جو تمام فضائل و کمالات میں نبی و امام کا ہم پلہ اور ان کے برابر ہو تو پھر اسے نظر انداز کر کے اس کے برابر درجہ رکھنے والے کو نبی و امام بنانے سے ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی جو کہ باطل ہے لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی و امام کو ہر لحاظ سے اپنی امت و رعیت سے افضل و اکمل اور اشرف و اعلیٰ ہونا چاہیئے۔

ایک ضروری وضاحت

وہ آیات متشابہات جن کے ساتھ بالعموم منکرین عصمت بموجب والذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاویلہ۔ تمسک کیا کرتے ہیں کتبِ مفصلہ و مبسوطہ میں ان کے مفصل جوابات مذکور ہیں۔ چونکہ یہ کتاب مستطاب پہلے ہی غیر معمولی طور پر طویل ہو چکی ہے۔ اس لئے اب ہم یہاں رشتۂ بیان کو کوتاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ہم یہ

ما کان لبشر ان یؤتیه اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون ولا یأمرکم ان تتخذوا الملائکۃ

جس کو خداوندِ عالم نے کتاب و حکمت اور نبوت عطا کی ہو۔ یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یوں کہتا ہے کہ) تم اللہ والے بن جاؤ جیسا کہ تم کتاب پڑھاتے اور پڑھتے ہو اور وہ تمہیں یہ حکم بھی نہیں دیتا کہ تم فرشتوں۔

چاہیں کہ ان تمام آیات کو جو موہم معصیت انبیاء ہیں ذکر کریں اور پھر ان کے مفصل جوابات لکھیں تو اس میں اس قدر طوالت ہو جائے گی کہ جس کے لئے اوراق کتاب متحمل نہیں ہیں۔ اس لئے ہم ان تفصیلات کو نظر انداز کر کے اسی اجمالی بیان واجب الاذعان پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو حضرات تفصیلی دلائل اور مکمل جوابات ملاحظہ کرنا چاہیں وہ کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ مصنفہ حضرت علامہ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ قدس سرہ (جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے) اور کتاب مستطاب عصمۃ الانبیاء والائمہ مصنفہ مولانا سید ابو القاسم الرضوی وغیرہ کتب مفصلہ کی طرف رجوع کریں۔ ان کتب میں ان تمام آیات متشابہات کے مفصل جوابات پیش کئے گئے ہیں جن سے معصیت انبیاء کا توہم ہوتا ہے اور اس سلسلہ کے تمام شکوک و شبہات کا مکمل ازالہ کر دیا گیا ہے۔ ان کتب جلیلہ کو دیکھنے کے بعد ایک عاقل و منصف ناظر کے لئے اس سلسلہ میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔ مگر افسوس ام تحسب ان اکثرھم یسمعون او یعقلون ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا۔

ستائیسواں باب غلو اور تفویض کا بیان

شرک کی بوقلمونیاں شخصیت پرستی کا نتیجہ ہیں

تاریخ ملل و مذاہب پر اجمالی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں شرک کی ابتداء و تدریج اور اس کی بوقلمونی میں شخصیت پرستی اور افراطِ عقیدت کو بہت کچھ دخل ہے۔ شرک کی ابتداء کب اور کس طرح ہوئی؟ اور بتدریج اس کے اوضاع و اشکال میں کیا کیا تغیر و تبدل رونما ہوا؟ اس وقت اس موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔

دنیا میں شرک کی ابتداء

اجمالاً اس قدر واضح رہے کہ حضرت آدمؑ و نوحؑ کے درمیانی زمانہ میں

والنبیین اربابا ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون وقال عزوجل لاتغلوا فی دینکم

اور نبیوں کو اپنا رب بنالو کیا وہ تمہارے مسلمان ہوجانے کے بعد تمہیں کفر اختیار کرنے کا حکم دے سکتا ہے؟ نیز خداوند عالم فرماتا ہے اپنے دین ومذہب میں غلو نہ کرو (یعنی مذہب کے حدود کو نہ پھاندو اور خدا کے بارے میں وہی بات کہو جو برحق ہے)۔

شرک کی ابتدا ہو چکی تھی اور اس میں بہت حد تک بعض خدا رسیدہ بزرگوں کے متعلق غلط جذبۂ محبت اور افراط عقیدت کو دخل رہا تھا۔ چنانچہ عرب کے وہ بڑے "اصنام خمسہ" جن کے نام "ود، سواع، یعوق، یغوث اور نسر" ہیں۔ یہ حضرت آدمؑ اور جناب نوحؑ کے درمیانی زمانہ میں خدا رسیدہ اور عبادت گذار بندے تھے لوگوں کو ان سے انتہائی عقیدت ومحبت تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے عقیدت مندوں پر ان کی جدائی انتہائی شاق گذری۔ وہ ان کی حسین یادوں کو سینے سے لگانے کی مختلف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ شیطان نے ان کی مورتیاں بناکر ان کے سامنے پیش کیں۔ وہ لوگ ان مورتیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور اس طرح ان کے جذبۂ شوق کی کسی حد تک تسکین ہوگئی۔ پہلے یہ مورتیاں کھلی جگہ پر رکھی ہوئی تھیں جب سردیوں کا موسم آیا تو وہ لوگ ان کو گھروں کے اندر لے گئے۔ اسی طرح ایک عرصۂ دراز گذر گیا۔ حتیٰ کہ یہ عقیدت مند لوگ دنیا سے رخت سفر باندھ کر چلے گئے۔

بت پرستی میں تدریجی ترقی

جب ان کی جگہ نئی پود نے لی۔ تو حقیقت حال سے بے خبری کی وجہ سے انہوں نے ان مورتیوں کی عبادت و پرستش شروع کر دی۔ کیونکہ وہ اپنے بزرگوں کو ان مورتیوں کے آگے بیٹھے اور ان کی تعظیم وتوقیر کرتے ہوئے تو دیکھتے تھے۔ مگر ان کو حقیقت حال کا کوئی علم نہ تھا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ توں توں صنم پرستی کو ترقی ہوتی گئی۔ اور رفتہ رفتہ صنم پرست لوگ اپنے اصنام کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنے لگے۔ اسی طرح بتوں میں نبیوں اور ان کے وصیوں کے مجسمے بناکر بھی شامل کرلئے گئے۔ پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت عرب میں بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ اور اس چیز کا سب سے بڑا مرکز مکہ مکرمہ اور اس میں بھی بیت اللہ الشریف تھا۔ جہاں کم وبیش تین سو ساٹھ بڑے بڑے بت رکھے ہوئے تھے۔ قبائل کے بت، حضر کے بت اور سفر کے بت ان کے علاوہ تھے۔ جن کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز تھی۔

بت پرست بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے

یہ لوگ تصور معبود سے بالکل خالی الذہن نہ تھے بلکہ توحید کا دھندلا سا تصور ان کے ذہنوں میں موجود تھا

...ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض ليقولن الله (پ ۲ ...)

واعتقادنا فی النبیؐ انہ سُمّ فی غزوۃ خیبر فما زالت ھذہ الاکلۃ تعاودہ حتی قطعت ابھرہ فمات منھا وامیر المومنین

ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ جناب سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غزوہ خیبر میں زہر دیا گیا تھا اور وہ زہر برابر اثر کرتا رہا یہاں تک کہ آنحضرتؐ کے قلبِ مبارک کی رگوں کو کاٹ دیا اور حضورؐ اس کی وجہ سے انتقال فرما گئے۔ (۲۸ صفر سنہ ۱۱ ھ) حضرت امیر المومنین علیہ السلام کو

اگر تم ان سے دریافت کرو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ یقیناً جواب میں یہی کہیں گے کہ اللہ نے بلکہ وہ بتوں کی عبادت و پرستش کی غرض و غایت بھی یہی قرار دیتے تھے کہ یہ شفاعت و سفارش کر کے ان کو خدا کا مقرب بنا دیں۔ چنانچہ خداوند عالم ان کے تقربہ کی خبر یوں دیتا ہے۔ ویعبدون من دون اللہ مالا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھؤلاء شفعائنا عند اللہ (پ ۱۱ س یونس ۲۲) وہ خدا کے علاوہ ایسوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، وہ کہتے یہ ہیں کہ یہ خدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ ایک اور مقام پر مشرکوں کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے والذین اتخذوا من دونہ اولیاء ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی (پ ۲۳ س زمر ۴) جن لوگوں نے خدا کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی اس لئے عبادت کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں۔ مذکورہ بالا حقائق معلوم کرنے کے لئے درج ذیل شیعہ و سنی کتب تفسیر کی طرف رجوع کریں۔ تفسیر مجمع البیان ج ۲ صفحہ ۵۳۶ تفسیر برہان ج ۴ صفحہ ۳۸ تفسیر صافی صفحہ ۵۱۲ تفسیر کبیر فخرالدین ج ۴ صفحہ ۸۱۹۔ ایضاج ۶ صفحہ ۲۲۲ تفسیر روح المعانی آلوسی جزء ۱۱ صفحہ ۸۸ وغیرہا) ان حقائق سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں خود ساختہ شفیع یا سفارشی کام نہیں آ سکتے۔ بلکہ وسیلہ و شفیع اسی ذاتِ ذوالجلال کا بنایا ہوا ہونا چاہیئے جس کی بارگاہ میں سفارش و شفاعت کرانا مقصود ہے۔ اسی لئے خدائے حکیم فرماتا ہے۔ وابتغوا الیہ الوسیلۃ۔ اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے (اس کے بنائے ہوئے) وسیلہ کو تلاش کرو۔ یہ نہیں فرمایا کہ وسیلہ بناؤ۔

ہمیشہ لوگ بزرگانِ دین کے متعلق افراط و تفریط میں مبتلا رہے ہیں

اقوامِ عالم کی تاریخ کے تتبع و تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ امر لوگوں کی جبلت و سرشت میں داخل ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے بزرگوں کی محبت و عقیدت میں گرفتار ہو کر ان کو اپنے حدود سے بڑھا دیا کرتے ہیں۔ یہی جذبہ تھا جس نے یہودیوں کو آمادہ کیا کہ وہ جناب عزیز کو ابن اللہ کہیں اور اسی جذبے نے نصرانیوں سے جناب عیسیٰ کو ابن اللہ کہلوایا۔ چنانچہ خداوند عالم نے اپنے کلامِ پاک میں اس امر کی خبر دی ہے قالت الیھود عزیر ابن اللہ۔ وقالت النصاری المسیح ابن اللہ۔

قتلہ عبد الرحمن بن ملجم لعنہ اللہ ودفن بالغری والحسن بن علی سمتہ امرئتہ جعدۃ

عبدالرحمٰن ابن ملجم المرادی ملعون نے شہید کیا ضربت ۱۹ ماہ رمضان کو لگی اور شہادت ۲۱ سنہ ۴۰ھ کو ہوئی) اور حضرت کو نجف اشرف میں دفن کیا گیا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کو ان کی زوجہ جعدہ بنت اشعث کندی (خدا باپ بیٹی دونوں پر لعنت کرے)

اسی لئے حکیم مطلق نے انہیں اس غلطی پر ٹوکا اور ان کو فہمائش کی کہ یا اھل الکتٰب لا تغلوا فی دینکم اے اہلِ کتاب! اپنے دین کے معاملہ میں غلو (حد سے تجاوز) نہ کرو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے دنیا کی عظیم شخصیتیں لوگوں کے افراط و تفریط کا شکار رہی ہیں یعنی ان کے عقیدت مند ہمیشہ انہیں حد سے بڑھاتے رہے اور ان کے مخالفین انہیں ان کے اصلی مقام و مرتبہ سے گھٹاتے رہے۔ چنانچہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ لوگ ان کے حق میں افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ بعض نادانوں نے آپ کو خدا قرار دے دیا۔ اور مخالفین نے آپ کی نبوت کا بھی انکار کر دیا۔ اور بعض نادان مسلمان جو بظاہر آپ کا کلمہ بھی پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود آپ کو اپنے جیسا خطا کار و گنہگار انسان تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں جو اس سلسلہ میں حد اعتدال پر قائم ہیں۔ آئمہ طاہرین کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ کہ بعض نے تو سرے سے ان کی خلافت و امامت کو ہی تسلیم نہیں کیا اور بعض نے چوتھے مرتبہ پر حضرت امیر کی خلافت کو مانا اور بعض خوارج نے تو معاذ اللہ ان کو دائرہ اسلام سے بھی خارج کر دیا مگر بعض احمق عقیدت مندوں نے انہیں حدود عبدیت اور مرتبہ امامت و خلافت سے بڑھا کر مرتبہ الوہیت تک پہنچا دیا جیسے عبداللہ بن سبا اور بنان بن سمعان النہدی جو جناب امیر المومنینؑ کی الوہیت کے قائل تھے یا جیسے ابو الخطاب محمد بن ابی زینب و بشار الشعیری وغیرہ جن کا یہ خیال تھا کہ حضرت علی علیہ السلام ہی خدا ہیں۔ جو کبھی بصورت محمدؐ اور کبھی بصورت علیؑ لباس بشریت میں نمودار ہوتے ہیں اور بطور امتحان یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کے بندے ہیں حالانکہ وہ خود خدا ہیں اور ابی الخطاب کے اصحاب کا یہ خیال تھا کہ چار بزرگوار خدا ہیں حضرت علیؑ حضرت فاطمہؑ اور حسنینؑ شریفین یہ جناب رسالتمآبؐ کی الوہیت کے منکر ہیں اور مخمسہ پانچ بزرگواروں کی الوہیت کے قائل ہیں۔ پہلے خدا جناب محمد مصطفٰےؐ ہیں پھر ان سے یہ خدائی کا سلسلہ جناب علی علیہ السلام کی طرف پھر ان سے جناب سیدۂ عالم کی طرف اور ان سے جناب امام حسنؑ کی طرف اور پھر ان سے جناب امام حسینؑ کی طرف منتقل ہوا۔ ان کا یہ بھی باطل خیال تھا کہ جناب سلمان فارسیؓ و مقدادؓ حضرت محمدؐ کے رسولؐ ہیں اور یہ لوگ ترک عبادات اور ارتکاب محرمات کو مباح سمجھتے ہیں اور تناسخ کے بھی قائل ہیں۔ یا جیسے محمد بن بشیر اور اس کے اصحاب جو جناب رسولِ خدا کی الوہیت کے قائل تھے اور ان کو لم یلد ولم یولد کا مصداق قرار دے

بنت الاشعث الكندی لعنهما الله فمات من ذلك والحسين بن علی قتل بكربلا قاتله سنان بن انس النخعی لعنهما الله

نے زہر دیا۔ (۲۸ صفر ۵۰ھ کو شہادت پائی) حضرت امام حسین علیہ السلام کو میدان کربلا میں سنان بن انس نخعی نے شہید کیا۔ (یہ ۱۰ محرم ۶۱ھ یوم عاشورہ کا واقعہ ہے)

کر بطور تناسخ ربوبیت کو دوسرے آئمہ طاہرین کی طرف منتقل ہونے کے قائل تھے۔ مغیرہ بن سعید صاید نہدی، حارث الشامی، فارس بن حاتم قزوینی۔ ابن ابی الزرقاء وحسن بن محمد بن بابا قمی، محمد عبری محمد بن بشیر اور منصور حلاج وغیرہم لعنہم اللہ ایسے ہی مذاہب فاسدہ اور عقائد کاسدہ کے حامل اور شریعت اسلامیہ کے احکام کے منکر تھے اور آئمہ طاہرین کی جانب سے ان کے متعلق خصوصی طور پر بہت کچھ لعن طعن وارد ہوا ہے معصومین نے ان سب طاہرین اور ان جیسے بدعقیدہ لوگوں کو کافر بلکہ یہود و نصاریٰ اور دیگر کفار و مشرکین سے بھی انجس واکفر قرار دیا ہے (رجال کشی وغیرہ کتب ملاحظہ ہوں)

مقام معرفت میں میانہ روی لازم ہے

ان حقائق سے یہ حقیقت واضح وآشکار ہو جاتی ہے کہ افراط و تفریط ہر دو مذموم اور قبیح ہیں۔ اور جو طریقہ عقلاً و شرعاً ممدوح اور قابل اختیار ہے وہ میانہ روی کا راستہ ہے۔ جیسا کہ حضرت امیر المومنینؑ نے افراط و تفریط کی مذمت اور ہلاکت خیزی بیان فرمانے کے بعد فرمایا ہے علیکم بالنمط الوسطیٰ۔ تمہارے اوپر اس سلسلہ میں میانہ روی لازم ہے (نہج البلاغہ) اور حضرت پیغمبر اسلام کا بھی یہی ارشاد ہے خیر الامور اوسطہا سب امور سے بہتر وہ امر ہے جو میانہ روی پر مبنی ہو لہٰذا ارباب عقل و دین پر واجب و لازم ہے کہ تمام امور کی طرح معرفت و مقام نبی و امام علیہما السلام میں بھی میانہ روی سے کام لیں یہی صراط مستقیم ہے ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ ۔

جعفری باش گر خدا خواہی — ورنہ در ہر طریق گمراہی

غالیوں کی مذمت ارشادات معصومینؑ کی روشنی میں

علاوہ ان خصوصی نصوص و روایات کے جو مذکورہ بالا اشخاص اور ان کے غلط نظریات کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں عمومی طور پر بھی ایسے نظریات فاسدہ رکھنے والے لوگوں سے آئمہ طاہرین نے اپنی برات و بیزاری کا بار بار اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ احتجاج طبرسی میں جناب امام رضاؑ سے مروی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا لا تجاوزوا بنا العبودیۃ ثم قولوا فینا ما شئتم ولن تبلغوا ایاکم والغلو کغلو النصاریٰ فانی بری من الغالین۔ ہمیں حدود عبودیت سے آگے نہ بڑھاؤ۔ پھر جس قدر چاہو ہمارے فضائل بیان کرو۔

وعلی بن الحسین السجاد زین العابدین سمہ الولید بن عبد الملک لعنہ اللہ فقتلہ والباقر بن علیؑ سمہ ابراہیم بن الولید لعنہ اللہ والصادقؑ سمہ ابو جعفر المنصور الدوانقی لعنہ اللہ فقتلہ

حضرت امام زین العابدینؑ کو ولید بن عبد الملک لعنہما اللہ نے زہر سے شہید کیا۔ اور وہ جناب جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ (۲۵ محرم الحرام ۹۵ھ) امام محمد باقر علیہ السلام کو ابراہیم بن ولید لعنہما اللہ نے زہر سے شہید کیا (۷ ذوالحجہ ۱۱۴ھ) اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو منصور دوانقی لعنہ اللہ نے زہر سے شہید کیا۔ (۲۵ شوال ۱۴۸ھ)

خبردار نصاریٰ کی طرح غلو نہ کرنا کیوں کہ میں غالیوں سے بیزار ہوں۔ ابن مسکان حضرت صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ لعن اللہ من قال فینا مالا نقولہ فی انفسنا لعن اللہ من اذا لنا عن العبودیۃ للہ الذی خلقنا والیہ مآبنا و معادنا و بیدہ نواصینا۔ خداوند عالم ان لوگوں پر لعنت کرے جو ہمارے متعلق وہ کچھ کہتے ہیں جو ہم خود اپنے متعلق نہیں کہتے۔ خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جو ہمیں اس خدائے تعالیٰ کی عبودیت سے خارج کرتے ہیں جو ہمارا خالق ہے۔ اور جس کی طرف ہماری بازگشت ہے۔ اور جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان ہے۔ ابی بصیر روایت کرتے ہیں کہ جناب صادق علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا یا ابا محمد ابرء ممن زعم انا ارباب اے ابو محمد! ان لوگوں سے بیزاری اختیار کرو جو ہمارے متعلق یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم رب ہیں۔ قلت برأت منہ۔ میں نے عرض کیا میں ایسے لوگوں سے بیزار ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا۔ ابرأ ممن زعم انا انبیاء ان لوگوں سے بھی بیزاری اختیار کرو جو ہمارے متعلق یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم نبی ہیں قلت برأت منہ۔ میں نے عرض کیا میں ان سے بھی بیزار ہوں۔ کتاب مستطاب عیون اخبار الرضا میں مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ مامون عباسی نے حضرت امام رضاؑ کی خدمت میں عرض کیا مجھے اطلاع ملی ہے کہ کچھ لوگ آپ حضرات کے بارہ میں غلو کرتے ہیں اور آپ کو حد سے بڑھاتے ہیں؟ آپ نے اپنے آبا و اجداد علیہم السلام کے سلسلہ سند سے فرمایا کہ حضرت امیرؑ جناب رسول خدا سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا لا ترفعونی فوق حقی فان اللہ تبارک و تعالیٰ اتخذنی عبداً قبل ان یتخذنی نبیاً مجھے میرے حق سے زیادہ بلند نہ کرو کیوں کہ خدائے تعالیٰ نے نبی بنانے سے پہلے مجھے اپنا عبد خاص بنایا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ پھر جناب امیر علیہ السلام کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ یھلک فی اثنان ولا ذنب لی محب مفرط و مبغض مفرط و انا ابرأ الی اللہ تعالیٰ ممن یغلو فینا و یرفعنا فوق حدنا کبراءۃ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام من النصاریٰ۔

وموسیٰ بن جعفر سمہ ھرون الرشید لعنہ اللہ فقتلہ والرضا علیؑ بن موسیٰ فقتلہ المامون لعنہ اللہ بالسم۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو ہارون رشید ملعون نے ۲۵ رجب ۱۸۳ھ کو) اور امام علی رضا علیہ السلام کو مامون رشید لعنہ اللہ نے زہر جفا سے شہید کیا (۱۷ صفر اور بروایتے ۲۳ ذی القعدہ ۲۰۳ھ)

(ترجمہ) میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہو جائیں گے حالانکہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ ایک محبت میں افراط کرنے والے دوسرے عداوت میں افراط کرنے والے۔ میں بارگاہ رب العزت میں ان لوگوں سے اپنی بیزاری ظاہر کرتا ہوں جو ہمارے متعلق غلو کرتے ہیں اور ہمیں اپنے حدود سے بڑھاتے ہیں، جس طرح جناب عیسیٰؑ نے نصاریٰ سے برأت ظاہر کی تھی پھر فرمایا فمن ادعی للانبیاء ربوبیۃ او ادعی للائمۃ ربوبیۃ او نبوۃ او لغیر الامام امامۃ فنحن منہ براء فی الدنیا والآخرۃ (ترجمہ) جو شخص انبیاء کے لئے ربوبیت یا آئمہ کے لئے ربوبیت یا نبوت یا غیر امام کے لئے امامت کا دعوےٰ کرے ہم اس سے دنیا و آخرت میں بری و بیزار ہیں۔ ثالث بحار میں بحوالہ کتاب الخصال حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا ادنیٰ ما یخرج الرجل من الایمان ان یجلس الی غال و یستمع حدیثہ و یصدقہ علی قولہ ان ابی حدثنی عن ابیہ عن جدہ علیہم السلام ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ قال صنفان من امتی لا نصیب لہما فی الاسلام الغلاۃ والقدریۃ کم از کم وہ چیز جس سے انسان ایمان سے خارج ہو جاتا ہے یہ ہے کہ وہ کسی غالی کے پاس بیٹھے اور اس کی باتیں سنے اور اس کے قول کی تصدیق کرے کیونکہ میرے والد ماجد نے مجھ سے اپنے والد ماجد سے انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے روایت کی ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں کہ ان کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایک غالی، دوسرا قدری۔ مشکوٰۃ الاسرار میں بحوالہ امالی شیخ طوسی علیہ الرحمۃ بروایت فضیل بن یسار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا احذروا علی شبابکم الغلاۃ لا یفسدونہم فان الغلاۃ شر خلق اللہ یصغرون عظمۃ اللہ و یدعون الربوبیۃ لعباد اللہ اپنے نوجوانوں پر غالیوں سے ڈرو کہ یہ کہیں انہیں خراب نہ کر دیں۔ کیونکہ غالی بدترین خلائق ہیں جو خدائے عزوجل کی عظمت کو گھٹاتے اور بندگانِ خدا کی ربوبیت کا ادعا کرتے ہیں۔

اس قسم کی بکثرت احادیث کتب معتبرہ میں موجود ہیں۔ اسی افراط و تفریط کے متعلق جناب امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا تھا فیہلک فی صنفان محب غال و مبغض قال (نہج البلاغہ) میرے حق میں دو قسم کے لوگ ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ حد سے بڑھاتے والے (نادان) دوست اور حد سے گھٹانے والے (بدبخت) دشمن اور ایسا ہی وقوع پذیر ہوا جیسا کہ مشاہدہ اس امر کا شاہد ہے کہ آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بیان است

وابوجعفر محمد بن علی قتلہ المعتصم لعنہ اللہ بالسم وعلی بن محمد قتلہ المتوکل لعنہ اللہ بالسم

اور جناب امام محمد تقی علیہ السلام کو معتصم عباسی ملعون نے زہر سے شہید کیا۔ (۵ جمادی الثانی یا آخر ذوالقعدہ سنہ ۲۲۰ھ) اور امام علی النقی علیہ السلام کو متوکل عباسی ملعون نے زہر دغا سے شہید کیا (سوم رجب سنہ ۲۵۴ھ)

قل یا اہل الکتب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق ولا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا من قبل واضلوا کثیرا وضلوا عن سواء السبیل۔

غلو کے انواع و اقسام

مخفی نہ رہے کہ غلو کے مختلف و متعدد انواع و اقسام ہیں۔ سرکار علامہ مجلسیؒ نے مقتبس بحار صفحہ ۳۶۵ پر ان اقسام کا تذکرہ کیا ہے۔ بنظر اختصار صرف ترجمہ پر اکتفا کی جاتی ہے فرماتے ہیں و جاننا چاہیئے کہ نبی و امام علیہم السلام کے متعلق کئی طرح غلو متصور ہو سکتا ہے (۱) ان کو خدا قرار دیا جائے (۲) معبود و خالق ہونے میں ان کو خدا کا شریک سمجھا جائے (۳) یہ کہا جائے کہ خدا نے ان کے اندر حلول کیا ہوا ہے (۴) خدا ان کے ساتھ متحد ہے (۵) یہ بزرگوار وحی و الہام کے بغیر علم غیب پر اطلاع رکھتے ہیں (۶) حضرات آئمہ کو نبی تسلیم کیا جائے (۷) یہ اعتقاد رکھا جائے کہ ان کی روحیں ایک دوسرے میں منتقل ہوتی رہتی ہیں (۸) ان کی معرفت عبادت خداوندی سے بے نیاز کر دیتی ہے اور گناہ سے اجتناب کرنے کی تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔ مذکورہ بالا اعتقادات میں سے کوئی عقیدہ رکھنا سراسر کفر والحاد ہے اور دین سے خروج کا باعث ہے۔ جیسا کہ اس امر پر ادلہ عقلیہ، آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ و ولویہ دلالت کرتے ہیں۔ سطور بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ آئمہ طاہرینؑ نے ایسے اعتقادات رکھنے والے لوگوں سے اپنی برأت و بیزاری ظاہر فرمائی ہے۔ اور ان کے کفر کا حکم صادر فرما کر ان کے قتل کا حکم دیا ہے۔ پس اگر کوئی ایسی حدیث تمہارے گوش گذار ہو جس سے مذکورہ بالا عقائد باطلہ کا وہم ہوتا ہو تو اس کی کوئی مناسب تاویل کی جائے گی۔ یا اسے غالیوں کی افتراپردازی کا نتیجہ قرار دیا جائے گا۔ انتہی کلامہ رفع فی الخلد مقامہ۔ اغتنم ہذا۔ فانہ جوہر ثمین و ملاینبئک مثل خبیر۔

ضال و مضل فرقہ مفوضہ کے عقائد کا بیان

کچھ ایسے نادان دعویداران محبت بھی تھے جن کے اندر آثار غلو موجود تھے اور آئمہ اطہار کو خدا کہنے کا جذبہ چٹکیاں لے رہا تھا۔ مگر کچھ آئمہ طاہرین کی منع اکید اور لعن شدید اور کچھ ظاہری شریعت کی حدود کا پاس و لحاظ مانع تھا۔ اس لیے کھلم کھلا طور پر تو آئمہ کی الوہیت کا ادعا نہ کیا۔ مگر در پردہ آئمہ کے حق میں اکثر اوصاف ربوبی کے قائل ہو گئے اور یہودیوں کی طرح یہ عقیدہ اختراع کر لیا۔ کہ خداوند عالم نے سرکار محمد و علی علیہما السلام کو خلق فرما کر باقی تمام عالم کے خلق کرنے مارنے اور جلانے رزق دینے اور نہ دینے اور بارش برسانے یا نہ برسانے۔ مرضوں بیماروں کو شفا دینے یا نہ دینے غرضکہ تمام عالم کے نظام کو برقرار رکھنے اور تدبیر عالم کا اہتمام کرنے کا معاملہ انہی بزرگواروں کے سپرد کر دیا ہے۔

والحسن بن علی العسکری قتلہ المعتمد لعنہ اللہ بالسم۔ واعتقادنا ان ذلک جری علیہم علی الحقیقۃ

اور حضرت حسن عسکری علیہ السلام کو معتمد لعین نے زہر جفا سے شہید کیا (۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ) ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قتل و شہادت کے حادثات ان حضرات معصومینؑ پر حقیقتاً جاری ہوئے۔

سابقہ عقیدہ فاسدہ کو غلو اور اس نظریۂ کاسدہ کو اصطلاح شریعت میں "تفویض" کہا جاتا ہے جس کے لغوی معنی سپرد کرنا ہیں۔ جو درحقیقت غلو ہی کا ایک شعبہ ہے اور اس بدعقیدہ کے شرعی مفاسد و مضار عقیدۂ غلو سے کچھ کم نہیں ہیں۔ دونوں میں فرق اس قدر ہے کہ غالی بالکل خدا کے منکر اور مفوضہ خدا کے فی الجملہ قائل ہیں۔ اس عقیدہ کے لوگ بھی آئمہ معصومینؑ کے زمانہ میں بکثرت موجود تھے۔ اس لئے آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے بڑی شد و مد کے ساتھ اس نظریۂ فاسدہ کو بھی رد فرمایا ہے۔ چنانچہ ان احادیث شریفہ کا ایک شمہ متن رسالہ میں مذکور ہے۔ اور کچھ ذیل میں آرہا ہے۔

فرقۂ مفوضہ کے عقائد کی تردید بچند وجوہ اشد ضروری ہے اور اس کے چند وجوہ ہیں۔ اولاً سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کا خدا نہ ہونا ان میں علامات مخلوقین اور سمات مصنوعین کے پائے جانے کی وجہ سے ایسا بدیہی و ضروری امر ہے۔ کہ اس کی رد محتاج بیان نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی صحیح الفطرت اور [illegible] آدمی علامات مخلوقیت کے ہوتے ہوئے مخلوق کو خالق اور آثار عبودیت کو دیکھنے کے باوجود عبد کو معبود نہیں کہہ سکتا ہاں البتہ ؎

؎ بعض آثار و اخبار میں منقول ہے کہ ایک جاثلیق (نصاریٰ کا بڑا عالم) حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عبدیت و معبودیت عیسیٰؑ کے بارہ میں مناظرہ کرنے کے لئے حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا اے نصرانی! خدا کی قسم ہم اس عیسیٰ کی نبوت کے ضرور قائل ہیں۔ جو جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت کا معترف تھا اور ہمیں آپ کے عیسیٰ پر بجز اس کے اور کوئی اعتراض نہیں ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ وغیرہ عبادات کا پابند نہ تھا۔ جاثلیق نے خشمناک ہو کر کہا کہ آپ نے جناب عیسیٰ کی طرف وہ بات کس طرح منسوب کر دی ہے۔ جو ان کے شایان شان نہیں۔ حضرت عیسیٰ تو ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے اور تمام شب عبادت میں گذارتے تھے پس جب آپ نے جاثلیق سے یہ اقرار لے لیا تو فوراً فرمایا اگر جناب عیسیٰ خود خدا و معبود تھے تو پھر یہ عبادت کس کی کرتے تھے؟ اور اگر وہ عبد نہیں تھے تو پھر اپنے لئے ایک معبود تسلیم کر کے اس کی عبادت و اطاعت میں اس قدر تعب و مشقت کیوں برداشت کرتے تھے؟ کلام امام عالی مقام سن کر نصرانی عالم مبہوت ہو کر رہ گیا (از حدیقہ سلطانیہ) قطع نظر دیگر ادلہ و براہین کے یہی تضاد دلیل ان لوگوں کے (باقی صفحہ نمبر ۵۶۴ کے آخر پر ملاحظہ ہو)

وانه ما شبه للناس امرهم كما يزعمه من يتجاوز الحد فيهم من الناس بل شاهدوا قتلهم على الحقيقة والصحة لا على الحسبان

اور ان کا معاملہ لوگوں پر مشتبہ نہیں ہوا۔ جیسا کہ ان حضرات کے بارے میں حد سے تجاوز کرنے والوں کا گمان ہے۔ بلکہ لوگوں نے حضرات معصومینؑ کو حقیقتاً اپنی آنکھوں سے شہید ہوتے دیکھا تھا۔

ع اذا لم یکن للمرء عین صحیحۃ — فلا غرو ان یرتاب والصبح مسفر

ثانیاً۔ اس وقت غالی فرقے اکثر و بیشتر منقطع اور ختم ہو چکے ہیں۔ اور سوائے بعض مقامات میں خال خال پائے جانے کے کہیں ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ بخلاف مفوضہ کے کہ وہ ہر جگہ موجود ہیں۔ اور خود ہمارے ملک میں ایسے بد عقیدہ لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ثالثاً کھلم کھلا الوہیت آئمہ کا عقیدہ ایسا غیر مانوس اور واضح البطلان ہے کہ لوگوں کا اس کی طرف کوئی خاص میلان و رجحان نہیں ہوتا۔ اس لئے لوگ اس بد عقیدہ کا بہت کم شکار ہوتے ہیں۔ مگر عقیدہ تفویض بظاہر ایسا خوش آیند نظریہ ہے کہ وہ طبائع جو غلو کی طرف مائل ہیں اسے بہت پسند کرتی ہیں اور جلد اسے قبول کر لیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر ایسا کوئی ایک بد عقیدہ آدمی کہیں موجود ہو تو وہ بیسیوں سادہ لوح اہل ایمان کے ایمان پر ڈاکہ ڈال کر ان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ بد عقیدہ متعدی مرض کی طرح قوم کے رگ و ریشہ میں برابر سرایت کر رہا ہے اور بعض "نیم ملا، خطرۂ ایمان" کے مصداق نام نہاد مبلغین جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام دے رہے ہیں جس کی وجہ سے سادہ لوح افراد ملت بری طرح اس عقیدۂ فاسدہ میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ جس کی روک تھام کا انتظام ہر ہمدرد قوم و ملت اہل علم و ایمان کا اولین فرض ہے۔ اس لئے ہم ذیل میں اس فرقۂ ضالہ و مضلہ کے نظریہ کے بطلان کی طرف عنانِ بیان کو پھیرتے ہوئے قدرے تفصیل سے اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔

مفوضہ کی مذمت ارشادات آئمہؑ کی روشنی میں

حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا "من زعم ان الله یفعل افعالنا ثم یعذبنا علیها فقد قال بالجبر ومن زعم ان الله عزوجل فوض امر الخلق والرزق الی حججه فقد قال بالتفویض والقائل بالجبر کافر والقائل بالتفویض مشرک"۔ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ خدا ہی ہمارے افعال کا

۱؎ نوٹ صفحہ ۵۶۳ سے آگے۔ زعم باطل کے بطلان کے لئے کافی و وافی ہے۔ جو جناب رسول خدا یا دوسرے آئمہ ہدیٰ کی الوہیت کے قائل ہیں کہ اگر یہ حضرات قدسی صفات خود اللہ و معبود تھے تو یہ روزہ کس ذات کے لئے رکھتے تھے؟ اور علاوہ واجبی نمازوں اور ان کے نوافل مرتبہ کے ہزار ہزار رکعت نماز نوافل کس معبود کے لئے پڑھتے تھے؟ اور دیگر عبادات کس خدا کے لئے کرتے تھے؟ بل عباد مکرمون لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون۔

والخیالات ولا علی الشك والتہمۃ فمن زعم انہم شبہوا او واحد منہم تلبیس من دیننا علی شئی دنحن منہ براء وقد اخبر

نہ یہ کہ صرف گمان وخیال کی بنا پران کی شہادت کا نظریہ قائم کیا تھا۔ جو شخص یہ گمان کرے کہ یہ حضرات یا ان میں سے کوئی ایک بزرگ حقیقتاً شہید نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی شبیہ کے ساتھ ایسا ہوا تو وہ ہمارے دین سے خارج ہے اور ہم اس سے بیزار ہیں۔

فاعل ہے اور پھر ہمیں عذاب بھی کرے گا تو وہ جبر کا قائل ہے اور جو یہ گمان کرتا ہے۔ کہ خداوند عالم نے خلق کرنا اور رزق دینا اپنی محبتوں (آئمہ طاہرینؑ) کے سپرد کر دیا ہے وہ تفویض کا قائل ہے۔ جبر کا قائل کافر اور تفویض کا قائل مشرک ہے (عیون اخبار الرضاؑ)

(۲) حسین بن خالد ایک طویل روایت کے ضمن میں جناب امام رضاؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آنجناب نے ان سے فرمایا یا ابن خالد انما وضع الاخبار عنا فی التشبیہ والجبر الغلاۃ الذین صغروا عظمۃ اللہ تعالیٰ فمن احبہم فقد ابغضنا ومن ابغضہم فقد احبنا ومن والاہم فقد عادانا ومن عاداہم فقد والانا ومن وصلہم فقد قطعنا ومن قطعہم فقد وصلنا ومن جفاہم فقد برنا ومن برہم فقد جفانا ومن اکرمہم فقد اہاننا ومن اہانہم فقد اکرمنا ومن قبلہم فقد ردنا ومن ردہم فقد قبلنا ومن احسن الیہم فقد اساء الینا ومن اساء الیہم فقد احسن الینا ومن صدقہم فقد کذبنا ومن کذبہم فقد صدقنا ومن اعطاہم فقد حرمنا ومن حرمہم فقد اعطانا یا ابن خالد من کان من شیعتنا فلا یتخذن منہم ولیاً ولا نصیراً۔ اے فرزند خالد! جبر و تشبیہ کے متعلق ہماری طرف جو اخبار منسوب ہیں یہ غالیوں نے وضع کی ہیں۔ وہ غالی جو اللہ سبحانہ کی عظمت وجلالت کو گھٹاتے ہیں۔ پس جو شخص ان سے محبت کرتا ہے وہ ہم سے بغض رکھتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ ہم سے محبت کرتا ہے جو ان سے دوستی رکھتا ہے وہ ہم سے دشمنی رکھتا ہے۔ اور جو ان سے دشمنی رکھتا ہے وہ ہم سے دوستی رکھتا ہے۔ جو ان سے وصل کرتا ہے وہ ہم سے قطع کرتا ہے اور جو ان سے قطع تعلق کرتا ہے وہ ہم سے وصل کرتا ہے۔ جو ان پر جفا کرتا ہے وہ ہم سے نیکی کرتا ہے اور جو ان کے ساتھ نیکی کرتا ہے وہ ہم پر جفا کرتا ہے۔ جو ان کا اکرام واحترام کرتا ہے وہ ہماری توہین کرتا ہے اور جو ان کی توہین کرتا ہے وہ ہمارا احترام کرتا ہے۔ جو انہیں قبول کرتا ہے وہ ہمیں رد کرتا ہے۔ اور جو ان کو ٹھکراتا ہے وہ ہمیں قبول کرتا ہے۔ جو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے وہ ہم سے بُرا سلوک کرتا ہے اور جو ان سے بُرا سلوک کرتا ہے وہ ہم سے اچھا سلوک کرتا ہے۔ جو ان کی تصدیق کرتا ہے وہ ہماری تکذیب کرتا ہے اور جو ان کی تکذیب کرتا ہے وہ ہماری تصدیق کرتا ہے جو ان کو دیتا ہے وہ ہمیں محروم کرتا ہے اور جو ان کو محروم کرتا ہے وہ ہمیں عطا کرتا ہے۔

النبیؐ والائمۃؑ انھم مقتولون فمن قال انھم لن یقتلوا انقد کذبھم ومن کذبھم فقد کذب اللہ عزوجل وکفر

یہ اس لئے کہ خود سرور کائناتؐ اور آئمہ اطہار علیہم السلام نے پہلے سے خبر دی تھی کہ ہم سب قتل کئے جائیں گے بایں ہمہ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ حضرات قتل نہیں ہوئے تو درحقیقت ایسا شخص خود ان بزرگواروں کو جھٹلاتا ہے۔ اور جس نے ان کو جھٹلایا اس نے گویا خدا کو جھٹلایا۔ اور خدا کو جھٹلانے والا

لے فرزند خالد! جو شخص ہمارے شیعوں میں سے ہے اس پر لازم ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار بنائے (عیون اخبار الرضا۔ احتجاج طبرسیؒ)

فرقہ مفوضہ فرقہ غالیہ کی ایک قسم ہے

شاید کوئی کوتاہ اندیش یہ خیال کرے کہ اس روایت میں تو غالیوں کی مذمت کی گئی ہے اسے مفوضہ کی مذمت کے ساتھ کیا ربط ہے؟ ازالۂ اشتباہ کے لئے واضح رہے کہ ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ غلو کلی مشکک ہے اور اس کے تحت افراد کثیرہ ہیں بعض ضعیف اور بعض شدید۔ تفویض بھی اسی غلو کا ایک فرد ہے۔ بالفاظ سادہ غالیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ مفوضہ بھی انہی کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ (شرح عقائد صلا میں) فرماتے ہیں۔ المفوضۃ صنف من الغلاۃ وقولھم الذی فارقوا بہ من سواھم من الغلاۃ اعترافھم بحدوث الائمۃ وخلقھم ونفی القدم عنھم یعنی مفوضہ غالیوں کا ہی ایک گروہ ہے۔ ان میں اور مکمل غالیوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ یہ آئمہ اطہارؑ کو قدیم نہیں جانتے۔ اور ان کو مخلوق تسلیم کرتے ہیں۔ شیخ فضل اللہ نوری حاشیہ اوائل المقالات مصنفہ شیخ مفید ص۲ طبع ایران میں رقمطراز ہیں۔ وھم فرقۃ من الغلاۃ یعنی مفوضہ غالیوں کا ہی ایک فرقہ ہے۔ اسی طرح صاحب معارف الملۃ الناجیۃ والنار یہ نے بھی مفوضہ کو غالیوں کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ ان کی اصل عبارت یہ ہے۔ غلاۃ ایشاں کسانے اند کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مع علیؑ و آئمہؑ دیگر را خدا جدا نند چہ بجا چہ باتحاد چہ بتفویض یا علیؑ و آئمہؑ را افضل از رسولؐ جدانند نزد امامیہ اثنا عشریہ کلہم کفار اند وایں غلاۃ فرقات دارند ص۵۹ ص۶۰ تک ان فرقوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور ص۶۱ پر مفوضہ کو بھی انہی غلاۃ کے فرقوں میں شمار کیا ہے۔ فراجع بنا بریں جن احادیث میں غالیوں کی مذمت وارد ہوئی ہے وہ مفوضہ کو بھی شامل ہے۔

۲۔ انہی حضرتؑ سے مروی ہے آپ کے خادم خاص جناب یاسر بیان کرتے ہیں قلت للرضاؑ ما تقول فی التفویض فقال ان اللہ تبارک وتعالیٰ فوض الی نبیہ امر دینہ فقال ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا واما الخلق والرزق فلا ثم قال ان اللہ عزوجل خالق کل شئی وھو یقول عزوجل الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ھل من شرکائکم من یفعل من ذالکم من شئی سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون۔

به وخروج به عن الاسلام ومن يتبع غير الاسلام دينا فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين كان الرضا يقول في دعائه اللهم اني ابرأ اليك من

دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور جو شخص دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا اس کا دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔ جناب امام رضا اپنی دعا میں کہا کرتے تھے۔ بار الٰہا! میں تیرے حضور میں اپنی ہر قسم کی طاقت وقوت سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں۔"

(سابع بحار الانوار) میں ہے جناب امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ تفویض کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا خداوند عالم نے امور دین کو اپنے نبی کے سپرد کیا چنانچہ ارشاد فرمایا جس چیز کا رسول تمہیں حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس چیز سے روک دیں اس سے باز رہو۔ لیکن پیدا کرنے، رزق دینے اور تقسیم کرنے کا معاملہ اس نے ان کے سپرد نہیں کیا۔ پھر فرمایا خدا تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے۔ وہی تمہارا خدا ہے۔ جس نے تمہیں پیدا کیا پھر رزق دیا۔ پھر تمہیں مارے گا۔ پھر زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے مقرر کردہ شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ان امور میں سے کوئی کام انجام دے سکے؟ خداوند عالم مشرکین کے شرک سے پاک و پاکیزہ ہے (۳) جناب شیخ کشی اپنے رجال میں اپنے سلسلۂ سند سے روایت کرتے ہیں کہ حجر بن زائدہ اور عامر بن خداعہ حضرت صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ فلاں شخص یہ کہتا ہے انكم تقدرون ارزاق العباد؟ فقال واللّٰه ما يقدر ارزاقنا الا اللّٰه ولقد احتجت الى طعام لعيالي فضاق صدري وابلغ الى الفكرة في ذلك حتى احرزت قوتهم فعندها طابت نفسي لعنه اللّٰه وبرئ اللّٰه منه" کہ آپ لوگوں کے رزق مقدر مقرر کرتے ہیں! امام نے یہ سن کر فرمایا خدا کی قسم سوائے خدا کے خود ہمارا رزق اور کوئی مقدر نہیں کرتا مجھے اپنے اہل وعیال کیلئے طعام کی ضرورت لاحق ہوئی۔ یہاں تک کہ میرا سینہ تنگ ہونے لگا۔ جب ان کی قوت لا یموت کا انتظام کر لیا ہے۔ تب طبیعت میں سکون پیدا ہوا ہے۔ خدا اس شخص پر لعنت کرے اور اس سے بیزار ہو وہ کتنا غلط عقیدہ رکھتا ہے (رجال کشی ص۲۰۸)

ابطال تفویض قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیات مبارکہ موجود ہیں جو بصراحت اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خلق کرنا و رزق دینا، مارنا جلانا اور بیماروں کو شفا دینا وغیرہ امور تکوینیہ کی انجام دہی ذات ایزدی سے وابستہ ہے۔ اس نے یہ امور کسی بھی مخلوق کے سپرد نہیں فرمائے نہ استقلالی طور پر اور نہ غیر استقلالی طور پر۔ صرف بطور نمونہ چند آیات مبارکہ پیش کی جاتی ہیں۔ ارشاد قدرت ہے یا ايها الناس اعبدوا ربكم الذي خلقكم والذين من قبلكم لعلكم تتقون۔ الذي جعل لكم الارض فراشا والسماء بناء وانزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقا لكم۔ فلا تجعلوا للّٰه انداداً وانتم تعلمون (پ۱ س بقرہ ۳) اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ جس نے تم کو اور ان لوگوں

الحول والقوة ولاحول ولاقوۃ الا بك اللھم انی ابرالیك من الذین قالوا فینا مالم نعلمہ فی انفسنا

کیونکہ تو ہی ہر قسم کی طاقت و قوت کا سرچشمہ ہے۔ یا اللہ! میں ان لوگوں سے اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں جو ہمارے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جو ہم اپنے اندر نہیں پاتے۔

کو جو تم سے پہلے تھے پیدا کیا۔ عجیب نہیں تم پرہیز گار بن جاؤ۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اسی نے تمہارے کھانے کے لئے بعض پھل پیدا کئے۔ بس کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ حالانکہ تم خوب جانتے ہو۔

۲۔ اللہ الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ھل من شرکائکم من یفعل من ذلکم من شیئ سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون (پ ۲۱ س روم ع ۷) خدا وہ (قادر و توانا) ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر اس نے روزی دی۔ پھر وہی تم کو مار ڈالے گا پھر وہی تم کو (دوبارہ) زندہ کرے گا۔ بھلا تمہارے بنائے ہوئے (خدا کے) شریکوں میں سے کوئی بھی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے۔ جسے یہ لوگ (اس کا) شریک بناتے ہیں وہ اس سے پاک اور برتر ہے۔ اس آیت مبارکہ کے ذیل میں حضرت علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں «یدل علی عدم جواز نسبۃ الخلق والرزق والاماتۃ والاحیاء الی غیرہ سبحانہ وتعالیٰ وانہ شرک» (ہفتم بحار ص۳۳) یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خلق کرنے رزق دینے اور مارنے وجلانے کی نسبت غیر خدا کی طرف دینا جائز نہیں ہے۔

۳۔ ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم قل اللہ خالق کل شیئ وھو الواحد القہار۔ (پ ۱۳ س الرعد ع ۸) ان لوگوں نے خدا کے کچھ شریک ٹھہرا رکھے ہیں۔ کیا انہوں نے خدا ہی کی سی مخلوق پیدا کر رکھی ہے جن کے سبب مخلوقات ان پر مشتبہ ہو گئی ہے (اور ان کی خدائی کے قائل ہو گئے ہیں) تم کہدو کہ خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی یکتا اور سب پر غالب ہے۔

اس آیت مبارکہ کے ذیل میں علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں۔ یدل علی عدم جواز نسبۃ الخلق الی الانبیاء والائمۃ علیھم السلام (بحار جلد ۷ ص ۳۳) یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام کی طرف خلق کرنے کی نسبت دینا جائز نہیں۔

۴۔ اللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر (پ ۱۳ رعد ع ۴) خدا ہی جس کے لئے چاہتا ہے روزی کو بڑھا دیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے۔

۵۔ واذا مرضت فھو یشفین (پ ۱۹ س الشعراء ع ۹) اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا عنایت فرماتا ہے۔

۶۔ قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء

اللھم لک الخلق ومنک الامر وایاک نعبد وایاک نستعین اللھم انت خالقنا وخالق آبائنا الاولین وآبائنا الآخرین اللھم لا تلیق الربوبیۃ الا بک۔

اے اللہ! خلق کرنا اور حکم دینا تجھ ہی سے متعلق ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں تو ہی ہمارا خالق اور ہمارے اوّلین و آخرین۔ اباء و اجداد کا خالق ہے۔ اے اللہ! مقام ربوبیت تیرے ہی لائق ہے۔

وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شئی قدیر (پ ۳ س ال عمران ع ۱۱) (اے رسولؐ) تم یہ دعا مانگو کہ اے خدا، تمام عالم کے مالک! تو ہی جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ اور تو ہی جس کو چاہے عزت دے اور تو ہی جسے چاہے ذلت دے۔ ہر قسم کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ بے شک تو ہی ہر چیز پر قادر ہے۔

۷۔ قل من یرزقکم من السماء والارض امن یملک السمع والابصار ومن یخرج المیت من الحی ومن یدبر الامر فسیقولون اللہ فقل افلا تتقون فذلکم اللہ ربکم فماذا بعد الحق الا الضلال فانی تصرفون (پ ۱۱ س یونس ع ۹) اے رسولؐ! تم (ان سے ذرا) پوچھو تو کہ تمہیں آسمان و زمین سے کون روزی دیتا ہے؟ یا (تمہارے) کان اور (تمہاری) آنکھوں کا کون مالک ہے؟ اور کون شخص مردے سے زندہ کو نکالتا ہے۔ اور زندہ سے مردے کو نکالتا ہے اور ہر امر کا بندوبست کون کرتا ہے؟ تو فوراً بول اٹھیں گے کہ خدا۔ (اے رسولؐ) تم کہو تو کیا تم اس پر بھی (اس سے) نہیں ڈرتے ہو؟ (ترجمہ فرمانؐ) ودلالۃ تلک الآیات علی نفی الغلو والتفویض ظاہرۃ لا تحتاج الی البیان واللہ المستعان۔

وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون۔

دینی امور میں تفویض کا بیان

مذکورہ بالا بعض احادیث مبارکہ میں چونکہ امور شریعت کی تفویض کا تذکرہ موجود ہے لہٰذا اس پر کچھ تبصرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے سو مخفی نہ رہے کہ تفویض کے متعدد اقسام و انواع ہیں چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار اور مرآۃ العقول میں اس کے سات اقسام شمار کئے ہیں۔ مگر اس کی بڑی بڑی دو قسمیں ہیں (۱) تفویض امور تکوینیہ (۲) تفویض امور دینیہ بالفاظ دیگر ایک تفویض کا تعلق دنیوی امور سے ہے اور دوسری کا تعلق دینی امور سے۔ مذکورہ بالا تحقیق سے دنیوی امور میں تفویض کا بطلان نور روز روشن کی طرح واضح و عیاں ہو چکا ہے کہ حضرات معصومینؑ نے اس نظریۂ فاسدہ کہ خدا نے مارنے، جلانے، خلق کرنے رزق دینے اور بیماروں کو شفا دینے کا کام ان کے سپرد کر دیا ہے کو غلط قرار دیا ہے۔ باقی رہی امور دینی کی تفویض جس کا مطلب شریعت سازی اور قانون بنانا نہیں کیونکہ شریعت سازی

اِلَّا وَ لَاتَصْلُحُ الْاِلٰهِیَّةُ اِلَّا لَكَ فَالْعَنِ النَّصَارٰی الَّذِیْنَ صَغَّرُوْا عَظَمَتَكَ وَالْعَنِ الْمُضَاهِیْنَ لِقَوْلِهِمْ مِنْ بَرِیَّتِكَ

اور معبودیت و الوہیت کی صلاحیت فقط تجھ ہی میں ہے۔ اے پالنے والے! تو نصاریٰ پر لعنت کر کیونکہ انہوں نے تیری عظمت کو گھٹانے کی کوشش کی اور ان لوگوں پر بھی لعنت کر جو تیری مخلوق میں سے ان (نصرانیوں) کے ہم خیال ہیں۔

تو خداوند عالم کا کام ہے۔ لہٰذا احکام وضع تو وہ خود کرتا ہے۔ لیکن اس کا بیان کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام۔ یہ پیغمبر اسلام کا وظیفہ ہے اور اس شریعت کی حفاظت و حراست اور تشریح و توضیح رسولؐ کے حقیقی خلفاء علیہم السلام کا کام ہے۔ وَ لٰكِنْ مَا يَشَاءُ وْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ اسی طرح یہ امر بھی ان کی صوابدید پر منحصر ہے کہ کہاں حکم بیان کرنا ہے اور کہاں بیان نہیں کرنا۔ کس سائل کو جواب دینا ہے اور کس کو نہیں دینا۔ کہاں ظاہری شریعت کے مطابق حکم دینا ہے اور کہاں اپنے علم پر عمل کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے متعلق متعدد احادیث وارد ہیں کہ اس قسم کی تفویض جناب رسولِ خدا اور آئمہ ہدیٰؑ کے حق میں صحیح ہے۔ ان احادیث میں سے ایک حدیث تو اوپر بیان ہو چکی ہے دو چار مزید احادیث شریفہ پیش کی جاتی ہیں۔ اصول کافی میں تفویض احکام کے متعلق ایک پورا باب موجود ہے جس کا عنوان ہے۔ کتاب کشف الغمہ کذا فی البحار ج ۷، ص ۳۶۲) میں بروایت جابر بن عبد اللہ انصاری جناب رسولِ خدا سے مروی ہے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَدَعَاهُنَّ فَاَجَبْنَ فَعَرَضَ عَلَيْهِنَّ نُبُوَّتِيْ وَوِلَايَةَ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَبِلْنَهُمَا ثُمَّ خَلَقَ الْخَلْقَ وَفَوَّضَ اِلَيْنَا اَمْرَ الدِّيْنِ فَالسَّعِيْدُ مَنْ سَعِدَ بِنَا وَالشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ بِنَا نَحْنُ الْمُحَلِّلُوْنَ لِحَلَالِهِ وَالْمُحَرِّمُوْنَ لِحَرَامِهِ۔ خداوند عالم نے زمین و آسمان پیدا کئے اور ان کو (بطور استعارہ) اپنی طاعت کی طرف بلایا۔ انہوں نے لبیک کہا پس ان پر میری نبوت اور جناب علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کو پیش کیا۔ انہوں نے اسے قبول کیا۔ پھر خلق کو پیدا کیا اور دینی امور کو ہمارے سپرد کیا۔ پس نیک بخت وہ ہے جو ہماری وجہ سے نیک بخت ہوا ہے اور بدبخت وہ ہے جو ہماری وجہ سے بدبخت ہوا۔ ہم ہی اللہ کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دینے والے ہیں۔ نیز اصول کافی میں جناب امام محمد باقرؑ سے مروی ہے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ اَدَّبَ نَبِيَّهٗ عَلٰى مَحَبَّتِهٖ فَقَالَ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ثُمَّ فَوَّضَ اِلَيْهِ دِيْنَهٗ فَقَالَ عَزَّوَجَلَّ وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَقَالَ عَزَّوَجَلَّ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَاِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ فَوَّضَ اِلٰى عَلِيٍّ وَائْتَمَنَهٗ فَسَلَّمْتُمْ وَجَحَدَ النَّاسُ الْحَدِيْثَ۔ خداوند عالم نے اپنے نبی کی اپنی محبت پر تربیت فرمائی یہاں تک کہ ان کے حق میں فرمایا، تم خلق عظیم پر فائز ہو۔ پھر اپنے دین کو ان کے سپرد کیا۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے جس چیز کا رسول تمہیں حکم دیں اس کو تسلیم کرو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو۔ اور جناب رسولِ خدا

اللّٰھم انا عبیدک وابناء عبیدک لا نملک لانفسنا ضراً ولا نفعاً ولا موتاً ولا حیٰوۃ ولا نشوراً۔ اللّٰھم من زعم ان لنا الخلق وعلینا

خداوندا! ہم تیرے بندے ہیں اور تیرے بندوں کی اولاد ہیں۔ ہم نہ اپنے نفع و نقصان کے مالک ہیں اور نہ ہی موت و حیات اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر قدرت رکھتے ہیں۔ بار الہا! جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ہم پیدا کرتے اور روزی دیتے ہیں۔

نے یہ امر علیؑ مرتضیٰ کے سپرد کیا۔ پس تم نے (اے شیعو) اسے تسلیم کر لیا۔ مگر دوسرے لوگوں نے انکار کیا۔ اسی طرح بروایت محمد بن سنان جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا ان اللّٰہ تبارک وتعالیٰ ادب نبیہ فلما انتھی بہ ما اراد قال انک لعلی خلق عظیم ففوض الیہ دینہ فقال وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا مطلب وہی ہے جو اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ لقد جاءک الحق من ربک فلا تکونن من الممترین۔

تفویض استقلالی و غیر استقلالی کا ابطال اور ایک تاویل علیل کی رد

وہ تفویض نواز حضرات جو قدرے عقلمند تھے اور اپنی غلطی اور اہل ایمان کی گرفت کا احساس کرتے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ احادیث معصومینؑ میں بالصراحت نظریۂ تفویض کی رد کی گئی ہے تو انہوں نے بڑے غور و فکر کے بعد اپنے عقیدۂ فاسدہ کی صحت کے لئے ایک تاویل تراش کی اور وہ یہ کہ تفویض کی دو قسمیں ہیں (۱) تفویض استقلالی اور (۲) تفویض آلی (غیر استقلالی) پھر کہا تفویض ممنوع وہ ہے کہ ان بزرگواروںؑ کو اس طرح مدبر بالذات اور خالق و رازق بالاستقلال تسلیم کیا جاوے کہ جس سے خدا کا بے کار اور معطل محض ہونا لازم آئے۔ لیکن اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ کرتا تو سب کچھ خدا ہے۔ مگر ان بزرگواروں کے ذریعہ سے کرتا ہے یہ اس کے آلۂ کار ہیں۔ خلق و رزق اور اماتہ و احیاء وغیرہ امور کا ظہور ان سے ہوتا ہے۔ یہ حضرات جو کچھ کرتے ہیں وہ اذن و مشیت ایزدی کے ماتحت کرتے ہیں لہٰذا یہ کہنا کہ وہ باذن اللّٰہ خلق کرتے ہیں اور باذن اللّٰہ رزق دیتے ہیں اور مشیت الٰہی مارتے اور جلاتے ہیں تو یہ تفویض ممنوع نہیں ہے۔

یہ تاویل بچند وجہ علیل اور ناقابل قبول ہے

وجہ اول۔ یہ تاویل بلا دلیل ہے اور اگر ایسی بے حقیقت تاویلات پر اعتماد کیا جائے تو دنیا میں کوئی کافر، کافر ہی نہیں رہے گا۔ کیونکہ قرآن شاہد ہے کہ جب کفار سے پوچھا جاتا تھا کہ تم اللّٰہ کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ تو وہ یہ جواب دیتے تھے۔ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللّٰہ زلفیٰ (ہم ان بتوں کو مستقل معبود سمجھ کر ان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس لئے ان کی عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا تعالیٰ کے قریب کر دیں۔ دیکھئے (کفار و مشرکین) کس صراحت کے ساتھ بتوں کے معبود برحق ہونے کی نفی اور ان کے وسیلہ و واسطہ ہونے کا اقرار کر رہے ہیں مگر باایں ہمہ خدا اور رسولؐ

الرزق فنحن الیک منھم براء کبراءۃ عیسیٰ بن مریم عن النصاری اللھم انا لم ندعھم الی ما یزعمون فلا تواخذنا بما یقولون واغفر لنا

ہم اس سے اسی طرح بری و بیزار ہیں جس طرح حضرت عیسیٰ بن مریمؑ نصرانیوں سے بیزار تھے۔ یا اللہ! جن باتوں کا یہ لوگ ہمارے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں، ہم نے ان کو اس کی دعوت نہیں دی۔ اس لئے جو کچھ وہ کہتے ہیں ہم سے اس کا مؤاخذہ کرنا اور جو وہ گمان فاسد کرتے ہیں ہمیں معاف فرمانا۔

نے ان کے اس عذر کو قبول نہ کیا۔ کیونکہ ان کا یہ نظریہ من گھڑت تھا بلا تشبیہ یہی حال ان حضرات کی اس تاویل کا ہے کہ یہ من گھڑت ہے اور بلا شاہد اور بلا دلیل ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قبول ہے۔

وجہِ دوئم:- اوپر متعدد احادیث ذکر ہو چکی ہیں کہ جن میں امورِ دین کی تفویض کے صحیح ہونے کا تذکرہ موجود ہے اور انہی احادیث میں سے بعض کے اندر دنیوی امور کی تفویض کی نفی وارد ہے۔ اس تقابل سے روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ امورِ دین میں جس قسم کی تفویض ثابت ہے اسی قسم کی تفویض امورِ دنیا میں باطل ہے پس اگر امورِ دین میں تفویض سے مراد تفویض استقلالی اور بالذات ہے کہ رسولِ خداؐ اور آئمہ ہدیٰؑ بالذات اور بالاستقلال احکامِ شریعت بناتے اور بیان کرتے ہیں اور خداوند عالم (معاذ اللہ) بے کار محض اور معطل بحت ہے تب تو دنیوی امور میں جو تفویض ممنوع ہے اس کا بھی یہی مطلب ہوگا جو اس تاویل میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اگر امورِ شرعیہ میں تفویض کے یہ معنی ہیں کہ احکام خدا وضع کرتا اور بناتا ہے۔ شریعت سازی اسی کا کام ہے۔ ہاں اس کے حلال و حرام کا بیان نبیؐ و امامؑ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں تو اس کے بالمقابل دنیوی امور میں جو تفویض ممنوع ہے اس سے مراد بھی یہی غیر استقلالی اور آلی تفویض ہوگی اور اس کی نفی سے تفویض استقلالی کا بطلان بطریق اولیٰ واضح و عیاں ہو جائے گا۔

ع وبضدھا تتبین الاشیاء۔ اگر اس تفویض استقلالی و غیر استقلالی میں کوئی فرق ہوتا کہ پہلی قسم غلط اور دوسری صحیح ہوتی جیسا کہ ان حضرات کا خیال ہے تو پھر ضروری تھا کہ خود معصومین علیہم السلام تفویض کی نفی اور مذمت کرتے وقت اس امر کی وضاحت فرما دیتے کہ تفویض ممنوع و مذموم وہ ہے جس سے خدا کی تعطیل لازم آئے اور اگر یہ اعتقاد رکھا جائے کہ حضرات آئمہؑ باذن اللہ یہ سب کچھ کرتے ہیں تو یہ درست ہے لیکن احادیث میں یہ وضاحت موجود نہیں ہے بلکہ علی الاطلاق دنیوی امور میں تفویض کی نفی کی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تفویض خواہ استقلالی ہو اور خواہ غیر استقلالی غلط ہے اور اس کا اعتقاد رکھنا باطل ہے۔

وجہِ سوئم:- یہ تاویل بلا ضرورت اور بلا وجہ ہے کیونکہ ایسی تاویل کی احتیاج اس وقت ہوتی ہے جب کہ ہمارے پاس دو قسم کی روایات موجود ہوتیں۔ جو سند اور صحت کے لحاظ سے مساوی ہوتیں اور پھر ان میں سے بعض میں دنیوی تفویض کا اثبات ہوتا اور بعض میں اس کی نفی وارد ہوتی۔ اس وقت البتہ اس قسم کی کسی تاویل کی گنجائش

مایزعمون رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیاراً انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولایلدوا الاّفاجراً کفارا وروی عن زرارۃ انہ قال قلت

پالنے والے! تو زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑ کیونکہ اگر تو انہیں زندہ چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے۔ اور سوائے کافر اور فاسق و فاجر کے اولاد نہیں جنیں گے جناب زرارہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا۔

ہو سکتی تھی کہ ان روایات کے درمیان اس طرح جمع و توفیق کی راہ پیدا کی جاتی کہ جن روایات میں تفویض کا اثبات وارد ہے۔ ان سے مراد تفویض غیر استقلالی ہے۔ اور جن میں اس کی نفی وارد ہے۔ ان سے مراد تفویض استقلالی ہے لیکن جب یہاں کوئی تعارض و اختلاف موجود ہی نہیں۔ بلکہ جس قدر روایات معتبرہ ہیں وہ سب تفویض کی نفی پر دلالت کرتی ہیں تو پھر اس تاویل کا محل و مقام ہی کیا باقی رہ جاتا ہے۔ جب معصومینؑ نے علی الاطلاق تفویض کی نفی فرمادی ہے تو اس سے اس کے تمام اقسام و انواع کی نفی ہو جاتی ہے۔ لان نفی العام یدل علی نفی الخاص کما لایخفیٰ علی الخواص۔

وجہ چہارم:۔ اگر بالفرض اخبار و آثار میں اس قسم کا تعارض واقع ہو بھی جاتا (جو کہ نہیں ہے جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے) تو بنا بر قانون تعادل و تراجیح نفی تفویض والی روایات ہی کو مقدم کیا جاتا۔ کیوں کہ وہ ظاہر قرآن کے مطابق ہیں۔ کیوں کہ خلق و رزق اور اماتہ و احیاء وغیرہ امور قرآن میں خداوند عالم کے صفات فعل میں سے شمار کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ بعض آیات مبحث توحید میں بیان ہو چکی ہیں اور بعض اسی باب میں متن رسالہ میں مذکور ہیں۔ اور مسلمہ قاعدہ ہے کہ اختلاف کے وقت ان روایات کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔ جو قرآن کے مطابق ہوں۔ کلما خالف کتاب اللہ فھو زخرف ہر وہ حدیث جو قرآن کے مخالف ہو وہ باطل ہے (اصول کافی فرمان امام جعفر صادقؑ)

وجہ پنجم:۔ بعض روایات میں غیر استقلالی تفویض کے ممنوع ہونے کی صراحت موجود ہے چنانچہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے فرمایا۔ من زعم انا خالقون بامر اللہ فھو کافر جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ہم باذن اللہ خالق ہیں وہ کافر ہے (شرح الخطبہ مصنف سید کاظم رشتی شیخی ص ۳۲۲) انہی حقائق کی بنا پر علماء اعلام نے تفویض غیر استقلالی کو بھی ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ ہفتم بحار میں تفویض کے اقسام بیان کرتے ہوئے تفویض استقلالی کو کفر و شرک قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ تفویض غیر استقلالی اگرچہ عقلاً ممکن ہے۔ مگر احادیث معصومینؑ کے پیش نظر یہ بھی ممنوع ہے اور اس کا اعتقاد رکھنا غلط ہے ان کی عین عبارت یہ ہے وھذا وان کان العقل لا یعارضہ کفاحاً لکن الاخبار السالفۃ تمنع من القول بہ فیما عدا المعجزات ظاہراً بل صراحاً مع ان القول بہ قول بمالا یعلم اذ لم یرد ذلک

للصادق ان رجلا من ولد عبد الله بن سبا یقول بالتفویض فقال ما التفویض فقلت یقول ان الله عزوجل خلق محمداً

کہ عبد اللہ بن سبا کی اولاد میں سے ایک شخص تفویض کا عقیدہ رکھتا ہے۔ امام نے فرمایا تفویض کیا ہے؟ میں نے کہا وہ کہتا ہے کہ خداوند عالم نے صرف حضرت محمد مصطفیٰ و علی مرتضیٰ کو پیدا کیا۔

فی الاخبار المعتبرۃ فیما نعلم۔ یعنی اس قسم کی تفویض اگرچہ بالکل عقل کے خلاف نہیں ہے مگر گذشتہ احادیث سوائے مقام اعجاز کے صراحتہً یہ اعتقاد رکھنے سے ممانعت کرتی ہیں علاوہ بریں یہ نظریہ ایسا ہے کہ اس کی صحت و حقانیت کا علم و یقین نہیں ہے۔ کیوں جہاں تک ہمیں علم ہے اس نظریہ کی صحت پر اخبارِ معتبرہ میں سے کوئی حدیث وارد نہیں ہوتی یہ اپنی سرکار نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرمایا ہے ولا تعتقد انہم خلقوا العالم بامر اللہ فانا قد نہینا فی صحاح الاخبار عن القول بہ ولا عبرۃ بمارواہ البرسی وغیرہ من الاخبار الضعیفۃ۔ یہ اعتقاد ہرگز نہ رکھو کہ آئمہ علیہم السلام نے خدا کے اذن سے اس عالم کو پیدا کیا ہے۔ کیوں کہ ہمیں صحیح السند احادیث میں یہ اعتقاد رکھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں برسی وغیرہ نے جو ضعیف روائتیں نقل کی ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

متعلقہ مسئلہ میں صحیح شیعی عقیدہ

ایک وقت وہ تھا کہ اہل دین اپنے دینی عقائد و اعمال کو معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کرتے تھے۔ اور جن عقائد و اعمال کی وہ بزرگوار تائید فرماتے ان پر وہ کاربند رہتے اور جن کی وہ تائید نہ فرماتے ان سے فوراً دست بردار ہو جاتے۔ اس قسم کے بیسیوں واقعات کتب سیر و تواریخ کے اندر موجود ہیں۔ مگر اب یہ حالت ہو چکی ہے کہ لوگوں نے مذہب و شریعت کو ایک کھلونا سمجھ رکھا ہے۔ جدھر چاہتے ہیں اس کو گیند کی طرح پھیر لیتے ہیں ہر شخص نے اپنی خام عقل، ناقص رائے اور قلیل علم سے علیحدہ علیحدہ عقائد و نظریات تراش رکھے ہیں کوئی کہتا ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ فلاں عقیدہ اس طرح ہونا چاہیئے۔ مگر کوئی خدا کا بندہ یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ شریعت مقدسہ نے اس سلسلہ میں کیا فیصلہ صادر کیا ہے؟ جو کہ ایک متدین انسان کی شان ہونی چاہیئے بلکہ ذہنیتیں اس قدر بگڑ چکی ہیں کہ اگر کوئی عالم دین شرعی فیصلہ کرے تو لوگ اپنے اوہام و ظنون سے اس کی تکذیب کر دیتے ہیں اور اپنے مزعومہ نظریات سے دست بردار نہیں ہوتے۔ والی اللہ المشتکی۔ اگر اس قسم کا مظاہرہ وہ لوگ کرتے جن کے مذہب کی اساس ہی قیاس پر قائم ہے تو کوئی جائے تعجب نہ تھی۔ افسوس تو اس امر کا ہے کہ آجکل جہالت و

لے۔ اصول الشریعہ کا مقدمہ ملاحظہ ہو (منہ عفی عنہ)

وعلينا ثم فوض الامر اليهما فخلقا ورزقا واحييا واماتا فقال كذب عدو الله اذا رجعت اليه فاقرء عليه الاية التى فى سورة الرعد

اس کے بعد تمام امور کی باگ ڈور ان کے حوالے کر دی اب یہی دونوں بزرگوار پیدا کرتے ہیں، یہی روزی دیتے ہیں، یہی زندہ کرتے ہیں اور یہی مارتے ہیں (یہ سن کر) امام نے فرمایا۔ دشمنِ خدا جھوٹ کہتا ہے جب تم اس کے پاس واپس جاؤ تو اس کے سامنے سورۂ رعد کی یہ آیت تلاوت کرنا۔

حماقت سے ایسی حرکات کا ارتکاب وہ لوگ بھی کر رہے ہیں جن کے مذہب کی بنیاد ہی حرمت رائے و قیاس پر قائم ہے اور جن کے دین کا سنگِ بنیاد قرآن اور سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کے فرمان پر رکھا گیا ہے اور ایمان کا دار و مدار تمام اقوال و افعال بلکہ تمام احوال میں اُن بزرگواروں کے اتباع کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔ من سرہ ان یستکمل الایمان فلیقل القول منی فی جمیع الاشیاء قول آلِ محمد علیہم السلام فیما اسروا وفیما اعلنوا وفیما بلغنی وفیما لم یبلغنی۔ جس شخص کو یہ امر پسند ہے کہ وہ کامل الایمان ہو جائے تو اسے چاہیئے کہ یوں کہے میرا قول تمام اشیاء میں وہی ہے جو آلِ محمد علیہم السلام کا قول ہے خواہ وہ قول ان امور کے متعلق ہو جن کو ان بزرگواروں نے پوشیدہ رکھا ہے اور خواہ ان کے متعلق ہو جن کو انہوں نے ظاہر فرمایا ہے اور خواہ ان امور کے بارہ میں ہو جو مجھے پہنچے ہیں یا ان کے بارہ میں ہو جو مجھ تک نہیں پہنچے (اصول کافی)

وہ کون سا عقیدہ ہے جو احادیثِ رسول و آل رسولؐ میں واضح نہیں کر دیا گیا اور وہ کون سا صحیح عقیدہ ہے جو کھول کر بیان نہیں کر دیا گیا؟ فقط صدق دل سے ان کی بارگاہ قدس کی طرف رجوع کرنا شرط ہے۔ چنانچہ ہمارے متعلقہ مسئلہ میں حجۃ اللہ علی العباد وبقیۃ اللہ فی البلاد ولی عصر حضرت امام زمانؑ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ نے صحیح شیعی عقیدہ کی بڑی عمدہ وضاحت و صراحت فرمائی ہے۔ احتجاج علامہ طبرسیؒ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ امام زمانہ کی غیبتِ صغریٰ میں جب کہ نواب اربعہ میں سے جناب ابو جعفرؒ آنجنابؑ کے نائب خاص تھے۔ شیعوں میں اختلاف ہو گیا کہ ان اللہ سبحانہ فوض الی اھل البیت امر الخلق والرزق ام لا؟ آیا خلاقِ عالم نے خلق و رزق کا معاملہ آئمہ اہل بیتؑ کے سپرد کیا ہے یا نہ؟ ان میں سے ایک عمر رسیدہ شخص نے کہا تم جناب ابو جعفر کی طرف کیوں رجوع نہیں کرتے تاکہ وہ حق و حقیقت کو تمہارے لئے واضح کریں کیوں کہ ان کی امام زمانہ تک رسائی ہے۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ سوال لکھ کر ان کے حوالہ کیا گیا اور جواب میں ناحیہ مقدسہ سے یہ توقیع مبارک صادر ہوئی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان اللہ خلق الاجسام وقسم الارزاق لانہ لیس بجسم ولا حال فی جسم لیس کمثلہ شئی وھو السمیع البصیر و اما الائمۃ فیسئلون اللہ فیخلق ویسئلونہ فیرزق ایجاباً لمسئلتھم و اعظاماً لحقھم۔ بسم اللہ!... خداوند عالم جسموں کا پیدا کرنے والا اور رزقوں کا

ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم قل اللہ خالق کل شیء وھو الواحد القھار فانصفقت الی الرجل فاخبرتہ بما قال الصادق

کیا انہوں نے خدا کے لیئے کچھ ایسے شریک بنا لئے ہیں جو خدا کی طرح خلق کرتے ہیں اس لئے ان پر خدا اور شرکاء کی مخلوق مشتبہ ہوگئی ہے (اے پیغمبرؐ) تم ان سے کہہ دو کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے جو یگانہ اور قہار ہے زرارہؒ بیان کرتے ہیں کہ جب میں اس آدمی کے پاس گیا اور اسے کلام امامؑ سے آگاہ کیا تو وہ اس طرح مبہوت ہوگیا کہ)

تقسیم کرنے والا ہے کیونکہ وہ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ کسی جسم میں حلول کرتا ہے کوئی شے اس کی مثل ومانند نہیں۔ وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ آئمہ اطہارؑ اس کی بارگاہ میں سوال کرتے ہیں۔ وہ پیدا کرتا ہے۔ یہ سوال کرتے ہیں تو وہ رزق دیتا ہے وہ ان کے سوال کو قبول کرتے ہوئے اور ان کی شان کو بڑھاتے ہوئے ان کے سوال کو مسترد نہیں فرماتا۔ حضرت امام زمانؑ کے اس توضیحی وتصریحی بیان حقیقت ترجمان سے واضح وعیاں ہوگیا کہ حضرات آئمہ طاہرینؑ کے متعلق یہ اعتقاد رکھنا کہ خلاق عالم نے امورِ تکوینیہ مثل خلق ورزق وغیرہ کی انجام دہی ان کے سپرد فرمائی ہے اور یہ ان کو انجام دیتے ہیں۔ یا خداوند عالم یہ امور ان کے ذریعے سے انجام دیتا ہے بالکل غلط اور باطل ہے اور ان ذوات مقدسہ کے حق میں افراط اور تجاوز عن الحد ہے اسی طرح یہ کہنا کہ ان حضرات کو امورِ تکوینیہ میں بالکل کوئی دخل نہیں۔ حتیٰ کہ وہ ان امور میں شفاعت وسفارش بھی نہیں کرتے۔ یہ تفریط ہے اور ان کی فضیلت کا انکار اور سابقاً بیان ہو چکا ہے کہ افراط ہو یا تفریط ہر دو مہلک ہیں۔ نجاح دارین وفلاح کونین میانہ روی ہی میں ہیں۔ اس درمیانہ راستہ کی امام عالی مقام نے اپنے بیان واجب الاذعان میں پوری وضاحت فرمادی ہے۔ کہ آئمہ اطہارؑ کی دنیوی امور میں وہی حیثیت ہے جو ایک شفیع ووسیلہ کی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بزرگوار بارگاہِ الٰہی میں سفارش کرتے ہیں اور خدائے عزوجل ان کی سفارش کو رد نہیں فرماتا ولکن ما یشفعون الا لمن ارتضیٰ۔ یہی آیت وسیلہ یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ" (پ س ع) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور بارگاہ الٰہی تک پہنچنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو) کا مفاد ہے کہ ہر چیز کا مرکز خداوند عالم ہے۔ ہاں البتہ وسیلہ وشفیع سرکار محمدؐ وآل محمدؑ علیہم السلام ہیں۔

بارگاہِ رب العزت سے حاجت طلب کرنے کا طریقہ

بنابریں بارگاہِ قاضی الحاجات میں مدعا عرض کرنے کے دو طریقے شرعاً جائز ہیں۔ ایک یہ ہے (اور یہی طریقہ اولیٰ واسلم ہے) کہ اولاد ورزق، صحت وعافیت اور طول عمر وغیرہ امور کا سوال براہِ راست بارگاہِ رب العزت میں کیا جائے۔ مگر جناب رسولؐ خدا اور دیگر آئمہ ہدیٰؑ

فکانما القمہ حجراً فقال وکانما خرس وقد فوض اللہ الی نبیہ امور دینہ فقال عزو جل وما اتیکم الرسول فخذوہ وما نھیکم عنہ

گویا کہ میں نے اس کے منہ میں پتھر ٹھونس دیا اور گویا وہ گونگا ہو گیا (کوئی جواب نہ دے سکا) ہاں البتہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنے شرعی امور اور دینی احکام کو اپنے نبی کے سپرد کیا ہے جیسا کہ وہ ارشاد فرماتا ہے "ہمارا رسول جو احکام تمہارے پاس لائے ان پر عمل کرو اور جن امور سے نہیں روکے ان سے باز رہو"

کا واسطہ دے کر مثلاً یوں کہا جائے اللھم بجاہ محمد وال محمد وسع علی رزقی۔ یا اعطنی ولداً صالحاً یا اشفنی وھکذا۔ یہ طریقہ انبیاء و مرسلین اور عباد اللہ الصالحین کا معمول ہے اور یہی اولیٰ و احسن ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خطاب جناب رسول خداؐ اور آئمہ ہدیٰ علیہم افضل التحیۃ والثناء کو کیا جائے۔ مگر یہ کہا جائے کہ میرے یہ مطالب و مقاصد بارگاہ ایزدی سے پورے کرا دو۔ یہ طریقہ بھی بعض ادعیہ و زیارات اور روایات سے مستفاد ہوتا ہے۔ مگر آئمہ طاہرینؑ کو مخاطب کر کے براہ راست یہ کہنا کہ مجھے اولاد و رزق عطا کرو۔ میرے مرض کو دور کرو وغیرہ وغیرہ کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے تفویض ممنوع کی بو آتی ہے۔ وقد اجازہ بعض العلماء اذا کان قصد الداعی التوسل والاستشفاع ولکن الاولیٰ ترکہ لانہ یشم منہ رائحۃ التفویض واللہ الھادی الی سواء السبیل۔

منشاء اشتباہ کی نشاندہی اور اس کا ازالہ؟

یہاں اس امر کا بیان کر دینا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے کہ اس عقیدہ تفویض کے اختیار کرنے کا سبب اور باعث کیا چیز بنی؟ حالات کا بنظر غائر جائزہ لینے سے اس اشتباہ عظیم کا منشاء آئمہ طاہرینؑ کے وہ کمالات و معجزات معلوم ہوتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ان حضرات سے مقام اعجاز میں ظہور پذیر ہوتے رہے کہ کبھی کسی مردہ کو زندہ کر دیا۔ کبھی کسی مریض کو صحت دے دی وغیرہ وغیرہ لہذا کوتاہ اندیش اور ظاہر بین لوگوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ ان امور کی انجام دہی ان کے سپرد ہے اور یہ بزرگوار ان امور کو بطور وظیفہ انجام دیتے رہتے ہیں۔

درحقیقت معجزہ فعل خدا ہے نہ فعل نبیؐ و امامؑ

مذکورہ بالا خیال بدو وجہ باطل اور محال ہے۔

وجہ اول:۔ اعجاز میں جو کچھ کسی نبی یا ولی سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وہ اس نبی یا ولی کا فعل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ "فعل اللہ" ہوتا ہے۔ چنانچہ معجزہ کی تعریف ہی یہ ہے ھی فعل اللہ یظھرہ اللہ علی ید نبیہ او لیہ اظہاراً لصداقتہ۔ معجزہ فعل خداوندی ہے

فانتهوا وقد فوض ذلك الى الائمة وعلامة للمفوضة والغلاة واصنافهم نسبتهم الى مشائخهم وعلمائهم الى القول	یہی دینی احکام پیغمبرؐ کے بعد آئمہ اطہارؑ کو سونپے گئے ہیں۔ غالیوں اور تفویض کے قائل لوگوں کی علامت یہ ہے کہ وہ علماء و مشائخ قم کی جانب تقصیر کی نسبت دیتے ہیں۔

جیسے وہ اپنے کسی نبی یا ولی کے ہاتھوں پر اس لئے ظاہر کرتا ہے کہ اس کی صداقت ظاہر ہو جائے۔ اسی لئے جناب امام رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔ لما ظهر من علیؑ الفقر والفاقة دل علی ان من هذه صفاته وشارکه فیها الضعفاء والمحتاجون لا تکون المعجزات فعله فعلم بهذا ان الذی اظهره من المعجزات فعل القادر الذی لا یشبه المخلوقین لا فعل المحدث المحتاج المشارك للضعفاء فی صفات الضعف ، جب حضرت علی علیہ السلام سے فقر و فاقہ ظاہر ہوا تو اس سے ظاہر ہوا کہ جس شخص کے یہ صفات ہوں اور ان صفات میں ضعیف و محتاج لوگ اس کے ساتھ شریک ہوں۔ یہ معجزات اس کا فعل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ جس نے یہ معجزات ظاہر کئے ہیں وہ قادر مختار ہے۔ جو کسی صفت میں مخلوق کے مشابہ نہیں ہے۔ یہ اس حادث و محتاج کا فعل نہیں ہے۔ جو صفات ضعف میں ضعفا کا شریک ہے:

(سابع بحار الانوار و احتجاج طبرسی) حضرت صادق آل محمد علیہم السلام فرماتے ہیں المعجزة علامة لله لا یعطیها الا انبیائه و رسله و حججه لیعرف به صدق الصادق من کذب الکاذب (علل الشرائع ج ۱ ص۱۱۳)۔

معجزہ خداوند عالم کی ایک خاص علامت ہے جو اپنے انبیاءؑ و اوصیاءؑ کو محض اس لئے عطا فرماتا ہے تاکہ اس کی وجہ سے صادق کا صدق اور کاذب کا کذب معلوم ہو جائے۔ اس مطلب کی تائید مزید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو کتاب انوارِ نعمانیہ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے دیکھا کہ حضرت امیرؑ جو کی خشک روٹی کو گھٹنے پر رکھ کر توڑ رہے ہیں۔ اس نے از راہِ تعجب عرض کیا۔ یا امیر المومنین! کیا یہ وہی کلائی نہیں ہے جس نے قلعۂ خیبر کو اکھاڑا تھا؟ آنجنابؑ نے فرمایا۔ قلعت باب خیبر بقوة ربانیة لا بقوة جسدانیة میں نے بابِ خیبر کو قوتِ ربانی سے اکھاڑا تھا نہ قوتِ جسمانی سے۔ انہی حقائق کی وجہ سے علماء محققین نے تصریحات فرمائی ہیں کہ معجزہ کا فاعلِ حقیقی خداوند عالم ہے۔ ہاں البتہ چونکہ اس کا ظہور نبی و امام کے ہاتھوں پر ہوتا ہے اس لئے مجازاً اسے نبی و امام کا فعل بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید کا نازل کرنے والا خدا ہے۔ مگر چونکہ نازل جناب رسولؐ خدا پر ہوا ہے۔ لہٰذا ان کا معجزہ سمجھا جاتا ہے۔

آتشِ نمرودی کو سرد خدا نے کیا تھا (قلنا یا نار کونی بردا) مگر چونکہ اس کا ظہور جنابِ خلیل خدا کے

التقصير وعلامة الحلاجية من الغلاة دعوى التجلي بالعبادة مع تدينهم بترك الصلوٰة وجميع الفرائض ودعوى المعرفة

اور غالیوں میں سے فرقۂ حلاجیہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ خداوند عالم عبادت کی وجہ سے بندوں میں ظہور کرتا ہے۔ بایں ہمہ نماز اور دیگر تمام واجبات شرعیہ کو ترک کرنا اس کا مذہب ہے ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ۔

ہاتھوں پر ہوا۔ اس لئے اسے ان کا معجزہ سمجھا جاتا ہے۔ ناقۂ صالح کو پتھر سے خدا نے پیدا کیا تھا مگر چونکہ بظاہر جناب صالح نے یہ معجزہ دکھایا تھا۔ لہٰذا اسے ان کا فعل سمجھا جاتا ہے۔ حضرت داؤد کے لئے لوہا نرم خدا نے کیا تھا۔ جبال وطیور کو مسخر خدا نے کیا تھا۔ چنانچہ خود خدا فرماتا ہے وکنا فاعلین۔ ہم ہی ان امور کے فاعل تھے۔ مگر چونکہ ان باتوں کا ظہور جناب داؤد کے ہاتھ پر ہوا۔ اس لئے ان کا معجزہ کہلایا۔ حضرت موسیٰ کے عصا کو سانپ خدا نے بنایا۔ اور پھر سانپ کو اپنی اصل شکل پر لانے والا بھی خدا ہی تھا (سنعیدها سیرتها الاولیٰ) مگر اسے معجزہ جناب موسیٰ کا قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس خارق عادت امر کا ظہور آنجناب کے ہاتھوں پر ہوا تھا۔ وعلی ہذا القیاس۔ بعد ازیں بھی اس حقیقت میں کوئی شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے کہ معجزہ کا فاعل حقیقی خدا ہے؟

——— سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں من زعم ان المعجزات والکرامات من فعل الانبیاء والاولیاء فلیس فی کفرہ شک جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ معجزات اور کرامات انبیاء اور اولیاء کا ذاتی فعل ہیں اس کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے۔ (علی ما نقلہ فی سبیل النجاۃ طبع ایران ص۱۳) پس جب اعجاز کی یہ حقیقت ہے تو اس پر دیگر عام حالات کا قیاس کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا! اسی طرح حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ اپنے رسالہ نکت اعتقادیہ میں فرماتے ہیں المعجز فعل اللہ کہ معجزہ فعل خدا ہوتا ہے۔ علامہ کراجکی کنز الفوائد میں لکھتے ہیں۔ والایات التی تظہر علی ایدیہم ہی فعل اللہ دونہم اکرمہم بہا ولا صنع لہم فیہا۔ وہ آیات ومعجزات جو آئمہ اطہار کے مقدس ہاتھوں پر ظاہر کر کے ان کی تکریم فرمائی ہے ان حضرات کو ان میں کوئی دخل نہیں ہے اور علامہ غفرانمآب فرماتے ہیں واللہ سبحانہ ھو المظہر تصدیقاً النبیؐ والوصی (عماد الاسلام) خداوند عالم نبی اور اس کے وصی کی صداقت ظاہر کرنے کے لئے معجزہ ظاہر کرتا ہے۔

وجہ دوم ثانیاً اس لئے کہ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ خلق ورزق وغیرہ امور آئمہ طاہرینؑ کے سپرد نہیں ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ حضرات (باقدار الٰہی) ان امور کو انجام نہیں دے سکتے۔ تاکہ ان کے معجزات پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی لاحاصل سعی کی جائے کہ وہ ان امور کو انجام دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ آئمہ اطہارؑ کی شان تو بہت ارفع واعلیٰ ہے ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جھجک محسوس نہیں کرتے کہ اگر قادر مطلق

يا سماء الله العظمى و دعوى انطباع الحق لهم فان الولى اذا خلص وعرف مذهبهم فهو عندهم افضل من الانبياء

خدا کے اسم اعظم کو جانتے ہیں اس فرقہ کے لوگوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ خدا نے ان میں حلول کیا ہوا ہے اور ان کا یہ زعم فاسد بھی ہے کہ جب کوئی شخص مخلص ہوا اور ان کے مذہب کی معرفت بھی پیدا کرے تو وہ ان لوگوں کے نزدیک انبیاء سے بھی افضل ہوتا ہے۔

چاہے تو اپنی قدرت کاملہ سے کسی معمولی سی مخلوق کے ذریعے سے بھی یہ کام کروا سکتا ہے! لیکن کلام اس میں ہے کہ کسی وقت بطور اعجاز کسی کام کا سرانجام دے دینا اور بات ہے اور کسی کام کو ڈیوٹی اور وظیفہ سمجھ کر ہمیشہ انجام دینا اور بات ہے؛ اس لئے ہم یہ تو کہتے ہیں کہ یہ بزرگوار مقام اعجاز میں وہ کام انجام دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں جو طاقت بشری سے مافوق ہیں۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان امور کی انجام دہی ان کا روزمرہ کا وظیفہ اور ان کی انجام دہی ان کا منصب ہے۔ وبینهما بون بعید فاین هذا من ذاک ع

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست   نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

چند شکوک و شبہات کا ازالہ

اگرچہ اس مقام پر غیر معمولی طوالت ہو رہی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ یہ بحث کسی طرح تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔ یہاں ان شکوک و شبہات کا ذکر اور پھر ان کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً غلو و تفویض نواز حضرات سے سننے میں آتے ہیں۔ یا ایسے لوگوں کی کتب میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں۔ یا جن کو اس مقام پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے بڑی تحقیق و جستجو سے ان کو یہاں یک جا جمع کر دیا ہے اور پھر ان کے تحقیقی جوابات بھی پیش کر دیئے ہیں تاکہ تصویر کے دونوں رخ سامنے آ جائیں لیهلک من هلک عن بینة ویحیی من حی عن بینة۔

پہلا شبہ

بظاہر سب سے قوی شبہ ان حضرات کا خطبۃ البیان ہے جو حضرت امیر علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا انا منشئ السحاب یعنی میں ہوں بادلوں کا پیدا کرنے والا انا مفجر العیون انا مجری الانهار یعنی میں ہوں چشمے نکالنے والا اور نہروں کا جاری کرنے والا انا مورق الاشجار میں ہوں درختوں کو پتے دینے والا اور ان کو سرسبز کرنے والا انا داحی الارضین انا سماک السموات میں ہوں زمینوں کا بچھانے والا اور آسمانوں کا بلند کرنے والا انا مخرج المؤمنین من القبور میں ہوں مومنوں کو ان کی قبروں سے نکالنے والا انا الذی بعثت النبیین والمرسلین میں ہوں نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کرنے والا انا فطرت العالمین میں ہوں جملہ عوالم کو پیدا کرنے والا انا مغنی الشیٔ

ومن علامتهم الغناد عوی علم الکیمیا ولا یعلمون منہ الا الدغل تقفیقول لتقبو والوصاص علی المسلمین اللھم لاتجعلنا منھم ولعنھم جمیعا

ان کے باطل دعووں میں سے ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ وہ علم کیمیا جانتے ہیں۔ حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے ان کا کام صرف دھوکہ دینا سونے اور چاندی کی شکل میں پیتل اور قلعی سے مسلمانوں کو فریب دیتے ہیں اے خدا! ہمیں ان لوگوں میں شامل نہ کر اور ان تمام پر لعنت کر۔

ومطلع الفجر ومنشئ النجوم ومنشئ الفلک فی البحر میں ہوں سورج کو روشن کرنے والا صبح کو نکالنے والا، ستاروں کو پیدا کرنے والا اور کشتیوں کو سمندروں میں چلانے والا انا الباری انا المصور فی الارحام میں ہوں پیدا کرنے والا میں ہوں رحموں میں بچوں کی تصویر کشی کرنے والا انا الذی کسوت العظام لحماً میں ہوں ہڈیوں پر گوشت کا لباس پہنانے والا انا احی وا میت انا اخلق وارزق انا السمیع العلیم انا البصیر۔ میں ہوں جلانے والا اور مارنے والا میں ہوں پیدا کرنے والا اور میں ہوں رزق دینے والا۔ میں سمیع و علیم اور بصیر ہوں انا الذی حملت نوحاً فی السفینۃ انا الذی انجیت ابراھیم۔ میں ہوں جناب نوحؑ کو کشتی میں سوار کرنے والا۔ اور جناب ابراہیمؑ کو آتش نمرود سے نجات دینے والا۔ الخ (از کوکب دری فی فضائل علیؑ) پس معلوم ہوا کہ کائنات عالم کا انتظام آنجنابؑ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے متعلق جواباً عرض ہے کہ اس خطبہ سے تمسک کرنا اور اس پر اعتقاد کی بنیاد قائم کرنا بچند وجہ غلط اور بے بنیاد ہے۔

خطبۃ البیان والے شبہ کا بچند وجہ جواب باصواب

وجہ اول:۔ یہ خطبہ قانون روایت و درایت کی رو سے محض غلط ہے اور آنجنابؑ کا ہرگز کلام نہیں ہے۔ عقائد و احادیث وغیرہ کی جس قدر ہماری معتبر مذہبی کتب ہیں ان میں اس خطبہ کا کہیں نام و نشان ہی نہیں پایا جاتا۔ بالخصوص آنجنابؑ کے خطبات کے مستند مجموعہ نہج البلاغۃ اور اس کے استدراک مستدرک نہج البلاغۃ میں بھی اس خطبہ کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں۔ ہاں البتہ یہ کوکب دری جیسی کتب میں موجود ہے جو ہر قسم کے رطب و یابس کا مجموعہ ہیں اور مؤلف کوکب دری نے بھی اسے کسی گمنام شخص مسمیٰ بہ خواجہ دیدار کے کسی رسالہ مجہولہ سے نقل کیا ہے (ظلمت بعضھا فوق بعض) اسی لئے علمائے محققین و فضلاء مدققین نے اس خطبہ اور اس کے ساتھ ملتے جلتے دیگر خطبات کو غیر مستند اور ناقابل استدلال قرار دیا ہے۔ چنانچہ غواص بحار الاخبار، ناشر علوم آئمہ اطہار سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ ہفتم بحار الانوار صفحہ ۳۶۵ میں خطبۃ البیان کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ خطبۃ البیان وامثالھا فلم توجد الا فی کتب الغلاۃ واشباھھم یعنی خطبۃ البیان اور اس کے مثل جو اور خطبے ہیں یہ سوائے غالیوں کی کتابوں کے اور کہیں نہیں پائے جاتے البتہ ہی

فیصلہ محقق خوئی نے منہاج البراعہ شرح نہج البلاغہ میں صادر فرمایا ہے۔ اسی طرح استاذ المجتہدین جناب ابوالقاسم معروف بہ محقق قمی صاحب قوانین الاصول نے اپنی کتاب جامع الشتات میں اس خطبہ کے متعلق لکھا ہے کہ نزد حقیر بصحت نرسیدہ کہ ایں کلام از جناب امیرالمومنینؑ باشد حقیر کے نزدیک اس خطبہ کا حضرت امیرالمومنینؑ کا کلام ہونا صحیح نہیں ہے۔

عالم ربانی الشیخ محمد علی اصفہانی اپنی کتاب تحفۃ الامامیہ فی حقیقۃ مذہب الشیعہ ج ا ص طبع بمبئی پر قمطراز ہیں۔ دقول بعضے آنکہ حضرت امیرالمومنینؑ خالق است واشیاء را او خلق نمودہ است غلط است وقول بایکہ ان حضرت عالم را باذن خدا خلق کردہ است غلط است وآیات واخبار بسیار برخلاف ایں اقوال است وآنچہ کہ نسبت می دہند بخطبۂ مولیٰ تتنجیان کہ فرمودہ است من خالق آسمان وزمینم ثابت نیست کہ ایں جزو خطبہ از آنحضرت باشد شاید دیگرے ملحق نمودہ باشد۔ خلاصہ یہ کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا حضرت امیرالمومنینؑ خالق ہیں اور انہوں نے باذن اللہ ہم کو پیدا کیا ہے۔ سراسر غلط ہے۔ اس کے رد میں بکثرت آیات و روایات موجود ہیں اور یہ جو آپؑ کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ آپ نے ایک خطبہ میں فرمایا ہے کہ میں زمین و آسمان کا خالق ہوں۔ اس کے متعلق یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ آپ کا کلام ہے شاید کسی اور نے اسے آپ کے خطبوں کے ساتھ ملحق کر دیا ہے۔

پس جس خطبہ کے غیر معتبر ہونے کی یہ کیفیت ہو۔ آیا کوئی عقل مند اور دیندار انسان اپنے عقائد کی دیوار کو اس پر استوار کر سکتا ہے؟ ہمیں رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے۔ مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی مرحوم پر جنہوں نے کوکب دری پر ۲۶ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ محض اس خطبہ کے فقرات کی تاویلات کے بارہ میں لکھ دیا مگر یہ خیال نہ فرمایا کہ وہ جس خطبہ کے فقروں کی تصحیح و تاویل کے لئے اس قدر سعی بلیغ کر رہے ہیں۔ آیا یہ حضرت امیر علیہ السلام کا خطبہ ہے بھی سہی؟ آیا اس کی کوئی ایسی سند موجود ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے؟ کیونکہ عقلائی ضرب المثل ہے وہ ثبت العرش ثم النقش، پہلے کوئی تختی ثابت کرو۔ پھر اس پر کچھ نقش و نگار کرو۔ ورنہ سر بے صاحب تراشیدن والی مثال صادق آئے گی۔ ہاں اگر بسند معتبر کتب معتبرہ میں یہ خطبہ آنجناب سے مروی ہوتا تو چونکہ اس کے ظاہری مطالب نصوص قرآنیہ کے مخالف تھے۔ ہر مومن ان کی تاویل کرنے پر مجبور ہوتا۔ اور ہم حضرت مولانا مرحوم کی سعی کو مشکور سمجھتے مگر جب خطبہ سرے سے ثابت ہی نہیں تو اس کے مندرجات کو صحیح ثابت کرنے میں زور بیان صرف کرنا چہ معنی دارد؟ ولکل وجھۃ ھو مولیھا۔

وجہ دوم

اگر قانون روایت کے اعتبار سے اس کے سلسلۂ اسناد سے قطع نظر بھی کر لی جائے اور از روئے قانون درایت اس خطبہ کے مندرجات و مطالب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو ایک ناظر خبیر اور ناقد بصیر انسان کو یقین کامل ہو جاتا ہے کہ یہ حضرت امیرالمومنینؑ کا کلام حقیقت ترجمان نہیں ہو سکتا۔

کیوں کہ یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں ہے کہ کوئی بھی بڑا شاعر ہو یا نثر نگار یا خطیب ایک مخصوص اندازِ تخیل و طریقِ نگارش اور اسلوبِ خطابت رکھتا ہے۔ جس کے ذریعہ اس کا کلام دیگر ہم صنفوں سے ممتاز و مشخص ہوتا ہے اس نہج پر بھی اگر اس خطبہ کا جائزہ لیا جائے تو جزم و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرت امیر علیہ السلام کا خطبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ آنجناب کے جو خطبات باسنادِ معتبر نہج البلاغہ وغیرہ کتبِ جلیلہ میں مذکور ہیں۔ یہ خطبہ اپنے اندازِ بیان میں ان خطبات میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی مشابہت و مناسبت نہیں رکھتا۔ آنجناب کے خطبات کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ شانِ توحید سے لبریز نظر آتے ہیں۔ انہی خطبات کو دیکھ کر بعض علمائے مصر بے ساختہ کہہ اٹھے تھے لولا خطبہ علیہ السلام لما عرف المسلمون التوحید اگر حضرت امیرؑ کے خطبات نہ ہوتے تو مسلمانوں کو توحید کی حقیقی معرفت حاصل ہی نہ ہوتی۔ مگر اس خطبہ میں اسی توحید پر ہی ہاتھ صاف کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں جس قدر اوصافِ جلیلہ خداوند عالم کے متعلق بیان کئے گئے ہیں وہ تمام اس خطبہ میں حضرت امیر المومنینؑ کی ذات والاصفات کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ اگر طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو یہاں وہ تمام آیات لکھ کر واضح کیا جاتا کہ یہ خطبہ کس طرح قرآن کے ساتھ متصادم ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ یہ امر عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے لہذا اس کے متعلق مزید توضیح کی ضرورت نہیں ہے۔ ناظرین کرام خدائے عزوجل کو حاضر ناظر سمجھ کر بتائیں کہ اگر یہ خطبہ صحیح ہو تو پھر حضرت امیر علیہ السلام کے خدا ہونے میں کوئی اشکال باقی رہ جاتا ہے؟ نا بریں نصیری اور علی اللہٰی فرقہ کو حق بجانب تسلیم نہیں کر لینا چاہیئے؟ کیا عقائد و اصول کے سلسلہ میں ایسے بے سروپا خطبات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ مالکم کیف تحکمون ۔ اللھم اھد قومی انھم لا یعلمون۔

وجہ سوم بالفرض محال اگر چند لمحات کے لئے اس خطبہ اور اس کے اشباہ و امثال خطبات کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس سے تفویضِ ممنوع ثابت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ لازماً اس کے الفاظ کی ایسی صحیح تاویل کی جائے گی جس کے بعد وہ دیگر نصوص قطعیہ شرعیہ کے ساتھ متصادم نہ ہو اور وہ تاویل یہ ہے کہ چونکہ یہ امر مسلم و مبرہن ہو چکا ہے کہ جناب رسول خدا اور آئمہ ہدیٰ علتِ غائی ممکنات ہیں۔ یعنی اگر یہ حضرات قدسی صفات پیدا نہ ہوتے تو کائنات عالم کی کوئی چیز نیستی سے نکل کر عرصۂ ہستی میں قدم نہ رکھتی۔ ارض و سما، جنت و نار انبیاء و اولیاء، غرضیکہ خداوند عالم نے ہر شے ان کے طفیل پیدا فرمائی ہے۔ لہذا یہ بزرگوار من باب المجاز یہ کہہ سکتے ہیں کہ گویا ہر شے ہم نے پیدا کی ہے گویا انبیاء ہم نے بھیجے ہیں۔ گویا بارش ہم برساتے ہیں اور گویا مارتے اور جلاتے ہم ہیں کیونکہ اگر ہم نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا اور خدا کچھ بھی پیدا نہ کرتا۔ چونکہ سب کچھ ہماری وجہ سے ہے اس لئے گویا یہ سب کچھ ہم کرتے ہیں لہذا اس سے تفویض ثابت نہیں ہوتی۔

وجہ چہارم قطع نظر نہج البلاغہ کے خطباتِ شریفہ کے خود حضرت امیر علیہ السلام کی بکثرت ایسی تصریحات موجود ہیں

جو اس خطبۃ البیان کی تردید کرتی ہیں۔ ہم یہاں بنظرِ اختصار آپ کے فقط ایک ارشاد واجب الاعتقاد کو پیش کرتے ہیں
جو کہ کتاب مستطاب عماد الاسلام ج ۱ ص ۱۸۱ طبع لکھنؤ میں موجود ہے قال امیر المومنین علیہ السلام ان معنی
اشھد ان لا الٰہ الا اللہ ان لا ھادی الا اللہ واشھد سکان السموٰت والارضین وما فیھن من
الملائکۃ والناس اجمعین وما فیھن من الجبال والاشجار والدواب والوحوش وکل رطب ویابس
بانی اشھد ان لا خالق الا اللہ ولا رازق ولا معبود ولا ضار ولا نافع ولا قابض ولا باسط ولا معطی
ولا مانع ولا دافع ولا ناصح ولا کافی ولا شافی ولا مقدم ولا مؤخر الا اللہ لہ الخلق والامر بیدہ الخیر تبارک
اللہ رب العالمین۔ فرمایا کلمۂ توحید اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کے معنی یہ ہیں کہ سوائے خدا کے کوئی ہادی نہیں
ہے۔ پھر فرمایا میں زمین و آسمان اور ان کے درمیان بسنے والی مخلوق از قسم ملائکہ، انسان، جن، وحوش اور طیور
وغیرہا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ سوائے خدا کے نہ کوئی خالق ہے نہ اس کے سوا کوئی رازق ہے نہ کوئی معبود ہے اور
نہ کوئی نفع و ضرر پہنچانے والا ہے اور نہ کوئی قبض و بسط کی قدرت رکھتا ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی عطا و منع کا مالک
ہے اور نہ اس کے سوا کوئی دافع و ناصح اور کافی و شافی ہے اور نہ مقدم و مؤخر کرنے والا ہے۔ وہی خالق و آمر
ہے۔ تمام خیرات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ بابرکت ہے وہ خدا جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے۔ اہل عقل و
انصاف بتائیں کہ جس بزرگوار کا یہ کلام معجز نظام ہو خطبۃ البیان جیسے خطبات کو کس طرح اس کا کلام تسلیم کیا جا سکتا
ہے؟ قل ھٰذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا۔

دوسرا شبہ

بعض کتب میں جمہور بن الحکم سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رأیت علی بن الحسین
وقد نبتت لہ اجنحۃ وریش فطار ثم قال رأیت الساعۃ جعفر بن ابی
طالب فی اعلی علیین قلت فھل تستطیع ان تصعدھا قال نحن صنعنھا فکیف نعجز ان نصعد الی
صنعتنا نحن حملۃ العرش والکرسی الخ۔ میں نے جناب امام زین العابدینؑ کو دیکھا کہ یکبارگی ان کو پر لگ گئے اور
اڑ گئے۔ کچھ دیر کے بعد واپس تشریف لائے اور فرمایا میں نے ابھی ابھی جناب جعفر بن ابی طالب کو اعلیٰ علیین میں دیکھا
ہے۔ میں نے عرض کیا آپ آسمانوں پر چڑھ سکتے ہیں؟ فرمایا ہم نے ہی تو ان کو بنایا ہے۔ پھر اپنی بنائی ہوئی چیز پر چڑھنے
سے کس طرح عاجز ہو سکتے ہیں؟ ہم ہی عرش و کرسی کے حامل ہیں!!

اس شبہ کا جواب

یہ ہے۔ کہ یہ روایت مجہولہ ہے۔ کیونکہ اس کا راوی جمہور بن حکم مجہول ہے۔ یہ بھی
معلوم نہیں کہ وہ مسلمان ہے یا منافق اور اگر مسلمان ہے تو مومن ہے یا غیر مومن اور
اگر مومن ہے تو پھر عادل ہے یا گنہگار؟ کیونکہ کتب رجال میں اس کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ ایسی
مجہول روایت فروع دین میں بھی ناقابل عمل ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ اصول اعتقادیہ میں اس پر اعتماد کیا جائے!! انصاف

شرط ہے کیا ایسی بے اصل و بے بنیاد اخبار احاد سے دین و اعتقاد ثابت ہو سکتا ہے؟ جو لوگ ایسی بے سر و پا روایات پر وثوق کرتے ہیں۔ اگر مقام حساب میں ان کو یہ خطاب ہوا (اور یقیناً ہوگا) کہ دین کے معاملہ میں تو صرف ان اشخاص کی روایات قابل قبول ہوتی تھیں جو عادل اور ثقہ ہوں۔ بتاؤ تم نے جمہور بن حکم کی وثاقت کہاں سے معلوم کی تھی؟ تو یہ حضرات کیا جواب دیں گے؟ قل فللہ الحجۃ البالغۃ۔ حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔ یاد رکھو دین و اعتقاد کے معاملہ میں ایسی بے اسناد بلکہ بالکل بے بنیاد اخبار احاد پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث کی معتبر کتب میں اس روایت کا کہیں نام و نشان بھی موجود نہیں ہے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

تیسرا شبہ

نہج البلاغہ حصہ سوم میں یہ فرمان وارد ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا نحن صنائع ربنا والناس بعد صنائع لنا یعنی ہم خدا کی مخلوق ہیں اور لوگ ہماری مخلوق ہیں۔ لہٰذا اس سے ثابت ہو گیا کہ کائنات حضرات محمدؐ و آل محمد علیہم السلام نے پیدا کی ہے۔

اس شبہ کا جواب

یہ ہے کہ یہ ترجمہ سراسر غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ترجمہ ہی غلط ہے تو نتیجہ بھی لامحالہ غلط ہی ہوگا۔ کیونکہ ؎ خشت اول چوں نہد معمار کج :: تا ثریا می رود دیوار کج

اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "ہماری خلقت محض خدا وند عالم کے لئے ہے اور لوگوں کی خلقت ہماری وجہ سے ہے" اس سے آنجناب کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ مقصود بالذات اور علت غائی ممکنات ہم ہیں اگر خدا ہمیں پیدا نہ کرتا تو کائنات عالم کی کوئی چیز وجود میں نہ آتی۔ جیسا کہ مشہور حدیث قدسی لولاک لما خلقت الافلاک اس پر دلالت کرتی ہے اور یہ مطلب بالکل حق و حقیقت پر مبنی ہے اور ہم سابقہ فصول میں اس پر مفصل تبصرہ کر چکے ہیں۔ قرآن میں وارد ہے یا موسیٰ انی اصطفیتک لنفسی۔ اے موسیٰ میں نے تمہیں خاص اپنے لئے پیدا کیا ہے۔ یعنی تیرا وجود بالذات مقصود ہے اور تیری امت کا وجود بالتبع۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے فقرہ کا عنوان بدلا ہوا ہے والناس بعد صنائع لنا نہیں بلکہ والناس بعد صنائع لنا۔ یہ "لنا" میں جو "لام" موجود ہے اسے لام اجلیہ و سببیہ کہا جاتا ہے۔ جس کا وہی مطلب بنتا ہے جو اوپر لکھ دیا گیا ہے کہ الناس صنائع لاجلنا لوگ ہماری وجہ سے پیدا کئے گئے ہیں یعنی لوگوں کا پیدا کرنے والا بہرحال خلاق عالم ہی ہے۔ ہاں ان کی خلقت ہماری وجہ سے ہے لولا ھم لما خلق اللہ آدم ولا حوا ولا الجنۃ ولا النار ولا السماء ولا الارض ولا شیئاً مما خلق اگر سرکار محمدؐ و آل محمد علیہ و علیہم السلام نہ ہوتے تو خداوند عالم نہ آدم و حوا کو پیدا نہ کرتا جنت و دوزخ کو نہ ارض و سما کو اور نہ کسی اور چیز کو (سابع بحار الانوار و بصائر الدرجات وغیرہ)

اس مفہوم کی تائید مزید اس طویل حدیث کے بعض فقروں سے بھی ہوتی ہے جو خود حضرت امیر المومنینؑ کی طرف منسوب ہے۔ اس میں آپ فرماتے ہیں۔ و لاجلنا خلق اللہ عزوجل السماء و الارض و العرش و الکرسی والجنۃ والنار۔ ہماری وجہ سے خدا نے آسمان و زمین، عرش و کرسی، اور جنت و جہنم کو پیدا کیا ہے (مجمع النورین ص ۲۲۰

طبع ایران) صاحب بشارۃ الزائرین نے غلو و تفویض کی رد کرتے ہوئے حدیث خلق الاشیاء بالمشیۃ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ والباء فی حدیث خلق الاشیاء بالمشیۃ للسببیۃ والتعلیل لا للاستعانۃ کاللام فی قولہ علیہ السلام والخلق بعد صنائع لنا ای لاجلنا فلا اشعار فیہما بالتفویض والا کان المناسب فی الاخوان یقول والخلق صنائعنا من غیر حاجۃ الی ذکر اللام کما فی الفقرۃ الاولی فمفاد الروایتین علی حد غیرہما من المستفیض جداً ان محمداً و اہلبیتہ صلی اللہ علیہ وعلیہم وسلم العلۃ الغائیۃ فی ایجاد العالم باسرہ من الملائکۃ الی الذرۃ وببرکتہم تنزل البرکات وتدرک الفیوضات کما فی المستفیض من الاحادیث

عنہ ولولاہم لم تخلق الارض والسماء ۔۔ ولا کان دیار ولا ذر شارق

یعنی اس حدیث مبارک میں با تسبیبت و تعلیل کے لئے ہے (کہ خدا نے مشیت کی وجہ سے اشیاء کو پیدا کیا) استعانت کے لئے نہیں (کہ مشیت کے ذریعہ سے پیدا کیا) جیسا کہ جناب امیر کے فرمان والناس بعد صنائع لنا میں لام سببیت کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے لوگوں کو ہماری وجہ سے پیدا کیا ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں تفویض (ممنوع) کی طرف کوئی اشارہ تک موجود نہیں ہے ورنہ دوسرے فقرہ میں لام ، نہ ہوتی بلکہ پہلے فقرہ کی طرح ، و صنائعنا ، ہوتا۔ پس ان دونوں روایتوں کا ماحصل و مفاد دوسری روایات کی طرح یہی ہے کہ یہ بزرگوار خلقت کائنات کی علت غائی ہیں انہی کی وجہ سے فیوض و برکات کا نزول ہوتا ہے۔ مفتی محمد عبدہ مصری نے اس عبارت کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ہم خدا کے اسیر احسان و مرہون منت ہیں۔ اور لوگ ہمارے اسیر احسان اور مرہون منت ہیں اس معنی کی بنا پر بھی اسے تفویض کے ساتھ کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔

چوتھا شبہ

بعض کتب میں ایک روایت جناب مقداد بن اسودؓ کی طرف منسوب ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں قال لی مولائی یوما ابتنی بسیفی فوضعہ علی رکبتہ ثم ارتفع الی السماء و انا انظر الیہ حتی غاب عن عینی فلما قرب الظہر نزل و سیفہ یقطر دماً فقلت یا مولائی این کنت فقال ان نفوسا فی الملاء الاعلی اختصمت فصعدت فطہرتہا فقلت یا مولائی امر الملاء الاعلی الیک فقال یا بن الاسود انا حجۃ اللہ علی الخلق من سمٰوتہ و ارضہ وما فی اسمائہ ملک یخطو قدما علی قدم الا باذنی ۔ یعنی ایک دن میرے آقا حضرت علیؑ نے مجھ سے فرمایا میری تلوار لاؤ۔ میں نے تلوار پیش کی۔ آپ نے اسے گھٹنوں پر رکھا اور آسمان کی طرف بلند ہونا شروع کیا میں دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ آنجنابؑ میری آنکھوں سے غائب ہو گئے۔ جب ظہر کا وقت قریب آیا تو اس وقت اترے درانحالیکہ آپ کی تلوار سے خون ٹپک رہا تھا۔ میں نے عرض کیا میرے آقا آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟ فرمایا ملاء اعلیٰ میں کچھ نفوس کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے جا کر ان کا فیصلہ کیا۔ میں نے عرض کیا میرے آقا! کیا آسمانوں کا معاملہ آپ

کے سپرد ہے؟ فرمایا اے فرزند اسود! میں اللہ کے آسمانوں اور زمینوں میں اس کی حجت ہوں۔ آسمان میں کوئی فرشتہ میرے اذن کے بغیر ایک جگہ سے قدم اٹھا کر دوسری جگہ رکھ نہیں سکتا۔ پس اس روایت سے بھی ثابت ہوتا کہ عالم کا نظم ونسق سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کے سپرد ہے۔

اس شبہ کا پہلا جواب

یہ روایت بچند وجہ ناقابلِ تمسک واستدلال ہے۔ اوّلاً۔ اس روایت کا سلسلہ سند مذکور نہیں تاکہ معلوم ہو کہ اس کے درمیان والے راوی کیسے ہیں۔ فقط ایک جلیل القدر صحابی کا نام لینے سے تو روایت کی صحت ثابت نہیں ہو جاتی جب تک درمیانی وسائط کی وثاقت وجلالت کا علم نہ ہو نیز حدیث کی جس قدر مستند ومعتبر کتابیں ہیں ان میں اس روایت کا کوئی نام ونشان تک مذکور نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت بالکل غیر معتبر اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ ورنہ علماء اعلام ومحدثین کرام اس سے اعراض وروگردانی نہ فرماتے۔

دوسرا جواب

ثانیاً۔ قطع نظر اصولِ روایت کے اگر اصولِ درایت کے اعتبار سے اس روایت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل جعلی و وضعی ہے کیونکہ اس کے موضوع ہونے کے قرائن ودلائل خود اس کے اندر موجود ہیں (الف) یہ روایت عصمت ملائکہ کے منافی ہے جن کی عصمت قرآن وحدیث اور اجماع مسلمین سے ثابت ہے ان میں جھگڑا اور فساد کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور جھگڑا بھی ایسا جو بعض کے قتل تک منتج ہو؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ان ہذا الا بہتان عظیم ملائکہ کے متعلق تو ارشاد قدرت ہے عباد مکرمون لا یعصون اللہ ما امرھم وھم بامرہ یعملون (ب) یہ امر مسلمات مسلمین میں سے ہے کہ ملائکہ کی خلقت نور سے ہوئی ہے جیسا کہ بعض سابقہ ابواب میں حقیقت ملائکہ کے ضمن میں اس امر پر مفصل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ان میں خون کا پایا جانا کس طرح متصور ہو سکتا ہے؟ ایسے لوگوں کی حالت بڑی قابلِ رحم ہے جو ایسی مہمل ومزخرف روایات کو بلا تامل قبول کر لیتے ہیں بقول

بدیں عقل و دانش بباید گریست

(ج) اس روایت میں وارد ہے کہ کوئی فرشتہ بغیر حضرت امیر علیہ السلام کے اذن کے اپنی جگہ سے قدم نہیں اٹھا سکتا یعنی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ یہ مطلب مسلمات قرآن وحدیث کے مخالف ہے۔ قرآن مجید میں خود ملائکہ کا یہ قول موجود ہے وما نتنزل الا بامر ربک لہ ما بین ایدینا وما خلفنا وما بین ذلک۔ اے رسول! ہم نہیں اترتے مگر تیرے پروردگار کے حکم سے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہمارا سب بست وکشاد ہے۔ اس آیت کا شانِ نزول مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسولِ خدا نے جناب جبرئیلؑ سے فرمایا آپ جس قدر ہمارے پاس آتے ہیں اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟ جبرئیل امین نے عرض کیا ہمارا آنا یا نہ آنا خداوند عالم کے حکم کے تابع ہے (تفسیر مجمع البیان ج ۲ وتفسیر صافی ص ۳ وتفسیر لوامع التنزیل ج ۱۶ ص ۲۵ وغیرہ) اسی طرح سورۃ القدر میں وارد ہے۔ "تنزل الملائکۃ والروح

کہ ملائکہ کی حرکت اور ان کا سکون اذنِ خداوندی کے تابع ہے اور اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حرکت اور ان کا سکون حضرت امیرؑ کے تابع ہے۔ اب اہل ایمان کو اختیار ہے۔ خواہ قرآن کی بات تسلیم کریں اور خواہ اس بے بنیاد روایت پر اعتماد کریں؟

تیسرا جواب

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی صحیفۂ کاملہ میں جو دعا ملائکہ پر صلوات کے سلسلہ میں موجود ہے اس میں آپ فرماتے ہیں ومن اوھمنا ذکرہ ولم نعلم مکانہ من دبائق امور وکلتہ بارالہا! ان ملائکہ پر درود بھیج جن کا ذکر ہم نے نہیں کیا اور نہ ہی ان کے متعلق ہمیں علم ہے کہ تیرے نزدیک ان کا مرتبہ کیا ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ تو نے ان کو کس امر پر مؤکل کیا ہے؟ یہ اس صحیفۂ سجادیہ کے کلمات ہیں۔ جس کے کلامِ امام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ امام تو یہ فرماتے ہیں کہ کچھ ملائکہ ایسے بھی ہیں کہ ہمیں ان کے مکان و مرتبہ اور کام کا بھی علم نہیں۔ علامہ سید علی خان نے ریاض السالکین میں اس فقرہ کی شرح میں لکھا ہے۔ فیہ دلالۃ علی انہ لا یعلم اصناف الملائکۃ غیر خالقھا کما قال تعالی وما یعلم جنود ربک الا ھو... الخ یعنی اس فقرہ میں اس مطلب پر دلالت ہے کہ تمام ملائکہ کے اصناف و اقسام کو سوائے ان کے خالق کے اور کوئی نہیں جانتا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے کہ اے رسول! تیرے پروردگار کے لشکروں کو سوائے اس کے اور کوئی نہیں جانتا۔

مگر تفویض نواز یہ کہہ رہے ہیں کہ کوئی فرشتہ بغیر اذنِ امام قدم نہیں اٹھا سکتا؟ ان ہذا الا اختلاق۔

پانچواں شبہ

جناب قنبرؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ جناب امیرؑ کے دولت کدہ پر گیا جناب فضہؑ سے دریافت کیا کہ حضرت علیؑ کہاں ہیں؟ جناب فضہ نے بتایا برج میں تشریف لے گئے ہیں تو کہا وہ برج میں کیا کرتے ہیں؟ فضہ نے جواب دیا وہ وہاں جاکر رزق تقسیم کرتے ہیں، عمریں مقدر کرتے ہیں۔ مخلوق کو پیدا کرتے ہیں۔ مارتے اور جلاتے ہیں اور عزت و ذلت تقسیم کرتے ہیں! قنبر نے کہا بخدا میں اپنے آقا کو اس کا فرہ کی گفتگو کی ضرور اطلاع دوں گا۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت امیرؑ نمودار ہو گئے اور فرمایا اے قنبر! تمہارے اور فضہ کے درمیان کیا بات چیت ہو رہی تھی؟ قنبر نے تمام واقعہ عرض کیا۔ آنجناب نے سن کر فرمایا مگر تم اس کے منکر ہو؟ قنبر نے عرض کیا ہاں! اس وقت آنجناب نے کچھ پڑھا اور ہاتھ مبارک قنبر کی آنکھوں پر پھیرا۔ قنبر کہتے ہیں کہ میں نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو آنجناب کے سامنے ایسے دیکھا جیسے کسی کے سامنے بادام پڑا ہوا ہو۔ نیز اور بہت سی مخلوق کو دیکھا اس وقت حضرت علیؑ نے فرمایا اے قنبر! نحن خلقنا ھما وخلقنا ما فیھما وما بینھما وما تحتھما۔ ہم نے ہی زمین و آسمان اور ان کے اندر رہنے والی اور ان کے درمیان والی اور ان کے نیچے بسنے والی مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ پھر حضرت نے دوبارہ ہاتھ پھیرا اور یہ سب کچھ آنکھوں سے غائب ہو گیا۔

اس شبہ کا پہلا جواب

یہ ہے کہ یہ روایت بدو وجہ ناقابلِ استدلال واستناد ہے۔ اولاً یہ روایت مرسل اور مقطوع السند ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حدیث بالاخص اصول عقائد میں ناقابلِ التفات وتوجہ ہوتی ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کا کتب معتبرہ میں کوئی نام ونشان نہ ہو اور نہ کوئی روایت معتبرہ اس کی مؤید ہو۔

دوسرا جواب

ثانیاً۔ قطع نظر سلسلۂ سند سے از روئے قانون درایت یہ روایت مثل سابقہ روایت کے بالکل وضعی وجعلی ہے اور اس کے وضعی ہونے کے دلائل وہی ہیں جو خطبۃ البیان کے وضعی ہونے کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس کے مندرجات نصوص قرآنیہ کے مناقض ومخالف ہیں۔ اور آئمہ طاہرینؑ کا حکم ہے کل حدیث لم یوافق الکتاب فہو زخرف (اصول کافی) ”جو روایت قرآن کے مخالف ہو وہ باطل ہے۔“ قرآن تو یہ کہتا ہے ان اللہ خلق السموات والارض وما بینہما وما تحت الثریٰ ”خداوند عالم نے زمین وآسمان اور ان کے درمیان اور تحت الثریٰ والی مخلوق کو پیدا کیا ہے۔“ اور یہ روایت کہتی ہے کہ ان تمام امور کو حضرت علیؑ نے پیدا کیا اب مومنین کو اختیار ہے کہ خواہ قرآن کو معتبر سمجھیں اور اس کے ارشاد کو تسلیم کریں یا اس کے بالمقابل اس بے سروپا روایت کو معتبر سمجھ کر اس کے مندرجات پر ایمان لائیں۔ یہ روایت ان روایاتِ کثیرہ ومعتبرہ کے خلاف ہے جن میں ان امور کی آئمہ علیہم السلام سے نفی کی گئی ہے۔ لہٰذا عندالاختلاف ترجیح انہی روایات کو دی جائے گی جو تعداد میں زیادہ اور سند کے اعتبار سے صحیح ہیں۔ کما لا یخفیٰ علی اولی الالباب

تیسرا جواب

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ مسئلہ اصول واعتقادات سے تعلق رکھتا ہے اور ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ عقائد کے سلسلہ میں آیات محکمات کارآمد ہوتی ہیں یا روایات متواترات جو موجب علم ویقین ہوتی ہیں اس قسم کی اخبار آحاد اور وہ بھی ایسی بے سروپا جو قانون روایت ودرایت کے لحاظ سے بالکل بے بنیاد ہوں یہاں کام نہیں آسکتیں ان فی ذالک لآیات لقوم یعقلون۔

چھٹا شبہ

قرآن میں وارد ہے وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ ”اے رسول! وہ کنکریاں جو تم نے پھینکی تھیں وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ خدا نے پھینکی تھیں۔“ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا فعل اللہ کا فعل ہے لہٰذا وہ جو کام کرتے ہیں اللہ سبحانہٗ فرماتا ہے وہ کام میں کرتا ہوں پس اس سے تفویض ثابت ہے۔

اس شبہ کا پہلا جواب

اس آیت مبارکہ سے اس مقصد کے لئے استدلال کرنا بدو وجہ باطل ہے۔ اولاً اس لئے کہ اگر اس فقرہ سے تفویض ثابت ہوتی ہے تو پھر یہ تفویض ان تمام لوگوں کے حق میں ثابت ہے جو اس جنگ میں آنحضرت کے ہمراہ شریک تھے کیونکہ ان کے متعلق ارشادِ قدرت ہے

فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم تم نے کفار کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ اللہ سبحانہ نے ان کو قتل کیا تھا" دونوں جملے ایک جیسے ہیں۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

دوسرا جواب

ثانیاً اس لئے کہ یہ آیت مقام اعجاز کے متعلق ہے۔ چونکہ واقعہ یہ ہوا تھا کہ آنحضرتؐ نے ایک مٹھی کنکریوں کی کفار کی طرف پھینکی تھی اور وہ کنکریاں تمام کفار کے چہروں پر لگیں، جن سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ خدائے عزّ وجل اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اے رسول کنکریاں پھینکی تو تم نے ہی تھیں لیکن ان کا تمام کفار کے چہروں تک پہنچانا یہ فوق طاقتِ بشری فعل میں نے انجام دیا تھا جناب محدث محسن فیض کاشانی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے " اثبت الرسول اللہ لانہ دجل منہ صورۃ ونفاہ عنہ معنی لان اثرہ الذی لایدخل فی قدرۃ البشر فعل اللہ سبحانہ فکانہ فاعل الرمیۃ علی الحقیقۃ وکانہا لم توجد من الرسول الخ (تفسیر صافی صہ ۱۹۴ طبع ایران) خدانے تیر مارنے کا اپنے رسولؐ کے لئے اس لئے اثبات کیا ہے کہ صورتِ رمی آنحضرتؐ سے صادر ہوئی تھی اور نفی اس لئے فرمائی کہ اس کا وہ اثر جو طاقتِ بشری سے خارج ہے خدانے پیدا کیا تھا۔ لہٰذا گویا کہ درحقیقت کنکری خدا نے ہی ماری تھا نہ رسولؐ نے"۔ اسی طرح دوسرے صحابہ کو خطاب ہے کہ تم یہ فخر ومباہات نہ کرو کہ کفار کو تم نے قتل کیا یہ ٹھیک ہے کہ تم شمشیر بکف تھے مگر کفار کو مرعوب کرنا تمہارے دلوں کو قوی کرنا اور ملائکہ کو تمہاری نصرت کے لئے اتارنا یہ سب کچھ میرا فعل تھا۔ اس لئے درحقیقت کفار کو میں نے قتل کیا (ملاحظہ ہو تفسیر صافی صہ ۱۹۴ و تفسیر برہان ج ۲ صہ ۷) یہ ارشادِ قدرت ایسا ہی ہے جیسے سورہ واقعہ میں مذکور ہے " انتم تزرعونہ ام نحن الزارعون" تم زراعت نہیں کرتے بلکہ ہم زراعت کرتے ہیں؟ بنابریں واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیتِ مبارکہ کو تفویض کے ساتھ کوئی ربط وتعلق ہی نہیں ہے۔ فقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنٰہ ھباءً منثوراً۔

ساتواں شبہ اور اس کے جوابات

ارشادِ قدرت ہے فتبارک اللہ احسن الخالقین بابرکت ہے وہ خدا جو پیدا کرنے والوں میں سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔ اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علاوہ کچھ اور خالق بھی ہیں۔ پس اس آیت سے بھی تفویض ثابت ہوتی ہے۔

پہلا جواب

اس آیتِ مبارکہ سے تفویض کے اثبات پر تمسک کرنا تین وجوہ سے غلط ہے اوّلاً۔ یہ آیت اسلوب عرب کے مطابق ہے اہل عربیت کا دستور ہے کہ جب کسی شخص کا کسی صنعت وحرفت میں کمال ظاہر کرنا مقصود ہو تو اس صنعت کے ماہروں کو بطور صیغہ جمع لا کر اس مخصوص شخص کے ساتھ لفظ احسن یا خیر، لگا کر اسے سب پر فوقیت دے دیتے ہیں جیسے احسن الناجرین۔ احسن النجارین۔ احسن الحدادین خیرا لخبازین خیرالقابلین وغیرہا۔ اگرچہ اس صنعت کے ماہروں کا خارج میں بالفرض وجود ہی نہ ہو اس سے

یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے صنعت کار صرف در موجود ہوں۔ یہی حال احسن الخالقین کا ہے۔

دوسرا جواب

ثانیاً "خلق" بمعنی "صنع" بھی استعمال ہوتا ہے (قاموس ج ۳ ص ۲۲۸ طبع مصر) بنا بریں ممکن ہے۔ مفہوم آیت (واللہ اعلم) یہ ہو۔ واللہ احسن الصانعین۔ یعنی اگرچہ صانع (بنانے والے) بہت ہیں کوئی حداد ہے کوئی نجار ہے کوئی دباغ وصباغ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض اپنی اپنی صنعت میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ مگر خلاق عالم ان سب صانعین میں سے بہترین صانع ہے بلکہ ان کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ چہ نسبت خاک را بعالم پاک! ومن احسن من اللہ صبغۃ۔ بنا بریں اس آیت کو اہل بیت علیہم السلام کے خالق ہونے کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں رہتا۔ کما لا یخفیٰ!

تیسرا جواب

ثالثاً۔ لغت عرب میں "خلق" بمعنی تقدیر (اندازہ لگانا) بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ المنجد ص ۱۹۳ اور قاموس ج ۳ ص ۲۲۸ وغیرہ میں مذکور ہے۔ لہٰذا بنا بریں اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام اندازہ لگانے والوں اور منصوبہ بندی کرنے والوں سے خداوند عالم بہترین اندازہ لگانے والا اور منصوبہ بندی کرنے والا ہے۔ لہٰذا اس کا تفویض کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

چوتھا جواب

رابعاً۔ اس آیت کے ذیل میں تفسیر صافی وغیرہ میں ایک روایت موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مخلوقین پر بھی من باب المجاز خالق کا اطلاق کیا گیا ہے۔ ان کی تعداد چار تک شمار کی گئی ہے ایک حضرت عیسیٰ دوسرے اور تیسرے وہ فرشتے جو باذن خدا بطن مادر میں بچہ کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ چوتھا سامری جس نے گوسالہ بنایا تھا۔ بنا بریں آیت اپنے ظاہری معنی پر رہے گی۔ لیکن پھر بھی اس سے آئمہ طاہرین کا خالق عالم ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے اس امر کی نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ بزرگوار بھی باذن خالق کردگار کہیں خالق ہوتے تو جہاں ان مذکورہ بالا چار افراد پر خالق کا اطلاق کیا تھا وہاں یہ بھی مذکور ہوتا کہ ہم آئمہ اہل بیت بھی خالق ہیں لیکن جب یہ وارد نہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالق نہیں ہیں۔ اب محض قیاس آرائی سے کام نہیں لیا جا سکتا کہ جب فلاں وفلاں پر خالق کا اطلاق ہوا ہے تو آئمہ اطہار پر کیوں نہیں ہو سکتا؟ فان اول من قاس ابلیس لعنہ۔ علاوہ بریں یہ روایت بھی محل نظر ہے ولا تدع من دون اللہ ما لا ینفعک ولا یضرک فان فعلت فانک اذاً من الظالمین۔

آٹھواں شبہ

متعدد آیات وروایات میں وارد ہے کہ خلاق عالم نے خلق ورزق اور اماتت واحیاء غرضیکہ نظام عالم کے مختلف کاموں کی انجام دہی پر مختلف ملائکہ موکل کر رکھے ہیں اور مذہب حق کا عقیدہ ہے کہ ملائکہ آئمہ طاہرین کے خادم ہیں۔ پس جب خادم ان امور کو انجام دے سکتے ہیں تو ان کے مخدوم ان امور کو انجام کیوں نہیں دے سکتے؟ بلکہ ممکن ہے کہ مدبرات الامر ملائکہ ہوں ان کے اوپر حاکم اعلیٰ اولی الامر

یعنی آئمہ اطہار ہوں اور اولی الامر کے اوپر خداوند عالم حاکم اعلیٰ ہو۔ جیسا کہ دنیوی نظام میں بادشاہ اور وزیر اور دیگر عمال کی مثال سے یہ مطلب اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ایسا اعتقاد رکھنے میں کونسی خرابی لازم آتی ہے؟ اس شبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ کی بارگاہِ قدرت میں وہی حیثیت ہے جو ایک وزیر با تدبیر کی کسی شہنشاہ کی بارگاہ میں ہوتی ہے۔

یہ شبہ بچند وجہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہے

چونکہ زیرِ بحث مسئلہ اصول وعقائد سے تعلق رکھتا ہے اس کے اثبات کے لئے دلیل قطعی درکار ہے۔ ظاہر ہے کہ امور اعتقادیہ میں بلکہ تمام دینی اور دنیوی معاملات میں فقط امکان عقل کہ ایسا یا ویسا ہونا ممکن ہے اور اس سے کوئی امر محال لازم نہیں آتا۔ کسی امر کے ثبوت کے لئے ہرگز کافی نہیں ہوتا۔ عقلاً بہت سی باتیں ممکن ہیں۔ مگر ان کا نہ اعتقاد رکھنا جائز ہے اور نہ ہی عملاً اس کے مطابق عمل جائز ہے مثلاً کون سا محال لازم آتا ہے اگر سید البشر اور ان کی عترتِ طاہرہ کو سجدہ روا رکھا جائے بلکہ ان ذواتِ قدسیہ کی عبادت کی جائے۔ مگر شریعت مقدسہ کے قواعد کی رو سے غیر اللہ کو نہ سجدہ جائز ہے اور نہ اس کی عبادت روا۔ یہی کیفیت متعلقہ مسئلہ کی ہے۔ آیات کثیرہ اور روایات وغیرہ اس عقیدہ کی رد میں وارد ہوئی ہیں۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اگر بالفرض اس عقیدہ باطلہ کی نفی پر کوئی نص نہ بھی موجود ہوتی تو اس سے اس پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا کیونکہ نفی محتاج دلیل نہیں ہوتی۔ البتہ کسی امر کا اثبات خصوصاً جب کہ وہ امر امور اعتقادیہ سے متعلق ہو دلیل قطعی شرعی کا محتاج ہوتا ہے۔ واذ لیس فلیس۔

دوسری وجہ

یہ جو کہا گیا ہے کہ اس اعتقاد رکھنے میں کونسی خرابی لازم آتی ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تقریر سراپا تعزیر عوام الناس کو متاثر کرنے اور ان کے صحیح عقیدہ پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے بے حد موثر ہے۔ مگر اربابِ عقل سمجھتے ہیں کہ یہ تقریر حقیقت سے بالکل خالی ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ اعتقاد رکھنے سے کونسی خرابی لازم آتی ہے؟ اس خرابی سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اس سے کونسا نظامِ عالم بگڑتا ہے؟ تو نظامِ عالم میں تو اس لئے خرابی لازم نہیں آسکتی کہ اس کا ناظم و مدبر خلاق عالم ہے۔ ھو حی لا یموت اور اگر اس سے دینی خرابی مراد ہے تو وہ موجود ہے کیونکہ یہ عقیدہ خدا و رسولؐ اور آئمہ طاہرینؑ پر افتراء ہے اور ان کے نصوص صریحہ وصحیحہ کے مخالف ہے۔ وانما یفتری الکذب الذین لا یؤمنون جس کی وجہ سے نعمتِ ایمان سلب ہو جاتی ہے اعاذنا اللہ منہ۔

تیسری وجہ

نظام ربوبی کو دنیوی بادشاہوں کے نظام پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے باوجودیکہ اصل قیاس ہمارے اصول مذہبی کے اعتبار سے باطل وعاطل ہے رسولؐ وآل رسولؐ کا اصل وظیفہ نظام شرعی کا قیام اور انفاذ حدود اور اجراء احکام ہے نہ نظام دنیوی کا چلانا۔ ہاں ان امور میں وہ شفاعت

وسفارش فرماتے ہیں اور خدائے ذوالمنن ان کی سفارش کو مسترد نہیں فرماتا۔ جیسا کہ اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ خدا کا نہ کوئی وزیر ہے اور نہ کوئی مشیر اس کی ذات اس سے اجل وارفع ہے وہ غنی بالذات ہے حضرت امیر علیہ السلام دعائے یستشیر میں فرماتے ہیں الحمد للہ الذی لا وزیر ولا خلق من عبادہ یستشیر وہ خدا وہ ہے جو بلا وزیر عالم کی تدبیر کرتا ہے اور اپنی مخلوق میں سے کسی سے بھی مشورہ نہیں کرتا (مفاتیح الجنان) خدا فرماتا ہے فلا تضربوا للہ الامثال۔ خدا کے لئے مثالیں نہ دیا کرو۔ امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں من شبہ الخالق بالمخلوق فھو مشرک جو خالق کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دے وہ مشرک ہے۔ (عیون الاخبار)

چوتھی وجہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر ملائکہ یہ کام انجام دے سکتے ہیں تو آئمہ طاہرین کیوں انجام نہیں دے سکتے جو کہ مخدوم ملائکہ ہیں؟ یہ تقریر سراسر فریب کاری یا جہالت اور مکاری پر مبنی ہے ورنہ کس نے یہ کہا ہے کہ آئمہ ان امور کو انجام نہیں دے سکتے۔ آئمہ اطہار تو اشرف الخلائق ہیں۔ خدا وہ قادر مطلق ہے کہ اگر چاہے تو مچھر جیسی کمزور مخلوق سے بھی یہ کام لے سکتا ہے[1] نزاع اس میں نہیں ہے کہ آئمہ اطہار علیہم السلام ان امور کو انجام دے سکتے ہیں یا نہیں دے سکتے؟ بلکہ تمام تر بحث و نزاع اس امر میں ہے کہ آیا ان امور کی انجام دہی آئمہ علیہم السلام کا وظیفہ اور فرض منصبی ہے یا یہ ان کا منصب نہیں ہے؟ اگر کسی کا خادم کوئی کام کرتا ہو تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ اس کا مخدوم بھی ضرور وہ کام کرے؟ اگرچہ وہ کام مخدوم کے شایان شان بھی نہ ہو۔ یاد رکھیں کسی کام کا کر سکنا اور ہے اور اسے فرض منصبی سمجھ کر کرنا اور ہے۔ عاقلاں را اشارہ کافی است۔

نواں شبہ اور اس کا جواب بعض زیارات میں ایسے فقرات موجود ہیں جن سے تفویض ثابت ہوتی ہے

---

[1] احسن الفوائد کی طبع اول کے بعد بعض اہل غرض مخربین دین اس عبارت کو لے اڑے اور ابلہ فریبی سے کام لے کر زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اور عامۃ الناس کو علماء اعلام سے بدظن کرنے کے لئے اس انداز میں اسے پبلک میں اچھالا کہ شاید معلم ملکوت بھی ان کی کارستانی دیکھ کر حیران ہو گیا ہوگا۔ باانصاف ناظرین کرام بنظر غائر اس عبارت کا مطالعہ کریں۔ کیا اس میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی توہین کا کوئی شائبہ بھی پایا جاتا ہے؟ کیا اس عبارت میں آئمہ اطہار کو مچھر کے برابر قرار دیا گیا ہے؟ کیا اس میں ان کو ان امور کی انجام دہی سے عاجز بتایا گیا ہے؟ یا اس میں ان کے حامل روح القدس ہونے کی نفی کی گئی ہے؟ حاشا وکلا۔ مالکم کیف تحکمون؟ ظاہر ہے کہ اس عبارت میں صرف خداوند عالم کے علی کل شیء قدیر ہونے کا اظہار کیا گیا ہے وبس۔ یہ اتنا واضح و آشکار مفہوم ہے کہ کسی بھی صاحب عقل سلیم و طبع مستقیم کو اس کے سمجھنے میں ہرگز کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی (الا من کان فی قلبہ مرض فزادھم اللہ مرضا) (منہ عفی عنہ)

جیسے زیارت رجبیہ میں مروی ہے آملکم فیما الیکم التفویض وعلیکم التعویض الی غیر ذلک من العبادات اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قطع نظر اس سے کہ یہ زیارات مستند ہیں یا نہیں؟ ان میں وارد شدہ لفظ "تفویض" سے مراد وہی دینی امور میں تفویض ہے جیسا کہ اس کے سیاق و سباق سے واضح ہے اور "تعویض" عوض دینے سے مراد آخرت میں ثواب عطا کرنا ہے جو کہ ان کی شفاعت کبریٰ سے حاصل ہوگا بہرحال اس قسم کی زیارات وعبارات کو ہمارے متعلقہ مسئلہ سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ اس کی مزید توضیح کے لئے کتاب مصابیح الانوار علامہ شبر کی طرف رجوع کیا جائے۔ فلا تغفل۔

دسواں شبہ

بعض روایات میں وارد ہے کہ نزّلونا عن الربوبیۃ ثم قولوا فینا ما شئتم لن تبلغوا ہمیں ربوبیت سے نیچے رکھو پھر ہمارے حق میں جو چاہو کہو۔ ہرگز ہماری اصل حقیقت تک تم نہیں پہنچ سکتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے خدا اور رب کہنے کے ہم سب کچھ اہل بیت علیہم السلام کے حق میں کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کو خالق و رازق وغیرہ کہنا درست ہے بلکہ اس روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے غلو ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ غلو نام ہے تجاوز عن الحد کا اور جب ہمیں خدا و رسولؐ اور آئمہ اطہارؑ کے حدود معلوم ہی نہیں تو ان کے حق میں غلو چہ معنی دارد؟ ان کی شان میں تو ہمارا غلو بھی نارسا ہے ؎ کما قیل

گویند غالیم ثنائے تو یا علیؑ ... حق ایں کہ من ز حق ثنائے تو قاصرم

یہ شبہ بچند وجہ باطل ہے وجہ اوّل

یہ روایت خبر واحد ہے کئی بار عرض کیا جا چکا ہے کہ اصول و عقائد میں اخبار احاد پر بالاتفاق اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اخبار احاد سے زیادہ سے زیادہ ظن حاصل ہوتا ہے۔ جو کہ عقائد میں ناقابل اعتماد ہے۔ عقائد میں علم و یقین ضروری ہے۔ جو کہ آیاتِ محکمات یا روایاتِ متواترات سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ علماء اعلام نے ایسی روایات کا یہی تحقیقی جوابِ باصواب دیا ہے۔ چنانچہ جناب سید العلماء السید حسین بن حضرت غفرانمآب قدس سرہ نے اپنی کتاب حدیقہ سلطانیہ میں اسی شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے فلکونہا من اخبار الاحاد لا تصلح ملاعتماد فی اصول الاعتقاد ص۶۹ طبع لکھنؤ بوجہ اخبار احاد سے ہونے کے اصولِ اعتقاد میں ناقابل اعتماد ہے۔

دوسری وجہ

بنا بر تسلیم صحت روایت اس کا وہ مطلب نہیں جو لیا جا رہا ہے یہ تو کلمۃ حق یراد بہا الباطل کا مصداق ہے۔ اس میں جو وارد ہے کہ ہمیں مرتبہ ربوبیت سے نیچا رکھو۔ کون عقلمند اور اسالیب کلام سے واقف انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بس ہمارے متعلق لفظ "رب" نہ کہو؟ باقی جو جی چاہے کہتے رہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو صفات شانِ ربوبیت سے تعلق رکھتی ہیں ان سے ہمیں متصف نہ کرو ہم متعدد آیات کے حوالہ جات سے ثابت کر چکے ہیں کہ خلق و رزق اور اماتۃ و احیا وغیرہ صفات

کا تعلق ربوبی صفات سے ہے کما قال عز من قائل اللہ الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون۔ لہذا آئمہ اطہار علیہم سلام الملک الجبار کو خالق و رازق اور محی و ممیت کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

تیسری وجہ اگر بالفرض ایسی روایات کا وہی مطلب ہو جو یہ حضرات مراد لے رہے ہیں کہ سوائے لفظ رب کے اور سب کچھ کہا روا ہے۔ تو کیا یہ حضرات روا رکھیں گے کہ آئمہ طاہرینؑ کو رسول کہا جائے یا ان کو جناب رسول خداؐ سے افضل قرار دیا جائے؟ یا ان مخصوص صفات خاصہ کا اسی معنی کے اعتبار سے جس اعتبار سے ذات باری تعالیٰ پر ان کا اطلاق ہوتا ہے ان ذوات مقدسہ پر اطلاق کیا جائے؟ جب یہ جائز نہیں اور یقیناً نہیں تو ماننا پڑے گا کہ اس کا صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ قولوا ما شئتم کے عموم سے مراد یہ ہے کہ وہ مدح و ثنا جو قواعد شرعیہ کے اعتبار سے جائز ہو وہ دل کھول کر کی جا سکتی ہے اور پھر بھی ان کے فضائل و محامد کا شمار نہیں ہو سکتا نہ یہ کہ جو کچھ چاہو غلط یا صحیح، بلکہ خود تراش کر کے ان ذوات قدسی صفات کی طرف منسوب کر دو۔ حاشا وکلا کلام امام کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا۔ ایسے خوش فہم حضرات کو کلام امام کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ فہمیدن کلام امام عالی مقام مجتہد است۔

چوتھی وجہ یہ درست ہے کہ ہم خدا و رسولؐ اور آئمہ طاہرینؑ کی کما حقہ مدح و ثنا سے قاصر ہیں کما قال الامام الرضاؑ الامام من حیث النجم من ایدی المتناولین۔ امام کا مقام اس طرح بلند ہے جس طرح آسمان کا ستارہ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہمیں حدود ربوبیت اور حدود نبوت و امامت کا کچھ بھی علم و اندازہ نہیں ہے۔ ورنہ خداوند عالم کے صفات ثبوتیہ و سلبیہ کا اعتقاد رکھنے اور خصائص نبوت بیان کرنے اور معارف امامت لکھنے کا اور بیان کرنے کا مقصد ہی کیا ہے؟ ہم جو خدا کے لئے چند صفات ثبوتیہ و سلبیہ ثابت کرتے ہیں یا پیغمبر اسلام کے لئے چند خصائص نبوت کا اعتقاد رکھتے ہیں یا چند فضائل امامت کو تسلیم کرتے ہیں۔ تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ہم نے ان کی اصل حقیقت کو معلوم کر لیا ہے اور وہ محدود ہو گئے ہیں مگر اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ جو صفات خدا کے لئے مانتے ہیں ان میں کسی اور کو شریک قرار نہیں دیتے اور خصائص نبوت میں غیر نبی کو سہیم نہیں مانتے۔ اسی طرح فضائل امام میں غیر امام کو برابر نہیں سمجھتے۔ لہذا اگر امام میں خصائص نبوت یا صفات ربوبیت تسلیم کر لی جائیں تو غلو یقیناً لازم آئے گا۔ یا جتنی ہیں صفات الہیہ تسلیم کریں تب بھی غلو لازم آئے گا۔ جیسا اوپر اقسام غلو میں اس مطلب کی وضاحت [illegible] کی جا چکی ہے۔ یہ کیا فضول بات ہے کہ ان حضرات کو سوائے خدا کہنے کے اور کسی طرح ہم سے غلو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ عقیدۂ تفویض غلو ہی کا تو ایک شعبہ ہے جیسا کہ ابتدائے مبحث میں اسے ثابت کیا جا چکا ہے۔ پس ان حقائق سے ثابت ہوا کہ "قولوا ما شئتم" کا عموم اپنے عموم پر باقی نہیں ہے بلکہ تخصیص ہے۔ وما من عام الا وقد خص مشہور و مسلم ہے الا ما شذ و ندر۔ ان حقائق سے قطع نظر

کرکے اس کے عموم کے ساتھ استدلال کرنا ایسا ہی ہوگا۔ جیسے کوئی شخص حدیث نبوی قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا۔ کے ساتھ تمسک کرکے کہے کہ تمام فرقہائے اسلام ناجی ہیں۔ یا کوئی بدعمل یہ استدلال کرے کہ عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ودو تحفظی سخافتہا۔

گیارھواں شبہ اور اس کا جواب

اگر تفویض کا عقیدہ اس لئے غلط ہے کہ اس سے شرک لازم آتا ہے تو پھر اس خرابی سے کوئی جائے فرار نہیں ہے کیونکہ ملائکہ کا ان امور کو انجام دینا تو مسلم ہے لہٰذا یہ کیا بات ہے کہ ملائکہ انہی امور کو انجام دیں تو شرک لازم نہیں آتا لیکن آئمہ اہل بیتؑ ان کو انجام دیں تو شرک لازم آتا ہے؟

اس شبہ کا پہلا جواب

اس شبہ کے کئی جوابات دیئے جا سکتے ہیں اوّلاً یہ کہ بعض اوقات دو فعل بظاہر بالکل باہم مجانس و مشابہ اور ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مگر اس وجہ سے کہ ایک ماذون من اللہ ہے وہ باعث قرب ایزدی قرار پاتا ہے اور دوسرا بوجہ غیر ماذون من اللہ ہونے کے باعث بُعد اور موجب شرک بن جاتا ہے چنانچہ متعدد روایات میں وارد ہے کہ جو لوگ آئمہ معصومینؑ کے علاوہ دیگر خلفائے جور کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں وہ مشرک ہیں اور جو آئمہ طاہرینؑ کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں وہ موحّد و خدا پرست۔ حالانکہ بظاہر دونوں صورتوں میں غیر خدا کی اتباع ہے مگر ایک صورت میں شرک ہے اور دوسری صورت میں ایمان۔ یہ تفریق کیوں ہے؟ محض اس لئے کہ چونکہ آئمہ طاہرینؑ کی اطاعت و پیروی کا منجانب اللہ حکم ہے اور دوسرے خلفاء کی اتباع کا کوئی اذن نہیں ہے۔ یہی کیفیت ہمارے متعلقہ مسئلہ کی ہے چونکہ ملائکہ کا مدبر امور ہونا قرآن و سنت سے ثابت ہے لہٰذا ان کو مدبر تسلیم کرنے سے شرک لازم نہیں آتا اور آئمہ طاہرینؑ کا مدبر و منتظم عالم ہونا قرآن و سنت سے ثابت نہیں ہے اس لئے اگر ان کو مدبر امور اور ناظم عالم مانا گیا تو شرک لازم آئے گا۔

بارھواں شبہ اور اس کا جواب

سورہ انا انزلنا کی تفسیر میں متعدد روایات کے اندر موجود ہے کہ لیلۃ القدر کو فرشتے امام وقت کی خدمت میں تمام امور لے کر حاضر ہوتے ہیں

اور اس سال زمین پر جو کچھ واقع ہونا ہوتا ہے اس کی اطلاع امامؑ کو دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا نظم و نسق امامؑ کے ہی سپرد ہے۔ ورنہ ملائکہ کا ان کی خدمت میں آنا چہ معنی دارد؟ اس شبہ کا تحقیقی جواب جیسا کہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے دیا ہے اور دوسرے اعلام نے ان کی تائید فرمائی ہے یہ ہے کہ فلیس ذلک لمدخلیتھم فی ذلک ولا للاستشارۃ بھم بل لہ الخلق والامر ولیس ذلک الا لتشریفھم واکرامھم واظہار رفعۃ مقامھم (بحار الانوار ص ۲۶ ج ۳) امام وقت پر ملائکہ کا نزول اس لئے نہیں ہوتا کہ آئمہ اطہار کو نظامِ عالم کے چلانے میں کچھ دخل ہے یا ان سے خدا کو مشورہ کرنا مقصود ہے خدا ہی خالق و حاکم ہے بلکہ آئمہ طاہرینؑ کے اکرام و احترام اور ان کی رفعت و عظمتِ مقام ظاہر کرنے کے لئے ایسا کیا جاتا ہے کہ جب ملائکہ زمین پر آئیں تو پہلے حجتہائے خداوندی کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کریں۔ صاحبِ مرأۃ الانوار و مشکوٰۃ الاسرار نے سرکار علامہ کی یہی توجیہہ وجیہہ نقل کرنے کے بعد بنظرِ استحسان دیکھتے ہوئے لکھا ہے واقول ما ذکرہ طاب ثراہ فیہ تنبیہ و توجیہ وجیہ للاخبار المذکورۃ وغیرھا الخ ص ۶ ۔ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ حضرت علامہ مجلسیؒ نے ذکر کیا ہے اس میں ان احادیث کی جو لیلۃ القدر میں آئمہؑ پر نزولِ ملائکہ کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں) کی بہترین توجیہہ و تاویل ہے۔ یہ تھے وہ شکوک و شبہات جن کے ساتھ قائلین تفویض تمسک کرتے ہیں یا تمسک کیا جا سکتا ہے۔ جنہیں تفصیل کے ساتھ ہم نے یہاں یکجا جمع کر کے ان کو بفضلہٖ تعالیٰ ہباءً منثوراً کر دیا ہے وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباءً منثوراً۔ قد تبین الرشد من الغی۔ فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔ وما علینا الا البلاغ

ایضاح

حضرت مصنف علامؒ نے غلاۃ و مفوضہ کے جو علاماتِ مخصوصہ شمار کئے ہیں کہ وہ علماء و مشائخ قمؒ کی طرف تقصیر و کوتاہی کی نسبت دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے متعلق اتنی وضاحت مطلوب ہے کہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہر غالی و مفوض میں یہ علامات ضرور ہی موجود ہوں۔ بلکہ مصنف علامؒ کی یہ فرمائش اپنے دور کے مخصوص حالات و کیفیات پر مبنی ہے۔ مکان و زمان کے تغیر و تبدل سے ایسے علامات میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے چنانچہ دورِ حاضر کے "مفوضہ" جن کا فردِ اکمل فرقہ "شیخیہ" ہے۔ جو کہ شیخ احمد احسائی کا متبع ہے وہ حوزۂ علمیہ نجف اشرف کے علماء اعلام اور دوسرے تمام متبع قرآن و سنت خیر الانام علماء کرام کو تقصیر کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور خود معارف ربانیہ و حقائق سبحانیہ اور دیگر علوم مخفیہ کی معرفت تامہ رکھنے کا مدعی ہے۔ اور یہی کیفیت ہمارے ملک کے علماء نما جہال کی ہے۔ کہ وہ اپنے کی نشر و اشاعت کرنے اور عوام کالانعام سے دادِ تحسین حاصل کرنے کے لئے محقق علماء و مجتہدین کی تذلیل و توہین میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے بلکہ اسے اپنا محبوب مشغلہ سمجھتے ہیں۔ بہر حال ان کی شناخت کا اصل معیار وہی عقائد و نظریاتِ فاسدہ ہیں جو بیان ہو چکے ہیں۔ یہ ظاہری علامات فقط بعض اوقات کاشف ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات ان میں کاشفیت کا پہلو بھی مفقود ہوتا ہے۔

باب الاعتقاد فی الظّلمین

اڑتیسواں ۳۸ باب ظالم لوگوں کے بارے میں اعتقاد

قال الشیخ ابو جعفرؒ اعتقادنا فیھم انھم ملعونون والبرائۃ منھم واجبۃ قال اللہ عزّوجل وما للظّلمین من انصار وقال اللہ تعٰ ومن اظلم ممّن افتریٰ علی اللّٰہ کذبا اولئک یعرضون علی ربّھم ویقول الاشھاد ھؤلاء الّذین

جناب شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔ ظالموں کے متعلق ہمارا یہ اعتقاد ہے۔ کہ وہ ملعون اور رحمتِ خداوندی سے دُور ہیں۔ ان سے بیزاری اختیار کرنا واجب ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ ظالموں کے لئے (بروزِ قیامت) کوئی ناصر و مددگار نہ ہوگا۔ ایک اور مقام پر فرمایا۔ جو شخص خدا پر جھوٹ بولے اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ یہ لوگ جب خدا کے دربار میں پیش کئے جائیں گے۔ تو گواہ کہیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے

واللہ العالم وعلمہ اکمل واتم

قل یا ایھا الناس قد جاءکم الحق من ربکم فمن اھتدیٰ فانما یھتدی لنفسہٖ ومن ضل فانما یضل علیھا وما انا علیکم بوکیل۔

اڑتیسواں باب ظالموں کے متعلق عقیدہ کا بیان

اس باب میں حضرت مصنف علامؒ نے چند امور ذکر کئے ہیں۔ (۱) ظالمین اور آئمہ طاہرینؑ کے معاندین سے بیزاری اختیار کرنا۔ (۲) منکرین امامت آئمہؑ کا انجام (۳) امیرالمومنینؑ کے ساتھ جنگ کرنے والوں کا حشر۔ (۴) جناب سیدہ عالم کی تمام زنانِ عالم پر افضلیت (۵) قاتلین انبیاؑ و آئمہ کا کفر۔ ہم ذیل میں ان تمام مسائل پر اور بعض دوسرے متعلقہ مباحث پر حسبِ گنجائش کسی قدر تفصیل سے تبصرہ کرتے ہیں۔

حق و باطل کی باہمی معرکہ آرائی

حق و باطل کی معرکہ آرائی اور زور آزمائی ابتدائے آفرینش کائنات سے جاری و ساری ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اور آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ قیامت تک اسی طرح جاری رہے گا۔ لایزالون مختلفین الی یوم القیمۃ۔ دنیا میں ہر شے، ہر حقیقت اور ہر نظریہ کی ضد موجود ہے۔ جب یزدان و رحمٰن کے مقابلے میں اہرمن و شیطان کھڑا ہوگیا تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ہر خیر کے ساتھ شر اور ہر حقیقت کے ساتھ اس کی ضد موجود ہے۔

کذبوا علی ربھم الا لعنۃ اللّٰہ علی الظّٰلمین الّذین یصدون عن سبیل اللّٰہ ویبغونھا عوجاً ھم بالآخرۃ ھم کافرون قال ابن عباسؓ فی تفسیر ھذہ الآیۃ ان سبیل اللّٰہ فی ھذہ المواضع علی ابن ابی طالب والائمۃ وفی کتاب اللّٰہ عزوجل

پروردگار پر جھوٹ بولا کرتے تھے۔ خبردار! ان ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔ جنہوں نے خدا کی راہ سے بندوں کو روک کر اس میں کجی ڈالنے کی کوشش کی اور یہی لوگ آخرت کے منکر ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں "سبیل خداوندی" سے مراد حضرت امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ اور دوسرے آئمہ اطہار علیہم السلام ہیں۔ خدائے عزوجل کی کتاب میں

ہابیل کے مقابلے کے لئے قابیل، موسیٰؑ کے لئے فرعون، اور محمد مصطفٰےؐ کے خلاف ابوجہل۔ ابوسفیان اور مسیلمہ کذاب وغیرہ موجود ہیں۔ اسی طرح حقیقی خلافت و امامت کے خلاف مصنوعی خلافت وحکومت موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے اندر جتنے خون خرابے اور فتنے فساد اسی اختلاف کی وجہ سے ہوئے۔ اتنے اور کسی وجہ سے نہیں ہوئے۔ حقیقت نے ہمیشہ کذب کو ماننے سے انکار کیا۔ خواہ اس کے سر پر کتنے ہی آرے چلے۔ اور کذب نے حکومت کی آڑ میں کوئی ایسا ظلم نہیں تھا جو حق اور اہل حق پر نہ کیا ہو۔ اسی تنازعہ نے اسلام کے عقیدہ و احکام پر بھی بہت برا اثر ڈالا۔ اور یہی اختلاف تمام اختلافات اور فقہ اسلام کے احکام میں ترمیم و تنسیخ کا باعث بنا۔ جن لوگوں کو آنحضرتؐ کے انتقالِ پُرملال کے بعد اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسلامی امامت کو یونانی حکومت کے ساتھ بدل دیا۔ اور اس تبدیلی کے لئے انہیں وہ تمام نظریات جن پر حقیقی امامت مبنی تھی۔ بدلنے پڑے اور ان کے بدلنے کے ساتھ اسلام بدلا گیا۔ بغرض کہ بقول صاحب ملل ونحل امامت کا اختلاف امت اسلامیہ میں سب سے بڑا اختلاف ہے اور مذہب تشیع وتسنن کا بنیادی نقطۂ اختلاف بھی یہی تنازعہ ہے (فلسفۂ اسلام)

امت اسلامیہ میں امامت کے دو سلسلے موجود ہیں۔ ایک وہ سلسلۂ جلیلہ ہے جو حضرت امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ سے شروع ہو کر بارہویں امام مہدیؑ دوران صاحب العصر والزمان حضرت حجۃ بن الحسنؑ تک منتہی ہوتا ہے۔ اور دوسرا سلسلہ جناب ابوبکر سے شروع ہو کر نہ معلوم مروان الحمار اموی یا معتصم عباسی یا کسی اور پہ جا کر منتہی ہوتا ہے؟ (جس کا صحیح علم ان کی خلافت کے علمبرداروں کو بھی نہیں [1] ہے

---

[1] تفصیلات معلوم کرنے کے شائقین ہماری کتاب اثبات الامامت صفحہ ۲۶۱ کی طرف رجوع کریں۔ (منہ عفی عنہ)

امامان امام الھدیٰ و امام الضلالۃ قال اللہ تعالیٰ وجعلناھم ائمۃ یھدون بامرنا و قال اللہ تعالیٰ وجعلناھم ائمۃ یدعون الی النار و یوم القیٰمۃ لا ینصرون واتبعناھم فی ھذہ الدنیا لعنۃ و یوم القیمۃ ھم من المقبوحین فلما نزلت ھذہ الآیۃ واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ

دو قسم کے اماموں کا ذکر آیا ہے۔ ایک امام ہدایت۔ دوسرا امام ضلالت۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے "ہم نے انہیں ایسا امام بنایا ہے کہ وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں" نیز (آئمہ ضلالت کی مذمت میں) خدا فرماتا ہے۔ "ہم نے انہیں ایسا امام پیدا کیا ہے جو دوزخ کی طرف (لوگوں کو) دعوت دیتے ہیں۔ قیامت کے روز ان کی امداد نہ کی جائے گی اور ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا رکھی ہے۔ اور بروز قیامت ان کا شمار ذلیل و خوار لوگوں میں ہوگا۔ جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی کہ "اس فتنہ سے ڈرو! جو صرف انہی لوگوں کو نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں" (بلکہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا)

خلافت علیؑ کا اجمالی بیان

حضرات شیعہ خیر البریہ کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب سرور کائناتؐ سنت انبیاء کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کو اپنا خلیفہ و جانشین مقرر فرما کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس خلافت کا اعلان دعوت ذوالعشیرہ کے موقع پر کیا۔ (مسند احمد بن حنبل وغیرہ) اور آخر میں غدیر خم کے مقام پر علانیہ آنجناب کو اپنا خلیفہ بلافصل مقرر فرمایا اور ولی عہدی کی رسم ادا فرمائی۔ اور اس درمیانی عرصہ میں بھی آنحضرتؐ برابر حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب اور ان کی تقرری کا تذکرہ فرماتے رہے۔ اور باقی گیارہ آئمہ طاہرینؑ کی بھی مع نام و نسب تصریح فرما دی۔ (جیسا کہ باب۳ کے ذیل میں اس مطلب پر فی الجملہ تبصرہ کیا جا چکا ہے۔) آنحضرتؐ نے اپنے اس اسوۂ حسنہ سے واضح کر دیا کہ خلافت بالنص ہوتی ہے نہ بالاجماع وغیرہ۔ مگر افسوس حسب رسم قدیم ابناء دنیا نے ان وارثان زمین کو آنحضرتؐ کی ظاہری مسند خلافت پر متمکن نہ ہونے دیا اور زمام حکومت ایسے ہاتھوں میں دے دی جو کسی طرح بھی اس منصب الٰہی کے اہل نہ تھے۔ لہٰذا ان آئمہ طاہرینؑ کی موجودگی میں جن لوگوں نے ظاہری خلافت و حکومت پر قبضہ کیا۔ ان کا یہ قبضہ حضرت علیؑ اور اولاد علیؑ علیہم السلام کی نگاہ میں غاصبانہ و ظالمانہ تھا۔ (والحق مع علیؑ و علیؑ مع الحق) جیسا کہ یہ امر حضرت امیر المومنینؑ کے متعدد خطبات وارشادات اور دوسرے آئمہ طاہرینؑ کے فرمائشات سے واضح و عیاں ہے۔ مثلاً خطبہ شقشقیہ میں آپ فرماتے ہیں۔

لقد تقمصھا فلان وھو یعلم ان محلی منھا محل القطب من الرحیٰ ینحدر عنی السیل ولا یرقیٰ الی الطیر

فلان (یعنی خلیفہ اول) نے قمیص خلافت کو زیب تن کر لیا۔ حالانکہ اسے علم تھا۔ کہ مجھے خلافت سے وہی تعلق ہے جو قطب آسیا کو آسیا سے ہوتا ہے (میں اس علمی بلند مقام پر فائز ہوں کہ) مجھ سے علم و معرفت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور مجھ تک پرندہ بھی پر مار کر نہیں پہنچ سکتا۔ (نہج البلاغہ صفحہ ۲۵ ج۱ طبع مصر)

قال النبیّ من ظلم علیاً مقعدی هذا بعد وفاتی فکانما جحد نبوّتی ونبوّة الانبیاء من قبلی ومن تولیٰ ظالماً فهو ظالم قال الله عزّ وجلّ ثنائه یا ایها الذین اٰمنوا لا تتخذوا آبائکم واخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان ومن یتولهم منکم فاولئک هم الظالمون وقال عزّ وجلّ یا ایها الذین اٰمنوا لا تتولوا قوماً غضب الله علیهم قد یئسوا من الآخرة کما

تو (اس کی تفسیر میں) جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جو شخص میری وفات کے بعد میرے مقامِ خلافت کے متعلق علی بن ابی طالبؑ پر ظلم کرے گا تو گویا اس نے میری اور مجھ سے پہلے گذرے ہوئے تمام انبیاءؑ کی نبوت کا انکار کیا اور جو شخص کسی ظالم سے بھائی چارہ قائم کرے وہ خود بھی ظالم ہے (اس سلسلہ میں) خدا فرماتا ہے۔ "اے ایمان والو! تم اپنے ان باپ بھائیوں سے محبت اور دوستی نہ رکھو جو ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیتے ہیں اور تم میں سے جو شخص ان سے دوستی رکھے گا وہ بھی انہی ظالموں میں سے ہوگا" نیز خدا فرماتا ہے۔ "اے ایمان والو! اس گروہ سے محبت نہ کرو جس پر خدا غضبناک ہے۔ وہ آخرت سے اس طرح مایوس ہیں جس طرح

ائمہ اہل بیتؑ اور خلفائے ثلاثہ کی خلافت

نہج البلاغۃ میں ایک مکتوب میں جو آپؑ نے معاویہ کے خط کے جواب میں ارسال فرمایا، خلافت ثلاثہ کی ناپسندیدگی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔ واما اکراهتہ فلا اعتذر للناس من ذلک یعنی باقی رہا میرا ان لوگوں کی خلافت کو ناپسند کرنا سو میں اس کی عذرخواہی لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ (آپ کا یہ خط العقد الفرید ج ۲ ص ۲۳۴ میں بھی مذکور ہے) خلیفۂ دوئم کی وفات کے بعد جب مجلسِ شوریٰ میں عبدالرحمٰن بن عوف نے کتابِ خدا، سنتِ مصطفےٰ کے ساتھ ساتھ سیرتِ شیخین پر عمل کرنے کی شرط پر زمامِ خلافت جنابِ امیرؑ کے حوالہ کرنا چاہی تو جنابِ امیرؑ نے تختِ حکومت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا مگر سیرتِ شیخین پر عمل کرنے کی شرط کو قبول نہیں فرمایا (الامامۃ والسیاسۃ ص۔ شرح فقہ اکبر ص۔ وغیرہ) اس واقعہ سے بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتی ہے کہ آنجنابؑ خلافتِ شیخین کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ بہرحال ان حقائق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کا ان لوگوں کو غاصب و جائر سمجھنا ایسا واضح تھا کہ خود ان لوگوں کو بھی اس حقیقت کا اعتراف تھا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ خلیفۂ ثانی نے حضرت امیرؑ اور جنابِ عباسؓ کو خطاب کرکے کہا۔ "رأیتمانی کاذباً آثماً۔ غادراً۔ خائناً" تم دونوں مجھے جھوٹا، گنہگار، غدار اور خیانت کار سمجھتے ہو، بلکہ جو شخص مجھ سے بہتر تھا۔ (خلیفۂ اول) تم دونوں اسے بھی ہمیشہ کاذب، آثم، خائن اور غادر سمجھتے رہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۹۱ طبع دہلی) حضرت امیرؑ اور جنابِ عباسؓ کے سکوت نے اس امر پہ مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ کہ واقعاً وہ ان لوگوں کو ایسا ہی سمجھتے

يئس الكفار من اصحاب القبور و قال عز وجل لا تجد قوماً يومنون بالله واليوم الآخر يوادون من حاد الله ورسوله ولو كانوا آبائهم اوابنائهم او اخوانهم اوعشيرتهم اولئك كتب في قلوبهم الايمان وقال الله تعالیٰ ومن يتولهم منكم فانه منهم ان الله لايهدى القوم الظلمين وقال عز وجل ولا تركنوا الى الذين ظلموا فتمسكم النار ومالكم من دون الله من اولياء ثم لا تنصرون والظلم هو وضع الشئ في غير موضعه فمن ادعی

جس طرح کہ کافر لوگ قبروں کے مردوں سے مایوس ہیں۔ نیز خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو لوگ خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ تم ان کو دشمنانِ خدا و رسولؐ سے محبت کرتے ہوئے نہیں پاؤگے۔ خواہ وہ ان کے باپ دادا یا بیٹے یا بھائی یا اپنے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ اس لیے ہے کہ خدا نے ان کے دلوں میں ایمان راسخ کر دیا ہے"۔ نیز خدا فرماتا ہے "تم میں سے جو شخص ان (ظالموں) سے دوستی رکھے گا۔ وہ بھی انہیں میں شمار ہوگا۔ بے شک خداوند عالم ظالموں کو ہدایت نہیں فرماتا۔ (اسی سلسلہ میں ایک اور جگہ) ارشاد فرماتا ہے ظالموں کی طرف مائل نہ ہو ورنہ تمہیں بھی آتش دوزخ اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ اور خدا کے سوا تمہارا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔ لغت میں کسی چیز کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے کا نام ظلم ہے۔ پس جو شخص امامت کا دعویٰ کرے

تھے۔ ان حقائق کو ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب اثبات الامامۃ میں ذکر کیا ہے۔ شائقین تفصیل اس کی طرف رجوع کریں۔ یہاں فقط اشارہ مقصود ہے۔ مگر زمانہ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ادھر حضرت امیرؑ آنحضرتؐ کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ پڑھنے میں مشغول رہے اُدھر آنجنابؑ کا حق غصب ہوتا رہا۔ (الملل والنحل وغیرہ) عرفی نے خوب کہا ہے ؂

امامے کہ روزِ وفاتِ پیمبرؐ ۔ خلافت گذارد بماتم نشیند

برأت و بیزاری کا عقلی و نقلی ثبوت

بنابریں چونکہ ہر معاملہ و مسئلہ میں حق اہل بیت رسولؐ کے ساتھ ہے۔ لہذا ان کی اقتدا و اتباع اور ان سے محبت و مودت رکھنا بنصِ قرآن واجب و لازم ہے اور یہ امر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ان کے مخالفین و معاندین سے علیحدگی و بیزاری اختیار نہ کی جائے۔ جس طرح کہ توحید و رسالت کا اقرار و اعتقاد اس وقت تک کامل نہیں ہوتا۔ جب تک خدا و رسولؐ کے بالمقابل جھوٹے مدعیانِ ربوبیت و نبوت کی ربوبیت و رسالت کا انکار کرکے ان سے بیزاری اختیار نہ کی جائے۔ اور یہی کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ علیؑ ولی اللہ کا مفاد و ماحصل ہے۔ اور بنظرِ بفطرتِ صحیحہ کے عین مطابق ہے۔ اور چونکہ دینِ اسلام فطری دین ہے۔ بلکہ یہی امر اس دین کا دیگر ادیانِ عالم کے بالمقابل

الامامة وهو غير امام فهو الظالم الملعون ومن وضع الامامة فى غير اهلها فهو ظالم ملعون وقال النبىؐ من جحد عليًا امامته بعدى فقد جحد نبوتى ومن جحد نبوتى فقد جحد الله ربوبيته وقال النبىؐ يا علىؑ انت المظلوم بعدى ومن ظلمك فقد ظلمنى ومن انصفك فقد انصفنى ومن جحدك فقد جحدنى ومن والاك فقد والانى ومن عاداك فقد عادانى ومن اطاعك فقد اطاعنى ومن عصاك فقد عصانى واعتقادنا

حالانکہ وہ امام نہ ہو تو وہ ظالم اور ملعون ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی ظالم و ملعون ہے۔ جو نا اہل لوگوں کی امامت کا قائل ہو۔

جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں جو شخص میرے بعد حضرت علی علیہ السلام کی امامت کا انکار کرے گا وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے میری نبوت و رسالت کا انکار کیا اور جو اس نے گویا خدا کی ربوبیت کا انکار کیا۔ نیز آنحضرتؐ نے فرمایا یا علیؑ میرے بعد تم پر ظلم و ستم کیا جائے گا (یاد رکھو) جو شخص تم پر ظلم کرے گا۔ وہ مجھ پر ظلم کرے گا اور جو تم سے انصاف کرے گا وہ مجھ سے انصاف کرے گا۔ جو تمہارا منکر ہوگا وہ میرا منکر ہوگا جو تم سے محبت کرے گا وہ مجھ سے محبت کرے گا اور جو تم سے دشمنی کرے گا وہ میرا دشمن ہوگا جو تمہاری اطاعت کرے گا وہ میرا اطاعت گذار ہوگا۔ اور جو تمہارا نافرمان ہوگا وہ میرا نافرمان ہوگا۔ ہمارا عقیدہ

طغرائے امتیاز و مایۂ کمال ہے۔ کہ یہ دینِ فطرت ہے۔ عقلِ سلیم و طبعِ مستقیم کے عین مطابق ہے۔ فطرۃ الله التی فطر الناس علیها جیسا کہ اس مطلب پر بعض سابقہ ابواب میں مفصل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس لئے دینِ اسلام نے اس مسئلہ پر بہت زور دیا ہے۔ اربابِ عقل و دانش پر مخفی نہیں ہے۔ کہ عقلِ سلیم کا یہ فیصلہ ناقابلِ انکار ہے۔ کہ سچا و جھوٹا۔ عالم و جاہل، مومن و منافق، مسلم و کافر، ظالم و مظلوم، مکار و عیار اور متقی و پرہیزگار۔ غرض کہ نیک و بد نبی و متنبی۔ امامِ اہلِ جنت و امامِ اہلِ نار دونوں مساوی و برابر نہیں ہو سکتے۔ عقلِ سلیم کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ سچے سے دوستی اور جھوٹے سے بیزاری۔ عالم سے الفت اور جاہل سے نفرت۔ مسلم و مومن سے محبت اور منافق و کافر سے عداوت۔ مظلوم سے ہمدردی اور ظالم سے برأت۔ مکار سے کنارہ کشی اور پرہیزگار سے راہ و رسم رکھنا سچے نبی و امام سے تولا اور ان کی اتباع و اقتداء اور جھوٹے مدعیانِ نبوت و امامت سے بغض و عداوت اور ان سے تبرا یعنی علیحدگی و بیزاری اختیار کرنا واجب و لازم ہے۔ کوئی ذوقِ سلیم و عقلِ مستقیم رکھنے والا انسان خواہ جس مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ بشرطیکہ تعصب و عناد نے اس کی عقل و فکر کو شل نہ کر دیا ہو۔ وہ بفضلہ تعالیٰ مذکورہ بالا حقائق میں ہرگز کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کر سکتا۔

فمن جحد امامة امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ والائمۃ من بعدہٗ انہ کمن جحدہ نبوۃ جمیع الانبیاء واعتقادنا فیمن اقر بامیر المومنینؑ وانکر واحداً من بعدہ من الائمۃ انہ بمنزلۃ من اقر بجمیع الانبیاء وانکر نبوۃ نبینا محمدؐ وقال الصادقؑ المنکر لآخرنا کالمنکر لاولنا وقال النبیؐ والائمۃ من بعدی اثنا عشر اولہم امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ واخرھم المھدی القائمؑ طاعتھم طاعتی

اس شخص کے متعلق جو حضرت امیرؑ اور دیگر آئمہ طاہرینؑ کی امامت و خلافت کا منکر ہے یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کی مانند ہے کہ جس نے تمام انبیاء کی نبوت کا انکار کیا ہو اور جو شخص حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی امامت کا تو قائل ہو۔ مگر دوسرے گیارہ اماموں میں سے کسی ایک کی امامت کا منکر ہو۔ تو اس کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ایسا شخص اس آدمی کی مانند ہے جو تمام انبیاء ماسلف کی نبوت کا اقرار تو کرتا ہو۔ مگر حضرت محمد مصطفےٰؐ کی نبوت کا منکر ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں جو شخص ہمارے آخری امامؑ کا انکار کرے وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے ہمارے پہلے امام کا انکار کر دیا۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ میرے بعد میری مسند خلافت کے وارث بارہ امام ہونگے۔ ان میں سے پہلے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں۔ اور آخری حضرت "مھدیؑ" قائم ہونگے۔ ان کی اطاعت میری اطاعت

صحیح اسلامی تعلیمات کا حامل ہے۔ وہ بحمدہٖ تعالیٰ مذہب شیعہ خیر البریہ ہی ہے۔ اس لئے اس میں "تولیٰ"، "و تبرّا" کو جزوِ مذہب قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ نظریہ قرآن و حدیث کے عین مطابق ہے۔ ارشادِ قدرت ہے لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المومنین (سورۃ آل عمران پ ۳ ع ۱) یعنی اہل ایمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔ یا ایھا الذین لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء (سورۃ ممتحنہ پ ۲۸ ع ۷) اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ خداوند عالم حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرماتا ہے کہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرء منہ (سورہ پ ۲) جب ان کو علم ہوا کہ ان کا چچا آذر دشمنِ خدا ہے۔ انہوں نے فوراً اس سے بیزاری و علیحدگی اختیار کر لی۔ خدا ان کی مدح فرماتا ہے۔ ان ابراھیم لاواہ حلیم۔ یہ ہے تبرا و تولیٰ کی اصل حقیقت جسے صحیح تسلیم کرنے میں ہرگز کوئی عقل سلیم آباد انکار نہیں کرتی۔ مگر فتنہ پرداز ملاؤں نے اس مسئلہ کو ہمارے خلاف عوام الناس میں کچھ اس طرح غلط انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کے اذہان میں راسخ کر دیا ہے کہ تبرا کا مفہوم اصحاب رسولؐ کو سب و شتم کرنا ہے۔ حالانکہ ارباب علم و بصیرت جانتے ہیں کہ لغت عرب میں تبرا کا مفہوم ہے "بیزار شدن" یعنی کسی سے علیحدگی و بیزاری اختیار کرنا ہے اور

ومعصيتهم معصيتي ومن انكر واحداً منهم فقد انكرني و قال الصادق من شك في كفر اعدائنا والظالمين لنا فهو كافر وقال امير المومنين ما زلت مظلوماً منذ ولدتني امي حتے ان عقيلاً كان يصيبه الرمد فيقول لا تذروني حتى تذروا علياً فيذروني وما بي رمد واعتقادنا فيمن قاتل علياً قوله من قاتل علياً فقد قاتلني ومن حارب علياً فقد حاربني ومن حاربني فقد حارب الله وقوله لعلي وفاطمة

اور ان کی نافرمانی میری نافرمانی ہے جو شخص ان میں سے کسی ایک کی امامت کا انکار کرے وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے میری نبوت کا انکار کیا ہے۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں جو شخص ہمارے دشمنوں اور جنہوں نے ہم پر ظلم کئے ہیں کے کفر میں شک کرے وہ خود کافر ہے۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں میری ابتدائے ولادت سے برابر مجھ پر ظلم ہوتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جب عقیل کی آنکھوں میں درد ہوتا تھا تو وہ کہتے پہلے علی کی آنکھ میں دوا ڈالو۔ تب میں ڈلواؤں گا اس وقت میری آنکھوں میں دوا ڈال دی جاتی تھی۔ حالانکہ میری آنکھوں میں قطعاً کوئی درد نہ ہوتا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کرنے والوں کے متعلق ہمارا عقیدہ پیغمبر کے اس ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ جو جناب علی سے جنگ کرے وہ مجھ سے جنگ کرتا ہے اور مجھ سے لڑائی کرنے والا خدا سے لڑنے والا ہے۔ اسی طرح آنحضرت جناب امیر المومنین۔ حضرت فاطمہ۔

سب وشتم کا مفہوم ہے دشنام دادن یعنی کسی کو گالی دینا و بینهما بون بعید - این هذا امن ذاك

مذہب شیعہ میں کسی کو گالی دینا جائز نہیں ہم تو بموجب ارشاد رب العزت ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدواً بغير علم۔ کفار و مشرکین کو بھی سب وشتم کرنا ناجائز سمجھتے ہیں۔ چہ جائیکہ متظاہرین اسلام کو سب وشتم کریں؟ ہاں لعنت جس کے معنی رحمت خداوندی سے دوری کے ہیں۔ اور تبرا جس کے معنی بیزاری اختیار کرنے کے ہیں۔ یہ اور چیز ہے۔ جس کا جواز قرآن و حدیث اور اکابر امت کے عمل سے ثابت ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ کہ کوئی شخص اس وقت تک درجۂ ایمان پر فائز نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ بانیٔ اسلام ختم رسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات قدسی صفات کو خدا کے بعد ہر شئی سے حتیٰ کہ اپنی جان و اولاد سے زیادہ عزیز و محبوب نہ سمجھتا ہو۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ النبی اولیٰ بالمومنین من انفسہم۔ اور خود آنحضرت کا ارشاد ہے۔ لا یومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من ولدہ و والدہ والناس اجمعین

والحسنؑ والحسینؑ علیهم السلام انا حرب لمن حاربکم وسلم لمن سالمکم واما فاطمة صلوات الله وسلامه علیها فاعتقادنا فیها انها سیدة نساء العالمین الاولین والآخرین وان الله عزوجل لیغضب لغضبها ویرضیٰ لرضاها لان الله فطمها وفطم من احبها من النار وانها خرجت من الدنیا ساخطة علی ظالمیها و غاصبی حقها ومن نفی من ابیها ارثها وقال النبیؐ ان فاطمة بضعة منی من آذاها فقد آذانی ومن غاظها فقد غاظنی ومن

اور جناب امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے۔ جو شخص تم سے لڑے گا میری بھی اس سے لڑائی ہے۔ اور جو تم سے صلح کرے گا۔ اس سے میری بھی صلح ہے۔ حضرت سیدہ عالم جناب فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کے بارے میں ہم عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ مخدرہ تمام زنانِ اولین و آخرین کی سیدہ و سردار ہیں۔ خدائے عزوجل ان کی ناراضی سے ناراض اور ان کی رضامندی سے رضامند ہوتا ہے۔ کیونکہ اس معصومہ کو خداوند عالم نے مع ان کے شیعوں کے آتشِ جہنم سے آزاد کر دیا ہے۔ ہم اس بات کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ جناب سیدہؑ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئیں کہ آپ ان لوگوں پر ناراض تھیں جنہوں نے آپ پر ظلم و ستم کیا آپ کے حق کو غصب کیا اور میراثِ پدری سے محروم کیا۔ حالانکہ جناب پیغمبرِ اسلام فرمایا کرتے تھے۔ فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے جس نے ان کو اذیت دی اس نے در حقیقت مجھے اذیت دی جس نے ان کو غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا اور جس نے

(شفاء قاضی عیاض۔ کنز العمال وغیرہ) کوئی شخص اس وقت تک مومن کہلا نہیں سکتا۔ جب تک میں اسے اس کی اولاد اس کے والد اور اس کے نفس بلکہ تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ اور یہ اصول فطرت ہے کہ محبوب کی ہر شئ محبوب ہوتی ہے اسی لئے دوست کا دوست دوست اور دوست کا دشمن دشمن سمجھا جاتا ہے۔ متنبی کہتا ہے۔ ع

انی وان کان الذنب جبیبه - حبیب الیٰ قلبی حبیب حبیبی

مذہبِ شیعہ میں محبتِ اصحابِ باصفا جزوِ ایمان ہے

بنا بریں یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے محبوب صحابہ کو بُرا سمجھ کر کوئی شخص مومن کہلا سکے؟ صحابہ کرام کی چند وجوہ سے محبت لازم ہے۔ ایک اس لئے کہ وہ مومن ہیں۔ وکل مؤمن اخوة۔ مومن بھائی بھائی ہیں۔ مؤمن کی محبت مومن پر واجب ولازم ہے۔ لہٰذا صحابہ کرام کی محبت مؤمن کا ایمانی فریضہ ہے۔ دوسرے اس لئے کہ صحابہ ناصرِ اسلام ہیں۔ اور ناصرِ اسلام ناصرِ رسولؐ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے آقا و ہادی کے ناصر کی محبت فطرتاً لازم ہے۔ سویم اس لئے کہ صحابہ کرام بوجہ جہاد فی سبیل اللہ محبوبِ خدا ہیں۔ ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیله۔ لہٰذا محبوبینِ خدا کی محبت

سرّها فقد سرّنی وقال النبیؐ ان فاطمۃ بضعۃ منّی و ھی روح التی بین جنبی یسوئنی ما سائہا و یسرنی ما سرّھا واعتقادنا

اور جس نے ان کو خوش کیا اس نے مجھے خوش کیا۔ فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے۔ فاطمہؑ میری وہ روح ہے۔ جو میرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔ جو چیز ان کو رنج پہنچائے وہ مجھے رنج پہنچاتی ہے اور جو چیز ان کو مسرور وشاد کام کرے وہ مجھے مسرور وشاد کام کرتی ہے

لازم ہے۔ چہارم اس لئے کہ اصحاب رسولؐ متبعان رسولؐ ہیں۔ اور آپ کی اتباع کرنے والے محبوب خدا ہیں۔ قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ۔ واضح ہے کہ محبوب خدا کی محبت ہر اس بندہ پر جو خدا سے محبت رکھتا ہے۔ واجب و متحتم ہے۔ ان دلائل سے واضح ہوا کہ جو حقیقی اصحاب رسولؐ ہیں۔ ان کی محبت جزو ایمان ہے۔ ان کی محبت کے بغیر کوئی شخص درجۂ ایمان پر فائز وکامران نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ محقق شیخ بہائیؒ اپنے رسالہ اعتقادات الامامیہ میں تحریر فرماتے ہیں ونعتقد وجوب محبۃ اصحاب الرسول الذین اقاموا علی متابعتہٖ ولم یتخالفوا اوامرہ بعد وفاتہ و انفاذ ما وصاھم بہ حال حیوٰتہ۔ ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان اصحاب رسولؐ کی محبت واجب ہے جو آنحضرت کی متابعت پر قائم ودائم رہے اور ان کی وفات کے بعد ان کے احکام و وصایا کی مخالفت نہ کی۔ یہی شیعیان حیدر کرار کا عقیدہ و ایمان ہے۔ وہ محبت اصحاب رسولؐ اور ان کے لئے دعائے خیر۔ اپنے آئمہ اطہارؑ کی تقلید وتاسی میں اپنا ایمانی وظیفہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے چوتھے امام حضرت زین العابدین علیہ السلام کے صحیفۂ کاملہ میں ایک دعا مخصوص اصحاب رسول کے لئے موجود ہے۔ اس دعا کا عنوان یہ ہے۔ وکان من دعائہٖ علیہ السلام فی الصلوٰۃ علی اتباع الرسل ومصدقیھم۔ اس دعا میں آپ فرماتے ہیں۔ اللھم واصحاب محمد صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم خاصۃً الذین احسنوا الصحابۃ والذین ابلوا البلاء الحسن فی نصرہ وکانفوہ واسرعوا الی وفادتہٖ وسابقوا الی دعوتہ۔ یا اللہ خاص کر حضرت رسولؐ کے ان صحابہ کرام کو نظر انداز نہ فرما بلکہ ان کو جزائے خیر دے جنہوں نے آپ کا اچھا ساتھ دیا اور آپ کی نصرت میں خوب جہاد کیا۔ اور جناب کی معاونت کی۔ اور ان کی دعوت قبول کرنے میں سبقت کی۔

ظاہر ہے کہ حضرات شیعہ آل محمدؐ کی محبت کے ساتھ ان کی اتباع واقتداء کو بھی عین ایمان سمجھتے ہیں اور ان کو مفترض الطاعۃ جانتے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اپنے آئمہ کی اتباع سے صحابہ کرام کے لئے دعائے خیر کرنا جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ اللّٰھم اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان بعد ازیں بھی جو یہ کہتا ہے کہ شیعہ اصحاب رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں۔ اور ان کو سب وشتم کرتے ہیں۔ افترا پردازی وبہتان تراشی کرتا ہے۔ یا وہ شیعوں کے عقائد واعمال سے ناواقف ہے (تحفہ کوکب دری)

فی البدایۃ انھا واجبۃ من الاوثان الاربعۃ یغوث ویعوق ونسر وھبل ومن الانداد الاربع	برأت کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ چار بتوں سے برأت واجب ہے اور وہ یہ ہیں۔ یغوث۔ یعوق۔ نسر اور ہبل۔ اسی طرح ان چار اصنام سے بھی بیزاری لازم ہے۔ جنہیں خدا کا مثل سمجھا جاتا ہے۔

صحابہ رسولؐ میں ہر قسم کے لوگ موجود تھے

ہاں چونکہ کتب سیر و تواریخ بلکہ خود قرآن کریم اور احادیث سید المرسلین سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رسولؐ میں کچھ قاتل کچھ مقتول کچھ ظالم۔ کچھ مظلوم۔ کچھ عادل اور کچھ غیر عادل کچھ مؤمن کچھ منافق کچھ ثابت و مستقیم اور کچھ مذبذب و مرتاب غرض کہ اصحاب رسولؐ میں ہر قسم وقماش کے لوگ موجود تھے۔ خلاصہ یہ کہ شیعہ مذہب اس بات کا قائل ہے۔ کہ ان مختلف طبقات کو ایک نگاہ سے دیکھنا اور سب کو "عدول" اور سب کو "کالنجوم" قرار دینا۔ سب سے یکساں محبت و مودت کرنا سب کو اپنا پیر و مرشد جاننا عقل سلیم و طبع مستقیم پر ظلم عظیم اور قواعد شرعیہ پر جور جسیم ہے۔ بقول جامی

ع ہر کہ روئے بہبود نداشت ۔ دیدن روئے نبی سود نداشت

بعض منصف مزاج علماء اہل سنت کو بھی بادل نخواستہ ان حقائق کا اقرار کرنا پڑا ہے چنانچہ علامہ تفتازانی شرح مقاصد میں تحریر فرماتے ہیں۔ وما وقع بین الصحابۃ من المحاربات والمشاجرات علی الوجہ المسطور فی کتب التواریخ والمذکور علی السنۃ الثقاۃ یدل لظاھرہٖ علی ان بعضھم قد حاد من طریق الحق وبلغ حد الظلم والفسق وکان الباعث علیہ الحقد والعناد والحسد واللداد وطلب الملک والریاسۃ والمیل الی اللذات والشہوات اذ لیس کل صحابی معصوماً ولا کل من لقی النبیؐ بالخیر موسوماً (شرح مقاصد ج ۲ ص۳۰۶ طبع استنبول) یعنی صحابہ میں جو جنگ وجدال اور مشاجرات واقع ہوئے۔ جیسا کہ کتب تواریخ میں اور قابل وثوق حضرات کی زبانوں پر مذکور ہیں۔ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بعض صحابہ راہ راست سے منحرف ہو گئے اور ظلم و جور اور فسق و فجور کی حد تک پہنچ گئے اور ان امور کا سبب باہمی کینہ وعناد اور حسد ولداد، طلب ملک و ریاست اور لذات و شہوات کی طرف میلان تھا۔ اس لئے کہ ہر صحابی معصوم نہیں ہوتا۔ اور ہر وہ شخص جس کو آنحضرتؐ کی ملاقات کا شرف حاصل ہے وہ خیر و خوبی کے ساتھ موسوم نہیں ہوتا۔ اسے کہتے ہیں۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کر بولے۔

ع خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں ۔ گفتہ آید در حدیث دیگراں

حدیث اصحابی کالنجوم وضعی ہے

انہی حقائق سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ حدیث جو برادران اسلامی کے ہاں بہت مشہور ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ بالکل جعلی و وضعی ہے۔ اور رُبّ شہرۃ لا اصل لہا کا مصداق ہے۔ کیونکہ ہر صحابی کی اقتدا باعث رشد و فلاح نہیں ہو سکتی چنانچہ

اللات والعزی ومنات وشعری ومتن عبدھم ومن جمیع اشیاعھم واتباعھم وانھم شرخلق اللہ وان

اور یہ ہیں۔ لات۔ منات۔ عزیٰ اور شعریٰ۔ نیز ان لوگوں سے بھی برأت وبیزاری اختیار کرنا واجب ہے۔ جو ان کی عبادت کرتے ہیں اور ان کے ہم پیالہ وہم نوالہ ہیں اور جو ان کے فرمانبردار ہیں۔ یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا لوگ بدترین خلائق ہیں۔

بعض علمائے اہل سنت نے بھی اس حدیث کی تضعیف کی ہے۔ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں لکھا ہے۔ ھذا الحدیث ضعیف ضعفہ آئمۃ الحدیث۔ یہ حدیث ضعیف ہے آئمہ حدیث نے اس کی تضعیف کی ہے۔ مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی نے رسالہ تحفۃ الاخیار میں متعدد جید علماء کے حوالے سے اس کا ضعیف بلکہ موضوع ہونا ثابت کیا ہے لکھتے ہیں "وجزم ابن حزم بانہ موضوع (فی رسالتہ الکبریٰ) وقال البزاز (فی الدین الخالص) لا یصح قال الذھبی ھی من الاحادیث الواھیہ۔ ابن حزم نے جزم ویقین کے ساتھ اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے اور بزاز نے کہا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے اور ذہبی نے کہا یہ احادیث واہیہ میں سے ہے۔ اگر بالفرض اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تو ماننا پڑے گا کہ اس سے مراد حضرت امیر المومنینؑ اور حضرت امام حسنؑ وحسینؑ اور دیگر آئمہ اہل بیتؑ ہیں۔ جو کہ شرف صحبت کے ساتھ ساتھ شرف قرابت سے بھی مشرف وممتاز ہیں۔ اور درجہ عصمت وطہارت پر فائز ہیں۔ اور نص آیت مودت ان کی مودت واجب ولازم ہے (اس پر ہم نے مفصل بحث اپنی کتاب تحقیقات الفریقین فی حدیث الثقلین میں کی ہے) اسی لئے علامہ تفتازانی نے یہاں تک لکھ دیا ہے والجزم بالعدالۃ یختص بمن اشتھر بطول الصحبۃ علی طریق التبع والاخذ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والباقون کسائر الناس فیھم عدول وغیر عدول الخ یعنی صرف انہی صحابہ کی عدالت کا یقین کیا جا سکتا ہے۔ جو طول صحبت رسول میں مشہور ہیں۔ اور اس دوران میں آپ کا اتباع اور آپ سے کسب فضائل کرتے رہے ہیں۔ باقی صحابہ ایسے ہیں جیسے عام لوگ کہ ان میں کچھ عادل ہیں۔ اور کچھ غیر عادل مزید برآں اس بیان حقیقت ترجمان سے "الصحابۃ کلھم عدول" والے نظریہ کا بطلان بھی واضح وعیاں ہو جاتا ہے۔ تفصیل کے شائقین سنی اہل قلم جناب حافظ علی بہادر صاحب دہلوی کی کتاب "صحابیت" کا مطالعہ فرمائیں۔ ان حقائق سے معلوم ہو گیا کہ صحابہ میں ہر قسم کے لوگ تھے اور اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ عالم وجاہل۔ ظالم ومظلوم۔ عادل وفاسق۔ صالح وطالح برابر نہیں ہو سکتے۔ ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون۔ اسی لئے مذہب شیعہ سب کو برابر نہیں سمجھ سکتا۔ اصحاب رسولؐ میں سے جو لوگ آنحضرتؐ کی اتباع میں پورے اترے اور آپ کے انتقال کے بعد رشد وہدایت کا مرکز اہل بیت نبوت کو قرار دیا۔ اور ان کی محبت ومودت

لا یتم الاقرار باللہ و برسولہ و بالائمۃ المعصومین الا بالبرائۃ من اعدائہم و اعتقادنا

خدا کی وحدانیت رسولؐ اللہ کی رسالت اور آئمہ معصومیؑن کی امامت کا اقرار اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے دشمنوں سے مکمل برائت و بیزاری اختیار نہ کی جائے

اختیار کر کے اجرِ رسالت اُدا کیا۔ ہم ایسے اصحاب کی خاک پا کو اپنے لئے طوطیائے چشم بنانے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ مگر جنہوں نے آپ کی کامل اتباع نہ کی۔ اور آپ کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد مرکزِ رشد و ہدایت سے علیحدہ ہو گئے۔ ود ائع نبوت کو ضائع کر دیا۔ آلِ محمدؐ کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا۔ ان پر ظلم و ستم کئے۔ ہم ان سے بیزاری کو واجب و لازم سمجھتے ہیں۔ ؎

ان کان ذنبی حب آل محمدؐ - فذلک ذنب لست منہ اتوب

منکرین امامت آئمہ اطہار کا انجام

اس سلسلہ میں حضرت مصنف علامؒ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ کی امامت کا منکر گویا تمام انبیاء کی نبوت کا منکر ہے۔ یہ امر دلائل عقلیہ و نقلیہ کی روشنی میں واضح ہے۔ بعض سابقہ ابواب میں اس امر پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ کہ خداوندِ عالم نے انبیاء کو اس وقت تک مرتبۂ نبوت و رسالت پر فائز نہیں فرمایا۔ جب تک ان سے اپنی توحید اور کار ختمی مرتبتؐ کی رسالت اور آئمہ اہل بیتؑ کی خلافت کا اقرار نہیں لے لیا۔

اب اربابِ عقل و انصاف خود ہی بتائیں۔ کہ اگر کوئی شخص بظاہر انبیاء کی نبوت کا اقرار تو کرتا ہے۔ مگر ان آئمہ اطہار کی امامت کا انکار کرتا ہے۔ جن کے طفیل انبیاء کو خلعتِ نبوت عطا ہوئی تھی۔ تو اس کے اس اقرار کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ اسی لئے جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ جو میرے اوصیاء کی امامت کا انکار کرے گا وہ اس شخص کی مانند ہے جو تمام انبیاء کی نبوت کا منکر ہے۔ جیسا کہ اس قسم کی متعدد روایات رسالہ میں درج ہیں۔ اور تفصیل سابع بحار الانوار میں موجود ہے چونکہ یہ بزرگوار ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اس لئے بعض کا اقرار اور بعض کا انکار متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی بناء پر معصومین علیہم السلام نے فرمایا ہے۔ من انکر واحد امنا فقد انکر کلنا جو ہم میں سے کسی ایک کا انکار کرے وہ ایسا ہے۔ جیسے اس نے ہم سب کا انکار کیا ہو۔ (سابع بحار الانوار و بصائر الدرجات وغیرہ) مخفی نہ رہے کہ ان احادیث میں منکرِ امامت آئمہؑ کو جو منکر انبیاء کی مثل قرار دیا گیا ہے اس سے بظاہر آخرت میں سزا کے سلسلہ میں شباہت مراد ہے نہ کہ دنیا میں ظاہری حکم نجاست وغیرہ کیونکہ عند المشہور خصوصاً متاخرین کے نزدیک منکرین امامت آئمہ علیہم السلام پر اسلام کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ فعلا تغفل۔ نیز اس بیان حقیقت ترجمان سے یہ حقیقت بھی واضح و عیاں ہو جاتی ہے کہ چہار امامی ہوں یا شش امامی وغیرہ ہمارے نزدیک یہ اور تمام آئمہؑ کی امامت کے منکر ایک جیسے ہیں۔

فی قتلة الانبیآء وقتلة الائمة المعصومین انھم کفار مشرکون مخلدون فی اسفل درک

انبیاء و مرسلین اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے قاتلوں کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ لوگ کافر اور مشرک ہیں۔ جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں دائمی عذاب الٰہی میں گرفتار رہیں گے۔

اہل بیت رسولؐ کے ساتھ امت کا سلوک

مگر افسوس بجائے اس کے کہ امت رسول آئمہ اہل بیتؑ کی خلافت و امامت کو تسلیم کرکے اپنے لئے رشد و ہدایت کی شمعیں روشن کرتی۔ اور نجات دارین کے اسباب مہیا کرتی۔ الٹا اس نے اہل بیت رسولؐ پر مصائب و آلام کے پہاڑ ڈھانے شروع کر دیئے اور ان کی شمعہائے حیات کو گل کرنا شروع کر دیا اور ان پر اس قدر ظلم و ستم کئے۔ کہ جناب سیدہ عالم سلام اللہ علیہا کو کہنا پڑا۔ ؎

صبت علی مصائب لو انھا - صبت علی الایام صرن لیالیا

اور سردار اہل بیتؑ نے مصائب و شدائد کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔ اری تراثی نھباً وفی العین قذی وفی الحلق شجی" (نہج البلاغہ) میں دیکھ رہا تھا کہ میری میراث (خلافت) لوٹی جا رہی تھی (شدت رنج و تکلیف کی وجہ سے میری یہ کیفیت تھی کہ جیسے) آنکھ میں کانٹا اور حلق میں ہڈی اٹکی ہوئی ہو۔ جناب امام زین العابدینؑ نے تو مظالم امت سے متاثر ہو کر یہاں تک فرمایا۔ ؎

اقاد ذلیلاً فی دمشق کانی - من الزنج عبد غاب عنه نصیر (نفس المہموم)

مجھے شام میں اس طرح ذلت کے ساتھ پھیرایا جا رہا ہے۔ جیسے کسی حبشی غلام کو پھرایا جاتا ہے۔ جس کے یار و انصار غائب ہوں۔ اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود باعلام الٰہی ان تمام مصائب و نوائب کا علم تھا۔ جو ان کی عترت اطہارؑ پر وارد ہونے والے تھے۔ انہوں نے ان حالات کی ان کو اطلاع بھی دے دی تھی۔ اور ان کو صبر و شکیبائی اختیار کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ چنانچہ کنز العمال ج ۶ صفحہ ۱۸۶ خصائص کبریٰ سیوطی ج ۲ صفحہ ۱۱۹ صواعق محرقہ صفحہ ۱۴۳ پر مرقوم ہے۔ یہ الفاظ خصائص کے ہیں۔ اخرج الحاکم وابو نعیم عن ابن مسعود واخرج الحاکم عن ابی سعید الخدری قال رسول اللہ انا اھل بیت اختار اللہ لنا الاخرۃ علی الدنیا و اھل بیتی سیلقون بعدی بلاءً وتطریداً وتشریداً۔ فرمایا ہم وہ خانوادہ ہیں۔ کہ خدا نے ہمارے لئے دنیا کی بجائے آخرت کو اختیار فرمایا ہے۔ میرے اہل بیتؑ میرے بعد آزمائش، مصیبت، در بدری جلاوطنی وغیرہ مصائب سے دو چار ہوں گے اور جناب امیر المومنینؑ کو خصوصی وصیت فرمائی تھی کہ ان جانگسل حوادث و سوانح میں صبر و شکیبائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور تلوار نہ اٹھائیں۔ چنانچہ معارج النبوۃ رکن رابع صفحہ ۲۰ و روضۃ الاحباب ج ۱ صفحہ ۳۹۲ پر مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت امیرؑ کو فرمایا۔ اے علیؑ اول کسے کہ بر لب کوثر بمن رسد تو باشی۔ بعد از من بسیاری

من النار ومن اعتقد بهم غير ما ذكرناه فليس عندنا من دين الله في شيء۔

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے۔ جو شخص اس کے علاوہ کچھ اور عقیدہ رکھے۔ وہ ہمارے نزدیک دین خدا سے کچھ بھی حصہ نہیں رکھتا۔

از مکروہات بتو خواہد رسید باید کہ دل تنگ نگردی و دست در عروہ وثقیٰ تحمل زدہ طریق صبر پیش گیری و چوں بینی کہ دنیا مرتقی و مختار خلق گردد باید کہ تو آخرت را اختیار کنی۔ یا علیؑ! تم سب سے پہلے حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچو گے۔ میرے بعد تمہیں بڑے مصائب و آلام در پیش آئیں گے ان سے دل تنگ نہ ہونا اور نہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا اور جب دیکھو کہ لوگوں نے دنیا کو اختیار کر لیا ہے تم آخرت کو اختیار کرنا۔

منقلبین کے ساتھ حضرت کے جنگ نہ کرنے کی وجہ

وفاتِ رسولؐ کے بعد ابتدائی دور میں اگرچہ اس خاندان پہ رنج والم کے کوہائے گراں ڈھائے گئے۔ مگر سردار اہل بیتؑ نے کبھی بھی دامن صبر کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اور تلوار نہ اٹھائی۔ اس کا ایک بڑا سبب تو آنحضرتؐ کی یہی وصیت تھی۔ جس کی تعمیل آنجنابؑ پر لازم تھی۔ اور دوسرا سبب وہ تھا جس کا ذکر آپ کے کلام (نہج البلاغۃ) میں بار بار آتا ہے۔ کہ اس وقت دین کی بقا آپ کے جنگ نہ کرنے میں مضمر تھی۔ اگر آپ اس وقت تلوار اٹھاتے تو مرکز اسلام خانہ جنگی کا شکار ہو جاتا اور دشمنانِ اسلام کو اس کی بیخ کنی کرنے کا بہترین موقعہ ہاتھ آجاتا۔ ظاہر ہے کہ حضرت امیرؑ جیسے محبِ و محافظ اسلام کے لئے ایسا موقع فراہم کرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس محافظِ اسلام نے بقائے دین کی خاطر سب مصائب و آلام جھیل لئے مگر جنگ نہ کی۔ تفصیل کیلئے ہماری کتاب اثبات الامامت کی طرف رجوع کیا جائے۔

حضرت علیؑ سے جنگ کرنا رسول اسلامؐ سے جنگ کے مترادف ہے

چونکہ جناب امیر علیہ السلام بنصِ قرآن نفسِ رسولؐ ہیں۔ (وانفسنا وانفسکم) اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک بزرگوار کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا وہی سلوک دوسرے کے ساتھ متصور ہوگا۔ اس کی تائید مزید ان احادیث نبویہؐ سے ہوتی ہے۔ جو کتبِ فریقین میں موجود ہیں۔ جن میں سے بعض فنی رسالہ میں بھی مذکور ہیں۔ یہاں بالاختصار مزید دو چار روایات کتبِ اہل سنت سے پیش کی جاتی ہیں۔ صواعق محرقہ ص١٢١ طبع جدید نیز تاریخ الخلفاء ص١٣٣ طبع جدید۔ میں آنحضرتؐ کی یہ احادیث مرقوم ہیں۔ من سب علياً فقد سبني ومن ابغض علياً فقد ابغضني۔ علي مع القرآن والقرآن مع علي۔ جس نے علیؑ کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی۔ اور جس نے علیؑ کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔ علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔ انہی صواعق محرقہ کے ص١٢١ پر آنحضرتؐ سے منقول ہے فرمایا من آذیٰ علياً فقد آذاني ومن اذاني فقد آذى الله

جس نے علیؑ کو اذیت دی۔ اس نے مجھے اذیت دی۔ اور جس نے مجھ کو اذیت دی اس نے خدا کو اذیت دی (مشکوٰۃ صفحہ ۵۶۲ صواعق محرقہ صفحہ ۱۸۵ وغیرہ کتب میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد موجود ہے۔ قال لعلی وفاطمۃ والحسن والحسین انا حرب لمن حاربہم وسلم لمن سالمہم جناب نے پنجتن پاک کے حق میں فرمایا جو ان سے جنگ کرے گا۔ اس کی مجھ سے جنگ ہوگی۔ اور جو ان سے صلح کرے گا۔ اس کی صلح مجھ سے ہوگی۔

مگر افسوس امت نے ان ارشادات نبویؐ کی اس طرح تعمیل کی قریباً اسی نوے برس تک منبروں پر حضرت علیؑ پر سب وشتم کیا۔ چنانچہ کتب سیر وتواریخ اس واقعہ ہائلہ کے ذکر سے لبریز ہیں۔ تاریخ الخلفاء سیوطی صفحہ ۲۴۳ طبع جدید مصر پر لکھا ہے۔ کان بنو امیۃ یسبون علی بن ابی طالبؑ فی الخطبۃ۔ بنی امیہ خطبوں میں حضرت علیؑ پر سب وشتم کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مولانا شبلی نعمانی ایسے متعصب مؤرخ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ وہ سیرت النبیؐ ج ۱ صفحہ ۶۶ پر لکھتے ہیں۔ "حدیثوں کی تدوین بنو امیہ کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے پورے ۹۰ برس سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آل فاطمہؑ کی توہین کی۔ اور جمعہ میں سر منبر حضرت علیؑ پر لعن کہلوایا۔ سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں"۔ حالانکہ پیغمبر اسلام کی یہاں تک تہدید ووعید موجود تھی۔ من سب اھلبیتی فقد خرج من الاسلام ومن اذانی فی عترتی فعلیہ لعنۃ اللہ (صواعق محرقہ صفحہ ۱۴۳ طبع قدیم) جو شخص میرے اہل بیتؑ پر سب وشتم کرے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور جو شخص مجھے میرے اہل بیتؑ کے بارے میں اذیت دے گا اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔

قاتلین انبیاءؑ وآئمہؑ کا کفر

اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ان کے ساتھ جنگ وجدال کیا گیا۔ اور شمشیر جفا یا زہر دغا سے ان کی شمع حیات کو گل کیا گیا۔ قرآن مجید میں عام مؤمن کے قتل کی سزا۔ دائمی عذاب جہنم۔ قہر وغضب خداوندی اور لعنت ایزدی ہیں گرفتاری قرار دی گئی ہے ارشاد قدرت ہے من قتل مؤمنا متعمداً فجزائہ جہنم خالداً فیہا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعد لہ عذاباً عظیما (پ ۵ س نساء ع ۱۰) ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ گناہ وجرم کی نوعیت زمان ومکان اور افراد واشخاص کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ جس کی تفصیلات میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ بنابریں انبیاءؑ وآئمہؑ کے قتل کی نوعیت عام اہل ایمان کے قتل سے یقیناً جداگانہ ہوگی۔ اسی لئے شریعت مقدسہ میں قتل نبیؐ وامامؑ کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا قاتل نبی وامام اگر اس جرم شنیع کے ارتکاب سے پہلے تام نہاد مسلمان بھی ہو تو بعد از اں مرتد فطری بن جائے گا اور اگر توبہ کرے تو بوجہ ارتداد وعدم توفیق اس کی توبہ کے قبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واللہ الموفق۔

افضلیت جناب سیدہ برزنان عالمیان

کتب فریقین میں متعدد ایسی روایات معتبرہ موجود ہیں۔ جن سے جناب مخدومہ کونین حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

کی تمام عالمین کی عورتوں پر افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ بعض احادیث میں وارد ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا فاطمۃ سیدۃ نساء اھل الجنۃ۔ میری بیٹی فاطمہؑ تمام جنت والی عورتوں کی سردار ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۵۷۶ ، ۵۶۹ صواعق محرقہ صفحہ ۱۸۵ طبع جدید) بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں۔ فاطمۃ سیدۃ نساء العالمین۔ میری بیٹی فاطمہؑ تمام عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں۔ (ارجح المطالب بحوالہ مستدرک حاکم)

کتاب الشرف المؤبد لآل محمد مطبوعہ مصر میں یہ تتمہ بھی مروی ہے۔ کہ جب آنحضرتؐ نے یہ فرمایا کہ میری بیٹی تمام زنانِ عالمین کی سردار ہے تو بعض صحابہ نے عرض کیا فاین مریم بنت عمران یا رسول اللہ یا رسول اللہ اگر آپ کی دختر نیک اختر تمام زنانِ عالم کی سردار ہیں تو پھر جنابِ مریم بنتِ عمران کیا ہوئیں؟ (جن کے متعلق ارشاد قدرت ہے۔ ان اللہ اصطفاک وطھرک واصطفاک علی نساء العالمین) فرمایا ھی سیدۃ نساء عالمھا وابنتی سیدۃ نساء العالمین من الاولین والاخرین ''وہ جناب مریم فقط اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار تھیں۔ مگر میری بیٹی تمام اولین و آخرین کی عورتوں کی سردار ہیں''۔ اسی طرح متعدد روایات کتبِ فریقین میں مروی ہیں جن سے یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ مخدومہ کونین نساء العالمین سے افضل و برتر ہیں۔ جیسے آنحضرتؐ کا یہ ارشاد ابنتی فاطمۃ سیدۃ نساء اھل الجنۃ (مشکوٰۃ وغیرہ) میری بیٹی فاطمہؑ تمام زنانِ جنت کی سردار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان جنت میں جانے والی مخدرات میں جنابِ حواؑ و مریمؑ و آسیہؑ وغیرہا من خیرۃ النساء بھی داخل ہیں۔ اور ان سب کی سردار جنابِ سیدہؑ ہیں۔ بعد ازیں بھی بعض معاندین کا بعض ازواجِ رسولؐ کو جنابِ سیدہ کے بالمقابل پیش کرنا یا ان کو حضرت سیدۂ عالم سے افضل قرار دینا خدا اور رسولؐ کی تکذیب اور اپنی ناصبیت وخارجیت کا مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ زنانِ عالم تو بجائے خود سرکارِ دو عالم کے ارشاد لو لم یکن علیؑ لما کان لابنتی فاطمۃ کفو ادم ومن دونہ (بحار الانوار ارجح المطالب بحوالہ کتبِ متعددہ) سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ انبیاء ماسلف بھی مقامِ فضیلت میں جنابِ سیدہؑ کے بالمقابل نہیں کھڑے ہو سکتے۔ باقی رہیں یہ احادیث کہ جنابِ سیدہؑ کی خوشنودی خدا و رسولؐ کی خوشنودی ہے۔ اور ان کی ناراضی خدا اور رسولؐ کی ناراضی ہے۔ یہ تمام احادیث برادرانِ اسلامی کی کتبِ صحاح ستہ کے ابوابِ مناقبِ اہلبیتِ النبیؐ میں مذکور ہیں۔ لہٰذا ان احادیث کی صحت میں کوئی مسلمان شک نہیں کر سکتا۔ یہ احادیث جہاں عمومی طور پر جنابِ سیدۂ عالم کی عظمتِ شان و

جلالتِ مکان پر دلالت کرتی ہیں۔ وہاں ان سے خصوصی طور پر ان کی عصمت وطہارت پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ آیتِ تطہیر اور دیگر ادلۂ طہارت کے یہ احادیث بجائے خود اس معصومہ کی عصمت وطہارت کی ایک مستقل دلیل ہیں۔ کیونکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جس ذات کی ہر حال میں خوشنودی خدا اور رسولؐ کی خوشنودی اور ناراضی ہر حال میں خدا اور رسولؐ کی ناراضی ہو۔ یہ شرف سوائے معصوم ذات کے کسی اور کے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ معصوم ہی کی شان ہے۔ کہ جس کا ہر حال میں ہر قول و فعل منشائے خدا و رسولؐ کے عین مطابق ہو۔

مسئلہ فدک پر مختصر تبصرہ

مگر افسوس امتِ رسولؐ نے اس معصومہ بی بی کی قدر نہ کی۔ آیتِ مبارکہ وآت ذالقربیٰ کے نزول کے بعد جنابِ رسولِ خدا نے فدک جناب سیدہ کو مرحمت فرما دیا تھا۔ جیسا کہ در منثور ج ۴ ص۱۷۷ شرح مواقف ص۷۳۵ صواعق محرقہ ص۲۱ کنز العمال ج ۲ ص۱۵۸ مستدرک الحاکم ص۱۸۶ میں مذکور ہے۔ مگر بخاری و مسلم وغیرہ کی روایات شاہد ہیں۔ کہ جب جنابِ سیدۂ عالم نے مسلمانوں کے پہلے خلیفہ کے دربار میں اپنا قضیۂ ہبۂ فدک پیش کیا۔ تو دربارِ خلافت سے نفی میں جواب ملا۔ فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر ج ۸ ص۲۸۶ بذیل آیت فئے پر لکھا ہے کہ خلیفہ نے کہا۔ لا اعرف صحۃ قولک بی بی! تیرے دعویٰ کی صداقت معلوم نہیں (کتاب الکتفا مولفہ ابراہیم بن عبداللہ یمنی یمن ما نقل عنہ) کی روایت کے مطابق بی بی عالم نے اپنے دعویٰ کی صداقت پر جناب علیؑ مرتضیٰ، حسنین شریفینؑ اور جناب ام ایمن کو بطور گواہ پیش کیا۔ مگر عدالت نے حسنینؑ کو نابالغ، ام ایمن کو عورت اور علیؑ مرتضیٰ کو سیدہؑ کا شوہر ہونے کی وجہ سے ان کی شہادتوں کو مسترد کر دیا۔ (کذا فی الصواعق ص۳۱ والملل بتفاوت یسیر) بلکہ جنابِ سیدہؑ نے وہ وثیقہ بھی پیش کیا جو آنحضرتؐ نے ان کو ہبۂ فدک کے وقت لکھ کر دیا تھا۔ مگر اسے بھی قبول نہ کیا گیا (ملاحظہ ہو معارج النبوۃ رکن ۴ ص۲۱۱ طبع نولکشور، حبیب السیر ج ۱ ص۵ روضۃ الصفا ج ۲ ص۱۶۱ وغیرہ) جس پر جناب سیدۂ عالم نے اتمامِ حجت کے لئے اپنے دعویٰ کا عنوان بدل دیا۔ فرمایا اگر بطور ہبہ فدک مجھے نہیں دیتے تو بطور میراث ہی دے دو۔ کیونکہ میں بنتِ رسول ہونے کی وجہ سے ان کی واحد

وارث ہوں۔ مگر دربارِ خلافت والے جنہوں نے کل حسبنا کتٰب اللہ کا نعرہ بلند کیا تھا آج ایک جعلی حدیث نحن معاشر الانبیاء لا نورث ولا نورث ما ترکنا فهو صدقة کا سہارا لے رہے تھے۔ اور جنابِ سیّدہ یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین وغیرہ آیاتِ قرآنیہ تلاوت کر رہی تھیں۔ اہلِ دربار کا یہ رویہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ ان کا پہلا نظریہ غلط تھا۔ بلکہ اس سے صاف صاف عیاں ہو رہا تھا کہ ان کا کوئی اصول ہے ہی نہیں۔ جب احادیث کو اپنے خلاف پایا تو حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ بلند کر لیا۔ اور جب دیکھا قرآن سے مطلب برآری نہیں ہوتی تو احادیث (اگرچہ وضعی ہی کیوں نہ ہوں) کا سہارا لے لیا۔ بہرحال بخاری شریف پ ج ۲ ص ۹۱ طبع دہلی کے الفاظ ہیں ابیٰ ابوبکر ان یدفع الیٰ فاطمة شیئاً۔ ابوبکر نے کچھ بھی دینے سے صریح انکار کر دیا۔ اس سے جنابِ سیّدہ کو اس قدر اذیت و کوفت ہوئی کہ فوجدت ای غضبت علی ابی بکر وهجرته ولم تتکلمہ حتیٰ توفیت۔ جنابِ سیّدہ ابوبکر سے ناراض ہو گئیں اور ان سے سلسلہ کلام وغیرہ ترک کر دیا اور تا زیست اس پر قائم رہیں۔ اس روح فرسا حادثہ سے جنابِ سیّدہؑ کو کس قدر رنج و الم پہنچا۔ اس کا کچھ اندازہ آپ کے اس دردناک شعر سے ہوتا ہے جو آپ نے اپنے بابائے بزرگوار کو مخاطب کر کے کہا۔ ؎

صبت علی مصائب لو انها
صبت علی الایام صرن لیالیا

بابا مجھ پر اس قدر مصائب و آلام ڈھائے گئے کہ اگر یہ مصائب دنوں پر پڑتے تو وہ راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔ حتیٰ کہ بی بیؑ عالم اسی صدمہ میں رو رو کر اور گھل گھل آنحضرتؐ کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد پچھتر ۷۵ اور بروایتے پچانوے ۹۵ روز زندہ رہ کر انتقال فرما گئیں۔ د بخاری اور مسلم ج ۲ ص ۹۱ میں لکھا ہے کہ فلما توفیت دفنها زوجها علیٌ لیلاً ولم یؤذن بها ابابکر جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے شوہر علیؑ نے ان کو رات کے وقت دفن کیا اور ابوبکر کو اطلاع نہ دی۔ روضۃ الاحباب ص ۳۳۴ پر لکھا ہے۔ روز دیگر ابوبکر صدیق و عمر فاروق

باب الاعتقاد فی اٰباء النبیؐ

قال الشیخؒ اعتقادنا فیهم انهم مسلمون من اٰدم الیٰ ابیه

اُنتالیسواں باب (حضرت رسولِ خدا کے آباء و اجداد کے متعلق اعتقاد)

جناب شیخ ابوجعفرؒ فرماتے ہیں کہ ان بزرگواروں کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ کے والد جناب عبد اللہ تک سب کے سب مسلمان اور موحد تھے۔

یا علی کرم اللہ وجہہ معاتبہ می کردند کہ چوں مارا خبر نہ کردی تا شرف نماز بر وے دریافتمی۔ علی عذر گفت بنا بر وصیت او چنین کردم یعنی دوسرے روز ابوبکر و عمر صاحبان نے حضرت علیؑ سے شکایت کی کہ آپ نے ہمیں جناب سیدہ کی وفات کی اطلاع کیوں نہ دی۔ تاکہ ہم نماز جنازہ کا شرف حاصل کرتے۔ حضرت علیؑ نے عذرخواہی کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ان کی وصیت کے مطابق ایسا کیا ہے۔ ارباب انصاف بتائیں کہ جن لوگوں سے دخترِ رسولؐ اس قدر ناراض و نالاں ہوکر دنیا سے تشریف لے جائیں کہ ان کو اپنی نمازِ جنازہ میں شریک نہ کرنے کی وصیت فرمائیں تو ان کا انجام کیا ہوگا؟ بالخصوص جب کہ اس کے ساتھ آنحضرتؐ کی وہ فرمائشات بھی ملحوظ رکھی جائیں جو آپ نے جنابِ سیدہ کے حق میں فرمائی تھیں جو کہ بخاری وغیرہ میں موجود ہیں کہ فاطمة بضعة منی من اغضبها فقد اغضبنی ومن آذاها فقد آذانی۔ پھر خدا و رسولؐ کو اذیت دینے والوں کے متعلق یہ تہدیدِ الٰہی بھی پیشِ نظر ہے کہ ان الذین یؤذون اللہ و رسوله لعنهم اللہ فی الدنیا والاٰخرة واعدلهم عذابا مهینا (پ ۲۲ س احزاب ع ۴)

واقعۂ فدک وغیرہ پر مولوی نذیر احمد دہلوی کا تبصرہ

یہاں مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی حنفی مترجم قرآن کا وہ تبصرہ نقل کرنا فائدہ اور عبرت سے خالی نہیں ہے جو انہوں نے اپنی کتاب رویائے صادقہ صفحہ ۱۹۱ طبع چہارم میں وفاتِ رسولِ خدا کے بعد اہلبیتِ نبوی کے ساتھ امتِ رسولؐ کے ناروا سلوک پر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ جو شخص سب سے زیادہ پیغمبر صاحب کی وفات سے متاثر ہوا وہ جناب فاطمہؑ تھیں والدہ پہلے انتقال فرما چکی تھیں۔ اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب صلعم تھے اور باپ بھی کیسے باپ دین و دنیا کے بادشاہ ایسے باپ کا سر سے اُٹھ جانا اس پر حضرت علیؑ کا خلافت سے محروم ہونا نمک پر جراحت ترکہ پدری باغ فدک کا دعوےٰ کرنا اور مقدمہ ہار جانا کسی دوسرے کو لیجئے پیہم صدمات پہنچتے تو وہ زہر کھا کر مرجاتا۔ مگر ان کے صبر و ضبط اُن کے ہی ساتھ تھے پھر بھی انہی رنجوں میں گھل گھل کر چھ ہی مہینے کے اندر اندر انتقال فرما گئیں اور جتنے دن زندہ رہیں اُن لوگوں سے جنہوں نے رنج دیئے تھے نہ بولیں اور نہ بات کی یہاں تک کہ ان لوگوں کو اپنے

عبد اللہ وان اباطالب کان مسلماً و امہ آمنۃ بنت وھب کانت مسلمۃ وقال النبیؐ اخرجت	اسی طرح حضرت ابوطالبؑ مسلمان تھے اور جناب رسولِ خداؐ کی والدۂ گرامی حضرت آمنہ بنت وہب بھی مسلمان تھیں جناب رسول خداؐ فرماتے ہیں۔

جنازہ پر آنے کی مناہی کر دی اور شب کے وقت مدفون ہوئیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مانا کہ ان کا عقدہ کسی قدر بے جا بھی تھا (معاذ اللہ) تاہم ان کے باپ کے حقوق کیا چاہتے تھے۔ جنابِ فاطمہؑ کے دلِ غمزدہ کو خوش کرنے کے لئے جنابِ علیؑ کو اگر وہ اہل بھی نہ تھے برائے نام خلافت دے دی ہوتی اور آپ انتظام کیا ہوتا خیر خلافت تو کون دیتا مگر باغِ فدک کے دینے میں آخر کونسی قباحت تھی غایتہ ما فی الباب حدیث شریف نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکناہ صدقۃ کے خلاف ہوتا اگر گناہ ہوتا تو جنابِ فاطمہؑ کو ہوتا کہ وہ سیدانی ہو کر صدقہ کھاتیں سخت افسوس کی بات ہے کہ اہلبیت نبویؐ کو پیغمبر صاحبؐ کی وفات کے بعد ہی سے ایسے ناملائم اتفاقات پیش آئے کہ اُن کا وہ ادب اور لحاظ جو ہونا چاہیے تھا اس میں ضعف آگیا اور وہ شدہ شدہ منجر ہوا اس ناقابل برداشت واقعہ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے وہ ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے ہوئی ہے کہ اگر سچ پوچھو تو دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں ہیں۔ انتہی کلامہ

اُنتالیسواں باب اسلام آباء النبیؐ والوصیؑ کا بیان

مسئلہ اسلام آباء النبیؐ میں اختلاف

اس مسئلہ میں مسلمانوں کے اندر اختلافِ عظیم پایا جاتا ہے۔ اکثر اہلسنت والجماعت انبیاء کے آباء و اجداد کے کفر کے قائل ہیں۔ اور وہ اس سلسلہ میں مختلف اقاویل فاسدہ و تاویلاتِ کاسدہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بالخصوص جناب رسالتمآبؐ کے والدین شریفین اور جناب وصایت مآبؑ کے والد ماجد کے کفر صریح کے قائل ہیں۔ جیسا کہ فقہ اکبر مع شرح کے پر مذکور ہے و مات والدا رسول اللہ علی الکفر ومات ابوطالب علی الکفر یعنی جناب رسولِ خدا کے والدین اور جناب ابوطالبؑ کی بحالتِ کفر وفات ہوئی (معاذ اللہ) اسی طرح دیگر کتب میں ان کے ہاں اس امر کی تصریحات موجود ہیں مگر حضرات شیعہ خیر البریہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جناب رسولِ خداؐ کے والدین جناب علی مرتضیٰؑ کے والد ماجد بلکہ آدمؑ تک ان کے تمام آباء و اجداد نہ صرف مسلم موحد بلکہ بعض انبیاء اور بعض اوصیاء تھے۔ اسی طرح امہات کا سلسلہ بھی مسلمات بلکہ ... مؤمنات موقنات پر مشتمل ہے اور تمام انبیاء کے والدین

من نكاح ولم اخرج من سفاح	کہ میں حضرت آدمؑ سے لے کر اپنے والدین تک
من لدن آدم وقد ولدنی ابی	ہمیشہ بذریعہ نکاح پیدا ہوا ہوں نہ بذریعہ زنا۔

والدین مسلم و موحد ہوتے ہیں۔ بعض منصف مزاج علمائے اہلسنت بھی اس عقیدۂ صحیحہ میں شیعوں کے ہمنوا ہیں بہر حال یہ عقیدہ مذہب شیعہ کے مسلمات بلکہ ضروریات میں سے ہے۔ اسلام آباء النبیؐ اور اسلام ابوطالبؑ کے موضوع پر علمائے شیعہ اور بعض علمائے اہلسنت نے متعدد کتب و رسائل لکھے ہیں۔ جن میں عقلی و سمعی ادلۂ قاطعہ و براہین ساطعہ سے اس مطلب کو ثابت کیا ہے۔ ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہاں چند دلائل عقلیہ و نقلیہ پیش کرتے ہیں۔

اسلام آباء النبیؐ پر ادلۂ نقلیہ

پہلی دلیل:۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے وتقلبك فی الساجدین (سورۂ شعراء پ ۱۹ ع ۱۱) اے رسولؐ ہم ہمیشہ تجھے سجدہ کنندگان میں الٹتا پلٹتا دیکھتے آئے ہیں۔ علامہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر ج ۶ بذیل آیت مذکورہ اور تفسیر نیشاپوری میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد مذکور ہے۔ ولم یزل ینقلنی اللہ من اصلاب الطاھرین الی ارحام المطھرات حتی اخرجنی فی عالمکم ھذا۔ خداوند عالم ہمیشہ مجھے پاک صلبوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے تمہارے اس عالم آب و گل میں پیدا کیا۔ اسی طرح علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درّ منثور ج ۵ ص۹۸ پر اسی آیت کی تفسیر میں متعدد ایسے اخبار و آثار لکھے ہیں جن سے بالصراحت آباء النبیؐ کا اسلام و ایمان ثابت ہوتا ہے چنانچہ مجاہد سے اس آیت کے معنی نقل کئے ہیں قال من نبی الی نبی حتی اخرجت نبیا میں یکے بعد دیگرے انبیاءؑ کی صلبوں میں منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ نبیؐ بن کر دنیا میں آیا۔ اسی طرح ابن عباس سے بھی یہی معنی نقل کئے ہیں۔ قال ما زال النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم یتقلب فی اصلاب الانبیاء حتی ولدتہ امہ اور اس سلسلہ میں خود آنحضرتؐ کی ایک طویل حدیث نقل فرمائی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں لم یزل اللہ ینقلنی من الاصلاب الطیبۃ الی الارحام الطاھرۃ ہمیشہ خلاق عالم مجھے پاک صلبوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف منتقل کرتا رہا۔ اس سے بڑھ کر آباء النبیؐ کے اسلام و ایمان کی اور کیا صراحت ہو سکتی ہے۔ اگر معاذ اللہ اس سلسلہ میں کوئی ایک فرد بھی کافر ہوتا تو آپ اسے طیب و طاہر کے مقدس الفاظ کے ساتھ یاد نہ کرتے کیونکہ کافر و مشرک بموجب انما المشرکون نجس نجس اور ناپاک ہیں

دوسری دلیل

کتاب مودۃ القربیٰ وغیرہ میں یہ حدیث قدسی موجود ہے کہ ایک مرتبہ جبرئیل امین جناب ختمی مرتبتؐ پر نازل ہوئے اور کہا یا محمدؐ ان اللہ یقرئک السلام ویقول انی

عبد المطلبؑ کان حجت و ابا طالبؑ کان وصیہ۔	آنحضرت کے دادا جناب عبد المطلب حجتِ خدا تھے اور عمِ رسولؐ، جناب ابوطالب ان کے وصی تھے۔

قد حرمت النار علی صلب انزلک و علی بطن حملک و حجر کفلک قال یا جبرئیل بین لی ذالک قال اما الصلب الذی انزلک فعبد اللہ بن عبد المطلب و اما البطن الذی حملک فآمنہ بنت وھب و اما الحجر الذی کفلک فحجر ابی طالب بن عبد المطلب و فاطمہ بنت اسد۔ اے حبیبِ خدا محمدؐ! خداوند عالم تحفۂ درود و سلام کے بعد ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے آتشِ جہنم حرام کر دی ہے۔ اس پشت پر جس میں تو رہا اور اس شکم پر جس نے تجھے اٹھایا اور اس گود پر جس نے تیری کفالت و پرورش کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا جبرئیل اس کی وضاحت کرو۔ جبرئیل نے کہا صلب سے مراد حضرت عبد اللہ بن عبد المطلب۔ شکم سے مراد جناب آمنہ بنتِ وہب اور گود سے مراد حضرت ابوطالبؑ اور فاطمہ بنتِ اسد ہیں۔ یہی روایت ہماری کتب مثل معانی الاخبار ص۴۲ وغیرہ میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے۔

تیسری دلیل قرآنِ مجید شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو تعمیرِ کعبہ کا حکم ہوا اور انہوں نے اپنے فرزند جناب اسمٰعیل کے ساتھ مل کر اس فریضہ کو ادا کیا۔ عین اس وقت جب کہ مزدور مزدوری کا مستحق ہوتا ہے۔ ان دونوں باپ بیٹے نے بارگاہِ احدیت میں چند درخواستیں پیش کیں (۱) ربنا تقبل منا۔ بار الہا ہمارے اس عمل کو قبول فرما (۲) واجعلنا مسلمین لک ہمیں اپنا خالص مسلمان یعنی مطیع و منقاد بنا (۳) و من ذریتنا امۃ مسلمۃ لک ہماری ذریت میں ہمیشہ ایک امتِ مسلمہ قرار دے (۴) ربنا وابعث فیھم رسولا منھم۔ یا اللہ! اور اس امت مسلمہ میں سے ایک رسول مبعوث فرما (۵) وارنا مناسکنا اور ہمیں ہمارے مناسک و ارکان حج دکھا۔ خلیل الرحمٰن و ذبیح اللہ کی زبان حق ترجمان سے نکلی ہوئی دعائیں کس طرح مسترد ہو سکتی تھیں؟ فوراً بابِ اجابت سے ٹکرائیں اور قبولیت کا شرف حاصل کیا۔ ان مطالب کی تفصیل قرآن کے مختلف سور و آیات میں مذکور ہے اور یہ امتِ مسلمہ سوائے آنحضرتؐ کے آباو اجداد اور اُن کی ذریتِ طاہرہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کما لا یخفیٰ۔

یہ دلیل سابقہ دلیل کی طرح اگرچہ ہمارے دعویٰ (تمام انبیاءؑ کے آباء و امہات کے مسلمان و موحد ہونے سے خاص ہے۔ کیونکہ یہ فقط حضرت ابراہیمؑ تک جناب سرورِ کائنات کے سلسلۂ آباو اجداد کے اسلام پر دلالت کرتی ہے مگر ہم نے اس لئے اسے پیش کیا ہے کہ ہمارا اصل مقصد اس بحث میں جناب رسالتمآبؐ کے

والدین اور حضرت امیرالمومنینؑ کے والد ماجد کے اسلام و ایمان کا اثبات کرنا ہے اور یہ دلیلیں اس مطلب پر بطور نصِ صریح دلالت کرتی ہیں۔ حضرت خلیلؑ و ذبیحؑ کی یہ طویل استدعا چند امور کو متضمن ہے (اوّل) یہ کہ ذریت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا ایسا گروہ ہونا چاہیئے جس کا اسلام مجعول بجعلِ ایزدی ہو۔ جس سے ختمی مرتبت مبعوث ہوں (دوم) یہ کہ یہ مسلم گروہ زمانِ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے لے کر زمانِ بعثت رسول اکرمؐ تک برابر ہمیشہ موجود ہونا چاہیئے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں انقطاع واقع نہیں ہونا چاہیئے (سوئم) یہ کہ وہ آخری رسولؐ ذریتِ ابراہیمؑ سے ہونا چاہیئے (چہارم) یہ امتِ مسلمہ ایسی قدیم الاسلام ہونی چاہیئے کہ جن افراد کو آخری نبی دعوتِ اسلام دیں، تو وہ کہہ اٹھیں۔ وکنا من قبلہ مسلمین۔ ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں۔

اب اہلِ عقل و دانش بتلائیں وہ کونسا خاندان وگروہ ایسا تھا۔ جس سے آنحضرتؐ مبعوث برسالت ہوئے؟ اگر وہی لوگ حضرتِ خلیلؑ و ذبیحؑ کی دعاؤں کے مصداق نہیں تو پھر کون بزرگوار اس کے مصداق ہیں؟ نہیں نہیں سوائے آنحضرتؐ کے دودمان کے اور کوئی خاندان نہیں مل سکتا اور نہ کوئی ہو سکتا ہے۔ یہی امتِ مسلمہ ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت تک ملتِ ابراہیمؑ پر قائم تھی اور آپ کی بعثت کے وقت جو حضرات زندہ تھے وہ شریعتِ مصطفوی پر ایمان لائے اور یہ ایمان آوری معاذاللہ کفر سے اسلام کی طرف انتقال نہ تھا۔ بلکہ ملتِ ابراہیمؑ سے دینِ محمدیؐ کی طرف رجوع تھا۔ کما لایخفیٰ پس معلوم ہوا کہ یہ آیاتِ مبارکہ اسلام آباء النبی والوصی پر نصِ صریح ہیں۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور۔

چوتھی دلیل

یہ دلیل حضرت ابوطالبؑ کے اسلام کے ساتھ مختص ہے۔ مسلمانوں کی ذہنیت پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے خلفاء کے آباؤ اجداد کے کفر پر پردہ ڈالنے ان کی فضیحت کو ہلکا کرنے اور اپنے بزرگوں کی کمزور پوزیشن کو سہارا دینے کے لئے مربیِ رسولؐ و محسنِ اسلام یعنی جناب امیر علیہ السلام کے والد ماجد جناب ابوطالبؑ کی ردائے ایمان کو کفر کے بدنما دھبوں سے داغدار کرنے کی پوری پوری سعی نافرجام کی بلکہ ان کے سنانِ اقلام کے زخم آنحضرتؐ کے والدین شریفین تک بھی پہنچ گئے۔ لا شکر اللہ سعیھم اس کتاب میں اتنی گنجائش تو نہیں کہ آنجنابؑ کے اسلام کے مکمل دلائل پیش کئے جائیں۔ اس مطلب کے لئے تو ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ شائقین تفصیل اسنی المطالب فی نجات ابی طالبؑ یا شیخ الابطح یا انوار الواہب فی ایمان ابی طالب یا ابوطالبؑ مومن قریش وغیرہ رسائل وکتب کی طرف رجوع کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص تعصبؑ عناد کی پٹی آنکھوں سے اتار کر ابتدائے بعثت رسولؐ میں (جبکہ اسلام و مسلمان بالکل کمزور و ناتواں تھے) دینِ اسلام کو پروان چڑھانے اور جناب رسولِ خداؐ کی شر اعداء سے حفاظت کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابوطالبؑ کے مساعی جمیلہ کا سرسری نگاہ سے بھی جائزہ لے تو وہ آنجنابؑ کے ایمان میں ہرگز کسی قسم کا شک وشبہ نہیں

کر سکتا۔ بعض کوتاہ اندیش متعصب لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ شفقتِ عموی کا تقاضا تھا اس میں کوئی جذبۂ ایمانی کارفرما نہ تھا مگر بموجب دروغ گو را حافظہ نباشد۔ دروغ گو را پائے نباشد۔ وہ یہ بات کہتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے چچے مثل ابی لہب وغیرہ اور بھی تو تھے۔ اگر اس جد و جہد میں کوئی جذبۂ ایمانی کارفرما نہ تھا بلکہ صرف شفقتِ عموی کا تقاضا تھا تو دوسرے چچاؤں نے اپنے بھتیجے کی نصرت کیوں نہ کی جب کہ خونی رشتہ میں سب برابر تھے بلکہ اُلٹا ان کو اتنی اذیتیں پہنچائیں کہ قرآن کے پورے پورے سورے ان کی مذمت میں موجود ہیں۔ فطرت بتلاتی ہے کہ کوئی رشتہ دار جس قدر بھی عزیز کیوں نہ ہو تاہم وہ اپنی حقیقی اولاد سے زیادہ عزیز نہیں ہو سکتا مگر تاریخِ اسلام کے طالب علم جانتے ہیں کہ جناب ابی طالبؑ کی یہ حالت تھی کہ رسولؐ کے بستر پر اپنے بیٹوں کو لٹا دیتے تھے اور رسولؐ کو اپنے ہمراہ رکھتے تاکہ اگر خدانخواستہ کوئی دشمن قتلِ نبیؐ کے ارادہ سے آئے تو ابوطالبؑ کی اولاد قتل ہو جائے مگر محمدؐ پر کوئی آنچ نہ آئے۔ (سیرت حلبیہ و سیرۃ النبیؐ) کیا ایک بابصیرت انسان ان حقائق کو دیکھنے کے بعد یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہاں جسمانی رشتہ کے علاوہ کوئی ایسا ایمانی رشتہ کارفرما تھا جس کے سامنے اولاد بھی ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنابِ رسولِ خداؐ کو بھی حضرت ابوطالبؑ کی وفات حسرت آیات پر اس قدر رنج و الم ہوا کہ ان کے انتقال کے سال کا نام ہی عام الحزن رکھ دیا۔ ولنعم ما قال ابن ابی الحدید المعتزلی ؎

ولولا ابوطالبؑ و ابنہٗ   لما مثل الدین شخصًا فقاما

پانچویں دلیل

جنابِ ابوطالبؑ کے بکثرت ایسے اشعار ابدار کتبِ فریقین میں موجود ہیں جو ان کے کامل الاسلام والایمان ہونے پر صراحتاً دلالت کرتے ہیں۔ بطور نمونہ مشتے از خروارے۔ یہاں فقط چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ شائقین تفصیل ان کے مطبوعہ دیوان کی طرف رجوع کریں جو کہ مصر و عراق میں شائع ہو چکا ہے۔ کفار کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ ؎

الم تعلموا انا وجدنا محمدًا ۔ نبیًا کموسیٰ خط فی اول الکتب (مواہب لدنیہ وغیرہ)

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم نے محمدؐ کو ایسا ہی نبیؐ پایا ہے جیسے موسیٰ نبی تھے۔ اس کی نبوت پہلی کتابوں میں مذکور ہے

ولقد علمت بان دین محمد ۔ من خیر ادیان البریۃ دینًا مجھے یقین ہے کہ محمدؐ کا دین تمام ادیانِ عالم سے بہتر و برتر ہے۔ (دیوانِ ابوطالبؑ)

چھٹی دلیل

اہل بیتِ رسولؐ کا جنابِ ابوطالبؑ کے ایمان پر اجماع و اتفاق ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بنصِ آیتِ تطہیر و حدیثِ ثقلین تالیٔ قرآن اور معصوم و مطہر ہیں۔ اس لئے ان کا اجماع و اتفاق یقینًا صحیح و درست ہے۔ ان کے نظریات میں غلطی کا امکان ہی پیدا نہیں ہو سکتا لانہم مع القرآن والقرآن معہم علمائے اہلسنت نے بھی اہلبیتِ رسولؐ کے اس اجماع کا اعتراف کر لیا ہے۔ چنانچہ ابنِ اثیر جزری جامع الاصول

میں رقمطراز ہیں (علی ما نقل عنہ) واھل البیت یزعمون ان اباطالب مات مسلماً۔ اہل بیت نبوی کا خیال ہے کہ ابوطالبؑ کا بحالتِ اسلام انتقال ہوا اسی طرح صاحب سیرۃ علویہ نے لبقیۃ السلف عبدالسلام بن محمد کے متعلق انہوں نے لکھا ہے اتفق اھل البیتؑ علی ان اباطالب مات مسلماً یعنی تمام اہلبیتؑ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوطالب کا بحالتِ اسلام انتقال ہوا۔ یہاں گنجائش نہیں کہ تمام آئمہ اطہار کے ارشادات پیش کئے جائیں۔ ہاں تبرکاً فقط جناب امیرالمومنینؑ کا ایک ارشاد نقل کیا جاتا ہے۔ کتاب بشارت المصطفٰیؐ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ آنجنابؑ کوفہ کے محلہ رحبہ میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ ایک گستاخ کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ آپ تو اس مرتبۂ عظمیٰ پر فائز ہیں۔ اور آپ کا والد آتشِ جہنم میں گرفتار ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔ خدا تیرے منہ کو توڑے۔ مجھے اُس ذاتِ ذوالجلال کی قسم جس نے محمد مصطفٰیؐ کو صدق و راستی کے ساتھ درجۂ نبوت پر فائز کیا۔ میرے والد ماجد کا وہ مرتبہ ہے کہ اگر تمام گنہگاروں کے حق میں شفاعت کریں تو خداوندِ عالم ان کی شفاعت کو ضرور قبول فرمائے گا۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں قسیم الجنۃ والنار ہوں اور میرے والد بزرگوار جہنم میں ہوں۔ بروزِ قیامت سوائے خمسہ نجباء کے انوار کے باقی تمام انوار کو میرے والد کا نور ماند کر دے گا۔ مخفی نہ رہے کہ اہلبیتِ رسولؐ کا اتفاق فقط اسلام ابوطالبؑ پر ہی نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء و اوصیاء کے۔ آباؤ امہات کے اسلام پر بھی ہے لہٰذا ہمارے مدعا پر یہ خود ایک مستقل دلیل ہے۔

ساتویں دلیل جنابِ ابوطالبؑ کا وہ خطبہ جو آپؑ نے جناب خدیجۃ الکبریٰؑ کے ساتھ جناب رسولِ خداؐ کے عقدِ نکاح کے موقع پر پڑھا تھا۔ آپ کے اسلام و ایمان کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اس خطبۂ جلیلہ کے ابتدائی جملے یہ ہیں الحمد للہ الذی جعلنا من ذریۃ ابراھیم و زرع اسمعیل وجعل لنا بلداً حراماً وبیتاً محجوجاً وجعلنا الحکام علی الناس (الکامل للمبرد ج ۲ ص۲۵۲ طبع مصر) تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے ہمیں ذریتِ ابراہیمؑ و اسماعیل سے بنایا ہے اور ہمارے لئے بلدِ محترم (مکہ) اور وہ گھر مقرر کیا جس کی حج کی جاتی ہے نیز ہمیں تمام لوگوں کا حاکم و سردار بنایا۔

آٹھویں دلیل شیخ علی بن برہان الدین الحلبی الشافعی اپنی کتاب سیرت حلبیہ میں لکھتے ہیں عن مقاتل ان اباطالبؑ قال عند موتہ یا معشر بنی ھاشم اطیعوا محمداً وصدقوا ترشدوا یعنی جناب ابوطالبؑ نے اپنی وفات کے وقت بنی ہاشم کو وصیت فرمائی کہ اے بنی ہاشم! جناب محمدؐ کی اطاعت کرو۔ اور ان کی تصدیق کرو۔ رستگاری پا جاؤ گے۔ اس سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ جناب ابوطالبؑ آنحضرتؐ پر ایمان لا چکے تھے۔ ورنہ دوسروں کو یہ وصیت کس طرح کر سکتے تھے اور اگر بالفرض کرتے بھی تو وہ بموجب خود میاں فضیحت و دیگراں را نصیحت۔ اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

باب الاعتقاد فی التقیۃ

قال الشیخؒ اعتقادنا فی التقیۃ انہا واجبۃ من ترکہا کان بمنزلۃ من ترک الصلوٰۃ و قیل للصادقؑ

چالیسواں باب (تقیہ کے متعلق عقیدہ)

حضرت شیخ ابوجعفرؒ فرماتے ہیں کہ تقیہ کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ واجب ہے اور اس کا ترک کرنے والا تارکِ نماز کی مانند ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا۔

نویں دلیل | مورخ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ انہ اسلم کہ جناب ابوطالب اسلام لا چکے تھے۔

ادلۂ عقلیہ بر اسلام آباء النبیؐ | **پہلی دلیل:** اگر انبیاء کا (معاذ اللہ) کفار کے اصلاب اور کافرات کے ارحام میں رہنا تسلیم کر لیا جائے تو جب ان کے والدین بتوں کو سجدہ کریں گے تو ان کے سجدہ کے ضمن میں خود انبیاء کا بھی بتوں کو سجدہ کرنا لازم آئے گا۔ کیونکہ اولاد جزو والدین ہوتی ہے و یجعلون لہ جزءً اور یہ امر عصمت انبیاء کے منافی ہے۔

دوسری دلیل | اگر نبی و امام کافر مردوں کی پشت اور کافر عورتوں کے رحم میں رہیں تو علاوہ اس کے کہ ان کی عزت و عظمت مسلمانوں کے دلوں سے ساقط ہو جائے گی۔ خود انبیاء بھی والدین کے کفر و شرک سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ بنصِ قرآنی انما المشرکون نجس مشرک نجس و بنصِ آیت وان الشرک لظلم عظیم شرک ظلم عظیم ہے تو جو شرک ایسی نجاست و کثافت اور شرک ایسے ظلم عظیم سے متاثر ہو۔ وہ نبی بننے کی اہلیت نہیں رکھ سکتا۔ ولا ینال عھدی الظالمین۔

تیسری دلیل | قاعدہ کلیہ ہے کہ مظروف کے مطابق ظرف ہوتا ہے۔ پانی کا برتن اس کے حسب حال ہوگا اور دودھ کا ظرف اس کے موافق۔ سونا رکھنے کی ڈبیہ اور ہوگی اور لوہا رکھنے کی جگہ اور۔ جب یہ مسلّم ہے۔ تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ خدائے حکیم اپنے انبیاء و اوصیاء کے مقدس سلسلہ کو کفر و شرک کے ظروف میں رکھتے۔ غور طلب بات ہے کہ خدائے قدیر و حکیم یہاں مظروف کے مطابق پاکیزہ ظرف بنانے پر قادر تھا یا نہ؟ اگر یہ کہا جائے کہ پاکیزہ ظرف بنانے پر قادر نہ تھا۔ تو یہ امر اس کی قدرت کاملہ کے منافی ہے اور اگر قادر تھا مگر ایسا نہیں کیا تو یہ فعل اس کی حکمت کاملہ کے خلاف ہے فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ۔ اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے مظروف کے مطابق ظرف بنائے تھے۔

ازالۂ شبہ | بعض معاندین اس سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کے چچا آذر کی وجہ سے شبہ پیش کیا کرتے ہیں جیسے

يا ابن رسول الله انا نرى في المسجد من يعلن بسب اعدائكم و يسميهم فقال ما له لعنه الله يعرض بنا وقال الله لا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوًا بغير علمٍ و قال الصادق في تفسير

فرزندِ رسولؐ! ہم مسجد میں ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو کھلم کھلا آپ کے دشمنوں کا نام لے کر ان پر سب و شتم کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ اس ملعون کو کیا گیا ہے کہ وہ ہمیں معرضِ خطر میں ڈال کر لوگوں کو ہمارے خلاف برانگیختہ کرتا ہے۔ حالانکہ خداوندِ عالم کا ارشاد ہے جو لوگ خدا کے سوا کسی کو پکارتے ہیں (ان کے سامنے) ان کے معبودوں کو برا نہ کہو ورنہ یہ لوگ جہالت اور دشمنی کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کو برا کہنے لگیں گے۔ حضرت صادق علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کا "اب" کہا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں مورخین کا اختلاف ہے۔ تحقیقی قول یہ ہے کہ آزر آنجنابؑ کے چچا تھے چنانچہ اس سلسلہ میں بڑے بڑے مورخین کی تصریحات موجود ہیں۔ ہاں البتہ چچا اور تربیت کنندہ ہونے کی وجہ سے محاورۂ عرب کے مطابق ان کو اب (باپ) کہہ دیا گیا ہے لأن العم صنو الأب ورنہ ان کے والدِ حقیقی کا نام جناب تارخ تھا۔ زجاج کہتے ہیں لا خلاف بين النسابين ان اسمه تارخ۔ اہلسنت میں کوئی اختلاف نہیں کہ ان کا نام تارخ تھا۔ (تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی ج ۴ ص ۳۸ و تفسیر مظہری ج ۵ ص ۲۲۵) اسی امر پر مذہبِ شیعہ کا اتفاق ہے۔ لہٰذا یہ شبہ دلائلِ قطعیہ عقلیہ اور نقلیہ کے بالمقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

چالیسواں باب (تقیہ کا بیان)

تقیہ کے مفہوم کی تعیین اور اس کا اثبات

اس مقام پر حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ کا یہ ایراد کسی حد تک درست ہے کہ حضرت مصنف علامؒ کا کلام تقیہ کے متعلق (دیگر اکثر مسائل کی طرح) بہت مجمل ہے اس میں نہ تقیہ کے مفہوم و معنی بیان کئے گئے ہیں اور نہ ہی یہ تفصیل بیان کی گئی کہ تقیہ کہاں واجب ہے اور کہاں حرام۔ کہاں راجح ہے اور کہاں مرجوح؟ اس لئے ہم ذیل میں اس مسئلہ پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ تقیہ کے لغوی معنی ہیں۔ ڈر۔ خوف اور اصطلاح میں تقیہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی شرعی ضرورت مثل خوف عرض و ناموس اور خطرۂ مال وجان کے وقت حق کو پوشیدہ رکھ کر خلاف حق بات کا اظہار کرنا۔ یہ مسئلہ منجملہ ان مسائل کے ہے کہ جن کی وجہ سے مخالفین ہمیشہ اہل حق پر زبانِ طعن و تشنیع دراز

هذه الاية فلا تسبوهم فلا تهم يسبوا علیکم وقال الصادقؑ من سب ولی اللہ فقد سب اللہ و من سب اللہ اکبہ اللہ علی منخریہ فی نارِ جہنم قال النبیؐ لعلیؑ من سبک یا علیؑ فقد سبنی و من سبنی فقد سب اللہ والتقیۃ واجبۃ لا یجوز رفعہا الی ان یخرج القائمؑ فمن ترکہا قبل خروجہ فقد خرج عن دین اللہ تعالیٰ و عن دین الامامیۃ وخالف اللہ ورسولہ والائمۃ

ان لوگوں پر سب و شتم نہ کرو ورنہ یہ لوگ تمہارے علیؑ پر سب و شتم کریں گے۔ پھر فرمایا جو شخص ولی اللہ کو بُرا کہے۔ اس نے گویا خدا وندِ عالم کو بُرا کہا۔ اور جس نے خدا کو بُرا کہا خدا تعالیٰ اسے ناک کے بل آتشِ جہنم میں اوندھا ڈالدے گا۔ جناب رسولخداؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیر علیہ السلام سے فرمایا یا علیؑ! جو شخص تم پر سب کرتا ہے وہ مجھ پر سب کرتا ہے اور جو مجھ پر سب کرتا ہے وہ خدا پر سب کرتا ہے۔ تقیہ واجب ہے اور حضرت قائم آلِ محمدؑ کے ظہور تک اس کا ترک کرنا جائز نہیں جو شخص آپ کے ظہور سے پہلے تقیہ ترک کریگا وہ دینِ خدا یعنی مذہب امامیہ سے خارج ہو جائے گا۔ اور خدا و رسولؐ و آئمہؑ ہدیٰ کا مخالف متصور ہوگا۔

کرتے رہتے ہیں حالانکہ یہ ایک فطری امر ہے جسے بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ضعیف و کمزور انسان اپنی نگہداشت اور مال وجان کی حفاظت کے لئے ضرور عمل میں لاتا رہتا ہے و من یکن یکرھا باللسان و قلبہ مطمئن بالایمان اگر کمزور و ناتوان انسان بوقت ضرورت تقیہ سے کام نہ لیں تو وہ ختم ہو جائیں اسلام جو کہ دین فطرت ہے۔ اس کے متعلق یہ کس طرح متصور ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کے اس فطری حق کو اس سے سلب کرلے اور اس فطری تقاضے کو حرام قرار دے دے؟ یہی وجہ ہے کہ بانیٔ اسلام اور ان کے اوصیاء علیہم السلام نے تقیہ کو فقط جائز ہی نہیں بتایا۔ بلکہ اس کی اہمیت پر بہت کچھ زور بھی دیا ہے چنانچہ جناب امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ واللہ ما علی وجہ الارض من شیٔ احب الی من التقیۃ بخدا روئے زمین پر مجھے تقیہ سے زیادہ کوئی چیز بھی محبوب نہیں ہے۔ (اصول کافی) بلکہ یہاں تک فرمادیا کہ لا دین لمن لا تقیۃ لہ (اصول کافی) جس میں تقیہ نہیں اس میں کوئی دین نہیں ہے۔

تقیہ کے جواز پر آیاتِ متکاثرہ اور اخبار متظافرہ بلکہ متواترہ کتب میں فریقین میں موجود ہیں بنابر اختصار ہم ذیل میں چند آیات و اخبار پیش کرتے ہیں۔

جوازِ تقیہ کی پہلی آیت

ارشاد قدرت ہے۔ من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدراً فعلیہم

وسئل الصادق عن قول الله عزّ وجلّ ان اکرمکم عند الله اتقکم قال اعملکم بالتقیۃ وقد اطلق الله تبارک وتعالی اظهار موالاۃ الکافرین فی حال التقیۃ وقال عزّ وجلّ لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیآء من دون المؤمنین ومن یفعل ذالک فلیس من الله فی شیء الا ان تتقوا منهم تقٰۃ وقال الله عزّ وجلّ لا ینهٰکم الله عن الذین

قولِ خدا ان اکرمکم عند الله اتقاکم: خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مکرّم وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہے، کی تفسیر پوچھی گئی۔ فرمایا کہ "اتقاکم" سے مراد وہ شخص ہے جو تقیہ پر سب سے زیادہ عمل کرے۔ خدا نے تقیہ کی حالت میں کفار سے دوستی ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے، مومنین کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کفار کو دوست نہ بنائیں۔ اور جو ایسا کرے گا اسکو خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں اگر تم ان سے خوف رکھتے ہو تو فقط اظہارِ دوستی میں حرج نہیں ہے۔ نیز فرماتا ہے خدا نے تمہیں ان کافروں سے نیکی اور انصاف کرنے کی ممانعت نہیں کی۔

غضبٌ من الله ولهم عذابٌ عظیم (پ۱۴ س نحل ع ۲۰) اس شخص کے سوا (جو کلمۂ کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دلِ ایمان کی طرف سے مطمئن ہو) جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے بلکہ خوب سینہ کشادہ (جی کھول کر) کفر کرے تو ان پر خدا کا غضب ہے۔ اور ان کے لئے بڑا (سخت) عذاب ہے۔ (ترجمہ فرمان) اس آیتِ مبارکہ کے متعلق تمام مفسرینِ اسلام کا اتفاق ہے کہ جوازِ تقیہ پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی ج ۱ صـ۳۹۶ تفسیر کشاف ج ۲ صـ۲۴۵ طبع مصر۔ تفسیر کبیر ج ۵ صـ۳۵۵ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ کفار نے جناب عمار اور ان کے والدین شریفین (جناب یاسر و سمیّہ) کو گرفتار کر لیا۔ اور ان کو چند کلماتِ کفر کہنے پر مجبور کیا۔ جناب یاسر و سمیّہ کے انکار کرنے پر ظالموں نے ان کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا لیکن جنابِ عمارؓ نے وہ کلماتِ کفر کہہ کر اپنی جان بچا لی۔ بعض لوگوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں شکایت کی کہ عمار کافر ہو گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا اس طرح نہ کہو۔ عمار تو سر سے قدم تک ایمان سے لبریز ہے اور ایمان اس کے گوشت و پوست کے ساتھ مخلوط ہے۔ اس اثنا میں جناب عمار بھی با چشمِ گریاں و دلِ بریاں بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ آپ نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا (کوئی بات نہیں) ان عادوا لک فعد لهم بما قلت۔ اگر کفار دوبارہ تجھ سے یہی کلمات کہلوائیں۔ تو دوبارہ کہہ دینا۔ اس کے بعد یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ یہ آیتِ مبارکہ عند الضرورت ایمان کو قلب میں پوشیدہ رکھ کر بظاہر کلمۂ کفر کہنے کے جواز پر ایسی نصِ صریح ہے کہ کوئی کلمہ گوئے اسلام اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قاضی بیضاوی ج ۱ صـ۳۹۶ نے اسی کے ذیل میں لکھ دیا ہے وهو دلیل جواز التکلم بالکفر عند الاکراہ یعنی یہ اکراہ کے وقت کلمۂ کفر

لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولٓئک ھم الظالمون ۔

جو تمہارے دین کے معاملہ میں تم سے برسرپیکار نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ یقیناً خدا تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ہاں جن کافروں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی لڑی اور تمہیں گھروں سے نکالا یا تمہارے گھروں سے نکالنے میں دشمنوں کی مدد کی ان سے محبت کرنے کی خدا نے ممانعت فرمائی ہے جو شخص ان سے دوستی اور محبت رکھے گا وہ ضرور ظالم ہوگا۔

کہنے کے جواز کی دلیل ہے اور تفسیر جامع البیان، اکلیل اور معالم التنزیل میں بذیل ارشاد قدرت و قلبہ مطمئن بالایمان لکھا ہے۔ والاجماع علیٰ جواز کلمۃ الکفر عند الاکراہ۔ مجبوری کے وقت کلمہ کفر کہنے پر اجماع ہے۔ (ذلک النجاۃ)

دلیل دوم خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شئی الا ان تتقوا منھم تقاۃ ویحذرکم اللہ نفسہ والی اللہ المصیر (سورہ آل عمران پ ۳ ع ۱۱) مومنین کے لئے لازم ہے کہ مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں مگر جب کہ ان سے خوف و ڈر ہو۔ خدا تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور تمہاری بازگشت اسی کی طرف ہے۔ یہ آیت مبارکہ بطور نص صریح اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ کفار کی دوستی حرام ہے۔ ہاں جب ان سے جان و مال کا خوف دامن گیر ہو تو پھر ان کی عداوت کو پوشیدہ رکھ کر بظاہر ان سے اظہار محبت اور میل جول رکھنا جائز ہے۔ یہاں بالکل واضح اور صریح لفظ الا ان تتقوا منھم تقاۃ مذکور ہیں۔ قراء سبعہ میں سے یعقوب نے اس لفظ "تقاۃ" کو "تقیۃ" پڑھا ہے (بیضاوی ج ۱ ص ۲۰۰) نیز قتادہ اور ابو رجاء بھی اسے تقیۃ ہی پڑھتے تھے (تفسیر درّ منثور ج ۲ ص ۱۶) اس آیت مبارکہ کے ذیل میں قاضی بیضاوی نے ج ۱ ص ۱۱۲ طبع مصر پر لکھا ہے۔ منع عن موالاتھم ظاھراً وباطناً فی الاوقات کلھا الا وقت المخافۃ فان اظھار الموالاۃ حینئذ جائز یعنی خداوند عالم نے تمام اوقات میں ظاہراً و باطناً کفار کی دوستی کی ممانعت فرمائی ہے ہاں جب ان سے خوف (جان یا مال) ہو تو اس وقت ان سے اظہار محبت جائز ہے۔ (وکذا فی تفسیر معالم التنزیل)

اسی طرح تفسیر نیشاپوری ج ۳ ص ۱۷۸ مطبوعہ برحاشیہ تفسیر ابن جریر پر بھی حفظ جان و مال کے لئے تقیہ کو جائز بتلایا ہے۔ ومنھا انھا جائزۃ لصون المال علی الاصح کما انھا جائزۃ لصون النفس لقولہ صلی اللہ

قال الصادق انی لاسمع الرّجل فی المسجد وھو یشتمنی فاستر منہ بالساریۃ کیلا یرانی وقال الصادق خالطوا الناس بالبرّانیہ وخالفوھم بالجوانیۃ مادامت الاُمرۃ صبانیۃ وقال الصادقؑ ان الرّیا مع المؤمن شرک ومع المنافق فی دارہٖ عبادۃ

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ میں اپنے کانوں سے سنتا ہوں۔ کہ ایک شخص مجھے گالیاں دے رہا ہوتا ہے مگر میں اس خیال سے کہ وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ ستون کے پیچھے چھپ جاتا ہوں نیز آپؑ فرماتے ہیں جہاں تک ممکن ہو سکے۔ اپنے مخالفین سے ظاہر میں رواداری کرو اور ان سے میل ملاپ رکھو۔ مگر اندرونی طور پر ان کے مخالف رہو۔ فرمایا مومن سے ریا کاری کرنا شرک کے مترادف ہے اور منافق سے اس کے گھر میں ریا کاری کرنا بمنزلہ عبادت ہے۔

علیہ و آلہ وسلم۔ حرمۃ مال المسلم کدمہ" یعنی یہ ہے کہ جس طرح حفاظتِ جان کے لئے تقیہ جائز ہے اسی طرح حفاظتِ مال کیلئے

دلیلِ سوم خداوندِ عالم نے مومن آلِ فرعون کی مدح وثنا کرتے ہوئے فرمایا ہے وقال رجل مومن من الِ فرعون یکتم ایمانہ (سورہ مومن پ۲۴ ع ۹) آلِ فرعون میں سے ایک مردِ مومن نے کہا جو کہ اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا۔ خداوندِ عالم کا اس کے فعل (کتمانِ ایمان و اظہارِ کفر) کو مقامِ مدح میں بیان کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ ایسے حالات میں ایسا کرنا نگاہِ قدرت میں محبوب ومرغوب امر ہے۔ اگرچہ یہ شریعتِ موسوی کا واقعہ ہے مگر شریعتِ مصطفویؐ میں اس کی دلیل نسخ کا نہ ہونا اس کے بقاء ودوام کی بیّن دلیل ہے۔

دلیلِ چہارم فضیلتِ تقیہ کی جن اخبار کی وجہ سے مخالفین ہم پر زبانِ اعتراض دراز کرتے رہتے ہیں۔ ایسی روایات خود اُن کی کتب میں موجود ہیں۔ چنانچہ کنز العمال ج ۲ صفحہ ۹۶ پر مرقوم ہے۔ لا دین لمن لا تقیۃ لہ" جو شخص عند الضرورت تقیہ نہیں کرتا وہ بالکل بے دین ہے۔ لہٰذا جو اعتراض ہم پر کیا جاتا ہے وہی خود ان حضرات پر بھی عاید ہوتا ہے۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔ بخاری شریف ج ۲ صفحہ ۱۰۲۶ طبع دہلی پر تقاۃ کی تفسیر تقیہ کے ساتھ کرنے کے بعد لکھا ہے وقال الحسن التقیۃ الی یوم القیامۃ یعنی حسن بصری کہتے ہیں کہ تقیہ قیامت تک باقی ہے۔ لان حلال محمدؐ حلال الی یوم القیٰمۃ وحرامہ حرام الی یوم القیٰمۃ۔

دلیلِ پنجم دوسروں پر بوجہ تقیہ کذب بیانی کا الزام لگانے والے اگر اپنی کتب حدیث وفقہ کا مطالعہ کریں۔ تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کے مذہب میں عند الضرورت جھوٹ بولنا فقط جائز ہی نہیں۔ بلکہ واجب لکھا ہے چنانچہ علامہ نووی شرح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۶۶ پر لکھتے ہیں۔ وقد اتفق الفقہاء علی انہ لوجاء ظالم یطلب انساناً مختفیاً لیقتلہ؛ او یطلب ودیعۃ لانسان لیاخذھا غصباً سئل عن ذالک

و قالؑ من صلی معھم فی الصف الاول فکانما صلی مع رسول اللہ فی الصف الاول وقال عودوا مرضاھم واشھدوا جنائزھم وصلوا فی مساجدھم و قال کونوا لنا زینا ولا تکونوا علینا

نیز فرمایا جو شخص مخالفین کے ساتھ ان کی پہلی صف میں نماز پڑھے تو وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے جنابِ رسولِ خدا کے ساتھ صفِ اوّل میں نماز پڑھی ہو۔[1] آپ ہی سے منقول ہے کہ ان (مخالفین) کے بیماروں کی بیمار پرسی کیا کرو اور ان کے جنازوں میں شریک ہوا کرو اور ان کی مسجدوں میں نماز پڑھا کرو۔ نیز فرمایا ہمارے لئے باعثِ زینت بنو باعثِ ننگ و عار نہ بنو۔

وجب علی من علم ذالک اخفائہ وانکار العلم بہ وھذا کذب جائز بل واجب۔ یعنی فقہا کا اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی شخص چھپا ہوا موجود ہو اور کوئی ظالم اسے قتل کرنے کی غرض سے وہاں پہنچ جائے یا کسی شخص کی امانت کسی کے پاس پڑی ہو اور کوئی غاصب وہاں پہنچ کر اس سے سوال کرے کہ وہ انسان یا مالِ امانت کہاں ہے ؟ تو جسے بھی حقیقتِ حال کا علم ہو اس پر واجب ہے کہ اسے مخفی رکھے اور اپنی لاعلمی کا اظہار کرے۔ یہ جھوٹ جائز بلکہ واجب ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ تقیہ

---

[1] مخالفین کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت کے بارہ میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے ان کو شمار کیا تھا۔ ان کی تعداد تیس سے زائد تھی۔ ان اخبار کے متعلق علماء اعلام کے دو نظریے ہیں۔ اکثر علماء تو ان کو حالتِ تقیہ پر محمول کرتے ہیں کہ یہ حکم حالتِ تقیہ کے ساتھ مختص ہے اور بعض علماء مثلِ علّامِ ربانی مولانا شیخ یوسف البحرانی صاحب حدائق ناظرہ اور حضرت آقائے سید حسین بروجردی اعلی اللہ مقامہ : علی الاطلاق اس امر کو مستحب و مستحسن سمجھتے ہیں۔ و ھذا القول لا یخلو من القوۃ و لیس ھذا محل تحقیق ماھو الحق فی المقام۔ مگر یہ یاد رہے کہ اقتدا کی نیت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ہاتھ کھول کر اپنی علیحدہ اذان و اقامت کہہ کر ان کے ساتھ کھڑا ہو کر فرادیٰ نماز کی طرح قرأت وغیرہ ذکر خود انجام دے کر نماز کو ان کے ساتھ تمام کرنا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ بحسبِ صورت اقتدا اور باعتبارِ حقیقت فرادیٰ ہو۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ لوگوں سے میل ملاقات کی جائے۔ اور تعلقات بڑھائے جائیں کیونکہ آئمہ اطہار فرماتے ہیں۔ لوگوں کو اپنی طرف رغبت دلاؤ، نفرت نہ دلاؤ۔ اسی لئے ان حکماء اسلام نے فرمایا ہے کہ مخالفین کے مریضوں کی عیادت اور ان کے جنازوں کی مشایعت کرو۔ تاکہ ان سے تمہارے تعلقات خوشگوار ہوں اور اس طرح تبلیغ حق کا بہترین موقع ہاتھ آئے گا۔ یہی اسلام کا تقاضا ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من یدہ و لسانہ اللّٰھم وفق المسلمین للاتفاق والاتحاد۔ بجاہ النبی و آلہ الامجاد۔ منہ عفی عنہ۔

شیئاً وقال رحم اللہ امرأ احبنا الے الناس ولم یبغضنا الیھم وذکر القصاصون عند الصادقؑ فقال لعنھم اللہ انھم یشنعون۔

خدا اس شخص پر رحمت نازل فرمائے۔ جو مخالفین کے دلوں میں ہماری محبت پیدا کرتا ہے اور ہمیں ان کی نظروں میں دشمن نہیں بناتا۔ جناب امام جعفر صادقؑ کے سامنے قصہ گروں کا تذکرہ کیا گیا آپ نے فرمایا خدا ان پر لعنت کرے کہ یہ ہم پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔

عندالکل جائز ہے۔ اور سب اس پر عامل بھی ہیں۔ اگر کچھ اختلاف ہے تو فقط اس کے نام میں ہم اس کو تقیہ کہتے ہیں اور تنگ نظر مخالفین ہماری عند الضیح تقیہ کی بجائے کذب کہتے ہیں اور اسے نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار دے رہے ہیں۔ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے چنانچہ بعض منصف مزاج علمائے اہلسنت نے اس کی تصریح کی ہے۔ صاحب المفاتح الکافیہ سنہ ۱۹۰ طبع بمبئی پر لکھتے ہیں قلت اتفق اصحابنا علیٰ جواز الکذب عند الضرورة بل وللمصلحة وھو عین التقیہ لکن ان عبرت عنه بلفظ التقیة منعه کثیر منھم لکونه من تعبیرات الشیعة فالخلاف فیما بینھم لفظی واللہ اعلم یعنی میں کہتا ہوں ہمارے علماء (اہلسنت) کا اس پر اتفاق ہے کہ ضرورت بلکہ کسی مصلحت کے وقت بھی جھوٹ بولنا جائز ہے اور یہی بعینہٖ تقیہ ہے۔ ہاں البتہ اگر اسے لفظِ تقیہ کے ساتھ تعبیر کیا جائے تو بہت سے علماء نے اس کی مخالفت کی ہے کیونکہ یہ تعبیر شیعوں کے ساتھ مختص ہے۔ بنا بریں بظاہر یہ سب اختلاف لفظی ہے واللہ اعلم ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں فریقوں میں بظاہر لفظی اختلاف ہے (ایک فریق اسے تقیہ کہتا ہے اور دوسرا اسے جواز الکذب عند الضرورت سے تعبیر کرتا ہے) ورنہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے الحمد للہ علیٰ وضوح الحق ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

تقیہ پر بعض عائد شدہ شکوک و شبہات کے جوابات

مذکورہ بالا بیاناتِ شافیہ سے یہ امر محقق و مبرہن ہو چکا ہے کہ تقیہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو شیعوں کے ساتھ مختص ہو تاکہ اس پر عائد کردہ شبہات کی جوابدہی کا فریضہ ان پر عائد ہو بلکہ واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ مسئلہ مشترکہ ہے اور عندالضرورت سب اس پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ من اکرھا فقلہ الکرھا باللسان وقلبه مطمئن بالایمان۔ مگر تاہم چونکہ ہمیشہ تنگ نظر ملا ہمیں اس سلسلہ میں ملعون کرتے رہتے ہیں اور ابلہ فریبی کے لئے اس پر مختلف اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں اختصار کے

علینا و سئل الصادقؑ عن القصاص ایحل الاستماع لهم فقال لا و قال الصادق من اصغی الی ناطق فقد عبده فان کان الناطق عن الله فقد عبد الله وان کان

پھر آپ سے سوال کیا گیا کہ ایسے قصہ گویوں کے قصص وحکایات کو سننا جائز ہے؟ فرمایا ہرگز نہیں۔ نیز انہی حضرت سے مروی ہے فرمایا جو شخص کسی بات کرنے والے کی طرف کان لگا کر اس کی باتوں کو غور سے سنتا ہے تو گویا وہ اس کی عبادت کرتا ہے لہٰذا اگر بات کرنے والا خدا اور دینِ خدا کی باتیں کرتا ہے تو سننے والا خدا کا عبادت گذار ہوگا۔

جیسا کہ ہماری ہر ہر مسئلہ میں یہی روش ورفتار ہے۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب

تقیہ مثل نفاق ہے۔ کیونکہ ان ہر دو میں یہ قدر مشترک ہے کہ دل میں کچھ ہوتا ہے۔ اور ظاہر کچھ اور کیا جاتا ہے اور چونکہ نفاق حرام و ناجائز ہے لہٰذا تقیہ بھی ناجائز ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس بالکل بے اساس ہے۔ تقیہ و نفاق کو ایک قرار دینا عین جہالت یا تجاہل ہے ورنہ معمولی عقل و علم رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ تقیہ و نفاق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تقیہ میں ایمان کو چھپا کر کفر کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور نفاق میں کفر و شرک کو پوشیدہ رکھ کر اسلام و ایمان کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ اذا جاءک المنافقون قالوا نشهد انک لرسول الله والله یعلم انک لرسوله والله یشهد ان المنافقین لکاذبون۔ پس جب یہ دونوں الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ تو پھر ایک کے حکم کا دوسرے پر چسپاں کرنا کس قانون و آئین میں جائز ہے؟ یہ قیاس مع الفارق تو ان لوگوں کے نزدیک بھی غلط ہے اور ناجائز ہے جو قیاس کو درست سمجھتے ہیں۔ فما لکم کیف تحکمون؟

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

ابتدائے اسلام میں جب کہ اسلام کمزور تھا بے شک تقیہ جائز تھا۔ مگر فتح مکہ کے بعد جب کہ اسلام و مسلمین طاقتور ہو گئے تھے۔ یہ حکم منسوخ ہو گیا لہٰذا اب ناجائز ہے۔ یہ شبہ فریب کاری عیاری کا شاہکار ہے ورنہ معمولی عقل و فکر رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ کسی حکم کا منسوخ ہو جانا اور بات ہے اور کسی چیز کو کچھ عرصہ تک بوجہ عدم ضرورت استعمال میں نہ لانا چیزے دیگر۔ یہ ٹھیک ہے کہ فتح مکہ کے بعد ایک مرتبہ تقیہ کی ضرورت نہ رہی تھی کیونکہ اس وقت خوف نہ تھا مگر یہ کہنا کہ اس وقت تقیہ ہمیشہ کے لئے منسوخ ہو گیا تھا۔ یہ خدا و رسول پر کھلا افترا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی حکم کا نسخ بغیر نص صریح کے ثابت نہیں ہو سکتا۔ ارشاد قدرت ہے ما ننسخ من آیة او ننسها نأت بخیر منها او مثلها کہ ہر جب کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں تو اس کی مثل یا اس سے

الناطق عن ابلیس فقد عبدہ و سئل الصادقؑ قول اللہ تعالیٰ والشعراء یتبعهم الغاون قال هم القصاصون و قال النبیؐ من اتی

اور اگر لغزیات اور شیطانی قصے بیان کر رہا ہے تو سننے والا بھی ابلیس کا عبادت گزار متصور ہوگا کسی نے امام علیہ السلام سے قولِ خداوندی " الشعراء یتبعهم الغاون کی تفسیر پوچھی آپ نے فرمایا یہاں شاعروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو عموماً جھوٹے قصے کہانیاں بیان کیا کرتے ہیں۔ جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی بدعتی انسان کے پاس جائے۔

بہتر ناسخ آیت لاتے ہیں۔ علامہ سیوطی اپنی تفسیر اتقان ج ۲ صہ ۲۴ پر رقمطراز ہیں انما یرجع فی النسخ الی نقل صریح عن رسول اللہ صلعم او عن صحابی یقول الخ یعنی نسخ کے سلسلہ میں جناب رسولخداؐ یا ان کے کسی صحابی کی روایت صریح پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جب کہ ناسخ آیت بھی موجود ہو بلکہ یہاں تک تصریح کر دی ہے کہ ولا یعتمد فی النسخ علی قول عوام المفسرین بل ولا اجتهاد المجتهدین من غیر نقل صحیح نسخ کے بارے میں عوام مفسرین کا قول بلکہ آئمہ مجتہدین کا اجتہاد بھی کافی نہیں ہے جب تک کہ نقل صریح موجود نہ ہو (صہ ۲۴)، بنابریں ہم نے اس کے جواز کے دلائل تو قرآن وحدیث سے ذکر کر دیے ہیں اگر مدعی نسخ میں ہمت ہے تو اس کے منسوخ ہونے پر کوئی نص قرآنی پیش کرے ورنہ اس طرح بلا دلیلِ قرآنی دعویٰ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

اگر تقیہ جائز تھا تو پھر حضرت امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں کیوں تقیہ نہ کیا؟ اور اپنا سب گھر بار راہِ خدا میں اعلاء کلمۃ الحق کیلئے کیوں قربان کر دیا۔ آپ کے بیعت یزید نہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقیہ جائز نہیں ہے۔ یہ شبہ بھی حقیقت الامر کو نہ سمجھنے پر مبنی ہے ورنہ کوئی حقیقت بین اور معاملہ شناس آدمی یہ اعتراض نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس شبہ کے جواب میں الزاماً اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ اگر تقیہ جائز نہ ہوتا۔ تو حضرت امیرالمومنینؑ خلافتِ شیخین کے وقت اور حضرت امام حسن مجتبیٰؑ صلح معاویہ کے وقت اس پر عمل نہ کرتے۔ مگر چونکہ اس طرح خدشہ ہے۔ کہ ایک ظاہر بین آئمہ طاہرینؑ کے افعال میں اختلاف کا خیال فاسد کرے۔ حالانکہ ان کے افعال واقوال میں فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس امر کی قدرے وضاحت کر دی جاتی ہے۔

تقیہ کے اقسام

اصل حقیقت بیان کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ متن رسالہ میں جو یہ مذکور ہے

ذا ابدعت فرقۃ فقد سعی فی ھدم الاسلام و اعتقادنا فیمن خالفنا فی شیئ واحد من امور الدین کاعتقادنا فیمن خالفنا فی جمیع امور الدین

اور جاکر اس کی تعظیم و تکریم کرے تو اس نے (ارکان) اسلام کے گرانے کی کوشش کی ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو شخص دین (برحق) کی باتوں میں سے کسی ایک بات میں بھی ہمارا مخالف ہے۔ وہ ان لوگوں کی مانند ہے۔ جو ہمارے دین کی تمام باتوں میں ہمارے مخالف ہیں۔

پر منقسم ہوتا ہے۔ بعض اوقات واجب ہوتا ہے، بعض اوقات حرام، بعض اوقات راجح یعنی مستحب ہوتا ہے۔ بعض اوقات مرجوح و مکروہ اور بعض اوقات فقط مباح ہوتا ہے۔ بنا بریں ہم کہتے ہیں کہ خواہ حضرت امیر علیہ السلام کا بوقت خلافتِ شیخین تقیہ ہو۔ یا جمل و صفین کی جنگ اسی طرح حضرت امام حسنؑ کی پہلے جنگ ہو یا بعد میں صلح۔ خواہ امام حسینؑ کا جہاد ہو یا امام زین العابدینؑ کی قید و بند حضرت امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ کی خاموشی ہو یا امام موسیٰ کاظمؑ کی قید۔ یا امام رضاؑ کی ولی عہدی (وھلم جرًّا) یہ سب حفاظت دین اور حمایت شریعت سید المرسلین کے مختلف مظاہر ہیں مقصد و مآل سب کا ایک ہی ہے۔ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

آئمہ طاہرینؑ کے افعال میں ظاہری اختلاف کی وجہ

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ حالات کے بدلنے سے ایک ہی مقصد کے حاصل کرنے کے طور و طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ سرور کائنات کے انتقال پر ملال کے وقت اسلام داخلی و خارجی دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا تھا۔ اگر اس وقت جناب امیرؑ اپنا حق خلافت حاصل کرنے کے لئے شمشیر بکف ہو کر میدان میں اتر آتے تو دار الخلافت میں خانہ جنگی کی وجہ سے اسلام مٹ جاتا جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں۔ ان لم انصر الاسلام و اھلہ لاری فیہ ثلمًا الخ میں نے دیکھا کہ اگر میں اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی خاموش رہ کر نصرت و امداد نہ کروں تو اسلام میں ایسا رخنہ پڑ جائے گا کہ اس کا صدمہ مجھے خلافت کے چھن جانے سے بھی زیادہ ہوگا (نہج البلاغہ) معلوم ہوا کہ اس وقت دین کی بقا تقیہ کر کے بساطِ صبر پر بیٹھنے میں تھی۔ ہاں جب ظاہری خلافت جناب کو مل گئی۔ اور آپ کو اصلاحِ احوال کرنے کا موقع دستیاب ہو گیا اور بعض شرپسند عناصر نے راستے میں روڑے اٹکانے کی مذموم حرکت شروع کر دی تو اس وقت دین کی فلاح و بہبودی ایسے عناصر کی سرکوبی کرنے میں تھی۔ اس لئے جنگِ جمل، صفین اور نہروان ظہور میں آئیں۔ اسی طرح جب حضرت امیرؑ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسنؑ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو امیرِ شام نے سازشوں کے جال بچھانے شروع کر دیئے اور اپنی ریشہ دوانیاں تیز سے تیز تر کر دیں۔ امام عالیمقامؑ

[illegible]

فوجی جرنیلوں کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ حتیٰ کہ نوبت بایں جا رسید کہ عین حالت نماز میں آنجنابؑ پر حملہ کر دیا گیا اور جناب کے خیمہ میں جو کچھ مال و اسباب تھا حتیٰ کہ وہ سجادہ جس پر آپ نماز پڑھ رہے تھے لوٹ لیا گیا اور جناب کی ران مبارک زخمی کر دی گئی۔ اس کے باوجود امیر شام آپ کو حسب دلخواہ شرائط پر صلح کی پیش کش بھی کر رہا تھا۔ اندریں حالات آنجنابؑ نے دین کی بقا اور اپنے نام لیواؤں کی فلاح اور مسلمانوں کی صلاح اسی امر میں دیکھی کہ تقیہ کر کے معاویہ سے صلح کر لیں۔ یہ امور تاریخ اسلام کے ایسے مسلمہ حقائق ہیں کہ کوئی شخص ان کی تکذیب نہیں کر سکتا۔ انہی حقائق کے پیش نظر منصف مزاج علمائے اہل سنت یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کا گواہ ہے کہ ہمارے امام و شہزادے نے اپنی خوشی کے ساتھ یہ خلافت معاویہ کو نہیں دی بلکہ مجبوری سے آپ نے دیکھا کہ میرے ساتھی لوگ درپردہ معاویہ سے سازش رکھتے ہیں اور امیر معاویہ جنگ پر تُلا ہوا ہے..... (الی ان قال) آپ معاویہ کو ظالم و غاصب جانتے تھے اور ہرگز خلافت کا مستحق نہیں جانتے تھے۔ (انوار اللغۃ پ۳ ص۱۱ از علامہ وحید الزمان مترجم صحاح ستہ)

سرکار سید الشہداءؑ کا معاملہ اپنے بزرگوں سے مختلف تھا

مگر امام حسینؑ کی حالت ان سب سے جدا تھی۔ ان کے سابقہ بزرگوں کے وقت اگرچہ دین میں بہت کچھ تغیر و تبدل شروع ہو گیا تھا۔ مگر پھر بھی نماز روزہ وغیرہ ظاہری احکام اسلام بہت حد تک بحال تھے۔ اور ان پر عمل بھی ہو رہا تھا لیکن جناب سید الشہداءؑ کو جس شقی ازلی یعنی یزید پلید عنید سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ علانیہ شارب الخمر تارک الصلوٰۃ و ناکح المحارم اور شعائر الاسلام کی ہتک حرمت کرنے والا تھا (تاریخ الخلفاء سیوطی وغیرہ) بلکہ کھلم کھلا طور پر اپنے کفر کا اظہار بایں طور کرتا تھا۔ لعبت بنو هاشم بالملك ٭ فلا خبر جاء ولا وحی نزل۔ (تذکرۃ خواص الامۃ وغیرہ)، اس لئے وہ دین اسلام کو مٹانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ ان حالات میں تو اہلسنت کے اصول کے مطابق بھی امام حسینؑ کے لئے اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر جہاد واجب تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں۔

اذا کفر الخلیفۃ بانکار ضروری من ضروریات الدین حل قتاله بل وجب فصار قتاله من الجهاد فی سبیل الله الخ.... جب کوئی خلیفہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرنے کی وجہ سے کافر ہو جائے تو اس وقت اس سے جنگ کرنا جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے اور یہ جنگ کرنا جہاد فی سبیل اللہ میں شمار ہو جاتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص۲۲۱) لہٰذا اگر اس وقت جناب سید الشہداءؑ تقیہ پر عمل پیرا ہو جاتے تو دین اسلام مٹ جاتا۔ اور ان کے جد نامدار پدر عالی مقدار اور برادر بزرگوار بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء خالق کردگار کی مساعی جمیلہ و جہود جلیلہ پر پانی پھر جاتا۔ ایسے حالات میں تقیہ کا واجب ہونا تو درکنار جائز بھی نہیں بلکہ حرام ہے۔ لہٰذا جناب امام حسینؑ کس طرح تقیہ کر سکتے تھے؟ امام عالی مقام سے بڑھ کر کون شخص معاملہ

شناس ہو سکتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس وقت دینِ خدا کی بقاء اور شریعتِ مصطفویہ کی اصلاح آپ کی شہادت عظمیٰ میں مضمر ہے۔ اسی لئے جناب نے فرمایا کہ ع ان کان دین محمد لم یستقم ۔ الا بقتلی یا سیوف خذینی تن، من، دھن کی بازی لگا دی اور اپنے تمام اعزہ و انصار کو راہِ خدا میں شہید کرا کے اسلام کو زندۂ جاوید بنا دیا ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ ولنعم ما قیل

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید ۔۔۔ حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؑ

حضرت سیّد الشہداءؑ اور ان کے پیشروؤں میں ایک ظاہری فرق یہ بھی نمایاں تھا کہ ان بزرگواروں کو خلفائے وقت کی طرف سے برابر صلح کی پیش کش کی جاتی تھی۔ مگر جنابِ سیّد الشہداء کے لئے دو ہی راستے تھے۔ بیعتِ یزید یا شہادت۔ لہٰذا بیعت کرنے میں دین جاتا تھا اور نہ کرنے میں جان جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب معاملہ کی نزاکت اس حد تک پہنچ جائے تو ایسے حالات میں قانونِ شریعت کے مطابق دین کی بقاء کا انتظام کرنا واجب و لازم ہوتا ہے۔ لہٰذا فرض شناس امام علیہ السلام نے وہی کچھ کیا جو ان کو کرنا چاہیئے تھا۔ ع

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن ۔۔۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ان حقائق سے روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو گیا کہ جنابِ سیّد الشہداءؑ کے جہاد کو تقیہ کے عدمِ جواز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جو بات سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے ورنہ الحال تغنی عن المقال ہاں یہ اور بات ہے کہ ع

اذا لم تکن للمرء عین صحیحۃ ۔۔۔ فلا غرو ان یرتاب والصبح مسفر

الصباح

مذکورہ بالا حقائق سے واضح ہو گیا کہ تقیہ کا جواز بالکل بے غبار ہے بلکہ یہ اس شریعتِ مقدسہ اسلامیہ کے محاسن و محامد میں داخل ہے۔ اس کے جواز کا انکار سراسر جہالت و ضلالت ہے جو کسی دیندار انسان کا شیوہ و شعار نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ لوگ اس کو محل بے محل استعمال کر کے اسے عامۃ الناس کی نظروں میں معیوب بنا دیں ع ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد" ایسے سہل انگیز اور آرام پسند حضرات کے لئے محقق تفلکار جناب محمد سلطان صاحب مرزا مرحوم کا یہ افادہ آویزہ گوش بنانے کے قابل ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔ "یہ ہوتا آیا ہے کہ انسان کے ہاتھوں میں اچھی سے اچھی شے بگڑ جاتی ہے۔ اور تقیہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل شیعہ اپنے تئیں شیعہ کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ فقط اس وجہ سے کہ شاید اگر ان کا شیعہ ہونا معلوم ہو جائے تو ان کے افسر اور پبلک ان کو بری نگاہ سے دیکھیں گے اور جو شیعہ افسران ہیں وہ شیعہ افراد کو ان کا حق دینا بھی پسند نہیں کرتے تاکہ لوگوں کی نگاہوں میں وہ غیر جانبدار سمجھے جائیں (حالانکہ ان کی اس ملازمت کی وجہ جواز ہی یہی ہے کہ ابنائے ملت کو فائدہ پہنچائیں (شارح) اس کو وہ تقیہ کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ

باب الاعتقاد فی العلویۃ

قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی العلویۃ انھم آل رسول اللہ وان مودتھم واجبۃ لانھا اجرالرسالۃ قال اللہ قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ والصدقۃ علیھم محرمۃ لانھا اوساخ مافی ایدی الناس وطہارۃ لھم الاصدقتھم بعیدھم واماتھم

اکتالیسواں باب (اولادِ علیؑ کے متعلق اعتقاد)

حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی اولاد امجاد کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ آلِ رسولؐ ہیں اور ان کی مودت ومحبت تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔ کیونکہ وہ اجرِ رسالت ہے جیساکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ اے رسولؐ (جو لوگ مال کی پیشکش کر رہے ہیں، ان سے کہدو۔ میں تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ میرے قرابتداروں سے محبت کرو۔ صدقہ چونکہ لوگوں کے ہاتھوں کی میل کچیل ہوتا ہے۔ اور ان کے لئے باعثِ طہارت (باطنی) ہوتا ہے اس لئے وہ ان (سادات) پر حرام کر دیا گیا ہے۔ مگر اولادِ رسولؐ میں بعض کا صدقہ بعض پر نیز ان کا صدقہ ان کے غلاموں اور کنیزوں پر حلال ہے۔

تقیہ نہیں ہے ان کو نہ جان کا خوف ہے اور نہ قانوناً شیعہ ہونے سے ان کو نقصان پہنچتا ہے۔ غیر شیعہ ان کو غیر جانبدار ہونے کا لقب دینے کے بجائے صحیح طور سے بزدل اور حریص سمجھتے ہیں۔ اور وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب بھی ہیں۔ ایسے لوگوں نے تقیہ کو بدنام کیا ہے: انتہی کلامہ (فلسفہ اسلام حصہ دوم)۔ وھو جید متین معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات یہ حقیقت فراموش کرچکے ہیں کہ

حوادث کے طوفاں سے دامن بچانا   علیؑ کے غلاموں کی عادت نہیں ہے

وفقنا اللہ لما یحب ویرضیٰ۔[1]

اکتالیسواں باب (ساداتِ کرامؑ کے متعلق اعتقاد کا بیان)

اس باب میں حضرت مصنف علامؒ نے اجمالاً چند امور ذکر کئے ہیں جن پر تفصیلاً تو ہم بھی تبصرہ نہیں کرسکتے ہاں بقدر ضرورت ان امور کی ذیل میں کچھ وضاحت کی جاتی ہے۔

---

[1] باقی جن امور کا مصنف علامؒ نے اس باب میں اجمالی تذکرہ کیا ہے ان پر سیر حاصل تبصرہ دیکھنے کے لئے ہمارے رسالہ اصلاح المجالس والمحافل یا مقدمہ سعادۃ الدارین کی طرف رجوع کیا جائے۔ (منہ عفی عنہ)

وصدقتہ بعضھم علی بعض واما الخمس فانما یحل لھم عوضا عن الزکوٰۃ لانھم قد منعوا منہ واعتقادنا فی المسئ منھم ان علیہ ضعف العقاب وفی المحسن منھم ان لہ ضعف الثواب وبعضھم اکفاء بعض لقول النبی حین نظر الی نبی ابی طالبؑ علیؑ و جعفرؑ الطیار قال بنا تنا کبنینا و بنونا کبنا تنا وقال الصادقؑ من خالف دین اللہ وتولی اعداء ہ

چونکہ مال زکوٰۃ ان پر حرام ہے۔ اس لئے اس کے عوض میں مال خمس اولادِ رسولؐ کے لئے حلال قرار دیا گیا ہے۔ سادات کے بارے میں ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ جو شخص ان میں سے بدعمل ہوگا۔ اس کو بہ نسبت غیر سادات کے دگنا عذاب ہوگا۔ اور ان میں سے جو نیکوکار ہوگا اُسے دگنا ثواب ملے گا۔ سادات کرام آپس میں ایک دوسرے کے کفو اور ہمسر ہیں۔ اس امر کی تائید پیغمبر اسلامؐ کے اس فرمان سے ہوتی ہے جو آپ نے جناب ابوطالبؑ کی اولاد یعنی حضرت علیؑ اور جناب جعفر طیارؑ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا تھا۔ ہماری بیٹیاں ہمارے بیٹوں کے مثل اور ہمارے بیٹے ہماری بیٹیوں کی مانند ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ جو شخص دینِ خدا کی مخالفت کرے اور دشمنانِ خدا سے محبت کرے۔

اولادِ علیؑ اولادِ نبیؐ ہیں

یہ مذہب جعفریہ کا مسلمہ نظریہ ہے اور بہت سے علماء اہلسنت بھی ہمارے ہم خیال ہیں کہ اولادِ علیؑ اولادِ نبیؐ ہیں۔ فریقین کی روایات اور قرآنی آیات اس دعوے کی حقانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

اس امر پر پہلی دلیل

ایک مرتبہ عباسی خلیفہ مامون الرشید نے حضرت امام رضاؑ سے دریافت کیا۔ کہ آپ کے اولادِ رسولؐ ہونے پر قرآنی دلیل کیا ہے؟ جس سے یہ ثابت ہو کہ بیٹی کی اولاد بھی بمنزلہ حقیقی اولاد کے ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا اس دعوے کی صداقت پر یہ آیت دلالت کرتی ہے ارشاد قدرت ہے ومن ذریتہ داود و سلیمٰن و ایوب و یوسف و موسیٰ و ھارون وکذالک نجزی المحسنین ۝ وزکریا و یحییٰ وعیسیٰ و الیاس کل من الصّٰلحین ۝ (سورہ انعام پ ۷ ع ۱۶) اس آیہ مبارکہ میں خداوند عالم نے حضرت عیسٰیؑ کو ذریت حضرت ابراہیمؑ سے شمار کیا ہے ظاہر ہے کہ ان کا یہ انتساب اپنی والدہ ماجدہ کی ہی طرف سے ہے۔ یہ اتنی مضبوط دلیل ہے کہ مامون جیسا فاضل عربیت اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا (ہفتم بحار)

دوسری دلیل

فریقین کی بکثرت روایات میں وارد ہے کہ جناب رسولِ خداؐ نے فرمایا۔ ان اللہ جعل

او ادعا ئے اولیاء اللہ فالبرائۃ منه واجبۃ کائنا من کان من ای قبیلۃ کان و قال امیر المومنین لابنه محمد بن الحنفیه تواضعك فی شرفك اشرف لك من شرف آبائك و قال الصادق ولایتی لامیر المومنین احب الی من ولادتی منه و سئل الصادق من آل محمد فقال آل محمد من حرم علی رسول اللہ نکاحه و قال

یا خدا تعالیٰ کے اولیاء سے دشمنی رکھے۔ اس سے بیزاری اختیار کرنا واجب ہے۔ وہ کوئی بھی ہو اور جس قوم اور قبیلہ سے ہو۔ حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے فرزند محمد بن حنفیہ سے فرمایا۔ تمہارا وہ شرف جو تواضع و انکساری سے حاصل کردہ ہو اس سے بہتر ہے جو تم کو اپنے باپ دادا کی نسبت سے حاصل ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت کا اعتقاد رکھنا مجھے ان کی اولاد میں سے ہونے سے زیادہ محبوب ہے حضرت صادق آل محمد علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ آلِ رسولؐ سے کون لوگ مراد ہیں؛ فرمایا جن سے رسولِ خدا کے لئے نکاح کرنا حرام ہے!!

ذرية كل نبي في صلبه وجعل ذريتي في صلب علي بن ابي طالبؑ (الشرف المؤبد نبهانی و صواعق محرقہ ص۲۳۹ طبع جدید) خداوند عالم نے ہر نبی کی اولاد اس کی پشت سے قرار دی ہے مگر میری ذریت جناب علی بن ابی طالبؑ کی صلب سے مقرر فرمائی ہے (صواعق محرقہ ص۱۶۹ طبع جدید پر آنحضرتؐ کا یہ ارشاد بایں الفاظ مذکور ہے کل نبی انثی ینتمون الی عصبتھم الا ولد فاطمۃ فانی ولیھم وانا عصبتھم وانا ابوھم۔ ہر عورت کی اولاد اپنے پدری رشتہ داروں کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ سوائے (حضرت) فاطمہؑ کی اولاد کے کہ میں ان کا سرپرست، پدری رشتہ دار اور باپ ہوں؛

تیسری دلیل

آنحضرتؐ نے جناب امام حسن و حسین علیہما السلام کو متعدد بار ابن (فرزند) کے لفظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔ جیسے جناب امام حسن علیہ السلام کے بارے میں یہ فرمایا کہ ابنی هذا سید۔ میرا یہ بیٹا سردار ہے (صواعق ص۱۹۱) دونوں شہزادوں کے متعلق ارشاد فرمایا هذان ابنای وابنا ابنتی اللهم انی احبهما فاحبهما (ترمذی ج ۲ ص۲۳۰) یہ دونوں میرے بیٹے اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ بارالہا میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر۔ نیز ان کے متعلق فرمایا ابنای هذان الحسن والحسین سیدا شباب اهل الجنۃ (صواعق محرقہ ص۱۹۱ طبع جدید) اسی طرح متعدد احادیث

عزّوجلّ ولقد ارسلنا نوحًا وابراهیم وجعلنا فی ذرّیتھما النبوّۃ والکتاب فمنھم مھتد وکثیر منھم فاسقون وسئل الصادق عن قول اللہ عزّو جلّ ثم اورثنا الکتٰب الّذین اصطفینا من عبادنا فمنھم ظالم لنفسہٖ و منھم مقتصد و منھم

خداوندِ عالم فرماتا ہے ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو رسولؑ بنا کر بھیجا اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب قرار دی۔ ان میں سے بعض تو ہدایت یافتہ ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر فاسق و فاجر ہیں۔

حضرت صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی۔ کہ خلاق عالم فرماتا ہے۔ پھر ہم نے ان لوگوں کو اپنی کتاب کا وارث قرار دیا ہے جنہیں ہم نے اپنے تمام بندوں سے چن لیا ہے۔ ان میں سے بعض تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں۔ بعض میانہ رَو۔

ہوتا ہے۔ نیز ملائکہ کا بحکم خدائے عزّ وجلّ امام حسینؑ کو ابنِ رسولؐ کہنا بھی کتب میں مذکور ہے چنانچہ صواعقِ محرقہ ص۱۹۱ طبع جدید پر لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ آج میرے پاس ایک ایسا فرشتہ آیا ہے جو اس سے قبل کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ مجھے خبر دیتا ہے ان ابنک ھذا حسینًا مقتول کہ آپ کا یہ بیٹا حسینؑ شہید کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب تک مجاز کی دلیل نہ ہو الفاظ اپنے حقیقی معنوں پر محمول ہوتے ہیں۔

آلِ رسولؐ کی محبت واجب و لازم ہے

اس سلسلہ میں جو آیت مودّۃ (سورۃ شوریٰ پ۲۵ ع۴) حضرت مصنف علام نے پیش فرمائی ہے وہ اس مدعا پر بطور نصِ صریح دلالت کرتی ہے۔ اگرچہ اس کا ظاہری نزول حضرات معصومینؑ کے حق میں ہے۔ چنانچہ تفسیر کشاف ج ۳ ص۴۰۲ طبع مصر پر لکھا ہے کہ جب یہ آیۃ مبارکہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا من قرابتک ھؤلاء الذین وجبت علینا محبتھم یا رسول اللہ! یا رسول اللہؐ آپ کے وہ قرابتدار کون ہیں، جن کی محبت ہم پر واجب کی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا ھم علی و فاطمۃ و ابناھما (وکذا فی تفسیر الدر المنثور و تفسیر جامع البیان۔ و تفسیر الخازن والمدارک والحقائق و روح المعانی وغیرہا)، مگر بالتبع اس میں تمام سادات کرام داخل ہیں۔ صواعق محرقہ ص۲۲۱ طبع جدید پر جناب امیرؑ سے مروی ہے فرمایا۔ فینا اھل البیت فی الرحم آیۃ لا یحفظ مودتنا الا کل مؤمن ثم قرء قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ۔ آلِ رسولؐ کی محبت کے وجوب اور اس کی فضیلت کے متعلق احادیث رسولؐ حدِ شمار سے باہر ہیں بطور تبرک یہاں چند احادیث لکھی جاتی ہیں (۱) فرمایا من مات علی حب آل محمد مات شھیداً

سابق بالخیرات باذن اللہ قال الظالم لنفسہ منا من لم یعرف حق الامامؑ والمقتصد من عرف حقہ والسابق بالخیرات باذن اللہ ھو الامامؑ و سئل اسمعیل اباہ الصادقؑ قال ما حال المذنبین منا فقالؑ لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتٰب من یعمل سوء یجز بہ

اور بعض خدا کے حکم سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا اس آیت میں ظالم سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے امام برحق کے حق کی معرفت نہیں رکھتا اور مقتصد (میانہ رو) سے مراد وہ شخص ہے جو امام کے حق کو پہچانتا ہو اور بحکم خدا نیکیوں میں سبقت کرنے والے سے مراد خود امامؑ ہیں۔ جناب اسماعیل نے اپنے والد ماجد جناب امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا کہ ہم میں سے جو لوگ گنہگار ہیں ان کا انجام کیا ہوگا؟ فرمایا تمہاری اور اہل کتاب کی آرزوئیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ جو شخص بھی برے کام کرے گا۔ اسے اس کی سزا دی جائے گی۔

مات مغفورا۔ جو شخص آلِ محمدؐ کی محبت میں مرے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں (۳) من مات علی حب الِ محمدؐ مات مومنا مستکمل الایمان جو شخص محبت اہلبیتؑ پر مرے وہ کامل الایمان ہو کر مرتا ہے (۴) من مات علی حب ال محمدؐ بشرہ ملک الموت بالجنۃ ثم منکر ونکیر جو شخص محبت اہلبیتؑ پر مرے پہلے اسے ملک الموت اور پھر منکر نکیر جنت کی بشارت دیتے ہیں۔ تفسیر کشاف ج ۳ ص۴۶۷) نیز ان احادیث سے بھی محبت کا وجوب ثابت ہوتا ہے جن میں اہلبیتؑ کی عداوت و دشمنی کو حرام اور اسے باعثِ دخولِ جہنم قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا۔ من ابغض احداً من اھل بیتی حرم شفاعتی (صواعق محرقہ ص۲۳۰) یعنی جو شخص میرے اہلبیت سے بغض وعداوت رکھے گا وہ میری شفاعت سے محروم رہے گا۔ (۶) من مات علی بغض الِ محمد جاء یوم القیامۃ مکتوب بین عینیہ آئس من رحمۃ اللہ جو شخص میرے اہلبیتؑ سے بغض رکھے گا وہ بروزِ قیامت اس حال میں آئے گا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا۔ رحمتِ خدا سے مایوس ہے۔ (صواعق محرقہ ص۲۳۷) نیز تفسیر کشاف ج ۳ ص۴۶۷ پر ہے من مات علی بغض ال محمدؐ مات کافرا جو شخص بغض اہلبیتؑ پر مرے وہ کفر کی موت مرتا ہے من مات علی بغض ال محمد لم یشم رائحۃ الجنۃ۔ جو شخص بغض آلِ محمدؐ پر مرے گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا نیز فرمایا اربعۃ انا شفیع لھم یوم القیامۃ ولو اتونی بذنوب اھل الارض معین اھل بیتی والقاضی لھم حوائجھم عند ما اضطروا الیہ والمحب لھم

ولا یجد من دون اللہ ولیاً ولا نصیرا

اور وہ اپنے لئے خدا کے سوا کوئی ناصر و مددگار نہیں پائے گا۔

وقال ابو جعفرؑ فی حدیث طویل لیس بین اللہ و بین احد قرابۃ ان احب الخلق الی اللہ اتقٰھم لہ واعملھم بطاعتہ واللہ ما یتقرب العبد الی اللہ عزوجل الا بالطاعۃ ما معنا برائۃ من النار ولا علی اللہ لاحد من حجۃ من کان للہ مطیعاً فھو لنا ولی و من کان للہ عاصیا فھو لنا۔

ایک طویل حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان کسی قسم کی کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ تمام مخلوقات میں وہی شخص خدا کو زیادہ محبوب ہے۔ جو سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہے اور سب سے زیادہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے۔ خدا کی قسم! خدا کی بارگاہ میں بغیر اس کی اطاعت و بندگی کے کوئی شخص بھی اس کا تقرب حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمارے پاس دوزخ سے نجات حاصل کرنے کا کوئی پروانہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی کے پاس خدا کے بالمقابل کوئی حجت ہے۔ جو شخص خدا کا اطاعت گذار ہے۔ وہ ہمارا دوست ہے۔ اور جو خدا کا نافرمان ہے وہ ہمارا۔

بقلبہ و لسانہ و الذی ادفع عنھم بیدہٖ (عیون الاخبار، صواعق محرقہ ص۲۳۴) چار شخص ایسے ہیں کہ اگرچہ تمام اہلِ زمین کے برابر گناہوں کا بوجھ لے کر بھی میرے پاس آئیں۔ جب بھی میں ان کی ضرور شفاعت کروں گا۔ ایک وہ جو میرے اہلبیتؑ کی اعانت و امداد کرے۔ دوسرا وہ جو ان کے اضطرار کے وقت ان کی حاجتیں بر لائے۔ تیسرا وہ جو قلب و زبان سے ان کے ساتھ محبت کرے۔ چوتھا وہ جو ہاتھ سے ان کی طرف سے دفاع کرے۔ من لا یحضرہ الفقیہ میں جناب امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے فرمایا کہ جب قیامت کا روز ہوگا تو جناب رسالتمآبؐ کی طرف سے ندا آئے گی۔ جس جس آدمی کا مجھ پر کوئی احسان ہو آج مجھ سے آکر اس کا عوض لے لے۔ لوگ عرض کریں گے۔ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ ہمارا آپ پر کس طرح احسان ہو سکتا ہے بلکہ آپؐ کا ہم پر احسان ہے۔ آپ فرمائیں گے میری مراد یہ ہے کہ من آوٰی احدًا من اھلبیتی او برّھم او کساھم من عری او اشبع جائعھم۔ جس شخص نے میرے اہلبیتؑ میں سے کسی کو پناہ دی ہو۔ یا ان میں سے کسی سے کوئی نیکی کی ہو یا ان میں سے کسی عریان کو کپڑے پہنائے ہوں یا ان میں سے کسی بھوکے کو کھانا کھلایا ہو وہ کھڑا ہو جائے اور مجھ سے اپنا عوض لے۔ اس وقت کچھ لوگ اٹھیں گے اور اپنے اپنے خدمات کا ذکر کریں گے۔ اس وقت بارگاہِ احدیت سے ندا آئے گی۔ یا محمدؐ یا حبیبی

عدو ولا تنال ولا یتنا الا بالورع والعمل الصالح وقد قال نوحؑ رب ان ابنی من اهلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین قال یا نوح انه لیس من اهلک انه عمل غیر صالح فلا تسئلن ما لیس لک به علم انی اعظک ان تکون من الجاھلین۔

دشمن ہے۔ ہماری ولایت اور دوستی حرام سے بچنے اور عمل صالح بجالانے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہِ خدا میں عرض کیا اے پالنے والے! یہ میرا بیٹا ... میرے اہل میں سے ہے۔ تیرا وعدہ برحق ہے اور تو تمام حاکموں سے بڑا حاکم اور فیصلہ کرنے والا ہے۔ خداوندِ عالم نے فرمایا اے نوحؑ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے کیونکہ یہ بدعمل ہے تو دیکھو جس چیز کا تمہیں علم نہیں ہے، اس کے متعلق مجھ سے سوال نہ کرو۔ میں تمہیں پندو نصیحت کرتا ہوں، کہ کہیں تم جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اسکنھم الجنۃ حیث شئت۔ میرے حبیب محمدؐ! جنت میں جہاں چاہو۔ ان کو ٹھہراؤ۔ اس وقت آنحضرتؐ ان کو جنت کے ایک عالی مقام بنام "وسیلہ" میں ٹھہرائیں گے جہاں ان اہلِ ایمان اور آنحضرتؐ اور ان کی اہلبیتؑ کے درمیان کوئی حجاب نہ ہو گا۔ ۱۲

من لم یکن علویا حین تنسبہ　　فما لہ فی قدیم الدھر مفتخر

ایک اشتباہ کا ازالہ

اوپر ہم نے جو احادیث بیان کی ہیں۔ ان میں سے بعض احادیث اگرچہ فقط آئمہ اطہارؑ علیہم السلام کے ساتھ خاص ہیں، مگر اکثر احادیث عام ذریت رسولؐ کو شامل ہیں جو یقیناً غیر معصوم ہیں۔ ان میں نیکوکار بھی ہیں اور بدکار بھی مگر بعض کم توفیق اور کوتاہ اندیش حضرات یہ کہتے ہیں کہ گنہگار سادات کی تعظیم و تکریم کا شرعاً کوئی حکم نہیں ہے بلکہ بعض لاابالی قسم کے لوگ تو ایسے گنہگار افراد کی سیادت میں بھی شک و شبہ کرنے لگتے ہیں اور اس سلسلہ میں حضرت نوحؑ اور ان کے ناخلف فرزند والا واقعہ پیش کیا کرتے ہیں۔

اس توہم فاسد کا جواب یہ ہے کہ ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ عملِ بد کرنے سے سلسلۂ نسب منقطع نہیں ہوتا۔ قرآن شاہد ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہِ ربّ العزت میں اپنی ذریت کے اندر عہدۂ امامت باقی رکھنے کی استدعا کی تھی کہ ومن ذریتی تو جواب ملا تھا۔ لا ینال عھدی الظالمین اے ابراہیمؑ! تیری ذریت میں سے جو لوگ ظالم ہوں گے۔ ان کو میرا عہدۂ امامت نہیں ملے گا۔ اس آیت

قال رب اعوذ بك ان اسئلك ما لیس لی به علم وان لم تغفر لی و ترحمنی اکن من الخاسرین و سئل الصادقؑ عن قول الله عزّ وجلّ ویوم القیٰمة تری الذین کذبوا علی الله وجوههم مسودة الیس فی جهنم مثوی للمتکبرین. قال من زعم انه امام

حضرت نوحؑ نے عرض کیا۔ اے میرے پروردگار! میں ایسی بات کا سوال کرنے سے جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ تیرے حضور میں پناہ مانگتا ہوں۔ اگر تو نے میرے حال پر رحم نہ کیا اور معافی نہ دی تو میں ضرور خسارا پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ حضرت صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی۔ جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا ہے روزِ قیامت تم دیکھو گے کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ کیا متکبر لوگوں کا ٹھکانا جہنم نہیں ہے۔ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ اس سے وہ شخص مراد ہیں جو امامت کا دعوےٰ کرے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ ظالم اولاد ذرّیتِ ابراہیمؑ میں داخل تو رہے گی۔ ہاں عہدۂ امامت ان کو نہیں مل سکے گا۔ اسی طرح ارشادِ خداوندی ہے ولقد ارسلنا نوحا وابراهیم وجعلنا فی ذریتهما النبوة والکتاب فمنهم مهتد وکثیر منهم فاسقون۔ ہم نے جناب نوحؑ و ابراہیمؑ کو رسالت دے کر بھیجا اور ان کی ذرّیت میں نبوت و کتاب کو برقرار رکھا۔ پس ان کی ذرّیت میں سے بعض ہدایت یافتہ اور اکثر فاسق و فاجر ہیں۔ یہ آیت بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ بدعمل بھی ذرّیت میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح آیت مبارکہ منهم ظالم لنفسه و منهم مقتصد و منهم سابق بالخیرات کی تفسیر میں وارد ہے کہ پہلی قسم ظالم سے مراد گنہگار سادات ہیں۔ اسی طرح جناب رسولِ خداؐ کا یہ فرمان بھی گنہگاروں کی سیادت اور ان کی تعظیم و تکریم کے لزوم پر دلالت کرتا ہے۔ اکرموا اولادی الصالحین لله والطالحین لی۔ میری اولاد کی عزت کرو اگر نیکوکار ہوں تو خدا کے لئے اور اگر بدکار ہوں تو میرے لئے (بحار الانوار ج اجامع الاخبار)

بدعقیدہ ہونے سے شرفِ سیادت ختم ہو جاتا ہے

حضرت نوحؑ کے بیٹے کے قصہ سے یہ قیاس کرنا کہ گناہ کرنے سے انسان شرفِ سیادت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بالکل غلط ہے۔ البتہ اس واقعہ سے اس مطلب پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بدعقیدہ ہو جائے اور اپنے معصوم آباؤ اجداد کے مذہب کو ترک کر دے تو اس سے یہ شرف سلب ہو جاتا ہے کیونکہ نوحؑ کے بیٹے کا فقط یہ جرم نہ تھا کہ وہ نماز روزہ وغیرہ فروعِ دین کا پابند نہ تھا بلکہ وہ اصولی طور پر بھی شریعت

امام ولیس بامام قیل وان کان علویًا قال وان کان علویا فا طمیا وقال الصادقؑ لاصحابہ لیس بینکم و بین من خالفکم الّا المضمر قیل فاتی شیء المضمر قال الذی تسمّون نہ

حالانکہ امام نہ ہو۔ کسی نے عرض کیا اگرچہ وہ جھوٹا مدعی امامت علوی بھی ہو؟ فرمایا اگرچہ وہ علوی ہونے کے ساتھ ساتھ فاطمی بھی کیوں نہ ہو۔ حضرت نے اپنے اصحاب سے فرمایا۔ تمہارے اور تمہارے مخالفین کے درمیان صرف مضمر کا ہی فرق ہے۔ عرض کیا گیا وہ مضمر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا مضمر وہی چیز ہے جسے تم برأت کے نام سے یاد کرتے ہو۔

نوح کا منکر تھا۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کا یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے یا بنی ارکب معنا ولا تکن من الکافرین لہٰذا قرآنِ مجید میں اس کے متعلق جو وارد ہے کہ انہ عمل غیر صالح اس سے مقصود یہی ہے کہ اس کا اعتقاد غلط تھا۔ اسی بناء پر ہم ایسے نام نہاد سادات کو کسی شرف و فضیلت کا اہل نہیں سمجھتے۔ جو آئمہ طاہرینؑ کے مذہب حق کے قائل نہیں بلکہ دشمنانِ دین اور آئمہ طاہرینؑ کے مخالفین کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعظیم و تکریم تو بجائے خود ان سے برائت و بیزاری اختیار کرنا واجب ہے۔ اس طرح وہ کسی اکرام و احترام کے حق دار نہیں رہتے جیسا کہ اس قسم کے متعدد احادیث متون رسائل اعتقادیہ میں درج ہیں اور اس کی تائید مزید حضرت امام رضا علیہ السلام کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ جو وسائل الشیعہ میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا۔ النظر الی ذریتنا عبادۃ۔ قلت ھل النظر الی الائمۃ عبادۃ او النظر الی جمیع ذریۃ النبیؐ صلی اللہ علیہ وآلہ فقال۔ النظر الی جمیع ذریۃ النبیؐ عبادۃ مالم یفار قوا منھاجہ۔ ہماری ذریت کی طرف نگاہ کرنا عبادت ہے۔ راوی نے عرض کیا فقط آئمہ کی طرف نگاہ کرنا عبادت ہے؟ جب تک وہ آنحضرتؐ کے منہاج و مذہب سے خارج نہ ہو جائیں۔

بنا بریں جو لوگ بدعقیدہ اور مذاہب باطلہ کے پیروکار ہیں اور پھر دعوائے سیادت بھی کرتے ہیں۔ وہ کسی قسم کی تعظیم و تکریم کے حقدار نہیں ہیں اس طرح ان کا یہ شرف ختم ہو جاتا ہے مگر جو حضرات من حیث الاعتقاد مذہب حق کے قائل ہیں۔ ہاں عملی طور پر ان سے کچھ فروگذاشتیں ہو جاتی ہیں۔ ان کی تعظیم و تکریم بہرحال لازم ہے اور ان کے حقوق کی رعایت واجب ہے۔ ایسے حضرات کی حالت بلا تشبیہ بد اعمال والدین جیسی ہے جو والدین اگرچہ غیر صالح ہوں۔ مگر ان کا احترام بہرحال ملحوظ رکھنا لازم ہوتا ہے۔ یہی کیفیت غیر صالح سادات کی ہے کہ بوجہ انتساب الی النبیؐ والائمہؑ بہرحال ان کا احترام ملحوظ رکھنا واجب ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض ایسے سادات بھی گزرے ہیں۔ جیسے جناب زید اور ان کے

بالبراءة ومن خالفكم وجازه فابرؤا منه وان كان علويا يا فاطميا وقال الصادق لاصحابه فى ابنه عبد الله انه ليس على شيئ مما انتم عليه وانى ابرأ منه برأ الله عز وجل منه۔

جو شخص مذہب میں تمہارا مخالف ہو۔ اور مذہب حق سے تجاوز کر جائے۔ تم اس سے بیزاری اختیار کرو۔ اگرچہ وہ علوی اور فاطمی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ (افطح) کے بارے میں اپنے اصحاب سے فرمایا۔ جس مذہب پر تم لوگ ہو۔ یہ اس پر نہیں ہے۔ میں اس سے بیزار ہوں۔ خدا بھی اس سے بیزار ہو۔

فرزند یحیٰی ۔ جعفر وغیرہم جنہوں نے آئمہ حق کے بالمقابل اپنی امامت کا دعوےٰ کیا تو کیا ایسے لوگوں کی تعظیم وتکریم بھی لازم ہے؟

اس کے متعلق گذارش ہے کہ اگرچہ ایسے سادات کی مذمت میں جنہوں نے آئمہ طاہرینؑ کے بالمقابل دعوائے امامت کیا بکثرت روایات وارد ہیں اور آئمہ طاہرینؑ نے ایسے لوگوں سے بیزاری ظاہر فرمائی ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی ان سے بیزاری اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ان روایات کا خلاصہ اسی رسالہ اعتقادیہ میں مذکور ہے لیکن تاہم حزم واحتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ چونکہ یہ آئمہ کرام اور ان مسلم الثبوت سادات عظام کا جن کی سیادت میں کلام نہیں ہو سکتا داخلی معاملہ ہے اس لئے ہمیں اس سلسلہ میں خاموشی اختیار کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ آئمہ طاہرینؑ نے ان کو اپنے حقوق معاف کر دیئے ہوں بلکہ آثار سے ایسا ہی ہونا مترشح ہوتا ہے۔ چنانچہ جناب زید اور جناب جعفر وغیرہ کے متعلق ایسی روایات مل جاتی ہیں۔ چنانچہ احتجاج طبرسی میں مروی ہے کہ امام زمانہ سے چند مسائل دریافت کئے گئے۔ جن میں سے ایک مسئلہ سید جعفر کے متعلق بھی تھا۔ آپ نے جواب میں فرمایا واما عمی جعفر وبنوہ فسبیلہ سبیل اخوۃ یوسف یعنی میرے چچا جعفر اور ان کے بیٹوں کا معاملہ برادران یوسف والا ہے" اس سے علماء نے یہی سمجھا ہے کہ جس طرح ابتداء میں برادران یوسفؑ سے بہت کچھ لغزشیں واقع ہوئی تھیں۔ مگر بالآخر توفیق الٰہی ان کے شامل حال ہوئی اور وہ تائب ہوئے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے ان کو معاف کرتے ہوئے فرمایا لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم تم پر کوئی حرج نہیں۔ خدا تمہیں معاف کرے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سادات کا خاتمہ بھی یقیناً توبہ پر ہوا ہو گا انشاء اللہ۔ اسی طرح جناب زید کی مدح میں بھی متعدد روایات وارد ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الحقیقت انہوں نے اپنی امامت کا کوئی دعوےٰ ہی نہیں کیا تھا؟

دبحار الانوار، سفینۃ بحار وغیرہ)، اسی لئے جناب جعفر کو جعفر تواب کہا جاتا ہے۔ بنا بریں کم از کم غیر سادات کو تو چاہیئے کہ وہ ان کو بہر حال برائی کی بجائے اچھائی کے ساتھ یاد کریں۔ ہمارے اس بیان کی تائید امام عالیمقام کے فرمان سے ہوتی ہے۔ کتاب سفینۃ البحار ج ۲ ص۲۵۶ پر بروایت ابی سعید مکارمی موجود ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں بیٹھے تھے۔ کہ بعض نے جناب زید کو بڑے لفظوں کے ساتھ یاد کیا۔ فانتھرہ الامام وقال مھلاً لیس لکم ان تدخلوا فیما بیننا الا بسبیل خیر۔ امام عالی مقام نے اس کو جھڑک دیا اور فرمایا خبردار! تمہیں ہمارے داخلی معاملات میں بجز خیر و خوبی کے دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

صحیح النسب سادات کا تائب ہوکر مرنا

بعض اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے جو صحیح النسب سیّد ہوں اور کسی وقت کسی بداعتقادی یا بدعملی میں مبتلا ہوئے ہوں تو توفیق الٰہی ضرور ان کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ بالآخر تائب ہوکر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں چنانچہ سفینۃ البحار ج ۲ ص۲۵۶ پر مذکورہ بالا روایت کے ذیل میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا انہ لم یمت نفس منا الا وتدرکہ السعادۃ قبل ان تخرج من الدنیا ولو بفواق ناقۃ ہمارے خاندان میں سے کوئی شخص نہیں مرتا۔ مگر یہ کہ سعادت الٰہی ضرور اس کے شامل حال ہوجاتی ہے۔ اگرچہ اس کی موت میں اتنا وقت باقی ہو کہ جتنا ناقہ کے دو مرتبہ دودھ ہونے کے درمیان ہوتا ہے۔" اسی طرح سفینۃ البحار ج ۲ ص۲۵۷ اور تاریخ قم میں جناب احمد بن اسحاق (وکیل حضرت عسکری) اور سیّد حسین قمی کا جو واقعہ مذکور ہے۔ اس سے بھی اس امر کی تائید مزید ہوتی ہے۔ اس واقعہ کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جناب احمد مذکور سادات کرام کی بہت خدمت اور ان کا بہت اکرام و احترام کرتے ہیں۔ انہی سادات قم میں سے ایک سیّد حسین قمی بھی تھے۔ جناب احمد کو معلوم ہوا کہ سیّد موصوف شراب پیتے ہیں چنانچہ انہوں نے ان کا مشاہرہ بند کردیا اور جب سیّد حسین ان کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تو جناب احمد نے ان کو ملاقات کا وقت نہ دیا۔ وہ مایوس ہوکر وہ واپس چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب جناب احمد حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور اس سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ میں امامؑ کے دولت سرا پر حاضر ہوئے۔ تو امام عالی مقام نے ملاقات سے انکار کردیا۔ اور فرمایا اگر تمہارے پاس ہماری اولاد کی ملاقات کے لئے وقت نہیں تو ہمارے پاس بھی تمہاری ملاقات کے لئے وقت نہیں ہے (اتفاقاً کسی طرح جب شرف زیارت حاصل ہوا تو) جناب احمد نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں نے تو محض اس لئے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا کہ وہ شراب خواری کی بدعادت میں مبتلا تھے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا ولکن لا بد من اکرامھم و

واحترامهم علیٰ کل حال وان لا تحقّرهم ولا تستهین بهم لا تنتسابهم الینا تکونن من الخاسرین۔ "جو کچھ بھی ہو ہر حال میں سادات کا اکرام و احترام لازم ہے اور ہرگز کبھی ان کو حقیر نہ سمجھو اور نہ ان کی توہین و تذلیل کرو۔ کیونکہ ان کی نسبت ہماری طرف ہے ورنہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے"۔

جب جناب موصوف واپس قم پہنچے اور ملاقات کے لئے اصحاب و احباب آئے تو ان میں سید حسین قمی بھی تھے اب کی مرتبہ خلافِ توقع جناب احمد نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ اپنے پاس بٹھایا۔ بڑی توجہ سے مزاج پرسی کی۔ جب دوسرے لوگ اٹھ کر چلے گئے تو سید موصوف نے جناب احمد سے دریافت کیا کہ یا تو میرے لئے ملاقات کا وقت بھی نہ تھا اور یا آج یہ لطف و مدارا کی وجہ کیا ہے۔ جناب احمد نے حقیقت الامر کے اظہار میں قدرے توقف کیا۔ مگر سید صاحب کے اصرار پر انہوں نے وہ تمام ماجرا بیان کر دیا جو سید صاحب کے بارے میں ان کے اور امام علیہ السلام کے درمیان گذرا تھا۔ سید صاحب سن کر زار و قطار رونے لگے اور کہا کہ ہم اعمالِ بد کا ارتکاب کرتے ہیں مگر ہمارے بزرگوں کو پھر بھی ہمارا اس قدر پاس و لحاظ ہے۔ یہ کہہ کر اٹھے اور گھر جا کر شراب کے برتن وغیرہ توڑ ڈالے اور ایسی توبۃ النصوح کرلی کہ عابد و زاہد بن گئے۔ ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ صحیح النسب سادات کرام ابتدائی ایام میں جس قدر بد عقیدہ یا بداعمال ہوں۔ مگر وہ بالآخر ضرور تائب ہو کر دنیا سے رحلت کرتے ہیں اگر کوئی شخص باوجود مدعی سیادت ہونے کے آخری دم تک عقائدِ فاسدہ پر اڑا رہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ درحقیقت سید ہی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

آلِ رسولؐ پر صدقہ حرام ہے

اس امر میں تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور اس صدقہ سے مراد زکوٰۃ و فطرہ ہے۔ نہ مستحبی صدقہ و خیرات اور عقیقہ وغیرہ اور اس حرمت کی وجہ احادیث میں وہی بیان کی گئی ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہے کہ انما اوساخ ایدی الناس کہ یہ زکوٰۃ و فطرہ لوگوں کے ہاتھوں کی میل کچیل ہے خداوند عالم نے سادات کی عظمت کے پیشِ نظر ان کو اس ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھا ہے اس امر میں سادات وغیر سادات کے درمیان مساوات مطلقہ کے قائل حضرات کے لئے لمحۂ فکریہ اور تازیانۂ عبرت موجود ہے۔ ولکن ما اکثر العبر و اقل الاعتبار بلکہ جس طرح بادشاہوں اور شہزادوں کے اصل مال سے حصص مقرر ہوتے ہیں۔ اسی طرح سادات کے لئے بھی اصل مال کا پانچواں حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ جسے خمس کہا جاتا ہے مگر افسوس اکثر مسلمانوں نے سادات کو اپنے اس جائز حق سے محروم کر دیا۔ غیر سادات کا فطرہ و زکوٰۃ پہلے ہی سادات پر حرام تھی اور خمس امتِ رسولؐ نے بند کر دیا اور جو وجوب کے قائل بھی ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ باقاعدگی کے ساتھ اسے ادا نہیں کرتے اور جو نکالتے بھی ہیں وہ اسے صحیح مصرف میں صرف نہیں کرتے اس لئے اب سادات کرام کا خدا ہی حافظ و ناصر ہے کیونکہ ع "یہ ہی تھے دو حساب سو یوں پاک ہو گئے"۔

باب الاعتقاد فی الاخبار المفسرۃ والمجملۃ

قال الشیخ اعتقادنا فی الاخبار المفسرۃ انہ یحکم علی المجمل کما قال الصادق ؑ۔

بیالیسواں باب مجمل اور مفسر احادیث کے بارے میں اعتقاد

جناب شیخ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں جن احادیث میں تفصیلی احکام مذکور ہیں وہ مجمل احادیث کی تفسیر متصور ہوں گی اور مجمل احادیث کو ان پر محمول کیا جائے گا جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج سادات کرام کی اکثریت نان شبینہ کی محتاج نظر آتی ہے اور مسلمانوں کی دینی حمیت اور مذہبی حرارت کو چیلنج کر رہی ہے اللھم نبھنا عن نومۃ الغفلۃ والغرور۔

سادات کے لئے ثواب و عقاب دوگنا ہوتا ہے

ہم نے اوپر سادات کرام کے جس قدر فضائل و مناقب بیان کئے ہیں۔ ان کی تعظیم و تکریم کے وجوب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ قطرہ از دریا و دانہ از انبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس سے کہیں زیادہ تاکیدی روایات موجود ہیں۔ مگر بموجب کلمۃ حق یراد بھا الباطل ان احادیث سے یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ نجات اخروی کا معاملہ بھی اسی طرح ہے کہ سادات جس طرح چاہیں، شریعت مصطفوی کا تمسخر و مذاق اڑاتے پھریں۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیتے رہیں اور لوگوں کی عزتوں سے کھیلتے رہیں۔ وہ ضرور ہی بلاحساب جنت میں چلے جائیں گے اور بقول بعض جہال گناہوں کی کثافت و نجاست ان کے ٹخنوں سے اوپر جاتی ہی نہیں۔ یہ زعم بالکل باطل اور قواعد شرعیہ کے مخالف ہے۔ اس طرح تو بانی شریعت پر جنبہ داری کنبہ پروری کا الزام عائد ہوتا ہے اور اغراء بالقبیح ایسے فعل شنیع کی ذمہ داری معاذ اللہ آنجناب پر عائد ہوتی ہے جس سے ان کی ساحت عصمت و طہارت اجل و ارفع ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک اخروی نجاح و فلاح کا تعلق ہے وہ صحت اعتقاد اور عمل صالح پر موقوف ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ امر مسلمات قطعیہ میں سے ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں سادات کو دیگر افراد امت سے یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ ان کو نیکیوں پر دوگنا ثواب اور برائیوں پر دوگنا عذاب و عقاب ہوتا ہے۔ اس قسم کی بکثرت احادیث اصول کافی وغیرہ کتب معتبرہ میں مذکور ہیں اور یہ شرف انتساب کی وجہ سے ہے۔ اس میں کوئی امر قابل تعجب نہیں ہے۔ جب ازواج رسولؐ بوجہ سببی رشتہ داری کے اس قابل ہو سکتی ہیں کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے یا نساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن۔ اے نبی کی بی بیو! تم اور عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر اللہ کی پرہیزگاری اختیار کرو۔ یعنی تمہارا مرتبہ بلند اور ثواب دو چند ہوگا۔ اس کے برعکس ناشائستہ اعمال بجالانے کی صورت میں قرآن ان کو یہ تہدید کرتا ہے۔

باب الاعتقاد فی الحظر والاباحة

تینتالیسواں باب حرمت اور جواز کے متعلق عقیدہ

قال الشیخ اعتقادنا فی ذالک ان الاشیاء کلها مطلقة حتی یرد فی شیئ منها نهی

جناب شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں اس بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کے متعلق خدا کی طرف سے نہی وارد نہ ہو اس وقت تمام چیزیں جائز اور مباح سمجھی جائیں گی۔

یا نساءالنبیؐ من یأت منکن بفاحشة مبینة یضعف لها العذاب ضعفین۔ اگر تم نے بد اعمال کئے تو تمہیں دوگنا عذاب کیا جائے گا۔ تو آنحضرتؐ سے نسبی رشتہ داری کی وجہ سے یہ امتیاز کیوں نہیں حاصل ہو سکتا۔

بیالیسواں باب: مجمل اور مفسر احادیث کے بارے میں اعتقاد

مجمل و مفصل حدیث کی تعریف

جس طرح سند کے اعتبار سے متاخرین کے نزدیک حدیث کی دو قسمیں ہیں۔ خبر متواتر اور خبر واحد اور پھر خبر واحد کے کئی اقسام ہیں مثلاً صحیح، حسن، موثق اور ضعیف وغیرہ۔ اسی طرح باعتبار معنی و مفہوم کے بھی اس کی چند قسمیں ہیں جیسے محکم متشابہ، عام و خاص، مطلق و مقید اور مجمل و مفسر وغیرہا۔ مجمل اس حدیث کو کہتے ہیں جس سے متکلم کی مراد واضح نہ ہو اور مفسر و مفصل اس روایت کو کہا جاتا ہے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی معنوی پیچیدگی نہ ہو بلکہ متکلم کی مراد واضح و آشکار ہو۔

مجمل و مفسر احادیث کا حکم

یہ امر اپنے مقام پر محقق و ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن مجید کی طرح احادیث میں بھی عام و خاص، مطلق و مقید اور مجمل و مفصل وغیرہ اقسام موجود ہیں۔ علم اصولِ فقہ میں یہ مطلب مبرہن کیا جا چکا ہے کہ عام و خاص مطلق و مقید اور مجمل و مفصل میں فی الحقیقت کسی قسم کا کوئی اختلاف و تعارض نہیں ہوتا بلکہ عام کو خاص پر مطلق کو مقید پر اور مجمل کو مفصل پر محمول کیا جاتا ہے کیونکہ ارباب علم و عقل جانتے ہیں کہ خاص مقید اور مفصل آیات و روایات ہی عام، مطلق اور مجمل آیات و روایات کی تفسیر و توضیح کرتی ہیں۔ اسی طرح وارد ہے الاحادیث یفسر بعضها بعضاً۔ بعض احادیث دوسری بعض کی تشریح کرتی ہیں مثلاً اگر کوئی حاکم اپنے کسی ماتحت کو حکم دے کہ اکرم العلماء، علماء کا اکرام کرو، پھر یہ حکم دے کہ لا تکرم الفساق منهم (ان علماء میں سے جو فاسق ہیں ان کا اکرام نہ کرو) تو ظاہر ہے کہ ان دونوں حکموں میں ہرگز کسی قسم کا کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے بلکہ دوسرے حکم میں پہلے حکم کی وضاحت موجود ہے کہ ان علماء سے مراد جن کا اکرام کرنا ہے غیر فاسق

باب الاعتقاد فی الاخبار الواردة فی الطب - قال الشیخ اعتقادنا فی الاخبار الواردة فی الطب انها علیٰ وجوه منها ما قیل علیٰ ھواء مکة والمدینة فلا یجوز استعماله فی سائر الاھویة۔

چوالیسواں باب طب کے متعلق

وارد شدہ احادیث کے بارے میں اعتقاد

حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کی چند قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جو صرف مکہ اور مدینہ کی ہوا کے مطابق ہیں لہٰذا ان کو دوسرے ممالک کی آب و ہوا میں استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

علماء ہیں۔ مذکورہ بالا حقائق میں علماء اعلام کے درمیان ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی پر علماء کا عمل ہے اور اسی طریقہ مرضیہ پر محاورات عرفیہ کا دار و مدار ہے لہٰذا اس امر کے اثبات پر مزید کچھ اور دلائل و براہین پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ آنچہ عیان است۔ چہ حاجت بیان است۔

تینتالیسواں باب حرمت و اباحت کے متعلق اعتقاد کا بیان

اس مسئلہ میں اختلاف انظار

اس مسئلہ میں علمائے اصولیین و اخباریین کے درمیان یہ معمولی سا اختلاف ہے کہ جن امور کے متعلق کوئی عمومی یا خصوصی نص وارد نہ ہو آیا ان کو مباح سمجھنا چاہیئے یا حرام؟ خلاصۂ کلام یہ کہ اس میں اختلاف ہے کہ آیا اشیاء میں اصل حرمت ہے یا اباحت؟ چنانچہ تمام علماء اصولیین اور بعض اخباریین اس مسئلہ میں جواز و اباحت کے قائل ہیں مگر اکثر اخباریین حضرات خطر و حرمت کے قائل ہیں۔

مصنف کے بیان کردہ نظریہ کی تائید مزید

حق یہ ہے کہ جن امور کے متعلق بالخصوص کوئی نص وارد نہ ہو ان کو مطلق اور مباح ہی سمجھا جائے گا۔ اس مسئلہ میں علاوہ دیگر دلائل کے حضرت صادق علیہ السلام کا یہ ارشاد نصِ صریح ہے جو کہ من لا یحضرہ الفقیہ وغیرہ کتب معتبرہ میں موجود ہے فرمایا کل شيئ مطلق حتی یرد فیه نھی۔ ہر چیز اس وقت تک مباح ہے جب تک اس کے متعلق ممانعت وارد نہ ہو۔ اور یہی امر شریعتِ اسلامیہ سہلہ کا طغرائے امتیاز ہے اور یہی اس کے قوانین کلیہ و آئین جلیلہ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

ایک ضروری وضاحت

لیکن اس سلسلہ میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ یہ فیصلہ ان امور کے متعلق ہے جن کے حسن و قبح کو معلوم کرنے میں عقل مستقل نہ ہو۔ جیسے وہ عادی امور

ومنها ما اخبر به العالم على ما عرف من طبع السائل ولم يتعد موضعه اذ كان اعرف بطبه منه ومنها ما دسته المخالفون في الكتب لتقبيح صورة المذهب عند الناس ومنها ما وقع فيه سهو من ناقله ومنها ما حفظ بعضه ونسي بعضه وما روي في العسل انه شفاء من كل داء فهو صحيح ومعناه انه شفاء من كل داء بارد وما روي في الاستنجاء بالماء البارد لصاحب البواسير فان ذالك ان كان بواسيره من حرارة وما روي في الباذنجان

کچھ حدیثیں ایسی ہیں کہ ان میں امام نے کسی خاص مریض کی طبیعت کے مطابق دوا بتائی ہے اور اس سے آگے تجاوز نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ آنجناب بہ نسبت خود مریض کے اس کے مزاج سے زیادہ واقف تھے اور بعض احادیث ایسی ہیں جنہیں مخالفین نے دھوکہ سے کتابوں میں داخل کر دیا ہے تاکہ عام لوگوں کی نظروں میں مذہب حق کی صورت بگڑ جائے اور کچھ حدیثیں ایسی ہیں جن کو نقل کرنے والے راویوں سے سہو ہو گیا ہے۔ کچھ حدیثیں ایسی بھی ہیں جن کا کچھ حصہ تو (راویوں کو) یاد رہا اور کچھ حصہ فراموش ہو گیا۔ یہ جو شہد کے متعلق حدیث میں وارد ہے کہ وہ ہر مرض کے لئے شفا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے

لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ شہد میں ہر اس مرض کی شفا ہے جو سردی کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ اسی طرح بواسیر کے متعلق حدیث میں وارد ہے کہ اس کے مریض کو ٹھنڈے پانی سے استنجا کرنا چاہیے تو یہ اس صورت میں ہے کہ جب یہ مرض گرم چیزوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہو اسی طرح بینگن کے متعلق جو وارد ہے کہ

امور جن کے مصالح ومفاسد حالات واشخاص کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں اور اختلاف شرائع سے ان میں مناسب حال حک واصلاح اور ترمیم وتنسیخ ہوتی ہے۔ مگر وہ امور جن کے قبح پر عقل مستقل ہے جیسے ظلم کرنا جھوٹ بولنا اور چوری کرنا وغیرہ۔ تو اگرچہ ان امور کی حرمت پر کوئی نص وارد نہ بھی ہو تو بھی ان کو حرام ہی سمجھا جائیگا ان کے جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ اشیاء کے حسن وقبح کو عقلی تسلیم کر لینے کے بعد جیسا کہ اہل حق کا نظریہ ہے، مزید کسی توضیح وتشریح کا محتاج نہیں رہتا۔ فتدبر۔

چوالیسواں باب
طب کے بارہ میں وارد شدہ احادیث کے متعلق اعتقاد کا بیان

مرض وشفا کا من جانب اللہ ہونا

کئی آیات واحادیث میں وارد ہے کہ مرض اور شفا منجانب خدا ہے

من الشفا فانه في وقت ادراك الرطب لمن ياكل الرطب دون غيره من سائر الاوقات واما ادوية العلل الصحيحة من الائمة فهي آيات القرآن وسوره والادعية على حسب ماوردت به الاثار بالاسانيد القوية والطرق الصحيحة وقال الصادقؑ كان فيما مضى يسمى الطبيب المعالج فقال موسىٰ بن عمران يا رب ممن الداء قال مني و قال يا رب ممن الدواء قال من عندي فقال فما يصنع الناس بالمعالج؟ فقال يطيب بذالك

اس میں شفا ہے تو یہاں بھی یہ حکم خاص اس وقت کے لئے ہے جب کہ خرما پکنا شروع ہوا ہو اور مریض خرما کھائے۔ ہر وقت اور ہر شخص کے لئے نہیں ہے البتہ۔ بیماریوں کی صحیح دوائیں جو آئمہ اطہار علیہم السلام سے منقول ہیں۔ وہ قرآن کی آیات اور سورتیں ہیں اور ایسی دعائیں جو کتب احادیث میں صحیح اور مستند طریقے سے وارد ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا گذشتہ زمانہ کے لوگ طبیب کو معالج کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ بن عمران نے دربار خداوندی میں عرض کیا میرے پروردگار! بیماری کس کی طرف سے ہے؟ فرمایا میری طرف سے۔ پھر عرض کیا دوا کس کی طرف سے ہے۔ فرمایا وہ بھی میری طرف سے جناب موسیٰ نے عرض کیا تو پھر یہ لوگ معالج کے پاس جاکر کیا کرتے ہیں؟ فرمایا اس سے ان کے دل خوش ہو جاتے ہیں۔

عزّ وجل ہے۔ جیساکہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی زبانی وارد ہے واذا مرضت فهو يشفين۔ میں جب مریض ہوتا ہوں تو خداوند عالم مجھے شفا عطا فرماتا ہے۔ علل الشرائع ج ۲ صہ ۲۱۳ میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا اگلے زمانہ میں طبیب کو معالج کہا جاتا تھا۔ اسے طبیب کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک بار حضرت موسیٰؑ نے بارگاہ رب العزت میں سوال کیا یا رب ممن الداء بار الہا مرض کس کی طرف سے ہے فقال مني ارشاد ہوا میری طرف سے پھر پوچھا ممن الدواء شفا کس کی طرف سے ہے جواب ملا میری طرف سے۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا۔ فما يصنع الناس بالمعالج۔ پھر لوگ معالج کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ ارشاد ہوا يطيب بذالك انفسهم۔ اس سے ان کے نفوس خوش ہو جاتے ہیں فسمي الطبيب لذالك۔ حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں اس وجہ سے معالج کا نام طبیب رکھا گیا۔ ان امراض میں انسان کے لئے کئی جسمانی اور روحانی فوائد مضمر ہوتے ہیں کہ جن کی وضاحت کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ مرض کو موت کا قاصد کہا گیا ہے۔ یہ کئی چھوٹے بڑے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔

النفسهم فسمّی الطبیب طبیبًا بذالک واصل الطبّ التداوی وکان داؤد ینبت فی محرابه کل یوم حشیشة فتقول خذنی فانی اصلح لکذا وکذا فرأی فی اخر عمره حشیشة نبتت فی محرابه فقال لها ما اسمك فقال انا الخروبیة فقال داؤد خرب المحراب فلا ینبت فیه

اسی بنار پر معالج کو طبیب کہا جانے لگا اور لغت میں طب کے معنی دوا کرنے کے ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ کی محراب میں روزانہ ایک گھاس اُگتی۔ قدرتِ ایزدی سے گویا ہو کر کہتی اے داؤدؑ! مجھے حاصل کر لیجئے کہ میں فلاں فلاں مرض کے لئے کام آؤں گی۔ چنانچہ جناب داؤدؑ نے اپنی آخری عمر میں محراب میں ایک گھاس کو اگا ہوا دیکھ کر اس نے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میرا نام خروبیہ ہے۔ اس وقت حضرت داؤدؑ نے فرمایا بس میری محراب تباہ ہو گی۔

اطباء کی طرف رجوع کرنے کا حکم

باوجودیکہ شفا خدا کی طرف سے ہے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے لیکن تاہم اس عالمِ اسباب میں طبیب کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ انوارِ نعمانیہ میں حضرت صادقؑ سے مروی ہے فرمایا ان نبیًا من الانبیا مرض فقال لا اتداوی حتی یکون الذی امرضنی هو الذی یشفینی فاوحی الله عزّوجل لا اشفیك حتی تتداوی۔ ایک نبی بیمار ہوئے۔ انہوں نے کہا میں ہرگز علاج نہیں کروں گا۔ جب تک وہ ذات خود مجھے شفا نہ دے جس نے مجھے مریض کیا ہے! ارشادِ قدرت ہوا کہ میں اس وقت تک ہرگز تمہیں شفا نہیں دوں گا جب تک تم علاج نہیں کرو گے! یہ بھی واضح ہے کہ علمِ طب بڑا جلیل القدر اور شریف علم ہے اور بطریق وحی و الہام اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ اطباء نے اسے انبیاء سے اور انبیاء نے خداوندِ عالم سے حاصل کیا ہے جیسا کہ متن رسالہ کی روایت بھی اس پر دلالت کرتی ہے کیونکہ حقیقتِ مرض اور اس کے علاج اور ہر ہر چیز کے خواص و آثار کا حقیقی علم بجز خالقِ اشیاء کے کسی اور کو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ تجربہ کو بھی بہت حد تک اس میں دخل ہے۔ مگر یہ بھی مسلّم ہے کہ دوا اسی وقت تاثیر کرتی ہے۔ جب اسے اذنِ خداوندی ہوتا ہے ورنہ تاثیر الٹی ہو جاتی ہے اور بجائے فائدہ کے نقصان پہنچ جاتا ہے۔ کما قیل ؎

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود
روغن بادام خشکی می کند

حفظانِ صحت کے بعض زرّیں اصول

روحانی اطباء یعنی جنابِ رسولِ خداؐ و آئمہ ہدیٰ علیہم السلام سے حفظانِ صحت کے بڑے زرّیں اصول مروی ہیں۔ جیسے

شئی بعدہ وقال النبیؐ من لم یشفہ الحمد فلا شفاہ اللّٰہ۔

اب اس کے بعد بیان کوئی چیز نہیں اُگے گی۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا جس شخص کو سورۂ حمد شفا نہ دے اس کو خدا بھی شفا نہ دے۔

یہ کہ المعدۃ بیت الادواء معدہ تمام امراض کا گھر ہے۔ والحمیۃ رأس کل دواء اور کم خوری تمام دواؤں کی سرتاج ہے۔" حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا لوان الناس قصدوا فی الطعام لاستقامت ابدانھم اگر لوگ طعام خوری میں میانہ روی اختیار کرتے تو ان کے بدن تندرست رہتے اور کبھی بیمار نہ ہوتے۔ بعض روایات میں وارد ہے کہ ایک نصرانی طبیب جناب صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور آنجناب سے دریافت کیا یا ابن رسول اللہ فی کتاب ربکم ام فی سنۃ نبیکم شیئی من الطب بسلسلہ فرزندِ رسول! کیا تمہارے رب کی کتاب یا تمہارے نبی کی سنت میں طب کے متعلق بھی کچھ وارد ہے؟ فرمایا نعم اما کتاب ربنا فقولہ تعالیٰ کلوا واشربوا ولا تسرفوا واما سنۃ نبینا فقال صلی اللہ علیہ وآلہ الحمیۃ من الاکل رأس کل دواء والاسراف فی الاکل رأس کل داء ہاں کتاب اللہ اور سنتِ نبویہ دونوں میں طب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ کتاب اللہ میں وارد ہے کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو اور سنتِ نبویہ میں وارد ہے کہ پیغمبرِ اسلام نے فرمایا کم خوری تمام دواؤں کی اصل اور پُرخوری تمام امراض کی جڑ ہے نصرانی یہ سن کر یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ واللہ ما ترک کتاب ربکم ولا سنۃ نبیکم شیئاً من الطب لجالینوس خدا کی قسم تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت نے جالینوس کے لئے کچھ طب باقی نہیں چھوڑی۔ (انوارِ نعمانیہ)

طبِ روحانی و جسمانی

اسی طرح ان حکمائے روحانیین سے امراضِ جسمانیہ سے شفا حاصل کرنے کے بڑا عمدہ روحانی اور جسمانی معالجات و مداوات مروی ہیں۔ جسمانی معالجات کا معتدبہ ذخیرہ طب الائمہ۔ طب الامام الصادق۔ طب الرضا اور زمز الصحت وغیرہ رسائل شریفہ میں موجود ہے اور روحانی علاج آیات و سور قرآنیہ اور ادعیہ مبارکہ کی شکل میں موجود ہے۔ از سرتاقدم تمام انسانی امراض کے متعلق ان بزرگوں سے آیات و ادعیہ منقول ہیں اور اکثر و بیشتر مجرب بھی ہیں۔ ہاں یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے صدق مقال و اکلِ حلال اور یقینِ کامل شرطِ اولین ہے کما قیل ؎

قرآن تو قرآن دعاؤں میں ہے تاثیر — جوہر جو نہیں کھلتے یہ عامل کی ہے تقصیر

آئمہ اطہار کی تعلیم کردہ ادویہ سب لوگوں کے لئے مفید ہیں

یہ روحانی طریقِ علاج علاوہ ارزاں ہونے کے سب کے لئے یکساں مفید بھی ہے باقی رہے جسمانی معالجات اور وہ دوائیں جو آئمہ طاہرین سے مختلف امراض کے سلسلہ میں منقول ہیں۔ آیا وہ تمام ممالک اور تمام اشخاص کے لئے یکساں طور پر مفید اور کارآمد ہیں یا اس میں ممالک کی آب و ہوا اور افراد کے اختلاف امزجہ و طبائع کو کچھ دخل ہے کہ بعض افراد کے لئے مفید اور بعض کے لئے غیر مفید، بعض ممالک کے لئے مفید اور بعض کے لئے مضر ہیں؟ اس سلسلہ میں علمائے اعلام کے نظریات قدرے مختلف ہیں۔ اگرچہ حضرت مصنف علامؒ کے اس سلسلہ میں افادات عمدہ ہیں اور متکلمین حضرات کے رفع شکوک و شبہات کے لئے کافی ہیں اور طبی نقطہ نگاہ سے بھی درست ہیں مگر ہمیں جناب محدث سید نعمت اللہ جزائری علیہ الرحمۃ کی تحقیقِ انیق زیادہ پسند ہے وللناس فیما یعشقون مذاہب چنانچہ بزرگوار اپنی کتاب انوارِ نعمانیہ میں حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ والے بیان کردہ احتمالات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں ولکن الحق ان فی بعض الاخبار ما یدل علی العموم مثل ما روی فی غیر واحد من الاحادیث من الاستشفاء والمداواۃ بالعسل لقولہ تعالیٰ فیہ شفاء للناس فان القرآن لم ینزل لخصوص بلد دون اخری وح فالحق فی الجواب ھو ما ورد عنھم علیھم السلام من انواع الادویۃ لانواع الامراض عام شامل للابدان والبلدان نعم ینبغی للمریض ان یتعاطی تلک الادویۃ من جزم ثم القلب وصمیمہ وان لا یتوھم من شیء منھا فانک قد تحققت ان من تطیّر من شیء ضرّہ ذالک الشیء۔ وقد شاھدنا جماعۃ من الافاضل ممن ساعدھم وفور الاخلاص بتلک الادویۃ اوردوا فی خراسان بلاد الادویۃ المذکورۃ فی طب الائمۃ وغیرہ التی لم تداوی اھل تلک البلاد تناولوا منھا انواع المرض بزعمھم وحصل لھم ببرکۃ الاخلاص الشفاء العاجل فلیس السبب الا ما عرفت یعنی حق یہ ہے کہ بعض اخبار عموم (بلاد و عباد) پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ کئی حدیثوں میں شہد سے علاج کرنے کا ذکر ہے کیونکہ ارشادِ قدرت ہے کہ اس میں لوگوں کے لئے شفا موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کسی خاص شہر (یا کسی خاص فرد) کے لئے نازل نہیں ہوا۔ لہٰذا حقیقی جواب یہ ہے کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام سے مختلف امراض کے لئے جو مختلف ادویہ و علاج منقول ہیں۔ یہ تمام شہروں اور تمام لوگوں کو شامل ہیں۔ ہاں البتہ مریض کو چاہیئے کہ ان ادویہ کو صدقِ دل اور یقینِ کامل کے ساتھ استعمال کرے اور ان کے استعمال کرنے میں کسی قسم کے ضرر و نقصان کا وہم و گمان بھی نہ کرے کیونکہ انسان جس اچھی چیز کے متعلق بھی شگونِ بد لے وہ اسے ضرر پہنچاتی ہے۔ ہم نے خود فضلاء کی ایک ایسی جماعت کو دیکھا ہے جن کا دامن نعمتِ اخلاص سے پُر تھا

باب الاعتقاد فی الحدیثین المختلفین

قال الشیخ اعتقادنا فی الاخبار الصحیحۃ عن الائمۃ انھا موافقۃ لکتاب اللہ متفقۃ المعانی غیر مختلفۃ لانھا ماخوذۃ من طریق الوحی عن اللہ سبحانہ ولو کانت من عند غیر اللہ لکانت مختلفۃ ولا یکون اختلاف ظواھر الاخبار الا لعلل مختلفۃ مثل ما جاء فی کفارۃ الظھار عتق رقبۃ وجاء فی خبر اخر صیام شھرین متتابعین وجاء فی خبر اخر اطعام ستین مسکینا وکلھا صحیحۃ فالصیام لمن لم یجد العتق والاطعام لمن لم یستطع الصیام وقد روی

پینتالیسواں باب دو مختلف حدیثوں کے متعلق اعتقاد

حضرت شیخ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ جو حدیثیں صحیح طرق واسانید کے ساتھ آئمہ اہلبیت علیہم السلام سے مروی ہیں. وہ سب کی سب قرآن کے موافق ہیں اور معنوی طور پر وہ سب باہم متفق ہیں۔ ان میں کوئی باہمی اختلاف وتضاد نہیں ہے کیونکہ وہ بذریعہ وحی والہام خداوندِ علام سے ماخوذ ہیں۔ ہاں اگر وہ خدا کے علاوہ کسی اور کی جانب سے ہوتیں تو ان میں ضرور اختلاف ہوتا اور جن احادیث میں ظاہری طور پر کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے مختلف علل واسباب ہیں مثلاً ظہار کے کفارہ کے بارے میں ایک حدیث میں ایک بندہ آزاد کرنے کا حکم ہے، دوسری روایت میں دو ماہ کے متواتر روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور تیسری حدیث میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا وارد ہے وان احادیث میں بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے حالانکہ یہ تینوں احادیث اپنے اپنے مقام پر بالکل درست ہیں. روزے اس شخص پر واجب ہیں جسے آزاد کرنے کے لئے غلام نہ مل سکے۔ کھانا کھلانے کا حکم اس شخص کے لئے ہے جو روزہ رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

کہ وہ خراسان میں رہ کر ان ادویہ کے ساتھ اپنا علاج معالجہ کرتے تھے جو رسالہ طب الائمہ وغیرہ میں مذکور ہیں کہ لوگوں کے گمان کے مطابق اگر ان شہروں والے لوگ ان کو استعمال کریں تو انہیں کئی قسم کے ضرر ونقصان حاصل ہوں۔ مگر ان فضلاء کرام نے انہی ادویہ سے شفا کامل حاصل کی ہے اور یہ سب کچھ اسی یقین کامل کا نتیجہ ہے۔

انتھی کلامہ رفع فی الخلد مقامہ وھو جوھر ثمین وبالفدار قمین ونعم ما قیل ؎

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

انه يتصدق بما يطيق وذالك محمول على من لم يقدر على الاطعام ومنها ما يقوم كل واحد منها مقام الآخر مثل ما جاء في كفارة اليمين اطعام عشرة مساكين من اوسط ما تطعمون اهليكم او كسوتهم او تحرير رقبة ومن لم يجد فصيام ثلاثة ايام فاذا ورد في كفارة اليمين ثلاثة اخبار احدها الاطعام وثانيها الكسوة وثالثها تحرير رقبة كان ذالك عند الجاهل مختلفاً وليس بمختلف بل كل واحدة من هذه الكفارات تقوم مقام الاخرى وفي الاخبار ما ورد للتقية وروى عن سليم بن قيس الهلالی

اور یہ بھی منقول ہے کہ وہ جتنی قدرت رکھتا ہے اتنا صدقہ دے دے یہ حکم اس آدمی کے لئے ہے جو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ کچھ احادیث ایسی بھی ہیں کہ دبظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں لیکن فی الحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایک حدیث دوسری حدیث کے قائمقام ہو جاتی ہے جیسے مخالفت قسم کے کفارہ کے متعلق وارد ہوا ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ۔ جو تم اپنے اہلِ خانہ کو کھلاتے ہو یا دس مسکینوں کو لباس پہناؤ۔ یا ایک بندہ آزاد کرو اور جس کے پاس آزاد کرنے کے لئے غلام نہ ہو وہ تین روزے رکھے۔ کفارۂ قسم کے سلسلہ میں یہ تین قسم کی احادیث وارد ہوئی ہیں ایک میں کھانا کھلانے کا حکم ہے۔ دوسری میں لباس پہنانے کا اور تیسری میں غلام آزاد کرنے کا اب ایک جاہل آدمی کے نزدیک تو یہ حدیثیں باہم مختلف ہیں حالانکہ درحقیقت ان میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان تین کفاروں میں سے جو بھی ایک ادا کر دیا جائے گا وہ باقی دو کفاروں کے قائم مقام ہو جائے گا اور کچھ حدیثیں ایسی بھی ہیں جو حالتِ تقیہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اس اختلاف کا ایک اور خاص سبب بھی ہے چنانچہ سلیم بن قیس ہلالی کا بیان ہے کہ۔

پینتالیسواں باب مختلف حدیثوں کے بارے میں اعتقاد کا بیان

حدیث کی تعریف لغوی معنی کے اعتبار سے حدیث و کلام باہم مترادف ہیں اور اصطلاحِ محدثین میں بنا بر مشہور حدیث اس چیز کا نام ہے جس میں قول یا فعل یا تقریر معصوم کی حکایت کی جائے؛ محدثین کے نزدیک۔ خبر بھی مجازاً اسی معنی میں استعمال ہوتی ہے بلکہ سنت کو جس کے اصطلاحی حقیقی معنی قول یا فعل یا تقریر معصوم کے ہیں۔ بعض اوقات حدیث کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے (دریۃ الدرایہ)

انه قال قلت لامیر المومنینؑ انی سمعت من سلیمان ومقداد وابی ذر شیئاً من تفسیر القرآن ومن الاحادیث عن النبیؐ غیرما فی ایدی الناس وسمعت منک تصدیق ما سمعت منهم ورائیت فی ایدی الناس اشیاء کثیرۃ من تفسیر القرآن ومن الاحادیث عن النبیؐ انتم تخالفون فیہا وتزعمون ان ذالک کلہ باطل افتری الناس یکذبون علی رسول اللہ متعمدین ویفسرون بارائہم؟ قال فقال علیؑ قد سئلت فافہم الجواب ان فی ایدی الناس حقاً وباطلاً وصدقاً وکذباً وناسخاً ومنسوخاً وخاصاً وعاماً ومحکماً و۔

میں نے جناب امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے سلمان۔ ابوذر اور مقداد۔ رضوان اللہ علیہم سے بعض آیات کی ایسی تفسیر اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض ایسی احادیث بہ آپ سے سنی ہیں جو دوسرے لوگوں کی تفسیر واحادیث کے مخالف ہیں اور پھر میں نے آپ سے ان بزرگ حضرات کی روایات کی تصدیق سنی ہے نیز میں نے لوگوں کے پاس تفسیر قرآنی اور احادیث نبویہ کا ایک ذخیرہ دیکھا ہے جس سے آپ کی حضرات مخالفت کرتے ہیں اور آپ کا یہ خیال ہے کہ یہ سب کا سب ذخیرۂ تفسیر و حدیث غلط اور باطل ہے کیا ان لوگوں نے عمداً جناب رسالتمآبؐ پر جھوٹ بولا ہے اور قرآن کی تفسیر بالرائے کی ہے؟ راوی (سلیم بن قیس) بیان کرتا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا اے سلیم! جب تم نے سوال کیا ہے تو اس کا جواب سمجھنے کی کوشش کرو۔ لوگوں کے پاس جو کچھ موجود ہے اس میں حق بھی ہے اور باطل بھی سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ ناسخ بھی ہے اور منسوخ بھی خاص بھی ہے اور عام بھی اور محکم بھی ہے اور متشابہ بھی۔

ابتدائے اسلام میں لوگ حافظہ کے زور سے زبانی حدیثیں یاد کرکے بیان کرتے تھے۔ مگر مرور ایام سے اس کی تدوین و ترویج شروع ہو گئی۔ اس سلسلہ کی ابتدا پہلی صدی ہجری میں ہی ہو گئی تھی اور بعد میں تو اس فن نے بڑی اہمیت حاصل کی اور اسلام میں بڑے بڑے جلیل القدر محدث اور حافظ الحدیث بزرگ پیدا ہوئے اور یہ امر خصائص اسلام میں شمار ہوتا ہے۔ دوسرے ملل و مذاہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

فن حدیث کی فضیلت

حقیقت یہ ہے کہ علوم اسلامیہ میں سے علم حدیث بہت ہی عظیم الشان اور جلیل القدر علم ہے اور اس میں نجات دارین۔ صلاح نشاتین اور نجاح کونین کے سب اسباب موجود ہیں۔ غواص بحار الانوار حضرت علامہ محمد باقر مجلسی علیہ الرحمۃ نے بحار ج ا ۱ پر فن حدیث کے متعلق جن زرین خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ قابل دید ہیں فاستمع لما یتلیٰ علیک فرماتے ہیں:

متشابهاً و حفظاً و وهماً و قد كذب على رسول الله في عهده حتى قام خطيباً فقال ايها الناس قد كثرت الكذابة علي فمن كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار ثم كذب عليه من بعده فانما اتيكم الحديث من اربعة ليس لهم خامس رجل منافق اظهر الايمان متصنع بالاسلام ولم يتأثم ولم يتحرج ان يكذب على رسول الله متعمداً فلو علم الناس انه منافق كذاب لم يقبلوا منه ولم يصدقوه ولكنهم قالوا هذا صحب رسول الله ورآه وسمع منه فاخذوا عنه وهم لا يعرفون حاله وقد اخبرك الله تعالى

ان لوگوں کو بعض چیزیں تو یاد ہیں اور بعض میں انہیں وہم و اشتباہ ہو گیا ہے۔ جناب رسالتمآبؐ کے عین حیات ہی میں آنحضرتؐ پر جھوٹ بولا گیا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرتؐ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا اے لوگو مجھ پر جھوٹ بولنے والے بکثرت ہو گئے ہیں (آگاہ ہو جاؤ) جو شخص بھی مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے گا وہ اپنا مقام دوزخ میں بنائے گا۔ پھر آپؐ کی وفات کے بعد بھی برابر آپ پر جھوٹ بولا گیا جس قدر حدیثیں تمہارے پاس پہنچی ہیں وہ چار قسم کے راویوں کے ذریعہ پہنچی ہیں ان میں کوئی پانچواں شخص شامل نہیں ہے۔ ایک تو وہ منافق ہے جو مصنوعی مسلمان ہے فقط ظاہری لبادۂ ایمان اوڑھ رکھا ہے۔ وہ جناب رسول اللہؐ پر عمداً جھوٹ بولنے میں کسی قسم کا گناہ و حرج محسوس نہیں کرتا۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص فی الواقع منافق اور جھوٹا ہے تو وہ نہ اس کی کسی بات کو قبول کرتے اور نہ اس کی تصدیق کرتے۔ مگر لوگ (بوجہ عدم واقفیت) یہ کہتے ہیں کہ یہ جناب رسول خداؐ کا صحابی ہے۔ اس نے آنحضرتؐ کو دیکھا ہے اور ان کا کلام سنا ہے بدیں وجہ انہوں نے اس سے حدیثیں

ولعمري لقد وجدتها سفينة نجاة مشحونة بذخائر السعادات والفيتها مزيناً بالبينات المنجية من ظلم الجهالات ورأيت سبلها لائحة وطرقها واضحة واعلام الهداية والفلاح على مسالكها مرفوعة واصوات الداعين الى الفوز والنجاح في مناهجها مسموعة ووصلت في شوارعها الى رياض نضرة وحدائق خضرة مزينة بازهار كل علم وثمار كل حكمة والبصرة في طي منازلها طرقاً مسلوكة معمورة موصلة الى كل شرف ومنزلة فلم اعثر على حكمة الا وفيها صفوها ولم اظفر بحقيقة الا وفيها اصلها۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم میں نے احادیث کو نجات کی ایسی کشتی پایا ہے جو سعادات کے ذخیروں سے لبریز ہے اور میں نے ان کو منارہائے نور سے اس طرح مزین و مرصع پایا ہے جو جہالت کی تاریکیوں سے نجات دہندہ ہیں۔ میں نے ان کے راستوں

عن المنافقين بما اخبروا ووصفهم بما وصفهم فقال عز من قائل اذا رأيتهم تعجبك اجسامهم وان يقولوا تسمع لقولهم كانهم خشب مسندة الآية ثم تفرقوا بعده فتقربوا الى ائمة الضلالة والدعاة الى النار بالزور والكذب والبهتان فولوهم الاعمال واكلوا بهم الدنيا وحملوهم على رقاب الناس وانما الناس مع الملوك والدنيا الا من عصمه الله فهذا احد الاربعة وسمع رجل آخر من رسول الله شيئا ولم يحفظه على وجهه ووهم فيه ولم يتعمد كذبا فهو فى يده يقول به ويعمل به ويرويه ويقول انا سمعته عن رسول الله فلو علم الناس انه وهم لم يقبلوه ولو علم هو انه

حالانکہ خداوند عالم نے صحابۂ رسولؐ میں منافقین کے موجود ہونے کی (قرآن میں) خبر دی ہے اور ان کے اوصافِ مخصوصہ بھی بیان فرمائے۔ چنانچہ فرمایا ہے اے رسول! جب تم ان لوگوں کو دیکھتے ہو تو تجھے ان کی جسمانی ساخت بھلی معلوم ہوتی ہے اور اگر وہ باتیں کریں تو تم ان کی باتوں کو سنتے ہو (مگر درحقیقت) گویا یہ چند لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی کر دی گئی ہیں، آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد یہ لوگ متفرق ہوگئے اور آئمۂ ضلالت اور داعیانِ دوزخ اربابِ اقتدار کی بارگاہ میں جھوٹ بہتان اور مکروفریب کے ذریعے سے تقرب حاصل کیا اور ان ائمۂ ضلالت نے ان کو لوگوں کا حاکم بنا دیا اور ان کے ذریعہ سے دنیا کو خوب حاصل کیا۔ حکمرانوں نے ان منافقوں کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیا اور یہ مسلّم ہے کہ عوام الناس ہمیشہ بادشاہوں اور دنیا کا ہی ساتھ دیتے ہیں۔ مگر جسے خداوند عالم محفوظ رکھے : حدیثِ نبویؐ کے چار راویوں میں سے پہلی قسم یہ ہے۔ راویانِ حدیث میں سے دوسری قسم کا راوی ایسا تھا کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی حدیث سنی مگر اسے پوری طرح یاد نہ رکھ سکا اسے وہم واشتباہ ہوگیا اور کچھ کا کچھ سمجھ لیا۔ یہ شخص جان بوجھ کر رسول اللہؐ پر جھوٹ نہیں بولتا جو (غلط یا صحیح) اس کے پاس موجود ہے وہ اس پر عمل بھی کرتا ہے اور اس کو نقل بھی کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے۔ کہ میں نے یہ حدیث رسول اللہؐ سے سُنی ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس بات کا علم ہو جاتا کہ اس شخص کو وہم واشتباہ ہوگیا ہے تو وہ اس سے ہرگز حدیث قبول نہ کرتے بلکہ اگر خود اس راوی کو بھی یہ معلوم

کو واضح ولائح دیکھا ہے اور اس راہ کے سالکین کے لئے رشد وہدایت اور نجاح وفلاح کے پرچم بلند دیکھے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ فوز وفلاح کی طرف دعوت دینے والے بزرگوں کی آوازیں ان راستوں کے چلنے والوں کے گوش گزار ہوتی ہیں۔ میں اس شہر کے کوچوں میں چلتے چلتے ایسے ترو تازہ اور سرسبز وشاداب باغات تک پہنچ گیا کہ جو ہر علم کے پھولوں اور ہر حکمت کے پھلوں سے مزین اور آراستہ وپیراستہ تھے۔ میں نے ان منازل کو

وهم لرفضه ورجل ثالث سمع من رسول الله شيئاً امر به ثم نهى عنه و هولا يعلم او سمعه نهى عن شيئ ثم امر به وهولا يعلم فحفظ منسوخه و لم يحفظ الناسخ فلو علم انه منسوخ لرفضه ولو علم المسلمون ان ما سمعوه منه انه منسوخ لرفضوه ورجل رابع لم يكذب على الله ولا على رسول الله مبغضاً للكذب خوفاً من الله عز وجل و تعظيماً لرسول الله لم ينسه بل حفظ ما سمع على وجهه فجاء بما سمع لم يزد ولا ينقص منه و علم الناسخ والمنسوخ فعمل بالناسخ و رفض المنسوخ وان امر النبی مثل القرآن ناسخ و منسوخ وخاص وعام۔

جائے کہ اسے وہم ہو گیا ہے تو وہ اسے چھوڑ دے تیسرا شخص راویان اخبار میں سے وہ ہے جس نے سنا کہ جناب رسول اللہ کسی چیز کا حکم دے رہے تھے مگر بعد میں کسی وقت اس کی ممانعت کر دی لیکن اس کو اس ممانعت کی خبر نہیں یا اس کے برعکس اس نے رسول اللہ سے کسی چیز کی ممانعت سنی مگر آنحضرت نے بعد میں اس کا حکم دے دیا لیکن اسے اس کا علم نہ ہو سکا اس طرح اس شخص نے منسوخ کو تو یاد کر لیا مگر ناسخ کو (اپنی لاعلمی کی وجہ سے) یاد نہ کر سکا۔ اگر اسے اس بات کا علم ہو جاتا کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے تو وہ ضرور اس کو ترک کر دیتا اسی طرح اگر دوسرے مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوتا کہ یہ حکم منسوخ شدہ ہے تو وہ بھی اس کو چھوڑ دیتے۔

چوتھا شخص وہ ہے جس نے کبھی بھی خدا اور رسولؐ پر جھوٹ نہیں بولا۔ وہ خدا کے خوف اور تعظیم رسولؐ کی وجہ سے جھوٹ سے نفرت کرتا ہے اور اسے برا سمجھتا ہے اس نے کسی چیز کو فراموش بھی نہیں کیا بلکہ جس طرح اس نے رسول اللہ سے کوئی حکم سنا اسے ویسا ہی یاد ہے اور اسی طرح آگے بیان بھی کرتا ہے۔ اس نے اس میں نہ کچھ بڑھایا ہے اور نہ کچھ گھٹایا ہے۔ اسے چونکہ ناسخ و منسوخ کا علم ہے اس لئے وہ ناسخ پر عمل کرتا ہے اور منسوخ کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ جناب رسالتمآبؐ کے اوامر و احکام میں کلام الٰہی کی طرح ناسخ و منسوخ خاص و عام

عبور کرتے وقت چند آباد اور پر شرف و عظمت تک پہنچانے والے راستوں کو بھی دیکھا ہے۔ میں نے کہیں بھی کوئی حکمت و دانائی کی بات نہیں دیکھی جس کا خلاصہ اور نچوڑ احادیث میں موجود نہ ہو اور کسی ایسی حقیقت و واقعیت پر مطلع نہیں ہوا۔ جس کی اصل احادیث میں مذکور نہ ہو۔ حدیث کے متعلق یہ اس بزرگوار کے تاثرات ہیں جس کی عمر عزیز انہی دیار میں گشت کرتے اور انہی سرسبز و شاداب باغات کی سیر کرتے ہوئے گزری ہے والد بہائی مشائخ بیت مومنین کی جلائے ایمانی کے لئے رسالہ شریفہ ہدیۃ المحدثین طبع ایران ص۲۶ سے فضیلت حدیث کے متعلق ایک

ومحكم ومتشابه وقد يكون من رسول
الله كلام له وجهان كلام عام وكلام
خاص مثل القرآن قال الله عز وجل في
كتابه وما آتيكم الرسول فخذوه و
ما نهيكم عنه فانتهوا فاشتبه على من
لم يعرف ما عنى الله ورسوله وليس
كل اصحاب رسول الله يسألونه ويستفهمونه
لان الله نهاهم عن السؤال حيث يقول
يا ايها الذين آمنوا لا تسئلوا عن اشياء ان
تبد لكم تسؤكم وان تسألوا عنها حين
ينزل القرآن تبد لكم عفا الله عنها والله
غفور حليم قد سألها قوم من قبلكم
ثم اصبحوا بها كافرين فمنعوا۔

اور محکم و متشابہ کا سلسلہ جاری ہے۔ قرآن کی طرح
کبھی رسول اللہ کے کلام کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں
ایک لحاظ سے وہ عام ہوتا ہے اور دوسری حیثیت
سے خاص۔ خداوندِ عالم اپنی کتاب میں فرماتا ہے
رسولِ خدا تمہیں جو حکم دیں ان کو لے لو اور جن باتوں
سے روکیں ان سے رک جاؤ۔ ایسے دو پہلو کلام کا
صحیح مفہوم کم علم لوگوں پر مشتبہ ہو گیا اور جناب
رسول اللہ کے صحابی ایسے نہ تھے کہ وہ تمام باتوں
کے متعلق رسول اللہ سے سوال کرتے اور حقیقتِ حال
معلوم کر سکتے کیونکہ صحابہ میں سے کچھ ایسے لوگ
بھی تھے جو آنحضرت سے سوال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ
خداوندِ عالم نے انہیں سوال کرنے کی ممانعت کر دی
تھی جیسا کہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے۔ اے ایمان والو!
ان چیزوں کی نسبت سوال نہ کرو جو اگر تمہارے لئے کھول کر بیان کی جائیں تو تم کو بری لگیں اور اگر قرآن نازل ہوتے
وقت تم ان کی نسبت سوال کرو گے تو وہ تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر کیا ہے اور
اللہ بڑا بخشنے والا (اور) بردبار ہے تم سے پہلے لوگوں نے بھی ان باتوں کو دریافت کیا تھا۔ پھر ان کے منکر ہو گئے۔

احادیث شریفہ نقل کی جاتی ہیں۔ (۱) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں یا فضیل ان حدیثنا یحیی
القلوب۔ اے فضیل ہماری احادیث دلوں کو زندہ کرتی ہیں۔ (۲) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں
حدیث تاخذہ من صادق خیر من الدنیا وما فیہا من ذہب وفضۃ۔ اگر ایک حدیث کسی
صادق القول آدمی سے حاصل کرو تو یہ تمہارے لئے تمام دنیا اور اس کے تمام طلاء و نقرہ سے بہتر و برتر ہے۔ بہر
حال اس زمانہ غیبت کبریٰ میں اپنی احادیث شریفہ کے ساتھ تمسک کرنا ہی باعثِ نجات ہے۔ علامہ مجلسی
رحمۃ اللہ اپنے رسالہ اعتقادیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ ثم انہم علیہم السلام ترکوا فینا اخبارہم فلیس
لنا فی ہذا الزمان الا التمسک باخبارہم والتدبر فی آثارہم فترک اکثر الناس فی زماننا آثار
اہل البیت علیہم واستبدوا بآرائہم فضلوا واضلوا پھر ائمہ اہل بیت ہمارے درمیان اپنے اخبار و آثار

من السوال حق کانوا یحبون ان یجیئ اعرابی فیسئل وهم یسمعون وکنت ادخل علی رسول الله فی کل لیلة دخلة واخلو به کل یوم خلوة یجیبنی عما اسئل وادور به حیث مادار وقد علم اصحاب رسول الله انه لم یکن یصنع ذالک باحد غیری وربما کان ذالک فی بیتی وکنت اذا دخلت علیه فی بعض منازله اخلانی واقام نسائه فلم یبق غیری وغیره واذا اتانی هو للخلوة اقام من فی بیتی ولم یقم عنا فاطمة ولا احد امن ابنائی وکنت اذا سئلته اجابنی واذا سکتت و نفدت مسائلی ابتدانی فما نزلت علی رسول الله۔

خلاصہ یہ کہ ان کو سوال کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی اسی بناء پر وہ لوگ اس بات کے خواہشمند رہتے تھے کہ کوئی بدو آئے اور آنحضرتؐ سے کوئی مسئلہ دریافت کرے۔ اور یہ بھی اسے سن سکیں لیکن میری کیفیت یہ تھی کہ میں ہر رات جناب رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اور ہر روز جنابؐ سے خلوت میں باتیں کرتا۔ جس چیز کا میں آپ سے سوال کرتا آنحضرتؐ مجھے اس کا جواب دیتے۔ آپ جہاں تشریف لے جاتے میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا۔ تمام صحابۂ رسولؐ کو اس بات کا علم ہے کہ آنحضرتؐ میرے سوا اور کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتے تھے۔ اکثر اوقات یہ تخلیہ میرے ہی مکان میں ہوتا تھا۔ اور جب کبھی میں آنحضرتؐ کے کسی مکان میں جاتا تو آنجنابؐ میرے لئے تخلیہ کا انتظام کرتے اور اپنی ازواج کو اٹھا دیتے۔ یہاں تک کہ آنجنابؐ اور میرے علاوہ کوئی بھی وہاں نہ رہتا۔ اور جب کبھی آنحضرتؐ میرے یہاں تشریف لاتے تو سب کو اٹھا دیتے مگر فاطمۃ الزہراؑ اور میرے دونوں بیٹوں (حسنؑ و حسینؑ) کو نہ اٹھاتے۔ جب میں آپؐ سے سوال کرتا تو آپؐ جواب دیتے اور جس وقت میں چپ ہو جاتا اور میرے سوالات ختم ہو جاتے تو آنحضرتؐ از خود ابتدا فرماتے۔ اس لئے قرآن کی کوئی ایسی آیت نہیں جو رسولؐ اللہ پر نازل ہوئی ہے۔

چھوڑ گئے ہیں۔ بس اس زمانہ میں ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہم ان کے اخبار کے ساتھ تمسک کریں اور ان کے آثار میں غور و فکر کریں۔ مگر افسوس کہ اکثر لوگوں نے اہلبیت نبوتؐ کے آثار و اخبار کو پس پشت ڈال کر اپنے آراء ناقصہ پر اعتماد کر لیا جس کی وجہ سے خود گمراہ ہو گئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ چونکہ سرکار علامہ کی عبارت میں منکرین حدیث کا ذکر آ گیا اور یہ فتنہ آج کل با قاعدہ ایک مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اس فتنہ کے متعلق کچھ شعور کر دیا جائے۔

فتنۂ انکارِ حدیث | واضح ہو کہ مسلمانوں میں ایک ستم نہاد فرقہ ایسا بھی موجود ہے جو احادیث کا منکر ہے۔

من القرآن ولا شيئ علمه الله تعالى من حلال او حرام او امر او نهي او طاعة او معصية او شيئ كان او يكون الا وقد علمنيه واقرأنيه واملاه علي وكتبته بخطي واخبرني بتاويل ذالك وظاهره وباطنه فحفظته ثم لم انس منه حرفاً وكان رسول الله اذا اخبرني بذالك كله يضع يده على صدري ثم يقول اللهم املأ قلبه علماً وفهماً ونوراً وحلماً وايماناً وعلمه ولا تجهله واحفظه ولا تنسه فقلت له ذات يوم بابي انت وامي يا رسول الله هل تتخوف علي النسيان فقال يا اخي لست اتخوف۔

اور نہ کوئی ایسی دوسری چیز ہے جو خدائے تعالیٰ نے ان کو تعلیم دی ہو، خواہ وہ از قسم حلال ہو یا حرام از قسم امر ہو یا نہی از قبیل طاعت ہو یا معصیت اور اس کا تعلق گزشتہ واقعات سے ہو یا آنے والے حالات سے مگر یہ کہ آنحضرتؐ نے ان تمام چیزوں کی مجھے تعلیم دے دی۔ اور یہ سب مجھے لکھوا بھی دیں میں نے ان باتوں کو اپنے خط سے لکھ لیا۔ اور آنحضرتؐ نے مجھے ان کی تاویل اور ان کے ظاہری و باطنی حقائق سے آگاہ کر دیا۔ میں نے ان سب باتوں کو حفظ کر لیا اور ایک حرف بھی فراموش نہیں کیا۔ آنحضرتؐ جب مجھے ان باتوں کی تعلیم دیتے تو اس وقت اپنا ہاتھ مبارک میرے سینہ پر رکھ کر بارگاہِ الٰہی میں یوں دعا کرتے۔ یا اللہ! تو اس (علیؑ) کے دل کو علم و فہم اور نور و علم اور ایمان سے بھر دے۔ اسے علم وافر عطا کر اور (کسی چیز سے) اس کو بے خبر نہ رکھ اسے حفظِ کامل مرحمت کر اور نسیان سے محفوظ رکھ۔ ایک روز میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ کیا آپ کو میرے متعلق نسیان کا اندیشہ ہے؟ فرمایا برادرِ من! مجھے تمہارے متعلق نہ تو نسیان کا خوف ہے۔

اگرچہ اس فتنہ کا بیج تو خود پیغمبرِ اسلام کے آخری ایام میں بعض حضرات نے حسبنا کتاب اللہ کہہ کر بو دیا تھا چنانچہ یہ پودا اگا اور مختلف اوقات میں برابر بڑھتا رہا۔ ہاں یہ درست ہے کہ اس پر خزاں کا موسم بھی آتا رہا لیکن ملائے چکڑالوی اور مسٹر پرویز کے وقت میں وہ بہت تناور ہو گیا اور خوب برگ و بار لے آیا اور اپنے زہریلے اثرات سے اسلام و ایمان کی صاف ستھری فضا کو بہت کچھ مسموم کیا۔ مقامِ شکر ہے کہ علماءِ اسلام نے اس فتنہ کو فرو کرنے اور دبانے کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور متعدد علمی مضامین بلکہ مستقل کتب و رسائل لکھ کر ان حضرات کے نظریاتِ فاسدہ کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ہم بھی ضرورتِ حدیث پر اپنے بعض مضامین میں تصریحاً و تلویحاً بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ یہاں اس امر پر کچھ تفصیل تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے فقط بطور تنبیہ ضرورتِ حدیث پر دو چار دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

علیک النسیان ولا الجهل وقد اخبرنی الله عزوجلّ انه قد استجاب لی فیک وفی شرکائک الذین یکونون من بعدک فقلت یا رسولؐ الله ومن شرکائی قال الذین قرن الله طاعتهم بطاعته وطاعتی قلت من هم یا رسولؐ الله قال الذین قال الله فیهم یا ایها الذین امنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسولؐ واولی الامر منکم قلت یا نبی الله من هم قال الاوصیاء الی ان هم الاوصیاء بعدی فلا یتفرقوا حتی یردوا علی حوضی هادین مهدیین لا یضرهم کید من کادهم ولا خذلان خاذلهم۔

اور نہ جہالت کا ڈر کیوں کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس نے تمہارے اور تمہارے ان شرکاء کار کے حق میں جو تمہارے بعد ہوں گے۔ میری دعا کو قبول کر لیا ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ میرے شریک کار کون ہیں؟ فرمایا وہ ہیں جن کی اطاعت خدا نے اپنی اور میری اطاعت کے ساتھ ملا دی ہے میں نے پھر عرض کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا جن کے حق میں خداوندِ عالم کا یہ ارشاد ہے "اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور ان والیانِ امر کی جو تم میں سے ہی ہیں" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کون ہیں؟ ان کی مزید نشان دہی فرمائیں۔ فرمایا وہ وصی ہیں جو میرے بعد میرے وصی ہوں گے۔ جن کے اندر اختلاف و تفرقہ نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ سب کے سب ہدایت یافتہ اور ہدایت کرتے ہوئے میرے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہوں جو کوئی ان سے مکر و فریب کرے گا یا ان کی نصرت نہیں کرے گا وہ انہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

ضرورتِ حدیث کے دلائل

یہ حقیقت اربابِ بصیرت پر پوشیدہ نہیں ہے کہ کسی بھی فن کی کوئی کتاب بغیر اس فن کے ماہر معلم کی تعلیم و تلقین کے خود اپنے مطالب و مقاصد کو واضح نہیں کر سکتی اور لوگ اس کے حقیقی مفاہیم کو نہیں سمجھ سکتے تو جس کتاب میں تمام دنیا کے علوم و فنون موجود ہوں جس میں کائنات کی ہر خشک و تر چیز کا ذکر موجود ہو۔ جس کا یہ دعویٰ ہو وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم تو بغیر کسی معلم ربانی کی تعلیم کے کیوں کر ہر شخص اس کے مفاہیم و معانی اور اس کے مطالب و مقاصد کو سمجھ سکتا ہے!

(۲) خداوندِ عالم نے جناب ختمی مرتبتؐ کے دینی وظائف میں سے ایک اہم وظیفہ یہ بیان کیا ہے کہ یعلمهم الکتٰب والحکمة سورہ جمعہ پ۲۸ ع۱ کہ وہ لوگوں کو قرآن و حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ اگر مسلمان جو کہ اہلِ زبان بھی تھے خود مطالب و مقاصدِ قرآنیہ کو سمجھ سکتے تو آنجنابؐ کے پڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟ ظاہر ہے کہ جب وہ تعلیم دیتے

من خذلهم هم مع القرآن والقرآن معهم لا يفارقونه ولا يفارقهم بهم ينتصر امتی وبهم يمطرون وبهم يدفع البلاء وبهم يستجاب لهم الدعاء فقلت يا رسول الله سمهم لی فقال انت يا علیؑ ثم ابنی هذا ووضع يده علی رأس الحسنؑ ثم ابنی هذا ووضع يده علی رأس الحسينؑ ثم سمیك يا اخی هو سيد العابدينؑ ثم ابنه سمیی محمد باقر علمی وخازن وحی الله وسيولد علیؑ فی زمانك يا اخی فاقرئه منی السلام وسيولد محمد فی حيوتك يا حسينؑ فاقرئه منی السلام ثم جعفر ثم موسیٰ بن جعفر ثم علی بن موسیٰ

وہ ہمیشہ قرآن کے ساتھ ہوں گے اور قرآن ان کے ساتھ ہوگا۔ نہ وہ قرآن سے جدا ہوں گے اور نہ قرآن ان سے علیٰحدہ ہوگا۔ انہی کی وجہ سے میری امت کی نصرت و امداد کی جاوے گی اور انہی کے وسیلے سے بارش برسائی جائے گی۔ انہیں کے طفیل مصیبتیں دور ہوں گی اور انہی کے ذریعے دعائیں قبول ہوں گی میں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! آپ ان کے اسماء گرامی سے مجھے آگاہ فرما دیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا اے علیؑ۔ ان میں سے پہلے تو تم ہو۔ تمہارے بعد میرا یہ فرزند ہوگا۔ یہ فرما کر اپنا دستِ مبارک حضرت امام حسنؑ کے سر پر رکھا۔ پھر فرمایا ان کے بعد میرا یہ دوسرا بیٹا ہوگا۔ یہ فرما کر جناب امام حسنؑ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اے بھائی ان کے بعد تمہارا ہم نام امام ہوگا جو کہ سید العابدین ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اور میرا ہم نام محمد ہوگا۔ جو میرے علم کو شگافتہ کرے گا اور خدا کی وحی کا خزینہ دار ہوگا۔ اے بھائی تمہارے زمانے میں علی زین العابدینؑ پیدا ہوں گے ان کو میرا سلام کہنا اور اے حسینؑ تمہاری زندگی میں ہی محمد باقرؑ پیدا ہوں گے۔ میری طرف سے انہیں سلام کہنا۔ پھر جعفر صادقؑ پھر موسیٰ کاظمؑ، پھر علی بن موسیٰ (رضا)

ہوں گے تو کچھ الفاظ و عبارات کے ذریعے دیتے ہوں گے۔ وہ انہی اقوال و اشارات اور تعلیمات پیغمبر اسلام کا نام مسلمان حدیث رکھتے ہیں۔ جس کے انکار کرنے کی کوئی مسلمان جسارت نہیں کر سکتا۔

۳۔ ارشادِ قدرت ہے و انا نزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیهم (سورہ نحل پ۱۴ ع ۱۲)
اے رسولؐ! ہم نے تمہارے پاس یہ قرآن اس لئے نازل کیا ہے کہ تم واضح طور پر لوگوں کے لئے بیان کرو ان کے لئے کیا نازل کیا گیا ہے اور منشائے قدرت کیا ہے۔ اس آیتِ مبارکہ سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن رسول اسلام کے بیان کا محتاج ہے۔ وہاں یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ وہ بیان و شرح رسولؐ اصل قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ تعلیمات قرآنیہ کے انہی تشریحات و توضیحات نبویہ کا دوسرا نام حدیث ہے۔

ثم محمد بن علي ثم علي بن محمد ثم الحسن بن علي الزكي ثم من اسمه اسمي ولونه لوني القائم بامر الله في آخر الزمان المهدي الذي يملأ الارض قسطاً وعدلاً كما ملئت قبله ظلماً وجوراً والله اني لاعرفه يا سليم حيث يبايع بين الركن والمقام واعرف اسماء انصاره واعرف قبائلهم قال سليم بن قيس ثم لقيت الحسن والحسين عليهما السلام بالمدينة بعد ما ملك معاوية فحدثتهما هذا الحديث عن ابيهما قالا صدقت قد حدثك امير المومنين بهذا الحديث ونحن جلوس حفظنا ذالك من

پھر محمد بن علی (تقیؑ)، پھر علی بن محمد (نقیؑ) پھر حسن بن علیؑ ملقب بہ زکی (عسکریؑ) ہوں گے۔ ان کے بعد وہ ہوگا جو میرا ہم نام اور ہم رنگ ہے۔ وہ آخر زمانہ میں خدا کے حکم سے قیام کرے گا وہ مہدیؑ ہوگا جو زمین کو عدل و انصاف سے لبریز کر دے گا۔ جس طرح وہ اس سے پہلے ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی (پھر حضرت علیؑ نے راوی حدیث سے فرمایا) اے سلیم خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ جہاں رکن (حجرِ اسود) و مقام (ابراہیمؑ) کے درمیان اس کی بیعت کی جائے گی۔ میں اس کے اعوان و انصار کے نام بھی جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کس کس قبیلے سے ہوں گے سلیم بن قیس کا بیان ہے کہ ایک مدت کے بعد جب کہ معاویہ حاکمِ شام تھا میں مدینہ میں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی زیارت کے لئے حاضر ہوا اور ان کی خدمت میں ان کے پدرِ بزرگوار کی یہی حدیث بیان کی۔ انہوں نے سن کر فرمایا تم سچ کہتے ہو۔ جس وقت امیر المومنین علیہ السلام نے تم سے یہ حدیث بیان فرمائی تھی ہم وہاں موجود تھے اور ہم نے یہ حدیث اسی طرح خود رسول اللہ سے بھی سن کر یاد کی ہے۔

خلاقِ عالم ارشاد فرماتا ہے انا انزلنا اليك الكتٰب بالحق لتحكم بين الناس بما اراك الله (سورۂ نساء پ ۵ ع ۱۶) اے رسول! ہم نے یہ حق کتاب تم پر اس لئے نازل کی ہے تاکہ تم اللہ کے عطا کردہ علم کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو۔ ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کے فیصلہ اور حکم کے الفاظ و عبارات یقیناً قرآن کے علاوہ ہوتے تھے لہٰذا قرآن کے ساتھ ساتھ ان کی بھی ضرورت ہے تاکہ ہم جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات و توضیحات کی روشنی میں مطالبِ قرآن کو سمجھ کر اور اس پر عمل کر کے دین اور دنیا میں فوز و فلاح حاصل کر سکیں۔

اگر احادیث و اخبار کو حجت تسلیم نہ کیا جائے تو دینِ اسلام کا کوئی بھی اصولی و فروعی اور معاشرتی و اجتماعی مسئلہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز کا تذکرہ موجود ہے۔ مگر اس میں

رسول اللهؐ كما حدثتك لم يزد فيه حرفا ولم ينقص منه حرفا قال سليم بن قيس ثم لقيت على بن الحسين عليهما السلام وعنده ابنه محمد الباقر فحدثته بما سمعت عن ابيه فقال سمعت عن امير المؤمنين عن رسول اللهؐ وهو مريض وانا صبي ثم قال ابو جعفرؑ واقرأني جدي عن رسول اللهؐ وانا صبي قال ابان بن ابي عياش فحدثت على بن الحسينؑ بهذا الحديث كله عن سليم بن قيس الهلاليؓ فقال صدق وقد جاء جابر بن عبد الله الانصاریؓ الى ابني محمد وهو يختلف الى الكتاب فقبله واقرأه۔

اسی طرح ہمارے والد بزرگوار نے تم سے بلا کم و کاست بیان کی تھی سلیمؓ کہتے ہیں۔ پھر میں ایک عرصہ کے بعد علیؑ بن الحسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت ان کے پاس آپ کے فرزند محمد باقرؑ بھی موجود تھے۔ میں نے ان کے والد بزرگوار کی یہ حدیث جو میں نے آنجنابؑ سے سنی تھی بیان کی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے بھی اپنے بچپن میں اپنے جد بزرگوار امیر المومنینؑ سے رسولؐ اللہ کی یہ حدیث سنی ہے۔ اس وقت امیر المومنینؑ بیمار تھے پھر امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا جس وقت مرے جد نامدار امام حسینؑ نے مجھے جناب رسولؐ اللہ کا سلام پہنچایا تھا اس وقت میں بچہ تھا۔ ابان بن ابی عیاش کہتے ہیں میں نے حضرت علی بن الحسین علیہما السلام کی خدمت میں سلیم بن قیس ہلالی کی بیان کردہ تمام حدیثیں عرض کی۔ آپ نے فرمایا سلیم نے سچ کہا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ میرے فرزند محمد باقرؑ کے پاس اس وقت آئے تھے جب کہ وہ مکتبہ کی طرف جا رہے تھے۔ جابرؓ نے ان کو بوسہ دیا اور ان کو جناب رسالتمآبؐ کا سلام پہنچایا۔

اس قدر ایجاز و اختصار اور رمز و کنایہ سے کام لیا گیا ہے کہ دوسرے مسائل و حقائق تو ایک طرف اس سے تو نماز پنجگانہ اور اس کی رکعتوں کی تعداد اور زکوٰۃ کی مقدار بھی معلوم نہیں ہو سکتی۔ بنا بریں بانئ اسلام اور ان کے صحیح مسند نشین حضرات کی فرمائشات کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے وھو المقصود فلا و ربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما۔

آئمہ اہلبیتؑ کی احادیث میں فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ ہدیٰ علیہم التحیۃ والثناء کی احادیث و اخبار صحیحہ میں ہرگز کسی قسم کا کوئی تعارض و تناقض

الاسلام عن رسول اللہؐ قال ابان بن ابی
عیاش فحججت بعد موت علی بن الحسینؑ
فلقیت اباجعفرؑ محمد بن علی بن الحسین
فحدثته بهذا الحدیث کله عن سلیم
فاغرورقت عیناه وقال صدق سلیم
وقد اتی الی ابی بعد قتل جدی الحسینؑ
وانا عنده فحدثه بهذا الحدیث
بعینه فقال له ابی صدقت واللہ یا سلیم
قد حدثنی بهذا الحدیث ابی عن امیر المومنینؑ

یہی ابان ابن ابی عیاش بیان کرتے ہیں کہ حضرت
امام زین العابدین علیہ السلام کی وفات کے بعد میں
حج بیت اللہ کے لئے گیا۔ وہاں امام محمد باقر علیہ السلام
کی خدمت میں حاضر ہو کر سلیم بن قیس ہلالی والی یہ
حدیث ان سے بیان کی۔ سن کر آنجناب آبدیدہ ہو
گئے اور فرمایا خدا رحم کرے سلیم پر اس نے سچ کہا ہے۔
وہ میرے جدِ بزرگوار کی شہادت کے بعد میرے پدرِ بزرگوار
کے پاس آئے تھے۔ اس وقت میں بھی ان کی خدمت
میں موجود تھا۔ سلیم نے وہاں بھی بعینہٖ اسی طرح یہ حدیث
بیان کی تھی۔ میرے والد نے فرمایا تھا اے سلیم بخدا تم سچ کہتے ہو۔ میرے والد ماجد امام حسینؑ نے میرے جدِ بزرگوار
جناب امیر المومنینؑ کی یہ حدیث اسی طرح مجھ سے بیان کی تھی۔

نہیں ہے۔ آلِ رسولؐ کی یہ وہ خصوصیت ہے جس کا اعتراف بعض علمائے اہلسنت نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ
محمد معین سندھی نے اپنی کتاب دراسات اللبیب ص۲۴۹ طبع لاہور پر تسلیم کیا ہے کہ "مذھب واحد منھم
مذھب باقیھم آئمہ اہلبیت علیہم السلام میں سے جو ایک کا مذہب ہو وہی سب کا ہوتا ہے ع والفضل
ما شھدت به الاعداء" اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اختلاف ان کے کلام میں ہوتا ہے جو جھوٹے ہوں۔ چنانچہ
ضرب المثل ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" جو غیر معصوم ہوں اور جن کی نگاہ حقائقِ واقعیہ پر نہ ہو۔ مگر
جن کی عصمت وطہارت اور صداقت پر آیاتِ قرآنیہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت
(الآیہ)، و یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین وغیرھا شاھد اور جن کے
سینۂ بے کینہ میں علمِ قرآن کے سمندر موجزن ہوں۔ تلک آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم
جو صغر سنی کے عالم میں بھی لوحِ محفوظ کا مطالعہ کر سکتے ہوں فان الحسن کان یطالع اللوح المحفوظ فی
صغر سنہٖ (فتح الباری شرح بخاری) لعسقلانی علی ما نقل عنہ، جو مدرسہ الہیہ کے تعلیم یافتہ ہوں وعلمناه من
لدنا علما جو وارثِ علومِ قرآنی ہوں ثم اورثنا الکتب الذین اصطفینا من عبادنا جو مدینۂ علمِ نبوی
کے ابواب ہوں۔ انا مدینة العلم وعلی بابها من اراد المدینة فلیاتها من بابها جن کے علوم
بتوسط جنابِ رسولِ خدا و روح القدس اور جبرئیل خود ربِّ جلیل سے ماخوذ ہوں۔ اہلِ عقل و انصاف

بتائیں کہ ان کے کلام حقائق ترجمان میں کیونکر اختلاف وافتراق متصور ہو سکتا ہے! انہی حقائق کی بنا پر علامہ محقق حضرت شیخ بہائی رح نے اپنے رسالہ وجیزہ میں تحریر فرمایا ہے ؎ ان جمیع احادیثنا الا ما ندر تنتھی الی ائمتنا الاثناعشر وھم ینتھون فیھا الی النبی فان علومھم مقتبسۃ من تلک المشکوٰۃ (وجیزہ مع شرح نھایۃ الدرایۃ ص۲) ہماری تمام احادیث سوائے بعض شاذ و نادر حدیثوں کے ائمہ اثنا عشر تک پہنچتی ہیں اور ان بزرگواروں کا سلسلہ مبارکہ جناب رسول خدا تک پہنچتا ہے کیونکہ ان حضرات کے علوم مشکوٰۃ نبوت سے حاصل شدہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جناب رسول خدا کا سلسلہ علم خدائے عز و جل تک جا کر منتہی ہوتا ہے۔ ولنعم ما قیل ؎

اذا شئت ان ترضیٰ لنفسک مذھبا	ینجیک یوم الحشر من لھب النار
فدع عنک قول الشافعی و مالک	و احمد والمنقول عن کعب بن الاحبار
ووال اناسا قولھم وحدیثھم	روی جدنا عن جبرئیل عن الباری

اختلاف احادیث کے علل و اسباب

ہاں اگر کسی وقت بظاہر ان احادیث میں اختلاف معلوم ہو تو اس کے کچھ علل و اسباب ہوتے ہیں۔

پہلا سبب

اس کا ایک سبب تو لوگوں کی عقل کا خام اور فہم کا ناقص ہوتا ہے کہ وہ اپنی کم علمی و عقل کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ ان احادیث میں اختلاف ہے حالانکہ فی الحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا کما قیل ؎

وکم من عائبٍ قولاً صحیحاً	وآفتہ من الفھم السقیم

جیسا کہ مصنف علام نے اس باب کے ابتدائی حصہ میں چند مثالوں سے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے اور شیخ الطائفہ شیخ طوسی علیہ الرحمہ کی کتاب استبصار میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ خود ائمہ اہلبیت کا ارشاد ہے ان حدیثنا صعب مستصعب لا یحتملہ الا ملک مقرب او نبی مرسل او مومن امتحن اللہ قلبہ للایمان (اصول کافی ۔۔۔ و بصائر الدرجات وغیرہ) ہماری احادیث بہت مشکل ہیں ان کا تحمل یا تو ملک مقرب کر سکتا ہے یا نبی مرسل یا پھر مومن ممتحن اسی طرح بعض احادیث میں وارد ہے۔ ان فی حدیثنا محکماً کمحکم القرآن ومتشابھاً کمتشابہ القرآن ہماری احادیث میں قرآن کی طرح محکم و متشابہ احادیث موجود ہیں (مرآۃ الانوار و مشکوٰۃ الاسرار وغیرہ) لہٰذا کم عقل و کم علم حضرات جو حقائق اشیاء کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنی بے سمجھی سے ظاہری اختلاف کو دیکھ کر فوراً یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ فلاں حدیث فلاں حدیث متعارض ہے۔ فلاں حدیث عقل کے متصادم ہے اور فلاں روایت ۔۔۔ قرآن کے مناقض ہے۔ حالانکہ درحقیقت ان میں

کوئی تعارض و تصادم نہیں ہوتا آہ ؎

چوں ندیدند رہِ حقیقت افسانہ زدند

قال الصادق علیہ السلام ویل لاھل الکلام یقولون ھٰذا ینقاد و ھٰذا لا ینقاد و ھٰذا ینساق و ھٰذا لا ینساق (اصول کافی وغیرہ) افسوس ہے متکلمین پر جو کہتے ہیں کہ یہ ہمارے عقل مفروضہ کے تابع ہے اور یہ تابع نہیں یہ ہمارے مقررہ قواعد کے مطابق چل سکتا ہے اور یہ نہیں۔ حالانکہ علمائے ربانیین کے نزدیک ان سب احادیث کے معانی صحیح موجود ہیں۔ ان کو ان احادیث میں انوار حقیقت کا عکس دکھائی دیتا ہے اور وہ اسے پڑھ کر کلام الامام امام الکلام کا لطف حاصل کرتے ہیں۔ سچ ہے ؎ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

دوسرا سبب

تقیہ ہے کما قال الصادق نحن القینا بینکم الاختلاف حقنًا لدمائنا و دمائکم ہم نے اپنی اور تمہاری جانوں کی حفاظت کے لئے تمہارے اندر اختلاف ڈالا ہے۔ اگر تم سب ایک ہی نظریہ پر متفق ہو جاتے تو پہچان لئے جاتے اور پھر یہ امر تمہاری ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ لہٰذا بعض اوقات یہ حکمائے اسلام و نباضِ فطرت ائمہ علیہم السلام حالات کی کیفیت و نزاکت کو دیکھ کر بعض خاص معتمد اصحاب کو اصل حقیقت سے آگاہ فرما دیتے اور دوسرے حضرات کو تقیہ کے مطابق جواب دیتے تھے جس کی وجہ سے کم علم و استعداد لوگوں پر حقیقتِ حال مشتبہ ہو جاتی مگر جو حضرات کامل علم و استعداد رکھتے اور کلام معصوم سے مانوس ہوتے تھے وہ سمجھ جاتے تھے کہ حکم واقعی کونسا ہے اور بنا بر تقیہ حکم ظاہری کونسا ہے؟ لان لکل حق حقیقۃ و علی کل حق نورا۔ ولکن لا یعرفہ الا العلماء الراسخون۔

تیسرا سبب

اس اختلاف کا سب سے بڑا سبب راویانِ اخبار و ناقلانِ آثار کے حالات کا اختلاف ہے جس کی پوری پوری وضاحت جناب سلیم ابنِ قیس رحمۃ اللہ کی روایت میں موجود ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہے۔ اس پر مزید کچھ تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اس میں اس قدر اضافہ کر دینا ضروری ہے۔ اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ جس طرح جناب رسولِ خدا کو بعض مخربین دین اور منافقین سے واسطہ پڑا تھا۔ اسی طرح آئمہ طاہرین کو بھی ہمیشہ بعض اشرار و مفسدین سے سابقہ پڑتا رہا جنہوں نے دین کے حقائق کو مسخ کرنے اور اسلام کا حلیہ بگاڑنے کے لئے جعلی حدیثیں بنا بنا کر اپنی عیاری اور سیہ کاری سے منتشر کر دیں۔ اس واسطے آئمہ طاہرین اور ان کے اصحاب کاملین نے ان لوگوں کے دجل و فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے نمایاں کارنامے انجام دیئے اگرچہ ہمارے اسلاف کی مساعی جمیلہ سے ایسی احادیث کو کتبِ معتبرہ سے نکال دیا گیا اور صحیح و سقیم میں تمیز کر دی گئی ہے مگر تاہم اگر کوئی شاذ و نادر ایسی حدیث رہ گئی تھی تو متاخرین نے نقد اخبار و آثار کے لئے کچھ خاص قواعد و ضوابط مرتب کئے جن کا سرچشمہ فرمائشات معصومین علیہم السلام ہی تھیں۔ ذیل میں ہم

ان ضوابط کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں مگر اس سے قبل کچھ تھوڑا سا تبصرہ کتاب سلیم بن قیس اور اس کے مؤلف پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

کتاب سلیم ابن قیس اور اس کے مؤلف پر کچھ تبصرہ

مخفی نہ رہے کہ جناب سلیمؒ حضرت امیر المومنینؑ کے اصحاب میں سے ایک جلیل صحابی ہیں جن کا تقریباً ۹۰ھ میں جناب امام زین العابدینؑ کے ظاہری دورِ امامت میں انتقال ہوا۔ حضرت علامہ حلی نے خلاصۃ الرجال میں اسی طرح دوسرے بعض اہلِ فن نے ان کی عدالت کو بھی تسلیم کیا ہے اور ابان بن ابی عیاش کا یہ بیان قلمبند کیا ہے کہ کان شیخاً متعبداً لہ نور یعلوہ۔ وہ عبادت گزار بزرگوار تھے اور ان کے چہرہ بشرہ پر نور ساطع تھا۔ جب حجاج ثقفی نے ان کو قتل کرنا چاہا تو انہوں نے بھاگ کر ابان بن ابی عیاش کے پاس پناہ لی اور بالآخر وہیں ان کا انتقال ہوا۔ اپنی وفات کے وقت انہوں نے ابان سے یہ حدیث بیان کی اور اپنی کتاب بھی انہی کے حوالہ کی اس لئے ان کی کتاب اصل سلیم بن قیس جس کا اصل نام کتاب السقیفہ ہے کے بارے میں علماءِ اعلام کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ بعض اسے جناب سلیم کی تالیف تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ منتہی المقال فی علم الرجال المعروف برجال شیخ ابی علی حائریؒ میں بحوالہ رجال غضائری لکھا ہے موضوع لا مریۃ فیہ یعنی بلا شک و شبہ یہ کتاب وضعی اور من گھڑت ہے مگر یہ کتاب حال ہی میں نجف اشرف میں طبع ہوئی ہے اور اس پر ایک گرانقدر مقدمہ لکھا گیا ہے اس میں دلائلِ محکمہ سے اس کتاب کا جناب سلیم کی تالیف ہونا اور اس کی وثاقت ثابت کی گئی ہے اور متعدد شواہد سے واضح کیا ہے کہ علمائے اعلام نے ہمیشہ اس کتاب پر اعتماد کیا ہے اور یہ ہمیشہ ان کے لئے موردِ استفادہ رہی ہے۔ اسی مقدمہ میں غیبت نعمانی کے باب آئمہ اثنا عشر سے شیخ نعمانی کی اس کتاب کے متعلق یہ رائے نقل کی ہے۔ و لیس بین جمیع الشیعۃ ممن حمل العلم ورواہ عن الائمۃ علیہم السلام خلاف فی ان کتاب سلیم ابن قیس الھلالی اصل من اکبر کتب الاصول التی رواہ اھل العلم وحملۃ حدیث اھل البیت علیہم السلام واقدمھا وھو من الاصول التی ترجع الشیعۃ الیھا و تعول علیھا صلا خلاصہ مطلب یہ کہ تمام شیعہ اہل علم میں اس امر کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کتاب سلیم ابن قیس شیعوں کے ان بڑے اصولِ قدیمہ میں سے ہے جس کی طرف ہمیشہ شیعہ رجوع کرتے رہے ہیں اور اس پر ان کا اعتماد رہا ہے۔ اسی طرح قاضی بدر الدین سبکی کی کتاب محاسن الرسائل فی معرفۃ الاوائل سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ان اول کتاب صنف للشیعۃ ھو کتاب سلیم ابن قیس الھلالی مذہب شیعہ میں جو کتاب سب کتب سے پہلے تصنیف ہوئی وہ کتاب سلیم ابن قیس ہے ابن ندیم نے اپنی کتاب فہرست صفحہ ۳۰۷ میں لکھا ہے کہ اول کتاب ظھر للشیعۃ کتاب سلیم ابن قیس الھلالی شیعوں

کی سب سے پہلی کتاب جو ظاہر ہوئی وہ کتاب سلیم ابن قیس ہے۔ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے مقدمۂ بحارالانوار میں اس کے متعلق لکھا ہے کتاب سلیم ابن قیس فی غایۃ الاشتہار وقد طعن فیہ جماعۃ والحق انہ من الاصول المعتبرۃ یعنی کتاب سلیم ابن قیس بہت مشہور ہے۔ بعض لوگوں نے اس پر طعن کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ کتاب اصولِ معتبرہ میں سے ہے لیکن حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ نے تصحیح الاعتقاد میں اس کتاب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی مگر اس حدیث کو انہوں نے بھی معتبر تسلیم کیا ہے جسے مصنف علام نے یہاں نقل کیا ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر کتاب قابلِ اعتماد ہے۔ اگرچہ اس کی بعض مرویات قابل و اشکال سے خالی نہیں ہیں۔ یہاں اس سے زیادہ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ واللہ العالم بحقیقۃ الحال۔ بہرحال جناب سلیم کی بیان کردہ حدیث سے جہاں اختلاف حدیث کے علل واسباب پر روشنی پڑتی ہے وہاں وہ ائمہ اطہارؑ کی خلافتِ عظمیٰ وامامتِ کبریٰ پر بھی نص صریح ہے۔ کما لایخفیٰ۔

اقسام وانواع حدیث

حدیث کی دو قسمیں ہیں (۱) متواتر (۲) واحد۔ اگر کسی حدیث کو ہر طبقہ میں اس قدر کثیر جماعت نقل کرے جس کا کذب وافترا پر اتفاق کرنا عادۃً محال ہو تو اسے خبرِ متواتر کہا جاتا ہے اور جس میں یہ شرائط نہ ہوں وہ خبرِ واحد کہلاتی ہے (ہدیۃ المحدثین، نہایۃ الدرایہ وغیرہ) اب اس خبرِ واحد کی متقدمین کے نزدیک صرف دو قسمیں تھیں (۱) صحیح اور غیر صحیح۔ ان کے نزدیک خبرِ صحیح وہ تھی جس میں کچھ ایسے داخلی وخارجی قرائن موجود ہوں جن کی بناء پر اس حدیث پر اعتماد و اعتبار کیا جا سکے اور جو حدیث ایسے قرائن سے خالی وعاری ہوتی تھی وہ اسے غیر صحیح قرار دیتے تھے (بحوالہ کتب مذکورہ) متقدمین میں بوجہ قربِ عہدِ ائمہ بکثرت ایسے قرائن موجود تھے۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ قرائن مفقود ہوتے گئے۔ اس لئے متاخرین کو صرف راویانِ اخبار کے حالات و صفات اور اخلاق و اطوار پر انحصار کرنا پڑا۔ اس لئے اخبار کی صحت وعدم صحت معلوم کرنے کے معیار تبدیل ہو گئے۔ ہم ذیل میں حدیث کے بعض اہم اقسام کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ورنہ بعض وجوہ سے اس کی اور بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن کے ذکر کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

(۱) **حدیثِ صحیح**:۔ ہر وہ حدیث جس کا سلسلۂ سند معصومؑ تک پہنچتا ہو اور اس کے تمام راوی شیعہ اثنا عشری اور عادل ہوں۔ اسے عندالمتاخرین صحیح کہا جاتا ہے۔

(۲) **حدیثِ حسن**:۔ جس کی سند معصومؑ تک منتہی ہوتی ہو۔ اور تمام راوی شیعہ اثنا عشری اور ممدوح ہوں مگر ان کی عدالت کی صراحت نہ کی گئی ہو۔

حدیثِ قوی:۔ حدیث قوی اس حدیث کو کہا جاتا ہے۔ جس کے تمام راوی شیعہ اثنا عشری ہوں مگر ان کی مدح و قدح کے متعلق کوئی نص موجود نہ ہو۔

حدیثِ موثق:۔ ہر وہ حدیث جس کا سلسلۂ سند ایسے راویوں کے ذریعہ سے معصوم تک پہنچے جو اگرچہ صادق القول اور قابلِ اعتماد ہوں مگر ہوں فاسد العقیدہ۔

حدیثِ ضعیف:۔ جو حدیث مذکورہ بالا تمام اقسامِ حدیث کی شرائط سے خالی ہو اسے ضعیف کہا جاتا ہے (ولہ اقسام عدیدۃ کالمقطوع والمرسل والمجہول وغیرہا) (از بدیۃ المحدثین، نہایۃ الدرایہ، مقباس الہدایہ وغیرہا)۔ متقدمین و متاخرین کی اصطلاح کے اس اختلاف سے یہ عقیدہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ کتب اربعہ بالخصوص کافی و فقیہہ کی تمام احادیث کس طرح متقدمین کے نزدیک صحیح اور متاخرین کے نزدیک کچھ صحیح، کچھ حسن اور کچھ ضعیف ہیں۔ ولا مشاحۃ فی الاصلاح۔ فتدبر (از مقدمۂ احقر مصنف برشافی ترجمہ اصول کافی)

وضاحت:۔ اس تقسیم سے یہ امر بھی واضح و عیاں ہو جاتا ہے کہ احادیث میں اختلاف کی صورت میں صحیح حدیث حسن پر، حسن قوی پر، قوی موثق پر اور موثق ضعیف پر مقدم ہوگی۔ کما لا یخفیٰ!

تعادل و تراجیح کا بیان

اس سلسلہ میں ایک امر باقی رہ گیا ہے جس کی طرف حضرت مصنف علام نے کوئی اشارہ نہیں کیا لہٰذا اس امر پر کچھ تبصرہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب کسی وقت احادیث و اخبار منقولہ میں فی الحقیقت تعارض و تضاد پایا جائے تو مقام اعتقاد و عمل میں کیا کرنا چاہیئے؟ کس حدیث کو قبول اور کس کو رد کرنا چاہیے اس کا معیار و میزان کیا ہے؟ یہ ایک طویل الذیل بحث ہے اور کتبِ اصولِ فقہ کا ایک معتد بہ حصہ بعنوان باب التعادل والتراجیح اس کے بیان کے لئے وقف ہے۔ اس سلسلہ میں آئمہ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین سے کئی قسم کے مرجحات مثل موافقتِ قرآن۔ مخالفتِ عامہ اور عدالتِ راوی وغیرہ مروی ہیں جو مختلف احادیث کے اندر متفرق طور پر مذکور ہیں۔ اس سلسلہ میں جو روایت سب سے زیادہ مفصل و مبسوط اور عند العلماء مقبول و معمول ہے وہ مقبولۂ عمر بن حنظلہ ہے جو امام بحق ناطق حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے۔ یہ حدیث بہت طولانی ہے۔ ہم یہاں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

اختیاری صورت میں حکامِ جور کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں ہے

راوی:۔ جناب ابن حنظلہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق آلِ محمدؐ علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ کے بعض نام لیواؤں کا کسی معاملہ میں باہمی جھگڑا ہو جاتا ہے۔ آیا وہ تصفیہ کے لئے حکامِ جور کی طرف رجوع کر سکتے ہیں؟

امام عالی مقام:۔ جو شخص کسی امر حق یا باطل میں ان کی طرف اپنا مقدمہ لے جائے تو گویا وہ شیطان

کی طرف اپنا مقدمہ لے گیا اور وہ اگرچہ حق بجانب ہی ہو لیکن اگر اس نے قاضیانِ باطل کے فیصلے سے اپنا حق حاصل کیا تو حرام کھائے گا۔ راوی:۔ پھر وہ کیا کریں؟

علماءِ کرام کی عمومی نیابت کا بیان

امامؑ:۔ ینظران الی من کان منکم ممن قد روی حدیثنا ونظر فی حلالنا وحرامنا وعرف احکامنا فلیرضوا بہ حکماً فانی قد جعلتہ علیکم حاکماً فاذا حکم بحکمنا فلم یقبلہ منہ فانما استخف بحکم اللہ وعلینا ردّ والرّاد علینا الراد علی اللہ وھو علی حد الشرک باللہ۔ دیکھیں کہ اپنے ہم عقیدہ لوگوں میں سے جو شخص ہماری احادیث سے واقف ہو ہمارے حلال وحرام پر استدلال، نگاہ رکھتا ہو اور ہمارے احکام و مسائل حلال و حرام کی بھی معرفت رکھتا ہو اسے اپنا حاکم تسلیم کرلیں کیونکہ میں نے (عمومی طور پر) ایسے شخص کو تمہارا حاکم بنا دیا ہے پس جب وہ حاکمِ شرع ہمارے حکم کے مطابق فیصلہ کرے اور اس کا فیصلہ تسلیم نہ کیا جائے تو رد کرنے والے شخص نے حکمِ خدا کو خفیف سمجھا ہے اور ہماری بات کو ٹھکرایا ہے اور ہمارا حکم رد کرنے والا گویا خدائے عزّوجل کے حکم کو ٹھکرانے والا ہے اور ایسا شخص مشرک ہے۔

راوی:۔ اگر وہ جھگڑا کرنے والے دو شخصوں کو اپنا حاکم تسلیم کریں اور پھر ان کے فیصلہ میں اختلاف ہو جائے۔ اور یہ اختلاف بھی آپ کی احادیث کی وجہ سے ہو تو پھر کیا کریں؟

امامؑ:۔ ان دونوں میں سے جس کی عدالت و فقاہت اور زہد و اتقاء کا پلّہ بھاری ہو اس کا حکم نافذ ہوگا۔

راوی:۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! اگر وہ دونوں ان صفات میں مساوی ہوں تو پھر کیا کرنا چاہئیے؟

امامؑ:۔ جس کا فیصلہ ان دونوں روایتوں میں سے مشہور بین العلماء روایت کے مطابق ہے اس کا فیصلہ قابلِ قبول ہوگا!

راوی:۔ اگر دونوں روایتیں مشہور ہوں اور ان کے راوی بھی ثقہ ہوں تو پھر کیا کیا جائے؟

امامؑ:۔ جو روایت کتاب خدا و سنّتِ رسولؐ کے مطابق اور مخالفین کے مذہب کے خلاف ہو اس پر عمل درآمد کیا جائے۔

راوی:۔ اگر دونوں روایات مخالفین کے نظریات کے موافق ہوں تو پھر کیا صورت ہوگی؟

امامؑ:۔ جس روایت کی طرف مخالف حکام اور قاضیوں کا زیادہ رجحان و میلان ہو اسے ترک کرکے دوسری پر عمل کیا جائے!

راوی:۔ اگر دونوں روایتوں کی طرف ان کا رجحان برابر ہو تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیئے؟

امامؑ:۔ اگر نوبت بایں جا رسید تو پھر توقف کرو حتیٰ کہ اپنے امامؑ سے ملاقات کرکے حقیقتِ حال

قرآن میں تناقض و تعارض نہ ہونے کا بیان

شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ خداوندِ عالم کی کتابِ مقدس میں بعض ایسی آیات بھی ہیں کہ جن کی نسبت جہال یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میں باہم اختلاف و تعارض ہے حالانکہ ان میں کوئی اختلاف اور تناقض نہیں ہے بطورِ مثال یہاں چند آیات درج کی جاتی ہیں۔ خدا فرماتا ہے۔ پس آج کے دن ہم بھی ان کو ایسا ہی بھلا دیں گے جیسا کہ وہ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے ہیں۔ وہ خدا کو بھول گئے۔ اللہ نے ان کو بھلا دیا۔

وفی کتابہ عزّ وجلّ ما یحسبہ الجاھل مختلفاً متناقضاً ولیس بمختلف و لا متناقض وذالک مثل قولہ تعالی فالیوم ننسٰھم کما نسوا لقاء یومھم ھٰذا وقولہ تعالی نسوا اللّٰہ فنسیھم ثمّ یقول بعد ذالک وما کان ربّک نسیّا ومثل قولہ عزّ وجلّ یوم یقوم الرّوح والملٰئکۃ صفًّا لا یتکلّمون الّا من اذن لہ الرّحمٰن وقال صوابًا ومثل قولہ تعالی ویوم

ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ تمہارے پروردگار کو نسیان نہیں ہوتا۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔ اس دن جس دن روح (جو جبرئیل سے بھی عظیم المرتبہ ہے) اور فرشتے صف بہ صف کھڑے ہوں گے مگر کوئی بات نہ کرے گا۔ سوائے اس کے جسے خدائے رحمٰن اجازت دے گا اور وہ بات بھی صحیح کرے گا۔

معلوم کرو۔ کیوں کہ شبہات کے وقت توقف کرنا چاہ ہلاکت میں چھلانگ لگانے سے یقیناً بہتر و برتر ہے!!

(اصول کافی۔ تہذیب الاحکام وغیرہ)

جب دو حدیثوں میں تمام مرجحات برابر ہوں تو کیا کرنا چاہیے

جب کبھی ایسا اتفاق ہو کہ دو حدیثیں مذکورہ بالا مرجحات میں بالکل مساوی ہوں تو اب کیا کرنا چاہیے۔ آیا انسان کو اختیار ہے کہ جس حدیث پر چاہے عمل کرے یا اسے توقف کرنا چاہیے؟ اس میں چند قول ہیں۔ چونکہ بعض روایات میں تخییر کا حکم وارد ہے اور بعض میں توقف و تاخیر کا اس لئے ان کے درمیان جمع کئی طرح کی گئی ہے اول یہ کہ فقیہ کو چاہیے کہ فتویٰ دینے میں تو توقف کرے مگر مقام عمل میں وہ مختیر ہے۔ جس حدیث پر چاہے عمل کرے۔ دوم جب امام عالی مقام ظاہر ہوں اور ان کی خدمت میں رسائی ممکن ہو تو اس وقت توقف کا حکم ہے مگر جب صورتِ حال اس کے برعکس ہو۔ جیسے موجودہ زمانہ تو پھر تخییر ہے۔ سوم اگر وہ احادیث عبادات اور حقوق اللہ کے متعلق ہیں تو وہاں اختیار ہے کہ اگر حقوق الناس کے بارے میں ہیں تو وہاں توقف کرنا چاہیے۔ چہارم یہ کہ اگر ان دو حدیثوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنے میں مجبور ہو تو تخییر ہے اور اگر مجبور نہ ہو تو توقف کرنا چاہیے۔ پنجم یہ کہ تخییر جائز اور توقف استحباب پر محمول ہے

القیامۃ یکفر بعضکم ببعض و یلعن بعضکم بعضا و قولہ تعالیٰ ان ذالک لحق تخاصم اھل النار ثم یقول لا تختصموا لدی و قد قدمت الیکم بالوعید و قولہ الیوم نختم علی افواھھم و تکلمنا ایدیھم و تشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون و قولہ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ ثم یقول عز و جل لا۔

پھر فرماتا ہے قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے۔ اور ایک دوسرے کو لعنت کرو گے بے شک یہ اہلِ جہنم کا آپس میں لڑنا جھگڑنا برحق ہے پھر خدائے تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے حضور میں جھگڑا نہ کرو میں تمہاری طرف وعید و تہدید (بذریعہ انبیاء و اوصیاء) پہلے بھیج چکا تھا اور دوسرے مقام پر فرماتا ہے اس دن ہم ان کے منہ پر مہریں لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔ اس کی بابت گواہی دیں گے۔ ایک مقام پر فرماتا ہے۔ کچھ چہرے تو اس دن چمکتے دمکتے ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

ششم۔ یہ کہ جو حدیث مطابق احتیاط ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر بنظرِ غائر ان اقوالِ متفرقہ پر نگاہ ڈالی جائے تو پہلے اور دوسرے قول کا مآل و انجام ایک ہی ہے کیونکہ فتوے دینے میں توقف اور عمل کرنے میں اختیار زمانہ غیبت یا ان تک رسائی نہ ہو سکنے کی صورت میں ہی متصور ہو سکتا ہے ورنہ ان کی طرف اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے رجوع کرنا لازم و متحتم ہے۔ ھذا القول لا یخلو من القوۃ والاخیر احوط واللہ العالم۔

تتمۂ مہمہ

قرآنِ مجید میں اختلاف کا نہ ہونا اس کے کلام اللہ ہونے کی بیّن دلیل ہے

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جھوٹے کے کلام میں ضرور اختلاف و تناقض ہوتا ہے اور سچے کے کلام میں اختلاف نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ خلاقِ عالم نے قرآنِ مجید کو اپنا کلامِ معجز نظام ہونے کا ایک بڑا معیار یہ بھی قرار دیا ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً۔ اگر یہ قرآن غیرِ خدا کا کلام ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف ہوتا۔ لیکن اس میں اختلاف کا نہ ہونا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ خالقِ کلام کا کلام صداقت التیام ہے جو لوگ اس میں تضاد و تعارض کا گمان کرتے ہیں یہ ان کے عقل و ادراک کے قصور اور کج فہمی و کم اندیشی

تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر و قولہ عزّ و جلّ ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الّا وحیاً او من وراء حجاب ثمّ یقول و کلّم اللہ موسیٰ تکلیماً و قولہ تعالیٰ و نادیھما ربّھما الم انھکما عن تلکما الشجرۃ و قولہ تعالیٰ لا یعزب عنہ مثقال ذرّۃ فی السمٰوٰت ولا فی الارض

دوسرے مقام پر فرماتا ہے نظریں ان کو نہیں پا سکتیں ہاں البتہ وہ بینائیوں کو پاتا ہے اور وہ باریک بین اور خبردار ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے کسی بشر کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے سوائے اس کے کہ وحی کے ذریعے ہو یا پس پردہ سے۔ پھر فرماتا ہے موسیٰ سے خدا نے اس طرح کلام کیا جو کلام کرنے کا حق ہے۔ ان کے پروردگار نے پکار کر ان سے کہا کیا میں نے تم دونوں کو اس کا پھل کھانے سے منع نہیں کیا تھا۔ ایک مقام پر فرماتا ہے تمہارے پروردگار سے زمین و آسمان کی ذرہ بھر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

کا ثمرہ و نتیجہ ہے جو ؎

کم من عائب قولاً صحیحاً ۔۔۔ و آفتہ من الفھم السقیم

کا مصداق ہے۔ جو لوگ خالقِ کلام کے کلامِ حقیقت ترجمان میں نقص و عیب نکالنے کی سعیٔ لا حاصل کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنی خباثتِ نفس، جہالت و ضلالت اور قلتِ علم و فہم کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ کتبِ سیر و تواریخ میں کئی ایک ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کئی کورباطن لوگوں نے اس قسم کی مذموم حرکتیں کیں مگر کبھی اپنے مقاصدِ مشؤمہ میں کامیاب نہ ہو سکے اور نہ ہی کیونکر سکتے تھے جب کہ خالقِ اکبر خود اپنے کلام کا محافظ ہے۔ ؎

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے ۔۔۔ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

نیز اس کا مقابلہ و معارضہ طاقت بشری سے مافوق ہے جیسا کہ قبل ازیں اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے:

ایک عجیب واقعہ

ان واقعات میں سے صرف ایک واقعہ یہاں پیش کیا جاتا ہے جو حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے زمانہ کا ہے۔ ایک زندیق نے جو مختلف علوم میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ بنام تناقض القرآن ایک کتاب لکھنا شروع کی جس میں اس نے بزعم خود بعض آیاتِ قرآنیہ میں اختلاف اور تناقض ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ جب امام علیہ السلام کو اس کی اس جسارت کا علم ہوا تو آپ نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کو حکم دیا کہ تم جا کر اس زندیق کی شاگردی اختیار کرو اور اس کے ساتھ گہرے روابط پیدا کر کے اس کا اعتماد حاصل کرو اور جب وہ تم سے اچھی طرح مانوس ہو جائے تو اس سے یہ سوال کرنا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ جو مطالب و معانی تم نے قرآن سے سمجھے ہیں وہ صحیح نہ ہوں اور خدا کا منشاء کچھ اور ہو؟ وہ فیلسوف ہے۔

ولا اصغر من ذالک ولا اکبر الا فی کتاب مبین ثم یقول الله تعالیٰ ولا ینظر الیهم یوم القیٰمة ولا یزکیهم ثم یقول کلا انهم عن ربهم یومئذ لمحجوبون و مثل قوله تعالیٰ ءأمنتم من فی السماء ان یخسف بکم الارض فاذا هی تمور و قوله تعالیٰ الرحمٰن علی العرش استوی ثم یقول وهو الله فی السمٰوٰت و فی الارض.

اور نہ اس سے چھوٹی اور بڑی مگر یہ کہ روشن کتاب میں سب موجود ہے۔ دوسرے مقام پر فرماتا ہے قیامت کے دن نہ ان کی طرف نظر کرے گا نہ ان کو پاک کرے گا۔ (کافر) لوگ اپنے پروردگار سے حجاب میں رہیں گے۔ ایک مقام پر فرماتا ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو۔ جو آسمان میں رہتا ہے کہ تم کو زمین میں دھنسا دے اور وہ زمین یکایک بھونچال میں آجائے۔ خدا عرش پر غالب ہے۔ دوسرے مقام پر فرماتا ہے خدا آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی۔ تمہارے بھیدوں کو بھی جانتا ہے اور ظاہری حالات کو بھی اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس سے آگاہ ہے۔

یقیناً جواب اثبات میں دے گا جب وہ اس امر کا اقرار کرے کہ ہاں ایسا ممکن ہے! تو پھر تم اس سے کہنا جب یہ ممکن ہے تو پھر تم یہ تناقض القرآن نامی کتاب لکھ کر کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو کیونکہ ممکن ہے کہ خدا کا منشا کچھ اور ہو اور تم کچھ اور سمجھ رہے ہو؟ چنانچہ اس صحابی نے امامؑ کی ہدایت کے مطابق عملدرآمد کیا۔ الغرض جب اس صحابی نے یہ آخری سوال کیا تو وہ زندیق خاموش ہو گیا اور گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اٹھا اور جس قدر کتاب کے اجزاء لکھ چکا تھا ان کو پھاڑ ڈالا۔ زندیق نے اصرار کیا کہ بتاؤ تم نے یہ دلیل جمیل کہاں سے حاصل کی ہے۔ صحابی نے بہت کچھ لیت و لعل کے بعد اقرار کیا کہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے حاصل کی ہے یہ معلوم کر کے زندیق نے کہا واقعاً وہی بزرگوار ایسی دلیل قائم کر سکتے ہیں (احتجاج طبرسی) یہ تو خالق اکبر کا کلام ہے اگر لوگ اسے نہیں سمجھ سکتے تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ انسان تو اس قدر کم علم و عقل واقع ہوا ہے کہ وہ اپنے ابنائے نوع اہل علم کے کلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتا۔ محقق عماد جناب میر سید محمد باقر دامادؒ کے کلام پر ایک شخص اعتراض کرتا ہے۔ وہ جواب میں فرماتے ہیں۔ فہمیدن کلام ما ہنر است نہ کہ برما اعتراض نمودن تمہارے لئے ہمارے کلام کا سمجھ لینا ہنر اور کمال ہے نہ کہ ہمارے اوپر اعتراض کرنا (فوائد رضویہ) غالب اور اقبال کا کلام موجود ہے۔ بڑے بڑے ایم اے پاس بلکہ پی ایچ ڈی ان کے بعض اشعار کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے بلکہ اپنی نا سمجھی سے ان اشعار کو ہی مہمل قرار دے دیتے ہیں حالانکہ عند التحقیق ان کا ایک شعر بھی مہمل نہیں۔ ان کے

يعلم سرّكم وجهركم ويعلم ما تكسبون وقال تعالى ما يكون من نجوى ثلثة الا هو رابعهم ولا خمسة الا هو سادسهم ولا ادنى من ذالك ولا اكثر الا هو معهم اينما كانوا ويقول عزّ وجلّ ونحن اقرب اليه من حبل الوريد وقال الله تعالى هل ينظرون الا ان تاتيهم الملٰئكة او ياتى امر ربك۔

کسی راز میں تین شریک نہیں ہوتے کہ وہ خود ان کا چوتھا نہ ہو اور پانچ شریک نہیں ہوتے کہ وہ ان کا چھٹا نہ ہو اور نہ اس سے کم ہوتے ہیں اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ جہاں کہیں بھی ہوں خدا خود ان کے پاس ہوتا ہے۔ نیز فرماتا ہے ہم اس کی شہ رگ حیات سے بھی زیادہ قریب ہیں؛ ایسا کیا وہ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمہارا رب آئے۔

شارحین کلام کا باہمی اختلاف حقیقت تک عدم رسائی کی قطعی دلیل ہے۔ پس جب عام لوگ اپنے جیسے انسانوں کا کلام نہیں سمجھ سکتے تو خالقِ کلام کے کلام معجز نظام کا صحیح مفہوم سمجھنے کا کیونکر دعوے کر سکتے ہیں؟ اس قسم کی متعدد آیات کلام پاک کے اندر موجود ہیں جن کے متعلق زنادقہ و ملحدین اور بعض کوتاہ اندیش ظاہر بین لوگ باہمی تعارض و تباین کا زعم باطل کرتے ہیں، چنانچہ ان میں سے چند آیات کا حضرت مصنف علام نے ذکر کرکے ان کی توضیح و تاویل کے سلسلہ میں حضرت امیرالمومنینؑ کی اس طولانی حدیث شریف کا حوالہ دیا ہے جو کتاب التوحید اور کتاب احتجاج میں مذکور ہے۔ نیز اس سلسلہ میں ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر فرمایا ہے۔ نہ معلوم وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے یا نہ؟ بظاہر تو کسی ایسی کتاب کا نام انکی تالیفات میں نہیں ملتا۔ واللہ العالم۔ بہرحال اگرچہ ان آیات کی متکلمین و مفسرین نے بڑی تنقیحات و توضیحات فرمائی ہیں اور تضاد و تعارض والے شبہ کے بڑے کافی و مدلل جوابات دیئے ہیں جن کے لئے مبسوط کتب کلام و تفسیر کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ہم سردست اس سلسلہ میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی حدیث شریف کے ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ یہ حدیث بہت طویل الذیل ہے جو کتاب التوحید مطبوعہ بمبئی کے تقریباً دس صفحات تک پھیلی ہوئی ہے جس میں اس قرآنِ ناطق کی زبانی قرآنِ صامت کی بیسیوں ایسی آیات کا صحیح حل موجود ہے ہم بنظر اختصار اس کے صرف اس حصہ کا ترجمہ کرتے ہیں جو ان آیات کے متعلق ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہیں۔

کلام امام علیہ السلام سے بعض مجمل آیات کا بیان

ایک آدمی نے حضرت امیرالمومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا امیرالمومنینؑ میں کتاب اللہ کی صداقت کے متعلق بعض شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ ان کا ازالہ فرمائیں۔ آنجنابؑ نے دریافت

او یاتی بعض ایات ربك ومثل قوله قل یتوفیکم ملك الموت الذی وکل بکم ثم یجعل توفتهم رسلنا وهم لا یفرطون وقال تعالی الذین یتوفیهم الملئکة و قال الله تعالی الله یتوفی الانفس حین موتها ومثل هذا فی القرآن کثیر فقد سئل عنها رجل من الزنادقة عن امیر المومنین علیه الصلوٰة والسلام فاخبره بوجوه اتفاق معانی هذه الا یات وبین له تاویلها وقد

یا تمہارے پروردگار کی کچھ نشانیاں آئیں۔ ایک مقام پر فرماتا ہے کہہ دو کہ وہ ملک الموت جو تم پر معین کیا گیا ہے وہ تم کو وفات دیتا ہے۔ پھر فرماتا ہے ان کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) وفات دیتے ہیں اور وہ کسی طرح کوتاہی نہیں کرتے۔ نیز فرماتا ہے وہ لوگ جن کو فرشتے وفات دیتے ہیں۔ دوسرے مقام پر فرماتا ہے موت کے وقت خدا نفسوں کو وفات دیتا ہے۔ اس قسم کی آیات قرآنِ مجید میں بکثرت موجود ہیں ایک مرتبہ ایک زندیق نے اس قسم کی آیات کے متعلق حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے

٥ ان آیات کی تاویل وتفسیر اور ان کے متعدد المعانی ہونے کے تفصیلی اسباب و وجوہ بیان فرمائے تھے۔

فرمایا:- سو تجھے کیونکر شک لاحق ہوا؟ اس نے عرض کیا بھلا کیونکر مجھے شک نہ ہو جبکہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تکذیب کر رہا ہے۔ حضرت نے فرمایا ان کتاب اللہ یصدق بعضه بعضًا ولا یکذب بعضه بعضًا ولکنك لم ترزق عقلا تنتفع به۔ کتاب اللہ کا ایک حصہ تو دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہے نہ تکذیب لیکن تجھے اس قدر عقل نہیں دی گئی جس سے تو فائدہ حاصل کر سکے! کلام امام سے معلوم ہوا کہ یہ اختلاف کمی عقل وخرد کا نتیجہ ہے، پھر آپ نے فرمایا وہ آیات پیش کرو جن کے متعلق تجھے شک ہوا ہے۔ چنانچہ اس شخص نے وہ آیات پیش کرنا شروع کیں کہ ایک مقام پر خدا یوں فرماتا ہے فالیوم ننسٰهم کما نسوا لقاء یومهم هذا۔ پھر فرماتا ہے۔ نسوا الله فنسیهم۔ ان آیتوں سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ کو نسیان لاحق ہوتا ہے۔ مگر ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ وما کان ربك نسیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کو نسیان نہیں ہوتا! یہ تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ان آیات کا صحیح مطلب یہ ہے نسوا الله فی دار الدنیا لم یعملوا بطاعته فنسیٰهم فی الاٰخرة لم یجعل لهم فی ثوابهم شیئًا فصاروا منسیین من الخیر۔ یعنی یہ لوگ دنیا میں اللہ سبحانہٗ کو بھول گئے یعنی اس کی اطاعت وفرمانبرداری نہ کی لہٰذا خدا آخرت میں ان کو بھول جائے گا یعنی ان کو کچھ اجر وثواب عطا نہ کرے گا۔ گویا کہ وہ فراموش کردیئے گئے خلاصہ یہ کہ ان کے فعل کی ان کو جزا دے گا۔ لہٰذا من باب المشاکلہ ندرت پر نسیان کا اطلاق کیا گیا ہے ورنہ ان ربنا تبارك وتعالی علوًا کبیرًا لیس بالذی ینسیٰ ولا یغفل بل هو الحفیظ العلیم۔ ہمارے پروردگار کی شان

اخرجت الخبر فی ذالك مسندا لشرحه فی کتاب التوحید وساجرد فی ذالك کتابا بمشیته وعونه تعالی تم بالخیر والعافیہ۔

میں نے اپنی کتاب التوحید میں اس حدیث کو پوری سند اور شرح کے ساتھ لکھ دیا ہے اور ارادہ ہے کہ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تحریر کروں گا انشاء اللہ۔

غفلت ونسیان سے اجل وارفع ہے۔ یہ جواب باصواب سن کر یہ شخص بے ساختہ کہہ اٹھا فرجت عنی فرج اللہ عنك وحللت عنی عقدۃ فعظم اللہ اجرك۔ آپ نے میرے عقدے حل کر دیئے ہیں۔ خداوند عالم آپ کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ حضرت نے فرمایا دوسرا شبہ کس آیت سے متعلق ہے۔ اس نے عرض کیا کہ ایک مقام پر خدا فرماتا ہے یوم یقوم الروح والملائکۃ صفا لا یتکلمون الا من اذن له الرحمٰن وقال صوابا اور دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ کفار کہیں گے واللہ ربنا ما کنا مشرکین ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے ویوم القیمۃ یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بروزِ قیامت مجرم گفتگو کریں گے مگر ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے الیوم نختم علی افواھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مجرم نہیں بول سکے گا کیوں کہ ان کے مونہوں پر مہریں لگی ہوئی ہوں گی۔ آنجناب نے فرمایا فان ذالك فی مواطن غیر واحد من مواطن ذالك الیوم الذی کان مقدارہ خمسین الف سنۃ۔ یہ مختلف حالات بروز قیامت کے مختلف مواطن ومقامات میں رونما ہوں گے کیونکہ وہ دن پچاس ہزار سال کا ہوگا جیسا کہ قرآن میں وارد ہے۔ بعض مقامات پر وہ باہم گفتگو کریں گے۔ ایک دوسرے سے بیزاری اختیار کریں گے۔ ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے۔ اور بعض ایک دوسرے کے لئے دعا واستغفار کریں گے اور بعض مقامات پر مجرموں کے مونہوں پر مہریں لگائی جائیں گی لہٰذا فی الحقیقت ان آیات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سائل یہ جوابِ باصواب سن کر بہت خوش ہوا اور پھر وہی فقرے دہرائے جو پہلے کہے تھے یعنی فرجت عنی فرج اللہ عنك وحللت عنی عقدۃ فعظم اللہ اجرك۔ پھر آنجناب نے فرمایا بتاؤ اور کس آیت میں شبہ ہے۔ اس نے عرض کیا کہ ایک مقام پر خدا ارشاد فرماتا ہے وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ۔ اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ کچھ لوگ خدا کو بروزِ قیامت دیکھیں گے۔ مگر دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے لا تدرکه الابصار وھو یدرك الابصار وھو اللطیف الخبیر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کوئی شخص اسے نہیں دیکھ سکتا؟ آنجناب نے جو مفصل جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ النظر الی ربھم النظر الی ما وعدھم ربھم فذلك قوله الی ربھا ناظرۃ

وانما یعنی بالنظر الیه النظر الی ثوابه تبارک وتعالیٰ یعنی یہاں اس آیت میں پروردگار کی طرف نگاہ کرنے سے مراد اس کے اجر و ثواب کی طرف نگاہ کرنا ہے پس خلاصۂ معنی یہ ہوگا کہ الی ثواب ربھا ناظرۃ لہٰذا دونوں آیتوں کے درمیان کوئی تضاد و تعارض نہیں ہے پھر امام عالی مقام نے ارشاد فرمایا اور کس آیت کے متعلق شک ہے؟ اس نے عرض کیا ایک مقام پر خلاقِ عالم فرماتا ہے وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنه ما یشاء۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی خدا کسی بندے سے بلا واسطہ کلام نہیں کرتا۔ مگر دوسرے مقام پر فرماتا ہے وکلم الله موسیٰ تکلیما فادیٰھما ربھما الم انھکما... یا آدم اسکن انت وزوجک الجنة۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض حضرات سے بلا واسطہ بھی کلام کرتا ہے؟ امام علیہ السلام کے جواب باصواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض درحقیقت الا وحیا میں وحی کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔ وحی کلام خدا ہے وکلام الله لیس علیٰ طریق واحد منه ما کلم الله به الرسل ومنه ما قذف فی قلوبھم ومنه رؤیا یراھا الرسل ومنه وحی وتنزیل یتلیٰ ویقراء فھو کلام الله۔ خدا کا کلام ایک طریقہ پر نہیں ہوتا بلکہ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے رسولوں سے کلام کرتا ہے۔ دوسری قسم وہ کلام ہے جو ان کے قلوب مطہرہ میں القاء و الہام فرماتا ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جس میں بذریعہ خواب انبیاء سے ہمکلامی ہوتی ہے۔ چوتھی قسم وہ ہے جو بصورت تنزیل انبیاء پر نازل ہوتی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور اسے پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا بنا بریں ان آیات میں ہرگز کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سائل نے پھر فرطِ مسرت سے والہ و شیدا ہو کر کہا فرجت عنی فرج الله عنک وحللت عنی عقدۃ فعظم الله اجرک یا امیر المومنین۔ آپ نے فرمایا اور جس آیت میں شک ہے وہ بھی بیان کرو اس نے عرض کیا ایک مقام پر خدا فرماتا ہے وما یعزب عن ربک من مثقال ذرۃ فی الارض ولا فی السماء اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائے عالم سے کائنات کی کوئی شے مخفی و مستور نہیں ہے۔ مگر ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ ولا ینظر الیھم یوم القیامة ولا یزکیھم اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس سے مخفی و محتجب ہوں گے۔ یہ تناقض نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ آنجناب نے فرمایا آیت مبارکہ لا ینظر الیھم سے مراد یہ ہے کہ ان کو کچھ اجر و ثواب عطا نہیں فرمائے گا۔ عرب کہتے ہیں لا ینظر الینا فلان فلاں شخص ہماری طرف نگاہ نہیں کرتا ای لا یصیبنا منه خیر یعنی ہمیں کچھ عطا نہیں کرتا۔ اسی طرح کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون سے مراد یہ ہے کہ عن ثواب ربھم لمحجوبون وہ اپنے پروردگار کے اجر و ثواب سے محتجب و مستور رہیں گے۔ نہ یہ کہ خود ذاتِ ایزدی سے پوشیدہ ہوں گے۔ پھر فرمایا اور کس آیت میں شبہ ہے؟ اس شخص نے عرض کیا ایک مقام خدا فرماتا

ہے ان اللہ علی العرش استویٰ دوسری جگہ فرماتا ہے وھو اللہ فی السماوالله وفی الارض الله ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔ ھو معکم این ما کنتم ایک اور جگہ فرماتا ہے نحن اقرب الیہ من حبل الورید پہلی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا عرش پر ہے۔ دوسری سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ وہ آسمان و زمین میں ہے تیسری آیت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ ہے۔ چوتھی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شہ رگ حیات سے بھی زیادہ قریب ہے۔ یہ تضاد نہیں تو اور کیا ہے۔ آنجناب نے فرمایا کہ تم نے صفاتِ خداوندی کا قیاس مخلوق کی صفات پر کیا ہے حالانکہ اس سے اس کی شان اجل وارفع ہے۔ وہ لامکان ہے۔ اس کا کوئی مکان نہیں ہے علی العرش استویٰ کے معنی یہ ہیں کہ وہ عرش پر غالب ہے اور اس کے زمین و آسمان میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین و آسمان میں معبود ہے اور اس کے ہر جگہ ہونے کا مفہوم ہے کہ وہ علمی اعتبار سے ہر شے کو محیط ہے وہی تمام اشیاء عالم کا مدبر و منتظم ہے۔ اس کے بعد امام عالی مقام نے فرمایا اور جس آیت مبارکہ میں تجھے شک ہے اس کا بیان کرو۔ سائل نے عرض کیا کہ ایک مقام پر خدا فرماتا ہے وجاء ربک والملک صفاً صفاً دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ فی ظلل من الغمام والملائکۃ او یاتی بعض ایات ربک۔ ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بروزِ قیامت خود خدا آئے گا۔ دوسرے مقام پر فرماتا ہے یوم یاتی بعض آیات ربک لا ینفع نفسا ایمانھا لم تکن امنت من قبل اوکسبت فی ایمانھا خیرا۔ ان آیات سے بعض آیات ربانیہ کا آنا ثابت ہوتا ہے لہٰذا ان آیتوں میں کھلا ہوا اختلاف موجود ہے۔ آنجناب نے فرمایا کہ جن آیات میں خدائے عز و جل کا آنا مذکور ہے۔ اس کا اس طرح آنا مراد نہیں جس طرح پر ارشاد فرماتا ہے فاتھم اللہ من حیث لم یحتسبوا۔ خداوندِ عالم ان کے پاس اس جگہ سے آیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا اس سے مراد یہی ہے کہ ارسل علیھم عذابا کہ ناگہانی طور پر خدا نے ان پر عذاب نازل کیا اسی طرح آیت مبارکہ فاتی اللہ بنیانھم من القواعد سے مراد بھی نزولِ عذاب و عقاب ہے۔ اور تیسری آیت جس میں ملائکہ یا بعض آیات کے آنے کا تذکرہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کفار و مشرکین جو خدا اور رسول پر ایمان نہیں لاتے وہ ہر وقت اس بات کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ ان کے پاس ملائکہ عذاب یا حکم پروردگار یا بعض آیات یعنی دارِ دنیا میں عذاب نازل ہو۔ اور آخری آیت میں بعض آیات کے آنے سے مغرب سے طلوعِ آفتاب مراد ہے وہ جو کہ ظہور حضرت قائم آلِ محمدؐ کے وقت ہوگا۔ پھر آنجناب نے فرمایا اور جس آیت مبارکہ کے بارے میں تمہیں شک ہے اسے بیان کرو۔ سائل نے کہا ایک مقام پر خداوندِ عالم فرماتا ہے قل یتوفاکم ملک الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتھا۔ ایک اور جگہ فرماتا ہے قال الذین تتوفاھم الملائکۃ۔ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے

کہ ملک الموت مارتا ہے۔ دوسری آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ مارتا ہے اور تیسری آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے ملائکہ مارتے ہیں۔ اس قدر واضح اختلاف کے باوجود میں کس طرح قرآن میں شک نہ کروں اگر آپ میری حالت زار پر رحم نہ کریں اور میرے لئے شرح صدر کا انتظام نہ فرمائیں تو میں ہلاک و برباد ہو جاؤں گا امام عالی مقام نے فرمایا کہ ان آیات میں ہرگز کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ خداوند عالم ہی حقیقی مدبر اور ناظر الامور ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے معاملات کی تدبیر فرماتا ہے۔ جب کسی شخص کو مارنا چاہتا ہے تو بعض کے پاس ملک الموت کو بھیجتا ہے اور بعض کے پاس دوسرے ملائکہ کو یدبّر الامر کیف یشاء اور چونکہ یہ سب کچھ خدائے حکیم کے حکم سے ہوتا ہے لہٰذا وہ محی و ممیت کہلاتا ہے۔ سائل نے خوش و خرم ہو کر کہا فرجت عنی فرج اللہ عنك یا امیر المومنین و نفع اللہ بك المسلمین۔ وارد ہے کہ وہ شاک و مرتاب شخص جناب امیر علیہ السلام کے کلام حقائق ترجمان کی برکت سے تائب ہو کر کامل الایمان بن گیا وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین و صلی اللہ علیٰ سید الانبیا والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین المعصومین

تم الکتاب والحمد للہ الوہاب الذی وفقنی لاتمام ہذا الشرح المستطاب ببرکۃ النبی وآلہ الاطیاب وارجو من الطافہ الخفیۃ والجلیۃ ان ینفع بہ کل مومن وکل جاحد مرتاب و یہدیہم الی جادۃ الرشد والصواب و یجعل ذالك ذخراً لی ولوالدی و ولدی واساتیذی وتلامیذی یوم المآب وکان الفراغ من تسویدہ یوم الاثنین الرابع والعشرین من ربیع الاول سنہ ۱۳۸۴ھ المصادف لثالث اغسطس سنہ ۱۹۶۴ء بالساعۃ الخامسۃ بعد الزوال ختم اللہ سبحانہ امورنا بالحسنیٰ بالخمسۃ النجباء ورزقنا حسن الخاتمۃ بالنبی المصطفیٰ والوصی المرتضیٰ والحسن المجتبیٰ والحسین سید الشہداء فاطمۃ الزہراء واولادہا الکرام البررۃ الاتقیاء۔

وفقنا لاعادۃ النظر علیہ واخراجہ من السواد الی البیاض یوم الثلاثاء الرابع والعشرین من ذی الحجۃ الحرام سنہ ۱۳۸۴ھ یوم المباہلۃ الموافق للسابع والعشرین من ابریل سنہ ۱۹۶۵ء بعد الساعۃ الخامسۃ وفرغنا من اعادۃ النظر علیہ واعدادہ للطبع الثانی بعد الاضافات المفیدہ یوم الاربعاء السابع والعشرین من جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ المطابق لحادی والعشرین من جولائی ۱۹۷۱ء بالساعۃ الحادیہ عشر والحمد للہ اولاً و آخراً وظاہراً وباطناً۔ وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ الطاہرین۔

(صفحہ ۵۲۵ سطر ۱۰ سے آگے)

ختمِ نبوت

مسئلہ ختم نبوت یعنی یہ کہ سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کوئی نیا یا پرانا نبی بحیثیت نبی و رسول تشریعی یا غیر تشریعی، ظلی یا بروزی نہیں آسکتا۔ ان مسلم الثبوت اسلامی مسائل میں سے ہے کہ جس پر تمام فرقہائے اسلام کا اجماع و اتفاق ہے بلکہ ان ضروریات دین میں سے ہے جن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج متصور ہوتا ہے۔ یہاں بڑے ایجاز و اختصار کے ساتھ اس موضوع پر تھوڑا سا تبصرہ کیا جاتا ہے تاکہ اس اہم مبحث سے ہماری یہ علمی کتاب خالی نہ رہ جائے۔

ختمِ نبوت قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں اس قسم کی بکثرت آیات مبارکہ موجود ہیں جو بالصراحت یا بالاشارہ اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں ہم اختصار کے پیش نظر دو تین آیات مبارکہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

پہلی آیت مبارکہ ارشاد قدرت ہے ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین (پ ۲۲ ع ۳) "محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں"۔

تقریب استدلال یہاں دو چیزیں قابل غور ہیں ایک لفظ خاتم کی تحقیق۔ دوسرے لفظ النبیین کی تحقیق خاتم کی قرأت میں اختلاف ہے۔ قراء سبعہ میں سے صرف دو قاریوں حسن اور عاصم نے اسے خاتَم (ت کی زبر کے ساتھ) پڑھا ہے باقی تمام قاریوں کے نزدیک خاتِم (ت کی زیر کے ساتھ) ہے۔ (ابن جریر ج ۲۲ ص)

لفظ خاتم کی لغوی تحقیق اگر اس لفظ کو خاتَم (ت کی زبر کے ساتھ) پڑھا جائے تو اس کے یہ معانی لغت میں مرقوم ہیں (۱) مہر کا نگینہ جس پر نام وغیرہ کندہ ہوتا ہے (۲) انگوٹھی (۳) آخر قوم کہا جاتا ہے، خاتم القوم ای آخرہم (قاموس ج ص۔ لسان العرب ج ص۔ المنجد ص۔ تاج العروس ج ص) اور اگر اسے خاتِم (ت کی زیر کے ساتھ) پڑھا جائے تو اس کا اسم فاعل کے معنوں میں کسی چیز کا ختم کرنے والا اس قدر واضح اور روشن مفہوم ہے کہ جس کی تشریح محتاج بیان نہیں ہے۔ یہاں حقیقی طور پر پہلے اور دوسرے معنی تو مراد ہو نہیں سکتے۔ لہٰذا تیسرے اور چوتھے معنی کے صحیح تسلیم کر لینے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اس کے اعتبار سے آیت کا مفہوم آخر النبیین اور سلسلۂ انبیاء کے ختم کرنے والے ہوتا ہے ——— اور اگر مجازاً پہلے اور دوسرے معنی کو مراد لیا جائے تو بھی مطلب یہی نکلتا ہے کہ آنحضرت خدا کے آخری نبی ہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ مہر کسی مطلب کے خاتمہ پر ہی لگائی جاتی ہے۔ جب کسی تحریر کے خاتمہ پر مہر لگ جائے تو اس کے بعد کچھ لکھا نہیں جا سکتا۔ اگر لکھا گیا تو وہ تحریر جعلی تصور کی جائے گی۔ اور جس لفافہ پر لگ جائے اس میں اب کچھ داخل نہیں کیا جا سکتا۔ کما لا یخفیٰ باقی رہی۔ دوسرے لفظ النبیین کی تحقیق نبیین

پر اتفاق ہے، کہ الف لام تعریف جب جمع پر داخل ہو، اور وہاں معہود و مخصوص افراد کیلئے کوئی قطعی قرینہ موجود نہ ہو تو یہ عموم و استغراق پر دلالت کرتی ہے لہٰذا النبیین سے مراد تمام انبیاء ہوں گے۔ لہٰذا قطع نظر پیغمبر اسلام، صحابہ کرامؓ، تابعین اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی تصریحات جلیلہ کے صرف لغت عرب کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس آیت مبارکہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ آنحضرتؐ سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی ہیں، جن کے بعد کوئی نیا یا پرانا شخص بحیثیت رسول و نبی نہیں آسکتا۔

دوسری آیت مبارکہ ارشاد قدرت ہے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً (پ ۶ س مائدہ ع ۱) "آج کے دین میں نے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین اسلام کو تمہارے لیے منتخب کیا ہے۔"

یہ آیت مبارکہ بہانگ دہل پکار کر اعلان کر رہی ہے کہ جس قصر دین کا سنگ بنیاد حضرت آدمؑ نے اپنے دست حق پرست سے رکھا تھا اور جس کی تعمیر میں تمام سابقہ انبیاء حصہ لیتے رہے۔ اس کی تکمیل حضرت محمد بن عبداللہ نبی خاتم کے ہاتھوں پر ہو گئی۔ اب اس دین کے عقائد، اعمال، اخلاق و آداب اور فرائض و سنن، محرمات و مباحات اور سب احکام حلال و حرام کو کامل مقدس کر دیا گیا۔ حلال محمد حلال الی یوم القیامۃ و حرامہ حرام الی یوم القیامۃ (اصول کافی)۔ لہٰذا جب دین مکمل ہو چکا ہے، سب احکام العباد نازل ہو چکے، بانیٔ اسلام ان کی توضیح و تشریح فرما چکے، قرآن و سنت میں جمیع ما تحتاج الیہ الامت کا مفصل بیان موجود ہے، تو پھر اب کسی نبی کی ضرورت کیا ہے؟ فمن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین

تیسری آیت مبارکہ تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیراً (پ ۱۸ س ف ع ۱) "بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندۂ خاص پر قرآن نازل کیا تا کہ وہ عالمین کے لیے ڈرانے والے قرار پائیں"۔ یہ آیت بعبارۃ النص دلالت کرتی ہے کہ آنحضرتؐ عالمی نبی ہیں۔ انکی بعثت تمام عالمین کے لیے ہوئی ہے اور آپ کے فیوض و برکات سے تمام عالمین مستفیض ہو رہے ہیں اور یہی آیت مبارکہ وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین کا مفاد ہے، جب آنحضرتؐ عالمین کے نذیر اور ان کے لیے باعث رحمت ہیں اور نجات دارین و سعادت کونین حاصل کرنے کیلئے آپ پر ایمان لانا اور آپ کی اتباع کرنا کافی ہے تو پھر کسی اور نبی کو ماننے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ کیا کسی نبی کو بھیجنا عبث کام نہیں؟ کیا خدا کا دامن ربوبیت عبث کاری سے منزہ و مبرا نہیں ہے؟ مالکم کیف تحکمون۔

ختم نبوت احادیث خاتم النبیین کی روشنی میں

اس سلسلہ میں احادیث نبویہ کا اس قدر وافر ذخیرہ موجود ہے، کہ جن کے عدو احصار کے لیے ایک دفتر درکار

پہلی حدیث :۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں :۔ ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتا فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ قال فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین ۔ (بخاری ومسلم ج ۲ ص ۲۴۸، مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۸ وغیرہ) میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی مثال اس شخص جیسی ہے، جس نے ایک گھر بنایا اور اس کی خوب آرائش و زیبائش کی مگر ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ اب لوگ اس گھر کو دیکھ دیکھ خوش ہوتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے وقت کہتے ہیں، یہ اینٹ کیوں نہ لگادی گئی؟ فرمایا وہ (آخری) اینٹ میں ہوں اور میں خاتم الانبیاء ہوں۔

اس سے بڑھ کر کس طرح ختم نبوت کے مسئلہ کی وضاحت و صراحت کی جاسکتی ہے؟

دوسری حدیث ۔ فرمایا لاتقوم الساعۃ حتی یبعث دجالون کذابون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لانبی بعدی ۔ (سنن ابوداؤد ۔ ترمذی وغیرہ) ـــــ اسوقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی، جب کئی جھوٹے دجال نہ اٹھائے جائیں۔ جن میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا ہوگا کہ وہ نبی ہے۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے ـــ اس حدیث شریف میں سرکار ختمی مرتبت نے وضاحت فرمادی ہے کہ خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، ظاہر ہے کہ اگر آنحضرتؐ کے بعد سلسلہ انبیاء جاری وساری ہوتا تو آنحضرتؐ سابقہ انبیاء کے دستور کے مطابق اس آنے والے نبی کا تعارف کرتے نہ یہ کہ ہر مدعی نبوت کو دجال و کذاب قرار دیتے!

تیسری حدیث ، فرمایا۔ کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لانبی بعدی وسیکون خلفا (بخاری ج ۱ ص ۴۹ مسلم ج ۲ ص ۲۴ مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۷ ابن ماجہ وغیرہ) بنی اسرائیل کا طریقہ یہ تھا کہ ان کی قیادت ان کے نبی کرتے تھے۔ جب ایک نبی کی وفات ہوتی تو اس کی جگہ دوسرا نبی آجاتا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ البتہ خلیفے ضرور ہوں گے۔ اس حدیث شریف میں بھی ہر قسم کی تشریعی و غیر تشریعی نبوت کے انسداد کا اعلان کیا گیا ہے۔

چوتھی حدیث فرمایا لایبقی بعدی من النبوۃ شیئ الا المبشرات قالو یا رسول اللہ۔ وما المبشرات؟ قال الرؤیا الصالحۃ یراھا المسلم اوتریٰ لہ ـ (کنز العمال و مسند احمد، سنن نسائی۔ سنن ابن ماجہ) میرے بعد نبوت کا کوئی جزء باقی نہیں رہا۔ سوائے مبشرات کے! اصحاب نے عرض کیا یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا وہ اچھا خواب جو کوئی مسلمان دیکھے یا اس کے لیے کسی اور کو دکھایا جائے۔ یہ حدیث شریف بھی اس مطلب پر نص صریح ہے کہ سوائے اچھے خواب کے باقی سب اجزاء نبوت ختم ہوچکے ہیں۔

پانچویں حدیث آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق جنگ تبوک میں فرمایا :۔ اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی (بخاری۔ مسلم باب فضائل الصحابہ) اے علی، تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے، جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا، ورنہ تم ہارونؑ کی طرح ضرور نبی بھی ہوتے۔

نفسِ رسولؐ بوجہ انسداد باب نبوت درجۂ نبوت پر فائز نہیں ہو سکتا تو اور کس ماں کا بیٹا ہو سکتا ہے۔

چھٹی حدیث فرمایا:۔ ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی (ترمذی، کتاب الرؤیا۔ مسند احمد) میرے بعد رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب میرے بعد نہ کوئی رسول آئے گا اور نہ نبی۔

ختمِ نبوت ارشادات ائمہ طاہرینؑ کی روشنی میں

اس سلسلہ میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کے بکثرت فرامین موجود ہیں، یہاں صرف تبرکاً دو چار ارشادات پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

جناب امیرالمومنین نہج البلاغہ (خطبۂ دوم) میں ارشاد فرماتے ہیں۔ بعث اللہ محمداً رسولہ لانجاز عدتہ وتمام نبوتہ الخ .... خداوند عالم نے جناب محمدؐ کو ایفائے عہد اور عہد نبوت کو تمام کرنے کی خاطر رسول بنا کر بھیجا۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا:۔ لقد ختم اللہ بکتابکم الکتب وختم بنبیکم الانبیاء (اصول کافی ووافی) ــــ خدا نے تمہاری کتاب (قرآن) کے ذریعہ کتابوں کو اور تمہارے نبی کے ذریعہ تمام نبیوں کو ختم کر دیا ہے ــــ حضرت جعفر صادقؑ سے منقول ہے فرمایا:۔ ان اللہ ختم بنبیکم النبیین فلا نبی بعدہٗ ابداً وختم بکتابکم الکتب فلا کتاب بعدہٗ (اصول کافی) خداوند عالم نے تمہارے نبی کے ذریعہ تمام نبیوں کو ختم کر دیا ہے۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ اور تمہاری کتاب کے ذریعہ تمام کتابوں کو ختم کر دیا۔ اب اس کے بعد کوئی کتاب نہیں ہے۔

جناب امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:۔ وشریعۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ لا تنسخ الی یوم القیٰمۃ ولا نبی بعدہٗ الی یوم القیامۃ فمن ادعی بعدہٗ نبوۃً اواتیٰ بعدہ بکتاب فدمہ مباح لکل من سمع ذالک (عیون اخبار الرضاؑ) ــــ جناب رسول خدا کی شریعت مقدسہ قیامت تک منسوخ نہیں ہو گی۔ اور نہ ہی قیامت تک آنجنابؐ کے بعد کوئی نبی آئے گا، جو شخص آنحضرتؐ کے بعد دعوائے نبوت کرے یا کوئی کتاب لائے تو ہر وہ شخص جو اس کے اس دعوائے باطل کو سنے، اس پر اس مدعی کا خون مباح ہے۔

ان ارشادات میں کس قدر بڑے شد و مد کے ساتھ آنحضرتؐ پر ہر قسم کی نبوت کے اختتام کا اعلان کیا گیا ہے، اور ہر مدعی نبوت کو واجب القتل قرار دیا گیا ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال۔

(باقی ختم نبوت عقل سلیم کی روشنی میں دیکھئے صفحہ نمبر ۵۲۵ پر)

اس کتاب کے مُصنّف علّام کے دیگر قلمی شاہکار

واقفان حال پر یہ حقیقت مخفی و مستور نہیں ہے کہ سرکار آیۃ اللہ الشیخ محمد حسین النجفی صاحب العصر مدظلہ العالی خدا کے ان خوش قسمت یگانہ روزگار بندوں میں سے ہیں جن پر جدا فیض کی طرف سے بڑی فیاضی کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ جہاں علوم مشرقیہ کے منتخب زمانہ مدرس ہیں وہاں قادر الکلام شعلہ نوا اور شیوہ بیان خطیب و مقرر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ شائستہ و شگفتہ اور مدلل تحریر کے ایک خاص اسلوب کا ملکہ کاملہ بھی رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کی خاندانی شرافت، طبعی نجابت، منکسر مزاجی، خوش اخلاقی، قدیم وضع داری، مشرقی تہذیب اور اسلامی ثقافت کی پابندی و پاسداری اس پر مستزاد ہے۔ علامہ موصوف کے یہی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے ان کو محبوب زبان، محسود الاقران بنا دیا ہے مگر وہ گرد و پیش کے نامساعد حالات سے غض بصر کرتے ہوئے برابر اپنے وظائف دینیہ اور وظائف شرعیہ کی انجام دہی میں ہمہ تن مشغول و منہمک ہیں گویا وہ زبان حال سے پکار رہے ہیں۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے ۔۔۔ وہ مرد درویش جس کو تو نے دیے ہیں انداز خسروانہ

چنانچہ درج ذیل کتب جلیلہ انہی کے علم و قلم کے شاہکار اور آثار خالدہ ہیں جو عالم اسلام کے صاحبان علم و انصاف سے خراج تحسین و آفرین حاصل کر چکے ہیں۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

تحقیقات الفریقین حول حدیث الثقلین

حدیث الثقلین کے موضوع اور مذہب حق کی حقانیت پر بے مثال کتاب پہلی بار طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر مدت سے شائقین تک پہنچ رہی ہے۔

کواکب مضیہ در احادیث قدسیہ

احسن القرآن حدیث قدسی کے موضوع پر پہلی جامع اور مکمل کتاب جس کا پہلا ایڈیشن بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ

خُلاصۃ الاحکام

قوانین الشریعہ فی فقہ الجعفریہ جو کہ ایک علمی و تحقیقی کتاب ہے اور ہر شخص اس کے مطالب و حقائق سمجھ نہیں سکتا۔ اس لیے عوام کی سہولت کے لیے اس کا خلاصہ پہلی بار بعض محقق اہل علم کے قلم سے منظر عام پر آ رہا ہے۔ (انشاء اللہ)

سعادۃ الدارین فی مقتل الحسین

جو اپنی شہرت کی بناء پر کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اور باتفاق اہل علم واقعات کربلا پر اتھارٹی ہے مدت سے تیسرا ایڈیشن ختم تھا اب دیدہ زیب اور شان و شوکت کے ساتھ قوم کے مشتاق ہاتھوں تک پہنچ رہی ہے۔ انشاء اللہ

احسن الفوائد فی شرح العقائد

اس مشہور عالم اور محققانہ کتاب کا چوتھا ایڈیشن بڑی آب و تاب کے ساتھ قارئین کرام تک پہنچ رہا ہے۔ انشاء اللہ

اصول الشریعہ فی عقائد الشیعہ

جو موجودہ دور کے تمام اختلافی مسائل و عقائد پر حرف آخر ہے اور اپنی علمی و تحقیقی شہرت کی بناء پر کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ عرصہ دراز سے ختم تھی۔ اب بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس کا چوتھا ایڈیشن عنقریب تحقیق پسند لوگوں تک پہنچ رہا ہے۔ انشاء اللہ

الشُعلہ

منیجر مکتبۃ السبطین

۲۹۶/ ۹-بی سیٹلائٹ ٹاؤن بلاک بی سرگودھا